سلسلۂ نصابِ عمرانیات جامعہ عثمانیہ

نظریۂ سلطنت

تصنیف
جے۔ کے۔ بلنچلی

ترجمہ
قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے۔
رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

جس کا مقابلہ اصل جرمنی کتاب سے
ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔
نے کیا

سنہ ۱۳۴۷ھ م سنہ ۱۳۳۷ف م سنہ ۱۹۲۸ع

دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

یہ کتاب کلارنڈن پریس آکسفورڈ کی اجازت سے جس کو
حق اشاعت حاصل ہے اُردو میں ترجمہ
کرکے طبع و شائع کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مذہبی نظر بر نظریۂ سلطنت

اس کتاب میں تحقیق پر تعصب غالب ہے مثلاً: "تاریخ عالم اسی وقت سے شروع ہو سکتی ہے جبکہ ایک اعلیٰ انسانی نسل نے بنی نوع انسانی کی تکمیل کے لئے خود کچھ کرنے کی قابلیت پیدا کر لی تھی، بس اس کی ابتدا سفید نسلوں کے ظہور سے ہوتی ہے، یہی لوگ روشنی کے فرزند ہیں اور یہی دنیا کی تاریخ کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، یہ سفید انسان اتنے قدیم نہیں ہو سکتے جتنے قدیم انسان نما بندر ہیں" (ص ۵۸)

تصور سلطنت کا جو موازنہ ہے (ص ۶۰ — ۶۶) وہ آئین قدیم سے پوری واقفیت پر مبنی نہیں۔

مذہبی رنگ کی سلطنتوں کی خصوصیتیں دکھائی ہیں کہ "آزادانہ نشوونما میں خلل پڑ جاتا ہے" "حکمران ...... حاکم علی الاطلاق بن جاتا ہے" "جب یہ اقتدار ایسے وحی الہام پر مبنی ہو جاتا ہے جس کا سلسلہ مدتوں قبل منقطع ہو چکا ہے، جیسے یہودیوں میں موسوی احکام اور مسلمانوں میں قران شریف، تو اس میں ایک مستحکم مگر ناقابلِ تغیر نظم قائم ہو جاتا ہے" "مذہبی حکومت میں قوائے انسانی جو قانون و حکومت کے معاملات کے فیصلے کے لئے لازمی ہیں بہت ہی ناکمل طور پر ترقی کرتے ہیں اور کبھی ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا" "مذہبی سلطنت میں مردانہ قوتیں زنانہ قوتوں کے تابع ہو جاتی ہیں" "اہل مذہب کی حکمرانی میں عام لوگوں کو ہمیشہ

قتیں پیش آئیں گی" "جرم کے قوانین سخت اور سزائیں ظالمانہ ہوتی ہیں" "علم و ہنر میں
فی نفسہ کوئی خوبی نہیں سمجھی جاتی" (ص ۳۷۲ - ۳۷۴) وما یحذو حذوہ

حضرات اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ درس کے وقت ایسے مقامات
سرسری نہ گزریں گے بلکہ حقیقی مذہب اور اس کے صحیح متعلقات کی نسبت جو غلط ف
ت کا تقاضا و ازالہ، اصل منشائے غلط کو ظاہر کرکے علمی استدلال کے ساتھ فرمائیں گے فقط

عبداللہ العمادی

ناظر مذہبی جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی

فہرست مضامین نظریۂ سلطنت

تمت

دیباچہ

قانون اور سیاسیات کا نامور ماہر اور مشہور مصنف، یوہن کاسپر بلنچلی،[1] اُن مصنفوں میں نہ تھا جو ساری دُنیا سے الگ تھلگ اپنی کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے نظریے گھڑا کرتے اور اپنی کتابوں کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھکر نئی کتابیں بنایا کرتے ہیں بلنچلی نے جہاں علم کی دوڑ میں بہتوں کو پیچھے چھوڑا تھا وہاں عمل کے میدان میں بھی ہمیشہ سب سے آگے بڑھ کے اپنی سرکردگی کا علم بلند کیا۔ پچیس برس کی عمر میں وہ اپنے وطن تسیورش کی جامعہ میں پروفیسر مقرر ہوتا ہے؛ چھے برس بعد ستمبر ۱۸۳۹ء میں اس شہر میں جو سیاسی واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں اُن میں وہ شہریوں کے فریق (یعنے کنسرویٹیو پارٹی) کے سرگروہ کی حیثیت سے شریک ہوتا ہے اور آگے چل کے ایک آزادی پسند کنسرویٹیو فریق کی بنیاد ڈالتا ہے۔ یہ تقریباً وہ زمانہ ہے جب کہ اس کی قابلیت کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء میں میونک کی جامعہ نے اور پھر ۱۸۶۱ء میں ہائیڈل برگ کی جامعہ نے اُسے پروفیسری کی دعوت دی۔

جرمانیا پہنچ کر اُس نے اپنے کو کبھی غیر ملکی نہ جانا بلکہ اول دن سے جرمنی ہی تصور کیا، اور تعلیم و تربیت کے لحاظ سے وہ تھا بھی جرمانی ہی۔[2] اپنے وقت کو اُسنے

---

[1] ۷ مارچ ۱۸۰۸ء کو سوئیس (سوئٹزرلینڈ) کے شہر تسیورش (زیورچ) میں پیدا ہوا اور ۲۱ اکتوبر ۱۸۸۱ء کو کارلس روہے (جرمانیا) میں مرا۔

[2] بلنچلی نے اعلیٰ تعلیم کی تکمیل جرمانیا میں رہ کر کی تھی جہاں وہ مشہور جرمانی علامہ فن سوینی (Savigny

صرف پڑھنے پڑھانے ہی میں صرف نہیں کیا بلکہ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ عملی سیاسیات
میں بھی نمایاں کام کرتا رہا۔ بویریا کی مجلس اعلیٰ کا رکن منتخب ہو کر آزاد قومی (نیشنل لبرل)
فریق میں داخل ہو گیا۔ ۱۸۶۲ء میں اوروں کے ساتھ شامل ہو کر اُس نے "جرمانی نمایندوں
کی مجلس" قائم کی۔ ۱۸۶۵ء میں "جرمانی پروٹسٹنٹوں کی انجمن" کی بنیاد رکھی اور ۱۸۷۳ء میں
"بین قومی قانون کا ادارہ" قائم کیا۔

اُس کی زیادہ اہم تصنیفوں کے شائع ہونے کا سلسلہ ۱۸۴۱ء سے شروع ہوا
اور آخر عمر تک برابر جاری رہا۔ ۱۸۵۲ء میں اُس کی بلند پایہ کتاب، جسے اُس کا "شاہکار"
کہنا چاہیے، "عمومی قانون سلطنت، تاریخی بنیاد پر" کے نام سے ایک جلد میں شایع
ہوئی اور ایسی مقبول ہوئی کہ جلد جلد کئی بار چھپی اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ جب
پانچویں اشاعت کی نوبت آئی تو مصنف نے اُس میں بہت زیادہ اضافہ کیا اور "زمانہ
حال کی سلطنت کا نظریہ" نام رکھ کر اُسے دو جلدوں میں شایع کیا (۱۸۷۵ء)۔ اب پہلی
جلد کا نام "عمومی نظریۂ سلطنت" اور دوسری کا "عمومی قانون سلطنت" قرار پایا۔ ساتھ
ہی ساتھ مصنف نے ایک اور جلد اضافہ کی اور یہ تیسری جلد "سیاسیات" کے نام سے
ایک سال بعد شایع ہوئی۔ بلنچلی کے مرنے کے پانچ برس بعد پہلی دو جلدوں کی اشاعت
چھٹے بار پروفیسر لوننگ کی ادارت میں ہوئی (۱۸۸۶ء)۔[1]

تینوں جلدوں کے فرانسیسی ترجمے کی پہلی اشاعت مصنف کی زندگی ہی میں ہو گئی
تھی (۱۸۸۱ء) اور اطالی ترجمہ اُس کے مرنے کے دو برس بعد (۱۸۸۳ء میں) چھاپے
خانے سے نکلا۔ انگریزی میں فقط پہلی جلد کا ترجمہ ہوا ہے جو پہلے بار ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۶ء
میں شایع ہوا اور پھر ۱۸۹۲ء میں بعض خفیف ترمیموں کے ساتھ تیسری اشاعت
۱۸۹۵ء میں ہوئی جو دوسری اشاعت کی محض نقل ہے۔

قاضی تلمذ حسین صاحب، ایم۔ اے، رکن شعبۂ تالیف و ترجمہ، جامعہ عثمانیہ
نے اسی انگریزی ترجمے کا اردو میں ترجمہ کیا، جسے جامعہ کی مجلس نصاب تاریخ نے
بہت پسند کر کے یہ سفارش کی کہ چھپنے سے پہلے اردو ترجمے کا مقابلہ اصل جرمانی متن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) [illegible] ہورن کا شاگرد رہا۔ Eichhorn

[1] اصل کتاب کی چھٹی اشاعت کے بہ زیادہ اضافے پروفیسر لوننگ نے قلمبند کی تھیں اُن کا مسودہ بھی انگریزی مترجموں کے پیش نظر تھا اور فرانسیسی ترجمے سے بھی اُن کو بہت کچھ مدد ملی۔ (دیکھو انگریزی ترجمے کے دیباجے کا آٹھواں صفحہ)

سے بھی کر لیا جائے اور یہ خدمت میرے سپرد ہوئی۔ میں اِس تجویز کو قبول کرنے کی جانب محض اِس خیال سے مائل تھا کہ اکثر حالتوں میں اگرچہ مانی زبان سے براہِ راست اردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ شگفتہ ہوتا ہے بہ نسبت اُس ترجمے کے جو انگریزی کے واسطے سے ہوا ہو، پھر بھی ہامیں بھرنے میں مجھے گونہ تامل تھا اِس لیے کہ میں اُس فن کا ماہر نہیں جس پر یہ کتاب لکھی گئی ہے اور پھر کتاب بھی ایسی جس کی مثال یورپ کی زبانوں میں بھی نہیں ملتی۔ انگریزی کا ترجمہ مسلّم انگریز ماہروں کی اجتماعی محنت اور نقد و تنقیح کا نتیجہ ہے اور اردو کے مترجم صاحب بھی اِس فن میں غائر اور وسیع نظر رکھنے کے علاوہ اردو کے جیّد انشا پرداز اور بڑے کہنہ مشق ترجمہ کرنے والے ہیں۔ مگر جب میں نے خود قاضی صاحب ہی کو مُصر پا کر ڈرتے ڈرتے چند ورقوں کا مقابلہ کیا تو اُنھوں نے اُسے بہت پسند کیا بلکہ جو خیال میں نے ترجمے کے طرزِ عبارت کو بدلنے کے متعلق ظاہر کیا اُس سے بھی اُنھوں نے اتفاق کیا اور مقابلے کے دوران میں بار بار میری محنت کی داد دے دے کے ہمت بڑھاتے رہے۔ جو اجزا میں مقابلہ کر کے شعبۂ تالیف کے دفتر میں بھیجتا وہ اُن کی نظر سے گزرتے اور بعض امور کا فیصلہ ہم دونوں کی خط کتابت سے طے پا لیتا تب سودہ صاف کرایا جاتا۔ غرض کہ ایک ایک لفظ کو جانچ کر اردو ترجمہ بنایا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ مقابلے کے کام میں کچھ اوپر دو برس لگ گئے۔

انگریزی ترجمہ مجموعی حیثیت سے بُرا نہیں۔ اور بعض مفید حاشیے بھی مترجموں نے اضافہ کیے ہیں۔ مگر جب مانی متن سے مقابلہ کرنے میں مجھے انگریزی کتاب میں کئی سقم دکھائی دیے۔

(۱) اکثر مقامات پر اختصار سے کام لیا گیا ہے جس کی طرف مترجموں نے خود ہی اشارہ کیا ہے[۱]۔ کہیں تو متن کے لفظوں سے قطع نظر کر کے مطلب کو انگریزی میں ادا کر دیا ہے اور کہیں ٹکڑے کے ٹکڑے چھوڑ دیے ہیں۔ یہ ڈھنگ شاید انگریزی بولنے والے ناظرین کے لیے کچھ بہت بیجا نہ ہو لیکن اردو پڑھنے والوں کے لیے بلاشبہ نامناسب ہوتا۔ بلکہ چانکیہ جیسے مصنف کی عبارت میں اِس طرح کا تصرف سراسر ظلم ہے

[۱] انگریزی ترجمے کا دیباچہ، ص ۶۔

اِس قسم کے تصرف کا حق اگر کسی کو ہو سکتا تھا تو وہ چھٹی اشاعت کے فاضل مدیر، لوئیگنگ کو، مگر وہ خود یوں کہتا ہے:[1]

راقم حروف کے سپرد یہ پُر اعزاز خدمت کی گئی ہے کہ وہ اِس نئی اشاعت کو سرانجام دے۔ مگر اِس خصوص میں اُس کی کارگزاری صرف ایک محدود حیثیت کی ہو سکتی تھی۔ بلنچلی کی یہ کتاب ایسی نہیں ہے کہ محدود معنوں میں ایک درسی کتاب کہی جا سکے، وہ کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں سوکھے سلکے نقروں کو ایک دوسرے پر جما جما کے مردہ معلومات کا ایک ڈھیر لگا دیا گیا ہو، نہ وہ کوئی اِس ڈھب کی کتاب ہے کہ کسی خاص زمانے میں فن کی جو حالت ہو اُس کے لحاظ سے بعض ٹکڑے اُس میں سے نکال لیے جائیں اور اُن کی جگہ اور ٹکڑے بھرتی کر دیے جائیں۔ اِس کتاب کی حالت تو یہ ہے کہ اُس کے ہر جملے پر مصنف کی انوکھی شخصیت کا سکہ لگا ہوا ہے۔ یہ خصوصیتِ خاص کتاب کے جسم و جان کا ایک جزء ہے (جو الگ نہیں کیا جا سکتا)، اور یہ مصنف کا محض احترام ہی نہ تھا جس نے راقم کو تبدیل و تعدیل سے باز رکھا بلکہ اِس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ خوب جانتا تھا کہ اِس قسم کی دست اندازی سے کتاب کی قدر و قیمت برباد ہو جائے گی۔ بلنچلی کے قانونی اور سیاسی، تاریخی اور کلیسائی تصورات سے راقم کی رائیں اکثر کسی قدر مختلف ہیں مگر اُس نے اِس بات کو نا روا جانا کہ اِس محل پر مصنف کی رایوں کا مقابلہ کرے یا اُس اختلاف کی طرف اشارہ بھی کرے، کہ اِس طرح سے وہ اثر کمزور پڑ جاتا جسے مصنف نے اپنی کتاب کے پڑھنے والوں پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب جیسی پہلے بلا شرکتِ غیرے بلنچلی کی دماغی ملک تھی، اب بھی ہے۔

راقم نے انھیں عبارتوں میں تبدیل اور اضافہ کرنے کی جسارت کی جو اصل کتاب کا جزء نہ تھیں[2]۔ تاریخی یا ادبی بیانات میں جو بیش پا افتادہ غلطیاں کسی نہ کسی طرح کتاب میں آ داخل ہوئی تھیں وہ دور کر دی گئیں۔ اہم واقعات اور قوانین جن کا علم

---

[1] جرمانی کتاب کی چھٹی اشاعت کا دیباچہ، ص ۱۲۔ ۱۳۔

[2] یعنی تمہیدوں، حاشیوں وغیرہ میں۔ ع۔ ص۔

مصنف کو شش(؟) میں نہ تھا اُن کی طرف اشارہ کرنا ضروری تھا۔ کتاب میں جو عبارتیں اور مصنفوں کی نقل کی گئی تھیں اُن کی تفصیلی نظر ثانی بھی ایک ضروری چیز تھی۔ ......
جہاں کہیں کوئی اضافہ کیا گیا ہے۔ وہ کھنی دار خطوں یعنی [ ] کے ذریعے سے ظاہر کر دیا گیا ہے۔[1]

"بلنچلی کی پُرزور اور واضح زبان بھی، جو اُسی کا حصہ ہے، بلا کسی رد و بدل کے اصلی حالت پر قائم رکھی گئی۔ خود اُن مقامات پر بھی پُرانا متن جیوں کا تیوں رہنے دیا گیا جہاں بلنچلی نے نامانوس لفظوں اور فقروں کا استعمال کیا تھا جو کبھی کبھی بعض سوئیسی علاقوں کی بولی ٹھولی کو یاد دلا دیتے ہیں اور جو ہمیشہ نحو او طرز تحریر کے تکسالی قاعدوں کے مطابق نہیں ہوتے۔ صرف ایسے موقعوں پر خفیف تغیر تبدل کرنے کی جسارت کی گئی جہاں یقین کیا جاسکتا تھا کہ غلطی کی بنا سہو کتابت پر ہے۔"

(۲) انگریزی مترجموں نے جابجا صرف تلخیص ہی سے کام نہیں لیا بلکہ اکثر مصنف کے لفظوں سے دور جا پڑے ہیں اور ترجمے کی عبارت دھندلی ہو گئی ہے۔ بعض جگہ صرف اس وجہ سے ترجمے کا حق ادا نہ ہو سکا کہ جرمانی لفظوں یا فقروں کے ٹھیک ہم معنی لفظ یا فقرے انگریزی میں مل نہ سکے مگر ایسے مقامات بھی کچھ کم نہیں پائے گئے کہ لفظ انگریزی میں موجود تھے پھر بھی بے پروائی کے ساتھ اُن کی جگہ پر غلط لفظ رکھ دیے گئے۔

(۳) سب سے بڑا سقم انگریزی کتاب میں یہ ہے کہ ترجمے کی ایسی غلطیاں بھی جابجا موجود ہیں جنھیں دیکھ کر سوا اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مترجموں کو جرمانی زبان پر عبور نہ تھا، مثلاً اسم واحد ہے اور ترجمہ جمع میں کر دیا گیا جس سے مضمون خبط ہو گیا یا ایک ہی مادّے سے دو لفظ مشتق ہیں مگر دونوں کے معنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور مترجموں میں سے کسی ایک کو بھی اِس کا احساس نہ ہوا۔

---

[1] انگریزی ترجمے میں لوئینگ کے حاشیوں کو (الف)، (ب)، وغیرہ سے ظاہر کیا ہے اور جو اضافے انگریزی مترجموں نے اپنی طرف سے کیے ہیں وہ کھنی دار خطوں کے اندر رکھے گئے ہیں مگر اس اصول کی پوری پابندی نہیں کی گئی مثلاً دوسرے مقالے کے بائیسویں باب کا حاشیہ ۱۳ مدیر کی طرف سے ہے مگر انگریزی کتاب میں کوئی علامت ایسی نہیں جس سے یہ بات معلوم ہو سکے۔

(۴) کتابت کی بھی بعض بہت بڑی غلطیاں ہیں جن سے پڑھنے والا یا تو دھوکا کھائے گا یا سخت غلجان میں پڑ جائے گا۔

اِن تمام اسقام نے جمع ہو کر اردو میں ترجمہ کرنے والے کے لیے چند در چند صعوبتوں کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ چنانچہ جب کتاب کے بعض مقامات کا وہ ترجمہ قاضی تلمذ حسین صاحب نے دیکھا جو اصل متن سے راست اردو میں کیا گیا تھا تو انھوں نے مجھے ایک خط میں لکھا:

"بلنچلی کے متعلق...... اگر آپ یقین کریں تو اتنا عرض کروں گا کہ بعض مقامات کے ترجمے میں میں خود متردد ہو گیا تھا اور......[فلاں فلاں مقامات]...... کا ترجمہ میں نے خود تامل کے ساتھ کیا، مگر میں مجبور تھا۔"

انگریزی ترجمے کی کمزوریوں پر نظر کر کے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اصل جرمانی متن کی پوری پیروی کی جائے؛ پس جہاں کہیں میں نے دونوں میں اختلاف پایا اصل کے مطابق اردو ترجمے کو بنا دیا۔ اہم اختلافوں اور چھاپے کی غلطیوں کی ایک فہرست مرتب کر دی جو اِس دیباچے کے تکملے کے طور پر کتاب میں شامل ہے۔ جو عبارتیں اور حاشیے اِس باعث سے ترجمہ ہونے سے چھوٹ گئے تھے کہ وہ لاطینی، یونانی، فرانسیسی یا اتیالی زبان میں تھے ان کا بھی اُردو میں ترجمہ کیا۔ جن کتابوں کا حوالہ حاشیوں میں دیا گیا تھا اُن کے ناموں کا بھی، جہاں تک ہو سکا، اردو میں ترجمہ کر دیا گیا تاکہ ہر کتاب کا موضوع معلوم ہو سکے۔

جرمانی، فرانسیسی، ولندیزی وغیرہ ناموں کی کتابت میں انگریزی تلفظ کا تتبع کرنا سراسر غلط ہوتا، اِس لیے جو نام جس زبان یا قوم سے متعلق تھا اُسے اُسی کے تلفظ کے مطابق اردو حرفوں میں ادا کرنے کی کوشش کی گئی گو کہ چند در چند دقتوں کے باعث اِس میں پوری کامیابی نہ ہو سکی۔ اکثر ملکوں کے نام اردو میں انگریزی تلفظ کے موافق لکھے جاتے ہیں باوجودے کہ اردو بولنے والوں کے لیے وہ از حد ثقیل ہوتے ہیں اور بہتوں سے تو وہ نام پڑھے بھی نہیں جا سکتے، جیسے سوٹ زرلینڈ۔ خود اُس ملک کے باشندے اپنے وطن کو اِس نام سے نہیں یاد کرتے بلکہ وہاں جو لوگ فرانسیسی بولتے ہیں وہ اُسے "سوئیس" اور جو جرمانی بولتے ہیں وہ "اشوائتس" کہتے ہیں۔ اردو کے لیے فرانسیسی نام زیادہ مناسب ہے اور اُسے ہم "سوئیس" کہہ سکتے ہیں۔ اِسی طرح "پرشیا"، جس سے اکثر "پرشیا" (ایران) کا دھوکا ہوتا ہے، انگریزی میں اُس خطے کا نام ہے جس کے باشندے خود اُسے "پروسن"

کہتے ہیں۔ اردو میں "پروس" یا "پروسیا" نہایت موزوں ہے اور یہی اس کتاب میں اختیار کیا گیا تھا، مگر کاتب نے نہ مانا اور اکثر جگہ "س" کو "ش" کر ہی دیا۔ افسوس ہے کہ اس کتاب میں کتابت کی اور بھی غلطیاں ہیں جن کا احاطہ غلط نامہ بھی نہ کر سکا۔ اس کی تلافی یوں ہی ممکن ہوگی کہ اگلی اشاعت کے وقت اصلاح کر دی جائے، اور "نظریہ سلطنت" کوئی ایسی کتاب نہیں جس کی دوسری اشاعت کی نوبت بہت دیر میں آئے۔ اس کی سودمندی ارباب فن تک محدود نہیں بلکہ ہر ہوشمند شخص اسے شوق سے پڑھے گا۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض لفظ مثلاً "لاتینی" "اتالی" وغیرہ "ط" سے نہیں لکھے گئے، اس لیے کہ یہ لفظ عربی زبان کے نہیں ہیں اور مصر اور شام میں بھی ان کا املا "ت" سے اختیار کیا گیا ہے۔ قاضی تلمذ حسین صاحب کو اس میں تامل تھا مگر مبادلۂ خیالات کے بعد انھوں نے اس املا کو منظور کر لیا۔ بعض اور اختلافات بھی تھے جو بحث مباحثے کے بعد طے ہوئے۔ کتاب کے نام کے متعلق میرا خیال تھا کہ "نظریہ مملکت" ہو، اس لیے کہ مجلس وضع اصطلاحات نے State کے لیے "مملکت" کا لفظ تجویز کیا تھا لیکن قاضی صاحب "سلطنت" کو زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ پس کتاب میں جہاں کہیں "سٹیٹ" کا لفظ آیا اس کا ترجمہ "سلطنت" ہی کیا گیا۔

ع۔ صدیقی

ڈھاکہ
۵ ستمبر ۱۹۳۰ء

انگریزی ترجمے کے اہم اختلافات جرمانی متن سے

[ہر اختلاف کے نشان سلسلہ کے بعد پہلے انگریزی ترجمے کے صفحے اور سطر کا، پھر قوسین میں جرمانی متن (م) کے صفحے اور سطر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ دوسری سطر میں اردو (ترجمے) کا صفحہ اور زیر بحث عبارت دے کر اختلاف کی تشریح کی گئی ہے]

(۱) ص ۳۱، س ۱-۲ (م۔ص ۳۲، س ۲۴-۲۵)۔

اردو۔ص ۳۰: "...مگر فائق مدبر اور سپہ سالار (یعنی نپولین) نے ....."

سلسلۂ کلام سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ "فائق مدبر اور سپہ سالار" سے سوا نپولین کے کوئی دوسرا شخص مراد نہیں ہو سکتا۔ مگر انگریزی ترجموں نے جرمانی زبان کے اسم اور صفت کی گردانوں کی بھول بھلیاں میں پڑ کر دونوں لفظوں "مدبر" اور "سپہ سالار" کو جمع سمجھ لیا اور غلط ترجمہ کر کے عبارت کو خبط کر دیا۔ اردو ترجمے میں مزید وضاحت کی غرض سے قوسین میں "یعنی نپولین" بڑھا دیا گیا۔

(۲) ص ۳۶، س ۹-۱۱ (م۔ص ۳۸، س ۷-۸)۔

اردو۔ص ۳۷: "اور معدلت کا فرض ..... منضبط کرے"

(۳) ص ۴۴، س ۱۲ (م۔ص ۴۵، س ۳۲)

اردو۔ص ۴۴: "اس خصلت کا ایک دوسرا....."

ان دونوں مقامات پر اختلاف خفیف ہے۔ اردو ترجمے میں اصل کی پیروی کی گئی۔

(۴) ص ۵۱، س ۲۵ (م۔ص ۵۳، نیچے سے دوسری سطر)۔

اردو ص ۵۲: "..... متزلزل کر دیا"

انگریزی میں "destroyed" کے سوا مشکل سے کوئی اور لفظ مل سکتا تھا۔ اردو میں اس کا ترجمہ ہوتا "تباہ کر دیا، برباد کر دیا" مگر یہ ترجمہ اصل متن سے دور جا پڑتا۔ بخلاف اس کے "متزلزل کر دیا" متن کے لفظ کا ٹھیک مرادف ہے۔

(۵) ۔ص ۵۱، س ۳۴ (م ۔ص ۵۴، س ۹) ۔
اردو ۔ص ۵۲، س ۲۱: "۱۳/ اکتوبر"
۳۱/ اکتوبر صحیح تاریخ ہے، اور ۱۳/ اکتوبر سراسر غلط ہے ۔ [اردو ترجمہ کی عبارت یوں ہونا چاہیے: "جس کے آغاز کی تاریخ ......"]
(۶) ۔ص ۵۳، س ۴ ۔۵ (م ۔ص ۵۵، س ۲۳ ۔۲۴) ۔
اردو ص ۵۴: "... انھیں پر اپنے رومی اور آبائی خیالات سے ...." انگریزی میں اسلوب بیان کو بالکل بدل دیا ہے جس کی ضرورت نہ تھی ۔
(۷) ۔ص ۵۴، س ۱۸ (م ۔ص ۵۶، س ۵) ۔
اردو ۔ص ۵۴، س ۱۲: "بے شک اِس انقلاب ......"
انگریزی مترجموں نے یہاں بھی مفرد کو جمع کر دیا ("اِس" کی جگہ "اِن") جرمن زبان میں واحد مونث غائب اور جمع مذکر و مونث غائب کے لیے ایک ہی ضمیر استعمال ہوتی ہے اور اردو کی طرح فعل سے فاعل کی وحدت یا جمعیت ظاہر ہوتی ہے یہاں فعل واحد ہے مگر مترجموں نے توجہ نہیں کی ۔
(۸) ۔ص ۵۵، س ۶ ۔۸ (م ۔ص ۵۸، س ۵ ۔ ۹) ۔
اردو ۔ص ۵۶: "عمر کے بڑھتے بڑھتے ..... زمانی فاصلے ......
انگریزی ترجمے میں گونہ اختصار سے کام لیا گیا ہے ۔
(۹) ۔ص ۵۵، س ۱۳ (م ۔ص ۵۸، س ۱۶) ۔
اردو ۔ص ۵۶: "انگلستان کی سی آئینی بادشاہی ......"
متن میں جو "انگلستان" کا لفظ موجود تھا اُسے انگریزی مترجموں نے ضروری نہ خیال کیا ہو مگر اردو میں اُس کے چھوڑ دینے سے ابہام پیدا ہو جاتا ۔
(۱۰) ۔ص ۵۹، جدول ۱، س ۱۴ (م ۔ص ۶۲، جدول ۱، س ۹ ۔۱۰) ۔
اردو ۔ص ۶۱، جدول ۱: "دماغی آزادی"
انگریزی ترجمے میں "spritual" کا لفظ سراسر غلط ہے ۔ اِس سے ثابت ہو گیا کہ مترجموں کو جرمانی زبان میں مہارت نہ تھی ۔ صحیح ترجمہ ہوتا: "Intellectual freedom" یا "freedom of thought"

(۱۱). ص ۷۷، س ۲ (م. ص ۸۳، س ۳۶-۳۸)۔

اردو. ص ۹۷، "انسان کے اخلاقی خصائل ..... معاشرت کا بھی"

انگریزی میں کسی قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

(۱۲) ص ۸۴، س ۴ (م. ص ۸۹، س ۱)۔

اردو. ص ۸۴، "نابالغوں کی تربیت اور انضباط"

محض "Discipline" کا لفظ کافی نہیں۔ متن میں "نابالغوں" کا لفظ بھی موجود ہے۔

(۱۳) ص ۸۸، س ۲۴ (م. ص ۹۴، س ۱۲-۱۳)

اردو. ص ۹۱: "مادری زبان"۔

متن میں "مادری زبان" ہے "قومی زبان" نہیں جیسا کہ انگریزی ترجمے میں لکھا گیا ہے۔

(۱۴). ص ۸۹، س ۱۷-۲۰ (م. ص ۹۵، س ۱۲-۱۴)۔

اردو. ص ۹۲، س ۹-۱۱۔

مضمون کی ترتیب و تقسیم میں انگریزی ترجمے میں جدت کی گئی ہے مگر یہاں بھی جرمانی متن کو ترجیح ہے۔ اردو میں اصل کا تتبع کیا گیا۔

(۱۵) ص ۹۲، تعلیق ۱ (م. ص ۹۸، تعلیق ۱)

اردو. ص ۹۵، تعلیق ۱: "قوم کی عمر کے مختلف مدارج ....."

انگریزی میں صرف "عمر" ہے حالانکہ اصل میں جمع کا صیغہ ہے مذکر واحد کا۔ یہاں ضمیر کی گردان نے مترجموں کو دھوکا دیا۔

(۱۶). ص ۹۶، س ۲-۵ (م. ص ۱۰۳، س ۱۱-۱۴)

اردو. ص ۹۱، س ۲-۳۔

انگریزی ترجمے میں دو جملے ملا کر ایک کر دیے گئے ہیں۔

(۱۷). ص ۹۹، س ۹ (م. ص ۱۰۵، س ۳ نیچے سے)۔

اردو. ص ۱۰۳، "جب فشتے نے اپنی ولولہ انگیز تقریروں اور آرنٹ نے تحریروں سے ......"

یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ انگریز مترجموں نے "تقریروں" اور "تحریروں" کو "نغموں اور گیتوں" کیوں کر بنا دیا۔

(۱۸)۔ ص ۹۹ زیر سطر۔ ص ۱۰۰، س ۲ (م۔ ص ۱۰۶، س ۳۰۔۳۴)۔

اردو۔ ص ۱۰۴: "تمام مملکتوں خصوصاً آسٹریا.......... عضو بند کر دیا"

انگریزی ترجمے میں بے جا اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

(۱۹)۔ ص ۱۰۰، س ۱۴ (م۔ ص ۱۰۷، س ۱۳۔۱۴)۔

اردو۔ ص ۱۰۴، س ۱۳۔۱۴۔

یہاں بھی انگریزی ترجمے میں اختصار کیا گیا ہے۔

(۲۰)۔ ص ۱۰۵، س ۱۸۔۱۹ (م۔ ص ۱۱۴۔ س ۶۔۷)۔

اردو۔ ص ۱۱۰: "اعلیٰ تعمیر سلطنت........ محدود نہیں رکھتی۔"

یہاں بھی انگریزی عبارت مختصر اور مبہم ہو گئی ہے۔

(۲۱)۔ ص ۱۰۷، س ۱۰ (م۔ ص ۱۱۶، س ۱۶)۔

اردو۔ ص ۱۱۲: "قوم اپنے نمو کے مختلف مراحل میں زندگی بسر کرتی ہے۔"

انگریزی ترجمہ یہاں بھی تشنہ رہ گیا۔

(۲۲)۔ ص ۱۱۰، س ۷ (م۔ ص ۱۱۹، س ۱۷)۔

اردو۔ ص ۱۱۶: "بخلاف اس کے ایک صحتور، خوش حال اور تربیت یافتہ..."

انگریزی ترجمے میں "خوش حال" کے لیے "beneficient" کا لفظ لایا گیا ہے جو غلط ہے۔

(۲۳)۔ ص ۱۱۳، س ۵ (م۔ ص ۱۲۲، س ۱۶، ۱۸)۔

اردو۔ ص ۱۲۰، س ۴۔۵: "دوری نظام سلطنت یونی........ سے جدا"

اس مقام پر انگریزی ترجمے میں ایک پورا جملہ چھوڑ دیا گیا ہے جو اردو خواں طبقے کے لیے خصوصاً بہت ضروری ہے۔

(۲۴)۔ ص ۱۱۵، س ۱۷ (م۔ ص ۱۲۵، س ۱۔۲)۔

اردو۔ ص ۱۲۲: "ہندو معتقدات کے مطابق"

یہ جملہ بھی اصل میں موجود ہے مگر انگریزی ترجمہ کرنے والوں نے حذف کر دیا تھا۔

(۲۵) ص ۱۲۱، س ۳۰-۳۱ (م۔ ص ۱۳۱، س ۲۲-۲۳)
اردو ص ۱۲۹، س ۵-۶: "وہ قلعوں (یا گڑھیوں) میں رہنے کے شائق ہوتے اور شہروں میں بھی بلند مقامات کو اختیار کرتے تھے۔"
جرمانی زبان میں "برگ" قلعے یا گڑھی کو کہتے ہیں اور متن میں یہی لفظ ہے۔ ایک دوسرا لفظ ہے "بیرگ" جس کے معنے ہیں "پہاڑ"۔ انگریز مترجم دونوں میں امتیاز نہ کرسکے گو کہ دونوں کے ہجوں اور تلفظ میں فرق ہے۔

(۲۶) ص ۱۲۲، س ۳۰ (م۔ ص ۱۳۲، س ۲۵)
اردو ص ۱۳۰: "معما سا رہ گئی"
انگریزی ترجموں نے غالباً ایک دوسرے لفظ کا دھوکا کھا کر "Doubtful" ترجمہ کر دیا جو صحیح نہیں۔

(۲۷) ص ۱۲۴، س ۲۰ (م۔ ص ۱۳۴-۱۳۵)۔
اردو۔ ص ۱۳۲: "ان کا کام یہ تھا...... اور کریں گے تو کس حد تک۔"
انگریزی ترجمے میں بیجا اختصار کیا گیا ہے۔

(۲۸) ص ۱۳۲، س ۳۲ (م۔ ص ۱۴۳)۔
اردو ص ۱۴۱، س ۱-۲: "البتہ اس گروہ...."
یہاں بھی انگریزی ترجمہ درست نہیں۔ متن میں امرار کا طبقہ مراد ہے نہ کہ عام رعایا۔

(۲۹) ص ۱۳۳، س ۱ (م۔ ص ۱۴۳، س ۲۴)۔
اردو۔ ص ۱۴۱: "ایسی مثالیں بھی کچھ کم نہیں...."
انگریزی ترجمے کا "بعض اوقات" کافی نہیں۔

(۳۰) ص ۱۳۳، س ۱۸-۱۹ (م۔ ص ۱۴۴، س ۹-۱۰)
اردو ص ۱۴۱، س ۱۷-۱۸۔
انگریزی ترجمے میں اختصار کو دخل دیا گیا ہے۔

(۳۱) ص ۱۳۴، س ۱ (م۔ ص ۱۴۵، س ۱-۲)
اردو۔ ص ۱۴۲: "مغربی فرانس نے........ کرلی۔"

انگریزی میں ایک پورا جملہ چھوٹ گیا ہے یا چھوڑ دیا گیا۔ یہ کمی بھی اصل تن سے پوری کی گئی۔

(۳۲)۔ص ۱۳۴، س ۲۰ (م۔ص ۱۴۵، س ۲۵-۲۶)۔

اردو۔ص ۱۴۳، س ۱۔

انگریزی ترجمہ مبہم ہے۔

(۳۳)۔ص ۱۵۳، س ۳۳-۳۴ (م ص ۱۶۹، س ۱۳-۱۵)۔

اس اختلاف کے متعلق دیکھو اردو، ص ۱۶۲، س ۷-۸ اور حاشیہ۔

(۳۴)۔ص ۱۹۱، س ۱۶-۱۷ (م۔ص ۲۱۱، س ۳۰-۳۱)۔

اردو۔ص ۱۹۸، س ۱۹-۲۲ "خود حکمرانی کرنے کی قابلیت اُن میں نہیں ہے۔ جہاں کہیں اُن کو اِس کوشش کا موقع ملا...... وہاں سلطنت کی حالت اُس آدمی کی سی ہو گئی جو سر کے بل کھڑا ہو اور ٹانگیں اوپر کو ہوں۔"

اردو میں اصل کا لفظی ترجمہ بول چال کے بالکل مطابق ہو گیا۔ انگریزی میں ایسا نہیں ہو سکا۔

(۳۵)۔ص ۲۰۰ (م۔ص ۲۲۳)۔

اردو۔ص ۲۰۷-۲۰۸۔

انگریزی میں بہت اختصار کیا گیا ہے۔ اردو میں تن کا پورا ترجمہ ہے۔

(۳۶)۔ص ۲۰۰، س ۲۲ (م۔ص ۲۲۳، نیچے سے چوتھی سطر)۔

اردو۔ص ۲۰۸، س ۳: "اس قسم کی......"

اصل تن میں "قانونی" کا لفظ نہیں ہے۔

(۳۷)۔ص ۲۲۱، س ۲۳ (م۔ص ۲۵۳، س ۲۳)۔

اردو۔ص ۲۳۱۔ دیکھو حاشیہ ۲۔

(۳۸)۔ص ۲۲۷، س ۲۴ (م۔ص ۲۵۰، س ۲۵-۲۶)۔

اردو۔ص ۲۳۶، س ۴: "خود ایک ہی اقلیم کے اندر"

انگریزی مترجموں نے جانے "معتدل اقلیم" کیوں کر لکھ دیا۔

(۳۹)۔ص ۲۴۷، س ۱۸ (م۔ص ۲۸۵، س ۲۰)۔

اردو۔ ص ۲۵۸، س ۱۷: "تادیب خاتون"
انگریزی ترجمے میں جو "قیدِ خاتون" لکھا گیا ہے سراسر متن کے خلاف ہے۔

(۴۰) ص ۳۱۲، س ۵ (م۔ص ۳۵۳، س ۱۸)۔
اردو۔ ص ۳۲۹، س ۱۲: "جنگی زندگی کا منبع وہی ہے۔۔۔۔"
"guided" غلط ترجمہ ہے۔ اس کے مقابل جو جرمانی لفظ ہے اس کے معنی "مشتق" یا "ماخوذ" ہیں۔

(۴۱) ص ۳۲۳، س ۲۳ (م۔ص ۳۶۶، س ۱۰)۔
اردو۔ ص ۳۴۲، س ۶: "مزدوری کرنے والوں۔۔۔۔"
انگریزی ترجمے میں "مزدور" کے لیے "کاریگر" لکھا ہے جو صحیح نہیں۔

(۴۲) ص ۳۶۱، س ۷ (م۔ص ۴۰۶، س ۱۱)۔
اردو۔ ص ۳۸۰، س ۳: "ارکان ملت"
انگریزی والوں نے "ارکان ملت" کو "ارکانِ مملکت" بنا دیا۔

(۴۳) ص ۳۶۳، س ۱۴ (م۔ص ۴۰۹، س ۱۳)۔
اردو۔ ص ۳۸۱، س ۱۸: "جرمانیوں۔۔۔۔"
انگریزی والوں نے جرمانیوں" کو "رومیوں" کر دیا۔

(۴۴) ص ۳۹۲، س ۱۷-۱۹ (م۔ص ۴۴۳، س ۸-۱۱)۔
اردو۔ ص ۴۰۵، س ۹-۱۱: "نئے علمائے قانون۔۔۔۔۔ اور خاص کر (پیرس اور صوبجات کی) شاہی۔۔۔۔ بڑی مدد دی۔"
اردو ترجمے میں متن کی پیروی کی گئی اور جو عبارت انگریزی ترجمے میں زائد تھی وہ قوسین میں رکھی گئی۔

(۴۵) ص ۴۰۹، س ۴ (م۔ص ۴۶۵، س ۲۱، ۲۲)۔
اردو۔ ص ۴۲۲: "اب ضرورت سے مجبور ہو کر لوگوں نے جمہوریہ کا اعلان کر دیا مگر اس کے بعد ہی۔۔۔۔۔"
"مگر" سے پہلے کے الفاظ انگریزی مترجموں نے چھوڑ دیے حالانکہ وہ ضروری تھے

(۴۶) ص ۴۱۹، س ۶ (م۔ص ۴۷۸، اخیر سطر)۔

اردو۔ ص ۴۳۱، نیچے سے تیسری سطر: "۵ ردسمبر"
متن میں "۵ ردسمبر" ہے مگر انگریزی ترجمے میں "۵ راکتوبر"

(۴۷)۔ ص ۴۳۱، س ۱-۲ (م۔ ص ۴۹۴، س ۱-۲)۔
اردو۔ ص ۴۴۴، س ۱: "آئینی شاہی کا تصور یہ ہوتا ہے کہ..."
انگریزی ترجمے میں "must" کا لفظ متن کے مفہوم کو صحیح ادا نہیں کرتا۔

(۴۸)۔ ص ۴۷۰، س ۱۲ (م۔ ص ۵۴۰، س ۱۸)۔
اردو۔ ص ۴۸۱، س ۷-۸: "زمین کے وسیع قطعات پر کم تعداد آبادی کو پھیلا کر انھیں قابلِ پیداوار بنادیا تھا۔"
انگریزی ترجمہ متن کے برعکس ہے۔

(۴۹)۔ ص ۵۳۲، س ۲۰ میں جو جملہ ختم ہوتا ہے اس کے بعد متن کے بعض جملے چھوڑ دیے گئے ہیں اور نو سطروں کا خلاصہ ڈیڑھ سطر میں کر دیا گیا ہے۔ آگے کی سطروں میں بھی بہت اختصار کیا گیا ہے۔

(۵۰)۔ ص ۵۳۳ کی سطر ۱ سے لیکر سطر ۷ تک جو عبارت ہے وہ بھی اصل کی ۲۶ سطروں کا خلاصہ صرف ۶ سطروں میں ہے۔

(۵۱) جن اختلافات کی بنا، کتابت یا چھاپے کی غلطیوں پر ہے وہ اگلے صفحے پر درج ہیں:-

انگریزی کتاب میں چھاپے یا کتابت کی غلطیاں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۳	۱۸	۱۶۶۸	۱۶۸۸ (اردو میں ص ۵۴، س ۱۱)
۶۴ (حاشیہ ۱)	۲	دونوں سن غلط درج ہیں تحقیق کی گئی تو وہی سن درست نکلے جو جرمانی متن میں درج ہیں۔	(اردو۔ ص ۶۷، حاشیہ ۱، س ۱۔)
۶۶	۲۲	Puffendorf	Pufendorf
۲۲۷	۱۹	wilder	milder (اردو ص ۲۳۵ آخیر سطر)
۲۵۲ (حاشیہ ۲)	۲	Klober	Klüber
۲۹۸	۹	external	eternal (اردو ص ۳۱۴، س ۱۱۔)
۳۴۴ (تعلیق)	اخیر	Chapter XVII,	Chapters XIV—XVI,
۳۶۱	۷	wergild	wergeld
۴۱۵	۱۱	Folkething	Volksthing
۴۳۷	۹	(نویں حاشیے کا ہندسہ متن کی سطر ۹ کے بجائے سطر ۲۰ کے آخر میں ہونا چاہیے تھا۔)	

تمام کتاب میں جرمانی لفظ "staat" کو "stat" لکھا ہے جو درست نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

پہلا باب

علم السیاست

علم السیاست کی تعریف

اپنے مفہوم صحیح میں علم السیاست وہ علم ہے جس کا مبحث سلطنت ہے اور جس کا مقصود یہ ہے کہ سلطنت پر اس طرح غور کیجئے، اور اُس کو ایسے واضح طور سے سمجھ لیجئے کہ سلطنت کی بنیاد، اُسکی حقیقت و ماہیت، اس کے مختلف اشکال و مظاہر اور اس کے نشو و نما سب پر احاطہ ہو جائے۔

اس میں بعض وہ علوم شامل نہیں ہیں جو اس علم کے معاون ہیں

پس بہت سے علوم جو بسا اوقات علوم سیاسیہ میں شمار کیے جاتے ہیں حقیقتہً اس علم میں داخل نہیں ہیں گو کہ اُن کو بھی سلطنت سے ایک تعلق ہے اور علم السیاست کے امدادی علوم کی حیثیت سے اُن پر لحاظ کرنا بھی لازمی ہے۔ اس قبیل کے علموں میں سے حسب ذیل علوم خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں:۔

(الف) کسی قوم یا ملت کی ایسی تاریخ جو اُس کی خالص سیاسی یا آئینی تاریخ نہیں ہے بلکہ جو اس قوم کی رفتارِ زندگی کے عام واقعات اور اُس کے افراد کے اعمال و افعال کا حال بیان کرتی ہے اور علوم و فنون، اقتصادی حالات، اخلاقیات، سفارتی اور سیاسی جد و جہد اور جنگی واقعات سے بحث کرتی ہے۔ یہ سب چیزیں علم السیاست میں شامل نہیں ہیں۔

(ب) اور نہ ایسے شمار و اعداد جو خالصاً سلطنت سے متعلق نہیں بلکہ معاشرتی اور شخصی حالات کو بھی شامل ہیں۔

(ج) اور نہ معاشیات (یا اقتصادیات) جہاں تک کہ اُس کا تعلق اُن اقتصادی قوانین کی تحقیق سے ہے جو صرف سلطنت پر نہیں بلکہ ہر شخص پر عائد ہو سکتے ہیں،

باب

(د) اور نہ نظم معاشرت کا مطالعہ، جہاں تک کہ معاشری زندگی خود اپنے حال پر چل رہی ہو اور اُس نے سلطنتی زندگی کی صورت نہ اختیار کر لی ہو۔

علم السیاست قانون عامہ اور سیاسیات میں منقسم ہے

قدیم یونانی پولیٹکی (یعنی پالیٹکس) کا لفظ ہر قسم کے علم السیاست کے لئے استعمال کرتے تھے ہم (جرمانی) قانون سیاسی (یعنی قانون عامہ) اور سیاسیات میں احتیاط کے ساتھ امتیاز کرتے اور اُن دونوں کو دو مستقل علم قرار دیتے ہیں اور اُن کے علاوہ کئی مخصوص علموں مثلاً سیاسی شمار و اعداد، قانون نظم و نسق، قانون بین الاقوام انتظام کوتوالی وغیرہ کو مختص ناموں کے ساتھ اُن دونوں مذکورہ بالا علموں کے پہلو بہ پہلو قائم کرتے ہیں۔

قانون سیاسی (یعنی قانون عامہ) اور سیاسیات دونوں کے دونوں فی الجملہ سلطنت ہی سے بحث کرتے ہیں مگر اُن دونوں میں سے ہر ایک علم سلطنت پر جداگانہ پہلو سے اور جداگانہ طریق پر نظر کرتا ہے سلطنت کو زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھنے کے لئے علم و حکمت نے اُس کے دونوں پہلوؤں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے: ایک اُس کا نفس وجود اور دوسرے اُس کے حرکات زندگی اس لئے کہ جب اجزا کی جانچ پرکھ جدا جدا ہو جائے تو پوری چیز کو زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ اس طریق عمل میں نہ صرف نظری بلکہ عملی فوائد بھی ہیں، قانون کی وضاحت اُس کی وسعت اور اُس کی قوت میں اُس وقت سے بہت نمایاں ترقی ہوگئی ہے جب سے کہ وہ سیاسیات سے قطعی طور پر ممیز کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح سیاسیات کو بھی اسی وقت سے اپنی وسعت میں آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کا موقع ملا جب سے کہ اُس کی جداگانہ حیثیت کا مشاہدہ اور اندازہ کیا جانے لگا۔

قانون عامہ سلطنت کے منضبط وجود اور صحیح انتظام پر نظر کرتا ہے اور سلطنت کی عضوی تنظیم اُس کی حیات کے دائمی شرائط، اُس کی ہستی کے ضوابط اور سلطنتی تعلقات کی ضرورت کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ قانون عامہ سلطنت سے کما ہی بحث کرتا ہے۔

بخلاف اس کے سیاسیات، سلطنت کے حرکات زندگی اور نشو و نما پر نظر کرتی ہے۔ اور اُن منازل کی نشاندہی کرتی ہے جا جد مساعی عامہ گامزن ہوتی ہیں ایسی راہیں بتاتی ہے جن سے ان منزلوں تک رسائی ہوتی ہے اور وہ تدبیریں سوچتی ہے جن سے حصول مقاصد ممکن ہو وہ واقعات پر قانون کے عمل و اثر کا مشاہدہ کرتی اور اس امر پر غور کرتی ہے کہ مضر نتائج سے حفاظت اور موجودہ انتظامات کے نقائص کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے۔ الغرض سلطنت کی زندگانی اور سلطنت کی عملی کیفیت کو سیاسیات کہتے ہیں۔

باب ا

پس قانون عامہ کو سیاسیات سے وہی واسطہ ہے جو انضباط کو آزادی سے، جو تعلقات کے پرسکون تعین کو اُن کی پرپیچ حرکت سے یا جو اجسام کو اُن کے افعال اور اُن کے مختلف ذہنی حرکات سے ہے۔

اخلاقیات سے قانون عامہ اور سیاسیات کا فرق۔

قانون عامہ اور سیاسیات دونوں میں اخلاقی جزو بھی شامل ہے، سلطنت ایک اخلاقی چیز ہے اور اُس کے کچھ اخلاقی فرائض بھی ہیں مگر قانون اور سیاسیات کا تعین محض اخلاقی قوانین سے نہیں ہوتا اور نہ کلیتہً اخلاقی قوانین سے، وہ فی نفسہا مستقل علوم ہیں، محض فلسفہ اخلاق کی فصلیں نہیں ہیں بلکہ اُن کی بنیاد سلطنت پر ہے اور سلطنت ہی اُن کی غایت ہے، یعنی وہ سیاسی علوم ہیں بخلاف اس کے اخلاقیات کوئی سیاسی علم نہیں اس لئے کہ اخلاقیات کے بنیادی اصول سلطنت پر مبنی نہیں بلکہ اُس کا وسیع تر پایہ عام انسانی فطرت پر اور اُس کی ارفع و اعلیٰ بنیاد خدائی نظام عالم اور قضاء و قدر پر قائم ہے۔

قانون اور سیاسیات کے باہمی تعلقات

قانون عامہ اور سیاسیات کو ایک دوسرے سے بالکل ہی جدا بھی نہ کر دینا چاہیئے سلطنت دافیعہ ایک زندہ چیز ہے یعنی وہ قانون اور سیاسیات کی جامع ہوتی ہے، قانون بھی کلیتہً جامد اور ناقابل تبدیل نہیں ہے (اور دوسری طرف) سیاسیات کا تحرک سکون کی جانب راجع ہے۔ معہذا قانون محض ایک نظم ساکت نہیں ہے بلکہ اُس کی ایک تاریخ بھی ہے اور اُس کے علاوہ قانون سازی کی سیاسیات بھی ایک چیز ہے۔ جہاں کہیں عضوی (یا ذی حیات) وجود دکھائی دیتے ہیں وہاں ہمیشہ قانون اور سیاسیات کا اثر ایک دوسرے پر پڑتا ہے جو فرق ہم نے تسلیم کیا ہے وہ اس طرح ساقط نہیں ہوجاتا بلکہ اور زیادہ خوبی کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ قانون کی تاریخ اور سیاسی تاریخ میں صحیح فرق یہی ہے کہ قانون کی تاریخ اپنے تئیں صرف سلطنت کی مُعدلہ و رقائم شدہ ہستی کے نشوونما کے اظہار اور اُس کی مستقل تنظیمات و قوانین کے پیدا ہونے اور اُن کے تغیر کے اعلان تک محدود رکھتی ہے لیکن سیاسیات کی تاریخ قوم کی تغیر پذیر قسمت آزمائیوں، اُس کی گوناگوں حالتوں، مدبّروں کی نیات و اعمال اور قوم اور مدبّروں دونوں کی کارروائیوں اور مصیبتوں پر خصوصیت کے ساتھ زور دیتی ہے اور اُس پر نہایت متحرک انسانی زندگی کو بیان کرتی ہے۔ قانون عامہ کا سب سے اعلیٰ اور سب سے خالص اظہار نظام سلطنت (یعنی قانون اساسی) کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ سیاسیات کا سب سے روشن اور سب سے پُرحیات ظہور خود سلطنت کی عملی کارفرمائی (یعنی حکومت) میں نظر آتا ہے۔ اس لئے سیاسیات میں علم کے بہ نسبت فن کی حیثیت زیادہ نمایاں ہے پس سیاسیات کے لئے قانون کو (بطور اصول متعارفہ کے) پہلے ہی سے مان لینا لازم ہے کیونکہ سیاسیات کی آزادی

باب ۱

کے لئے اگرچہ قانون ہی ایک اکیلی شرط نہیں ہے مگر پھر بھی ایک بنیادی شرط ضرور ہے۔ سیاسیات کو اپنی رفتار میں حدود قانونی کا لحاظ رکھنا لازم ہے اس لئے کہ وہ زندگی کی بدلنے والی ضروریات کا اہتمام اپنے ذمے لیتی ہے۔ دوسری جانب قانون کو سیاسیات کی امداد کی ضرورت رہتی ہے۔ تاکہ وہ موت کی سی افسردگی سے محفوظ اور زندگی کی ترقیوں کے ہمقدم رہ سکے سیاسیات کے روح پرور انفاس کے بغیر پیکر قانون ایک جسد بے روح ہوگا اور قانون کے آثار و حدود کے بغیر سیاسیات بے لگام خود غرضی اور ہلاک کن ہوسوں میں پڑ کر تباہ ہو جائے گی۔ محض وضاحت اور آسانی بیان کے لئے نظریہ سلطنت کے ان دو فرعی علموں یعنی قانون عامّہ اور سیاسیات کے قبل ہم علم السیاست کے ایک تیسرے بلکہ سب سے مقدم جزو کو پیش کرتے ہیں۔ یہ فرع عمومی نظریہ سلطنت ہے اس میں ہم سلطنت کو قانون و سیاسیات کی دو حیثیتوں میں میز کئے بغیر اس پر مجموعۃً نظر کرتے ہیں۔ سلطنت کا تصور، اس کی بنیاد، اس کے خاص اجزاء (ملک و قوم) اس کے پیدا ہونے اور ترقی پانے کی کیفیت، اسکی غرض و غایت، اس کے نظام سیاسی کی خاص شکلیں، اس کے اقتدار شاہی کی تعریف اور تنظیم عضوی یہی عمومی اصول سلطنت کے موضوعات ہیں اور پھر اپنی باری میں یہی عمومی نظریہ سلطنت علم السیاست کے دو خاص اجزا یعنی قانون عامّہ اور سیاسیات کی بنا ہے۔

اس تصنیف کا پہلا حصہ عمومی نظریہ سلطنت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ دوسرا حصّہ قانون عامہ کے لئے اور تیسرا حصّہ سیاسیات کے لئے ہے[1]۔

---

[1] یہ ترجمہ صرف پہلے حصے کا ہے۔

دوسرا باب

علمی تحقیق کے طریقے

صحیح و غلط طریقے

سلطنت کے متعلق علمی تحقیق و تفتیش مختلف نقطہائے خیال اور مختلف طریقوں سے اختیار کی جاسکتی ہے علمی تحقیق کے صحیح طریقے دو ہیں اور انھیں دونوں طریقوں کی افراط یا تفریط سے دو غلط طریقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ صحیح طریقوں کو ہم فلسفیانہ اور مورخانہ کہہ سکتے ہیں۔ انھیں دونوں طریقوں کی کسی اہم خصوصیت کو مبالغے کی حد تک پہنچانے سے فاسد طریقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس مبالغے سے فلسفیانہ طریق تخیل مجرّد کی اور مورخانہ طریق تطفن محض کی مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتا ہے۔

تخیل پرستی

ان دونوں طریقوں کا یہ اختلاف کچھ تو قانون اور سیاسیات کے خصوصیات ذاتی سے وابستہ ہے اور کچھ ان لوگوں کے ذہنی میلان کے اختلافات سے تعلق رکھتا ہے جو ان مباحث کے مطالعہ میں مشغول رہے ہیں۔ تمام قوانین اور جملہ سیاسیات ایک تخیلی پہلو رکھتے ہیں جو ایک اخلاقی و روحانی عنصر ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایک حقیقی بنیاد پر مبنی ہوتے ہیں اور ایک مادّی شکل اور قیمت بھی رکھتے ہیں اور اسی آخرالذکر پہلو کے سمجھنے میں تخیل پرستوں سے غلطی ہوتی ہے اور وہ اس سے بے پروا ہو جاتے ہیں، وہ ایک سیاسی اصول کی بالکل مجرّد صورت کو اپنے سامنے رکھ لیتے ہیں اور اسی سے منطقی نتائج کا نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس کا کچھ لحاظ نہیں کرتے کہ نظام سیاسی کے حقیقی واقعات کیا ہیں۔ افلاطون تک اپنی کتاب سیاست مدن[1] میں اس لغزش سے نہ بچ سکا اور ایسی رائیں اختیار کریں جو سراسر فطرتِ انسانی اور رواجِ بشری کے خلاف واقع ہوئی ہیں تاہم وہ اپنی علوئے طبیعت اور لطافت پسندی کی وجہ سے

[1] میں نے اس موقع پر (Republic) کا ترجمہ سیاست مدن کے لفظ سے کیا ہے کیونکہ ری پبلک سے یہاں مراد جمہوریت نہیں ہے بلکہ یہ کتاب انتظام تمدن سے متعلق ہے۔

باب

اُن نہایت لایعنی کلیات کے قائم کرنے سے محفوظ رہا جن کو ہم مصنفین حال کے فلسفۂ سیاسی میں بکثرت پاتے ہیں۔ سلطنت ایک زندہ اخلاقی عضویہ ہے نہ کہ ٹھیٹ منطق کی پیداوار اور قانونِ عامۃ تخمینی خیال آرائیوں کے مجموعہ کا نام نہیں ہے۔

یہ طریقہ جب تک نظریات کی حد میں رہتا ہے اس سے بے سود نتائج پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جب عملیات کی سرحد میں قدم رکھتا ہے تو جمے ہوئے (غلط) خیالات کو نہایت ہی خطرناک اثر بخشتا اور موجودالوقت سیاسی تنظیمات کے نقض و تخریب کی طرف رجوع ہوجاتا ہے۔ انقلاب کے زمانے میں چونکہ لوگوں کے جذبات بالکل بے قید ہوجاتے ہیں اس لئے وہ انھیں خیالی اصولوں کی طرف راغب ہوجاتے ہیں اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ انھیں یہ امید ہوتی ہے کہ ان اصولوں کی مدد سے وہ قانونی قیود سے آزاد ہوجائیں گے۔ اس قسم کی تخیل پرستی بہت آسانی کے ساتھ خطرناک قوت حاصل کرلیتی ہے جس میں خود کسی نئی تنظیم کے پیدا کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی مگر جو ایک دیو کی طرح اُن تمام چیزوں کو برباد کردیتی ہے جو اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ فرانسیسی انقلاب اپنے پُرجوش واقعات کے ذریعے سے اس رائے کی صداقت کے عبرتناک ثبوت دنیا کے سامنے پیش کرچکا ہے اور نپولین کا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ "مابعدالطبیعیات والوں اور خیال پرستوں نے فرانس کو تباہ کیا"۔ "آزادی و مساوات" کے خیالی خبط نے فرانس کو برباد کردیا اور اس میں خون کی ندیاں بہادیں اسی طرح اصول شاہی کے نظریہ محض کے مسلمہ غلبے نے جرمانیا کی سیاسی آزادی کو دبا دیا اور اس کی طاقت کی ترقی کو روک دیا۔ اب اس زمانے میں قومیت کے خیالی اصول کو عملی صورت میں لانے کی کوشش نے تمام یورپ کے امن کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ صحیح سے صحیح اور مفید سے مفید خیالات جب تخیل پرستوں کے دماغوں میں سما جاتے ہیں اور وہاں سے نکل کر تنگ ظرف کٹّروں کے تختۂ مشق بنتے ہیں تو اُن سے سوائے نقصان کے کوئی نفع نہیں ہوسکتا۔

تطفنی

خالص تطفنی طریقہ دوسری جانب کی یکطرفہ افراط کا نتیجہ ہے، وہ صرف ظاہری ہیئت قانون کے الفاظ اور رسمی واقعات سے غرض رکھتا ہے۔ علمی حیثیت سے اس طریقے کا زیادہ سے زیادہ نفع یہ ہے کہ ترتیب نتائج کے لئے کثرت کے ساتھ مواد فراہم ہوجائے۔ عملی سیاسیات میں اس طریقے کے ماننے والے بڑی تعداد میں پیدا ہوجاتے ہیں خاصکر مطلق العنان حکومت کے عہدہ دار اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ تطفنی طریقہ اگرچہ تخیلی طریق کی طرح تمام سلطنت کو یکدم

سے خطرے میں نہیں ڈال دیتا تاہم انصاف کی شمشیر آبدار کو زنگ آلود کر دیتا، مفاد عامہ میں ہر طرف سے حارج ہوجاتا اور بہت سے چھوٹے چھوٹے نقائص پیدا کر دیتا ہے۔ سلطنت کی اخلاقی قوت کو کمزور کر دیتا اور اس کی صحت میں ایسا انحطاط پیدا کر دیتا ہے کہ نازک وقتوں میں سلطنت کا بچنا دشوار بلکہ کبھی کبھی ناممکن ہوجاتا ہے۔ اگر تخیلی طریقے پر عمل کرنے سے سلطنت مرض کی بحرانی کیفیت میں مبتلا ہوجاتی ہے تو یہ تظنینی طریقہ اُسے مزمن امراض کا شکار بنا دیتا ہے۔

مورخانہ طریقہ

تظنینی طریقے پر مورخانہ طریقے کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے محض موجود الوقت تنظیمات اور وقتی واقعات کے آگے سر تسلیم خم نہیں کر دیتا بلکہ ماضی وحال کے اندرونی تعلقات، قومی زندگی کے عضوی نشوونما، تاریخ کے منکشف کردہ اخلاقیات سب کی معرفت حاصل کرتا اور اُن کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ بھی حقیقی واقعات پر مبنی ہے مگر وہ اُن واقعات کو مردہ نہیں بلکہ ایک زندہ چیز سمجھتا ہے۔

فلسفیانہ طریقہ

اسی صحیح مورخانہ طریقے کے ساتھ صحیح فلسفیانہ طریقہ بھی ہم رشتہ ہے جو صرف تخمین مجرد پر نہیں بلکہ ادراک واقعات پر مبنی ہے اور اسی لئے اس میں تخیلات و واقعات دونوں کے دونوں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر مورخانہ طریقے کی بنیاد ظاہری واقعات اور ان کے ارتقا پر ہے تو فلسفیانہ طریقے کی بنیاد انسانی طبائع کے سمجھنے پر ہے اور وہ اسی نقطۂ نظر سے ارادۂ انسانی کے اُن مظاہر کو دیکھتا ہے جو تاریخ کے ذریعے منودار ہوتے ہیں۔

اعلیٰ درجے کے لکھنے والوں نے ان دونوں طریقوں کو جمع کیا ہے

بالغ نظر علمائے فن میں سے بیشتر اپنے رجحان فطری کے باعث کسی ایک جانب مائل ہوگئے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے جنھوں نے دونوں طریقوں کو جمع کیا ہو۔ اس زمرے میں [illegible] خاص قدر و منزلت کا مستحق ہے اُس کی کتاب "سیاسیات" اگرچہ تاریخ عالم کے عہد طفولیت میں لکھی گئی تھی جبکہ سلطنت کو یہ نشوونما اور ترقی حاصل نہیں ہوئی تھی مگر یہی کتاب دو ہزار برس سے سیاسی حکمت کا پاکیزہ ترین سرچشمہ بنی ہوئی ہے۔ سیسرو نے اپنے طرز استدلال اور انداز بیان میں رومیوں سے زیادہ ذی جوہر یونانیوں کا فلسفیانہ اسلوب اختیار کیا ہے مگر اُس نے اپنی تصنیف کے بہترین اجزا کا مواد اور قوم کی عملی سیاسیات سے اخذ کیا اور اس کا ایسا کرنا بالکل بجا تھا۔ زمانۂ حال کے لکھنے والوں میں بودین (فرانسیسی) و میکیاولی (اطالوی) اور بیکن فلسفیانہ اور مورخانہ دونوں طریقوں کے جامع کہے جانے کے مستحق ہیں۔ برک جس طرح اپنی فصیح البیانی کی شان اور دلآویزی میں سیسرو سے مشابہت رکھتا ہے اُسی طرح وہ اپنے

باب۲

ملک کے علم سیاست کے اصول کو اپنے ہی ملک کی تاریخ اور اپنی ہی قوم کی زندگی سے اخذ کرنے اور ان کو فلسفیانہ عظمت اور عالمانہ شوکت کے ساتھ بیان کرنے میں بھی سیسرو کے دوش بدوش معلوم ہوتا ہے مکیا ویلی (ایطالی) نے اپنی تصانیف کو ایک عمیق نظر و ہوشمند مردم شناس کے غم افزا تجربات کا مخزن بنا دیا ہے اور مونٹیسکیو (فرانسیسی) نے کشادہ پیشانی اور خندہ روئی کے ساتھ دنیا پر نگاہ ڈال کر برجستہ خیالات اور قطعی مشاہدات سے اپنی تصانیف کو مالامال کر دیا ہے۔ یہ دونوں کبھی ایک طریق اختیار کرتے ہیں کبھی دوسرا۔ تاہم اول الذکر زیادہ تر مورخانہ طریق کی طرف اور ثانی الذکر فلسفیانہ طریق کی طرف مائل رہتا ہے۔ برخلاف اُن کے روسو اور منجملہ اکثر جرمانیوں کی طرح زیادہ تر فلسفیانہ ہی طریق کے پابند رہتے ہیں مگر وہ اپنے معلم اعلیٰ افلاطون کے بہ نسبت تخیل پرستی کی یکطرفہ غلطی میں زیادہ مبتلا ہوجاتے ہیں۔

مورخانہ اور فلسفیانہ طریق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں۔

بیان مذکورۂ بالا سے واضح ہے کہ مورخانہ اور فلسفیانہ طریقوں کے درمیان کسی قسم کا تصادم نہیں ہوتا بلکہ ایک سے دوسرے کی تکمیل و تصحیح ہوتی ہے۔ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اسی پر تاریخ کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اب نئے قانونی خیالات نہیں پیدا ہو سکتے اس کی نظر تاریخ کے متعلق بہت ہی محدود اور تنگ ہے اسی طرح جو شخص سمجھتا ہے کہ اسی کی ذات پر تمام صحیح اصولوں کی ابتدا و انتہا ہو گئی ہے وہ ایک خود بیں وہمی مغرور متفلسف ہے اور بس۔ جو شخص صحیح معنوں میں مورخ ہوگا وہ فلسفے کی قدر و منزلت کو تسلیم کرے گا اور اسی طرح ایک سچا فلسفی تاریخ کے تجربات سے بھی فائدہ اُٹھائے گا۔

دونوں طریقوں میں سے ہر ایک کی خاص خوبیاں اور پھر خاص کمزوریاں اور خطرے ہیں۔ مورخانہ طریقہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس کے نتائج وافر اور قطعی ہوتے ہیں اس لئے کہ تاریخ جیتے جاگتے تنوعات سے بھری ہوئی ہے اور اسی کے ساتھ پوری پوری حتمی و قطعی بھی ہے۔ جو خیالات بنی نوع انسانی کی تاریخ کے مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں اُن کے مقابلے میں وہ سارے خیالات جو ایک بار آور سے بار آور دماغ پیدا کر سکتا ہو پوچ پوچ ہوں گے اور عموماً ایک غیر معتبر اور دھندلی شکل اختیار کریں گے البتہ اس کے ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی موجود ہے کہ تاریخی طریقوں پر چلنے سے شاید ہم انواع و اقسام کے لاتعداد حالات میں پڑ کر اپنے اصلی مقصود کو بھول جائیں اور اُسے کھو بیٹھیں، مواد کثیر کے بوجھ سے دب جائیں، تاریخی مشاہدات کی بھتات ہمیں مغلوب کرلے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گزشتہ زمانے کے حالات سے مرعوب و مسحور ہو کر ہم اپنی نظر کی اُس تازگی کو کھو بیٹھیں

باب ۲

جس سے ہمیں موجودہ اور آئندہ زندگی کی طرف دیکھنا چاہئے۔ یہ کچھ لازم نہیں کہ یہ نقائص ہر حال میں مورخانہ طریقے کے لابدی نتائج ہوں مگر تاریخ خود ہی ہمیں بتاتی ہے کہ وہ لوگ جو ہمہ تن اُسی کے ہو رہے ہیں، اکثر اس قسم کی بے راہروی میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

اس کے مقابلے میں فلسفیانہ طریق کے فوائد یہ ہیں کہ اس سے مقصود اصلی صاف ہو جاتا ہے، اختیار کردہ نظام میں یکرنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، حصول تکمیل کی آرزو جس کے لئے انسان ہر جگہ اور ہر زمانے میں کوشش کرتا ہے، پوری طرح بر آتی ہے یعنی وہ اپنے منتہائے خیال کو حاصل کر لیتا ہے فلسفیانہ طریقے سے جو نتائج اخذ کئے جاتے ہیں وہ انسانی طبیعت کے موافق اور منتہائے خیال کے مطابق ہوتے ہیں۔ تاہم اپنی جگہ پر یہ طریقہ بھی خطرات سے خالی نہیں ہے، فلسفی اپنا غایت الہم تو بعد نتائج کو بنا کر اس درجہ اُس کے درپے ہو جاتے ہیں کہ فطرت کی اندرونی پیچیدگیوں اور حیات واقعی کے معمور خزانوں کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ خیالات کی بے قید بلند پروازی میں پڑ کر کمتر ایسا ہوتا ہے کہ حقیقی قوانین کے دریافت کرنے کے بجائے لاحاصل کلیات اور لایعنی مزخرفات کے بنانے میں وہ اپنا وقت نہ ضائع کر دیتے ہوں۔ وہ فطری نشو و نما کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے کچے پھل توڑ لیتے بے جڑ کے درخت لگانے لگتے، اور تخیل پرستی کے اوہام باطلہ میں ڈوب جاتے ہیں چند ہی عالی ہمت فلسفی ایسے ہوئے ہیں جو ان غلطیوں سے بچ نکلے ہوں۔

فائدہ: ۱۸۱۴ء میں میں نے ایک کتاب "جرمانیہ میں اصول قانون کے موجودہ طریقے" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کتاب میں ان خیالات اور ان کے مثل دوسرے خیالات کو جرمانیہ کے علمی نقطہ نظر سے ربط دیکر تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا، مگر اُس سے مدتوں پہلے انگلستان کا لارڈ چانسلر بیکن اپنے زمانے کے قانون فطرت اور انسانی اصول قانون کے مروجہ طریق کے مطالعہ پر اعتراض کر چکا اور تاریخ فلسفہ کے امتزاج سے قانون میں ضروری اصلاح کی توقع ظاہر کر چکا ہے۔

تیسرا باب

عام اور خاص علم السیاست

خاص علم السیاست کسی مخصوص قوم اور ایک ہی سلطنت تک محدود ہوتا ہے اس کی مثالیں روما کی قدیم جمہوریہ، جدید انگریزی نظامِ سلطنت اور موجود الوقت جرمانی شہنشاہی ہیں۔

برخلاف اس کے عام علم السیاست سلطنت کے ہمہ گیر تصور پر مبنی ہے مخصوص سلطنت کی بناء ایک معین قوم پر ہوتی ہے، عام سلطنت جو انسانی فطرت پہ نظر رکھتی ہے کل بنی نوع انسان پر مبنی ہے۔

سلطنت کے عام نظریئے اور بالخصوص عام قانون عامہ کی نسبت اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ دلخواستہ تخمین کا نتیجہ ہے، اور کوشش کی جاتی ہے کہ دنیا کے حالات پر ایک تخمینی نظر ڈال کر محض منطقی استدلال کے ذریعے اُس نتیجے کا استنباط کرلیا جائے۔ اس طرح پر فطری یا فلسفی قانون عامہ کے مختلف مذاہب پیدا ہوگئے ہیں جو اُس قانون عامہ سے بالکل ممیز ہیں جسے اثباتی یا تاریخی کہتے ہیں۔

میں اس فرق کو اور ہی نظر سے دیکھتا ہوں۔ میرے خیال میں سلطنت کو فلسفی اور تاریخی دونوں طریق سے سمجھنا اور پہچاننا چاہیئے اس دوگونہ عمل سے نہ عام قانون عامہ مستغنی ہوسکتا ہے نہ خاص۔

عام علم السیاست عالمگیر تاریخ پر مبنی ہے

سلطنت کے خاص نظریئے سے اُس کا عام نظریہ اُسی طرح مقدم ہے جس طرح عام انسانی فطرت کسی قوم کی مخصوص خصلت سے مقدم ہے۔ عام علم السیاست اُن اصولی تصورات سے بحث کرتا ہے جو خصوص سلطنتوں کے نظریات میں ادنیٰ یا اعلیٰ طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ بہ لحاظ عام نظریۂ سلطنت کرتا ہے وہ تمام دنیا کی عالمگیر تاریخ ہے، کسی خاص ملک یا کسی خاص سلطنت کی تاریخ نہیں ہے تاریخ عالم ہے سیاسی فلسفے کے نظمیات کا اندازہ اور تکملہ ہوتا ہے اور تاریخ عالم ہی ترقی کے اُن مختلف مدارج کو ہمارے پیش نظر کردیتی ہے،

جنھیں انسان نے اپنے بچپن سے اس وقت تک طے کیا ہے اور ان میں سے ہر درجہ میں سلطنت کے متعلق مختص خیالات اور اُس کی خاص ترکیبی ہیئتیں پائی جاتی ہیں۔ اس سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بنی نوع انسان کے عمل مشترک میں مختلف قوموں نے کس طریقے سے حصّہ لیا ہے۔

تاریخ عالم کے تمام دور اور اُس کی تمام قومیں ہمارے اس علم کے لئے یکساں اہمیت نہیں رکھتیں۔ ہمیں بالتخصیص موجودہ زمانے کی سلطنت سے غرض ہے۔ ازمنۂ قدیمہ اور ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت کی جو شکلیں تھیں اُن پر محض اس لحاظ سے غور کرنا چاہئے کہ وہ ہیولائے ابتدائی کا کام دیتی ہیں اور ان کے ساتھ مقابلہ کرنے سے جدید سلطنت کے اوصاف زیادہ واضح اور عیاں ہوجاتے ہیں۔ جدید سلطنت کی تشکیل میں مختلف قوموں کی اہمیت کا تعین بالعموم اُن کے اُس کام سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے سیاسی تمدن کو ترقی دینے میں کیا ہے، سیاسی تمدن سے مراد وہ اجتماع انسانی ہے جس میں انسانی باضابطگی اور انسانی آزادی دوش بدوش چل رہے ہوں۔ دنیا کی تاریخ میں آریائی یا ہند جرمانی نسل سیاسیات کے لئے ویسی ہی نمایاں ہے جیسی سامی نسل مذہب کے لئے۔ لیکن آریائی قوموں کو بھی اُن کے یورپ میں آنے کے بعد ہی دانستہ طور پر سلطنت کی اعلیٰ ترکیبی ہیئت حاصل ہوئی۔ آریائی قوموں میں سے زمانۂ قدیم میں یونانی اور رومی اور ازمنۂ وسطیٰ میں جرمانی گوئے سبقت لے گئے ہیں مگر ہماری جدید سیاسی تہذیب بالتخصیص یونانی رومی اور جرمانی عناصر کے باہمی امتزاج کا ثمر حاصل ہے اور جدید سیاسی ارتقا میں اقوام ذیل نے اور ساری قوموں سے زیادہ حصہ لیا ہے (۱) اول انگریز جن کی نسل بھی انھیں عناصر سے ممزوج ہے (۲) دوسرے فرانسیسی جن میں قدیم کلٹی اور رومانی عناصر کے ساتھ جرمانی عناصر بھی مخلوط ہو گئے ہیں (۳) تیسرے پروشیائی جن میں جرمانی قانون پسندی اور مردانہ تمکنت کے ساتھ سلاوی پاس حکومت اور اطاعت شعاری ممزوج ہیں۔ امریکہ کی سیاسی زندگی یورپ سے ماخوذ ہے لیکن اُس نے شمالی امریکہ (یعنی ممالک متحدہ) ہی میں ترقی حاصل کی ہے۔

پس عام علم السیاست زمانۂ موجودہ کے متمدن بنی نوع انسان کے مشترک سیاسی ادراک و احساس، اُن کے اساسی خیالات اور اُس کے حقیقی مشترک تنظیمات سے بحث کرتا ہے اور اُن مشترک تنظیمات کا اظہار مختلف سلطنتوں میں مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ عام قانون عامّہ بھی محض نظریہ نہیں ہے۔ اس کا اثر بھی ایک حقیقی اثر ہے لیکن یہ اثر بالواسطہ ہے

کون سے زمانے اور کون سی قومیں نمایاں ہیں

کیونکہ ایک عالمگیر سلطنت موجود نہیں اور اس لئے مختلف مخصوص سلطنتوں کے توسط سے یہ اثر عمل پذیر ہوتا ہے۔ انسان اور اُس کی تاریخ کے مانند، اس قانون عامہ کا وجود بھی حقیقی ہے محض خیالی نہیں۔

تعلیق ارسطو کی Rhetoric (فن بلاغت) میں خاص قانون اور عام قانون کے درمیان جو اختلاف بیان کیا گیا ہے وہ اُس سے مختلف ہے جس پر ہم بحث کررہے ہیں۔ اول الذکر سے مراد وہ قانون ہے جسے کسی خاص سلطنت نے خود اپنے لئے بنایا ہو خواہ وہ تحریری ہو یا غیر تحریری۔ ثانی الذکر وہ ہے جو کسی سیاسی ملت کا لحاظ کئے بغیر از روئے فطرت صحیح ہو۔

پہلا مقالہ

سلطنت کا تصور

پہلا باب

سلطنت کا تصور۔ سلطنت کا تخیل۔ سلطنت کا عام تصور

سلطنت کا تصور ایسی سلطنتوں کی ماہیت سے جو فی الواقع موجود ہیں اور اُن کی ضروری خصوصیات سے بحث کرتا ہے۔ برخلاف اس کے سلطنت کا تخیل عالم خیال میں ایک اہم واکمل سلطنت کی جگمگاتی ہوئی تصویر پیش کرتا ہے جو ابھی تک عالم وجود میں نہیں آئی ہے مگر جس کے لیے کوشش کرنا ضروری ہے۔

سلطنت کا تصور تاریخ سے اور اُس کا تخیل فلسفے سے پیدا ہوتا ہے۔

سلطنت کا تصور صرف تاریخ ہی سے حاصل ہوسکتا ہے اور سلطنت کا تخیل فلسفی تخمین سے پیدا ہوتا ہے۔ سلطنت کے عام تصور کی معرفت اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ اُن متعدد سلطنتوں کی جو واقعتہً دنیا کی تاریخ میں نمودار ہوچکی ہیں پڑتال کی جاتی اور اُن کے مشترک خصوصیات کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ سلطنت کا اونچے سے اونچا تخیل اُس وقت نظر کے سامنے آتا ہے جب کہ انسانی فطرت کے اُس میلان پر لحاظ کیا جاتا ہے جو اُسے سیاسی نظم کی طرف ہے، اور جب کہ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ جہاں تک خیال میں آسکتا ہے اس میلان کو ممکن ترقی دینا نوع انسان کی سیاسی غایت ہے۔

تمام سلطنتوں کی مشترک خصوصیات

اگر ہم سلطنتوں کی اُس کثیر تعداد پر نظر کریں جس کو تاریخ نے ہمارے سامنے کردیا ہے تو چند خصوصیات جو تمام سلطنتوں میں مشترک ہیں فوراً ہی ہم پر عیاں ہوجائیں گی۔ اُن کے علاوہ بعض دوسری خصوصیات زیادہ غائر مطالعہ سے ظاہر ہوں گی۔

۱۔ انسانوں کی ایک تعداد۔

۱۔ سب سے پہلے یہ بات واضح ہے کہ ہر سلطنت میں آدمیوں کی ایک تعداد مجتمع ہوتی ہے۔ مختلف سلطنتوں میں اس تعداد میں بہت تفاوت ہوسکتا ہے۔ بعض سلطنتیں صرف

باب ۳

چند ہزار اور بعض اوقات کروڑ انسانوں پر محتوی ہوتی ہیں مگر سلطنت کا لفظ ہم اس وقت تک نہیں استعمال کر سکتے جبتک کہ کسی سلطنت کے باشندے ایک اکیلے خاندان کے حلقے سے باہر نہ ہو جائیں اور جبتک کہ ایک بڑی تعداد آدمیوں (یعنی خاندانوں کی جن میں مرد - عورت - بچے شامل ہوں) باہم متحد نہ ہو جائے - حضرت یعقوبؑ کے کنبے کی طرح کوئی خاندان یا قبیلہ ایک ایسا مرکز ہو سکتا ہے جس کے گرد امتداد زمانہ سے ایک بڑی تعداد جمع ہو جائے مگر جب تک یہ اضافہ وقوع میں نہ آئے یا جب تک ایک کنبہ مختلف کنبوں میں تقسیم ہو کر اور قرابتداری کی حد سے گزر کر ایک نسل نہ بن جائے اس وقت تک حقیقی معنوں میں سلطنت نہیں قائم ہو سکتی - محض ایک غول کو ایک قبیلہ نہیں کہہ سکتے اور بغیر ایک قبیلہ یا تمدن کے اعلیٰ مدارج میں بغیر ایک قوم کے سلطنت نہیں ہو سکتی -

سلطنت کے لئے آبادی کی کوئی خاص تعداد معین نہیں ہے[1] روسو نے جو دس ہزار آدمیوں کی تعداد تجویز کی ہے وہ یقیناً ناکافی ہے ازمنہ وسطے میں ایسی چھوٹی سلطنتیں حفاظت اور عزت کے ساتھ قائم رہ سکتی تھیں مگر جدید زمانے کا میلان بہت بڑی سلطنتوں کے قیام کی طرف ہے جس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ جدید سلطنت کے سیاسی فرائض کے لئے بڑی قومی قوت کی ضرورت ہے اور کچھ یہ کہ بڑی بڑی سلطنتوں کی بڑھتی ہوئی طاقتیں چھوٹی سلطنتوں کی خود مختاری اور آزادی کے لئے خطرہ و تہدید کا سبب ہو جاتی ہیں -

ایک معین مملکت

(۲) دوسرے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ سلطنت کی بقا کے لئے کسی خاص زمین کے ساتھ قوم کا مستقل تعلق لابدی ہے سلطنت کو ایک رقبۂ سلطنت کی ضرورت ہے اور قوم اور ملک لازم و ملزوم ہیں -

خانہ بدوش قوموں میں اگرچہ حکمرانی کے لئے سردار اور انتظام کے لئے قانون موجود ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ سلطنت کی پوری منزلت پر نہیں پہنچ سکتیں - اُن کی سلطنت کی صورت اُسی وقت بندھتی ہے جب وہ ایک مقررہ جگہ پر بس جاتی ہیں - بنی اسرائیل نے سیاسی تربیت

---

[1] اس مسئلہ کے متعلق ارسطو کی رائے کے لئے "سیاسیات" (فصل ہفتم جزو ۴) دیکھنا چاہئے وہ کہتا ہے کہ سلطنت نہ تو دس آدمیوں کی ہو سکتی اور نہ لاکھ آدمیوں کی ہو سکتی "سیاسیات" کی فصل سوم جزو ۳ فقرہ ۵ بھی دیکھنا چاہئے - انگریزی مترجم

حضرت موسیٰ نے ان سے حاصل کرلی تھی مگر وہ سلطنت کی حیثیت میں اس وقت تک نہ آسکے جب تک کہ یوشعؑ نے ان کو فلسطین میں متمکن نہیں کردیا۔ سلطنت روما کے زوال کے بعد نقل وطن کا جو سیلاب عظیم رواں ہوا اور قوموں نے اپنے قدیم مسکنوں کو چھوڑ کر نئی جائے بود و باش کے فتح کرنے کا تہیہ کیا تو وہ استحالہ کی ایک غیر معین حالت میں تھیں۔ ان کی قائم کردہ سابق سلطنتیں باقی نہیں رہی تھیں اور نئی ابتک وجود میں نہیں آئی تھیں شخصی تعلق ایک زمانے تک قائم رہا مگر ملک کے ساتھ جو تعلق تھا وہ ٹوٹ گیا تھا صرف اسی حالت میں وہ کوئی نئی سلطنت قائم کرسکے جب وہ مستقل طور پر کہیں قدم جمانے میں کامیاب ہوگئے۔ جو قومیں اس مرحلے میں ناکامیاب ہیں وہ تباہ ہوگئیں۔ ایتھنز والوں نے تھمسٹوکلیس کی سرکردگی میں سلطنت ایتھنز کو اپنے جہازوں پر بچالیا کیونکہ فتح کے بعد انھوں نے پھر اپنے شہر پر قبضہ کرلیا مگر سمبری اور ٹیوٹونی تباہ ہوگئے کیونکہ انھوں نے اپنے قدیم وطن کو چھوڑدیا تھا اور کسی جدید مقام کو اپنا وطن بنانے میں ناکام رہے۔ اگر اہل روما اپنے شہر کے جل جانے کے بعد ویای کو چلے گئے ہوتے تو خود سلطنت روما کا خاتمہ ہوگیا ہوتا۔

۳۔ سلطنت کی ایک اور خصوصیت ہے کل افراد کا اتحاد یعنی قوم کے ہر فرد کا اپنے تئیں ایک ہی کل کا جز سمجھنا۔ اندرونی طور پر مختلف تقسیمیں ضرور ہوسکتی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر کافی آزادی رکھتی ہوں جیسے روما میں ایک گروہ پیٹریسیوں (یعنی اشراف) کا تھا اور دوسرا پلیبیون (یعنی عامیوں) کا۔ اسی طرح متوسط زمانے کے ابتدائی دور میں جرمانی سلطنتوں میں جاگیری نظام کے پہلو بہ پہلو ایک قومی نظام بھی موجود تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سلطنت ایسے مختلف حصص پر مشتمل ہو جو بجائے خود سلطنت ہوں جیسے قدیم جرمانی شہنشاہی سے بتدریج بہت سی مقامی سلطنتیں پیدا ہوگئیں یا جیسے شمالی امریکہ یا سوئیزرلینڈ کی ہیں متحد سلطنتوں اور نئی جرمانی شہنشاہی میں ایک مشترک مجموعی سلطنت کے ساتھ ساتھ متعدد مقامی سلطنتیں بھی قائم ہیں۔ مگر جب تک کہ قوم اپنی اندرونی عضوی ترتیب میں ایک مربوط مجموعہ نہ بن جائے یا اپنے بیرونی تعلقات میں سارے قومی اتحاد کی وحدت حیثیت کا اظہار و عمل نہ کرسکے اس وقت تک سلطنت کا وجود ہی نہیں ہوسکتا۔

۳۔ اتفاق

۴۔ تمام سلطنتوں میں ہم حاکم اور محکوم یا باصطلاح قدیم پادشاہ اور رعیت کے درمیان امتیاز پاتے ہیں۔ پادشاہ اور رعیت کے فقرے کے مفہوم میں بسا اوقات غلط فہمی ہوئی اور اکثر وہ غلط استعمال کیا گیا ہے مگر بجائے خود یہ فقرہ نہ قابل نفرت ہے نہ اس سے غلامانہ انقیاد کا اظہار ہوتا ہے۔ بہرصورت یہ فرق نہایت ہی متنوع شکلوں میں

۴۔ حاکم و محکوم کا فرق

باب

ظاہر ہوتا ہے مگر ہر حال میں ایک ضروری امتیاز ہے یہاں تک کہ بہت ہی انتہا کو پہنچی ہوئی جمہوریت جس میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ امتیاز نا پدید ہوگیا ہے وہاں بھی حقیقت میں موجود ہوتا ہے شہر ایتھنز کے باشندوں کی مجلس ہی فرمانروا تھی اور اہل ایتھنز فرداً فرداً رعایا تھے۔

جہاں کوئی حکمران صاحب اختیار نہ رہے جہاں محکوموں نے سیاسی اطاعت سے انکار کر دیا ہو اور ہر شخص وہی کرنے لگے جو اُس کا جی چاہے، اور جہاں لاحکمیت کا دور دورہ ہو وہاں پھر سلطنت کا خاتمہ ہے۔ لاحکمیت (یا طوایف الملوکی) مثل اور منفیات کے اتنی کم مدت تک قائم رہ سکتی ہے کہ ہر ایک زندہ قوم میں گویا فوراً ہی اُس لاحکمیت سے پھر ایک قسم کی نئی حکومت پیدا ہو جاتی ہے گو کہ وہ نہایت سخت گیر بلکہ اکثر سنگدل اور ظالمانہ ہوتی ہے یہ نئی حکومت بزور لوگوں کو اطاعت و انقیاد پر مجبور کر دیتی اور اس طرح اُس لابدی امتیاز کو دوبارہ قائم کر دیتی ہے۔ اشتمالی اصولاً اس امتیاز سے انکار کرتے ہیں مگر ان کے اس انکار سے خود نفس سلطنت کا انکار لازم آتا ہے۔ سلطنت کو توڑ پھوڑ کے محض معاشرتی اتحاد پیدا کرنے میں یہ لوگ بھی کسی قوم میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں اور اگر کبھی عارضی طور پر عوام کو اپنی تجاویز کا طرفدار بنالیں اور انھیں کامیابی ہو بھی جائے تو سولھویں صدی کی مذہبی اشتمالیوں یعنی باز اصطباغیوں[1] کی مثال کے مطابق اور واقعات کے اندرونی نتائج کی بنا پر ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ بھی بعد میں ایک تسلط قائم کر دیں گے اور یہ تسلط سخت ترین قسم کا ہوگا۔

سلاوی قوموں میں ہم یہ قدیم خیال پاتے ہیں کہ قوم کے تمام افراد کا اتفاق رائے ہی

---

[1] سنہ ۱۵۲۲ء میں جرمانیا میں ایک نئے فرقے کی ابتدا ہوئی جس کے ماننے والوں کو اُن کے مخالفوں نے "باز اصطباغیوں" (Anabap tist) کا لقب اس لئے دیا کہ اُن کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ بچوں کو بپتسما (اصطباغ) دینا ایک باطل چیز ہے پس عام رواج کے مطابق جن لوگوں کو سولہ سترہ برس کی عمر میں بپتسما دیا جا چکا ہے اُن کے بپتسمے کی تجدید لازم ہے۔ اسی کے ساتھ یہ لوگ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ ہر سچی مذہبی اصلاح سے لازماً معاشرت کی بھی اصلاح ہوتی ہے۔ اسی عقیدے پر سولھویں صدی میں اشتمالیت کی بنیاد پڑی پس یہ فرقہ خالص مذہبی نہیں بلکہ سیاسی مقاصد بھی رکھتا تھا۔ اس نے جرمانیا، سوئیس (Sw!tzer-land) اور ولندیز (Holland) میں ایک حد تک شیوع پایا لیکن مذہبی اور سیاسی شورش برپا کر کے اپنے ماننے والوں کی تباہی کا باعث ہوا۔ ع۔ص۔

مرضی عامہ کا نمائندہ ہو سکتا ہے اور کثرت رائے کو یا اعلیٰ ذی اقتدار افراد کو فیصلہ کرنے کا
کوئی حق نہیں۔ یہ اصول زیادہ سے زیادہ مقامی جماعات کے لئے کام دے سکتا ہے اور وہ بھی
اسی قوم میں جہاں لوگ آسانی اور سرعت کے ساتھ باہم اتفاق کر لیتے ہوں لیکن اسے سیاسی
اصول کا درجہ کبھی نہیں حاصل ہو سکتا کیونکہ سلطنت کے لئے ضروری ہے کہ وہ افراد کی ناگزیر مخالفت
کو مغلوب کر دے۔

ذیحیاتی فطرت۔

سلطنت کسی نہج سے ایک بے جان آلہ یا ایک مردہ کل نہیں ہے وہ ایک زندہ اور
اس لئے ایک عضوی وجود ہے۔ سلطنت کی اس عضوی فطرت کو لوگوں نے ہمیشہ نہیں سمجھا۔ سیاسی
اقوام نے ضرور اس کا ایک نقش اپنے ذہن میں قائم کر لیا ہے اور الفاظ میں بھی اسے بطیب خاطر
تسلیم کیا ہے مگر علم السیاست سے سیاسی عضویے کی حقیقی معرفت ایک مدت تک پوشیدہ رہی
اور آج بھی بہت سے علمائے سیاست اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ تاریخی مصنفین میں اس کا سہرا
جرمانیا کے تاریخی قانون دانوں کے سر رہا کہ انھوں نے قوم کی اور سلطنت کی عضوی فطرت کو
پہچانا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سلطنت پر ریاضی اور علم آلات کے طریق تحقیق سے نظر ڈالنا جس میں
صرف گنتیوں سے کام لیا جاتا ہے نیز ایسے لانعد ولاتحصیٰ جزئیات سے بحث کرنا جنھوں نے جزو کے
ہجوم میں کل کو بھلا دیا تھا، غلط اور لاحاصل مانا گیا۔ جس طرح ایک روغنی تصویر صرف روغن و
رنگ کے قطرات کا مجموعہ نہیں بلکہ کچھ اور ہی چیز ہے اور ایک مجسمہ صرف سنگ مرمر کے ذرات
کے اتصال کا نام نہیں بلکہ اس کے لئے کچھ اور بھی درکار ہے اور انسان محض خلل و جراثیم
اور خون کی ایک مقدار کا نام نہیں ہے اسی طرح محض شہریوں کا اجتماع، قوم نہیں ہے اور نہ سلطنت
محض ظاہری نظامات و ضوابط کا مجموعہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ سلطنت فطرت کی پیدا کی ہوئی چیز نہیں ہے اور اس لئے وہ ایک فطری
عضویہ بھی نہیں بلکہ بالواسطہ انسانوں کا کام ہے البتہ سلطنت بنانے کا میلان انسان کی
فطرت میں پایا جاتا ہے اور اس حد تک سلطنت کی بنا فطرت پر ہے مگر اس میلان کو عملی
صورت دینا فطرت نے انسانی محنت اور انسانی انتظام و اہتمام پر چھوڑ دیا ہے اور اس
حد تک سلطنت انسانی قوت عمل کی پیداوار اور اس کی عضوی صورت ایک فطری عضویے
کی نقل ہے۔

سلطنت کس معنی میں ذیحیات ہے۔

جب ہم سلطنت کو عضوی (یا ذی حیات) کہتے ہیں تو ہم فطرت کی مخلوقات کے ان

اعمال و افعال کا خیال اپنے دل میں نہیں لاتے جن کے ذریعے سے وہ مخلوقات اپنی غذا کو تلاش کرتے، اُسے ہضم کرتے اور جزو بدن بناتے ہیں اور اپنی نوع کا توالد و تناسل کرتے ہیں، بلکہ ہمارے دل میں عضوی (یا ذی حیات) ہستیوں کے خصوصیاتِ ذیل کا خیال آتا ہے :۔

(الف) ہر عضویہ ذی حیات، جسم اور روح یعنی مادی عناصر اور روحی قوتوں کے اتحاد سے بنا ہے۔

(ب) اگرچہ ہر عضویہ ایک پوری چیز ہے اور پوری ہی چیز رہتا ہے پھر بھی اگر اُس کے اجزا پر نظر کرو تو وہ ایسے اعضا رکھتا ہے جو خاص اغراض کے لئے بنے ہیں اور خاص قابلیتوں سے بھرے ہوئے ہیں تا کہ وہ متعدد طریقوں سے خود مجموعے کی مختلف ضروریات کو پورا کریں۔

(ج) ہر عضویے کا نمو اندرونی جانب سے بیرونی جانب کو ہوتا ہے اور اُس میں خارجی نشوونما ہوتی ہے۔

ان تینوں اعتبارات سے سلطنت کی عضوی نوعیت عیاں ہے :۔

(الف) سلطنت میں روح اور جسم ہے

(الف) سلطنت کے اندر روح اور جسم، ارادہ اور کارکن اعضا لازماً مربوط ہو کر ایک زندگی پیدا کرتے ہیں۔ قوم کی واحد روح جو اپنے وقت کے فرداً فرداً تمام باشندوں کی روح کے اوسط مجموعے سے ایک مختلف شے ہے سلطنت کی بھی روح ہے۔ قوم کا واحد ارادہ، جو تمام قوم کے اوسط ارادے سے مختلف ہے، سلطنت کا بھی ارادہ ہے۔ نظام سلطنت اور اس کے ساتھ اُس کے وہ اعضا، جو کل کی قائم مقامی کرتے اور قوانین کی شکل میں سلطنت کی مرضی کا اظہار کرتے ہیں، اس کا وہ سرگردہ جو حکمرانی کرتا ہے، انتظامی اغراض کے لئے اس کے ہر طرح کے محکمے اور دفتر، عام انصاف کو عمل میں لانے کے لئے عدالتیں، قوم کے مادی اور ذہنی اغراض کے مہیا کرنے کے لئے ہر قسم کے تنظیمات، عام قوت کے اظہار کے لئے فوج، یہی وہ نظام ہے جو سلطنت کا جسم ہے اور یہی وہ شکل ہے جس میں قوم کی مشترک زندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ انفرادی سلطنتیں مثل انفرادی اشخاص کے اپنی روح اپنے خصائل اور اپنی شکل و صورت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ بنی نوع انسان کی ترقی کا حقیقی انحصار قوموں اور سلطنتوں کی مسابقت پر ہے، جن سے نوع انسانی مرکب ہے۔

(ب) سلطنت میں اعضا ہیں جن کے خاص وظائف ہیں

(ب) نظامِ سلطنت میں سیاسی جسم کے اعضا کی ترکیب و ترتیب بھی رونما ہوتی ہے۔ ہر عہدہ اور ہر سیاسی مجلس اُسی جسم کا ایک مختص عضو ہے جو ایک خاص کام کے لئے

مخصوص ہے عہدہ کسی کل کے ایک ٹکڑے کے مثل نہیں ہے اُسے خالص اوزاری کام کرنے نہیں ہوتے جو ہمیشہ ایک ہی سے ہوتے ہیں جس طرح کسی کل کے پہیے اور پھرکیاں ہمیشہ ایک ہی کام کو ایک ہی طریقے سے انجام دیتی رہتی ہیں عہدے کے کار منصبی ذہنی (یا روحانی) نوعیت رکھتے ہیں اور عام زندگی کی ضروریات کے لحاظ سے جن کو پورا کرنا اُن کا فرض ہے۔ خاص مواقع پر ان میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ زندوں کی خدمت کرتے اور خود بھی زندگی رکھتے ہیں پس جب کوئی عہدہ اپنے جوہر حیات کو کھو کر لا یعقل ظاہریت کی پستی میں جا پڑتا اور ایک کل کے مانند بن جاتا ہے جو بغیر کسی پیمانے کے اور خاص حالات پر یا مرور زمانہ سے بدلی ہوئی کیفیات پر لحاظ کئے بغیر اپنی معین عادت کے مطابق اور اُسی اوزاری روش سے برابر اپنا کام کئے چلی جاتی ہے تو اس حد کو پہنچکر خود وہ عہدہ ہی تباہ ہو جاتا ہے اور مشین بن جانے کی وجہ سے خود سلطنت پر انجام کار زوال آجاتا ہے۔

عہدے کی روح

نہ صرف وہ شخص جو کسی عہدے پر ہے بلکہ خود عہدے میں بھی ایک طرح کی نفسی اہمیت اور ایک ذی حیات روحی اصول ہوتا ہے گویا کوئی روح اسے زندہ رکھتی ہے۔ عہدے کی ایک خصوصیت اور اس کی ایک روح ہوتی ہے جو اپنی باری میں اُس شخص پر اثر ڈالتی ہے جو اس عہدے پر کام کرتا ہے۔ رومیوں میں جب ایک معمولی شخص بھی کونسل کے بلند اور با اقتدار عہدے پر ممتاز ہو جاتا تھا تو اپنے عہدے کی عظمت اور اقتدار و قوت کی وجہ سے اُس شخص کا اخلاق بلند ہو جاتا تھا اور اس کی طبعی طاقت بڑھ جاتی تھی۔ میر عدل (یعنی جج) کا عہدہ ایسا محترم ہے اور انصاف گستری نے اُسے ایسا مقدس بنا دیا ہے کہ ایک نہایت کمزور شخص بھی جب اس عہدے پر مقرر ہو جاتا ہے تو حق کے قائم رکھنے کے لئے اس کا دل شریفانہ خیالات سے لبریز اور اس کا استقلال بلند ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عہدے کی روح عہدہ دار کی طبیعت کو نہیں بدل سکتی، وہ اس قدر قوی نہیں ہوتی کہ انسان کی خصلت پر اس طرح چھا جائے کہ ہمیشہ شخص کو جس کا تقرر کیا جائے عہدے کا پورا اہل بنا دے تاہم عہدہ دار اپنی طبیعت اور مذاق پر ایک غیر مرئی اثر محسوس کرتا ہے اور اگر اس کا دل اثر پذیر ہے تو ممکن نہیں کہ وہ یہ اثر محسوس نہ کرے کہ خود اُس کے عہدے میں ایک روح ہے جسے فی الحال اُس کی شخصیت سے گہرا اور قریبی تعلق پیدا ہو گیا ہے مگر جو اس کی ذات سے مختلف اور زیادہ دیرپا ہے۔

(ج) سلطنت میں نمو اور بالیدگی ہوتی ہے۔

ج۔ قومیں اور سلطنتیں نمو کرتی ہیں اور انکی بالیدگی خاص قسم کی ہوتی ہے۔ قومی اور سیاسی تاریخ کے دوروں کا شمار ان طویل المدت قرنوں سے ہوتا ہے جو منفرد اشخاص کی عمروں سے بہت بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، آخر الذکر کو برس اور برس کی دہائیوں سے ظاہر کرسکتے ہیں اول الذکر صدیوں سے متجاوز ہوتا ہے۔ پھر ہر دور اپنے مخصوص شمائل رکھتا ہے اور یہ قوم و سلطنت کی جامع تاریخ میں وہ سب یک جا دکھائی دیتے ہیں۔ قوموں کا بچپن، ان کے زمانۂ بلوغ سے بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے اور ہر مدبر مجبور ہے کہ سلطنت، زندگی کے جن زمانی مدارج پر ہو اُن کا لحاظ رکھے۔ اس امر میں بھی وہی مقولہ حکمت صادق آتا ہے کہ "ہر چیز کے لئے ایک وقت ہے"۔

پھر بھی سلطنت محض فطری نشو ونما پائی ہوئی چیز نہیں ہے۔

سلطنت کو جہاں عضوی موجوداتِ فطری کے ساتھ نشو ونما میں مشابہت ہے وہاں اُن دونوں میں ایک اہم فرق بھی ہے وہ یہ کہ نباتات، حیوانات اور انسان کی زندگی تعبا قاعدگی کے ساتھ نمو اور انحطاط کے مختلف دوروں اور درجوں کو طے کرتی ہے مگر سلطنتوں اور سیاسی تنظیموں کا نمو ہمیشہ ایسا معین و مشخص نہیں ہوتا۔ انسانی آزادی یا بیرونی سوانح کے اثروں سے نمو کی یہ رفتار اکثر دوسری راہیں اختیار کرلیتی ہے اور کبھی یکایک معمولی طبعی مدارج میں خلل پڑ جاتا ہے یا اُس کی صورت بالکل بدل جاتی ہے۔ یہ صورت جیسے جلیل القدر و قوی افراد یا خود قوم کے زبردست جذبات کی طرف سے پیش آتی ہے ویسا ہی اُس کا اثر بھی پڑتا ہے لیکن یہ کجراہیاں نہ تو تعداد میں اتنی زیادہ اور نہ عموماً ایسی اہم ہیں کہ عام قاعدے کو کمزور کردیں بلکہ اُن کا وقوع بہت نادر ہے اور عام طور پر وہ اس سے بہت ہلکی ہوتی ہیں جتنا وہ لوگ گمان کرتے ہیں جن کی رائیں ہمعصر واقعات کے فوری اثرات سے قائم ہوتی ہیں لیکن پھر بھی ان میں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی وزن ہوتا ہے کہ سلطنت کے محض ایک فطری عضویہ ہونے کا خیال یک طرفہ اور ناقابل اطمینان ہے اور یہ کہ اس معاملے میں بھی ہمیں افراد کے آزادانہ عمل کی پوری وسعت کار کو تسلیم کرنا چاہیئے۔

(د) سلطنت ایک اخلاقی و روحانی عضویہ ہے۔

۶۔ تاریخ ہم پر جہاں سلطنت کی عضوی نوعیت کو ظاہر کرتی ہے وہاں وہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سلطنت، نباتات و حیوانات کے جیسے ادنیٰ ذی حیاتوں کی ہم سطح نہیں ہے بلکہ اُن سے ایک بلند تر درجے کی چیز ہے۔ تاریخ ہی سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت ایک اخلاقی و روحانی عضویہ ہے، وہ ایک عظیم جسم ہے جو قوم کے حسیات و خیالات کو اپنے اندر جمع کرسکتا ان کو قوانین کی صورت میں ظاہر کرسکتا اور عملاً ان سے کام لے سکتا ہے۔ (تاریخ ہی کے ذریعے سے ہمیں ہر سلطنت کے

اخلاقی صفات اور اُس کی حقیقت سے اطلاع حاصل ہوتی ہے اور تاریخ ہی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سلطنت ایک ایسی شخصیت ہے جس میں روح اور جسم ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ اپنا ایک ارادہ رکھتی اور اسے ظاہر کرتی ہے۔

سلطنت کی عزت وشوکت کے خیال نے ہمیشہ اس کے فرزندوں کے دلوں کو ملتہب کیا اور انھیں ایثار اور جاں بازی کے لئے جوش دلایا ہے سلطنت کی آزادی وخودمختاری اور اس کے حقوق کے لئے ہر زمانے اور ہر قوم میں شریف ترین اور بہترین افراد نے اپنا مال اور اپنی جان قربان کردی ہے اس امر پر ساری دنیا کا اتفاق ہے کہ سلطنت کے وقار اور قوت کو بڑھانا اور اُس کی خوشحالی اور اقبال مندی کو ترقی دینا نوع بشر اشخاص کے معزز ترین فرائض میں داخل ہے۔ سلطنت کی خوشی اور رنج میں تمام اہلِ ملک ہمیشہ شریک رہے ہیں۔ اگر سلطنت میں یہ اعلیٰ اخلاق اور شخصی صفت نہ ہو تو وطن کا اعلیٰ خیال اور وطن کی محبّت سب کالعدم ہو جائے گی۔

سلطنت کی شخصیت کا تسلیم کرنا قانون عامہ کے لئے بھی ویسا ہی لابد ولازمی ہے جیسا بین الاقوامی قانون کے لئے ہے۔

(حاشیہ: سلطنت کی ایک شخصیت ہے۔)

قانون کی اصطلاح میں شخص اُسے کہتے ہیں جس کی طرف کوئی قانونی ارادہ منسوب کیا جاسکے اور جو حقوق کو حاصل کرسکے، پیدا کرسکے اور ان پر قابض رہ سکے۔ قانون عامہ میں یہ تصور ویسا ہی معنی خیز ہے جیسا قانون شخصی میں، قانونِ عامہ کے مفہوم میں سلطنت بہمہ وجوہ ایک شخصیت ہے سلطنت کا سارا دستور اس طرح ترکیب پاتا ہے کہ سلطنت کی شخصیت اپنے ارادے میں جو ہم آہنگی پیدا کرکے اس پر عمل پیرا ہوسکے تمام افراد کے انفرادی ارادے سے مختلف ارادوں کے مجموعے سے بھی مختلف ہے۔

البتہ سلطنت کی شخصیت کو صرف آزاد قوموں نے تسلیم کیا ہے اور صرف متمدّن قومی سلطنتوں میں اُس نے پوری قوت حاصل کی ہے۔ سیاسیات کے زیادہ قدیم مدارج میں صرف حکمراں کی ہستی نمایاں ہوتی ہے۔ شخص صرف وہی ہے اور سلطنت اُسی کی ذاتی حکومت کا میدان ہے ہے۔ موجودہ زمانے کی سلطنت کی مردانہ خصوصیت کا بھی یہی حال ہے کہ یہ خصوصیت سب سے اول کلیسا کی زنانہ خصوصیت کے مقابلے میں نمایاں ہوئی۔ ایک مذہبی جماعت میں سیاسی جماعت کے تمام صفات ہوسکتے ہیں مگر سلطنت ہونے کی خواہش اس میں نہیں ہوسکتی

(حاشیہ: سلطنت مذکر ہے)

اور وہ سلطنت سے بھی نہیں محض اس وجہ سے کہ وہ مثل ایک انسان کے اپنے اوپر بالارادہ حکومت نہیں کرتی اور نہ اپنی بیرونی زندگی میں آزادانہ عمل کرتی ہے بلکہ وہ صرف خدا کی عبادت کرنا اور اپنے مذہبی فرائض کو بجا لانا چاہتی ہے اس تاریخی غور اور مشاہدے کے نتیجے کو یکجا کیجئے تو سلطنت کا عام تصور اس طرح پر معین کیا جاسکتا ہے کہ سلطنت انسانوں کے اُس مجموعے کو کہتے ہیں جو ایک معیّن رقبے میں حکومت اور محکوم کی شکل میں ہو اور وہ لوگ ایک اخلاقی اور عضوی مردانہ شخصیت میں باہم متفق ہوگئے ہوں یا زیادہ مختصر یوں کہئے کہ کسی خاص ملک کی سیاسی طور پر تنظیم پائی ہوئی قومی شخصیت کو سلطنت کہتے ہیں۔

سلطنت کے مختلف نام۔

فائدہ (۱) اس امر پر نظر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مختلف قوموں نے سلطنت کے نام کس طرح رکھے ہیں یونانی ہمیشہ شہر اور سلطنت کو ایک ہی لفظ پولیس (πόλις) سے ظاہر کرتے تھے۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ اُن کا تصور سلطنت شہر پر مبنی اور شہر ہی کے نقطہ نظر کے باعث محدود بھی تھا۔ اسی طرح رومیوں کا لفظ کیوٹاس (Civitas) اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک شہر کے حقوق شہریت ہی سلطنت کا مغز ہیں، مگر بہ نسبت یونانی لفظ کے اس میں وصفِ شخصی زیادہ ہے اس لئے یہ لفظ قوم کی زیادہ وسیع جماعتوں پر حاوی ہونے کے لئے یونانی لفظ سے زیادہ موزوں ہے۔ اس امر سے سلطنت کے علاوہ مرتبت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ لفظ تمدّن Civilization سلطنت کے نام سے ماخوذ ہے اور عملاً سلطنت کی وسعت و انتفاع کے مرادف ہے ایک خاص لحاظ سے دوسرا رومی نام ریس پبلکا (Res publica) اور بھی زیادہ بلند ہے کیونکہ اُس سے نہ صرف شہریت کی طرف اشارہ ہوتا ہے بلکہ وہ ریس پوپلی Res populi ایک قوم اور اس قوم کے فوائد پر نظر رکھنے کی طرف اشارہ کرتا ہے قدماء کے مفہوم میں لفظ جمہوریہ (ریپبلک) سے شاہی خارج نہیں ہے البتہ خود مختارانہ حکومتوں پر یہ لفظ عائد نہیں ہوتا (اس کے مقابلے میں انگریزی کے لفظ دولت عامہ Common wealth پر غور کرنا چاہئے۔

جدید زبانوں میں سے نہ صرف رومانی ہی زبانوں میں بلکہ جرمانی زبانوں میں بھی اسٹیٹ (State) کا لفظ (Stato, etat, Stat) عام طور پر شائع ہے

---

[1] واضح ہو کہ "رومانی" (Romance) (یعنی جدید لاطینی) قوموں کے لئے استعمال ہونا چاہئے۔ پس (Roman) کے لئے "رومی" ہی کو قائم رکھنا درست ہوگا ہے ع ۔ ح

بجائے خود بالکل غیر معین ہونے کے باوجود امتداد زمانہ سے یہ اصطلاح بہت ہی عالمگیر ہوگئی اس میں اب نہ توکسی قسم کا ابہام ہے اور نہ وہ کسی طرح کی تعریف کی محتاج ہے (گو کہ ابتداءً اس لفظ سے محض "حالت" کا اظہار ہوتا تھا اور سلطنت کا پورا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے "حالت امور عامہ" (Status Reipublicae) کے مرکب کلمے کی ضرورت ہوتی تھی اگرچہ اسٹیٹ (سلطنت) کے لفظ کا نہایت نمایاں مفہوم ایک وہ چیز ہے جو "قائم" یا "مستقل" ہے لیکن لفظ و معنی کا یہ واسطہ بھی اب پس پشت پڑ گیا ہے اور اس لفظ (سلطنت State) سے نہ صرف موجودالوقت انتظام و نظام حکومت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ خود وہ سلطنت مراد ہوتی ہے جو حکومت کی شکل کی کامل تبدیلی کے بعد بھی قائم رہ سکتی ہے۔ اس مفہوم کے اظہار کے لئے زمانۂ جدید میں جو دوسرے الفاظ اختیار کئے گئے ہیں ان سب کا اطلاق محدود ہے مثلاً ایک پُر فخر لفظ رائش (Reich) کا ہے اس کا اطلاق صرف ان بڑی بڑی سلطنتوں پر ہوتا ہے جو شاہی تنظیم کے تحت میں ہوں اور اسی طرح اس سے ایسے متعدد ممالک کے اجتماع باہمی کا خیال بھی ذہن میں آتا ہے جو ایک دوسرے سے آزاد ہوں، یہی کیفیت لاطینی لفظ امپیریم (Imperium فرانسیسی و انگریزی امپائر Empire) شہنشاہی کی ہے جس میں ساتھ ساتھ قیصری حکمرانی کا اشارہ بھی موجود ہے۔ اس سے زیادہ محدود مفہوم لفظ ملک (Land ارض) کا ہے جس سے ابتداً سلطنت کے خارجی رقبے کا (اور ایسی سلطنت کا جو متفرق اجزاء میں منقسم نہ ہو) اظہار ہوتا ہے۔ مگر ثانیاً اس کا اطلاق خود اُس سلطنت پر بھی ہوتا ہے جو اس رقبے پر قابض ہوتی ہے۔ یہ لفظ یونانی لفظ پولس (πόλις) کی ایک طبعی ضد ہے کیونکہ اس میں سلطنت کی اولین بنا ملک (Landschaft) پر رکھی گئی ہے اور یونانی لفظ نے اس کی بنا شہر پر رکھی ہے۔ وطن (Fatherhand) کا دلاویز لفظ اور بھی محدود ہے کیونکہ اُس کا تعلق افراد سے ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُس میں اس وجہ سے بلندی اور روحانیت ہے کہ اُس کا اشارہ ملک کے ساتھ شخصی تعلق اور رشتۂ خون کے سلسلے کی طرف ہے۔ اس لفظ میں صفائی اور جوش کے ساتھ اُس تمام حب و شغف کا اظہار ہوا ہے جو اُس جلیل القدر و ذی حیات جماعت سے ہوتا ہے جس سے اسے تعلق ہے جس کی ہستی کے ساتھ خود اس کی ہستی وابستہ ہے اور جس کے لئے اپنے کو نثار کر دینا انسان کے شرف و علو کی برترین مثال ہے۔

(۲) میں نے اپنی تصنیف Psychological Studies on State and Church میں سلطنت کی مردانہ خصوصیت پر زیادہ تفصیل سے بحث کی ہے۔ فرانسیسی کے اس فقرے سے (L'etat c'est l'homme سلطنت انسان ہے) صرف یہی مراد نہیں ہے کہ "سلطنت ایک عام انسان ہے" بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح کلیسا عام زنانہ صفت یعنی بیوی کی حیثیت رکھتا ہے اُسی طرح "سلطنت مرد یا میاں" کے مفہوم کو پورا کرتی ہے۔ (یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ جرمانی زبان میں لفظ سلطنت (Stat) مذکر ہے اور لفظ کلیسا (Kirche) مونث ہے)

باب دوسرا

سلطنت کا انسانی تخیل — عالمگیر شاہنشاہی

سوال یہ ہے کہ کیا سلطنت کا ایک ایسا تصور جو مختلف قائم شدہ سلطنتوں پر غور کرنے سے حاصل ہوا ہو انسانی تخیل کے لئے کافی ہو سکتا ہے؟ تاریخی طریق صرف اس بات کے مان لینے پر قانع ہے کہ سلطنت، قوم کا کالبد ہے اور سلطنت کی بنا قوم کی فطرت اور اُس کی ضروریات پر ہوتی ہے۔ پس سلطنت اُسی قوم تک محدود ہے۔

عام فطرت انسانی ایک عالمگیر سلطنت کی ضرورت کی متقاضی ہے۔

لیکن فلسفے کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اور زیادہ تعمق نظر سے کام لیں۔ انسانی فطرت میں ہمیں بقائے سیاسی کا میلان اور اُس کی احتیاج محسوس ہوتی ہے۔ ارسطو مدتوں قبل اس معنی خیز صداقت کا اظہار کر چکا ہے کہ "انسان فطرتاً ایک سیاسی حیوان ہے"۔ یہ کوئی قومی خصوصیت نہیں ہے جو انسان کو حصول سلطنت پر آمادہ کرتی اور اس کے قابل بناتی ہے بلکہ یہ ایک عام انسانی فطرت ہے۔ اس کے علاوہ مختلف سلطنتوں کے عضویے کی پرتال سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف و متباین قوموں میں ایک ہی سے اہم اعضا ایک ہی طرح پر پائے جاتے ہیں، ہر جگہ ایک ہی سی عام طبیعت انسانی کا مشاہدہ ہوتا ہے جس کے مقابلے میں مختلف قومی شکلیں ایسی دکھائی دیتی ہیں کہ یہ ادنیٰ تغیر ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں ہیں۔ سب سے آخری بات یہ ہے کہ خود قوم ہی کا تصور قطعی اور مسلّم نہیں ہے۔ اس سے بجائے خود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ایسے بلند تر انسانی اتحاد کی ضرورت ہے جس میں اقوام محض اعضا و ارکان کی حیثیت رکھتی ہوں پس کیونکر ہو سکتا ہے کہ بلالحاظ اس اعلیٰ اتحاد کے سلطنت کی بنا قوم پر قائم کی جائے اور اگر یہ سچ ہے کہ انسان ایک جنس واحد ہے اور ایک عام روح اس میں دائر و سائر ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے اس جوہر حقیقی کو ایک مجسم شکل میں لانے کی کوشش سے باز رہے یعنی ایک سلطنت نہ بن جائے۔

اس لحاظ سے نہ کی قومی سلطنتوں کی واقعیت اور اہمیت صرف ایک نسبتی چیز

رہ جاتی ہے۔ ایسی سلطنتوں میں ایک فلسفی کو سلطنت کے اعلیٰ ترین تخیل کا روبکار آنا محسوس نہیں ہوتا۔ اُس کے نزدیک سلطنت ایک انسانی عضویہ بلکہ ایک انسانی شخص ہے اور جب ایسا ہے تو جو انسانی روح اُس میں موجود ہے اُسے ایک انسانی جسم بھی ملنا چاہیئے کیونکہ روح اور جسم ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور باہم ملکر شخص بنتے ہیں درحقیقت ایک ایسے جسم میں جس کی عضویت انسانی نہ ہو، روح انسانی صحیح معنوں میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے سلطنت کے جسم کی تعمیر انسان کے جسم کے نمونے پر ہونا لازمی ہے پس مکمل سلطنت انسانیت کے جسم حربی کے مماثل ہے عالمگیر سلطنت یا عالمگیر شاہنشاہی انسانی ترقی کا منتہائے خیال ہے۔

ایک اکیلا انسان اپنی انفرادی حیثیت میں اور نوع انسانی اپنی مجموعی حیثیت میں تخلیق عالم کی دو ایسی ضدیں ہیں جو ابتدا سے چلی آئی ہیں اور یوں ہی قائم رہنے والی ہیں شخصی قانون اور عام قانون کا فرق بالآخر انہیں دونوں پر مبنی ہے یہ سچ ہے کہ نوع انسان میں یکجہتی کا احساس ابھی محض ایک خواب پریشاں ہے نہ وہ ابھی پوری طرح بیدار ہوا ہے اور نہ ابھی اس نے اتحاد آزادی کی صورت اختیار کی ہے۔ اس لئے نوع انسان ابھی اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ وہ اپنے عضوی وجود کو مکمل کرسکتی۔ عالمگیر سلطنت کے حصول کے لئے ابھی صدیاں درکار ہیں۔ لیکن دنیا کی تمام قوموں کا ایک اس قسم کا جتھا قائم ہو جانے کی تمنا دنیا کی تاریخ ماسبق میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہی ہے۔ مہذب یورپ پہلے ہی سے اس بلند مقصد کی طرف اپنی نظر زیادہ مضبوطی کے ساتھ جما چکا ہے۔

گذشتہ زمانے میں اس عالمگیر سلطنت کے حصول کی کوششیں

یہ سچ ہے کہ ازمنۂ تاریخی میں عالمگیر سلطنت کے حصول کی تمام کوششیں آخر میں ناکامیاب ہوئیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ مقصد ناقابل حصول ہے عالمگیر سلطنت کا خیال عالمگیر مذہب کے خیال کے مماثل ہے۔ مذہب عیسوی اس امید میں سرخوش ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ساری دنیا کو اپنے حلقے میں داخل کرلے گا اور اگرچہ یہ امید ابھی تک پوری نہیں ہوئی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا پورا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ جس طرح مذہب عیسوی اس یقین سے دست بردار نہیں ہوسکتا کہ وہ (دنیا کا) واحد مذہب ہوکر رہے گا۔ اسی طرح انسانی سیاسیات تمام بنی نوع انسان کو ایک نظام میں لانے کی کوشش سے باز نہیں رہ سکتی۔ اگر بے تعصبی کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو وہ خود صاف صاف اس راستہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو منزل مقصود کو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی

ہمیں اُن غلط راستوں سے متنبہ بھی کرتی ہے جن میں عالمگیر سلطنت کے قبل از وقت حصول کے دیوانہ دار جوش میں ماہرین سیاسیات تک بھٹک گئے ہیں۔ جب سے پہلی بار ایک عام سلطنت کا انسانی احساس یورپ میں پیدا ہوا ہے اس وقت سے ہر زمانے میں اپنے اپنے طریقے پر اُس کے لئے کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

۱۔ سکندر اعظم کی شاہنشاہی

اول۔ سکندر اعظم۔ مقام لوسا (ایران) میں سو جوڑوں کی تقریب شادی کے موقع پر سکندر نے اپنے خیال سے دنیا کو اشارۃً آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ یونانیوں کے مردانہ جوش کا عقد ایشیائیوں کی زنانہ حسیتی و نزاکت سے کرنا چاہتا ہے۔ مقصود یہ تھا کہ مشرق اور مغرب باہم متحد و مخلوط ہو جائیں اور اس جام محبّت کے سرمستوں کے اختلاط باہمی سے ایک نئی نوع انسانی پیدا ہو جو ایک عظیم الشان ربانی و انسانی شاہنشاہی کے حصول سے اپنا اطمینان حاصل کرے۔ بہر حال اس طور پر آنے والی صدیوں کی تہذیب و تعلیم کے لئے سکندر نے ایک روش مقرر کر دی اور ایشیا کی نئی سرزمین میں یونانی تہذیب کے تخم نے خوب ہی سرسبزی و شادابی حاصل کی مگر دنیا کی ایک سلطنت قائم کرنے کی یہ پہلی شاندار کوشش کچھ دیرپا ثابت نہیں ہوئی اور سکندر کی موت سے مایوسانہ طور پر تباہ ہوگئی، مگر اس تباہی کا باعث صرف فلک کج رفتاری کو قرار دینا درست نہ ہوگا جس نے اس نئی عالمگیر سلطنت کے بانی کو یکساں انتظامات قائم کرنے اور آئندہ کے لئے سامان مہیا کرنے کے قبل ہی عین عنفوان شباب میں جام مفارقت پلا دیا بلکہ متضاد اجزا کا اختلاط بجائے خود ایک غیر فطری چیز تھا اور جو خیال اس تدبیر کا محرّک ہوا وہ خود ہی دھندلا تھا۔ اس امتزاج سے سیاسی خیالات پریشان ہو گئے۔ ادھر یونانی، سلطنت کو آزادانہ طور پر انسان کی بنائی ہوئی شے سمجھتے تھے، اُدھر ایرانی حکومت کو آسمانی منصب جانتے تھے۔ ان دونوں میں اتحاد نہیں ہو سکتا تھا یہ نہیں ممکن تھا کہ مقدونیہ کی شاہی ایک ایشیائی مذہبی سلطنت بھی بن جاتی۔ ایشیائی تو یہ یقین کرنے کو آمادہ تھے کہ سکندر برترین خدا کا فرزند ہے مگر خود یورپ والے اس کو الوہیت کا اعزاز دینے کے خیال تک سے متنفض ہوتے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ نسلیں گڑبڑ ہو گئیں۔ یونان کے علوم و تہذیب نے ایشیائیوں کو مذہبی اور سیاسی قیود کی پابندیوں سے تو آزاد کر دیا مگر اس کا اثر زیادہ تر یہ ہوا کہ

قدیم نظام ٹوٹ پھوٹ گیا اور اُس کی جگہ پر کوئی نیا نظام وجود میں نہ آیا انسان کو اوصاف الوہیت سے متصف کر دینے سے قدیم دیوتاؤں کی عظمت جاتی رہی تھی۔ یورپی تہذیب بے باکانہ عیاشی کی صورت میں مبدل ہوگئی اور مشرق کی پستی کے تکمیل کر دینے میں اور معاون بن گئی۔

۲۔ رومی شہنشاہی

عالمگیر مملکت حاصل کرنے میں اہل روما کے مساعی نے زیادہ دیرپا نتیجہ پیدا کیا، رومن شہنشاہی ایک عالمگیر شہنشاہی تھی۔ تمام رومن قوم یہ سمجھتی تھی کہ تمام روئے زمین پر اپنے خیال سلطنت کے پھیلانے اور تمام قوموں کو رومن اقتدار کے تحت میں لانے کے لئے وہ مبعوث ہوئی ہے۔ اہل روما کی طبیعت کی مردانگی اور ان کی قوت بازو نے انھیں ان متعدد اقوام پر غالب کر دیا جنھوں نے روما کی فاتحانہ رفتار کے مقابلے کی جرأت کی تھی اور قلیل ہی مدت میں اپنی کوہ وقار قانونی تنظیم کے ساتھ روما کی سلطنت تین براعظموں میں مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگئی۔ اہل روما کا عظیم ترین شخص قیصر جولیس شاہنشاہی کا خیال اپنے اخلاف کے لئے ورثے میں چھوڑ گیا، اور اس خیال میں اس نے ایسی قوت مہیا کر دی جس نے قومی حدود سے گزر کر دنیا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

اہل روما کی کوشش پر بھی عالمگیر تاریخ کی عدالت میں محاکمہ ہو چکا ہے۔ یہ کوشش سکندر کی کوشش کی طرح قوموں کے اختلاط پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد ایک قوم واحد کی اعلیٰ فطرت پر تھی جس نے یہ چاہا کہ اپنا قومی اخلاق تمام نوع انسان میں پھیلا دے یعنی تمام دنیا کو رومی بنا دے۔ یہی اس کا گناہ تھا۔ کوئی قوم ایسی جلیل القدر نہیں ہوسکتی کہ تمام نوع انسان کا احاطہ کرنے اور دوسری قوموں کو اپنی آغوش میں فنا کر دے۔ روما کی عالمگیر سلطنت ٹیوٹن قوم کے تازہ جوش جوانی سے ٹکرا کر تباہ ہوگئی۔ وہ جرمانیوں کو فتح نہ کر سکی اور صدیوں کے جدال و قتال کے بعد جرمانیوں ہی نے اسے پامال کر دیا۔

۳۔ مقدس رومن شاہنشاہی

اس کے بعد پھر کبھی عالمگیر سلطنت کا خیال سیاسی مطلع پر ایسی شان و شوکت کے ساتھ طلوع نہیں ہوا مگر کبھی تمام غروب بھی نہیں ہوا از منۂ متوسط میں لاطینی رومانی اور ٹیوٹنی اجزا کے ارتباط باہمی کے ساتھ اسے اپنے طور پر حاصل کرنے کی پھر کوشش کی گئی۔ اول فرنک کی شاہی کے ذریعے سے، بعد ازاں رومن جرمانی شاہنشاہی کے ذریعے سے، یہ سچ ہے کہ انھوں نے زیادہ معتدل حد کے اندر کوشش کی مگر اس سے بھی حصول صداقت میں اہم ترقی ہوئے بغیر نہیں رہی، اب یہ خیال نہیں رہا تھا ایک اعلیٰ اور مطلق اقتدار ہو جو قوم کی تمام زندگی پر یکساں حکومت کرتا ہو۔

اس اثنا میں عیسائیت نے سلطنت و مذہب کے سخت تخالف کو ظاہر کر دیا تھا۔ یہ تخالف انسان کے لئے نتائج سے بھرا ہوا تھا۔ سلطنت اپنے اس حق سے دست کش ہو گئی تھی کہ وہ لوگوں کے ایمان و ایقان پر اپنے قوانین کے ذریعہ سے حکومت کرے، اس نے اس امر کو تسلیم کر لیا تھا کہ اس کے سوا ایک مذہبی جماعت بھی ہے جو زندگی کے خاص اصول رکھتی ہے اور جو خود سلطنت ہی کی طرح (مگر اس سے مختلف) ایک مرئی جسم بھی رکھتی ہے اور حقیقتاً آزاد ہے۔ یہ ایک ایسی روک تھی جو سلطنت کو علی الاطلاق تسلط کے عمل میں لانے سے باز رکھتی تھی۔ وہ مجبور تھی کہ مذہبی زندگی کو کلیسا کی رہبری میں دیدے۔ درحقیقت سلطنت نے کلیسا کے ساتھ اپنے تعلق کو کبھی بھی پوری وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھا مگر مذہبی اعتقاد کی آزادی اور خدا کی عظمت دنیادی حکمراں کی بے لگام مرضی سے محفوظ رہی عیسائیت کی قوت کا انحصار دنیاوی حکمران پر نہیں تھا۔

علاوہ ازیں عیسوی عالمگیر سلطنت کا مقصود یہ نہیں تھا کہ وہ مختلف قوموں کو ہضم کر جائے یا انھیں معدوم کر دے بلکہ وہ ان سب کو امن اور انصاف کا اطمینان دلانا چاہتی تھی۔ ازمنۂ متوسط کا رومن شاہنشاہ تمام قوموں کا "حاکم علی الاطلاق" نہیں تھا بلکہ وہ ان کے حقوق اور ان کی آزادی کا ایک عادل محافظ تھا۔ اس طرح شاہنشاہیت کا خیال پاک وصاف ہو کر فریڈرک ثانی جیسے مدبر اور ڈانٹے جیسے صاحب فکر کی معنی آفرینیوں کی جولانگاہ بن گیا۔ ازمنۂ متوسط کی شاہنشاہی حقیقی آزاد سلطنتوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی، جو درحقیقت ایک عام نظم میں متحد اور عرفاً شاہنشاہ کے ماتحت تھیں، مگر اپنے تمام اہم امور میں آزاد اور اپنی ہی مرضی پر چلنے والی تھیں یہاں تک کہ (ایک ہی سلطنت کے اندر) متبائن قوموں اور نسلوں کو بھی مراعات و محافظت حاصل تھی مگر جو امر فی نفسہ عالمگیر سلطنت کی نشو و نما میں ترقی کا باعث تھا وہی اس کی خرابی کا بھی سبب ہو گیا کیونکہ زائد از ضرورت یکطرفہ طور پر اس کی پیروی کی جانے لگی۔ افتراق کا میلان اتحاد کی اہمیت سے زیادہ قوی تھا۔ قومیتوں کے تبائن اور زبانوں کے اختلاف نے فرانس اور جرمانیا کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا اور فرنک کی عالمگیر پادشاہی کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ جرمانی بادشاہ اور رومن شاہنشاہ کی کمزور طاقت چھوٹے چھوٹے حکمرانوں اور مقامی امرا کے قیام کا مقابلہ نہ کر سکی۔ مرکزی تنظیم کی کوئی مرکزی بنیاد نہیں تھی اور اسلئے

محیط قوتیں بہت زور پکڑ گئیں اور شاہنشاہی کے پرخچے اڑ گئے یہ کوشش دوبارہ ناکام ہوئی مگر آنے والی نسلوں کے لئے اہم سبق چھوڑتی گئی۔

نپولین اول کی شاہنشاہی

ہمارے زمانے (اُنیسویں صدی) میں شاہنشاہ نپولین اول نے ایکبار پھر ارادہ کیا کہ اس خیال کو جو ایک مدت سے فراموشی میں پڑا تھا پھر زندہ کرے اُس نے ازمنۂ وسطیٰ کی غلطی سے بچ کر کامل احتیاط کے ساتھ ایک مضبوط کارکن مرکزی طاقت قائم کی مگر جو سچی ترقیاں ازمنۂ وسطیٰ میں ہوچکی تھیں اُن کو قائم رکھنے کی طرف اُس نے کافی توجہ نہیں کی۔ غیر قومیتوں کا اُس نے بہت ہی کم لحاظ کیا اور اس طرح وہ اُسی راستے پر پڑ گیا جو اس کے قبل اہل روما نے اختیار کیا تھا گو کہ یہ ضرور ہے کہ اُس نے رومیوں کے بہ نسبت زیادہ اعتدال سے کام لیا۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ یورپ کو ایک وسیع بین الاقوامی سلطنت کے طور پر مرتب کرے، اور منفرد سلطنتیں اس کے اعضا و ارکان کی حیثیت سے ہوں۔ شاہنشاہی اقتدار فرانسیسی قوم کو حاصل ہو، جو قوموں کے اس بڑے خاندان میں بمنزلہ سرگروہ کے ہو۔ اس نے ایک پشت میں وہ بات حاصل کرنا چاہی جس کے لئے اہل روما نے صدیاں صرف کردی تھیں وہ اس منصوبے میں ناکام رہا مگر اس مرتبہ جرمانی قوم کی مقاومت کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا کیونکہ وہ تو بادلِ ناخواستہ فرانسیسی قومیت کو مان چکے تھے، مگر نپولین کے اس نظم و ترتیب کے متعلق ان کی اطاعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ خود بھی پرانی شاہنشاہی سے مایوس ہوگئے تھے اور اپنے آبائی ملک کی صورت حال سے بیزار تھے، صرف دو بڑی جرمانی سلطنتوں نے سہیم جنگ کے ذریعے فرانس کی قومیت کے مقابلے کی کوشش کی ایک ان میں سے حوصلہ مند پروشیا تھی اور دوسری کئی مختلف ملکوں اور قوموں کا مجموعہ آسٹریا وہ اپنی بقا کے لئے فکرمند تھی اور یہ اپنے آپ کو ایک شاہنشاہی سلطنت سمجھتی تھی مگر فائق مدبر اور سپہ سالار (یعنی نپولین) نے ان دونوں کو بھی مغلوب کرلیا لیکن انگریز جن کی قومی جبلت میں قدیم جرمانی (پائیوٹن) نسل کے خیالات آزادی کے ساتھ جن میں ایک جلیل القدر تاریخی احساس قومیت بھی شامل تھا ایک صعب دشمن ثابت ہوئے اور اُن کی مقاومت پر غالب آنے میں نپولین ناکام رہا۔ اُدھر روسی جو اُس وقت تک نیم وحشی تھے شکست کھا کر میدانوں کی طرف ہٹ گئے مگر مغلوب نہیں ہوئے جب متحدہ یورپ فرانس پر حملہ آور ہوا تو اس مصیبت کے وقت فرانسیسیوں نے کچھ استقامت نہیں دکھلائی

بس نپولین کا خیال بھی عملی صورت اختیار کرنے سے اُسی طرح ناکام رہا جیسے اس کے قبل رومی ناکام رہ چکے تھے اور اس ناکامی کے وجوہ و اسباب بھی وہی تھے۔ فرانسیسیوں کے سوا اور تمام قوموں نے اس عالمگیر بادشاہی سے خود کو خطرے میں سمجھا اور دنیا کی اس نئی حکومت کی طرف سے ان کو اعتماد و اطمینان بھی نہیں دلایا گیا اس کے ساتھ ہی فرانسیسی قوم میں اتنی قوت بھی نہیں تھی کہ وہ ہمیشہ انھیں محکوم رکھ سکتی۔

نوع انسان کے ایک مشترک انتظام کے میلان

لیکن اس اثنا میں خود زمانہ جس پر کسی کا قابو نہیں برابر اپنا کام کرتا جا رہا ہے وہ قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہا اور تمام نوع انسانی کے عالمگیر احساس کو پیدا کر رہا ہے اور عام انتظام عالم کے لئے یہ ایک فطری تیاری ہے یہ محض اتفاق ہی نہیں ہے کہ جدید تحقیقاتیں اور آمد و رفت اور رسل و رسائل کے بے شمار نئے ذرائع سب کے سب اس غرض کو پورا کر رہے ہیں اور جدید کے تمام علوم اس تحریک کے عقب میں چل رہے ہیں اور وہ خاصۃً تمام نوع انسانی کی ملک سمجھے جاتے ہیں اور صرف ضمنی طور پر کسی خاص قوم کے لئے مختص ہوتے ہیں، معہٰذا وہ متعدد روک اور حجاب جو مختلف قوموں کے درمیان حائل تھے اب رفع ہوتے جا رہے ہیں۔ آج بھی تمام یورپ یہ محسوس کرتا ہے کہ ہر خلل جو کسی خاص سلطنت میں پیدا ہوتا ہے اس کا نتیجہ کل یورپ کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور براعظم کے انتہائی حدود پر بھی جو کچھ پیش آتا ہے فوراً ہی اس سے عام دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، اس وقت بھی یورپ کا جوش طبیعت تمام کرۂ ارض کو اپنے حلقۂ اثر میں لا رہا ہے اور آریائی نسل یہ محسوس کرتی ہے کہ انتظام عالم کا فرض اس پر عائد کیا گیا ہے۔

ابھی ہم اس حد تک نہیں پہونچے ہیں مگر اس وقت بھی ارادے اور قوت کی اتنی کمی نہیں ہے جتنی روحانی پختگی کی کمی ہے، یوروپی خاندان اقوام کے ارکان دوسری قوموں پر اپنی فوقیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں مگر یہ ارکان خود اپنے آپس کے تعلقات اور اپنے ذاتی امور کو صاف اور واضح طور پر سمجھنے سے ابھی تک قاصر ہیں اُس وقت تک کسی قطعی نتیجے کا امکان نہیں ہے جب تک کہ علم کا نور افشاں لفظ اس امر خاص اور فطرت انسانی کی نسبت کوئی فیصلہ صادر نہ کر دے اور (دنیا کی) قومیں اُسے ماننے کے لئے تیار نہ ہوں۔

جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت تک عالمگیر شاہنشاہی صرف ایک خیالی شے رہے گی جس کے پیچھے بہت لوگ سرگرداں ہیں مگر جسے کوئی تکمیل کو نہ پہنچا سکا۔ لیکن اس

لحاظ سے کہ عالمگیر شاہنشاہی کا تخیل آئندہ زمانے میں پوری ہونے والی شئے ہے عام نظریۂ سلطنت اسے نظر انداز نہیں کرسکتا۔ صرف عالمگیر شاہنشاہی میں سچی انسانی سلطنت کا اظہار ہوگا اور اسی میں بین الاقوامی قانون ایک اعلیٰ شکل اور ایک متیقن ہستی حاصل کرے گا۔ عالمگیر شاہنشاہی کے ساتھ منفرد سلطنتوں کا تعلق ہے جیسا قوموں کا تعلق نوع انسان کے ساتھ منفرد سلطنتیں عالمگیر شاہنشاہی کے اعضا و جوارح ہیں اور انسانی اعضا کی طرح یہ اعضا بھی ایک جسم میں مرتب ہوکر ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوسکتے اور اپنے مدعا کو حسب دلخواہ حاصل کرسکتے ہیں عالمگیر شاہنشاہی کا مقصد منفرد سلطنتوں کو توڑ دینا اور قوموں کو دبا لینا نہیں ہے بلکہ سلطنتوں کے لئے امن اور قوموں کے لئے آزادی کا بہتر طریق پر حاصل کرنا اس کا مطمح نظر ہے۔ پس سلطنت کا بلند ترین تصور جو ابھی تک عملی صورت اختیار نہیں کرسکا ہے یہ ہے کہ سلطنت بنی نوع انسان کی ایک منتظمہ صورت ہے مگر مردانہ شکل و شمائل کے ساتھ نہ کہ زنانہ صورت میں، کیونکہ سلطنت مرد ہے۔

(۱) ونیٹ کے اعتراضات

تعلیقات:۔ (۱) وینیٹ (ساکن واڈ) جیسے ذی جوہر اور صداقت پسند شخص نے اپنی کتاب "انفرادیت و اجتماعیت"[ل] میں عالمگیر سلطنت کے خیال پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ نوع انسان کی تمام زندگی کو جذب کرلے گی شخصی آزادی کے اصول کو توڑ دے گی اور ایمان و ایقان اور علم پر ایک غیر مناسب حد تک دنیاوی حکومت قائم کردے گی یہ اعتراض ہمیں مجبور کرتا ہے کہ اس خیال کو زیادہ صحت کے ساتھ محدود کردیں۔

ان اعتراضات کے جوابات

سب سے اول یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سلطنت ہی واحد انسانی اجتماع نہیں ہے تجسیم انسانیت کی یہی ایک شکل نہیں ہے کلیسا بھی اپنی ظاہری و ارضی (دنیاوی) حالت کے اعتبار سے انسانیت کی ایک جماعت اور مجسم ہستی ہے، بہر صورت یہ مسلم ہے کہ سلطنت کی سیاسی حکومت، انسان کی مذہبی زندگی کو معین نہیں کرتی اور نہ انفرادی ضمیر اور عقیدے کی آزادی کو خطرے میں ڈالتی ہے۔

ثانیاً یہ کہ سلطنت کی انسانی نوعیت کے اعتبار سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ سلطنت افراد پر جزواً و کلاً حکمراں ہے، ہر فرد انسانی میں دو ممیز حیثیتیں پائی جاتی ہیں۔

ل Vinet In L Indinidualismeme et le Socialisme

ایک حیثیت انفرادی اور دوسری حیثیت مشترکہ انسانی کوئی فرد واحد بشمول دیگر افراد بتمامہ قوم یا زمین کی ملک نہیں ہے اور اس لئے وہ کلیتہً سلطنت کی مالک بھی نہیں ہے جو زمین پر زندہ جماعت ہے۔ سلطنت کی بنا فطرت انسانی پر ہے مگر نہ اس حد تک جو انواع و اقسام کے تغیرات کے ساتھ لاکھوں افراد میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس حد تک جس قدر کہ انسانیت کی مشترک فطرت ایک شخص پر ظاہر ہوتی ہے اور اس لئے سلطنت کا اختیار اس حد سے آگے نہیں بڑھتا جس قدر کہ مشترک اغراض و اجتماع انسانی کے لئے ضروری ہے۔ خود سلطنت جب غلطی سے انفرادی آزادی کے حدود میں مداخلت کر بیٹھتی ہے تو وہ اپنے حکم کی تعمیل کرانے کی قوت نہیں رکھتی کیونکہ وہ شخصی طبیعت کو پا بہ زنجیر نہیں کرسکتی یعنی شخصی روح کو ہلاک نہیں کرسکتی۔

لورین کے اعتراضات

بہت تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں کہ لورین (Laurent) نے بھی اپنی کتاب "تاریخ حقوق انسان" (Histoiredudrail desgens) میں اپنے کو عالمگیر سلطنت کے خیال کا مخالف ظاہر کیا ہے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

(الف) عالمگیر سلطنت ایک عالمگیر شاہی ہوگی اور یہ سلطنتوں کے اقتدار شاہی سے توافق نہیں پیدا کرسکے گی۔

(ب) افراد کی شخصیت فطری اور قوموں کی شخصیت مفروضہ میں فرق ہے اول الذکر ناقص ہیں اور خراب جذبات سے موثر ہوتے ہیں ثانی الذکر مکمل اور با اخلاق ہستی ہیں۔ اس غرض سے کہ اول الذکر باہمدگر زندگی بسر کرسکیں قوت سلطنت کی مسلسل مستعدی کی ضرورت ہے مگر ثانی الذکر کو باہمدگر زندگی بسر کرنے کیلئے اس آمادہ کاری کی ضرورت نہیں ہے اور ہے بھی تو بہت ہی مستثنیٰ صورتوں میں۔

(ج) فرداً فرداً ہر شخص کمزور ہے اور اسکے لئے قوت سلطنت کے تابع ہونا لازمی ہے سلطنتیں قوی ہیں اور اس لئے وہ کسی اعلیٰ طاقت کے سامنے سر نہیں جھکائیگی۔

(د) اگر عالمگیر سلطنت اتنی قوی ہوئی کہ وہ سلطنتوں کو ان کی مرضی کے خلاف مجبور کرسکے تو یہ فوقیت انصاف اور آزادی میں خلل انداز ہوگی کیونکہ جہاں مقاومت غیر ممکن ہوتی ہے آزادی باقی نہیں رہسکتی۔

(ہ) افراد کی ترقی کے لئے قومی سلطنت ضروری ہے اور اسکے لئے اتنا ہی

کافی بھی ہے، افراد کی بہبود کے لئے عالمگیر سلطنت کی ضرورت نہیں ہے اور قوموں کی ترقی کیلئے یہ عالمگیر سلطنت خطرناک ثابت ہوگی۔

میرے معزز دوست کے دلائل مجھے اپنا معتقد نہ بنا سکے ہیں ان کا جواب یہ دوں گا۔ کہ

(الف) عالمگیر سلطنت کا خیال شاہی سرکردگی یعنی شہنشاہی کی صورت میں بھی ذہن میں آسکتا ہے اور جمہوریت کی شکل میں بھی یہ جمہوریت خواہ ایک نظامت کے تحت میں قائم کی جائے (میں اس وقت صرف یورپ کے دول خمسہ کا خیال کر رہا ہوں) یا سلطنتوں کی شرکت یا اتحاد کی صورت میں ہو، کسی صورت میں بھی ہمیں اس عالمگیر سلطنت کے لئے اختیار مطلق کے خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور قومی سلطنتوں کا مسلسل قیام و بقا حدود و اختیارات میں تمیز کو خود لازمی کر دے گا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ عالمگیر سلطنت کے حدود و اختیارات کو دنیا کے مشترک معاملات یعنی دنیا کا امن قائم رکھنے، دنیا کی تجارت اور بالخصوص بین الاقوامی قوانین کے محفوظ رکھنے کے اغراض سے آگے بڑھائے اس کا نمونہ ایک متفقی سلطنت یا ایک متفقی شاہنشاہی میں مل سکتا ہے جس میں عام متفقی معاملات کا انصرام مشترک قانون، مشترک انتظام اور مشترک عدالت کے ذریعے سے ہوتا ہو، اور جو معاملات خاص اپنے اپنے ملک سے متعلق ہوں ان میں منفرد سلطنتوں کا اقتدار شاہی برابر تسلیم کیا جاتا ہو۔

(ب) مثل افراد کے قومیں بھی اپنی کمزوریاں اور اپنے جذبات رکھتی ہیں اور اگر بین الاقوامی قانون نہ ہوتا تو جو قومیں کمزور اور بے بس ہیں وہ بہت آسانی کے ساتھ طاقتور اور حریص قوموں کا شکار ہو جائیں، قانون بین الاقوامی کی بنا عالمگیر سلطنت کی بھی اصل بنیاد ہے۔

(ج) قومی سلطنتوں کی قوت عالمگیر سلطنت کے مقابلے میں بھی بہترین ضمانت اس امر کی ہے کہ ان پر کسی قسم کی تعدی نہ کر سکے گی لیکن عظیم ترین قومی سلطنت بھی اگر وہ غلطی پر ہے تو اس میں اتنی قوت نہ ہوگی کہ وہ تنہا تمام دنیا سے جنگ کر سکے، جنگ صرف اس وقت ممکن ہوگی جب سلطنتوں کے گروہ با مختلف فریق ایک دوسرے کے مخالف ہو جائیں ورنہ اور تمام صورتوں میں جنگ عالمگیر عدالتوں کے عدالتی فیصلوں کی تعمیل ہوگی۔ بہترین

سیاسی انتظامات بھی ہمیں تمام جنگوں سے کامل طور پر مامون نہیں کر سکتے اور اگر بین الاقوامی قانون کا ایک زیادہ مضبوط انتظام سلطنتوں کے درمیان جنگ کو کم کر دے تو ہمیں اسی پر قناعت کرنا چاہیے۔ انصاف کبھی اپنے منتہائے خیال پر نہیں پہنچ سکتا بس بہترین صورتوں میں صرف اس کے قریب تک پہنچ جاتا ہے۔

(د) عالمگیر شاہنشاہی قومی سلطنتوں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے کم طاقتور ہوگی اس لئے کہ جو اقتدار ایک قومی سلطنت کو اپنے اہل ملک کے مقابلے میں حاصل ہوتا ہے وہ قومی سلطنتوں کے مقابلے میں عالمگیر سلطنت کو کسی طرح حاصل ہی نہیں ہو سکتا اور باوجود قومی سلطنت کے اس اقتدار سے باشندگان ملک کی آزادی کو کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ سلطنت کے نظم و ترتیب کے ذریعے سے ہی ان کی اور حفاظت ہوتی ہے۔

(ہ) سلطنت تمام انفرادی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی، علوم و فنون ادبیات اور تجارت وغیرہ کے بہت سے ہمہ گیر روحانی اور مادی اغراض ایسے ہیں جو صرف ایک کامل عالمگیر سلطنت ہی سے کما حقہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ یورپ و امریکہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ہمارے وقت میں پوری پوری قوموں تک کے حقوق کس قدر کم محفوظ ہیں۔

یورپین بین الاقوامی قانون کی بنا نسل انسانی کے اتحاد پر قرار دیتا ہے اور کوئی دوسری بنا اس کے لیے ہو بھی نہیں سکتی مگر وہ اس اتحاد کو محض ایک اندرونی اتحاد سمجھتا ہے۔ میرے خیال میں منطق اور نفسیات دونوں یہ چاہتے ہیں کہ اندرونی قوت کو خود کو خارجاً بھی ضرور ظاہر کرنا چاہیے۔ اگر نوع انسان اندرونی طور پر واقعی ایک ہستی ہے تو اپنے پورے نمو کی حالت میں وہ اپنے کو خارجاً بھی مثل ایک شخص کے ظاہر کرے گی اور نوع انسان کی تنظیم ہی عالمگیر سلطنت ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میرے بہت سے ہمعصر اس خیال کو محض ایک خواب سمجھتے ہیں مگر اس وجہ سے میں اپنے اعتقاد کے اظہار اور اس کی حمایت سے باز نہیں رہ سکتا۔ آنیوالی نسلیں شاید اب سے صدیوں بعد اس سوال کا آخری فیصلہ کر سکیں گی۔

تیسرا باب

تخیل سلطنت کے نشو و نما کی تاریخ

(۱) دنیائے قدیم

الف یونانیوں کا تخیل سلطنت

صحیح معنوں میں علم السیاست کی ابتدا یونانیوں میں ہوئی جس طرح دیگر علوم و فنون اور فلسفہ کے متعلق انسان کی خود آگاہی کا اظہار اول اول یونان میں ہوا وہی کیفیت سیاسیات کی بھی رہی۔

یونانیوں کے سیاسی تخیلات

یونانی سلطنت کے حدود ارضی جس درجہ مختصر تھے اور اس کی طاقت جس درجہ محدود تھی وہ ظاہر ہے مگر وہ اصول جن پر یونانیوں کے سیاسی تصورات مبنی تھے، نہایت وسیع اور جامع تھے اور یہ یونان کے اصحاب فکر نے جس سیاسی تخیل کا اظہار کیا ہے وہ ایک بلند رتبہ اور شریفانہ تخیل ہے۔ وہ سلطنت کی بنا کو فطرت انسانی پر قائم کرتے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف سلطنت ہی میں انسان تکمیل کو پہنچ سکتا اور حقیقی طمانیت حاصل کر سکتا ہے ان کے نزدیک سلطنت ہی دنیا کا وہ اخلاقی نظام ہے جس سے فطرت انسانی اپنی غرض کو پورا کرتی ہے۔

افلاطون

افلاطون نے اپنی کتاب (Repudlic)[۱] میں یہ بلند پایہ الفاظ درج

---

[۱] افلاطون نے جو کتاب اس نام سے لکھی ہے یا جو اس نام سے اس کی طرف منسوب ہے اس میں نہ صرف سیاسیات پر بحث ہے بلکہ جملہ انتظامات عامہ پر اس نے اظہار خیال کیا ہے۔ ہمارے زمانے میں (Republio) کے معنی سلطنت جمہوری کے ہیں مگر اس زمانے میں اس کے یہ معنی نہ تھے بلکہ محض جمہور کے مفہوم میں یہ لفظ بولا جاتا تھا۔

گئے ہیں کہ "سب سے بہتر سلطنت وہ ہے جو اپنی عضو بندی میں سب سے زیادہ انسانی حالت کے قریب پہنچ سکے جسم کے ایک حصے پر اگر کوئی آفت آتی ہے تو تمام جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا اور سارا جسم اس تکلیف رسیدہ عضو سے ہمدردی کرتا ہے" اس عبارت سے اس نے سلطنت کی نہ صرف محض عضوی فطرت بلکہ انسان کی سی عضوی فطرت کو تسلیم کر لیا ہے گو کہ اس نے اس پُر مغز خیال کے نتائج سے زیادہ اعتنا نہیں کی ہے۔

افلاطون کے نزدیک سلطنت انسانی تخیل کا بلند ترین ظہور اور انسان کی مختلف روحانی طاقتوں کا تناسب اور ہم آہنگ جلوہ ہے یعنی سلطنت کامل انسانیت ہے۔ چونکہ روح انسانی عقل آگاہ (شعور) اور مردانہ جرأت اور خواہشات نفسانی سے مرکب ہے اور ذہانت اور جرأت کو خواہشات پر حکمراں ہونا چاہیے اس لیے افلاطون تخیلی سلطنت میں عقلمندوں کو حکمراں ہونا اور بہادر جنگجوؤں کو قوم کی حفاظت کرنا اور جو فرقے مادی پیداوار اور جسمانی کاموں میں مشغول ہیں انھیں ان دو اعلیٰ طبقوں کا مطیع ہونا چاہیے اور معدلت فرض یہ ہے کہ جسم سیاسی کے تمام متعلقات کو ان کی فطرت کے مطابق منضبط کرے۔

ارسطو کے سیاسی فلسفے کی عظمت ہمارے دلوں میں اسی قدر بڑھتی ہے جس قدر زیادہ ہم اس کے بعد کے مصنفوں کی تصانیف پر غور کرتے ہیں۔ افلاطون کی نسبت وہ پرواز خیال کی پیروی کم کرتا ہے، واقعیت کو زیادہ تامل کے ساتھ جانچتا اور انسان کی ضروریات کو زیادہ صحت کے ساتھ پہچانتا ہے۔ اس غرض سے کہ حکما اور محافظین قوم کے حکمران طبقے اپنی زندگی کو کلیتہً سلطنت کے لیے وقف کر دیں افلاطون ان کو خاندانی زندگی سے علٰحدہ کر لیتا ہے اور ان کے لیے مشترک ازدواج و املاک مہیا کرنا چاہتا ہے برخلاف اس کے ارسطو چاہتا ہے کہ ازدواج اور خاندان اور شخصی جائداد کے اہم اور مبارک تنظیمات بدستور قائم رہیں۔ وہ سلطنت کو قبائل اور مقامات (یعنی قوم اور ملک) کی ایک مکمل اور خود کفیل زندگی کے باہمی ارتباط کا مجموعہ بتاتا ہے وہ کہتا ہے کہ "انسان فطرتاً ایک سیاسی حیوان ہے اور سلطنت فطرت انسانی کی پیدا کی ہوئی چیز ہے"۔ "سلطنت محض بقائے زندگی کے لیے وجود میں آتی ہے مگر اس کا قیام برائے استمرار بہتر زندگی

کے لئے ہوتا ہے"۔

سلطنت کے اس تخیل (یا منتہائے خیال) میں مذہب و قانون، اخلاق و معاشرت علوم و فنون، تحصیل و ترتیب دولت، تجارت و حرفت غرض یونانیوں کی جملہ کوششیں مجتمع و فنا ہیں۔ منفرد انسان کو سلطنت ایک قانونی حیات عطا کرتی ہے۔ سلطنت سے علیحدہ نہ وہ محفوظ ہے نہ اسے آزادی حاصل ہے۔ غیر ملکی فطرتی دشمن ہیں اور مفتوح دشمن غلام ہو جاتے ہیں جو سیاسی جماعت سے خارج ہوتے ہیں اور اس لئے ذلیل و مبتذل حالت میں ڈال دئے جاتے ہیں۔

یونانی تخیل سلطنت کے نقائص۔ سلطنت کو زائد از ضرورت طاقت تفویض کی گئی تھی۔

چونکہ قدیم زمانے کی تمام سلطنتوں کی طرح یونانی سلطنت بھی ہمہ گیر طاقت کا منبع سمجھی جاتی تھی اس لئے اسے فی الواقع زائد از ضرورت طاقت حاصل تھی سلطنت ہی سب کچھ تھی کسی شہری کی کوئی ہستی نہ تھی بجز اس کے کہ وہ سلطنت کا ایک رکن تھا۔ اس کی ہستی تمام تر سلطنت پر موقوف اور اسی کے تابع تھی۔ بیشک اہل ایتھنز کو ذہنی آزادی حاصل تھی اور وہ اس کو عمل میں بھی لاتے تھے مگر یہ صرف اس لئے ہوتا تھا کہ ایتھنز کی سلطنت میں فی نفسہ آزادی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ نہ اس لئے کہ وہ انسان کے حقوق کو تسلیم کرتی تھی یہی آزادترین سلطنت تھی جس نے سقراط کے قتل کی اجازت دی اور یہ سمجھتی رہی کہ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھی۔ خاندانی آزادی، خانگی زندگی، ماں باپ کی تربیت بلکہ ازدواجی وفاشعاری تک بھی کسی اعتبار سے سلطنت کی مداخلت سے محفوظ نہیں تھی شہریوں کی شخصی ملکیت تو لازماً اور بھی کم مامون تھی۔ سلطنت ہر چیز میں دست اندازی کرتی تھی اور وہ اپنی طاقت کے لئے نہ کسی اخلاقی حد کو تسلیم کرتی تھی نہ کسی قانونی حد کو۔ وہ اپنے شہریوں کے جسم بلکہ ان کی ذہنی قابلیت تک کو جس طرح چاہتی تھی کام میں لاتی تھی، وہ عہدوں کے قبول کرنے پر لوگوں کو اسی طرح مجبور کرتی تھی جس طرح فوجی خدمت انجام دینے کے لئے۔ افراد کو اول سلطنت میں فنا ہو جانا چاہئے تھا پھر اس کے بعد وہ سلطنت کے ذریعے سے دوبارہ زندہ ہو کر آزاد اور معزز زندگی پا سکتے تھے۔ سلطنت کی اس طاقت علی الاطلاق کے لئے قدیم رسم و رواج کے اثر سے قطع نظر اگر کوئی حد تھی تو وہ حسب ذیل تھی۔

اس طاقت علی الاطلاق کے حدود۔

ایک تو اس طاقت کے عملدرآمد میں شہری خود بھی دخل رکھتے تھے اور اس خوف سے کہ

مبادا عوام کی خود مختاری خود ان کے لئے بھی باعث مضرت ہو جائے وہ سیاسی اشتراکیت کے انتہائی نتائج سے بچتے رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ایک شہر کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں شہریوں کو اپنے جذبات کے عمل میں لانے کے لئے کچھ زیادہ موقع نہ ملتا تھا اور پھر وہ اپنے ہمسایوں کا لحاظ کرنے پر بھی مجبور رہتے تھے اس کے علاوہ یونانی سلطنتیں یونانی قوم کے متفرق اجزا اور ان کی نسلوں کی تقسیم در تقسیم سے مرکب تھیں، اور اُن کی حیثیت شہری جماعتوں سے کچھ زیادہ ارفع نہ تھی پس اس طرح اس پُر رفعت تخیل کی مادی صورت بہت حقیر سی تھی۔ اگرچہ یہ تخیل کل نوع انسانی پر منطبق کیا جاتا تھا مگر عملاً وہ صرف کسی پہاڑ کی وادی یا کسی ساحلی قطعے کے تنگ حدود کے اندر ہی اپنی طفلانہ ہستی کو رو نما کر سکتا تھا۔

اس طرح قوت سلطنت کی اس خیالی لامحدودیت اور اس کی عملی بے بسی میں ایک گہرا تعلق ہو گیا ہے۔ یونانیوں کے تصور سلطنت کے یہی دو بڑے نقص ہیں ورنہ دیگر اعتبارات سے وہ نہایت ہی قابلِ وقعت، فطرت انسانی کے عین موافق اور نتیجے کے لحاظ سے نہایت ہی بارآور رہا ہے۔

(ب) رومیوں کا تخیل سلطنت

تمام قدیم قوموں میں سب سے زیادہ اہل روما کی طبیعت قانون سلطنت سے مناسبت رکھتی تھی اور اُن کے ذہنی قویٰ سے زیادہ اُن کے اخلاقی خصائل اس کا باعث تھے اس لئے دنیا پر یونانیوں کے بہ نسبت اُن کا زیادہ اثر پڑا؛

یونانیوں کا اثر۔

پہلی نظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رومیوں کا تخیل سلطنت یونانیوں سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ سسرو نے اپنی سیاسی تحریروں میں ایتھنز کے نمونے کو برابر پیش نظر رکھا ہے رومن مصنفین جب قانون و سلطنت کی عمومی تشریح کرتے ہیں تو وہ فلاسفۂ یونان خاصکر رواقیوں کا اتباع کرتے ہیں۔

سسرو سلطنت کو انسانی طاقت کی اعلیٰ ترین پیداوار قرار دیتا اور کہتا ہے کہ انسان کسی کام میں خداؤں کی مرضی سے اتنا قریب نہیں ہے جتنا سلطنتوں کی بنا ڈالنے اور اُن کو قائم رکھنے کی کوشش میں کہیں کہیں وہ بھی سلطنت کو انسان سے اور سرگروہ سلطنت کو انسانی روح سے مشابہ قرار دیتا ہے جو جسم پر حکومت کرتی ہے!

یونانی تخیل سے فرق

لیکن بعض اہم خصوصیات میں رومن تصور سلطنت' یونانی تخیل سے مختلف ہے۔

(۱) قانون کا اخلاقیات سے میز کیا جانا

رومیوں ہی نے سب سے پہلے قانون کو اخلاق سے ممیز کیا اور اسے ایک معین شکل میں ڈھالا اور اس طرح سلطنت کی قانونی حیثیت کو زیادہ واضح طور پر نمایاں کیا اس طرح اُنھوں نے سلطنت کی حدبندی کرکے اسے زیادہ استحکام اور قوت عطا کی۔ اب سلطنت ان کے لئے اخلاقی نظم عالم کا مجموعہ نہیں رہی، بلکہ وہ ابتداہی سے ایک عام قانونی تنظیم بن گئی اُنھوں نے بہت کچھ معاشری رسم و رواج پر اور انسان کے جذبۂ مذہبیت پر چھوڑ دیا رومیوں کا خاندان (یونانیوں کے بہ نسبت) سلطنت کی مداخلت سے زیادہ آزاد تھا۔ شخصی جائداد اور شخصی حقوق خود حکومت کے خود مختارانہ عمل کے مقابلے میں بھی بالعموم

زیادہ محفوظ تھے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے بھی سلطنت کی بہبود کو برترین قانون قرار دیا حتیٰ کہ اُن کے دیوتاؤں کی پرستش کا انتظام بھی سلطنت کی طرف سے ہوتا تھا۔ سلطنت جب اپنا منشا ظاہر کردیتی تو پھر کوئی اس کی مخالفت نہیں کرسکتا تھا مگر بایں ہمہ رومی سلطنت نے اپنے حدود مقرر کر لیئے تھے اور خود اپنے اختیار اور اپنے عمل کی وسعت کا حصر کردیا تھا۔

۲۔ قوم کا تصور

مزید براں اہل روما "قوم" کے تصور کو تسلیم کرتے تھے اور اُنھوں نے نظام سلطنت اور قوم کے درمیان ایک عضوی تعلق پیدا کردیا تھا۔ وہ بالاعلان یہ کہتے تھے کہ قوم کی تنظیم شدہ ہیئت ہی سلطنت ہے اور قوم کی مرضی ہی کو وہ تمام قوانین کی اصل قرار دیتے تھے پس رومی سلطنت محض ایک مقامی جماعت نہیں رہی تھی بلکہ اس نے خود کو ایک قومی سلطنت کے بلند درجے تک پہنچا دیا تھا۔

۳۔ عالمگیر سلطنت کی طرف میلان۔

علاوہ ازیں، رومی سلطنت کے لئے یہ مقدر ہوچکا تھا کہ وہ تمام دنیا کو اپنی آغوش میں لے لیگی۔ عالمگیر حکومت کا یہ میلان، اہل روما کی تمام تاریخ پر جاری وساری ہے۔ شہریت کے قومی قانون کے ساتھ قانون اجانب بھی شامل تھا۔ رومیوں کا شہر ابد قرار (روما) دنیا کا دارالحکومت ہوگیا گویا دنیا ایک انگشتری تھی اور روما اس انگشتری کا نگینہ۔ روی حکام کے اختیارات محیط عالم ہوگئے تھے رومی سینات تمام قوموں اور ان کے بادشاہوں کا سینات ہوگیا۔ رومی قوم کی عظمت وشوکت بڑھتے بڑھتے شہنشاہی طاقت کی عظمت وشوکت کے درجے پر پہنچ گئی۔ چنانچہ فلورس فخر سے کہتا ہے کہ روما کی تاریخ نوع انسانی کی تاریخ ہوگئی اس کوشش نے رومی تخیل سلطنت میں ایک ایسی جان ڈالدی جس سے یونانی سلطنتیں بہت پیچھے رہ گئیں اور رومیوں کو ایسی عظمت نصیب ہوئی جس کے سامنے یونانیوں کو جھکنا پڑا۔ تمام دنیا پر جو قوت حکومت کررہی تھی وہ کوئی وہمی شے نہیں تھی بلکہ ایک حقیقی شے تھی جو اس زمانے کی ساری دنیا پر حکمرانی کرتی تھی اور جس کے مقابلے کی جرات مغرب میں صرف جرمانی اور مشرق میں صرف ایرانی ہی کرسکے۔

چوتھا باب

(۲) ازمنۂ وسطیٰ

جن دو جدید طاقتوں نے روما کی عالمگیر شاہنشاہی میں گونہ تبدل پیدا کیا اور ایک حد تک اُسے تباہ کر دیا وہ عیسائیت اور جرمانی قوم کی طاقتیں تھیں۔

(الف) عیسائیت

ابتدائی زمانے کے کلیسا کی روش سلطنت کے متعلق۔

عیسوی مذہب نے یہودی سلطنت اور روما کی شاہنشاہی دونوں کے اقتدار سے یکساں انکار کر کے اپنی طاقت انسان کے دلوں میں جاگزیں کر دی۔ عیسائیت کا بانی کچھ اس دنیا کا بادشاہ نہ تھا۔ قدیم سلطنت نے اسے اور اس کے پیرودں کو ہر طرح پرستایا یہاں تک کہ ان کے قتل سے بھی دریغ نہیں کیا۔ زمانۂ اوائل کے عیسائی سلطنت کے براہ راست مخالف نہ بھی ہی مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ سیاسی تنظیم اور سیاسی اغراض کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کی طرف مائل تھے جب عیسوی دنیا اور قدیم یونانی رومی سلطنت میں صلح و آشتی ہوئی اُس وقت مذہبی جماعت یعنی کلیسا کو اپنی مختص روحانی ہستی کا احساس ہو چکا تھا اور وہ خود کو محض سلطنت کا ایک محکمہ نہیں سمجھتا تھا بنا خیال یہ شائع ہو گیا تھا کہ جماعت کی تمام و کمال روحانی زندگی اگرچہ سلطنت کی نگرانی اور اثر سے کلیتہً علیٰحدہ نہیں ہو گئی ہے پھر بھی وہ حقیقتاً اُس سے آزاد ہے۔ کلیسا اور سلطنت کی یہ نمایاں دورنگی سلطنت کے حدِ اثر کے لئے ایک حقیقی روک ہو گئی۔ سلطنت اب صرف قانون و سیاسیات کی ایک جماعت رہ گئی تھی، مذہب و عبادت سے اسے کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔

پاپائیت

جب کلیسا نے اپنے لئے شہنشاہ سے جدا پوپ کے نام سے ایک ظاہری سرگروہ حاصل کر لیا اور روما کو اس کا مستقر قرار دیدیا تو عالمگیر تسلط کا قدیم رومی تخیل مذہبی رنگ میں پھر ظاہر ہوا۔ اگرچہ اپنی زمانہ وسطیٰ والی وقعت پر پہنچکر بھی کلیسا کو اس امر میں کامیابی نہیں ہوئی کہ وہ سلطنت کو پست کر کے اسے محض ایک مذہبی محکمہ بنا دے تاہم اس کی چمک دمک نے ایک مدت تک

سلطنت کے خیال کو خیرہ کردیا تھا کلیسا اپنے کو آفتاب سے اور سلطنت کو ماہتاب سے تشبیہ دیتا تھا اور انسانوں کی روحوں پر نگران ہونے کی حیثیت سے اُن کے جسموں کے حکمران پر تقدم کا دعویٰ کرتا تھا مگر سلطنت اور کلیسا کی یہ دوگونہ حیثیت برابر تسلیم ہوتی رہی اور مآل کار سلطنت کی آزادی محفوظ رہ گئی شہنشاہ اور پوپ دونوں کی تلواریں یکساں طور پر خدا سے حاصل ہوئی تھیں جو دنیا کا برتر اور حقیقی حکمران ہے۔ جہاں تک کلیسا کی تعلیم نے اثر کیا سلطنت کا تصور (جیسا کہ اس سے پہلے مشرق میں ہو چکا تھا) پھر مذہبی بنیاد پر قائم ہو گیا۔ سلطنت کی طاقت خدا سے حاصل ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی سلطنت کی روحانی اہمیت نظر انداز کردی گئی تھی اور اس کے سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔ تمام مذہبی زندگی کلیسا سے حاصل ہونا چاہیے تھی اور چونکہ سلطنت محض جسمانی خیال کی جاتی تھی اس لیے اُس کا درجہ پست رکھا گیا تھا۔ قومیت کے تنگ حدود سے سلطنت کے تصور کا وسیع ہونا اُس کا ناکافی معاوضہ تھا سلطنت کا مطمح نظر نوع انسانی پر حکومت کرنا نہیں رہا تھا بلکہ صرف عیسائیوں کے امور دنیا دی کا انصرام اس کا کام تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کی حالت کے اعتبار سے رومن شہنشاہی کی تجدید اس طرح ہوئی تھی کہ اعلیٰ صفات میں کلیسائے روما اور ادنیٰ صفات میں جرمانی قوم کی رومی شہنشاہی اُس کی نمائندگی کرتی تھیں۔

(ب) جرمانی (یا ٹیوٹن) قوم

جرمانیوں (یا ٹیوٹنوں) کی بادشاہت

روما کی قدیم عالمگیر شاہنشاہی ٹیوٹن نسلوں کے مقابلے میں دائماً قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ ان جنگجو قبائل نے ایک صوبے کے بعد دوسرا صوبہ رومیوں کے تحت سے نکال لیا۔ ایسے اتفاقات بھی پیش آئے کہ رومی صوبہ داروں یا خود شاہنشاہوں نے اپنی مدد کے لئے ٹیوٹن شاہزادوں سے فوجی مدد طلب کی اور اس طرح انھوں نے پُرامن طریق سے اقطاع ملک پر شاہی حقوق حاصل کر لئے۔ ازمنہ وسطیٰ میں مغرب میں ہر جگہ ٹیوٹن حکمراں تھے۔ اُنھوں نے کلیسا کی مذہبی تعلیم اور رومی تہذیب کے اثر کو قبول کر لیا تھا مگر شاہوں کے تخت اور امرا کے قلعوں پر انھیں کا قبضہ رہا عصا اور تلوار دونوں انھیں کے ہاتھ میں تھے۔

قوم ٹیوٹن کی خصلت

رومیوں کی طرح ٹیوٹن ایک کامل سیاسی قوم نہیں ہیں۔ افراد کل قوم کے اقتدار اعلیٰ کی اطاعت بادل ناخواستہ کرتے ہیں۔ ان کی مضبوط، با اعتماد اور خود رائے شخصیت احساس عامہ میں مداخلت کرتی اور اس کی قوت کو روک دیتی ہے (بس اس وجہ سے قوم ٹیوٹن کو رومیوں کے سیاسی

انضباط سے سبق لینے کی ضرورت تھی) مگر با ایں ہمہ تاریخ عالم میں سیاسیات کا ارتقا اُن کا بہت کچھ زیر بار احسان ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ قوم ٹیوٹن نے رومی سلطنت کی مطلق العنانی کو توڑ دیا اور جدید سیاسی تنظیمات میں اشخاص و جماعات، اور طبقات کی آزادی کے لئے ایک با اثر جگہ حاصل کرلی۔ مونٹسکیو نے بہت ہی سچ کہا ہے کہ مجالس شوری کے انتظامات کے تخم کو جرمانیا کے جنگلوں میں تلاش کرنا چاہیے جہاں قدیم غیر متمدن جرمانی قبیلے سکونت پذیر تھے۔ ٹاسی ٹوس نے ابتدائی صورتوں کا جو نقشہ کھینچا ہے کہ شاہان ٹیوٹن ایک جانب مقامی شہزادوں اور دوسرے امرا کے ساتھ اور دوسرے جانب آزاد اشخاص کی جماعت عظمیٰ کے ساتھ ملکر کام کرتے تھے اسی نقشے میں ہمیں اس آزاد بنیادی حکومت کی ناہموار ابتدا صاف صاف نظر آتی ہے جو بعد کی صدیوں میں پیدا ہوئی۔

انفرادی حقوق کا خیال

ٹیوٹنوں کے نزدیک قوم کی مرضی یا کم از کم اس کی براہ راست مرضی قانون کا ماخذ نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے لئے ایک پیدائشی حق کا دعوی کرتے ہیں جس کی حفاظت سلطنت کا فرض ہے مگر جسے سلطنت پیدا نہیں کرتی اور جس کے لئے ایک ٹیوٹن ساری دنیا سے لڑنے کے لئے آمادہ رہتا ہے یہاں تک کہ خود اپنی (قومی) حکومت کے اقتدار کے مقابلے میں بھی سینہ سپر رہتا ہے۔ وہ سلطنت کے اس قدیم تخیل کا کہ جو کچھ ہے سلطنت ہی ہے، شدت کے ساتھ منکر ہے پس اس طرح تمام نسبتیں الٹ گئی ہیں۔ ایک ٹیوٹن شخص کے نزدیک شخصی آزادی فائق ہے۔ اسے اس امر کی ترغیب دی جاسکتی ہے کہ وہ سلطنت کے لئے اس آزادی کا ایک حصہ قربان کر دے تاکہ باقی حصے کو وہ زیادہ محفوظ رکھ سکے۔

اس خصلت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جرمانی تخیل سلطنت رومی تخیل سلطنت کے بہ نسبت شخصی حقوق کی آزادی کی قطعاً و حتماً زیادہ وقعت کرتا ہے۔ اس طرح شخص خاندان اور جماعت کی آزادی قدیم رومی شہنشاہی کے بہ نسبت زیادہ محفوظ اور زیادہ وسیع ہوگئی ہے۔ لہذا سلطنت کے حقوق کلیسا کے حقوق کے ساتھ ہی شخصی حقوق سے بھی محدود ہوگئے تھے۔

سیاسیات میں شخصیت

اس خصلت کا ایک دوسرا نتیجہ قانون عامہ کے لئے یہ ہے کہ جرمانی قومیں سلطنت کے اختیار مطلق کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتیں اور اُن معاملات میں بھی نہیں جن کا اثر کل جماعت پر پڑتا ہے لہٰذا کار رومی تصور اُن کے لئے ایک اجنبی چیز ہے۔ جب اُن سے حکم ماننے کو کہا جاتا ہے تو وہ رائے دینے اور فیصلہ کرنے میں شریک ہونے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

ان کے طبقات ایک سیاسی طاقت ہیں جن کے ساتھ بادشاہ کی طاقت کو تحدید ہونا چاہئے تاکہ
قانون وضع کئے جاسکیں۔ یہ خیال کہ سلطنت مجموعی حیثیت سے ایک شخص متصور ہوسکتی ہے
جرمانیوں کے لئے دور از کار اور بیشتر ناقابل فہم ہے۔ ان کا میلان زیادہ اس طرف ہوتا ہے کہ سلطنت
کو واقعی اشخاص یا واقعی اشخاص کی جماعتوں میں منقسم کردیں۔ وہ اولاً یہ سمجھتے ہیں کہ سلطنت
بادشاہ یا دوسرے والیان ملک میں جو محکمۂ عدالت اور مجلس ملی کے سرگردہ ہیں یا تعلقوں اور
قبیلوں، اور قصبوں کے سرداروں میں مرکوز ہوتی ہے۔ اشخاص کا ایک گروہ کبھی دوسرے
گروہ کو تقویت دیتا ہے اور کبھی اس کے سدراہ ہوجاتا ہے۔ پس قوم کا سارا نظام جزئیات تک
میں آزادی کی روح سے بھرا ہوا ہے۔ اجزائے ترکیبی کا اتحاد نسبتاً کمزور ہے مگر ان اجزا کی آزادی
بجائے خود مستحکم ہے۔

قدامت کے مابقی روایات

تخیل سلطنت کے یہ تغیرات جن میں معتدبہ ترقی پائی جاتی ہے نظریہ کے بہ نسبت عمل
میں زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ خود جرمانیوں کا کوئی مخصوص سیاسی فلسفہ تھا ہی نہیں۔ ازمنۂ وسطی
میں علوم اول اول کلیسا کے ہاتھ میں رہے اور اس کے بعد رومی اصول قانون اور یونانی فلسفے
کی روایات نے انھیں اپنا تابع بنا لیا۔ قدیم قبائلی قوانین تک میں اس قسم کے آثار پائے جاتے ہیں
مثلاً مغربی گوتھی قوانین میں قدیم ادبیات کے اتبع میں جسم سیاسی کو انسان کے سے مشابہ قرار دیا ہے
جس کا سر بادشاہ اور جس کے اعضا قوم ہے مگر یہ محض تقلیدی انشا پردازانہ نمائش تھی۔
اس میں کوئی عمیق معنی نہیں تھے اور نہ ازمنۂ وسطی کی حقیقی سلطنتوں سے اس کی کوئی قطعی
تطبیق کی گئی تھی۔

جاگیرداری قانون۔

بعض دوسرے اعتبارات سے تخیل سلطنت میں تنزل واقع ہوا اور یہ محض اسی وجہ سے
نہیں ہوا کہ کلیسا نے اسے نسبتاً حقیر قرار دے دیا تھا

ازمنۂ وسطی کی سلطنت بھی ایک قانونی سلطنت کہی جاسکتی ہے مگر رومیوں کے مفہوم سے ایک
جداگانہ مفہوم میں کیونکہ ازمنۂ وسطی کی سلطنت خالص قانون عامہ کی تنظیم نہیں تھی بلکہ اس کے
تمام تنظیمات میں شخصی قانون کے اجزا ملے ہوئے تھے۔ ملکیتی بادشاہت خاندان کی موروثی ملک
شمار ہوتی تھی اور خدمات عامۂ اراضی پر بانڈ سمجھے جاتے تھے۔ سارے جاگیرداری قانون اور
آبائی سلطنت کو اس تخلیط سے ہر طور پر نقصان اٹھانا پڑا۔ رومیوں نے قانون عامہ نے غایت عامہ
کے لئے صرف ایک بنیاد کا کام دیا ورنہ ازمنۂ وسطی کا جاگیرداری قانون ہی اس زمانے کی

سلطنت کا اصلی مقصود معلوم ہوتا تھا اور اس کے لئے قوم کے سود و بہبود کی طرف سے بے پروائی ہوتی جاتی تھی۔

قومی اور سیاسی اتحاد کے شکست ہو جانے جاگیر داری طریق کے نافذ ہو جانے طبقوں اور خاندانوں کے حقوق میں تصادم ہو جانے سے قومی سلطنت کا تصور فنا ہو گیا تھا رومن شہنشاہی کے اثرات میں سے جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ سیاسی اتحاد کے بہ نسبت زیادہ تر مغربی یورپ کا خیالی بین الاقوامی اتحاد تھا اور یہ اتحاد شہنشاہی کے بجائے زیادہ تر پوپ اور رومن پادریوں کے اقتدار کی وجہ سے قائم تھا۔

فی الجملہ سلطنت کی زیادہ آزاد اور زیادہ صحیح ترقی کا بیج بویا جا چکا تھا مگر ازمنہ وسطیٰ میں سلطنت کا تخیل بمقابلہ رومی زمانہ کے قطعیت و قوت میں کم ہو گیا تھا۔

(ج) نشاۃ جدیدہ کا اثر

رومی کلیسا نے رومی شہنشاہی کے تخیلات کو زندہ رکھا۔

قدیم سلطنت کی یاد ازمنہ وسطیٰ میں بھی کسی وقت کلیتہً محو نہیں ہوئی تھی۔ روما اب بھی مغرب کا روحانی مستقر بنا ہوا تھا۔ جرمانیوں نے اگرچہ قدیم رومن سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے مگر وہی جرمانی جنھوں نے رومی صوبوں کو خود مختار سلطنتیں بنا دیا تھا۔ اپنے تمدن اور سب سے بڑھکر اپنے مذہب میں روما ہی کا تتبع کرتے تھے اور رومیوں کے زوال یا فتہ شہر کے بجائے رومن کلیسا ازمنہ وسطیٰ کی حکمراں طاقت بن گیا تھا جس کی اطاعت ایک وقت میں آگر خود جرمانی قوم نے بھی کی۔ رومن کلیسا کے تنظیمات اس کے طور و طریق، اخلاق، قانون اور زبان میں قدیم رومن سلطنت کا ایک بہت بڑا بلکہ اس کا خاص الخاص حصہ قائم رہ گیا تھا۔ اقوام پر زیادہ آسانی کے ساتھ حکومت کرنے کے لئے قدیم شہنشاہی نے پاپائیت کی اور عالمگیر سلطنت نے عالمگیر کلیسا کی صورت اختیار کر لی تھی۔ قدیم رومن شہنشاہ اپنے اقتدار کو رومن قوم کے نام اور رومن قوانین کی امداد سے اپنے نائبین اور عمال کے توسط سے عمل میں لاتا تھا اور اپنی فوجوں کے ذریعے سے ان کی تعمیل کراتا تھا۔ اسی طرح رومن پوپ مذہبی انضباط اور دینی قانون کی مدد سے اپنے اساقفہ کے وسیلے سے خداوند و کلیسا کے نام سے تقدس و عظمت کی مسند پر متمکن تھا اور بے شمار خانقاہی سلسلوں کے ذریعے سے اپنے احکام کا نفاذ کرتا تھا۔

مقدس رومن شہنشاہی۔

مگر کلیسا کے پہلو بہ پہلو قدیم شہنشاہی کی یاد بدستور قائم تھی ہم اب اس زمانے میں

یہ جانتے ہیں کہ کارل (چارلس) اعظم کے وقت سے فرانکی (فرانسیسی) بادشاہوں کی اور اوٹو اعظم کے وقت سے جرمانی بادشاہوں کی رومن شہنشاہی اُس رومن شہنشاہی سے جس کا مستقر روما اور قسطنطنیہ تھا کس درجہ مختلف تھی مگر تمام ازمنہ وسطی میں لوگ یہی یقین کرتے تھے کہ فرانکی رومی جرمانی ردمی شہنشاہی اسی روما والی شہنشاہی کی جانشین ہے اور یہ کہ فرانکی شہنشاہ جرمانی قوم کا رومی شہنشاہ کلاڈیس، انٹونیس اور قسطنطین کا باقاعدہ جانشین ہے۔ بہرحال شہنشاہوں کی ازسرنو قائم شدہ عظمت قدیم رومن شہنشاہی کی یاد تازہ کرتی تھی اور دنیائے قدیم کے ساتھ ازمنۂ وسطیٰ کے خیالات وتنظیمات کا ایک خیالی اتحاد قائم ہوگیا تھا۔

رومن قانون — مزید براں یہ کہ قدیم رومی شہنشاہی ضابطہ یعنی مجموعہ قوانین روما ازسرنو ہاتھ آگیا تھا۔ اطالیہ کی یونیورسٹیوں میں بارھویں صدی سے اس ضابطے کی تشریح وتوضیح ہوتی رہی تھی اس طرح پر کہ گویا وہ نوع انسان کے الہامی قانون کا معزز وموقر درجہ رکھتا تھا۔ اطالیہ نے نکل کر اس قانون نے تمام مغرب کو فتح کرلیا اور ہر جگہ مسلم ومستند ہوگیا۔ تیرھویں صدی سے فرانس میں اور پندرھویں صدی سے جرمانیا میں اس کا دوردورہ ہوگیا۔ جرمانیا میں اس کے اثرات ونتائج فرانس سے بھی بڑھے ہوئے ثابت ہوئے البتہ قانون عامہ کے بجائے اُس زمانے کے فاضل قانون داں زیادہ تر شخصی قانون اور شاید اُس سے بھی زیادہ فوجداری کے قانون کو مدنظر رکھتے تھے مگر پھر بھی اس طرح سلطنت، اس کی قانون سازی اور اس کے اقتدار شاہی کے نسبت بہت سے اصولی خیالات جنھیں رومیوں نے ظاہر کیا تھا، تعلیم یافتہ طبقے کے معمولی خیالات کا جزو ہو گئے۔

جمہوریت کے روایات — علاوہ ازیں قدیم رومن جمہوریت اور اس کی عظمت کی یاد بسا اوقات شہری باشندوں کی نئی شہری جمہوریتیں قائم کرنے کی کوششوں کو تازہ کرتی اور اس میں جان ڈالتی رہی۔ اطالیہ اور جرمانیا کے "حکام شہری" (Civil magistraae) کا نام رومی جمہوریت کے کانسلوں کا ایک دھندلا سا خیال پیدا کرتے تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں روما کے عامۃ الناس نے دوبار پرانی جمہوریت کے بیدار کرنے اور اس میں ازسرنو جان ڈالنے کی کوششیں افسانہ وار جوش کے ساتھ کیں، ایک مرتبہ بارھویں صدی میں آرنلڈ آف برسکیا کی سرکردگی میں اور دوسری مرتبہ چودھویں صدی میں ٹریبیون کولا ارینزی کے تحت میں ازمنہ وسطیٰ کے آدمیوں کی سیاسی ناقابلیت کے سبب سے یہ دونوں کوششیں ناکام رہیں مگر ان دونوں سے قدیم روایات کی قوت کا ثبوت

ملتا ہے۔

یونانی نظریات

ازمنۂ وسطیٰ کے رومی الاثر تمدن کے لئے یونانی سیاسی نظریات بھی کلیتہً غیر معروف نہ تھیں۔ بہت سی خانقاہوں میں ارسطو کی کتاب "سیاسیات" کی تعلیم ہوتی تھی حتیٰ کہ دینیات کے نہایت ہی مشہور عالم ٹامس (اکوئینوی) نے اس یونانی فلسفی کی اس برگزیدہ تصنیف کی شرح لکھی۔

بایں ہمہ ازمنۂ وسطیٰ کا قانونی نظم اور اس سے بھی زیادہ اُس کی سیاسی تنظیم، قدیم طور وطریق سے بالکل ہی مختلف تھی اِس زمانے کی تمام تنظیمات جرمانی اثر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں اور اُس کے خیالات پر کلیسا کے مذہبی قوانین حاوی تھے۔

نشاۃِ جدیدہ

پندرھویں صدی کے نصف آخر میں قدما کے زمانے کی یاد زیادہ زور کے ساتھ تازہ ہوگئی تھی اور یونانیوں اور رومیوں کی قدامت کی روح دوبارہ بیدار ہوگئی تھی (اسی کو نشاۃِ جدیدہ یا نئی زندگی کہتے ہیں) قدیم فنون کے کاموں نے اطالیہ کے ہنروروں یعنی تعمیرات سنگتراشی نقاشی اور شاعری کے ماہروں کے دلوں میں آزادی پیدا کردی اور ان کے خیالات کو بلند کردیا قدیم علوم کے خیالات نے دوبارہ وقعت وعزت حاصل کرلی اور ازمنۂ وسطیٰ کی مدرسی تعلیم اور خانقاہی دینیات کے قیود وعائدہ کو توڑ ڈالا۔ کلیسا کے اس عقیدے پر کہ دنیا ایک قابل احتراز چیز ہے، اس خیال نے غلبہ پالیا تھا کہ انسانیت (یعنی فطرت انسانی اور قدامت کا مطالعہ) ایک قابل قدر شے ہے اور زندگی پر زیادہ روشن اور زیادہ مسرت آمیز طریقے سے نظر ڈالنے کو درباروں اور شہروں میں وسیع مقبولیت حاصل ہوگئی۔ جس طرح تقریباً دو ہزار برس قبل سوفسطائی یونانیوں کے عالی خاندان نوجوانوں کے معلم ہوگئے تھے اُسی طرح اب علمائے قدامت جرمانیا فرانسیسی اور اطالیہ کے حوصلہ مند نوجوانوں کے معلم وادیب ہوگئے۔ تعلیم یافتہ اشخاص اب اس ملامت سے ہراساں نہیں ہوتے تھے کہ وہ مسیحیوں سے پھر بت پرست بنتے جارہے ہیں خود پاپاؤں تک نے اس ذہنی تحریک کی سرگروہی اختیار کی۔ نکولاس پنجم (۱۴۴۷-۱۴۵۵) پیس دوم اینیاس سلویئس (۱۴۵۸-۱۴۶۴) یولیس (جولیئس دوم ۱۵۰۳-۱۵۱۳) لیئو دہم (۱۵۱۳-۱۵۲۱) سب نے نشاۃِ جدیدہ کے فنون لطیفہ کی آزادی کی ہمت افزائی اور حمایت کی۔ مڈلیسی کا شاہانہ جاہ وعظمت والا خاندان حکمراں میں سے کوسی مو (۱۴۳۴-۱۴۶۴) اور لونیزو (۱۴۶۹-۱۴۹۲) نے خوشنما فلورنس کو اطالیہ کا ایتھنز بنا دیا۔

علوم قدامت کی تجدید

قدیم تصور سلطنت اور اسی طرح قدیم نظریات سیاسی کا کچھ حصہ بھی اب دوبارہ ظاہر ہوا اور اس نے عام معاملات پر اپنا اثر ڈالا (خصوصاً) حسب ذیل صورتوں میں۔

(۱) ایک یہ کہ چند ذی ہمت صاحبان فکر نے سلطنتوں کے قیام اور سیاسی اقتدار کی نوعیت کو انسانی خیالات کے تحت میں لاکر ان کی تشریح کرنے کی جرأت کی اور اس طرح سلطنت کے معاملات میں مذہبی طرز استدلال کا مقابلہ کیا۔

(۲) دوسرے یہ کہ حکمتِ عملی کا خیال یعنی سلطنت کی رہبری اور قوموں کی حکومت کے اغراض و ذرائع پر بالارادہ اور خاصۃً غور کرنا سیاسی عملیات و نظریات میں قطعی ہو گیا اور مکیاویلی (۱۴۶۹-۱۵۲۷) کی تحریرات میں اس خیال کو واضح ترین اور صاف ترین اظہار کا موقع ملا۔ اس کی کتاب "مکالمات لیوی" (جس میں اس نے روما جمہوریت کی عظمت و رفعت کو ظاہر کیا ہے) نیز اس کی تصنیف "حکمراں" (Prince جس میں اس نے حکمرانوں کے حوصلوں کو پورا کرنے کے طریقے بتائے ہیں) دونوں نشأۃ جدیدہ کے سیاسی جوش سے بھری ہوئی ہیں

(۳) تیسرے یہ کہ ہم ایک ایسی سیاسی آمریت اور سیاسی اقتدار شاہی کی تجدید کے علامات دیکھتے ہیں جن کے واحد اقتدار کے سامنے ہر شے کو جھکنا پڑتا ہے۔ اس بادشاہ کے ہاتھ میں جو سلطنت پر حکمراں ہے یہ اقتدار تمام جاگیری اور ازمنۂ وسطیٰ کے سارے طبقاتی قیود سے آزاد ہو کر رومن شہنشاہ کی سی مطلق العنانی کی حد تک ترقی کر گیا۔

(۴) آخر الامر یہ ہے کہ نشأۃ جدیدہ نے خود کو ایک مخالف شکل میں بھی ظاہر کیا جس میں اس روز افزوں ظلم نے استقلال پیدا کر دیا قیصر کی یاد کے ساتھ بروٹس کی یاد بھی تازہ ہو گئی۔ ظالموں کا قتل جمہوریت کا ایک وصف سمجھا جاتا تھا اور اس کی مدح سرائی ہوتی تھی یہاں تک کہ کیٹیلینا کے سے بیباک سازشی بھی پیدا ہو گئے۔

مگر قدیم سیاسی خیالات اور قدیم میلانات کی یہ تمام تجدید اعلیٰ تعلیم یافتوں کے ایک تنگ حلقے ہی تک محدود تھی۔ عامۃ الناس تو اسے سمجھتے تھے اور نہ اسکے سمجھنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ سیاسیات پر نشأۃ جدیدہ کا تمام اثر صرف جزوی اثر

تھا اور بہت جلد رفع ہوگیا اُس نے ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت کے شیرازے کو بکھیر کر ازمنہ جدیدہ کی سلطنت کے لیے راستہ صاف کر دیا مگر بجائے خود کوئی نئی سیاسی تنظیم نہ پیدا کر سکا۔

پانچواں باب

(۳) ازمنہ جدیدہ کا تخیل سلطنت

(الف) نیا دور کس وقت سے شروع ہوتا ہے۔

آج اہل یورپ و امریکہ کا تاریخی احساس اس امر کے قبول کرنے پر متفق ہے کہ انسانی زندگی میں کئی صدیوں کا ایک زمانہ گذرا ہے جسے ہم "ازمنۂ وسطیٰ" کہتے ہیں، اور وہ یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہم اب ایک نئے زمانے میں رہتے ہیں مگر اُس خاص وقت کے متعلق جو موجودہ زمانے کو ازمنۂ وسطیٰ سے قطعی طور پر جدا کرتا ہے رایوں میں اب بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ تو ہم مدت سے جانتے ہیں کہ ماضی مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے۔ آنے والے زمانے کے مدرکات و میلانات بہت پیشتر سے محسوس ہونے لگتے ہیں، اور (اسی طرح) ایام گذشتہ کے بیشمار اثرات بدلے ہوئے وقتوں میں بھی اپنے عمل کو جاری رکھتے ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے دوران میں چند ممتاز افراد نے ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا جو موجودہ صدی کے قبل تک سمجھ میں نہیں آئے تھے اور (دوسرے جانب) ہم آج تک ازمنۂ وسطیٰ کے بہت سے تنظیمات کے آثار دیکھتے ہیں جو باحتیاط تمام محفوظ رکھے گئے ہیں اور یہ آثار صرف خانقاہوں اور امرا کے قلعوں ہی تک محدود نہیں ہیں۔ قدیم اور جدید دور کی کڑیاں خود انسانی زندگی کے اتحاد کے ذریعے سے ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اور ان دونوں کا قاطبتہً ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا گوشت سے ناخن کو جدا کرنا۔ یہی حال افراد کی زندگی کے مختلف دوروں کا ہے مگر پھر بھی زمانے کے اُن مختلف دوروں کا تعین ضروری ہے جن کی سرحدوں کے آپس میں تداخل ضرور پایا جاتا ہے لیکن وہ باوجود اس تداخل کے بہ حیثیت مجموعی یقیناً ایک دوسرے سے ممیز کئے جا سکتے ہیں۔

نشاۃ جدیدہ

بہت سے لوگ دورِ جدید کی ابتدا کو پندرھویں صدی کے نصف آخر تک پیچھے ہٹاتے ہیں، اُن کے نزدیک نشاۃ جدیدہ کا دور وہ وقت ہے جب کہ ازمنۂ وسطیٰ کی تقلیب عالم جدید

کی شکل میں ہوئی۔ ہزار برس سے زائد کی خواب کے بعد فلسفیانہ روح (خیالات) کا ازسرِنو بیدار ہونا، ازمنۂ وسطیٰ کے تنظیمات و اعتقادات کے علی الرغم قدیم خیالوں اور یادگاروں کا دوبارہ زندہ ہونا، قدما کے نمونوں کی مطابقت میں پہلے سے زیادہ آزاد اور زیادہ مسرت آمیز فنون لطیفہ کا دوبارہ ظاہر ہونا، سب سے بڑھ کر اطالیہ میں ایسے شہروں کا عروج حاصل کرنا جنھیں موقع آنے پر پوپ کی مذہبی حکومت سے علیحدہ ہوجانے میں کوئی باک نہو، رومن قانون کا (ملکوں میں) پھیل جانا، مذہبی قانون پر اُس کا ترجیح پانا، چھاپے کا ایجاد اور مطبوعات کی اشاعت بارود کا ایجاد ہونا اور اس کی وجہ سے طریقِ جنگ کا بدل جانا، بحری سفر میں زیادہ جسارت اور افریقہ کے سواحل اور ہندوستان میں نامعلوم ملکوں کی دریافت، اور مغرب میں ایک پورے کے پورے نئے براعظم کا پتا چل جانا، یہ تمام امور قطعی طور پر بتاتے ہیں کہ (انسان) عصرِ قدیم سے گذر کر عصرِ جدید کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ مگر یہ ازمنۂ وسطیٰ کا اختتام نہ تھا بلکہ انحطاط تھا جو عصرِ جدید کے عروج پذیر میلانات کا پیش خیمہ تھا۔ نشاۃ جدیدہ کے وقت میں زمانے کی طبیعت میں جوانی یا بچپن کے خصائل کے بجائے پختگی کی خصلت پائی جاتی تھی۔ وہ نئی چیزوں کے پیدا کرنے کی طرف اس قدر مائل نہ تھی جس قدر پرانی چیزوں کے زندہ کرنے کی طرف اس کی کوششیں تمام تر قدیم خیالات کی تجدید اور قدیم نمونوں کی نقل کی طرف متوجہ تھیں۔ اس نے ازمنۂ وسطیٰ کی بعض تنظیمات کی اصلاح کی اور بعض کو متزلزل کردیا مگر انھیں بالکل میٹ نہیں دیا اور نہ کسی نئی چیز کو پیدا کرکے اُن کی جگہ پر قائم کیا۔ آخر میں یہ تحریک چھوٹے اور بڑے ہر طرح کے حکمرانوں کی مطلق العنانی کے باعث ٹھٹھر کر رہ گئی۔

اصلاح

اس سے بھی زیادہ کلیسائی اصلاح کا زمانہ نئے دور کی ابتدا خیال کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود اصلاح کی وہ ناکامی کوششیں نہیں ہیں جو جرمانی شہنشاہی میں ۱۴۹۵ء کی ورمز کی مجلس (رائشس تاغ) میں کی گئی تھیں بلکہ اس سے مقصود سولھویں صدی کی کلیسائی اصلاح ہے جس کی تاریخ ۳۱ اکتوبر ۱۵۱۷ء سمجھی جاتی ہے جب کہ مارٹن لوتھر نے اپنے مقالوں اعتقدات کو ڈٹنبرگ کے گرجا کے دروازے پر چسپاں کیا تھا۔

حقیقت میں ازمنۂ وسطیٰ کے رومن کلیسا کا اقتدار اُس وقت پوری طرح ٹوٹ گیا تھا جس کا اثر تاریخِ عالم پر پڑا اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں کی بنا مذہبی دائرۂ عمل میں حقیقۃً ایک نئی تخلیق تھی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ مذہبی اعتقاد کے روما کی غلامی سے آزاد ہوجانے نے

علوم کو بھی مذہبی اقتدار سے مطلقاً آزاد کر دینے کے لئے ایک قومی تحریک پیدا کر دی۔ غرضکہ تخیل سلطنت کی بلندی اور اُس کے اخلاقی تزکیہ نے جدید سیاسیات کے لئے راستہ تیار کر دیا۔

تاہم جرمانی اصلاح کا اصولی خیال کسی نئی شئے کا پیدا کرنا نہیں بلکہ قدیم مذہب کو دیرا ستادہ خرابیوں سے پاک کرنا اور عیسائیت کی ابتدائی سادگی کو واپس لانا تھا۔ پاپائی کلیسا کا تاریخی اقتدار اور اُس کے روایات شکست ہو گئے تھے مگر کتاب مقدس کا اُس سے بھی پرانا اور ویسی ہی تاریخی اہمیت کا اقتدار پہلے سے بھی زیادہ پابندی کے ساتھ قائم رکھا گیا تھا۔ درحقیقت مصلحان مذہب کے لئے ابتدائی عیسائیت کا واپس لانا ایسا ہی ناممکن تھا جیسا اطالیہ کے ماہران فن کے لئے ایتھنز اور روما کے قدیم فن وصنعت کا واپس لانا دشوار تھا۔ دنیا بدل گئی تھی اور قدیم خیالات اب صرف نئی شکلوں میں دوبارہ ظاہر ہو سکتے تھے یورپ کی زندگانی برابر ترقی کرتی جاتی تھی اور پروٹسٹنٹ مذہب اور نیز سلطنت جس پر اُسی مذہب کا اثر پڑ رہا تھا، نسبتاً نئے مظاہر معلوم ہوتے تھے مگر خود سلطنت کا تخیل اصلاً وہی رہا جو ازمنۂ وسطیٰ کا تھا۔ سلطنت اب بھی اس دنیا کی اور اجسام مادی کی بادشاہی تھی اور مذہب اب بھی زیادہ تر مقدس نفوس کی ایک روحانی جماعت تھی جو بہشت کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔

یہ امر کہ سولھویں صدی کی اصلاح کا تعلق نئے دور کی جوانانہ کوششوں کے بجائے درمیانی دور کی انحطاط پذیر کبرسنی سے زیادہ ہے، اس کا قطعی ثبوت سنہ ۱۵۴۰ء سے سنہ ۱۷۴۰ء تک کی دو صدیوں کے خصائل میں موجود ہے۔ یہ طویل زمانہ ایک ناطرفدار مبصر کے ذہن میں نوجوانی کی نہیں بلکہ پیرانہ سالی کی تمثال کو منعکس کرتا ہے۔ پروٹسٹنٹ کلیسا تک میں ایک بحث اور بے جان تقلید پرستی نے فوراً ہی پھر غلبہ حاصل کر لیا جس نے کسی تازہ تحریک کو آگے نہ بڑھنے دیا اور علوم کی ترقی میں رکاوٹیں ڈال کر انھیں پامال کرنا چاہا۔ کیتھولک کلیسا میں ہم یسوعی (Jesuit) فرقے کا اثر بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہ فرقہ ازمنہ وسطیٰ کی مصنوعی طور پر قائم کی ہوئی مذہبی حکومت کا علم بردار تھا زمانۂ وسطیٰ کے امرا پر شاہی مطلق العنانی غالب آگئی اور اس نے جاگیرداری طریقے کو توڑ دیا تھا مگر پھر بھی اُس مطلق العنانی میں زیادہ تر وہی قدیم روح برقرار رہی یہ خود مختار

طریق حکومت جو اب تمام براعظم یورپ پر چھا گیا تھا اور جسے صرف انگلستان میں مقاومت کا سامنا ہوا اُس کی تائید زیادہ تر انہیں پرانے رومی اور آبائی خیالات سے ہوتی تھی جن کا اصل اصول شاہی خاندان کی حرمت تھا اور جن کی رو سے حکومت کے سارے اقتدار کو احکام مذہبی پر مبنی ہونا چاہئے تھا۔ اٹھارھویں صدی کا پر تصنع طرز (Rococo) جس نے آہستہ آہستہ نشاۂ جدیدہ کے طرز کی جگہ لے لی تھی پیرانہ سالی کا اظہار ہے ان سب باتوں سے کسی ابھرتے کے آثار نہیں نظر آتے جس کی بنیاد نئی ہو بلکہ عہد وسطیٰ کی شکست و ریخت زیادہ نمایاں ہے۔

نوئیر لائب نٹس پر اُس کے زمانے کے قدیمانہ رنگ کا ایسا اثر پڑا کہ اُس نے ۱۶۹۷ء میں یہ لکھا کہ "ہم بخوبی یقین کرسکتے ہیں کہ دنیا اپنے عہد پیری میں داخل ہوگئی ہے۔"

۳۔ انگریزی انقلاب

یہی اسباب ہیں اس سے بھی روکتے ہیں کہ ہم عہد جدید کی ابتدا انگلستان کی انقلاب کو قرار دیں، خواہ وہ ۱۶۴۲ء کا انقلاب ہو یا ۱۶۸۸ء کا نام نہاد "شاندار انقلاب" بیشک اس انقلاب نے بھی ایک نئے شئے پیدا کردی یعنی آئینی بادشاہی کی بنا ڈالدی لیکن ہم جس قدر زیادہ غور کے ساتھ انگریزی انقلاب کا فرانسیسی انقلاب سے مقابلہ کرتے ہیں، اُسی قدر ہمارا یہ اعتقاد قوی ہوتا جاتا ہے کہ وہ عہد وسطیٰ کے آخری زمانے سے اور عہد جدید سے تعلق رکھتا ہے۔ انگریزوں کی جدوجہد زیادہ تر قدیم اینگلو سیکسن آزادی قوم اور روایتی حقوق پارلیمنٹ کے لئے بادشاہ کی مطلق العنانی کے خلاف میں تھی، بخلاف اس کے فرانسیسیوں کی کوشش یہ تھی کہ سلطنت کی ایک نئی معقول تشکیل ہو اور ایک نئی معاشری آزادی حاصل کی جائے۔

۴۔ فرانسیسی انقلاب

اس لئے بہتوں کے نزدیک فرانسیسی انقلاب میں عہد جدید کی پہلی قطعی تحریک رونما ہے اور اسی لئے وہ اس دور جدید کی تاریخ ۱۷۸۹ء سے مقرر کرتے ہیں۔ یہ رائے فرانسیسیوں کے عجب و خود بینی کو بہت خوش آئند معلوم ہوتی ہے۔ اس میں کسی بحث کی گنجائش نہیں کہ فرانسیسی انقلاب میں دور جدید کی روح جوش زن تھی مگر اس روح نے اپنا کام اس سے قبل ہی شروع کردیا تھا۔ "روشن خیالی" کا زمانہ جو پہلے ہی شروع ہوچکا تھا اُس پر دور جدید کا گہرا نقش بیٹھ چکا تھا جو دور سے نمایاں تھا۔

۵۔ سنہ ۱۷۴۰ء اور پروشیا کے فریڈرک اعظم کی تخت نشینی

جدید تمدن کی تاریخ کے فاضل مصنف ٹامس بکل نے بھی بہت سے اور لوگوں کی

طرح یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ۱۷۶۰ء میں انسانی خیالات کی رفتار میں ایک نمایاں تغیر نظر آتا ہے جس طرح آفتاب کی کرنیں پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں کو روشن کرتی ہیں، اور بعد کو جاکر نیچے کی وادی میں چمکتی ہیں، اسی طرح نیا خیال پہلے بڑے آدمیوں میں ظاہر ہوتا ہے اور پھر بہت آہستہ آہستہ عوام میں پھیلتا ہے لیکن اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں نئی تحریک نے نہ صرف چند منتخب سربرآوردہ اشخاص میں تازہ روح پھونک دی تھی بلکہ ہر طرف افق پر نئے خیالات بلند ہونے لگے تھے۔ اور تغیر کی خواہش عالمگیر طور پر محسوس ہونے لگی تھی۔ لوگوں کے دل نئی زندگی کی امید سے اچھلنے لگے تھے فنون لطیفہ اور ادب میں سلطنت اور معاشرت میں ایک بالکل نیا رنگ پیدا ہو گیا تھا دنیا کے حیات ازمنۂ وسطیٰ سے ہٹکر ایک جدید کائنات کی طرف قطعی طور پر منعطف ہو گئے تھے۔

اگر ہم ۱۷۶۰ء اس سے بعد کے حالات و اشخاص کا مقابلہ اس سے قبل کی صدیوں سے کریں تو ہم زمانے کے خصوصیات کے وسیع تغیر سے حیرت میں پڑ جاتے ہیں، نہ صرف افراد میں تغیر نظر آتا ہے بلکہ ان کی زندگی کی ساری کیفیتیں بدلی ہوئی ہیں۔ وہ زمین جس پر وہ کھڑے ہیں، وہ ہوا جو ان کے گرد و پیش چل رہی ہے کوئی اور ہی شے ہے ہم مثالاً کہتے ہیں کہ پروشیا کا فریڈرک اعظم جدید سلطنت اور جدید طرز زندگی کا نہایت بہتر ہی طرح نمائندہ ہے۔ اگر اس کا مقابلہ فرانس کے لوئیس چہاردہم سے نہیں جو مطلق العنان شاہی "بافضال ایزدی" کا روشن ترین قائم مقام تھا اور جس پر ازمنۂ وسطیٰ کا خاتمہ ہوتا ہے) بلکہ خود اسی کے جلیل القدر بزرگ الکٹر فریڈرک ولیم سے کیجئے یا ہسپانی حکومت سے ندرلینڈ کے آزادی پانے اور انگریزی حکومت سے شمالی امریکہ کے آزاد ہونے کا باہم موازنہ کیجئے یا اگر فرانسیسی انقلاب کو انگریزی انقلاب کے مقابل رکھکر دیکھئے ۔ یا روسو پر اور لرکوفن ہوٹن پالینگ پر لوتھر کے بالمقابل نظر ڈالئے تو یہ وسیع فرق فوراً عیاں ہو جائے گا۔

گزشتہ صدی کے وسط سے مہذب دنیا جس دور میں داخل ہوئی ہے اس کی جدت بعض اور باتوں سے بھی نمایاں ہوتی ہے یعنی اس زمانے میں سیاسی نظریے کی غیر منقطع تلاش اور سیاسی عمل کا تجربہ کیا جانا ایک بالکل نئی تخلیق کے وجود میں لانے دلیرانہ کوششوں کا عمل میں لایا جانا اس مایوسی کا طاری ہونا جو ہر ناکامی کا پہلا نتیجہ ہوتی ہے۔ انقلاب اور رجعت کا

کا یکے بعد دیگرے واقع ہونا، یہ سب باتیں اُسی نئے دور کی طرف اشارہ کرتی ہیں -

دورِ جدید کو اگر اپنے بلوغ کا احساس اُس سے بلند تر درجے میں ہے جتنا کسی اور تاریخی دور کو کبھی ہوا ہو تو وہ خصوصیات جو ہم نے اوپر ذکر کی ہیں، یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ہم نے ابھی بلوغ کی پہلی ہی منزل میں قدم رکھا ہے اور ابھی تک اُس میں خامی اور نوجوانانہ بلکہ بسا اوقات طفلانہ کیفیت بالکل اُسی طرح موجود ہے جیسے ازمنۂ وسطیٰ کی آخری صدیوں میں پیرانہ سری کے آثار نمایاں تھے۔ عمر کے بڑھتے بڑھتے بڑھاپے کا آجانا ایک عضوی اور نفسی قانون ہے اور اُس کا عمل انسان کی اجتماعی زندگی کے طویل دور ہائے روزگار میں محدود نہیں ہے بلکہ روزگار کے مختلف دوروں کے اندر جو چھوٹے چھوٹے زمانی فاصلے ہوتے ہیں اُن پر بھی یہ قانون ایک دورانی رفتار سے بار بار نافذ ہوتا رہتا ہے۔

پس ہم دورِ جدید کی تاریخ کو سنہ ۱۷۴۰ء سے مقرر کرتے ہیں، سلطنت پروشیا کا عروج، آسٹریا میں جوزف ثانی کے اصلاحات، شمالی امریکہ میں ممالک متحدہ کا قائم ہونا فرانسیسی انقلاب کے تغیرات اور نپولیونی سلطنت، براعظم یورپ کے ممالک میں انگلستان کی سی آئینی بادشاہی کا قائم ہونا، نیابتی عمومیہ جس کو رواج دینے کی کوششیں، قومی سلطنتوں کی بنا قانونِ عامہ پر جو ایک مذہبی غلاف پڑا تھا اُسے اُتار پھینکنا مذہب کا سلطنت سے جدا کر دیا جانا، یا کم از کم اُن دونوں میں ہر ایک کے میدان عمل کی حدبندی ہو جانی، جاگیرداری طریق اور ہر طرح کے امتیازی گروہوں کے حقوق و رعایات کی تنسیخ، قومی اتحاد کے تخیل کا عروج پانا، معاشرت کی آزادی کا تسلیم کر لیا جانا یہ سب جدید اجتماعی زندگی کی اور اس لئے جدید سلطنت کی پہلی کوششیں ہیں یا پہلی تشکیل و نتائج -

تعلیق - ہم نسل انسانی کی تاریخ کو اس کے داخلی ارتباط اور ایک معین ترتیب میں دیکھنے کے عادی ہیں، اس لئے ہم دنیا کی مختلف عمروں میں اُسی طرح فرق کرتے ہیں جس طرح ہم افراد کی زندگی کے مختلف مدارج میں تمیز کرتے ہیں - ہم نوع انسانی کے زمانی مدارج کو طفولیت اور شباب سے تعبیر کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُس کے شباب کا زمانہ قدیم یونانی اور رومی تہذیب کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اسی طرح ہم ازمنۂ وسطیٰ کو ایک طرف قدیم یونانیوں اور رومیوں کے نوجوانانہ دور شباب کا درمیانی دور اور دوسری جانب دنیا کے بعد

کی زیادہ پختہ اور مردانہ حالت سے ممیز کرتے ہیں۔

جس طرح فرد واحد کی زندگی کا شمار برسوں اور دہائیوں سے ہوتا ہے اُسی طرح نوع انسانی کی زندگی کا شمار سیکڑوں اور ہزاروں برس سے ہونا چاہیے۔ بعض اوقات ہم خاص دوروں کے اندر بھی یہی چکر اور عمروں کے یہی مراتب دیکھتے ہیں۔ پہلے عروج کے اور پھر زوال کے مدارج نظر آتے ہیں۔ اور جس طرح تاریخ عالم کے بڑے دوروں کی ایک معیّن خصوصیت و روح ہوتی ہے، بالکل یہی حال اُن دوروں کی اندرونی قرنوں اور حالتوں کا ہوتا ہے۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے نصف اوّل اور نصف آخر کا لینۃً ایک دوسرے سے جداگانہ طور کے ہیں اور یہی کیفیت سولھویں صدی کے اول و آخر حصوں کی ہے۔

اتحاد تاریخ میں اتحاد انسانیت داخل ہے۔

لیکن تاریخ عالم پر غور کرنے کا یہ سارا طریقہ صرف اُسی حالت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ اول یہ فرض کر لیا جائے کہ انسانیت محض افراد کا ایک مجموعہ نہیں ہے نہ اُس کی زندگی محض افراد کی زندگی کا حاصل جمع ہے۔ اُس کا انحصار اس خیال پر ہے کہ انسانیت (نوع انسانی) بجائے خود ایک مکمل شئے ہے، اور خود اس کا ایک نشو و نما ہے جو اپنی حرکت اور ترقی کے لئے ان سے وسیع تر زمانوں کا خواہاں ہے جو انسانی زندگی کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ جب ہم سیکڑوں اور ہزاروں برسوں کے پورے پورے مجموعی زمانوں پر نظر کرتے ہیں تو پھر یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم پر اس پرزور تسلسل اور اُس معین ترتیب ترقی کا اثر نہ پڑے اور اس سے ہم نسل انسانی کے اتحاد اور اُس نوع انسانی کے آئندہ مقدر کا نتیجہ نکالتے ہیں جس کی طویل زندگی افراد کی ان چھوٹی چھوٹی زندگیوں سے بے پروا ہو کر ترقی کر رہی ہے جو بالارادہ یا بلا ارادہ اُس میں شریک ہیں۔

نسل انسانی کی مدت

اگر یہ خیال صحیح ہے تو ہمیں یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ عالمگیر تاریخ میں جس نوع انسانی کا بیان ہوتا ہے اُس کی مدت عمر کیا ہے۔ یہ امر اغلب نہیں معلوم ہوتا کہ انسانیت کا غیر معلوم یا قلیل المعلوم دور طفولیت نامحدود زمانے تک وسیع ہوتا جائے اور اس کی نوجوانی اور سن رسیدگی چند ہزار برسوں سے زائد نہ بڑھے دونوں میں کوئی نہ کوئی نسبت ہونا چاہئے لیکن یہ احتمال موجودہ زمانے کے طبیعی علوم کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

تخلیق عالم کی سامی تاریخ زمین کی عمر کو گھٹا کر چند ہزار برس بیان کرتی ہے لیکن زیادہ تر تحقیق نے اسے نہایت ہی وسیع کر دیا ہے، اور ہم اب لاکھوں اور

کروڑوں کیا اربوں سے اُس کا شمار کرنے لگے ہیں اسی قسم کی تحقیقاتوں سے نسل انسانی کے آغاز و ابتدا کے زمانے کو ایسے وقت تک پیچھے ہٹا دیا ہے جس کا قطعی تعین مشکل ہے اور تاریخ مابعد کے جو زمانے معلوم ہوتے ہیں اُن سے وہ بے انتہا زیادہ بعید ہے۔ کم از کم اس قدر اگر یقینی نہیں تو اغلب ضرور ہے کہ لاکھوں برس پیشتر کچھ مخلوقات انسان کے مثل موجود تھے۔ تاریخ طبعی نے ابتدائی انسانوں کی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کے باقیات کا پتہ چلایا ہے جو اُس نامعلوم قبل التاریخ زمانے سے متعلق معلوم ہوتی ہیں جس زمانے میں غاروں میں رہنے والے ریچھ کا پتہ چلتا ہے طبعی تاریخ اُس ربط اور اُن تقلیبی مدارج کو بھی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے جو انسانی جسم کو حیات حیوانیہ کے زیادہ قدیمی اجسام کے مماثل بتاتے ہیں۔ طبعی تاریخ کی رو سے یہ گمان بھی غالب ہے کہ قبل التاریخ زمانے کا انسان اپنے موجودہ قائم مقام (انسان) کے بہ نسبت لنگوروں اور دوسرے حیوانوں سے زیادہ قریبی تعلق رکھتا تھا۔ اس بیان سے پہلی نظر میں تو ہمارے مشکلات بڑھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر زیادہ غائر نظر ڈالئے تو خود اسی بیان سے اُن مشکلات کا حل پیدا ہو جاتا ہے۔

انسانی تخلیق کی تاریخ اس قدر پیچھے ہٹا کر قائم کی جا سکتی ہے کہ وہاں تک روایتی رائے کا وہم و گمان بھی نہیں پہنچ سکتا لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم تہذیب کی تاریخ کو اور اُس تاریخ کو جسے ہم عالمگیر تاریخ کہتے ہیں۔ اس قدر پیچھے ہٹا لیجائیں۔ تاریخ عالم اُسی وقت سے شروع ہو سکتی ہے جب کہ ایک اعلیٰ انسانی نسل نے نوع انسان کی تکمیل کے لئے خود کچھ کرنے کی قابلیت پیدا کر لی تھی۔ پس اس کی ابتدا سفید نسلوں کے ظہور سے ہوتی ہے۔ یہی لوگ روشنی کے فرزند ہیں اور یہی دنیا کی تاریخ کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہیں یہ سفید انسان اتنے قدیم نہیں ہو سکتے جتنے قدیم انسان نما بندر ہیں۔

تاریخ کا آغاز سفید انسان سے ہوتا ہے

تاریخ عالم کے عضوی اور نفسی نمو کے قانون کو جسمانی تناسل کے طبعی قانون کے ساتھ خلط ملط نہ کر دینا چاہیئے۔ نوع انسان کا وہ مشترک احساس اور اُس کی وہ مشترک روح؛ اور حسیات و خیالات کے وہ ارتقائی مدارج جو انسان کے کاموں سے ظاہر ہوتے ہیں سب کے سب اُس کی اعلیٰ فطرت سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ حیوانی خصلتوں سے۔

ادنیٰ درجے کی انسانی نسلوں کا پہلا ظہور انسانیت کے اعلیٰ اشکال

کی مادی بنیاد تصور کیا جا سکتا ہے مگر انسانیت کی حقیقی تاریخ سے اُن ادنیٰ نسلوں کو اُتنا ہی لگاؤ ہو سکتا ہے جتنا رنگ اور موقلم کو مصور کے نقش کمال سے ہوتا ہے۔

چھٹا باب

(ب) ازمنۂ قدیمہ و وسطیٰ کے تصورِ سلطنت سے جدید تصورِ سلطنت کے خاص خاص فرق

ان فرقوں کا اظہار حسبِ ذیل صورتوں سے واضح ہو سکتا ہے:-

۱۔ قدیم اور جدید سلطنت کے فرق (۱) حقوقِ انسان بحیثیت انسان

ازمنۂ قدیمہ کی سلطنت

۱۔ قدیم سلطنت انسان کے شخصی حقوق کو تسلیم نہیں کرتی تھی اور اسی لئے انفرادی آزادی کو بھی نہیں مانتی تھی۔ تمام قدیمی سلطنتوں میں آبادی کا کم سے کم نصف حصہ غلاموں پر مشتمل تھا جن کے کچھ بھی حقوق نہیں تھے اور آزاد شہریوں کی تعداد آبادی کا صرف چھوٹا آدھا حصہ تھی زراعت مویشیوں کی پرورش، صناعت، خانگی خدمات اور ایک بڑی حد تک تجارت بھی ترجیحاً غلاموں کے سپرد ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ محنت کی کچھ وقعت نہ تھی اور محنت مزدوری کرنے والے کسی شمار میں نہ تھے غلاموں کا تعلق سلطنت سے صرف اُن کے آقاؤں کے توسط سے ہوتا تھا سلطنت میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا نہ ان کا کوئی وطن تھا۔ غلام انسانی حقوق سے تقریباً بالکل ہی محروم کردئے گئے تھے البتہ رواج اکثر قانون سے بہتر تھا مگر بہترین صورت میں بھی ان کی واقعی منزلت غیر متعین تھی اور دفعتہً بدترین صورت میں تبدیل ہو سکتی تھی وقتاً فوقتاً غلاموں

دورِ جدید کی سلطنت

۱۔ جدید سلطنت ہر شخص کے لئے حقوقِ انسانی کو تسلیم کرتی ہے، غلامی ہر جگہ ظلم سمجھکر منسوخ کردی گئی ہے یہاں تک کہ زرعی غلامی اور موروثی اطاعت کو بھی انسان کی طبعی آزادی کے خلاف سمجھکر برطرف کردیا گیا ہے، انسان انسان کو اپنی ملک نہیں بنا سکتا کیونکہ انسان کوئی شے نہیں بلکہ ہمیشہ "شخص" (یعنی خود صاحبِ حقوق) ہے اس امر میں ہر شخص آزاد ہے کہ وہ جس کام کو چاہے اُسی کو اختیار کرے اور ہر کام باوقعت سمجھا جاتا ہے آبادی کے تمام طبقات سلطنت میں ایک سیاسی حیثیت رکھتے ہیں اور رائے دہی کا حق مزدوروں اور ملازموں تک کے لئے وسیع کردیا گیا ہے غلاموں کی شورشوں کا خطرہ مفقود ہو گیا ہے کل سلطنت زیادہ وسیع بنیاد پر قائم ہے اُس کی جڑیں تمام آبادی کے اندر پھیلی ہوئی ہیں

کی شورشیں پھوٹ پڑتی تھیں۔ اور ظالمانہ طور پر دبائی جاتی تھیں۔

سلطنت کے عمل کی تحدید و وسعت۔

۲۔ سلطنت کا قدیم تخیل افراد قوم کی پوری انسانی زندگی پر حاوی تھا جس میں مذہبی، قانونی، اخلاقی، حرفتی، تہذیبی، علمی سب حالات شامل تھے مذہبی پیشوائی بھی ایک سیاسی عہدہ تھی۔ قدیم سلطنت نے افراد کی کامل دماغی آزادی کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔

۲۔ جدید سلطنت اپنی طاقت اور اپنے حقوق کے حدود سے آگاہ ہو گئی ہے وہ خود کو حقیقتاً ایک قانونی اور سیاسی جماعت سمجھتی ہے، وہ مذہب اور عبادات پر حکمراں ہونے کے دعوے سے دست بردار ہے اور ان دونوں کو مذہب وافراد کی رائے پر چھوڑتی ہے، مذہبی پیشوائی ایک دینی عہدہ ہے۔ جدید سلطنت کسی قسم کے علمی اور حرفتی اقتدار کا بھی دعویٰ نہیں کرتی، البتہ وہ علمی تحقیقات اور اظہار رائے کی آزادی کی قدر اور اس کی محافظت کرتی ہے۔

شخصی آزادی، قانون شخصی

۳۔ قدیم زمانے کے انسان کو پورے حقوق صرف سلطنت کی رعایا ہونے کی حیثیت سے حاصل تھے۔ یونانیوں میں عام قانون اور شخصی قانون کا فرق نہیں قائم ہوا تھا بلکہ دونوں قسم کے قانون آپس میں گڈمڈ تھے۔ رومیوں نے ان دونوں کو اصولاً تو علیحدہ کیا مگر پھر بھی ان کا شخصی قانون کلیتہً قوم اور سلطنت کی مرضی پر منحصر رہا۔ سلطنت کے مقابل میں شخصی آزادی اس وقت تک بھی تسلیم نہیں کی گئی تھی۔

۳۔ موجودہ زمانے میں انسان کو انفرادی حیثیت سے حقوق حاصل ہیں۔ قانون شخصی قانون عامہ سے بیّن طور پر ممیز ہے، سلطنت شخصی قانون کی وضع کرنے والی نہیں بلکہ اسے تسلیم کرنے والی ہوتی ہے اور اسے اپنے تابع کرنے کے بجائے زیادہ تر اس کی محافظ ہوتی ہے، آزاد شخص سلطنت میں جذب نہیں ہو جاتا بلکہ آزادانہ طور پر ترقی حاصل کرتا ہے اور اپنے حقوق کو حکمراں طاقت کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ خود اپنی مرضی کے موافق عمل میں لاتا ہے۔

اقتدار سلطنت

۴۔ قدیم زمانے کی سلطنت کا اقتدار غیر محدود

۴۔ جدید زمانے کی سلطنت کا اقتدار آئینی طور پر

تھا۔

حکومت بلاواسطہ / حکومت نیابتی

۵۔ صاحبان اختیار اپنے اختیاراتِ عامہ کو براہِ راست کام میں لاتے تھے۔ قدیم جمہوری سلطنت میں سارے شہری، بڑے بڑے عام جلسوں میں جمع ہوتے تھے (جنھیں یونانیوں کے ہاں اکلیسا اور رومیوں کے ہاں کومی ٹیا کہتے تھے) اور سلطنت کے اہم معاملات کا فیصلہ اُنھیں عام جلسوں میں کرتے تھے۔

شہر، قوم

۶۔ یونانی سلطنتیں درحقیقت شہروں کی سلطنتیں تھیں، روما ایک شہر ہی کی سلطنت سے ترقی کرکے دنیا کی سلطنت بن گیا تھا۔

تفریق فرائض

۷۔ قدیم سلطنت میں فرائض عامہ کی تفریق اُن کی نوعیت اور اغراض کے لحاظ سے کی گئی تھی مگر پھر بھی بالعموم ایک ہی مجلس اور ایک ہی عامل مختلف النوع فرائض انجام دیتے تھے یعنی قانونی بھی اور انتظامی بھی۔

تعلقات بین الاقوامی

۸۔ قدیم سلطنت اگر اپنے اقتدار کو اپنے ملک کے حدود کے اندر ہی تک محدود سمجھتی بھی تھی محض اتفاقیہ وجہ سے کہ دوسری سلطنتوں کی مقاومت سدِ راہ تھی، نہ اس وجہ سے کہ وہ خود کو کسی عام بین الاقوامی قانون کا پابند سمجھتی تھی چنانچہ روما تمام دنیا پر مسلط ہو جانے کو بیباکی کے ساتھ اپنا فطری حق سمجھتا تھا۔

محدود ہے۔

۵۔ جدید سلطنت نیابتی ہے، ان عام جلسوں کی جگہ ایک نیابتی مجلس ہوتی ہے جسے اہل ملک منتخب کرتے ہیں۔ اس زمانے کی نیابتی مجلسوں کو زمانہ قدیم کی عمومی مجلسوں کے بہ نسبت قوانین کو جانچنے، تجاویز پر غور کرنے اور امور سلطنت پر قابو رکھنے کی زیادہ قابلیت حاصل ہے۔

۶۔ جدید سلطنتیں حقیقتاً قومی سلطنتیں ہیں شہر سلطنت کا صرف ایک جزو ہے اس کا قلب نہیں ہے۔

۷۔ جدید سلطنت میں مختلف فرائض کے لئے مختلف کارکن معین ہیں پس اختیارات کی وہ قدیم تفریق جس کی بنا محض اشیا پر قائم ہوئی تھی اب ترقی کرکے ایک ایسی تفریق بن گئی ہے جو فرائض کی شخصی تقسیم پر مبنی ہے۔

۸۔ جدید سلطنتیں بین الاقوامی قانون کو اپنے اقتدار و تسلط کی حد سمجھتی ہیں۔ بین الاقوامی قانون تمام قوموں اور سلطنتوں کی ہستی اور آزادی کی حفاظت کرتا اور تمام قوموں پر کسی ایک سلطنت کے عالمگیر تسلط کو مسترد کرتا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ اور دورِ جدید کی سلطنت کے فرق بابت خدائی یا انسانی مبدأ

ازمنۂ وسطیٰ اور دورِ جدید کی سلطنتوں کے درمیان فرق حسبِ ذیل ہیں :-

ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت	دورِ جدید کی سلطنت
۱- ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت اور سلطنت کے اختیار کا مبدا خدا کو سمجھتے تھے۔ سلطنت گویا ایک تنظیم تھی جس کو خدا نے اپنی مرضی سے پیدا کیا تھا۔	۱- دورِ جدید کی سلطنت انسانی ذرائع سے انسانی فطرت کے تقاضے کی بنا پر قائم ہوئی ہے سلطنت حیاتِ مشترکہ کا ایک نظام ہے جسے انسان نے انسانی اغراض کے لئے بنایا اور وہی اس کا انتظام کرتا ہے۔
۲- سلطنت کا تصور مذہبی اصول پر مبنی تھا اور یہی اصول اس کا انضباط کرتے تھے۔ اسلام جس کا تعلق تمام تر ازمنۂ وسطیٰ سے ہے وہ صرف خدا کی ایک سلطنت کو تسلیم کرتا ہے جسے خدا نے سلطان کے تفویض کر دیا ہے، ازمنۂ وسطیٰ کی عیسائیت، مذہب اور سلطنت کی دوگونگی کا اقرار کرتی ہے مگر یہ یقین رکھتی ہے کہ روحانی اور دنیاوی دونوں تلواریں خدا کی ہیں، اور اس نے ایک تلوار پوپ کو اور دوسری شہنشاہ کو تفویض کر دی ہے۔ پروٹسٹنٹ مذہب نے روحانی تلوار کے خیال کو منتشر کر دیا اور صرف سلطنت کی ایک تلوار کو تسلیم کیا مگر وہ بھی اس مذہبی خیال پر مضبوطی سے جما رہا کہ شاہی اقتدار خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔	۲- سلطنت کے بنیادی اصول کا تعین انسانی علوم فلسفہ و تاریخ سے ہوتا ہے، جدید علم السیاست سلطنت کی تشریح کرتے وقت انسان ہی سے شروع کرتا ہے، بعض اشخاص سلطنت کو افراد کی ایک جمعیت (سوسائٹی) سمجھتے ہیں۔ جو اپنے امن و آزادی کی حفاظت کے لئے باہم متحد ہو گئے ہیں، بعض اسے قوم کی روحیت و اتحاد کا مجسمہ سمجھتے ہیں۔ سلطنت کا جدید تخیل مذہبی نہیں ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ غیر مذہبی ہے یعنی وہ سلطنت کا انحصار مذہبی اعتقاد پر نہیں رکھتا مگر وہ اس سے بھی انکار نہیں کرتا کہ خدا نے انسانی فطرت کو بنایا ہے اور حکومت عالم میں اس کی مرضی شریک ہے۔ جدید علم السیاست خدا کے طریقوں پر حادی ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ سلطنت کو ایک انسانی تنظیم جان کر اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

مذہب و علم

خدائی حکومت

۳۔ ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت کا منتہائے خیال قدیم ایشیائی قوموں کی طرح براہ راست خدائی حکومت کا خیال نہیں تھا بلکہ سلطنت بالواسطہ خدائی حکومت سمجھی جاتی تھی، حکمراں خدا کا نائب تھا۔

۳۔ کسی قسم کی خدائی حکومت کا خیال جدید اقوام کے احساس سے بالکل مستبعد ہے۔ جدید سلطنت انسان کی معین کی ہوئی آئینی تنظیم ہے سلطنت کا اختیار قانون عامہ سے مشروط ہے اور اس کے سیاسیات کی غایت المرام قوم کی بہبود (یا رفاہ عام) جسے انسانی عقل سمجھ سکتی ہے اور جو انسانی ذرائع سے عمل میں آتی ہے۔

مذہب

۴۔ ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت مذہبی ملت پر مبنی اور اتحاد اعتقاد کی خواہاں تھی منکروں اور ملحدوں کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہیں تھے، اُن پر ظلم ہوتا اور اُن کا استیصال کیا جاتا تھا، ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مراعات یہ تھی کہ اُن سے تعرض نہ کیا جائے۔

۴۔ جدید سلطنت مذہب کو قانونی معیار کی کوئی شرط نہیں سمجھتی۔ قانون عامہ و قانون شخصی دونوں اعتقاد مذہبی سے آزاد ہیں جدید سلطنت آزادی اعتقاد کی حفاظت کرتی ہے اور مختلف مذاہب اور دینی انجمنوں کو امن و آشتی کے ساتھ متفق رکھتی ہے، وہ غیر مذہب والوں کو یا منکروں کو کسی قسم کا آزار پہنچانے سے باز رہتی ہے۔

کلیسا

۵۔ ازمنۂ وسطیٰ میں مسیحی دنیا کلیسا کو روحانی اور اس وجہ سے افضل و برتر اور سلطنت کو جسمانی اور اس وجہ سے کمتر سمجھتی تھی۔ چنانچہ پیشوائے مذہبی کی حکومت یا کم از کم اُس کی ولایت بادشاہوں پر قائم سمجھی جاتی تھی مقتدایان دین کا فرقہ عام لوگوں سے بہت زیادہ بلند تھا اور ایسے خاص حقوق رکھتا تھا جن سے بعضے جرموں کے ارتکاب پر بھی سزا لازم نہ آتی تھی۔

۵۔ جدید سلطنت اپنے کو ایک شخص سمجھتی ہے جس میں روح بھی ہے (یعنی قومی روح) اور جسم بھی (یعنی آئین سلطنت) وہ اپنے کو کلیسا تک کے مقابل میں آزاد سمجھتی ہے کیونکہ کلیسا بھی اُس کے مثل جسم و روح پر مشتمل ہے اور ایک مذہبی مجموعی شخصیت رکھتا ہے۔ سلطنت مختار اور آزاد ہے اور کلیسا پر بھی اپنی برتری کو قائم رکھتی ہے۔ وہ مقتدایان دین کے تفوق کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ اُس نے اُن کے ایسے حقوق کو جن کی بنا پر وہ قانون کی پابندی سے مستثنیٰ تھے

	منسوخ کردیا ہے اور قانون کے اختیار کو تمام طبقات پر یکساں طور پر وسیع کردیا ہے۔	
۶۔ ازمنۂ وسطیٰ میں نوجوانوں کی تربیت کا ہادی و رہبر کلیسا تھا اور علم پر بھی اُسی کا اختیار چلتا تھا۔	۶۔ جدید سلطنت نے صرف مذہبی تربیت کو کلیسا کے ہاتھ میں رہنے دیا ہے۔ مدرسۂ سلطنت کا مدرسہ ہے۔ علم دینی اقتدار سے آزاد ہے اور سلطنت اُس کی آزادی کی محافظ ہے۔	تعلیم
۷۔ ازمنۂ وسطیٰ میں عام قانون اور شخصی قانون آپس میں خلط ملط تھے۔ مملکتی اقتدار ملکیت اراضی کے مشابہ سمجھا جاتا تھا اور شاہی اختیار گویا ایک خاندانی حق تھا۔	۷۔ جدید سلطنت نے عام قانون اور شخصی قانون کو ایک دوسرے سے ممتاز کردیا ہے اور اُس نے حقوق عامہ کے ساتھ فرائض عامہ کو بھی لازم کردیا ہے۔	قانون عامہ و قانون شخصی
۸۔ ازمنۂ وسطیٰ کا رجحان زعامت (یعنی جاگیرداری طریق) کی طرف تھا۔ پس سلطنت کی طاقت کے ٹکڑے ہوگئے اور تدریجی نزول کے ساتھ یہ طاقت خدا سے بادشاہ کو، بادشاہ سے نوابوں (امرا) کو نوابوں سے جاگیرداروں (یا منصبداروں) اور شہروں کو حاصل ہوگئی تھی۔ قانون کی تعمیر نے ایک تخصیصی نوعیت اختیار کی تھی (یعنی اُس کی بنیاد یکساں اور ہموار نہ تھی)۔	۸۔ جدید زمانے میں سلطنت قوم کی تنظیم کا نام ہے جو اپنے اختیارات کی متحدہ قوت کو ایک مرکز پر قائم رکھتی ہے۔ سلطنتیں قومی اتحاد پر مبنی ہوتی ہیں اور اس کی کوشش کرتی ہیں کہ اُن میں افراد کی تعداد بہت زیادہ ہوجائے۔ قانون ایک قومی اور انسانی عضویہ ہے اور سب پر یکساں طور پر نافذ ہوتا ہے۔	خصوصیت اور مرکزیت
۹۔ نیابت، طبقات کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ اشرافی طبقات یعنی پادریوں اور اعیان کو غلبہ حاصل تھا۔ قانون بھی ہر طبقے کے لیے مختلف تھا۔	۹۔ جدید سلطنت تمام قوم کی یکساں نیابت کی خواہاں ہے۔ قوم کے کثیر التعداد گروہوں کی طاقت غالب ہے۔ پس سلطنت کی بنا عمومیت پر ہے۔ حقوق شہریت میں تمام فرقے یکساں طور پر شامل ہیں۔ قانون تمام ملک و قوم کے لیے ایک ہی ہے۔	نیابت
۱۰۔ امرا چھوٹے ہوں یا بڑے ان کی خاندانی اور	۱۰۔ جدید سلطنت تمام گروہوں میں شہریت کی	آزادی۔

طبقاتی آزادی اس درجہ محفوظ تھی کہ سلطنت کا اقتدار کمزور ہوگیا تھا، دوسری جانب کاشتکاروں کا طبقہ غیر آزاد حالت میں مقید تھا۔

علم آزادی کو ترقی دیتی ہے، اور ہر شخص کو اقتدار سلطنت کی اطاعت پر مجبور کرتی ہے۔

سلطنت کے عمل کی حد و وسعت

۱۱۔ ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت محض ایک قانونی سلطنت تھی، مگر عدالت کے ذریعے سے حقوق کی پوری حفاظت نہیں ہوتی تھی اور لوگوں کو اکثر اپنے حقوق کی حفاظت خود ہی کرنی پڑتی تھی۔

حکومت اور انتظام دونوں کمزور تھے اور اُن میں بہت کم ترقی ہوئی تھی۔

۱۱۔ جدید سلطنت چونکہ آئینی سلطنت ہے اس وجہ سے وہ بھی ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت کی طرح قانونی سلطنت ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ معاشی اور تہذیبی سلطنت بھی ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ سیاسی سلطنت ہے۔

جدید زمانے کی سلطنت کی حکمرانی پُرقوت ہے اور اُس کا نظم و نسق قوم اور سوسائٹی کی بہبود کے نقطۂ نظر سے مضبوط طور پر قائم کیا گیا ہے۔

غیر ارادی رواج اور ارادی قانون

۱۲۔ ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت کو خود اپنی روح کا احساس بہت کم تھا سلطنت کی بنا شعور فطری اور رجحانات پر قائم ہوتی تھی اور دیکھنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک خودرَو چیز تھی۔ اُس کے قانون کا اصل ماخذ رواج تھا۔

۱۲۔ جدید سلطنت کو خود اپنا احساس و ادراک ہے اس کے کام شعور طبعی کے بجائے اصول و عقل کے تابع ہوتے ہیں، اس کے قانون کا خاص منبع تشریع ہے

ساتواں باب

سلطنت کے مختلف نظریوں کا ارتقا

سلطنت کے تخیل اور اُس کے واقعی مفہوم کی تبدیل ہیئت میں علم السیاست[1] نے بھی بہت ہی اہم حصہ لیا ہے، جدید سیاسی نظریہ۔ جدید سیاسی عمل سے پہلے وجود میں آیا۔ عملی سلطنت کے تغیرات کی راہ میں ہر قدم پر نظریۂ سلطنت چراغ ہدایت بن کر اُس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ نظریۂ عمل کے پیچھے پیچھے رہا۔

نظریۂ سلطنت کی عملی ارتقا کے حسب ذیل اہم مراحل خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں:۔

نشاۃ جدیدہ

نشاۃ جدیدہ کے وقت میں سلطنت کا جو تصور بالخصوص ماکیاویلی بوڈن اور کسی قدر ہوغو غروتیس[2] کی تحریرات میں ملتا ہے، وہ قدیمی خیال کا بلا واسطہ نتیجہ ہے گر اُس سے منحرف ہونا شروع ہوگیا تھا۔

ماکیاویلی

ماکیاویلی کے نزدیک سلطنت کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی ہے، وہ انسانی سرشت کی شریف ترین آفرینش سمجھکر اس کا احترام کرتا اور ولولہ انگیز طور پر اُس سے الفت رکھتا ہے وہ بلا تامل ہر شے کو یہانتک کہ مذہب اور نیک صفاتی کو بھی اُس پر قربان کردیتا ہے مگر اُس نے سلطنت کو اس قسم کی قانونی یا آئینی سلطنت نہیں باقی رکھا ہے جیسی رومیوں کی قدیمی سلطنت تھی، اُس کے نزدیک قانون عامہ صرف سلطنت کی بہبود کے ترقی دینے اور اُس کی ترقیِ طاقت کی حفاظت کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

---

[1] بلنچلی کی تصنیف: "قانون ملکی اور سیاسیات کی تاریخ (میونک ۱۸۶۴ء۔ طبع ثالث ۱۸۸۲ء) میں علم السیاست کی اس ارتقا کا زیادہ تفصیلی بیان درج ہے۔

[2] یاد رہے کہ ولندیزی زبان میں G کا تلفظ ہمیشہ غ کیا جاتا ہے اور بعض حالتوں میں خ۔ (ع ص)

اُس کا تخیل سلطنت بتمامہ سیاسیات سے بھرا ہوا اور اسی کے تابع ہے۔ اُس کے نزدیک سلطنت نہ اخلاقی ہے اور نہ قانونی بلکہ وہ محض ایک سیاسی شے ہے۔ پس سلطنت کے تمام کاموں کا معیار محض سود مندی ہے۔ سلطنت کی قوت اور اس کا اقتدار جس امر کا متقاضی ہو صاحب سلطنت (مدبر ملک) کو وہی کرنا چاہیئے اور اخلاقی ضوابط اور قانونی رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لانا چاہئے البتہ جو امر سلطنت کی بہبود کے حق میں مضر ہو اُس سے پہلو بچا جانا چاہیئے۔

ماکیاویلی کی بڑی خدمت یہ تھی کہ اُس نے علم السیاست کو دینیات سے بالکل آزاد کر دیا اور قانون عامہ اور سیاسیات کا فرق دریافت کیا مگر اس نے ایک خلاف اخلاق اور خلاف قانون طرز عمل کو سراہا ہے اور اپنی دانشمندانہ مشورت کو ظلم و جور کے تابع کر دیا ہے اور اس طرح گزشتہ چند صدیوں کے سیاسی دستور کو خراب کرنے میں مدد دی ہے۔

بوڈن

بوڈن، سلطنت کا مفہوم یہ سمجھتا ہے کہ چند خاندان اور اُن کے مشترک مقبوضات کی صحیح حکومت شاہی اقتدار کے ساتھ ہو۔ وہ سلطنت کی بنا بالتخصیص خاندان مقبوضات مشترک اور اقتدار شاہی پر رکھتا ہے اور قدما کے ان سیاسی خیالات کو مورد الزام سمجھتا ہے کہ اُنھوں نے خوشحالی و کامیابی پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی۔ حکمراں کے اقتدار شاہی کے اصول سے اس نے فرانسیسی بادشاہوں کی مطلق العنانی کو علمی تقویت دیدی۔

غوتیس

ہوغو غروتیس ہنوز سیسرو کی تعریفات کی طرف رجوع تھا مگر پھر بھی جدید سیاسی خیالات کی طرف اس کا میلان بہت ہی بین طور پر نظر آتا ہے۔ قدما کی طرح وہ بھی سلطنت کی بنا انسانی فطرت پر رکھتا ہے مگر نسبتاً وہ بنی نوع انسان یا تمام قوم کا خیال کم کرتا ہے وہ سب سے زیادہ منفرد اشخاص پر نظر ڈالتا ہے اس کا یہ قول کہ انسان مدنی الطبع ہے ارسطو کے اس قول کا ناقص ترجمہ ہے کہ "انسان ایک سیاسی حیوان ہے"۔ مگر اس سے ایک خصوصیت کے ساتھ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جدید طبائع سلطنت سے ابتدا نہیں کرتیں جیسا کہ متقدمین کا عمل تھا بلکہ افراد سے ابتدا کرتی ہیں اور اُن کے مجموعے کی طرف بعد کو توجہ کرتی ہیں۔ کلیسا کی مذہبی جماعت کا سلطنت کی دنیاوی اور سیاسی جماعت سے قطعی علٰحدہ کر دینا اور شخصی آزادی پر زور دینا اس ولندیزی مصنف کے جدید میلان طبع کے دو مزید شواہد ہیں۔ وہ سلطنت کو آزاد اشخاص کا اتحاد کامل بتاتا ہے جو قانون سے نفع اُٹھانے اور عام بہبود کے خیال سے باہم متفق ہو جاتے ہیں۔

سلطنت کی شخصیت سے بھی وہ نا واقف نہیں تھا مگر اس کے سیاسی نظریئے پر اس خیال کا غلبہ نہیں ہے، عام رضامندی کو قانون عامہ کا اہم ماخذ قرار دینے سے اُس نے اُسی خیال کی طرف اشارہ کیا ہے جس نے بعد کے زمانے میں نظریۂ معاہدہ کی صورت اختیار کی۔

۲۔ قانون فطرت کے نظریے اور سلطنت معاہدہ اور سلطنت ارتباط۔

قانون فطرت کے نظریہ جدید کی بنا یہی خیال معاہدہ ہے اور اُس تخمینی فلسفہ سیاسی کی بنا بھی یہی ہے جو سلطنت کے قدیم نظریات سے بالکل آزاد ہو کر قائم کیا گیا ہے فلسفی جماعتوں اور سیاسی فریقوں کے اختلافات نے رایوں میں بڑا تفرقہ ڈال دیا اور مشکل سے کوئی ایک مصنف دوسرے مصنف سے پورا اتفاق کرتا تھا، مگر فطری قانون کے متعدد بیانوں اور سلطنت کے عام تصور میں موجودہ صدی تک یہ بنیادی خیال پھیلا ہوا تھا کہ سلطنت دراصل افراد کا ایک اجتماع ہے اور اس لئے وہ شخصی آزادی کا ایک علی الاطلاق فعل ہے (جو کسی قاعدے کا پابند نہیں) اس معاملے میں حکومت علی الاطلاق کا حامی، ہابس جس نے بادشاہ کے اختیار کو ایک بلا نوشس عفریت بنا دیا ہے، اور وہ اصول پرست خانہ برانداز روسو جس نے "اپنے قومی اقتدار اعلیٰ" کے نظریے سے سارے نظم سلطنت کے استقرار کو ایک بحث طلب مسئلہ بنا دیا ہے؛ دونوں ہمنوا ہیں ذہیں ساموئیل یوفن ڈورف سلطنت کو ایک "اخلاقی شخص" قرار دیتا ہے، مگر اُس کے نزدیک بھی سلطنت کی مرضی جملہ افراد کی مرضی کا مجموعہ ہے اور سلطنت کی تشریح وہ بھی معاشرتی معاہدے کے نظریہ سے کرتا ہے۔ جان لاک نے مذہبی متعصبوں کے مقابلے میں نظریۂ معاہدہ کی پرجوش حمایت کی ہے اور اُس کی نظر میں بھی نظریہ انگریزوں کی ملکی آزادی کی ایک ضمانت ہے۔ کانٹ[1] بھی اس سے آگے نہیں بڑھا ہے اگرچہ اس کا میلان یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دائرے سے نکل جانا چاہتا ہے اور فشتے بھی اپنی سابقہ تحریروں میں اسی خیال پر قائم ہے۔

نظرتی حقوق کے تمام فلسفے کے مطابق سلطنت کی حقیقی بنا معاہدے اور اجتماع پر

[1] دیکھو کانٹ کے تصنیفات (مرتبہ روزن کرانتس) جلد ۷ صفحہ ۱۹۷۔
تمام معاشرتی معاہدات میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ کسی خاص غرض کے لئے بہت سے لوگ متحد ہو جاتے ہیں مگر ایسا اتحاد جو فی نفسہ مقصود آخری ہو وہ صرف تنظیم معاشرت ہی میں پایا جاتا ہے مگر اُسی حد تک جہاں تک کہ نظم معاشرت ایک مجموعی حیثیت رکھتا ہو۔

اگر قدیم فلسفیوں نے افراد کے حقوق پر کافی توجہ نہیں کی، تو جدید فلسفیوں نے اُن کے برعکس یہ غلطی کی ہے کہ انھوں نے انفرادی حیثیت کو اتنا بڑھایا کہ سلطنت کی مجموعی ہستی سے غافل ہوگئے۔

۵۴۔ حاوی اقتدار

فطری قانون کی بنا پر جو نظریہ سلطنت معاشری کا قائم ہوا تھا اُسے دورِ جدید میں اگر عام مقبولیت حاصل ہو سکی۔ اور اسی دور میں اُسے عمل میں لانے کی کوشش کی گئی ۱۷۸۹ء سے قبل کی دو صدیوں کے خود مختارانہ رنگ طبیعت کو ایک ایسا ہی نظریۂ سلطنت پسند آسکتا تھا جس میں سلطنت کی بنیاد اقتدارِ اعلیٰ پر رکھی ہو۔ اُس زمانے میں اس بات کے دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی کہ خود اقتدارِ اعلیٰ کا ماخذ کہاں ہے۔ کبھی تو لوگوں کو کلیسا کے اس روایتی اعتقاد سے اطمینان ہو جاتا تھا کہ حکومت کی تلوار خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے، اور کبھی وہ اس پیشینی روایت کی طرف مائل ہو جاتے تھے کہ امیر یا حکمراں ملک کا مالکِ اعلیٰ ہے لیکن اس اثنا میں ان قدیمی معتقدات میں تغیر ہوتی رہا کچھ تو اقتدارِ اعلیٰ میں قانونِ عامہ کی خصوصیت کے بڑھ جانے کی وجہ سے اور کچھ عام بہبود پر لحاظ کرنے کی ضرورت سے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اس طرح سلطنت کی نسبت یہ خیال پیدا ہو چلا کہ وہی بالاتر شخص کی حکمرانی کے دائرۂ عمل کا نام ہے، اور اقتدارِ اعلیٰ واقعتاً سلطنت کے ہم معنی ہو گیا (جیسا کہ لوئس چہاردہم کہا کرتا تھا کہ "میں ہی سلطنت ہوں")۔ اس خود مختاری کے نظریۂ سلطنت کا بنیادی خیال یہی تھا جسے بوڈن اور ہابس نے تیار کیا اور جسے بالتخصیص علمر (انگریز) اور بوسیویت (فرانسیسی) کے توسط سے مذہبی رنگ میں ترقی حاصل ہوئی اور سیکڑوں مختلف طریقوں سے اسی ایک خیال کی تعلیم ہوتی رہی۔ اقتدار کی اس یک طرفہ بحث میں بالطبع محکوم کی آزادی اور اس کے حقوق بالکل نظر انداز کر دیے گئے تھے جس طرح رومن کیتھولک کلیسا اپنی ہستی کا لب لباب صرف فرقۂ مذہبی کو اور اُس کے سرگروہ پوپ کو قرار دیتا ہے ورد دنیا دار دل کو بھیڑوں کا گلہ سمجھتا ہے جس کی ہدایت و خبر گیری (اور ان سے انتفاع) مذہبی گلہ بانوں پر موقوف ہے، اسی طرح اس نظریۂ سلطنت کے موافق صرف حکمراں اور عہدہ داران حکومت ہی ایک حیثیت رکھتے ہیں اور رعایا محض ایک مطیع و منقاد گروہ ہے، جس پر حکومت کرنا طبقۂ بالا کا کام ہونا چاہیئے اور خود رعایا کو اپنے انتظام کا یا حکومت میں شریک ہونے یا حکمرانوں کے اطوار کی نگرانی کا کوئی حق نہیں ہے۔

سلطنت بحیثیت قانونی سلطنت کے

کانٹ اور ولہیلم فون ہمبولٹ نے سلطنت کو جو اس مفہوم میں ایک قانونی سلطنت بتایا کہ اُس کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ ہر شخص کے قانونی حقوق کی حفاظت کو برقرار رکھے اس دعوے سے اُن کی پہلی غرض اُس وسعت کو تنگ کرنا تھا جو نظریۂ قانونِ فطرت اور نظریۂ اقتدار دونوں کے بموجب حکومت کو حاصل ہوگئی تھی مگر فشتے نے در حقیقت اپنی توضیح سلطنت میں ان تنگ حدود کو توڑ دیا کیونکہ اس نے معاشیات کو بھی سلطنت کے ساتھ مربوط کر دیا بلکہ معاشی سلطنت کی طاقت کو مبالغے کے ساتھ بیان کیا اور اپنی زندگی کے آخر زمانے میں جرمانیا کی آزادی کے قومی جوش سے متاثر ہو کر اُس نے سلطنت کی طرف اس سے بھی برتر روحانی فرائض منسوب کر دیے مگر اُس سے اگلی پشت کے اکثر جرمانی فلسفی اور مقنن اس نظریہ سے متعلق کانٹ ہی کے تنگ مفہوم پر قائم رہے۔

قانونی سلطنت بمقابلہ احتسابی سلطنت

یہ کوئی تعجب کا مقام نہیں کہ یہ خیال بہت سے ایسے لوگوں میں مقبول ہو گیا جو اُس زمانے کی حکومت کے خبط سے اور کوتوالی اور فوج کی بے لگام کارروائیوں سے پناہ ڈھونڈتے تھے مگر جو لوگ "قانونی سلطنت" کو احتسابی (یا کوتوالی) سلطنت کا مقابل قرار دیتے تھے اور جن کے نزدیک زمانۂ جدید کا یہ فرض ہے کہ وہ کوتوالی سلطنت کو ہٹا کر اُس کی جگہ قانونی سلطنت قائم کرے انھوں نے صاف طور پر یہ نہیں سمجھا تھا کہ سلطنت کیسی وسیع چیز ہے۔ سلطنت کو خالص قانونی سلطنت بنا دینا ایسا ہی ناموزوں ہے جیسا اُسے صرف "کوتوالی سلطنت" بنا نا رہا ہے۔ اگر سلطنت کی تدوین یک طرفہ طور پر کر کے وہ "قانونی سلطنت" بنا دی گئی تو وہ بالآخر محض انصاف رسی کی ایک تنظیم ہو کر رہ جائے گی جس میں قانون وضع کرنے والی قوت کی جانب سے قانونی قواعد مقرر کر دیے جائیں گے اور اختیارِ عدالت ان کی حفاظت کرے گا اور انہیں منفرد حالتوں پر عائد کرے گا اور حکومت کی کارفرمائی کے لیے اس کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا کہ وہ قانونی عدالتوں کی خادم یعنی اہلکار کوتوالی بن جائے۔ اقتصادی اغراض، تعلیم و تہذیب اور قومی قوت کا نشوونما سب اُس بیبسی کی حالت میں پڑ جائیں گے اور ملک کی حکمت عملی میں کسی قسم کی عظمت و رفعت باقی نہیں رہے گی۔ اس کے برعکس "احتسابی سلطنت" کی یک طرفہ تدوین انجام کار میں ہر قسم کے انفرادی حق اور آزادی کو ان مقاصد پر قربان

(اعلہ مقابلہ کیجیے مقالہ تیم باب سوم۔ یہ عیاں ہے کہ بلنچلی (ذکی قانونی سلطنت" کا مفہوم وہی ہے جیسے انگلستان میں (اقبول پروفیسر ... تنقید ہربرٹ اسپنسر) انتظامی احدامیت" یا لاحکمیت مع پولیس" کہا گیا ہے۔ پس یہ اس سے بالکل مختلف ہے جسے بلنچلی "احتسابی سلطنت" کہتا ہے جس کا مفہوم وہ ہے جسے "وادی جان کی قانون سازی" کے نام سے بدنام کیا جاتا ہے۔ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ زیادہ حال کے بعض جرمانی مصنفین نے "قانونی سلطنت" کا لفظ محض آئینی حکومت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ یعنی وہ حکومت ہے کہ آئین اور جو کچھ بھی ہو مگر وہ قانونی کی خلاف ورزی نہیں کرتی۔ مقابلہ کیجیے ہولٹز ندارف۔ اصول سیاست طبع دوم صفحہ ۲۱۳ - ۲۱۴]

کرے گی جو مجموعۃً مفید معلوم ہوں گے اور ان اشخصوں پر نا قابل برداشت حد تک تولیت قایم کردے گی۔

پس اگر قانونی سلطنت سے یہ سمجھا جائے کہ (۱) سلطنت صرف ایک تنظیم ہے جس کا فریضہ افراد کے حقوق کی حفاظت ہے تو پھر سارا قانون عامہ محض ایک ذریعہ قانون شخصی ہی کا رہ جائے گا اور سلطنت افراد کے ذاتی خادم کی حیثیت تک تنزل کر جائے گی۔

کس معنی میں سلطنت ایک قانونی سلطنت ہے اور کس معنی میں نہیں ہے۔

اور اگر قانونی سلطنت" سے یہ سمجھا جائے کہ (۲) سلطنت کا کام قوم کے حقوق کو منتظم کرنا اور اس کے ساتھ افراد کے حقوق کو تسلیم کرنا ہے تو یہ ایک بالکل صحیح مگر غیر مکمل رائے ہے کیونکہ اس میں مدبران سلطنت کے سب سے زیادہ نتیجہ خیز مساعی یعنی قوم کی مادی بہبودی اور اس کی دماغی ترقی کی فکر کرنے کے کام کلیتہً نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔

یا (۳) اگر یہ سمجھا جائے کہ سلطنت کا کام عملاً فوائد عامہ کو ترقی دینا بھی ہے مگر ضابطے کی رو سے اُسے صرف اُس حد تک جبر کرنے کا اختیار ہے جس قدر کہ کسی قانونی ضرورت کے لئے درکار ہو تو اس خیال کے خلاف مشکل سے کچھ کہا جاسکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ اس سے سیاسی کارفرمائی کا صرف ایک پہلو متعین ہوتا ہے اور مفاد عامہ کے معاملات مثلاً اشیائے خوردنی کی بہم رسانی، تجارت اور عام تمدن کے حالات سے کچھ اعتنا نہیں کیا گیا ہے حالانکہ یہ سب انھیں قانونی حدود کے اندر آزادانہ طور پر جاری ہیں اور ان کے لئے جبر کی کسی شکل کے اختیار کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

اگر قانونی سلطنت سے یہ سمجھا گیا ہے کہ (۴) سلطنت کی مذہبی بنا سے انکار اور اس کے انسانی بنا رحدود کا اقرار کیا جائے یا یہ کہ (۵) ہر قسم کے اقتدار علی الاطلاق اور موروثی سلطنت سے جس میں اکثر جا بیجا پولیس کی مداخلت بھی شامل ہو جاتی ہے مقاومت کی جائے اور اس امر کا دعویٰ کیا جائے کہ معاملات عامہ میں اہل ملک کو شریک کرنا چاہئے تو اس سے "جدید سلطنت" کے خصوصیات ضرور ظاہر ہو جاتے ہیں مگر بدقسمتی سے طریق اظہار اس کے لئے ناموزوں واقع ہوا ہے۔ اسے آئینی سلطنت کہنا زیادہ مناسب ہے۔

جس طرح سلطنت کے دو پہلو ہیں، سکون اور حرکت، قائم رہنا اور نشو و نما پانا [illegible] اور روح اور اس داخلی اعتبار کے حسب حال دو علوم سیاسیہ ہیں، "قانون عامہ" اور "سیاسیات" اسی طرح دو منتہم بالشان اصول سلطنت بھی ہیں جو دو روشن ستاروں کے مانند سلطنت کی

سلطنت کو بہبودی [illegible] اور قانون یکجاں [illegible] ظاہر کرنا چاہئے۔

زندگی کو بنانے اور اُسے بار آور کرتے ہیں اور جو سلطنت کی صورت اور معنی دونوں کو متشکل و متعین کرتے ہیں۔ یہ دو مہمات اصول، عدالت گستری اور بہبود عامہ ہیں۔ بہبود عامہ بالخصوص مدبرین کے پیش نظر ہوتا ہے اور عدالت گستری پر مقننین کی نظر رہتی ہے۔ خیال عدل، قانون عامہ کا تعین کرتا اور خیال بہبود سیاسیات کی رہبری کرتا ہے۔

حکومت کا اشتغال اگرچہ حدود قانونی ہی کے اندر رہے مگر اس کا تعلق زیادہ تر بہبود عامہ سے ہوتا ہے۔ اہل روما جن کی قوم سیاسی اعتبار سے بہترین قوم تھی انھوں نے بہبود عامہ کی خبرگیری کو اپنے اعلیٰ ترین حکام کا مقدم فرض قرار دیا تھا۔ عدالت قانونی کے مشاغل قانون کے برقرار رکھنے تک محدود ہیں لیکن سلطنت اگر اپنی زندگی و خوش حالی کی خواہاں ہے تو اسے بہبود عامہ و قانون دونوں پر مسلسل توجہ رکھنا چاہئے۔ اب ہی بہبود عامہ کی ضروریات میں جدید سلطنت ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنت کے بہ نسبت بہت زیادہ توجہ کرتی ہے اور اس نے سابق الذکر آخر الذکر کی بہ نسبت " قانونی سلطنت " کی حیثیت کم رکھتی ہے۔

۵۔ فرقہ مورخین، سلطنت کا نظریۂ عضو

یہ فخر فرقہ مورخین ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے سلطنت کے عضوی خصوصیات کا از سر نو احساس کیا، بعض بڑے بڑے مدبرین نے تو سلطنت کی عضوی حیثیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا تھا چنانچہ پروشیا کے فریڈرک اعظم نے اپنی تصنیف " انٹی ماکیاویل " (یعنی ماکیاویلی کے رد) میں صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ " جس طرح سے انسان پیدا ہوتے ایک عرصے تک زندہ رہتے اور پھر کسی بیماری سے یا بوڑھے ہو کر مر جاتے ہیں، اسی طرح سلطنتیں بھی وجود میں آتی، چند صدیوں تک پھلتی پھولتی اور پھر برباد ہو جاتی ہیں " مگر اہل فن نے اس خیال کے ساتھ اس درجہ لاپروائی برتی کہ جب فرقہ مورخین نے اس کی تجدید کی تو وہ ایک نئی تحقیقات معلوم ہونے لگی اور علم السیاسات کے ارتقا نے آیندہ کے لیے ایک بالکل نیا اور زیادہ حاصل خیز راستہ اختیار کیا۔ اس اثنا میں فرقہ مورخین تصور سلطنت کو ضرورت سے زیادہ قومی رنگ میں لانے کی طرف مائل رہے اور اس کی بلند تر انسانی اہمیت کو انھوں نے نہ صرف نظر انداز کر دیا بلکہ اس کے ماننے سے انکار کرتے رہے چنانچہ سوی نی نے[1] صاف یہ لکھا ہے کہ " سلطنت قوم کے اجتماع روحی کی مجسم شکل یا قوم کا عضوی مظہر ہے " مگر ایک

[1] سوی نی: رومیوں کا نظام قانون Savigny System (Lesromischen Rechtes) ۱/۲۲

مشہور انگریز اڈمنڈ برک نظریات انقلاب کے خلاف بحث کرتے ہوئے تاریخی سلطنت کو دنیا کی "ترتیب خداوندی" کی روشنی میں لایا۔ اپنی تحریر (فرانس کے انقلاب پر اظہار خیالات) میں ایک مشہور فقرہ اس نے یہ لکھا ہے کہ "نظم معاشرت فی الواقع ایک طرح کا معاہدہ ہے، محض وقتی ضرورت کی اشیاء کے لئے جو معمولی اور ضمنی معاہدے ہوتے ہیں وہ حسب مرضی منسوخ کئے جا سکتے ہیں مگر سلطنت کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ کالی مرچ، قہوے چھینٹ یا تمباکو یا اسی قسم کی ادنیٰ درجہ کی چیزوں کی تجارت کے معاہدہ اشتراک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جو کسی ادنیٰ اور عارضی غرض سے قائم کیا جاتا ہے اور فریقین کے دل میں جب خیال آجائے وہ اُسے برطرف کر سکتے ہیں سلطنت کو ایک دوسری ہی طرح کے احترام کی نظر سے دیکھنا چاہیئے کیونکہ وہ اُن چیزوں کا اشتراک نہیں ہے جو کثیف حیوانی ہستی کے لئے عارضی و فناپذیر قسم کی ہوا کرتی ہیں بلکہ ہر طرح کے علم، ہر طرح کے فن، ہر طرح کی نیک صفاتی، ہر طرح کی تکمیل کا اشتراک ہے چونکہ اس قسم کے اشتراک کے اغراض کئی نسلوں میں بھی حاصل نہیں ہو سکتے اس لئے یہ صرف اُن لوگوں کا اشتراک نہیں رہتا جو الحال زندہ موجود ہیں بلکہ یہ ایک اشتراک ہے اُن لوگوں کے درمیان جو اس وقت زندہ ہیں اور جو مر گئے ہیں اور جو آنے والے ہیں۔ ہر ایک مخصوص سلطنت کا ہر ایک معاہدہ دائمی نظم معاشرت کے عظیم وسیع ابتدائی معاہدے کی ایک دفعہ ہے یہی وہ دائمی نظم معاشرت ہے جو مرئی اور غیر مرئی دنیا کو مربوط کرتا ہے جو ایک معین عہد و پیمان کے ذریعے سے (جسے اس ناقابل الفسخ حلف کی منظوری حاصل ہے جو جملہ طبعی و اخلاقی ہستیوں کو اپنی اپنی جگہ پر قائم کئے ہوئے ہے) ادنیٰ فطرتوں کو اعلیٰ سے اور مرئی دنیا کو غیر مرئی دنیا سے مربوط کرتا ہے۔

سلطنت کا یہ تصور اس سے بدرجہا زیادہ بلند ہے جو ازمنہ وسطیٰ کے اصول کے موافق ممکن تھا کہ سلطنت کا تعلق کلیسا (مذہب) سے ویسا ہے جیسا جسم کا تعلق روح سے۔

لیکن فرقہ مورخین نے سلطنت کو اُس حالت میں دیکھا جو قائم ہو چکی تھی صرف گذشتہ پر نظر کرنے سے اُن پر قدیم زندگی کے مناظر کا ایسا قوی اثر پڑا کہ ان میں سے بہتوں سے موجودہ حالت کا ادراک اور حالات عامہ کو ترقی دینے کا میلان ہی جاتا رہا۔ نظریہ قانون طبعی کے حامیوں پر بکثرت یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے سلطنت افراد کی خودکامی کا کھلونا بنا دیا ہے اسی طرح فرقہ مورخین پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے تصور سلطنت کو روایتی اقتدار اور موروثی تعصبات سے سخت جکڑ بند کر دیا ہے۔

۲۶ موجودہ زمانے کا جرمانی فلسفہ سیاسی - ہیگل -

اگرچہ فرقۂ مورخین کی تصنیفیں کم وبیش خاص ہی خاص سلطنتوں کی قانونی اور سیاسی تاریخ تک محدود ہیں پھر بھی اس جدید تحقیقات سے فلسفۂ تخمینی کو بھی نفع پہنچتا ہے -

ہیگل تک نے اپنے نظریۂ قانون میں سلطنتوں کی تاریخ تکوین پر اُس سے زیادہ توجہ کی ہے جتنی اُس سے پہلے فطری قانون کے نظریے کے ماننے والوں نے کی تھی۔ اُس نے یہ ضرور سمجھا کہ دنیا کی تاریخ میں اُسے ایک منطقی طریقۂ استدلال مل گیا ہے" ہستی موجود" ہی اُسے "قرین عقل" معلوم ہوئی۔ اُس کے نظریے نے اُس وقت کی سلطنت پروسیا کو آسمان پر چڑھا دیا جس کی حکومت ہنوز مطلق العنان تھی گو کہ فرائض عامہ کا احساس بھی پروسی حکومت میں شامل تھا۔ اس نے شاہی طاقت کی حمایت کی اور آئینی آزادی کی کچھ پروا نہیں کی لیکن اس نے سلطنت کی اخلاقی اہمیت پر زور دیا اور اس لغو خیال کے علی الرغم کہ سلطنت صرف ایک لابدی خرابی ہے، اس نے سلطنت کی تعریف و توصیف ان الفاظ میں کی کہ سلطنت "حق" کے تخیل کی بلند ترین اور شریف ترین تشکیل ہے -

باایں ہمہ ہیگل کی سلطنت ایک منطقی تجرد ہے، کوئی زندہ عضویہ نہیں ہے، وہ محض ایک منطقی تصور ہے، کوئی شخص نہیں ہے[1]۔ ہیگل نے سلطنت اور قانون کی بنا محض مرضی پر قائم کرنے سے اس حقیقت نفس الامری کو نظر انداز کر دیا ہے کہ سلطنت محض مجموعی انسانی مرضی ہی کی عاملانہ صورت نہیں ہے بلکہ وہ انسانی طبیعت و احساس کی تمام قوتوں کی جامع ہے -

اشٹال

فریڈرش ۔ ی ۔ اشٹال جو ہیگل کے بعد برلن میں فلسفیانہ نظریۂ سلطنت کا سب سے زبردست نمائندہ تھا اس نے نظریۂ "قانون فطرت" کے ماننے والوں اور نظریۂ ہیگل کے خلاف جوش اور سلیقے کے ساتھ بحث کی، اُس نے رجحان تاریخی کو شیلنگ کی متخیلی تخمین سے ملا دینے کی کوشش کی -

اشٹال نے اپنی مناظرانہ اور نقادانہ قابلیت سے نئے نکات پیدا کر کے اور اپنی

[1] ہیگل اپنی تصنیف Rechtsphilosophie (فلسفۂ قانونی) فقرہ ۲۵۰ میں لکھتا ہے کہ سلطنت اخلاق کے تصور کی تشکیل ہے۔ یہ اخلاقی روح ہے جو ادی آزادی کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے، وہ خود اپنے لئے عیاں ہے صاحب فکر و علم ہے اور جن امور کا اُسے علم ہے اور جو کچھ وہ جانتی ہے اُس کی تکمیل کرتی ہے مقابلہ کرو ہیگل کی کتاب فلسفہ تاریخ سے (مترجمہ سیبری) صفحات ۴۰ - ۴۷ .

وقت نظر سے اکثر مبہم بیانات کو واضح کر کے علم السیاست میں مختلف طریقوں سے ترقی دی مگر اعتبارات سے اس نے اپنی تاریخی قابلیت کی کمی اور کسی قدر مبتذل سوفسطائیت کے باعث جدید کلیات کو چھوٹے بڑے مطلق العنان حکمرانوں کے افسانہ وار توہمات کے تابع کر دیا جس سے فن کو بہت نقصان پہنچا۔ اٹشال سلطنت کو ایک اخلاقی و ذہنی مملکت "یعنی ایک منتظم مشترک ہستی کے لئے ایک گروہ کا اتفاق" سمجھتا ہے بالفاظ دیگر ایک پر شوکت و عظمت اخلاقی اقتدار و قوت کا قائم ہو جانا جس کے سامنے تمام رعایا سر تسلیم خم کر دے" اُس کا تصور سلطنت ہیگل کے تصور سے زیادہ جاندار ہے۔ اُسے یہ بھی تسلیم ہے کہ سلطنت کی حکمرانی "عام اغراض تک محدود ہے" اور اس طرح وہ اپنے تئیں قدیم سلطنت کے غلو سے بھی بچاتا ہے مگر پھر بھی عہد نامۂ عتیق کی حکومت مذہبی کا اثر ایک لال ڈورے کی طرح اُس کے تمام نظریۂ سلطنت میں دوڑ گیا ہے جس سے اُس کا نظریہ جدید یورپی دنیا کے لیے بالکل ناقابل قبول ہو گیا ہے۔ سلطنت کی طاقت کے لیے ربانی یا فوق الانسانی عظمت کا ہونا انسانی و ملکی آزادی کے ساتھ ہمنوا نہیں ہو سکتا۔

۷۔ فلسفیانہ اور مورخانہ طریقوں کا اتحاد

جرمنیا میں فلسفیانہ اور مورخانہ فرقوں کی قدیم جنگ کلیتہً بند ہو گئی ہے ۱۸۴۰ء کے بعد ہی دونوں میں صلح ہو گئی تھی اُس وقت سے ہر طرف یہ مسلم ہو گیا ہے کہ تاریخ کے تجربات و مشاہدات کو تفکر کی شمع سے روشن کرنا چاہیئے اور تخمین اگر قوم کی زندگی کے حقیقی حالات کا لحاظ نہیں کرتی تو وہ محض طفلانہ توہم ہے۔ دونوں طریقے ایک دوسرے کی تلافی اور اصلاح ہوتی رہتی ہے ظاہر ہے کہ ان دونوں طریقوں کے اتحاد سے مختلف مصنفوں کی رایوں کا تنوع محو نہیں ہو سکتا کیونکہ طبیعتوں کا اختلاف ایک فطری چیز ہے بعض مصنفوں کا رجحان فلسفے کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور بعض کا تاریخ کی طرف۔

سلطنت کی تنقید مختلف پہلوؤں سے

جدید علم السیاست کی ایک دوسری خصوصیت وہ زیادہ دقیق تنقید ہے جس سے نہ صرف واقعات کی تنقیح میں بلکہ واقعات سے نتائج کے اخذ کرنے میں اور مفہومات کی تشکیل میں بھی کام لیا جاتا ہے اس قسم کی تنقید میں سلطنت پر نہایت ہی مختلف پہلوؤں سے نظر کی جاتی ہے سب سے زیادہ سربرآوردہ مصنفوں میں سے چند کا نام لیا جا سکتا ہے۔ روبرٹ فون موہل کی تصنیفیں بیشتر ادبی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں مگر ساتھ ہی اُن میں عملی فائدہ مندی کا لحاظ ہوشمندانہ اور عاقلانہ طور پر رکھا گیا ہے آلکسس ڈی توکے ول چاہے امریکہ کی جمہوریت کا بیان

کر رہا ہو یا انقلاب فرانس کا قدیمی سلطنت کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہو یا انگریزی حکومت اعیانی کی حالت دکھاتا ہو ہر موقع پر وہ سیاسی زندگی کی حرکت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ سر ارن ایوٹ فوس کی تحریریں اُن بدگمانیوں سے متاثر ہیں جو جدید خیالات کی طرف سے پھیلی ہوئی تھیں جان اسٹوارٹ مل معاملات عامہ پر تجریدی منطق کے اصولی نقطۂ نظر سے بحث کرتا ہے مگر اسکی انگریزی سرشت وطینت نے اس میں گونہ اعتدال پیدا کردیا ہے۔ ٹامس بکل علم طبعی کے طریقوں سے نظریہ سلطنت میں کام لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ فطرت کی قوتوں کے مطابق سلطنت کی زندگی کی تشریح کرے۔

تاریخی تنقید

دوسرے مصنفوں نے تنقید کی نوعیت کلیتہً مورخانہ کردی ہے جیسے گنائیسٹ نے کیا ہے جو انگریزی آئینی تاریخ پر خاص سند ہے۔ یہی حال ایڈورڈ لابولی کا ہے جس نے امریکی نظام سلطنت پر نہایت شوق کے ساتھ لکھا ہے' ہائن رش فون تراچکے جس نے سب سے اول پروسی شاہی کی اہمیت ظاہر کی وہ بھی اسی زمرے میں داخل ہے لورنتس فون اشتائن بھی اسی طریق کا پیرو ہے مگر وہ خاصکر انتظامی جزیات میں مشغول ہو گیا ہے۔

متقنانہ طریق

کیبر کے نسبتاً نئے طریق میں تنقید نے بالخصوص متقنانہ نوعیت حاصل کرلی ہے یہ طریقہ جو تجریدات اشکالیہ کے ذریعے سے ترقی کی رفتار کو روک دینے کی طرف مائل ہے اس کے بہت سے شاگردوں کی تحریروں میں مضر حد تک پہنچ گیا ہے۔

نفسیاتی طریق

دوسری جانب جو لوگ نفسیاتی طریقے پر سلطنت کے متعلق غور کرتے ہیں وہ سلطنت کی زندگی کو انسانی طینت کے خواص واشکال کے مطابق زیادہ نمایاں کرنا چاہتے ہیں' اس طریقے میں طریقۂ سابق کے مخالف خطرہ پیدا ہوتا ہے یعنی سیاسیات کی حرکت قانون کے معینہ ویقینی تسلط پر کافی لحاظ نہ کرے بلکہ اسے مضطر ومبدل کردے۔

تقابلی طریقہ

طریق تقابلی جو زیادہ اہم سلطنتوں کو ایک دوسرے کے مقابل میں لاکر غور کرتا ہے وہ حال کے میلانات کے موافق ہے۔ جن مصنفوں کا ابھی ذکر ہو چکا ہے ان میں سے بہتوں نے اس طریق کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے' عام نظریہ سلطنت کے لئے یہ طریقہ لابُد ضروری ہے۔

قومی نظریہ سلطنت

سب سے آخر امر یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں جس میں قومی سلطنتیں قائم کی جارہی ہیں

نظریۂ سلطنت قطعی طور پر سلطنت کی قومی خصوصیت کے متعلق بہ نسبت سابق کے زیادہ زور دیتا ہے۔ اٹلی اور جرمانیا کے اپنے اپنے قومی اتحاد پیدا کرنے کی کوششوں سے پہلے فرائی برگ میں ولکر، نیویارک میں فرانسس لی بر، گنٹ میں فریڈرک، لورین، نستیو رش اور میونک میں بلنچلی نے نظری حیثیت سے اس میلان کی پیروی کی ہے۔ اہل اطالیہ کا نوبیدار علم السیاست اپنے جوانانہ جوش میں سلطنت کو قومی بنیاد پر قائم کرنے کے مسئلے کو بہت خاص نمود کے ساتھ زیر بحث لایا، ابتداءً یکطرفہ جذبات کا بھی اظہار کیا، اس خیال کے ممتاز ترین حامی روما میں من چینی اور پدے لیتی اور نیپلز میں پیرانتو لی ہیں۔ جرمانیوں کی طرح اطالوی بھی اپنی تصانیف میں مورخانہ اور فلسفیانہ طریقوں کو متحد رکھتے ہیں۔

سلطنت کی حیاتی یا نفسیاتی حقیقت

تعلیق ہائے ابھی تک سلطنت کے عضوی یا بہتر الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ اس کی نفسیاتی و انسانی حقیقت کا ادراک و افہام بہت کم ہوا ہے جس طرح بہت سے لوگ ہیں جن میں تعلیم یافتہ اشخاص بھی شامل ہیں کہ اُن کے کان موسیقی سے آشنا نہیں ہوتے یا تصویر اور نقاشی کے حسن کا مطلقاً احساس نہیں رکھتے، اسی طرح بہت سے ذی علم اشخاص ہیں جو کسی شے کے متعلق حیاتی یا نفسیاتی غور و فکر سے بالکل معرا ہیں ان پر کوئی الزام نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ کوئی شخص اپنے طبعی خصائل کے خلاف نہیں چل سکتا مگر ان کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ جس شے کو وہ نہیں سمجھتے اُس پر حکم لگانے سے باز رہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو صرف یہ ہوگا کہ ان کی کوتاہی کے ساتھ ان کی خودبینی کا بھی اظہار ہوگا۔

اشمٹ ہنیر

عضوی طریقے کے اولین پیشرؤں میں ایک فریدرش اشمٹ ہنیر بھی تھا جس نے سلطنت کو ایک "اخلاقی عضویت" قرار دیا اور اُس کا مقصد یہ بتایا کہ انسان کی ظاہری زندگی اور قانون اور بہبودِ عامہ اور تعلیم و تہذیب کے عام معاملات کو اپنے ذمے لے۔

فولگراف

نظریۂ سلطنت کو تمام قوموں کی نفسیات پر مبنی کرنے کی ایک بہت ہی قابل یادگار کوشش فولگراف نے کی (اُس نے ۱۸۵۱-۵۵ء میں ایک کتاب تین حصوں میں شائع کی جس کا نام ہے "عام علم الاقوام کی علم الانسان کے ذریعے سے اور فلسفۂ سیاسیات و قانون کی علم الاقوام یعنی اقوام کی قومی خصائص کے ذریعے سے تشریح کی پہلی کوشش" یہ تصنیف پہلی کوشش ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور اس اعتبار سے وقعت کی مستحق ہے مگر نفسیاتی طریقے کی قدر و منزلت قائم کرنے کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے اس میں تو قوائے ذہنی انسانی کا بیان قابل اطمینان ہے اور نہ مختلف طبائع کا اندازہ درست ہے اور جو متعدد تاریخی مواد جمع کیا گیا ہے اور

مشاہدات سیر و سیاحت کے تجربات کا بڑا حصہ اس درجہ غیر تنقیدی ہے اور اس درجہ خالص اور وہمی تصویر روشن ملا ہوا ہے کہ اُس کی صحت کا اثر دل پر نہیں پڑتا۔

آرنیسس

فلسفہ کراؤزے کی پیروی میں آرنیسس نے ایک کتاب بنام "عضوی نظریۂ سلطنت" لکھی ہے (آرنیسس: عضوی نظریۂ سلطنت پہلی جلد۔ ویانا سنہ ۱۸۵۰ء) مگر سلطنت کے عضویہ سے وہ اس درجہ ایک زندہ اور شخصی مجموعی وجود مراد نہیں لیتا جس قدر وہ اسے قوم کے لئے قانون کی ایک عضوی تنظیم سمجھتا ہے۔

وائیتسس

وائیتسس (پالیٹک سنہ ۱۸۶۲ء جلد ۱ باب ۵) کہتا ہے کہ سلطنت کوئی ایسی شے نہیں ہے جو حسب مرضی قائم کرلی جائے یہ نہ تو لوگوں کے معاہدۂ باہمی سے پیدا ہوتی ہے نہ ایک یا زائد افراد کی قوت سے وجود میں آتی ہے سلطنت مثل ایک عضویہ کے نمو پاتی ہے مگر نہ محض طبعی زندگی کے قانون کے موافق اور نہ محض اس زندگی کے اغراض کے لئے بلکہ اُس کی بنیاد انسان کے اعلیٰ تر اخلاقی رجحانات پر قائم ہے اور وہ اخلاقی خیالات کے حصول کا ایک ذریعہ ہے پس وہ ایک طبعی نہیں بلکہ ایک اخلاقی عضویہ ہے۔ سلطنت قوم کی عضوی تنظیم کا نام ہے"۔ مگر حقیقت میں سلطنت عام اخلاقی زندگی کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے۔ انسان کے اخلاقی خصائل اور اخلاقی خیالات اس کی خانگی زندگی کا بھی تعین کرتے ہیں اور اس کی سلطنتی زندگی کا بھی اُس کے مذہب کا بھی اور سلطنت کا بھی اُس کے خاندان کا بھی اور معاشرت کا بھی تخیل سلطنت کے لئے ایک صاف اور قابل اطمینان بنیاد کا ادراک ہم اسی وقت کرسکتے ہیں جب ہم اقوام اور نوع انسان کی مجموعی خصلت انسانی کو نفسیات کی رو سے سمجھ لیں میں نے اپنی تصنیف "سلطنت و کلیسا پر نفسیاتی مطالعا"

Psychlogische Studien uber Staat und, Kirche. Zurich, 1844

بلنچلی

مطبوعہ تسیوریش ۱۸۴۴ء) میں پہلی بار کوشش کی ہے کہ سلطنت کی تشریح فریڈرک رومر کی نفسیات کی رو سے کروں۔

میں نے خطا کی جو یہ فرض کرلیا کہ یہ علم جسے میں نے اپنی کتاب "سیاسی فرقوں کے نظریے" (Lehrevon den porteien) میں ظاہر کیا ہے، اشاعت پذیر ہوگیا ہے۔ مجھے بہت جلد تجربہ ہوگیا کہ نہ صرف یہ علم مفقود ہے بلکہ سلطنت کی نسبت نفسیات کی رو سے غور و فکر کرنا تعلیم حجہ سے مطلقاً خارج ہوچکا ہے اور اُسے کوئی جانتا ہی نہیں ہے "مطالعات" یہ کہکر علیحدہ رکھدیے گئے کہ یہ ایک ایسے شخص کے ناقابل یقین ہفوات ہیں جو اس کے سوا سیاسی

باتوں میں بلاشبہ سمجھ دار ہے ان "مطالعات" کے ثمر جو پختہ ہو کر اس موجودہ تصنیف میں پیش کیے گئے ہیں عام طور پر مقبول ہوں گے اب وہ وقت قریب آ گیا ہے کہ جس راہ پر ان "مطالعات" میں قدم رکھا گیا تھا وہ خطرناک نہ معلوم ہو اور سلطنت کا عضوی اور نفسیاتی مطالعہ مستعدی کے ساتھ جاری ہو جائے۔ اس وقت لوگ اس امر کا بہتر فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ "مطالعات" قابل قدر ہیں یا نہیں اس اثنا میں مجھے اس بات کے جاننے سے بہت سی غلط فہمیوں اور ناقدردانیوں کا معاوضہ مل گیا کہ جرمانی مدبرین میں سے سب سے زیادہ درخشاں مدبروں یعنی فریڈرش اعظم اور پرنس بسمارک نے اپنے قول و فعل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ قوموں اور سلطنتوں کے اندر نفسیاتی زندگی کو محسوس کرتے ہیں۔

دوسرا مقالہ

سلطنت کے بنیادی شرائط انسان اور اقوام کی سرشت و طینت کے اعتبار سے

پہلا باب

نوع انسان انسانی نسلیں اور قوموں کے خاندان

نوع انسان، اُس کا توحد اور اُس کے اختلافات

نوع انسان ابھی تک عالمگیر شہنشاہی کی کوئی مجموعی تنظیم قائم نہیں کر سکی ہے۔ ازمنہ گزشتہ کی تاریخ میں صرف ایسی منفرد شہنشاہیوں اور سلطنتوں کا ذکر ملتا ہے جو نوع انسان کے خاص خاص حصوں تک محدود تھیں، اس لئے قانون عامہ کا موجودہ زمانے کا نظریۂ عام انھیں حصوں کے مشاہدات اور نوع انسانی اور سلطنت کے ساتھ اقوام کے تعلقات کے متعین کرنے سے شروع ہونا چاہیئے۔

اعلیٰ مذہبی احساس کے لیے بنی نوع انسان کی ایکی کا یقین کرنا بہت ضروری ہے[۱] مسیحیت نے تمام آدمیوں کو خدا کی اولاد بتایا ہے۔ مہذب سلطنتیں نوع انسانی کی ایکی کو مانتی اور ریست و رجے کی نسلوں اور قبیلوں تک میں ایک مشترک انسانی فطرت کا اعتراف کرتی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی نسلوں کا تخالف، سلطنت اور قانون عامہ دونوں کے لئے نہایت ہی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ سلطنت میں انسان ایک نظم و ترتیب کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور نظم و ترتیب بغیر اختلاف و امتیاز کے ممکن نہیں ہے۔ نوع انسان کی اہم نسلوں کے پراسرار آغاز پر جو پردہ پڑا ہے اُس کے اُٹھانے سے سائنس اب تک عاری رہا ہے سوال یہ ہے کہ آیا نسلیں تخلیق کے جدا جدا افعال کا نتیجہ ہیں اور بعض نسلیں پہلے پیدا ہوئیں اور بعض بعد کو یا مختلف نسلیں ایک ہی ابتدائی نسل سے رفتہ رفتہ جدا ہو گئی ہیں اور اگر ایسا تھا تو کن فطری قوتوں کے باعث یہ تغیر پیدا ہوا ہے ہمیں ہنوز اسکا علم نہیں ہے مگر

---

[۱] لیکن تمام مذاہب سے اعلیٰ ترین خیال اس "ایکی" (توحد) کا اسلام میں موجود ہے یعنی یہ کہ کل بنی نوع انسان ایک ہی خالق کی مخلوق ہے، اور تمام مخلوقات میں اس کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اور وہ خالق مطلق نہ خود کسی سے پیدا ہوا ہے نہ کوئی اُس کی اولاد ہے۔ (ناظر مذہبی)

انسانی ترقی کی تاریخ کے عین ابتدا ہی کے جو حالات ہمیں معلوم ہیں انھیں میں ہم دیکھتے ہیں کہ خاص خاص نسلوں کے جسموں کی ساخت اور ان کے رنگ نیز ان کی ذہنی قابلیتوں میں فرق موجود تھا، اور وہی فرق حقیقتاً اس وقت تک بدستور موجود ہے۔

یہ سچ ہے کہ کوئی نسل کلیتہً خالص نہیں رہی ہے، اور ابتدائی نسلوں کے بہت بڑے بڑے حصے اپنی قرابت قریبہ سے جدا ہو گئے اور بعض ان میں نئی قوموں کی صورت میں مبدل ہو گئے ہیں۔

چار خاص نسلیں

مگر اس تمام دور میں سفید، سیاہ، زرد، اور شاید سرخ رنگوں کی نسلوں کا امتیاز صاف نظر آرہا ہے اور یہ امتیاز محض رنگوں کے بہ نسبت جو کبھی دھو کے میں ڈال دیتے ہیں زیادہ تر انسانی ارتقا کی تاریخ میں نمایاں ہوتا ہے۔ بعض نہایت عالی دماغ لوگ بھی ہیں جو ان نسلوں کے دماغی تفاوت کو اصولاً نہیں مانتے مگر ایسا شاید ہی کوئی ہو جو عملی زندگی میں بالاستقلال اس تفاوت کا اعتراف نہ کرتا ہو۔ دنیا کی تمام تاریخ، نسلوں کی ذہنی قابلیت کے اختلاف کی شاہد ہے بلکہ ان نسلوں سے جو قومیں پیدا ہو گئی ہیں ان تک میں نامساوی قابلیت کا ثبوت عیاں ہے۔

(۱) حبشی نسل

اغلب یہ ہے کہ سیاہ رنگ حبشی نسل کی قومیں جن کو کارُوسؔ "اقوام اللیل" کہتا ہے، کسی وقت میں نہ صرف افریقہ پر محیط تھیں (جو دنیا میں ان کا خاص حصہ ہے) بلکہ ایشیا کے جنوبی ممالک میں یہی کالی نسل پھیلی ہوئی تھی اور خود براعظم یورپ کے جنوبی اقطاع پر قابض تھی۔ اس نسل کی طویل عمر میں کوئی شک نہیں ہو سکتا اور یہ شاید دنیا میں سب سے مقدم نسل ہے مگر کسی جگہ یا کسی زمانے میں اس نے بطور خود کسی معقول حد تک قانونی یا سیاسی ترقی نہیں حاصل کی۔ اُس کی کوئی حقیقی تاریخ بھی نہیں ہے۔ گوری نسل کے افراد یا قبائل سے جب کبھی اُس کا مقابلہ ہوا وہ فوراً اُن کی مطیع ہو گئی۔ تخیل کی کثرت اور جلد اشتعال میں آجانے والے جذبات کے ساتھ کالی نسل میں کم فہمی اور ضعف ارادہ بھی شامل ہے۔ فطرتاً اس کی طبیعت بچوں کی سی بنی ہے جس کا اقتضا یہ ہے کہ اعلیٰ قومیں

اسے اپنے زیر تربیت رکھیں اور اس پر حکومت کریں۔

قدیم زمانے میں بھی ہندوستان اور مصر کی کالی قوموں پر آریائی اور سامی قومیں حکمرانی کرتی تھیں۔ افریقہ کی قدیم حبشی بادشاہتیں آج بھی صحیح مفہوم میں سلطنت نہیں ہیں بلکہ جابرانہ متلون مزاج مطلق العنان حکومتیں ہیں۔ یہ قبیلے جب مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب کی ہدایت میں آگئے تو بالخصوص شمالی افریقہ میں اور وسطی سوڈان کی سلطنتوں نے ایک نمایاں ترقی حاصل کی، ہیٹی اور لبریا کے حبشیوں کا فرانسیسی شہنشاہی اور ممالک متحدۂ امریکہ کی نقل کرنے کی کوشش کرنا سیاسی قوموں کی زندگی کا ایک تمسخر ہے۔

(۲) لال رنگ والی نسل

برخلاف اس کے امریکہ کے اصل باشندوں کی سرخی مائل نسل میں اس درجہ بچوں کی سی حالت نہیں ہے، مگر سلطنت کی قابلیت ان میں بھی بہت ہی کم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امریکہ میں یورپیوں کے آباد ہونے سے پہلے وہاں بڑی بڑی سلطنتیں موجود تھیں اور ان میں ایک معقول حد تک قابل وقعت تمدن پایا جاتا تھا مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پیرو اور مکسیکو کی مذہبی بادشاہیاں خود وہاں کے اصل باشندوں کی کارگزاری کا نتیجہ نہیں تھیں بلکہ مشرقی اور جنوبی ایشیا سے آئے ہوئے آبادکاروں کی قایم کی ہوئی تھیں۔ پیرو میں قبیلۂ انکاس کو "سورج کے سفید بچوں" کا نام دیا جانا اور "دیوتاؤں کے بیٹوں" کی حیثیت سے گورے آدمیوں کی وقعت کرنا بلاشبہہ پیرو والوں کی آریائی اصل کا ثبوت ہے جہاں امریکی خود اپنی مرضی پر چھوڑ دیے گئے تھے، وہاں وہ پھر وحشی شکاریوں کی حالت کی طرف پلٹ گئے اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ان کے قبائلی جمہوریئے باوجود اپنے وقتاً فوقتاً بدلتے رہنے والے سرگروہوں اور اپنے پرزور تقریر کرنے والوں اور اپنی سیاسی مجلسوں کے کسی مضبوط قانونی بنیاد پر قائم نہ تھے اور اُنکے تنظیمات کا قیام یقینی اور قابل اطمینان نہ تھا۔ وہ سلطنت نہیں ہیں بلکہ شکاریوں کے جرگے ہیں۔ منفرد شخصوں کو شاید ایک طرح کی خودسرانہ اور زبردستی کی آزادی حاصل ہو مگر جو بندش سب کو متحد کرتی ہے وہ پکی اور لوچ دار نہیں ہے۔ وہ گورے آبادکاروں کی ترقی میں کسی طرح سے

خارج نہیں ہوسکتے اور اس کے قدموں کے نیچے کچلے جاتے اور تباہ ہوتے جاتے ہیں۔

(۳) زرد نسل

سیاسی ترقی کی قابلیت کالی نسل کی نسبت زردی مائل نسل میں زیادہ ہے۔ اس زرد نسل کا وطن ہمیشہ ایشیا میں رہا ہے اور وہ دو بڑے قبیلوں میں تقسیم ہے۔ ایک طرف زیادہ بھورے رنگ والے اہل ملایا ہیں اور دوسری طرف ہلکے رنگ والے ترکی اور مغل ہیں۔ مغلوں میں بالتخصیص بڑے بڑے فرمانروا سپہ سالار اور مدبر پیدا ہوئے ہیں۔ بعض قبائل جو بلا شبہ مغل نسل سے ہیں اس وقت تک گلہ بانوں شکاریوں اور رہزنوں کی حیثیت سے خاص کر وسط ایشیا میں بادیہ نشین حالت میں رہ گئے ہیں۔ مگر اس نسل کی دوسری قوموں نے بڑی بڑی شاہنشاہیاں قائم کرلیں۔ مغرب میں انھوں نے اپنی درشت خوئی قائم رکھی ہے مگر مشرق میں وہ زیادہ نرم مزاج ہوگئے ہیں۔ حبشیوں اور لال امریکیوں کے بہ نسبت یہ ساری نسل کوہ قافی نسل سے زیادہ قریبی مشابہت رکھتی ہے اور اس نے قدیم زمانے سے سفید قوموں کے ساتھ ازدواج باہمی بھی قائم رکھا ہے۔ بالخصوص ان کے اعلیٰ طبقہ میں یہ رواج زیادہ ہے۔ چین اور جاپان کی متمدن قومیں ہنوں اور ترکوں کے بہ نسبت ترقی کے مدارج زیادہ طے کرگئی ہیں۔ انھوں نے ایک لطیف سیاسی فلسفہ پیدا کردیا ہے اور انھوں نے وحشت کے مقابل میں خیالات انسانیت کا اور شرافت نسب کے مقابلہ میں جوہر ذاتی کا اعتراف یورپ کی آریا قوموں سے بہت پہلے کیا تھا انھوں نے زراعت، تجارت، مدارس اور کوتوالی کے لئے بہت کچھ کیا ہے مگر قانون کے متعلق اُن کے خیالات ہمیشہ اخلاقی احکام کے ساتھ مخلوط اور خاندانی زندگی اور نابالغوں کی تربیت اور انضباط کے ضروریات سے محدود رہے ہیں۔ اُن کی حکومت ایک فیض رساں مطلق العنانی ہے۔ عزت کا احساس ان میں زیادہ نمایاں نہیں ہے اور قومی آزادی کے خیال نے زیادہ ترقی نہیں کی ہے۔ اس میزان میں کوہ قافی یا ایرانی قوموں

(۴) گوری نسل

کی نسل کا پلہ سب سے بھاری ہے، کارس انھیں کو "تاریکی اور شفق کی قوموں" کے مقابلے میں "روز روشن کی قومیں" کہتا ہے اور قدما نے انھیں کو آفتاب

اور آسمان کے فرزند" کہا ہے۔ یہ قومیں ممتاز طور پر تاریخی قومیں ہیں۔ دنیا کی
تاریخ کو یہی قومیں معین کرتی ہیں؛ تمام اعلیٰ مذاہب جو انسان کا تعلق خدا سے
قایم کرتے ہیں ان کا ظہور انھیں قوموں میں ہوا اور کم و بیش تمام فلسفہ انھیں کے
افکار ذہنی کا نتیجہ ہے۔ دوسری قوموں سے جب ان کا تصادم ہوا ہے تو اس کا
انجام ہمیشہ یہی ہوا کہ انھوں نے اُن قوموں کو مفتوح کر کے انھیں اپنا ماتحت
بنا لیا ہے۔ ہر قسم کی اعلیٰ سیاسی تنظیم انھیں کی اُمنگ کا نتیجہ اور انھیں کی
کارگزاری ہے۔ خدا کے زیر سایہ انھیں کی ذہانت اور انھیں کی قوت آزادی
سے ہمیں انسانی طبیعت کی تمام اعلیٰ ترقیات کا مآل حاصل ہوا ہے۔

گوری نسل کے دو بڑے خاندان (أ) سامی، (ب) آریا

یہ "روز روشن" کی قومیں دو بڑے خاندانوں سامی اور آریا میں
منقسم ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں سامیوں کا کام سب سے زیادہ مذہب سے
متعلق رہا ہے، یہودیت، عیسائیت اور اسلام ان سب کا پہلا ظہور سامی ہی قوموں
میں اور مشرق ہی میں ہوا مگر سیاسی حیثیت سے ان کی اہمیت نسبتاً کم ہے۔
بخلاف اس کے آریا خاندان کی قومیں، جن کی زبان صوری اور معنوی خوبیوں
کے لحاظ سے بہت وسیع ہے، سلطنتوں کی تاریخ اور حقوق کے نشو و نما میں سب سے
اول جگہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنا صحیح وطن یورپ میں پایا ہے، اور یہیں آکر
سیاسیات کے متعلق ان کی مردانہ فطرت کو غور اور پختگی حاصل ہوی۔ یہی بنا
ہے یورپ کی آریا قوموں کے اس دعوے کی کہ وہ اپنے خیالات و تنظیمات
سے روئے زمین کی تمام دوسری قوموں کے سیاسی سرگروہ بن جانا اور اس طرح
نوع انسان کے انتظام کو مکمل کرنا چاہتی ہیں۔

نسلوں کے یہ فرق طبعی ہیں قومیت کے فرق تاریخی ہیں۔

پس نسلوں کا یہ اختلاف فطرت کی تخلیقی قوت کا نتیجہ ہے، محض انسانی
تاریخ کی پیداوار نہیں ہے برخلاف اس کے وہ قومیں جن میں یہ نسلیں تقسیم ہو گئی
ہیں یا جو مختلف نسلوں کی مخالطت سے پیدا ہوی ہیں، وہ صاف طور پر انسانی
تاریخ کی پیداوار ہیں۔ قومیں، نوع انسان اور انسانی نسلوں کی تاریخی ارکان
ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہم نہایت ہی قدیم قوموں سے بھی آگاہ ہیں جنھیں ہم
اوائل زمانہ میں دیکھتے ہیں مگر جن کی نسبت ہمیں بہت ہی خفیف سا علم ہے،

اور جن کی اصل و ابتدا قدامت میں گم ہوگئی ہے، لیکن ایک بہت کثیر تعداد
اُن قوموں کی ہے جن کی اصل و ابتدا ہمارے تاریخی علم کی حدمیں واقع
ہے اور ہمارے لئے یہ یقین کرنے کی کافی وجہ موجود ہے کہ ابتدائی قومیں
بھی اسی طریقے سے پیدا ہوی ہونگی، تاریخ نے اس طویل زمانے میں
انفصال و اتصال کے مسلسل عمل نیز تبدل و ترقی کے ذریعے سے
قوموں کو متفرق کردیا ہے، اور نئی قومیں پیدا کردی ہیں - یہ وجہ ہے کہ
قوموں کی خصوصیت، ان کی طینت و خصلت زبان و قانون کے بہ نسبت
اُن کے جسم کی ساخت میں کم ظاہر ہوتی ہے -

تعلیقات

(۱) پریچرڈ نے اپنی "انسان کی فطری تاریخ" میں بڑی بڑی نسلوں
کی جسمانی ساخت اور زبان کے تخالف و توافق کو نہایت خوبی سے
دکھایا ہے اور اے ڈی گوبینو نے اپنے مضمون "انسانی نسلوں کے عدم مساوات"
میں سیاسی اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے[1] یہ تصانیف اگرچہ
دلچسپ اور طبیعت میں حرکت پیدا کرنے والی ہیں مگر فیصلہ کن علمی نتائج کے
حاصل کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، سب سے آخری اور سب سے
مکمل تصنیف تھیوڈور وائٹس کی کتاب "فطری (یعنے غیر متمدن) قوموں کی
انسانیات" ہے[2] جس کا چھٹا (آخری) حصہ خصوصاً ملاحظہ طلب ہے نیز پیشل
کی کتاب "معلومات بابت اقوام" (پانچویں اشاعت ۱۸۸۱ء) صفحہ ۳ سے
آخری بیان تک[3]

---

[1] A. de Gobineau,
Essai sur l'inégalite des races humaines, Paris 1852-1855.

[2] Th. Waitz, Authropologie der Naturvolker. 6 vols, 1856-1872

[3] Peschel, Volkerkunde 5. Auflage 1881

(۲) قانون اور سیاسیات کے متعلق نسل کی جو اہمیت ہے اُس سے اہل فن نے بہت زیادہ زمانے تک لاپروائی برتی ہے گوبینو اس کمی کو پورا کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اکثر دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے اور ہر شئے کی تشریح نسل کی طبیعت سے کرنا چاہتا ہے نیز وہ اس نسل پر ضرورت سے زیادہ توجہ کرتا ہے جو توالد و توارث اور خون کے تسلسل سے قایم ہوی ہو اور اس امر واقعی کو فراموش کر دیتا ہے کہ تعلیم سے بھی نسل پیدا ہوسکتی ہے جیسا کہ ہم خاندانوں اور قوموں دونوں میں دیکھتے ہیں ایسی ثانوی نسل اگرچہ زیادہ تر انسانی آزادی پر منحصر ہے مگر حقوق کی ارتقا پر بہت قوی اثر رکھتی ہے، رومی پادری اس زمانے میں یورپ میں اس کی ایک نمایاں مثال ہیں کہ تعلیم و تربیت کے اثر سے کیوں کر ایک نسل پیدا ہوسکتی ہے ۔

افراد کا اثر نسل کے اثر سے ایک جدا چیز ہے اور انفرادی اثر بھی کچھ کم توجہ نہیں چاہتا ۔ افراد نے تاریخ کی رفتار کا تعین نسلوں سے بھی زیادہ کیا ہے ۔ فریڈرش رومر نے ان اختلافات کا جو بیان اپنی کتاب "اصول جماعات سیاسیہ" میں کیا ہے وہ اس سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے جو اُسے اب تک حاصل ہوی ہے ۔

دوسرا باب

تصورات امت وقوم

امت کے اندر تمدن کا مفہوم مرعی ہے اور "قوم" ایک سیاسی خیال

زبان کے عام استعمال میں "امت" اور "قوم" کے الفاظ خلط ملط ہوجاتے ہیں مگر علمی حیثیت سے لازم ہے کہ ان میں احتیاط کے ساتھ تفریق قائم کی جائے، لیکن خود علمی زبان میں بھی اکثر اس وجہ سے خلط بحث ہوجاتا ہے کہ مختلف مہذب قومیں ایک ہی لفظ کو مختلف معنوں میں استعمال کرتی ہیں۔ جرمانی زبان میں ہم لفظ ناتسیون nation) کو رومیوں کے لفظ ناتسیو (natio) اور اتالیوں کے لفظ ناتسیونالتا (nazionalita) کی طرح تمدنی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر زمانۂ حال کے فرانسیسی اور انگریز اس مفہوم کو پیوپل اور پیپل[1] people (امت) سے ادا کرتے ہیں۔ سیاسی مفہوم کو ہم (جرمانی) فولک (Volk) یعنی لاتینی لفظ پوپلس کے مرادف لفظ سے ظاہر کرتے ہیں مگر مغربی قومیں یعنی انگریز اور فرانسیسی اسی مفہوم کے لئے لفظ (nation نیشن یا ناسیون) استعمال کرتے ہیں۔ اشتقاق کی رو سے جرمانی استعمال صحیح ہے اس لئے کہ لاتینی لفظ (natio ناتسیو) جو nasci (ناس سی) سے مشتق ہے، پیدائش اور نسل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور فولک (Volk اور پوپلس (populus) کے لفظ بیشتر سلطنت کی عام زندگی (یونانی πολις پولس یا لاتینی (respublica ریس پبلکا

---

[1] مگر انگریزی لفظ "پیپل" سے بسا اوقات "فولک" کا سیاسی مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً فولکس فیر ترے تنگ Volksvertretung کا مرادف انگریزی میں Representation of the people ہے۔

کو ظاہر کرتے ہیں۔
چنانچہ اہل جرمنی بنا از منۂ وسطیٰ میں ایک "امت" بھی تھے اور ایک قوم بھی اور اخیر کی چند صدیوں میں اُن کی حیثیت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک امت کی تھی جو مختلف سلطنتوں، ملکوں یا یوں کہئے کہ مختلف قوموں میں منقسم تھی آج جرمانی قوم (Volk) پھر زندہ ہوگئی ہے گو کہ جرمانی امت کے متفرق اجزا غیر جرمانی قوموں اور سلطنتوں کا جزو بھی ہیں۔ ہر چند کہ ہمارے زمانے میں قومیت کا خیال اُس سے زیادہ قوی ہے جتنا کسی سابق زمانے میں رہا ہے مگر اب بھی "امت" اور "قوم" کے حدود کسی جگہ بھی بتمامہ ایک نہیں ہوگئے ہیں۔

امت کی ابتدا

"امتیں" اور "قومیں" تاریخ کی پیدا کردہ ہیں۔ ایک امت نفسیاتی کارروائی کے ذریعے سے آہستہ آہستہ وجود میں آتی ہے جس میں آدمیوں کا ایک گروہ بتدریج معاشرت اور زندگی کا ایک انداز اختیار کر لیتا ہے، جو دوسرے گروہوں سے اُسے ممیز کردیتا ہے اور یہی ایک نسل کی مستقل توریث ہوجاتی ہے کسی تحکمانہ اتفاق یا اجتماع سے کبھی کوئی اُمت نہیں بنتی ہے بلکہ اشخاص کی ایک کثیر تعداد کے آپس کی رضامندی سے اتفاق کرلینے اور معاشرتی میل جول سے بھی کوئی امت نہیں پیدا ہوسکتی۔ امت کے لئے کئی نسلوں کے تجربات وحوادث کے تعامل باہمی کی ضرورت ہے، اور پھر بھی اس وقت تک اس کے استمرار کا یقین نہیں ہوسکتا جبتک کہ خاندانوں کی روایاتِ تہذیب پشتہا بپشت تک جاری رہکر متوارث خصائل نہ پیدا کردیں۔

قوم کی ابتدا

ایک قوم کے وجود میں آنے کے لئے پہلے سیاسی کارروائی یعنی ایک سلطنت کے قائم ہونے کی ضرورت ہے اور اس لئے ایک نیا نظام سلطنت جاری کرکے بہت عجلت کے ساتھ ایک قوم معرض ظہور میں لائی جاسکتی ہے مگر حقیقی تحفظ اُسے اُس وقت تک نہیں حاصل ہوسکتا جبتک کہ اُس کی بنیاد قومیت پر نہ رکھی جائے۔

امت کے بنانے میں اُن متعدد قوی اور عناصر کو ایک ساتھ عمل کرنا پڑتا ہے جو مشتملہ گروہوں کو اُن کی مشترک عصبیت، مشترک اغراض اور مشترک رسم و رواج

کے ذریعے سے آپس میں متحد ہو جانے اور دوسرے اجنبی گروہوں سے جدا ہو جانے کی طرف مائل کر دینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

(الف) مذہب کا اثر

مذہبی اعتقادات نے نہ صرف خصوصیت کے ساتھ ازمنۂ وسطیٰ کے یورپ ہی میں بلکہ قدیم ایشیا میں بھی انسان کے تمام خیالات اور زندگی پر ایسا قوی اثر ڈالا کہ ملت دینی Community قومیت کی بنا قرار پا گئی اور اس مذہب پر اعتقاد نہ رکھنے والے اجنبی قرار پا کر خارج کر دیئے گئے۔

ظن غالب ہے کہ ہندوستان اور ایران کے آریا اولاً مذہبی وجوہ کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور برہمنی مذہب کے پیرو اور بودھ مت کے ماننے والے تو اپنی مشترک بود و باش، زبان اور نسل کے باوجود یقیناً محض مذہب ہی کی بنا پر ایک دوسرے سے اس طرح لڑتے تھے گویا وہ ایک دوسرے سے بیگانہ اُمتیں (People) ہیں۔ اسی طرح اُمت یہود نے صرف اپنے وطن فلسطین میں بلکہ بابل کی غلامی میں اور اس کے بعد اسکندریہ کی رومی شہنشاہی کے تحت میں اور روما کے دوران قیام میں اور یہودی سلطنت کے تباہ ہو جانے پر دور دراز غیر ممالک اور اُمتوں میں منتشر ہو جانے کے بعد بھی اپنے خصوصیات کو قائم رکھا مگر اب کہ مذہبی یکجہتی کے مقابلے میں مذہبی آزادی کی زیادہ قدر ہونے لگی ہے اُمتوں کے بننے اور جدا ہونے کے لئے مذہب کا اثر نسبتاً کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اب اتحاد و تفریق کے لئے مذہب کی نسبت قومیت زیادہ قوی طاقت رکھتی ہے جرمانیوں میں بلا لحاظ اس کے کہ وہ کیتھولک ہیں یا پروٹسٹنٹ۔ موسوی مذہب والے ہیں یا ایک سے زیادہ معبودوں کے ماننے والے قومی اتحاد کا احساس و ادراک پیدا ہو گیا ہے اور وہ غیر ملکی اُمتوں سے اپنا امتیاز قائم رکھتے ہیں۔ باوجودیکہ اکثر ان میں سے انھیں کے ہم مذہب ہیں۔

(ب) زبان

اُمتوں کی تفریق میں مذہب سے زیادہ قوی الاثر شئے زبان کا اختلاف ہے۔ زبان کا اشتراک اُمت کا خاص نشان ہے۔ مختلف ممالک کی آبادیاں اپنی زبانوں کو بتدریج اپنی ایک خاص وضع میں ڈھالتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ

ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب وہ لوگ جو پہلے ایک ہی زبان بولتے تھے ایک دوسرے کی گفتگو کے سمجھنے سے قاصر ہو جاتے ہیں کیونکہ اُن کی زبانیں مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔ اس نوبت کے بعد بھی جو لوگ ایک ہی زبان بولتے ہیں، وہ ایک دوسرے کو اپنا ہم امت سمجھتے ہیں اور اُن دوسروں کو جن کی زبان وہ نہیں سمجھتے اجنبی جانتے ہیں۔

زبان ہی مشترک جذبات کے اظہار کا ذریعہ اور تبادلہ خیالات کا آلہ ہے۔ وہ خاندان میں آگے بڑھتی رہتی اور وارث کے طور پر جاری رہتی ہے۔ اسلئے مادری زبان روزمرہ عمل کے ذریعے سے قومیت کے خیالات کو بیدار اور زندہ رکھتی ہے۔ خود اجنبی نسلیں جب وراثت کے ذریعے سے ایک نئی زبان کو اختیار کرتی ہیں تو رفتہ رفتہ اُن نسلوں کی طینت میں اُس زبان کے اثر سے تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اُسی قوم میں شمار ہونے لگتی ہیں جس کی زبان وہ بولتی ہیں۔ اس طرح جرمانی قبائل اوسٹ گوٹ اور لوم بارڈ جو اٹلی میں تھے وہ رفتہ رفتہ اٹالوی ہوگئے؛ فرانس میں کلٹ فرانک اور برگنڈوی فرانسیسی بن گئے اور پروشیا میں سلادی اور وینڈ جرمانی ہوگئے۔

ہمارے وقت میں اگر قومیت کا احساس تمام سابق زمانوں سے زیادہ قوی اور موثر ہو گیا ہے تو اس کی خاص وجہ زبان اور ادب (لٹریچر) کا اثر ہے اور سب سے بڑھکر یہ نتیجہ ہے موقت الشیوع مطبوعات کا۔ قومی تحریک کو سب سے زیادہ قوت قومی ادب سے پہنچی ہے۔ کیونکہ قومی ادب ہی وہ چیز ہے جو خیال اور احساس کا اتحاد قائم کرتی اور جو مشترک ذہنی خزانوں کو وسعت دیتی ہے۔

تاہم زبان ہی ہمیشہ قومیت کا فیصلہ نہیں کرتی اور اس لئے "اُمت" اور موروثی زبان کا جتھا دونوں ایک ہی چیز نہیں ہیں بریٹنی (واقع فرانس) کے رہنے والے اور باسک[1] اپنے آپ کو امت فرانسیسی کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔

---

[1] باسک واقع فرانس کے باشندے ایک قدیم زبان بولتے ہیں۔ اور اس کا نام اسکیورا ہے۔

حالانکہ وہ فرانسیسی زبان یا تو بولتے ہی نہیں یا اُس کا استعمال مثل ایک سیکھی ہوئی غیر زبان کے کرتے ہیں - اس موقع پر فرانسیسی قومیت کا احساس ایک قوم کی حیثیت سے سیاسی طور پر متحد ہوتے، مشترک حوادث اور مشترک اغراض اور ایک ہی تہذیب سے پیدا ہوا اور انہیں سے قائم ہے - دوسری جانب انگریز اور شمالی امریکی اگرچہ ایک ہی زبان بولتے ہیں، مگر وہ قومیت میں ایک دوسرے کو علیحدہ سمجھتے ہیں - اگرچہ ان کا تعلق قریبی ہے مگر پھر بھی وہ ایک دوسرے سے ممیز ہیں - یہاں زبان کا سوال نہیں ہے بلکہ طبعی کیفیات اور مقاصد اور تاریخی معاشرتی اور سیاسی حالات کے اختلاف نے ایک امت کو دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے

(ج) سکونت رسم و رواج سیاسی اتحاد وغیرہ

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئی اُمتوں کے بننے میں مذہب اور زبان کے سوا (ا) وطن اور ملک، (ب) طرز معاشرت فرائض زندگی اور رسم و رواج اور (ج) سیاسی تعلقات کے ایک ہونے کا بھی اثر پڑتا ہے -

نسلوں کا امتزاج

ان سب کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جس کا اثر اس خصوص میں زیادہ ہوتا ہے یعنی مختلف قومیتوں کا میل جس کے ذریعے سے ایک قومیت کے بعض حصے ایک دوسری قومیت کے ارکان کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیتے ہیں اس طرح سے ایک نیا گینڈا اور ایک نئی خصلت اور اُسی سے ایک نئی قومیت پیدا ہو جاتی ہے یورپ اور امریکہ کی تاریخ اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں -

امت کی خصوصیت مشترک جذبے اور مشترک خصلتیں ہیں یہ باتیں ترقی کی غیر ارادی رفتار سے حاصل ہوتی ہیں -

(۱) امت کا اصلی جوہر اُس کے تمدن میں مخفی ہے اُس کا اندرونی اتصال اور غیر امتوں سے اُس کا افتراق زیادہ تر اُسی تمدنی ترقی سے پیدا ہوتا ہے اور ان کا اظہار بالتخصیص اُس کے حالات پر اثر ڈالنے سے ہوتا ہے - اسے ہم صرف نفسیاتی نقطۂ نظر سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے اصلی جوہر کو ہم اُسی مشترک جذبے اور مشترک خصلت میں دیکھ سکتے ہیں جو اس کے محرک ہیں، اُسے ہم اُسی حد تک عضوی (ذی حیات) کہہ سکتے ہیں جہاں تک اس کی کیفیت کا بدیہی اظہار نسل کے قد و قامت اُس کے خط و خال، زبان، عادات، و اطوار سے ہوتا ہے مگر حقیقت میں امت شخصیت کے اعلیٰ مفہوم کے لحاظ سے کوئی عضوی ہستی نہیں ہے جیسی ایک قوم کی ہستی ہوتی ہے

امت میں باہمی ارتباط کا احساس اور اتحاد کا میلان موجود ہے مگر قانونی ارادے اور عمل کا اتحاد نہیں ہے اور نہ قانونی شخصیت کا وجود ہے جب تک کہ وہ ایک سلطنت کے حدود میں ایک قوم نہ بن جائے۔

اگرچہ انسانی طبیعت اور انسانی کوششیں "امتوں" کی ساخت پر بہت بڑا اثر رکھتی ہے مگر زیادہ تر یہ عمل مثل ایک فطری ضرورت کے غیرارادی طور پر جاری رہتا ہے محض اس بات سے کہ ایک اکیلی نوع انسانی مختلف امتوں میں منقسم ہو گئی ہے یہ موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کی مسابقت اور ان کے انواع و اقسام کے قوائے عملیہ کے ذریعے سے ان کی فطرت کی وہ تمام پوشیدہ قوتیں عیاں ہو جائیں جن میں مشترک ترقی کی قابلیت موجود ہے اور اس طرح انسان اپنی غایت اصلی کو زیادہ وسعت اور فراوانی کے ساتھ پورا کر سکے امتوں کا نمو و ارتقا دنیا کی تاریخ کا ایک زبردست جزو ہے اور یقیناً اُس کے خدائی نقشے کے بنیادی خطوط ہیں۔

امت کی تعریف

پس "امت" کے تصور کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے: امت ایک موروثی نظام معاشرت ہے اُن مختلف پیشوں اور مختلف معاشری مدارج کے آدمیوں کے گروہوں کے مشترک جذبے، مشترک احساس اور مشترک نسل کا جو سیاسی یگانگت سے قطع نظر بھی خصوصاً ایک ہی زبان ایک سے رسم و رواج اور ایک سی تہذیب کے باعث یہ احساس رکھتے ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے ہم قبیلہ ہیں اور ایک ہی سی تہذیب نے اُن کے آپس میں رشتہ داری قائم کر دی ہے اور غیر امتوں سے اُن کو جدا کر دیا ہے۔

اُمت کے حدود تحرک و تبدل کی قابلیت رکھتے ہیں، اپنی زبان اپنے عادات و اطوار اور اپنے تمدن کو غیر گروہوں میں پھیلا کر اور اس طرح سے انھیں اپنے اندر جذب کر کے وہ مسلسل ترقی اور وسعت حاصل کر سکتی ہے، اسی طرح اگر کوئی غیر تمدن قاتحانہ طور سے اُس پر غالب آجائے اور اُس کے افراد کو اپنے اندر جذب کر لے اور ان کی حالت بدل دے تو وہی "امت" گھٹ سکتی، شکست ہو سکتی اور بالکل نیست و نابود ہو سکتی ہے۔ اس طریقے پر ایک بڑی اُمت کا اعلیٰ تمدن

چھوٹے چھوٹے قبیلوں کے ناکمل تمدنوں کو آہستہ آہستہ فنا کر کے اُن کی جگہ پر اپنے
کمل اور وسیع نظام کو قائم کر دیتا ہے۔

قوم کی تعریف

لفظ "قوم" سے ہم بالعموم کسی سلطنت کے جملہ افراد کا اجتماع جس حیثیت سے
کہ وہ سلطنت کے اندر متحد و منظم ہوں مراد لیتے ہیں۔ قوم سلطنت کے قائم ہونے سے
وجود میں آتی ہے وہ شے جو قوم کو امت سے بلند کرتی ہے وہ سیاسی یگانگت اور
یکجہتی کا احساس و ادراک ہے خواہ اس احساس نے کم ترقی کی ہو یا زیادہ۔ کوئی قوم
جو اپنے ملک کو چھوڑ دے اس کی قومی حیثیت برقرار متصور ہو سکتی ہے مگر صرف
عارضی طور پر یہاں تک کہ اسے کسی نئے ملک میں ایک نئی سلطنت قائم کر لینے میں
کامیابی ہو جائے۔ سوا اس کے قوم سلطنت سے پہلے بھی قائم ہو سکتی ہے جیسے
یہود کی قوم موسیٰ کے تحت میں یہودی سلطنت سے مقدم تھی مگر یہاں بھی صرف اس وجہ
سے ایسا تھا کہ حیات سلطنت کی تحریک یہودی قوم میں پوری قوت کے ساتھ
ترقی کر چکی تھی، اور قوم کی متحد تنظیم بنائے سلطنت کے لئے راستہ صاف کر چکی تھی۔

سیاسی اتحاد کے احساس سے قوم امت سے ممیز ہوتی ہے

یہاں تک تو قوم کے تخیل کے ساتھ سلطنت کا لابدی تعلق برابر قائم ہے
اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ "سلطنت نہیں تو قوم بھی نہیں"۔ سلطنت کی تخلیق پر ہم خصوصیت
کے ساتھ چوتھے مقالے میں بحث کریں گے۔ اگر ہم عام طور پر قوم کے لفظ کا اطلاق
اُس گروہ اُمت پر نہیں کرتے جو محض ایک بے بس محکوم ہو اور اس کے کچھ سیاسی
حقوق نہ ہوں اور اس لحاظ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ "قوم نہیں تو سلطنت بھی نہیں"۔
مطلق العنان حکومت قوموں کو نہیں جانتی۔ وہ صرف رعایا کو جانتی ہے۔

سلطنت نہیں تو قوم بھی نہیں۔

اگر پوری قوم یا اُس کا بڑا حصہ ایک ہی امت پر مشتمل ہوتا ہے، تو طبعاً اُس
امت کی مشترک روح بہ لحاظ زبان اور رسم و رواج قوم پر چھا جاتا ہے، برخلاف
اس کے اگر وہ مختلف امتوں کے اجزا سے مرکب ہوتی ہے، تو اس میں جذبات
اور تنظیمات کا اتحاد ایک امت کے بہ نسبت کم ہوتا ہے۔

دوسری جانب قوم کو امت پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ قوم میں اتحاد
حقوق زیادہ نمایاں درجے تک ترقی کر جاتا اور اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ
امور سلطنت کے انصرام میں حصہ لے سکے اور اس میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے

قوم ایک مجموعی شخصیت ہے

کہ نظام سلطنت میں موزوں اعضا کے قیام سے وہ اپنی عام آزادی کا اظہار اور اون کے عملی استحکام کا انتظام کر سکے - ایک لفظ میں کہہ سکتے کہ وہ قانونی و سیاسی طور پر ایک مجموعی شخصیت ہے ۔

قوم کی روح اور ارادہ

اس لئے ہم قومی روح اور قومی ارادے کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو بجا ہیں - یہ روح اور یہ ارادہ اُن جملہ افراد قوم کی روح اور ارادے کے مجموعے سے کچھ زائد حقیقت رکھتا ہے جو قوم میں شامل ہیں - یہ روح اور ارادہ اپنے ظاہر و باطن میں منفرد اور متضاد نہیں ہے بلکہ مشترک روح اور عام ارادے کا کامل اتحاد اس کے اندر موجود ہے ۔

قوم عضوی زندگی کے تغیرات کے تابع ہے۔

مزید براں اقوام ذی اعضا ہستیاں ہیں اور اس وجہ سے عضوی زندگی کے فطری قوانین کے تابع ہیں - ان کی تاریخ ترقی میں وہی مدارج ممیز طور پہ پائے جائیں گے جو افراد کی زندگی میں پائے جاتے ہیں - کسی قوم کی فطری قوتیں اور قابلیتیں - اس کے خیالات اور ضروریات پیرانہ سالی میں وہی نہ ہوں گے جو عہد طفلی میں تھے - افراد کے مانند اقوام میں بھی زندگی کا وسط ان کی طبیعت اور طاقت کے عروج کا زمانہ ہوتا ہے - فرق صرف اس قدر ہے کہ جو زمانہ افراد کی زندگی میں دہائیوں سے شمار ہوتا ہے اقوام کی زندگی میں صدیوں سے شمار کیا جاتا ہے مگر فانی ہونے کے لحاظ سے اقوام افراد سے کچھ بہتر نہیں ہیں -

تعلیقات

(۱) سوی نی کا یہ ایک کارنامہ ہے کہ اس نے بحیثیت ایک عضوی ہستی کے قوم کی اہمیت کو اور جرمانیا میں ارتقائے قانون پر قوم کی عمر کے مختلف مدارج کے اثر کو نہایت واضح طور پر بیان کر کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا -

(۲) خاندانی رابطے سے از خود نہ امت ظہور میں آتی ہے اور نہ قوم اور اشلائیر ماخر Schleiermacher کا یہ کہنا تاریخ کے سراسر مخالف ہے کہ اگر بہت سے خاندان بذریعہ ازدواج آپس میں متحد اور دوسروں سے منقطع ہو جائیں تو قومی اتحاد اُس کا نتیجہ ہوگا - روما کے پیٹریشین Patrcian آپس میں ازدواجی تعلق

رکھتے تھے اور یہی حال پلیبیائین (Plebeian) گروہ کا تھا۔ مگر اولاً اُن میں باہمی ازدواج کا طریقہ رائج نہیں تھا، پھر بھی یہی دونوں ملکر رومی قوم بنے تھے۔

جرمانی (ٹیوٹنی) قومیں طبقات کے اتحاد پر مشتمل تھیں جن میں سے ہر ایک اپنے طبقے کے اندر ہی اپنے برابر والے گھر میں بیاہ کر سکتا تھا۔ موجودہ زمانے میں ہم مختلف امتوں میں باہمی ازدواج کا رواج دیکھتے ہیں۔ مگر اس سے کوئی نئی اُمت نہیں پیدا ہوتی۔

(۳) من چینی اپنی کتاب (Della nazionalita come fonda mento del Diritto delle Genti) مطبوعہ ٹیورن ۱۸۵۱ء صفحہ ۳ میں "قومیت" کی تعریف اس طرح کرتا ہے "ایک فطری اتحاد اُن انسانوں کا جو اپنے وطن، نسل، رواج اور زبان کے ایک ہونے سے مشترک زندگی میں شامل ہو گئے ہیں اور اس اجتماعی زندگی کا احساس رکھتے ہیں"۔ من چینی کا یہ تسلیم کرنا تو درست ہے کہ سلطنت قائم کرنے کی طبعی قابلیت قومیت میں موجود ہوتی ہے۔ مگر اس کی رائے سے قوم اور امت کا فرق کافی وضوح کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا نیز وہ اس طرف مائل ہے کہ امت کو ایک قانونی شخص تصور کرے حالانکہ کوئی امت اس وقت تک قانونی شخص کی حیثیت کو نہیں پہنچ سکتی جبتک وہ ایک سیاسی عضویے کے درجے پر نہ پہنچ جائے۔

تیسرا باب

قومیتوں کے حقوق

حقوق جن کا ایک امت دعوی کرسکتی ہے

اس امر سے کہ ہم قومیتوں کے حقوق کے تسلیم کیے جانے کا مطالبہ کرنے لگے ہیں ترقی تمدن میں ایک قدم آگے بڑھنے کا اظہار ہوتا ہے۔ قومیتیں چونکہ نوع انسانی کے اجزا اور تاریخ عالم کے ایک عظیم الشان عمل ارتقائی کا نتیجہ ہیں اس لیے وہ اس بات کی مستحق ہیں کہ اُن کے قیام و دوام کی بھی حرمت و حفاظت کی جائے سب سے پہلا اور سب سے زیادہ قرین فطرت اور بنیادی حق اپنی ہستی کا برقرار رکھنا ہے۔ لیکن ایک اُمت کی "روح عامہ" سے زیادہ اپنی بقائے ہستی کا حق انسانی زندگی کی کس ہیئت و شکل کو حاصل ہو سکتا ہے یہی "روح عامہ" انفرادی زندگی کا اساس اور اس کے ساتھ ہی ارتقائے انسانی کی شرط اولین ہے مگر اس کے لیے وقت چاہیے کہ یہ خالص اخلاقی اقتضاء قانونی اصول کی صورت اختیار کرے۔ اس حد تک اصول قومیت کی بڑی اہمیت حکمت عملی کی حد میں داخل ہے قانون عامہ سے اُسے تعلق نہیں ہے۔

مگر ایسے اصولی قومی حقوق بھی ہیں جن کا دعوی ایک ہی قومیت کے اعضائے مختلفہ جائز طور پر کر سکتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اپنی قومی زبان پر حق

ہر ایک "اُمت" کے لئے اس کی زبان اُس کی نہایت ہی خاص ملک ہے زبان ہی میں امت کی تخصیصی صفت رونما ہوتی ہے اور یہی وہ نہایت مضبوط زنجیر ہے جو اُمت کے افراد کو باہم ملائے ہوئے ہے اس لئے سلطنت کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ کسی قومیت (امت) کو اس کی زبان کے استعمال [۱] سے روکے نہ اس کے ترقی دینے اور اس کے ادب کو رواج

[۱] ۲۱ دسمبر ۱۸۶۷ء کے آسٹروی اساسی قانون میں شہریوں کے عام حقوں کی بابت دفعہ ۱۹ میں

کرنے سے منع کرنا چاہئے بلکہ اس کے برعکس سلطنت کا یہ فرض ہے کہ جس حد تک تمدن کے عام اغراض کو نقصان نہ پہنچے وہ ہر ایک زبان کو آزادی کے ساتھ پھیلنے دے اور خیر خواہانہ اس کے رواج کو ترقی دے۔ اہل روما کا اپنے صوبوں کی دیسی زبانوں کا دبانا اور ریٹوٹنی نظم و نسق کے ممالک میں سزائے موت سے ونڈی زبان کے استعمال کو روکنا حقوق پر وحشیانہ دست درازی تھی۔

مگر اس اصول سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ سلطنت کے اغراض کے لئے تمام زبانوں کو ترک کر کے کسی ایک خاص زبان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ جہاں سلطنت کی زندگی کا تعلق ہے وہاں قوم کی بہبود بہ حیثیت مجموعی اس امر کی متقاضی ہے کہ زبان کا اتحاد قائم کیا جائے انگریزی پارلیمنٹ سے ویلزی اور گیلی زبانوں کا فرانسیسی مجلس ملکی سے باسک اور برٹن اور جرمانی رائشس تاگ سے پولی ڈینی اور فرانسیسی زبانوں کا اخراج حق بجانب ہے مگر سویزرلینڈ ان مختلف قومیتوں کو جن سے وہ مرکب ہے زیادہ وقعت دیتی ہے اور سرکاری زبان میں فرانسیسی کے ساتھ جرمانی کو شامل کر رکھا ہے اور بعض مواقع پر اطالوی زبان کو بھی تسلیم کرتی ہے۔

سلطنت کو اس امر کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ مدارس میں زیادہ ترقی یافتہ زبان کی تعلیم کا انتظام کرے تاکہ ہنوز غیر تکمیل یافتہ امت کے بچے ایک پاکیزہ اور مقتدر علم ادب کا ورثہ حاصل کر سکیں بخلاف اس کے ایک متمدن اُمت اسے نہایت ہی سخت ظلم سمجھتی ہے کہ ایک غیر ملکی زبان کی طرفداری میں اس کی زبان مدرسے اور کلیسا سے خارج کر دی جائے۔

مزید براں ہر ایک اُمت کو اپنے خاص رسم و رواج پر عمل کرنے کا اس حد تک حق ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاقی قانون انسانی کے مخالف یا حقوق سلطنت کے لیے ضرر رساں نہ ہوں ہندوستان کی بیواؤں کو اپنے شوہروں کے مرنے پر ستی ہو جانے کی اجازت نہ دینے میں انگریز حق بجانب ہیں مگر غیر مضر قومی کھیلوں کے بند کرنے کا

۲۔ اپنے خاص رسوم

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ یہ تحریر ہے کہ قوم کے اندر تمام قبائل کو یکساں حقوق حاصل ہیں اور ہر ایک کو اپنی قومیت اور زبان کے قائم رکھنے کا ناقابل الفسخ حق ہے۔

سلطنت کو کوئی حق نہیں ہے ۔

خاص قانونی تنظیمات کے حدود میں کسی اُمت کو اپنے اس قسم کے قانونی تنظیمات کے سلطنت کی طرف سے تسلیم کئے جانے اور اس کی محافظت ہونے کی امید کم رکھنا چاہیے اس لئے کہ ایسی صورت میں اُس اُمت کے مقابلے میں کچھ تو سلطنت کا اتحاد اور اس کی یکسانی اور کچھ سلطنت کی متمدن قوم کے اغراض فطرتاً زیادہ اثر رکھتے ہیں ۔

سلطنت کے حدود کے اندر اپنے خاص قوانین پر عمل پیرا ہونا ۔

ایک ترقی یافتہ سلطنت کے لئے ایک ایسا قانون ضروری ہے جو ساری آبادی کو شامل ہو اور منفرد اُمتوں کے حقوق کو بدل سکے یا منسوخ کر سکے۔ ہم اہل روما پر یہ الزام نہیں لگا سکتے کہ انھوں نے اپنی تمام شاہنشاہی میں رومی قانون جاری کرنے کی کوشش کی مگر بیباکانہ مداخلت ضرور قابل ملامت ہے ۔ انگریزی حکومت نے اس معاملے میں نہایت ہی سخت غلطی کی کہ اس نے ۱۷۹۳ء میں انگریزی قانون اور طریق عدل جوئی کو بنگال کے لوگوں میں زبردستی نافذ کرنا چاہا جو اس کے لئے ہنوز تیار نہیں تھے ۔ دوسری جانب اسی زمانے میں جرمانی سلطنتوں میں بحد اضطراب تھا کہ قوم کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے لئے روایتی قرابتی حقوق کا ایک انبار پریشان جمع ہو گیا اور ساتھ ہی تمام امت کے لئے ایک غیر ملکی قانون کے دلیرانہ اور انقلابانہ طور پر جاری کر دینے کی روش بھی قائم رہی ۔

پس قانون کے ارتقا میں قوم کو بہ نسبت ”اُمت“ کے زیادہ قوی حق حاصل ہے، قانون و انصاف سب کے لئے ایک اور یکساں ہونے کے خیال سے قومیت کے اختلافات کو دب جانا چاہیے ۔

یہ یقینی ہے کہ رومیوں کے لئے یہ آسان تھا کہ ماتحت اُمتوں کو قانون کے لحاظ سے رومی بنا لیں مگر یہ مشکل تھا کہ وہ زبان کے لحاظ سے انھیں لاطینی بنا لیتے اور ہم اسی طرح فرانسیسیوں پر اس امر کا الزام نہیں لگا سکتے کہ وہ اپنا نپولینی ضابطہ جرمانی الساس اور قدیم گالی بریٹنی پر کیوں نافذ کرتے ہیں، انگریزوں کو ہر طرح پر یہ حق حاصل ہے کہ اہل ویلز اور اہل آئرلینڈ پر یکساں قانون جاری کریں تاہم یہ امر فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ رومیوں کا غیر متمدن جرمانیوں پر رومی طریق عدل گستری کے نافذ کرنے ہی کا اثر تھا کہ جرمانی آزادی کی

عظیم الشان جدوجہد کا شعلہ بلند ہوا اور اسی وجہ سے صدیوں تک جرمانی نظریہ قانون کا یہ مسلمہ اصول رہا ہے کہ ہر "اُمت" کو اپنے خاص قانون پر عملدرآمد کی اجازت ہونا چاہیئے اور ہر شخص کی اس کے خاص وطنی اور قومی حقوق کے مطابق حفاظت ہونا چاہیئے۔

قدیم رومی اصول اگر انتہائی حد تک پہنچایا جاتا تو وہ قومی قانون کے ساتھ ہر طرح کی قومی آزادی کو بھی برباد کردیتا اور اگر قدیم جرمانی طریقے پر سختی کے ساتھ عمل کیا جاتا تو حکومت اور قانون کی ہر طرح کی اعلیٰ تہذیب غیر ممکن ہوجاتی آزادی اقوام اور ترقی تمدن کی خوش نصیبی تھی کہ رومی اور جرمانی دشمنوں کے طور پر ایک دوسرے سے ملے اور کسی اصول کو کامل غلبہ نہیں ہونے پایا۔

۴۔ اپنی اخلاقی و ذہنی زندگی کا برقرار رکھنا۔

اگر کسی اُمت کی اخلاقی اور ذہنی زندگی پر سلطنت کی طاقت کی طرف سے حملہ کیا جاتا ہے تو اُس اُمت کے افراد نہایت ہی سخت مقاومت پر آمادہ ہوجاتے ہیں انسان کے واسطے ظلم و تعدی کی مقاومت کے لئے قومیت کی محافظت سے بڑھکر کوئی سبب نہیں ہوسکتا اس کشمکش[1] میں ضابطہ بیانی کو نقصان پہنچ سکتا ہے مگر خود نفس قانون کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔

[1] نی بور (Niebuhr) اپنی تصنیف میں جس کا نام "پروسیا کا حق سکسونی دربار کے مقابلے میں" ہے لکھتا ہے: "سیاسی تعلقات کے بہ نسبت ایک ہی نسل کی مختلف امتوں کو متحد یا متفرق کرتے میں تمام قومیت کے حقوق بہت بلند ہیں صرف نحو، زبان، رسم و رواج، روایات اور یادیات ایسا رشتۂ اخوت قائم کردیتے ہیں جو غیر قبائل سے انھیں علٰحدہ کردیتا اور اپنے قبیلے کے برخلاف دوسرے قبیلے کے ساتھ اتحاد کو جرم بنادیتا ہے"۔

چوتھا باب

تعمیر سلطنت میں قومیت بہ حیثیت اصول کے

قومیت ہمیشہ قوی رہی ہے

تاریخ عالم کے ہر زمانے میں سلطنت اور سیاسیات پر قومیت کا زبردست اثر پڑتا رہا ہے۔ قومی یگانگت اور مخصوص قومی صفات کے احساس نے یونانیوں کو ایران کے مقابلے میں جنگ پر برانگیختہ کیا۔ اپنی قومی آزادی کے خاطر جرمانیوں نے رومیوں سے مقاومت کی۔ رومی عالمگیر شہنشاہی کے لاطینی اور یونانی شہنشاہیوں میں تقسیم ہو جانے کی اصلی وجہ قومیت ہی کے اختلافات تھے۔ فرانکی شاہی کا شکست ہونا، فرانس اور جرمانیا کا ایک دوسرے سے الگ ہو جانا بہت کچھ رومانی اور جرمانی زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوا ازمنۂ وسطیٰ تک میں قومیت کے قوی اختلافات وقتاً فوقتاً نمایاں ہوتے رہے ہیں مگر موجودہ زمانے تک یہ نہ ہو سکا کہ قومیت کا اصول ایک قطعی سیاسی اصول کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہو۔

مگر سیاسیات کے اصول کی حیثیت سے وہ تھوڑے ہی زمانے قبل مسلّم ہوئی ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت کی بنا خاندانی یا طبقاتی اغراض پر ہوا کرتی تھی اور اس کے حدود قومی کے بجائے زیادہ تر ملکی تھے، بعد کی صدیوں میں بڑی بڑی یورپی امتوں نے نشوونما پائی مگر اس وقت تک بھی سلطنت نہ تو قومیت کی بنا پر قائم ہو سکی اور نہ اسے اظہار قومیت کا موقع ملا بلکہ بادشاہ اور اس کے عمال کو مرکز قرار دیکر اس نے ایک ناظمانہ خصوصیت حاصل کر لی تھی۔

نیز بہ حیثیت ایک سیاسی نظریہ کے۔

فطرتی حقوق کا نظریہ بھی اپنے حسب دلخواہ سلطنت کے دعووں کی بنا عام قومیت پر نہیں قائم کرتا تھا بلکہ انسانی فطرت اور اس کے ضروریات اور منفرد اشخاص کی آزادانہ مرضی پر اس کی بنیاد رکھی جاتی تھی۔ روسو کے نزدیک سلطنت کی بنا معاشرت پر ہے لیکن "امت" یعنی قوم جس سے وہ سلطنت کی اعلیٰ طاقت کو متعلق کرتا ہے وہ ایک متحدہ امت نہیں ہے، بلکہ ایک مجموعہ گروہ "یا شہریوں کی کثرت" ہے جو بلا کسی وجہ موجبہ کے ایک سلطنت کے قیام کے لئے باہم متفق ہو گئے ہیں۔ خواہ وہ

ایک ہی امت کا ایک چھوٹا سا جزو ہو خواہ متعدد قومیتوں کے اتحاد سے مرکب ہو۔ انھیں اصول پر ۱۷۹۱ء اور ۱۷۹۳ء کے فرانسیسی دستوروں کی بنا قائم ہے (دیکھو فرانسیسی دستور ۱۷۹۱ء عنوان ۳ دفعہ ۱، ۱۷۹۳ء دفعات ۲۵-۲۸، ۱۷۹۵ء دفعہ ۱) کہیں "امت" کا اور کہیں "قوم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر دونوں کا مفہوم یہی تھا کہ وہ شہریوں کا ایک مجمعہ گروہ ہے۔ جو کچھ ہوا صرف یہ تھا کہ سلطنت کی حکومت مرکز سے دائرے کی طرف منتقل کردی گئی یعنی بادشاہ کے ہاتھ سے عوام کے ہاتھ میں آگئی۔

نپولین اور اقوام یورپ

نپولین نے جب انیسویں صدی کے اوائل میں چارلس اعظم کی سلطنت کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی اور فرانسیسی امت پر اعتماد کر کے یورپ پر ایک ہمہ گیر شاہی قائم کرنا چاہی تو دوسری امتوں سے جو فرانسیسی حکومت کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتی تھیں اسے ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ باوجود اپنی ذہانت اور طباعی کے شہنشاہ کے لئے جو قومیت کی قدر و منزلت کو نہیں سمجھ سکتا تھا، قومی مقاومت بہت ہی سخت ثابت ہوئی، لیکن اس وقت تک بھی قومیت کے احساس میں پوری ترقی نہیں ہوئی تھی اگرچہ یہ جذبہ غیر ارادی طور پر عوام پر اثر ڈال رہا تھا مگر قومیت کی روح ابھی تک بیدار نہیں ہوئی تھی فرانسیسیوں سے انگریزوں تک کی مستحکم اور دیرپا نفرت بھی قومیتوں کے آزاد کرنے کی خواہشوں پر اس قدر مبنی نہیں تھی جس قدر کہ فرانسیسی انقلاب سے انگریزی طبقۂ امرا کی نفرت یورپ میں فرانسیسی غلبے کے خوف اور تجارتی اغراض پر منحصر تھی۔

انگریز باوجود اپنے اس بلند سیاسی احساس کے جو ان کے مردانہ غرور اور آزادانہ پاس قانون سے پیدا ہوتا ہے، قومیت کو سیاسی اصول کی حیثیت سے مشتبہ سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے جزیرے کی بادشاہی میں مختلف قومیتیں داخل ہیں اور کلٹی آئرش لوگوں کے قومی جذبات نے ایک سے زائد بار سلطنت کے اتحاد کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ قومیت پر بہت زیادہ زور دینے سے ان کی ہندوستان اور سمندر پار ملکوں کی عالمگیر شاہی کے بھی خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ فرانسیسیوں کے ساتھ کشمکش میں ہسپانویوں نے اپنے اتحاد کو ایک قوم کی حیثیت

سے محسوس کیا اور فرانسیسیوں کو غیر ملکی حکمران سے نفرت کرتے رہے مگر وہ اپنی ان مساعی کو اس درجہ قومیت کی جدوجہد نہیں سمجھتے تھے جس قدر وہ اُنھیں شیاطین انقلاب کے مقابلے میں اپنے جائز بادشاہ اور کیتھولک مذہب کی مساعدت تصور کرتے تھے۔ اہل جرمانیا اختلافات مذہب اور شہنشاہی کے مختلف خاندانی سلطنتوں میں منقسم ہوجانے کی وجہ سے سیاسیات میں قومیت کا احساس بالکل کھو بیٹھے تھے اور جب فشتے نے اپنی ولولانگیز تقریروں اور آرنٹ نے تحریروں سے جرمانی قومیت کے احساس کو تازہ کرنا چاہا تو صرف معدودے چند تعلیم یافتہ اشخاص نے اُدھر توجہ کی۔ روسیوں نے جب اپنے کو جنگ اور موت کے منہ میں ڈال دیا تو صرف اس لئے کہ وہ اپنے زار اور اس کی مقدس شہنشاہی کو مغرب کے بیدینوں کے مقابلے میں بچانا چاہتے تھے ورنہ اپنے کو ایک قوم سمجھنے کا خیال ان کے ذہن میں مطلقاً نہیں تھا۔

فرانسیسی انقلاب نے مبہم طور پر قومیتوں کی آزادی کا اعلان کیا مگر شاہی کی "رجعت" کے بعد یہ خیال پیروں کے نیچے روند ڈالا گیا۔ وائنا کی کانگرس نے قومی حقوق پر مطلقاً لحاظ نہیں کیا اور بڑی بڑی اُمتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے واپس شدہ شاہی خاندانوں میں تقسیم کر دیا، جس طرح روس آسٹریا اور پروشیا نے اس کے قبل ہی پولستان کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ اُسی طرح اب اٹلی اور جرمانیا کی تقسیم متعدد شاہی سلطنتوں میں کر دی گئی اور بلجیم اور ہولنڈیز باوجود متضاد قومیتوں کے ایک میں باندھ دیئے گئے۔

قومیت ۱۸۴۸ء کے بعد سے

اس امر واقعہ سے کہ قومیت کو نہ تو انقلاب کے مدبروں نے اور نہ رجعت شاہی کے مدبروں نے سیاسی اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا، اس کا اثر موجودہ زمانے کی سیاسی تاریخ پر اور بھی زیادہ نمایاں اور حیرت انگیز ہوجاتا ہے۔ علم نے بالخصوص جرمانیا اور اٹالیا میں اس کے قبل ہی قومیت کے تصور کو ظاہر اور سیاسیات میں اس کے نتائج کی طرف اشارہ کر دیا تھا مگر اُمتوں کے اس فطرتی حق کی طرف کہ وہ اپنے کو سلطنت کی صورت میں ہویدا کریں علمی توجہ تقریباً ۱۸۴۸ء ہی سے ہوئی۔ قومیت کی تحریکات عوام الناس تک میں سابق کے بہ نسبت زیادہ زور کے ساتھ برانگیختہ ہوگئیں اور نہ صرف ادبیات میں بلکہ سیاسیات میں بھی خواہشوں کے پورے ہونے کا مطالبہ کرنے لگیں۔ اُمتوں نے اپنے اتحاد کو سیاسی شکل میں بدلنے اور

قوموں کی حیثیت اختیار کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی، خاندانی دستور جو ازمنۂ وسطیٰ سے یورپی سلطنتوں کی وراثت میں چلا آتا تھا اب وہ قومی مطالبات وجذبات کے دھارے میں پڑ گیا تمام مملکتوں خصوصاً آسٹریا کو اُن مختلف قومیتوں کی آزادی حاصل کرنے کی متواتر کشمکش نے ہلا دیا جو وہاں سکونت پذیر تھیں۔ نئی مملکتوں اور اُن میں سب سے پہلے ایک متحدہ اٹالیا اور جرمانی شہنشاہی کا قائم ہونا اسی تصور قومیت کی ولولہ انگیزی کا نتیجہ تھا جس نے ایک امت کے منتشر اجزا کو مجتمع کرکے انھیں ایک جسم سلطنت میں عضو بند کر دیا۔ اس قومی جوش و تحریک کی قوت میں کوئی کلام نہیں ہے گو کہ اس کی حدود غایت میں بحث کی گنجائش ہے۔

بہ ظاہر ہے کہ قومیت کو کلیسا کے بہ نسبت سلطنت سے زیادہ قریبی اور قوی تعلق ہے کیونکہ کلیسا کے لئے عالمگیر ہیئت کا اختیار کرلینا زیادہ آسان ہے سلطنت ایک قومی عضویہ ہے اور قوموں کے خصائص وجذبات زیادہ تر وہ امتیں متعین کرتی ہیں جو اُس سلطنت کے اندر رہتی ہیں، اس لئے اُمت اور قوم کے درمیان ایک فطری تعلق اور مسلسل تعامل جاری رہتا ہے۔

نہائی اصول ہر اُمت کیلئے ایک سلطنت

اُمت کوئی سیاسی اجتماع نہیں ہے بلکہ ایک ایسا اجتماع ہے جو ایک مشترک تہذیب پر قائم ہے لیکن اگر واقعتاً اسے دماغی یکجہتی کا احساس ہو تو یہ امر طبعی ہے کہ وہ اُسے ایک ایسی عام آزادی کے ساتھ جو عملاً ظاہر ہو سکے ایک پوری شخصیت میں ترقی دینے کی خواہاں ہوگی یعنی دراصل وہ ایک سلطنت بن جانا چاہے گی۔

اُمتوں اور سلطنتوں کے باہمی حدود سے ان میں تعدیل پیدا ہو جاتی ہے

یہی ہے اس سیاسی اصول قومیت کی بنیاد جو آج مانا جاتا ہے۔ وہ اس پر قانع نہیں ہے کہ سلطنت قومی زبان، رسم ورواج اور تہذیب کی حفاظت کرے بلکہ وہ چاہتی ہے کہ خود سلطنت قومی سلطنت ہو جائے مجرداً ہم اسے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ہر امت کا یہ فرض اور اس کا یہ حق ہے کہ وہ ایک سلطنت قائم کرے چونکہ نوع انسان کثیر التعداد امتوں میں منقسم ہے اس لئے دنیا کو بھی اسی تعداد کی سلطنتوں میں منقسم ہو جانا چاہئے ہر امت کے لئے ایک سلطنت ہو اور ہر سلطنت کی بنا قومیت پر ہو۔ کیا یہ واقعتہً صحیح ہے؟ ہمیں اول اُمت اور سلطنت کا مقابلہ باعتبار اُن کے حدود وسعت کے کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ ان میں کیا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

ایک امت کئی سلطنتوں میں منقسم ہو

اگر سلطنت کے حدود اُمت کے حدود سے تنگ ہوتے ہیں تو ان میں دو

متضاد رجحان پائے جاتے ہیں۔

رجحان تفرد

اگر شہریوں میں اپنے سیاسی اتحاد کا مضبوط و زندہ احساس موجود ہے تو سلطنت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے باشندوں کی ایک جدید و ممیز اُمت قائم کرے چنانچہ قدیم زمانے میں ایتھنز اور اسپارٹا والوں نے اپنی سیاسی تربیت اور تفرد کی وجہ سے جداگانہ قومیتوں کی صورت اختیار کرلی۔ ازمنۂ وسطیٰ میں وینس اور جینوا والوں کا بھی حال ہوا اور اس سے بھی بعد کے زمانے میں ولندیزیوں (یعنی ڈچ لوگوں) اور کسی قدر سویزرلینڈ والوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا مگر سیاسی جذبات کی قوت سے ایک نئی اُمت بن جانے کی عظیم ترین مثال شمالی امریکی سلطنتوں کا انگلستان سے جدا ہو جانا ہے گو کہ اس میں شک نہیں کہ اس معاملہ خاص میں جغرافی اختلافات کا بھی اثر ہے۔

رجحان اتحاد

لیکن دوسری طرف اگر قومی جذبات کسی تنگ سلطنت میں فسردہ ہو جاتے ہیں تو وہ اُس کے حدود سے باہر نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اسی قومیت کی دوسری سلطنتوں سے ملکر ایک بڑی اور قومی سلطنت قائم کرلیں۔ قدیم زمانے میں فرانسیسی سلطنت کی اور انیسویں صدی میں متحدہ اٹالیا و متحدہ جرمانیا کی ابتدا یوں ہی ہوئی۔

(۲) ایک سلطنت میں متعدد اُمتیں داخل ہوں تو (الف) پہلو بہ پہلو آباد ہوں (۱) جذب

اگر سلطنت کے حدود ایک اُمت کے دائرے سے زیادہ وسیع ہیں یعنی اس میں دو یا زیادہ اُمتیں یا امتوں کے ٹکڑے شامل ہیں تو پھر۔

اگر مختلف اُمتیں ایک ہی ملک میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اپنی اپنی مجموعی حیثیت سے آباد ہیں تو مختلف صورتیں پیدا ہوں گی:۔

(۱) سلطنت ایک امت کے برتر تمدن پر مبنی ہونے کی صورت میں باہستگی دوسرے اجزا کے ہضم کرنے کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور اس طرح تمام قوم کو ایک امت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ چنانچہ قدیم رومی شہنشاہی میں مغرب پر لاطینیت اور مشرق پر یونانیت چھا گئی تھی، اسی طرح موجودہ زمانے میں سلطنت بلجیم جس کی بنا قوم کو لون اور اس کے فرانسیسی پایۂ تخت بروسلز پر ہے دہ فلیمی (Flemish) آبادی کے اعلیٰ طبقات کو گال بنا لینا چاہتی ہے اسی طرح روسی پولستان و الزاس کو

بزور روسی بنا لینا چاہتے ہیں ۔

اس طریق میں کامیابی اُسی وقت ہوتی ہے جب ایک مادّی و غالب اُمت تعلیم اخلاق ظنیت اور طاقت میں دوسری اُمتوں سے قطعی طور پر فائق ہو۔ جرمانیوں اور ایرانیوں کی مقاومت نے روما اور قسطنطنیہ کی لاتینیت اور یونانیت کی عمل پیرائی کی دھجیاں اُڑا دیں۔

(۲) انفصال

(۲) مختلف اُمتیں سیاسی انفصال کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ آئرلینڈ میں تنسیخ (اتحاد) کی تحریک اہل لمبارڈی اور اہل وینس کا آسٹریا سے جدا ہو جانا خود آسٹریا میں نظام سلطنت کے متعلق بالعموم تنازعات کا برپا رہنا آسٹریا اور ہنگری کی دوہری حکومت کی تجدید اسی طرح مگیاروں اور سلاووں اور جرمانیوں اور چیشوں کا تصادم ان سب سے اسی رجحان کی مستقل قوت کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳) اختلاف کا اتحاد (۲) غیر جانبدار حکومت کے ذریعے سے

دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ سلطنت مختلف اُمتوں کو باہم ملائے رہے بغیر اس کے کہ کسی ایک قومیت کو مرجح سمجھ کر اسی کے موافق اوروں کی حالت کو بدل دے مگر اس صورت میں خود سلطنت کو غیر جانب دار ہونا اور تخصیص کے ساتھ قومی ہونے کے حقوق سے ہر طرح دست بردار ہو جانا چاہئے اُسے ہر اُمت کو اُس کی اندرونی زندگی اور تمدن میں آزادانہ اختیار دینا چاہئے اور یہ خیال کر لینا چاہئے کہ سب کے حقوق یکساں ہیں۔ اس کی طرز عمل مخصوص قومی اغراض کے زیر فرمان نہ ہونا چاہئے بلکہ عام اغراض کے تابع ہونا چاہئے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے سے سویزرلینڈ نے سلطنت کے اتحاد کو خطرہ پہنچائے بغیر مختلف قومیتوں کو پہلو بہ پہلو برقرار رکھنے کے مشکل مسئلہ کو حل کر لیا اور اس طرح پر جرمانیا فرانس اور اتالیا کے درمیان کے اس پہاڑی ملک میں ان تین بڑی امتوں کے ٹکڑوں نے چھوٹی چھوٹی جمہوری جماعتیں قائم کر لیں اور آئین اور غیر جانبداری کے ساتھ متحد ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ منفرد صوبوں میں قومی خصوصیت موجود ہے۔ اب چاہے یہ اس وجہ سے ہو کہ ان خاص صوبوں میں ایک ہی امت آباد ہے جیسے شمالی اور مشرقی سوئٹزرلینڈ میں جرمانی یا مغربی سوئٹزرلینڈ میں فرانسیسی یا ٹیسینو میں اتالوی آباد ہیں اور چاہے اس وجہ سے کہ ایک خاص قومیت کو قطعی غلبہ حاصل ہے۔ جیسے برن اور گرا اور نیو نڈن میں جرمانیوں کو ویلشوں پر غلبہ حاصل ہے اور فرای برگ اور والیس میں فرانسیسیوں

کو جرمانیوں پر۔

(ب) مصنوعی طاقت کے ذریعے سے

مختلف امتوں کو بلا تمیز سیاسی اتحاد میں قائم رکھنے کا ایک بالکل ہی دوسرا طریقہ جوزف ثانی کے آسٹریا کو جرمانی بنالینے کی کوشش کی ناکامی کے بعد ایک مدت تک آسٹریا کی حکمت عملی سے ظاہری کامیابی کے ساتھ چلتا رہا وہ طریقہ یہ تھا کہ ہر منفرد سلطنت کو باقی دوسری سلطنتوں کی قوت سے دبا رکھنا چاہیے لیکن جبری اتحاد کا یہ بے روح طریقہ متفرق اجزا کو صرف مصنوعی طور پر متحد رکھے گا اور وہ بھی صرف اُسی وقت تک جبتک جابر طاقت کا خوف غالب ہے اگر اس کی آہنی گرفت ڈھیلی پڑجائے یا وہ اپنا اثر نہ ڈال سکے تو ستم رسیدہ قومیتیں بہت زور کے ساتھ ٹوٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہوجاتی ہیں آسٹریا نے ۱۸۶۷ء کے بعد سے اس امر کو سمجھ لیا ہے۔

(ج) انضمام

ایک ہی ملک میں مختلف امتیں بجائے خود مجتمع ہوکر ایک دوسرے سے منفصل نہیں ہوتی ہیں بلکہ آپس میں خلط ملط ہوکر رہتی ہیں پس ایسی حالت میں سلطنت کو کوئی خطرہ نہیں ہے البتہ اگر خطرہ ہے تو یہ کہ کمزور امت کو قوی امت مغلوب اور بالآخر تباہ کردیگی۔ اعلیٰ دماغی قابلیت رکھنے والی امت حاوی ہوجاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ دوسری امتوں کے منفرد اجزا کو ہضم کرلیتی ہے یہی وجہ تھی کہ جو جرمانی سابق روسی صوبوں میں بستے تھے وہ بالآخر روسی ہوگئے گو کہ وہ خود حکمراں نسل سے تھے اسی طرح ممالک متحدہ امریکہ میں آئرلینڈی، جرمانی اور فرانسیسی دو تین پشتوں کے بعد اینگلو سیکسن آبادی میں جذب ہوجاتے ہیں۔

قومیت کے دعاوی کا خلاصہ

اس عام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قومیت اور سلطنت کے اصول ایک دوسرے پر موثر ہوتے ہیں مگر امت اور قوم لازمی طور پر بہمہ وجوہ مرادف نہیں ہیں اس لئے ہم قومیت کے اصول کو ایک ضمنی دعوے سے زیادہ نہیں قرار دے سکتے اور زیادہ غائر نظر سے دیکھنے سے ہم نتائج ذیل پر پہنچتے ہیں۔

(۱) سیاسی قابلیت

ہر امت میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ وہ سلطنت کی بنا ڈال سکے اور اسے قائم رکھ سکے، اور صرف وہی امت ایک آزاد قوم بن سکتی ہے جو سیاسی قابلیت رکھتی ہو۔ جن امتوں میں خود قابلیت نہیں ہوتی انھیں ضرورت ہے کہ دوسری زیادہ ذی جوہر قومیں انکی رہبری کریں، کمزور امتوں کو یا تو دوسری امتوں سے

مل جانا پڑے گا یا اپنے سے زیادہ قوی طاقتوں کی حفاظت میں آنا پڑے گا۔ چنانچہ تمام مغربی یورپ میں کلٹک امتوں کا مصرف یہی ہے کہ وہ بے چون و چرا رومانی اور ٹیوٹنی سلطنتوں کی تعمیر کے لئے غیر متحرک مواد کا کام دیں۔ جنوب مغربی یورپ کی بہت سی مختلف امتیں اپنی سیاسی ہستی صرف اسی طرح قائم رکھ سکتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے پر انحصار کریں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا استحقاق اسی بنا پر ہے کہ اُس ملک کی امتوں کو اپنے سے ایک بلند تر قوم کی رہبری کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک قومی سلطنت کی بنیاد ڈالنے اور اسے قائم رکھنے کی پوری دماغی اور اخلاقی طاقت صرف وہی امتیں رکھتی ہیں جن میں مردانہ قوتیں (مثلاً فہم اور جرات) غالب ہوں۔ جن امتوں میں زنانہ صفات غالب ہوتی ہیں وہ انجام کار ہمیشہ دوسری فائق قوتوں کی محکوم ہو جاتی ہیں۔

(۳) تخالف جذبات کمزوری کا سبب ہے یا قوت کا۔

چونکہ امت کا جوہر اصلی اس کے مشترکہ تمدن میں مخفی ہے نہ کہ سیاسی اتحاد میں اس لئے ممکن ہے کہ کسی امت کو اپنی تمدنی قرابت مندی کا احساس ہو اور پھر بھی وہ اپنے سیاسی خیالات میں غیر متحد ہو۔ ممکن ہے کہ ایک حصہ اُس کا شاہی کی طرف مائل ہو اور دوسرا جمہوریت کی طرف راغب ہو اور ہر ایک اپنے پسند کردہ سیاسی منتہائے خیال کے حاصل کرنے کا مصمم ارادہ رکھتا ہو اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی امت مختلف صورتوں کے نظام سلطنت میں اپنی خصوصیت کو ظاہر کرے اور اسی مختلف النوع تعمیر سلطنت سے اُسے تشفی حاصل ہو مگر یہ تخالف کبھی امت کی سیاسی کمزوری کا باعث ہو جاتا ہے۔ یونانی جو اول مقدونیہ اور بعد کو رومہ کے شکار ہو گئے اُس کی وجہ یہی تھی کہ وہ بہت سی چھوٹی چھوٹی شہری سلطنتوں میں منقسم ہو گئے تھے ایسی ہی تفریقوں کی وجہ سے اٹالیا اور جرمانیا اپنے تئیں بیرونی قوت کی زد سے پوری طرح نہ بچا سکے اور اسی وجہ سے اُن کی سیاسی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔

دوسری جانب ایک امت کا دو یا زاید سلطنتوں کی صورت میں نمو حاصل کرنا بسا اوقات اس امت کے ذرائع و وسائل کو مالا مال کر دیتا اور ایک بلیغ قوت حیات کا ثبوت دیتا ہے جیسا کہ انگلستان اور شمالی امریکہ کی اینگلو سیکسن برادرانہ

سلطنتوں کا حال ہے جن میں سے ایک میں اعیانی بادشاہت قائم ہے اور دوسری میں عمومی جمہوریت ہے اسی طرح جرمانی شہنشاہی سے باہر ایک جرمانی سوئیٹزرلینڈ اور ایک جرمانی آسٹریا کا وجود جرمانی اُمت کی وسعتِ وسائل کا ثبوت ہے۔

ذمہ سیاسی موزونیت۔

کوئی امت جسے خود اپنا احساس ہو اور جس میں سیاسی موزونیت موجود ہو اسے ایک سلطنت میں متشکل ہو جانے کی طبعی ضرورت کا احساس ہوتا ہے اگر اس اشتیاق کے پورا کرنے کی طاقت بھی اس میں موجود ہے تو ضرور اسے اپنی ایک سلطنت قائم کرنے کا فطرتی حق حاصل ہے۔

کسی امت کی بقا و ترقی کے اعلیٰ حق کے مقابلے میں اُس کے منفرد ارکان اور اُس کے بادشاہوں اور امیروں کے حقوق محض ایک ذیلی اہمیت رکھتے ہیں۔ نوع انسان کی غایت پوری نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ امتیں جن سے وہ مرکب ہے اس قابل نہ ہوں کہ وہ اپنے فرائض کو پورا کر سکیں بقول پرنس بسمارک امتیں اگر زندہ رہنا چاہتی ہیں تو اُنھیں سانس لینے اور ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل ہونا چاہیئے۔ اُمتوں کے سیاسی شکل اختیار کرنے اور اپنی عام زندگی کی حرکت داظہار کے لیئے اپنے اعضا کو ترقی دینے کے مقدس حق کی بنا یہی ہے، خود انسانیت کے حق کو چھوڑ کر بقیہ تمام حقوق میں سب سے زیادہ مقدس اور اُن سب کی بنیاد اور رابطہ یہی حق ہے۔

(۴) قومی سلطنت۔

مگر ایک قومی سلطنت کے قائم ہونے اور برقرار رہنے کے لیئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اُس اُمت کے تمام لوگوں پر حاوی ہو۔ قومی سلطنت کی تعمیر کا امت کے صرف ایک ایسے بڑے اور قوی حصے پر محتوی ہونا کافی ہے جو اپنے اخلاق اور جذبے کو سلطنت پر موثر طور پر کلیتہً نافذ کرنے کی کافی وسعت و قوت رکھتا ہو۔ اس لیئے قومی سلطنت کے حدود کو اتنا ہی وسیع کرنے کی خواہش جتنی اُمت کی زبان وسیع ہو گویا قومی اصول کا نا اندازِ ضرورت کھینچ تان کرنا ہے۔ ایسی خواہش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سلطنت کے حدود بھی ویسے ہی متحرک ہو جائیں جیسے زبان کے حدود۔ اور یہ تزلزل خود شخصیتِ سلطنت کے استمرار اور حقوق کی عام محافظت کے منافی ہوگا۔ فرانس اپنا لیا اور شاہی جرمانیا قومی سلطنتیں ہیں گو کہ فرانسیسی بولنا لوگ

اور جرمانی امتوں کے ایسے اجزا بھی موجود ہیں جو اُن سلطنتوں سے تعلق نہیں رکھتے۔

کوئی امت جو قوم بن گئی ہو یا قوم بننے کے قریب ہو وہ اپنے ایسے منتشر اجزا کو جمع کرنے کا حق رکھتی ہے جو اس کی بقائے ہستی کے لئے ضروری ہوں لیکن اگر وہ اُن کے بغیر ہی اپنا کام چلا سکتی ہے تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ انھیں کسی دوسری سلطنت کے اتحاد سے جس سے وہ مطمئن ہوں دور علیحدہ کرے۔

(۵) اتم و اکمل سلطنت۔ اعلیٰ التعمیر سلطنت اپنے تئیں کسی ایک اکیلی "قومیت" (یعنی اُمت) تک محدود نہیں رکھتی۔ انسانیت کی ترقی اپنی شرط اولین کے طور پر یہ چاہتی ہے کہ نہ صرف اُمتوں کا آزادانہ ظہور اور اُن کے آپس میں مقابلہ ہو بلکہ وہ بار بار یہ بھی چاہتی ہے کہ اُمتیں آپس میں متفق ہو کر اعلیٰ اتحاد بھی پیدا کریں۔ قانون کا انحصار اُمتوں کی طبعی خصوصیات کے بہ نسبت انسانی طینت پر زیادہ ہے۔ مہذب قوموں کا ترقی یافتہ قانون قومی رسم و رواج سے زیادہ انسانی تعلقات کی ضروریات سے متعین ہوتا ہے سلطنت کے اصولی تنظیمات، مختلف قوموں میں ایک ہی ہیں۔ سلطنت کا بلند ترین منتہائے خیال یہ ہے کہ سلطنت کی بنا انسانیت پر ہو۔

پس ایک قومی سلطنت میں مختلف قومیتیں شامل ہو سکتی ہیں یہانتک کہ وہ سلطنت جس کی بنا صاف طور پر قومی اصول پر ہو وہ بھی بیرونی اجزا کے شمول سے (جو دوسری اُمتوں کے تمدن سے سلسلۂ ارتباط پیدا کرنے اور انھیں برقرار رکھنے کا کام دیں) وسعت و تنوع حاصل کر سکتی ہے۔ یہ مخالطت کبھی سلطنت کے لئے نہایت سود مند اور معین ترقی ہوتی ہے اُسی طرح جیسے اعلیٰ دھاتوں میں تانبے کا میل اُن کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ داد و ستد کی ضرورتوں میں یہ سکہ بن کر چل سکیں۔

(۶) یکجہتی۔ بخلاف اس کے سلطنت کی یکجہتی کے لئے یہ بہت ہی مفید ہے اگر قوم کی بنا بحصۂ غالب ایک معین قومیت پر ہو اور آبادی کے دوسرے اجزائے ترکیبی کا

پڑتا اُس کے مقابلے میں قلیل التعداد ہو جیسے کہ روس میں جرمانی، پروشیا میں سلاوی، جرمانیا میں یہودی اور شمالی امریکہ میں فرانسیسی جب کہ متعدد امتیں قوت اور اہمیت میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کر رہی ہوں اُس صورت میں یہ بہت ہی مشکل ہے کہ قوم کا اتحاد قائم و برقرار رہے۔ انگلستان کو اس مشکل پر اس طرح غالب آنا پڑا کہ پہلے سکسونی نارمنوں سے متحد ہوئے پھر انگریزوں نے اسکاچ سے اتحاد کیا اور آخر میں یہ دونوں آئرلینڈ سے متحد ہو گئے، یہ وہ مشکل ہے جس پر آسٹریا ابھی تک غالب نہیں آسکی ہے۔

(۷) امتنا
اگر کوئی سلطنت مختلف امتوں سے مرکب ہو جو سب ملکر ایک قوم بنتی ہوں تو سیاسی حقوق قومیت کے اعتبار سے تقسیم نہیں کیے جا سکتے بلکہ سیاسی جمعیت اور حقوق یکسانی بلا لحاظ قومیت کے قائم رکھنا چاہیئے۔

(۸) تاریخ کا فیصلہ
قانون بین الاقوام کی نامکمل حالت میں کسی انسانی قانون کی رو سے اس امر کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس حد تک کوئی امت ایک سلطنت کے قائم کرنے کی اہلیت و قابلیت رکھتی ہے اس کا فیصلہ صرف خدا کے حکم سے ہو سکتا ہے جو تاریخ عالم کے ذریعے سے ظاہر کیا گیا ہے، عموماً یہی ہوتا ہے کہ بڑی جد و جہد سے بہت تکالیف برداشت کرنے اور بہت سے کام انجام دینے ہی سے کوئی قوم اپنے اس دعوے کو حق بجانب ثابت کر سکتی ہے۔

سلطنت کو بہ حیثیت جسم قومی کے
اگر سلطنت بہ حیثیت قوم کے جسم ہونے کے کار منصبی کو پورا کرنا چاہتی ہے تو یہ صاف واضح ہے کہ اُس کے قوانین و تنظیمات کو قوم کی ضرورتوں اور قابلیتوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے خلاصہ یہ کہ اُسے عام پسند ہونا چاہیئے۔ ایک ایسا دستور سلطنت جو قوم کے خصائل کے لئے موزوں نہیں، جو اُس کی خصوصیات کی پروا نہیں کرتا اور جو اُس کے جذبات و خیالات سے موافقت نہیں رکھتا وہ ایک غیر طبعی اور ناکارہ جسم ہے۔ اگر کوئی غیر طاقت کسی امت پر ایسے غیر موزوں دستور کو جبراً عائد کر دیتی ہے یا جیسا ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کسی بڑے سیاسی ہیجان کے وقتوں میں کوئی غلط رو اور بیمار قوم اُسے خود اختیار کر لیتی ہے تو جوں ہی وہ باہری طاقت کمزور پڑ جاتی ہے یا قوم دوبارہ عقل سے کام لینے لگتی ہے، فوراً ہی وہ نظام سلطنت منہدم ہو جاتا ہے مگر دونوں صورتوں میں سیاسی جسم کو ایسا شدید نقصان پہنچ جاتا ہے کہ اُس میں قوم کے زوال تک کا امکان موجود ہوتا ہے

اور یہ کم از کم اس کی طاقت تو ایک مدت کے لئے ضرور ہی پژمردہ ہو جاتی ہے۔
ہر بڑی اُمت جو ایک سلطنت والی قوم بننے کی موزونیت رکھتی ہے وہ بحیثیت سلطنت کے اپنا ایک خاص سیاسی نصب العین اور اپنا ایک مخصوص فرض رکھتی ہے اور یہ اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ قوم اپنی خاص خصلت سے سلطنت کو موثر نہ کردے کسی قوم کے قومی نظام سلطنت کے طبعی حق کا مفہوم یہی ہے۔ اس لئے نظامہائے سلطنت کا اختلاف قوموں اور اُمتوں کے ان مواہب سے مطابقت رکھتا ہے جو خدا نے اُنھیں عطا کی ہیں۔

قوم کے نشو نما کے ساتھ ترقی کرنا چاہیئے

مگر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ کسی قوم کے تخصیصی صفات اُس کی سلطنت میں ایک ہی بار منعکس ہو کر ہمیشہ کے لئے اُسی نہج سے رونما رہتے ہیں۔ قوم اپنے نمو کے مختلف مراحل میں زندگی بسر کرتی ہے اور اس کی ضرورتیں اور اُس کے خیالات اُس کی عمر کے دوروں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں گو کہ خود قوم وہی رہتی ہے جو تھی، ایک قومی اور عام پسند سلطنت نمو کے ان مراحل میں بھی قوم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اپنے اعضائے عمل میں بھی اُن کے مطابق تغیر و تبدل کرتی جاتی ہے مگر اپنی شخصیت کو کلیتہً نہیں بدل دیتی۔ رومی ہی سلطنت کو دیکھو کہ اُس کی تاریخ کے مختلف دوروں میں اُس کی ظاہری صورت کس درجہ مختلف رہی ہے مگر اس پر بھی کتنے واضح طور سے اُس سلطنت میں رومی جبلّتِ قومی ہمیشہ رونما رہی۔ شاہی جمہوریہ اور شہنشاہی قوم کے مختلف مدارج حیات کے موافق صورت پذیر ہوتی رہی ہیں، اور ان سب میں روما کا نقش صاف نمایاں ہے، انگلستان میں خاندان ٹیوڈر کی شاہی، خاندان ہینوور کی شاہی سے اُسی مناسبت سے مختلف تھی جس نسبت سے سولھویں اور اٹھارھویں صدی میں انگریز قوم کی ترقی کے مدارج مختلف تھے۔ کسی قوم کے اپنے نظامِ حکومت کو زمانے کے موافق رکھنے کے طبعی حق کا مفہوم یہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ سلطنت مطابق فطرت ہے جو ہر وقت اُس میں بسنے والی قوم کی خصوصیات اور مدارج ارتقا کے مطابق رہے۔

تعلیقات

(۱) سیسرو کی کتاب "ریپبلک" (ج ۲(۲۱) میں کاٹو کہتا ہے: "دستور سلطنت نہ کسی ایک زمانے کی چیز ہے نہ کسی انسان کی"۔

(۲) فریڈرش اعظم (اپنی کتاب ماکیاویل-۲۱ میں-) کہتا ہے: "کائنات میں ہر چیز مختلف ہے: انسانوں کے طبائع مختلف ہیں اور فطرت نے وہی اختلاف سلطنتوں کے طبائع میں بھی پیدا کر دیا ہے۔ سلطنت کی طبیعت سے میری مراد ہے اُس کا محلّ وقوع - اُس کی وسعت کے حدود، اُس میں بسنے والی قوموں کی تعداد اور اُن کے جذبات کی افتاد، اُس کی تجارت، اُس کے رواج و عادات اُس کے قوانین، اُس کی قوت، اُس کی کمزوریاں، اُس کی دولت اور اس کے وسائل"۔

(۳) ڈمیسٹر (۱۷۹۶ء) اپنی کتاب "فرانس سے متعلق خیالات" (کونسی ویراسیون سیور لا فرانس (Considerations sur la France)) باب ۶ میں کہتا ہے: ایک دستور سلطنت جو تمام قوموں کے لئے بنایا گیا ہو وہ کسی قوم کے بھی کام کا نہیں۔ وہ ایک نری تجرید ہے اور تکلیف کی گھڑی ہوئی ایک چیز ہے جس کا مصرف ہوا اس کے کچھ نہیں کہ انسان کا دماغ خیالی مقدمات کے قائم کرنے کی مشق کرے اور جس کے مخاطب وہی انسانِ مطلق ہیں جو صرف تخیل کے فضا میں پائے جاتے ہیں"۔

(۴) نپولیون (۱۸۰۳ء میں) سوئٹزرلینڈ والوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے: "حکومت کی ایسی شکل جو ایک قوم کے واقعات اور ناکامیوں، جدوجہد اور ولولوں کے ایک طویل سلسلے کا نتیجہ نہ ہو وہ کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتی"۔

(۵) سیس مون دی اپنے "آزاد قوموں کے دستور کے مطالعات" (مقدمہ ص ۳۸) میں کہتا ہے: "کسی قوم کے صرف قوانین ہی نہیں بلکہ اُس کا دستور بھی اُس کے میلانات یا دوام اور طرزِ تخیل پر قائم ہوتا ہے - بلاشبہہ یہ ایک حد درجے کا سطحی اور غلط محرک عمل ہے کہ کسی قوم کے لئے ایک ایسا نیا دستور قائم کرنے کی کوشش کی جائے جو اُسی قوم کے مزاج اور اُس کی تاریخ کے مطابق نہ ہو بلکہ جس کی

بنیاد چند عام فقروں پر رکھی گئی ہو جن کو لوگوں نے غلطی سے "اصول" کا باوقعت نام دے رکھا ہے پچھلے پچاس سال میں بہت سے دستور بڑے بڑے دستوروں کے ساتھ قائم ہوئے اور بہت سے دستوروں کو ایک ملک نے دوسرے سے لے کر تقلیداً رکھا۔ لیکن اس طویل تجربے سے بھی یہی بات ثابت ہوئی کہ ان تمام دستوروں میں سے ایک نے بھی اپنے بنانے والے کی آرزوؤں یا جس قوم کے لئے وہ دستور بنایا گیا تھا اُس کی امیدوں کو پورا نہیں کیا۔"

(۶) رانکے (رسالہ = Zeitschriflt ج ا ص ۱۹) کہتا ہے: "ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ہر قوم کا اپنا ایک اصول عمل ہے۔ مگر پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو قومی آزادی تمام طبائع میں جاری و ساری ہے اُس کے معنی کیا ہیں۔ کیا اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ کوئی غیر ملکی جج (حاکم قضا) ہمارے شہروں میں نشست نہ کرے اور کوئی غیر ملکی فوج ہماری زمین پر سے نہ گذرے؟ اس سے بڑھکر کیا اُس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم دوسروں سے آزاد ہو کر اپنی خاص ذہنی طاقتوں کو ان کی انتہائی حد قابلیت تک ترقی دیں؟"

پانچواں باب

نظم معاشرت (سوسائٹی)

فرانسیسی سیاسی نظریہ خاصکر روسو کے وقت سے اس خیال کی طرف مائل رہا ہے کہ سلطنت کو سوسائٹی کے ہم معنی اور اسٹیٹ و قوم کے تصورات کو سوسائٹی کے تصور کے مرادف سمجھنا چاہیئے مختلف اصطلاحوں کی اس تلبیس کی وجہ سے سلطنت کے علم میں خلط مبحث ہوگیا ہے اور سیاسی عمل و دستور کو بھی نقصان پہنچا ہے جرمانی سیاسی نظریہ زیادہ دقیق طور پر ان مختلف تصورات میں فرق کرتا ہے اور بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہتا ہے اس سے سلطنت کو ایک زیادہ قوی بنیاد اور زیادہ مستحکم عمل حاصل ہوتا ہے اور معاشرت کی آزادی سلطنت کی تعدی سے محفوظ رہتی ہے۔

نظم معاشرت کا تعلق (۱) قوم اور سلطنت سے

"قوم" لازماً ایک مربوط مجموعہ ہے بخلاف اس کے معاشرت افراد کی ایک تعداد کا ایک اتفاقی اجتماع ہے۔ قوم سلطنت کی صورت میں مجسم ہو کر ایک ذی حیات شے کی طرح سر و اعضا رکھتی ہے، معاشرت افراد کا ایک غیر عضو بند انبوہ ہے۔ قوم ایک قانونی شخصیت رکھتی ہے، معاشرت کوئی مجموعی شخصیت نہیں رکھتی بلکہ محض ایک انبوہ ہے جو بہت سی شخصیتوں سے مرکب ہے۔ قوم اتحاد ارادی سے مزین ہے اور سلطنت کے اندر اپنے ارادے کو عمل میں لانے کی قوت رکھتی ہے سوسائٹی کا نہ کوئی مجموعی ارادہ ہے اور نہ اس کی کوئی مختص سیاسی طاقت ہے، وہ نہ قانون بنا سکتی ہے، نہ حکومت کرسکتی ہے، نہ عدالت کو عمل میں لاسکتی ہے، اس کے قبضۂ قدرت میں صرف ایک رائے عامہ ہے اور وہ سلطنت کے اعضاء پر اپنے بیشتر یا کل افراد کے خیالات، اغراض اور مطالبات کے موافق بالواسطہ اثر ڈالتی ہے قوم ایک سیاسی تخیل ہے سوسائٹی سلطنت کی قلمرو میں ذاتی حیثیت سے افراد کا

ایک تغیر پذیر مجموعہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قوم اور سوسائٹی جو ایک ہی لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے متعدد طریق سے ایک دوسرے پر گہرا اثر ڈالتی ہیں سلطنت سوسائٹی کے لیے قانون وضع کرتی، اس کی حفاظت کرتی اور مختلف طریقوں سے اس کے اغراض کو ترقی دیتی ہے۔ دوسری جانب سوسائٹی اپنے معاشی اور ذہنی وسائل سے سلطنت کو تقویت پہنچاتی ہے۔ ایک مصیبت زدہ سوسائٹی سلطنت کو بھی اپنے ساتھ مصیبت میں ڈال دیتی ہے، ایک بیمار سوسائٹی سلطنت کو بھی خطروں سے دوچار کر دیتی ہے، بخلاف اس کے ایک صحتور خوش حال اور تربیت یافتہ سوسائٹی سے سلطنت کو تقویت ہوتی ہے اور اس طرح کی سوسائٹی سلطنت کی بہبود کے لئے شرط لازمی ہے۔

مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ سوسائٹی اور سلطنت کے درمیان کامل ہم نوائی ہو۔ بعض وقت سوسائٹی اپنے ہی خاص اغراض پر نظر رکھنے کی وجہ سے یا رائے عامہ کے سیاب صفت اثرات سے متاثر ہو کر سلطنت سے ایسے مطالبات کرنے لگتی ہے جنھیں سلطنت نامنصفانہ یا غیر دانشمندانہ سمجھکر مسترد کرنے پر مجبور ہوتی ہے بعض وقت سلطنت سوسائٹی سے ایسے خدمات اور ایسے ایثار کی خواہاں ہوتی ہے جن کی انجام دہی سوسائٹی پر گراں ہوتی ہے سلطنت کی دائمی حفاظت (کی ضرورت) کبھی کبھی وقتی اغراض وخواہشات سے ٹکرا جاتی ہے۔ وقتاً فوقتاً معاشرت میں ابتری پھیل جاتی ہے جسے رفع کرنا سلطنت ہی کا کام ہے، اور اسی طرح کبھی سلطنت کے دستور یا اس کے نظم ونسق میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے رفع کرنے کی تحریک سوسائٹی کی طرف سے ہوتی ہے۔ قانون عامہ اور سیاسیات کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ مناقشات کا فیصلہ اور ان کی تلافی عادلانہ اور دانشمندانہ طور پر کردی جائے۔

(۲) امت سے

اسی طرح سوسائٹی اور امت کے تصورات بھی ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں مگر وہ بھی بالکل مرادف نہیں ہیں۔ ایک متوارث امت کے مقابلے میں سوسائٹی افراد کا ایک تغیر پذیر ازدحام معلوم ہوتی ہے، امت نے اپنی روح عامہ

کے جیاتی اظہار کے لیے ایک عام زبان پیدا کرلی ہے اور سوسائٹی اپنی حسب آسائش قومی زبان کا استعمال کرتی ہے مگر سوسائٹی کی حیثیت سے اُس کی کوئی مخصوص زبان نہیں ہوتی، ایک اُمت شاخ در شاخ ہو کر مختلف سلطنتوں میں پھیل سکتی ہے ہم اپنے تصور معاشرت کو صرف ایک ہی سلطنت کے باشندوں تک محدود رکھتے ہیں، یا مثلاً اگر ہم "یورپی سوسائٹی" کہتے ہیں تو تمام متمدن یورپی سلطنتوں کے باشندوں کو اُس میں شامل کر لیتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ مختلف اُمتوں سے تعلق رکھتے ہیں، خود سلطنت کے اندر سوسائٹی کا تصور امتی اختلافات سے آزاد ہے اور اس میں تمام وہ لوگ شامل ہیں جو سلطنت کے اندر رہتے ہیں۔ اُمت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کم از کم مادی حیثیت سے اپنی ایک خاص فطری تنظیم رکھتی ہے اور سوسائٹی صرف منفرد اشخاص کا ایک مجموعہ ہے۔

گنائسٹ کی معاشرتی حرفت

گنائسٹ نے سلطنت اور معاشرت کے فرق کو نمایاں کر کے اور اُن کے تصادم کی طرف توجہ دلا کر علم السیاست کی ایک خدمت انجام دی ہے مگر اس کے ہمنوا ہو کر موجودہ زمانے کی سوسائٹی کو کاروباری سوسائٹی کہنا بہت ہی تنگ نظری معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دولت کا حصول سوسائٹی کے سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ وسیع الاثر اغراض میں سے ہے مگر پھر بھی سوسائٹی کی صرف یہی ایک غرض نہیں ہے ورنہ یہ غرض سب سے زیادہ اہم غرض ہے۔ سوسائٹی دولت کے انتفاع سے بھی ویسا ہی تعلق رکھتی ہے جیسا اس کے حصول سے مزید براں دولت کے تمام خیالات سے قطع نظر سوسائٹی خاندانی زندگی کو بھی بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتی ہے؟ وہ مدنیت کی قدر کرتی ہے اور تہذیب و شائستگی ادبیات اور فنون لطیفہ سے پر جوش دلچسپی رکھتی ہے۔ سوسائٹی کی تعریف کرتے وقت محض حصول دولت پر زور دینا اسے زائد از ضرورت مادی اور خود غرض بنا دینا اور افکار ذہنی اور بہبود عامہ کے متعلق اُس کی ساری کوششوں کو نظر انداز کر دینا ہے اس دعوے کی صحت کی کافی تائید اُن کثیر التعداد ادارات و انتظامات سے ہوتی ہے جنھیں غریبوں اور بیماروں کی آسائش اور علوم و فنون کی

ترویج کے لئے سوسائٹی نے بغیر سلطنت کے دباؤ کے برضا و رغبت خود قائم کر لیا ہیں اور کثیر دولت اُن کے لئے وقف کر دی ہے ۔

چھٹا باب

قبائل

قبائل سے امتی اندرونی تفریقات کا اظہار ہوتا ہے۔

جس طرح انسانی نسلیں مختلف امتوں میں منقسم ہو جاتی ہیں اسی طرح امتیں قبائل میں منقسم ہو جاتی ہیں ایک دقیق النظر مبصر امتوں کی زبان، رسم و رواج و قوانین سے ان کے آپس کی قرابت کا پتہ چلا لیتا ہے مگر خود وہی امتیں جو ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں ایک دوسرے سے بیگانہ ہو گئی ہیں اور ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتیں۔

بخلاف اس کے ایک ہی امت کے مختلف قبائل اپنی مشترکہ زبان اور رسم و رواج کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب کے سب ایک عام زندگی میں مربوط ہیں اس بات میں شک نہیں کہ مشترک قومیت کے احساس کی راہ میں قوم کے اندرونی یعنی قبائلی امتیازات و خصوصیات حائل ہو جاتے ہیں اور وہی اجزا جو قوم کے وسیع دائرے میں شامل تھے ایک دوسرے سے کٹ کر جدا ہو جاتے ہیں مگر امت کی زبان جس سے سب ہی قبیلوں کے کان یکساں آشنا ہوتے ہیں، امتی یکجہتی اور قرابت کے احساس کو بیدار رکھتی ہے مقامی بولیوں میں قومی اتحاد اور قبائلی خصوصیت دونوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان بولیوں کو زبان سے وہی نسبت ہے جو خاص قبائلی قانون کو عام امتی قانون سے ہے۔ امتوں کے مانند قبائل بھی تاریخ کی پیداوار ہیں اور تاریخ ہی اندرونی تفریقات کو نشو و نما دیتی اور روشنی میں لاتی ہے بلکہ یہ قبائل امت کے صرف ٹکڑے ہیں یعنی وہ خود کوئی اپنا مستقل قومی کینڈا نہیں رکھتے بلکہ وہ صرف عام قومی جذبے کو مختلف رنگ و پے میں نمایاں کرتے ہیں اس طرح قبیلے قائم رہتے اور اپنی جداگانہ ہستی کو مستقل کر لیتے ہیں

ان کا اچھا اور برا اثر۔

اور ان تفریقات کو جو قومی خصوصیات پر اثر ڈالتی ہیں، زندہ رکھتے ہیں۔ یہ تفریقیں جہاں قومی زندگی میں برگ و بار اور رنگارنگی پیدا کر دیتی ہیں وہاں بسا اوقات اتحاد

سلطنت کے لئے ایک روک بھی ثابت ہوتی ہیں۔ اگرچہ فرقوں کے اندرونی مناقشات سے جو فی الاصل قبائلی اختلافات پر مبنی تھے روما کو قوت حاصل ہوگئی مگر یہی قبائلی عناد کی شدت تھی جس نے یونانیوں کو ایک دیرپا مجموعی سلطنت بنانے سے روک دیا ٹڈوری نظام سلطنت یونانی سے مختلف تھا اور ایٹولی نظام ان دونوں سے جُدا۔

قبائلی عناد و خصومت

جدید یورپ میں بھی قبائلی عناد بڑا اثر رکھتے تھے خاصکر جرمانیوں میں جن کا قدیم نظام حکومت قبیلوں کی تنظیم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی انفرادیت پسندی کو اس سے ویسی ہی قوی مدد ملی جیسی موجودہ زمانے کے رجحان اتحاد کو اس سے سخت رکاوٹ پیش آرہی ہے۔ اٹالیا اور جرمانیا کی تاریخوں سے یہ امر اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان دونوں ملکوں میں قدیم قبائل بہت پہلے ہی شکست ہو چکے تھے۔ اٹالیا میں زیادہ تر شہروں کی آزادانہ ترقی کی وجہ سے ایسا ہوا اور جرمانیا میں بالتخصیص بادشاہوں کی طرز روش اور ملکی امرا کی تفریق اس کا باعث ہوئی۔ بایں ہمہ قبائلی احساس اور انفرادیت شہروں میں ایک طاقت کی حیثیت سے برقرار رہی اور اگرچہ قدیم قبائلی ڈھچیوں کے ایکبار شکست ہوجانے کے بعد مختلف قبائل بڑی بڑی ملکیتیں قائم کرنے کے لئے متحد ہوگئے پھر بھی جرمانی شہنشاہی کے زوال میں قبائلی بغض و عناد کا بہت بڑا دخل تھا اور جرمانی اتحاد کے مخالفین آج بھی قبائلی تعلقات سے کام لیکر قومی ترقی کو اگر بالکل روک نہیں سکتے تو اُس میں دقتیں ضرور پیدا کردیتے ہیں۔

قبیلہ ایک جدید قوم کے تخم کی حیثیت سے

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک نئی قوم کے بننے کے لئے قبیلہ ابتدائے کار کا کام دیسکتا ہے۔ قبیلے میں ایک امت بننے کے بجائے ایک نئی قوم اور ایک نئی سلطنت بن جانے کا (خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی سلطنت ہو) زیادہ امکان ہوتا ہے۔ اُمت کا بننا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب پوری مخالفت واقع ہو اور اس کے ساتھ ہی زبان بھی بدل جائے جیساکہ اٹالیا میں لمبارڈی کے ٹیوٹنی (جرمانی) قبیلے کو پیش آیا یا یہ کہ قبیلہ اپنی مختص مقامی زبان کو ترقی دیکر ایک نئی زبان بنادے جیساکہ ولندیزیوں نے کیا۔

ساتواں باب

ذاتیں

قوم اور قبیلے کے اندر تفریقات

اُمتیں، قومیں اور قبیلے سب ہی بہ ظاہر جغرافی حدود کے ذریعے جدا جدا دکھائی دیتے ہیں، مگر ان ہی امتوں، قوموں اور قبیلوں کے اندر ہی اندر ایسی مزید تفریقیں بھی موجود ہیں جو جغرافی لحاظ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور جو ایک سیاسی اہمیت رکھتی ہیں ان تفریقوں کو نظم معاشرت کے مستقل عناصر یا مجموعی زندگی کے مختلف رجحانات یا سیاسی اہمیت و ترقی کے مختلف مدارج کہہ سکتے ہیں دوسرے لفظوں میں ذاتیں یا طبقات یا درجات کہیئے۔

ذات کے طریقے پر ہندوستان میں تو بہت ہی کامل عمل ہوا ہے مگر مصر اور ایران میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر پڑے بغیر نہیں رہا۔ اس کا تعلق مقدماً ایشیا کے آریوں سے ہے۔ یورپ میں اسے کبھی سرسبزی حاصل نہیں ہوئی البتہ امریکہ میں گوری اور کالی نسلوں کے فرق کی وجہ سے اس کے شیوع کی ایک نئی صورت نکل آئی ہے طبقات کا طریقہ بہت سی قدیم و جدید دونوں زمانوں کی قوموں میں پایا جاتا ہے۔ مگر اسے انتہائی ترقی ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کی ٹیوٹنی اقوام کے درمیان حاصل ہوئی۔ درجات کے طریقے میں اولاً ایک ایسی سلطنت کا وجود فرض کرلیا جاتا ہے جو عقلاً ہرطرح منقسم و مرتب ہو جیسی چین، ایتھنز یا روما کی سلطنتیں تھیں۔ اس زمانے کی بہت سی سلطنتیں بھی ذاتوں کی تقسیم فطرت کا فعل سمجھی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُسے خدا نے خلق کیا ہے اور وہ غیر قابل تبدیل ہے، طبقات نتیجہ ہیں تاریخ اقوام اور پیشوں کے اختلافات کا، درجات خود سلطنت کی تنظیمات میں سے ہیں۔ ذات کی بنیاد مذہبی اعتقاد پر ہوتی ہے، طبقات میں معاشرتی زندگی اور اعتقادی اور تعلیمی حالتوں کا زور ہوتا ہے، درجات میں مدبرین کی قوت تنظیمی کا اثر رونما ہوتا ہے۔

پس ذات لامحالہ موروثی اور غیر قابل تبدل ہے۔ وہ گویا ایک مضبوط عمارت ہے جس کی ایک اینٹ پر دوسری اینٹ جمی ہوئی ہے۔ طبقات نباتات کی طرح بڑھتے ہیں اور اُمتوں اور سلطنتوں کے مانند ان میں ایک جبلّی نمو ہوتا ہے۔ ان میں پیشے کا آزادانہ انتخاب موروثی حقوق میں اعتدال پیدا کر دیتا یا انھیں بالکل فنا کر دیتا ہے زیادہ قدیم زمانوں میں طبقات بھی ذاتوں ہی کے مثل اور انھیں کی طرح موروثی تھے مگر جس قدر تمدن کو ترقی ہوتی جاتی ہے پیشے کی آزادی بڑھتی جاتی ہے اور طبقات درجات کے سبب پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ درجات سلطنت کے مختلف اغراض کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اسی طرح جیسے ایک نقاش اپنی صناعی کی اغراض کے لئے اپنی تصویر کی ہیئت کو بار بار (موقلم لگا کر) بدلتا رہتا ہے۔

ہندوستانی ذاتیں۔

ہندوستان میں ذات کا جو طریقہ رائج ہے اُسے نمونۂ کمال سمجھنا چاہئے۔ منو کے قوانین کی رو سے وہ براہما کا پیدا کیا ہوا ہے۔ **افلاطون** نے اپنی تخیلی سلطنت میں جس اعتقاد کو مصنوعی ذرائع سے جمانا چاہا تھا اُس نے ہندوؤں میں پورے طور پر دائمیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

(۱) برہمن۔

سب سے اونچی ذات برہمنوں کی ہے جن میں آریہ خون اگرچہ کلیتہً دوسرے اجزا سے بالکل غیر مختلط تو نہیں رہا پھر بھی سب سے زیادہ صاف رہا۔ ہندو معتقدات کے مطابق برہمن خدا کے منہ سے نکلے ہیں اس لئے جیسا کہ ہونا چاہئے وہ خدا کا زندہ کلام اور الوہیت کے صاف ترین و وسیع ترین مظاہر ہیں، علم، مذہب اور قانون یہ ان کے خاص کام ہیں۔ پس حقیقت سے ادنیٰ ترین برہمن کا رتبہ بھی بادشاہوں سے برتر ہے۔ ان کی خلقت بہمہ وجوہ ربانی ہے اور اگرچہ دنیاوی عہدوں پر فائز ہونا اور دنیاوی معاملات میں پڑنا اُن کے لئے منع نہیں ہے لیکن مادی لذات سے محترز رہنے سے ان کی پاکی و قدر بہت بڑھ جاتی ہے جو شخص برہمن کو گھاس کی ایک پتی سے بھی مارے وہ عقوبت و دوزخ کا سزاوار ہو جاتا ہے۔

(۲) چھتری۔

دوسری ذات چھتریوں کی ہے جن میں سے بادشاہ ہوتے ہیں وہ خدا کے بازو سے پیدا ہوئے ہیں وہ زور اور جسمانی طاقت کے مظاہر ہیں وہ خلقی جنگ آوروں اور امیروں کی ذات ہے اگرچہ وہ تجارت کرنے سے ممنوع نہیں ہیں مگر ان کا خاص

کام سپہگری ہے۔

(۳) ویشیہ

تیسری ذات ویشیوں کی ہے، وہ خدا کی رانوں سے نکلے ہیں۔ اعلیٰ معاشری پیشے ان سے متعلق ہیں۔ زراعت، پرورش مواشی اور تجارت ان کا کام ہے،

(۴) شدر

چوتھی اور سب سے ادنیٰ ذات شدروں کی ہے۔ وہ خدا کے پیروں سے نکلے ہیں وہ کمین ذات اور زندگی کی مادی ضروریات کے لئے مخصوص ہیں۔ کتب مقدس کا پڑھنا ان کے لئے ممنوع ہے۔

ذاتوں کے درمیان مخالطت

مناکحت کی اعلیٰ قسم میں نسب کی برابری مقدم سمجھی جاتی ہے، مگر ایک برتر ذات کا مرد اپنے سے کمتر ذات کی عورت سے عقد کرسکتا ہے لیکن عورت اپنے سے کمتر ذات والے سے عقد نہیں کرسکتی مگر بمرور دہور بیشمار آمیزشوں نے بہت سی دشواریاں پیدا کردی ہیں اور بہت سی موروثی مخلوط ذاتیں ایسی نکل آئی ہیں جو ذات سے خارج ہیں۔ بہت شاذ و نادر ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص ایک ذات سے نکل کر دوسری ذات میں شامل ہوجائے، عام قاعدہ یہی ہے کہ ذاتوں میں قطعی علٰحدگی قائم رکھی جائے۔ ذات کا طریقہ مرنے کے بعد بھی موثر رہتا ہے، آئندہ زندگی پر اس کا ایسا ہی تسلط ہوتا ہے جیسا موجودہ زندگی پر۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے اور وہ بھی ہزاروں برس کی کوششوں کے بعد کہ کوئی چھتری برہمن کی مذہبی رفعت حاصل کرسکے برخلاف اس کے اگر ایک قدم بھی غلط پڑجائے تو فوراً وہ قعر پستی میں گرجاتا ہے، جس سے نکلنے کی بہت ہی کم امید رہتی ہے۔

ذاتوں کی اصل

ہم جانتے ہیں کہ ہندو اپنے اعتقاد میں غلطی پر ہیں اور ذاتیں ایک بڑی حد تک انسانی ہی تاریخ کا کارنامہ ہیں، ویدوں میں اس زمانے کی یاد برقرار ہے جب امتیازی درجات موجود تھے مگر ہنوز ذاتیں وجود میں نہیں آئی تھیں۔

نسلی تفریقات

تین اعلیٰ ذاتیں جو مجموعۃً آریہ کہلاتی ہیں ان کے اور شدروں کے درمیان اختلاف کا پتہ اصلاً تفریق نسل میں چلتا ہے، گورے رنگ والے آریوں نے سیاہ فام شدروں کے ملک کو فتح کرلیا تھا، اور آقاؤں کی حیثیت سے ملک میں آباد ہوگئے تھے یہ بالکل ایسا ہی ہوا جیسے سفید رنگ یورپین امریکہ کے اصلی باشندوں میں آباد ہوگئے ہیں، ذات کے لئے قدیمی لفظ برن، جس کے معنی رنگ کے ہیں اسی گورے اور کالے

رنگوں کے اصلی اختلاف کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ذات کے سلسلے میں جس قدر اوپر جاتے ہیں اسی قدر گوری نسل کو زیادہ خالص پاتے ہیں اور جتنا ہی نیچے اُترتے ہیں اُتنا ہی قدیمی سیاہ نسل کے ساتھ اس کی آمیزش میں زیادتی نظر آتی ہے[۱] دونوں بلند ترین ذاتیں تیسری سے ویسی ہی فائق و برتر ہیں جیسے اکثر آریا قوموں میں ہم عوام سے بلند تر ایک طبقۂ خواص کا دیکھتے ہیں۔

مذہب۔ آخر میں یہ کہنا ہے کہ اہل سیف و امرا بلکہ خود بادشاہوں تک پر برہمنوں کی فوقیت ماننے کے لحاظ سے آخری عمل تھا اور میرے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ برہما کے نئے ہمہ اوست مذہب نے عروج حاصل کرکے قدیم معبودانِ فطرت کی تعدد پرستی کو مغلوب کر دیا تھا۔ برہمن پوجاریوں، رشیوں اور منیوں میں مذہبی احساس بڑھ گیا تھا اور وہ ہر طرح کے خطرات برداشت کرکے اپنے مذہبی کام پر جوش و انہماک کے ساتھ ثابت قدم رہنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے بخوشی خاطر دنیاوی حکومت بادشاہوں کے لیے چھوڑ دی تھی۔

پس اس طرح ذاتوں کا طریقہ باہستگی تاریخی واقعات اور جد و جہد سے پیدا ہوا مگر بعد کو اسے مذہبی تصدیق بھی حاصل ہوگئی اور وہ ہمیشہ کے لئے جم گیا نوعمروں کی تمام تعلیم میں معینہ مذہبی فرائض کو بھی خانگی اور عام زندگی کے تمام انتظامات میں ایسی تنگ دکاوش کے ساتھ نشو و نما دی گئی کہ اس سے کسی قسم کے انحراف کا خیالی امکان تک باقی نہیں رہا اور یہ طریقہ بلا کسی تغیر کے نسلاً بعد نسل چلتا رہا۔

ایک مصنوعی طریقہ کا سلطنت پر غالب آجانا۔ یہ ذاتوں کی ترتیب کوئی سلطنت کی تنظیم نہیں ہے نہ وہ نظام سلطنت کا جزو ہے بلکہ یہ ایک سانچہ ہے جس میں خود سلطنت ڈھالی جاتی ہے۔ یہ دنیا کا ایک ہمہ گیر و مستقل انتظام ہے جو تمام تعلقات پر غالب ہے، اس وجہ سے سلطنت کی اعلیٰ ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ سلطنت اس ذات کے طریقے کی تابع رہنے پر مجبور ہے۔ وہ خود اپنے

---

[۱] ہندوستانی ذاتوں کی تاریخ و قومیت کے متعلق دیکھو لاسن کی کتاب "ہند کی قدیمیات" (Lassen's Indische Alterthums Kunde, مقالہ ۲ صفحہ ۱۱۔

گوبنو کی کتاب "انسانی نسلوں کی نامساوات" "Del' inegalile de race humaines" حصہ ۲ صفحہ ۱۳۵

اصول زندگی کے موافق آزادانہ نشو و نما نہیں حاصل کرسکتی، یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی سیاسی نصب العین ان سخت ناقابل تغیر عامۃ الناس کے مقابلے میں عملی صورت اختیار کرسکے جو سلطنت کے قانون سے بھی ایک بالاتر قانون کے ذریعے سے ایک دوسرے سے جدا کرکے حالت غلامی میں رکھے گئے ہوں۔ جس صورت میں رعایا یہ اعتقاد رکھتی ہو کہ حکومت کی اطاعت ہزارہا برس کی مصیبت و تکلیف کا باعث ہے اس حالت میں سلطنت کے اقتدار کے کیا معنی ہوسکتے ہیں اور وہ اپنے تہذیبی اختیار کو کیونکر عمل میں لاسکتی ہے۔

انتظام و استقلال کے فوائد حاصل ہوتے ہیں

اس میں شک نہیں کہ موروثی اصول سلطنت کے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے یہ گزشتہ و آئندہ کے درمیان تعلق قائم رکھتا ہے یا یوں کہیے کہ سلطنت کی ہیئت جسمانی کو (جو افراد کی زندگی سے زیادہ دیرپا ہے) مداومت عطا کردیتا ہے مگر جہاں کہیں وہ کلیتۃً و قاطبتہً قانون عامہ پر حاوی ہو جاتا ہے وہاں وہ بہترین قوتوں کو پابہ زنجیر داخل کردیتا ہے، سلطنت ایک حنوط کردہ لاش ہوجاتی ہے جس میں حنوط کرنے والا اپنی چابکدستی سے موت کے اثرات کے چھپانے کی بیکار کوشش کرتا ہے۔

ذات کا طریقہ طبقات سوسائٹی کی تفریقات کو سخت و دوامی کردینے کی طرف مائل ہوتا ہے اور بیرکی امیازی ذاتیں جنھیں وافر موروثی اختیارات حاصل ہوتے ہیں، اس طریقے سے مطمئن معلوم ہوسکتی ہیں مگر اس سے طبقۂ اوسط و طبقۂ ادنیٰ پر اس کا دباؤ زیادہ پڑتا ہے وہ ان کی پیشانی پر نشان حقارت کا ایک اور داغ لگا دیتا ہے اور کسی شخص کے لیے ان مقصود بندشوں سے نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رکھتا۔ یہ اصول اعلیٰ طبقات کے اقتدار کو بڑھاتا اور ادنیٰ طبقات کی آزادی کو برباد کرتا ہے۔

مگر ترقی و آزادی مفقود ہوتی ہے

یہ صحیح ہے کہ منفرد پیشوں میں مقابلۃً زیادہ تکمیل کا حاصل ہوجانا اور اعلیٰ ترین حلقوں میں قابل داد جودت ذہنی کا پیدا ہوجانا اس کا لازمہ ہے مگر نسل کے خاندانی توارث و روایت کو اعلیٰ ترین قانون بنادینے سے وہ اس انفرادی آزادی سے کلیتہً انکار کرتا ہے جو ان حدود سے باہر نکلنا چاہتی ہے اس نے مقدس رشی، بڑے بڑے فلسفی، ممتاز شاعر، دلیر سورما، پرفضیلت باپ، بیٹے چابکدست صناع پیدا کیے ہیں مگر اس نے کبھی کوئی بڑا مدبر نہیں پیدا کیا اور کہیں بھی آزادی اقوام کو روا نہیں رکھا۔

اس کے تمام تنظیمات معاشرت کو بحال خود برقرار رکھنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کوئی تنظیم زندگی میں آگے قدم بڑھانے کی فکر نہیں کرتی اس کا مطمح نظر سکون ہے، تحرک خطرناک سمجھا جاتا ہے، زندگی ایک غیر متغیر تکرار ہے ایک چرخی ہے جو ہمیشہ ایک ہی سمت میں ایک ہی محور پر چکر کھاتی رہتی ہے، جہاں زندگی ایسی کم قدر ہو وہاں بودھ کے مسئلہ نرواں کو دائمًا ایک حال پر قائم رہنے کے مقابلے میں ایک حقیقی آسائش سمجھا جانا اور اسے کثیر التعداد پیروؤں کا مل جانا بالکل قرین قیاس ہے، ہندوستانی تمدن ذات کا شگوفہ و ثمر ہے لیکن باوجود اس کے کہ بنیادیں بہت گہری تھیں پھر بھی وہ ہمیشہ کے لئے ہندوستانی تمدن کو اندرونی زوال سے نہ بچا سکا، اور نہ مخالف فتوحات کے مقابلے میں ہندوستان کی آزادی کی حفاظت کرسکا۔

جدید ہندوستان

جدید ہندوستان ذات پات کی باقیات کو زمانۂ گزشتہ کا ایک وراثتی بار سمجھتا ہے، وہ اب اپنے نظم دنیا کے تصور کو اس بنیاد پر نہیں قائم کرتا بلکہ انگریزی جذبات سے متاثر ہو کر وہ اب دوسری ہی بنیادوں پر اپنی عمارت کھڑی کر رہا ہے۔

آٹھواں باب

طبقات، گروہ ذی امتیاز

یورپ میں طبقات کا رواج شروع

یورپ کی تمام قوموں میں ہم ذاتوں کے بجائے طبقات (گروہ ذی امتیاز) کا رواج دیکھتے ہیں۔ ذاتوں کی طرح طبقوں سے بھی قوم کے مختلف اجزا میں ایک عضوی نظم و ترتیب پیدا ہو جاتی ہے مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ طبقات تاریخ کے محرک سے متاثر ہوتے رہے ہیں اور ان میں قوت نمو ہے۔ یہ خصوصیت سے یورپ میں ذاتوں نے طبقات کی شکل اختیار کر لی ہے اور متعدد مختلف تغیرات کے اندر سے گزر چکی ہیں۔

طبقات کی قدیم ترین شکل ذاتوں سے بہت مشابہ ہے۔ ابتدا میں وہ موروثی تھے اور جو صفات اُن سے منسوب تھے اُن سے (یورپ کے) طبقات کی اندرونی قرابت ذاتوں کے ہندوستانی طریقہ کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ خود وہ افسانے بھی (ہندی افسانوں سے) بالکل مشابہ ہیں، جن کی بنا پر یہ مانا جاتا تھا کہ طبقات کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔ (اسکینڈینویا کے قدیم مجموعۂ نظم و نثر کی کتاب) ایڈا میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح رِگر (Rigr) دیوتا نے اپنے گشت میں پہلے تھریل (Thral) کو پیدا کیا جو کمین آبادی کا جدِ اعلیٰ تھا، پھر ایک اس سے بہتر گھر میں آزاد کارل (Karl) کو پیدا کیا جو آزاد کسانوں کا مورثِ اعلیٰ تھا اور آخر میں شریف یارل (Jarl) کو پیدا کیا جسے اس نے تیر اندازی اور نیزہ بازی سکھلائی اور حرفوں کا مقدس راز اس کے تفویض کیا۔ یہ طبقات بھی اپنے جسم کی ساخت اور رنگ میں مختلف تھے، شرفا (Noble) نہایت ہی چمکتے ہوئے گورے رنگ کے ہوتے تھے، اُن کے بال ہلکے شفاف رنگ کے اور رخسارے درخشاں، غلاموں (ادنیٰ طبقے والوں) کے چہرے بدنما اور اُن کے اعضا بے ڈول ہوتے تھے۔

(۱) پجاری

گال کے ڈروئیڈ (پیشوایان مذہب) برہمنوں کے مماثل سمجھے جا سکتے ہیں یہاں بھی مذہبی پیشوائی، علم اور قانون انھیں کے تفویض[۱] تھے اگرچہ یہ ڈروئیڈ اور ان سے بھی زیادہ مسیحیت سے قبل کے جرمانیوں کے مذہبی پیشوا (جن کا نام "گوڈی" اسی طرح گوٹ (خدا) سے مشتق ہے جیسے برہمن برہما سے نکلا ہے) قومی شرفا کے طبقے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ ازمنہ وسطیٰ میں قسیسوں کی حیثیت مسیحی پجاریوں کے ایک خاص طبقے کے طور پر برہمنوں کی ذات سے قریبی مشابہت رکھتی ہے۔

(۲) طبقہ اعیان

یورپ کی نہایت ہی ابتدائی تاریخ میں جس قدیم طبقہ اعیان کو ہم ہر جگہ پاتے ہیں وہ ایک موروثی طبقہ اور بالعموم دونوں اعلیٰ ترین ذاتوں کے فرائض کا حامل تھا۔ محاورات زبان بالعموم اس موروثی خصوصیت کے شاہد ہیں اتھنز کے ایوپٹریڈ (Eupatpidai) اور روما کے پیٹریسی (Patricu) اسی وجہ سے ان ناموں سے موسوم ہیں کہ وہ شریف باپوں کی اولاد ہیں اور جرمانی ادالینگون (Adalinge) کا نام ایک خاندان (آدال Adal) سے نکلا ہے جس کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے[۲]۔

اٹیر وریا کے لیوکوموئی (Lucumones) اور گال کے نائٹ (Knight) موروثی طبقہ اعیان میں سے تھے۔ افسانوں میں یہ پسند کیا جاتا ہے کہ بڑے بڑے خاندان اور بالتخصیص حکمران خاندانوں کا سلسلہ براہ راست خداؤں یا اوتاروں سے ملحق کر دیا جائے اور خداؤں کی اولاد کی طرح ان کی تعظیم و توقیر کی جائے۔

پس مذہبی پیشوائی اور خدائی امور کا علم، نیز قانون کا علم و عمل لازمی طور پر اسی

---

[۱] قیصر کی کتاب "ویگالی جنگ" مقالہ ۶، فصل ۱۳ مذہبی فرائض اُن کے سپرد ہیں یعنی عام قربانیاں اور منفرد اشخاص کی طرف سے قربانیاں کرنا اور مذہبی احکام کی شرح بیان کرنا نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد ان کی طرف حصول علم کی غرض سے رجوع رہتی ہے جو ان کا احترام کرتی ہے عموماً تمام نجی اور عمومی قضیوں کا فیصلہ وہی کیا کرتے ہیں۔

[۲] اسٹمٹ ہنیز نے اپنی کتاب "قانون ملکی" (Statsrecht) کے صفحہ ۱۰۳ و ۱۰۴ میں اس کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔

قدیم طبقہ اعیان سے متعلق تھا۔ وہ تمام لوگوں سے پہلے بلند ترین سرکاری عہدوں پر مقرر کئے جاتے تھے اور فوجی نظام میں انھیں بلند درجہ دیا جاتا تھا۔ دوسری طرف تمدنی پیشے زیادہ تر ان کے لئے بند کر دیئے گئے تھے عموماً کچھ متوسلین ان کی حفاظت میں ہوتے اور ان کی خدمت کرتے تھے اور شخصی قانون کے دائرے میں بھی مالک اراضی ہونیکے اعتبار سے ان امرا کو خاص امتیاز حاصل ہوتا تھا وہ قلعوں یا گڑھیوں) میں رہنے کے شائق ہوتے اور شہروں میں بھی بلند مقامات کو اختیار کرتے تھے۔

تمام یورپین اقوام کی تاریخ میں یہ تخصیصی علامتیں خفیف تغیرات کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ ہم اس نیم سیاسی و نیم مذہبی تنظیم کا جس قدر آگے کو پتہ چلاتے جاتے ہیں اسی قدر ان میں زیادہ مماثلت پاتے ہیں۔

۳۔ آزاد اشخاص۔

یونانیوں رومیوں اور جرمانیوں میں آزاد اشخاص عوام اور قوم کی طاقت کے سنگ بنیاد تھے قومی حقوق سے وہ پورا پورا انتفاع حاصل کرتے تھے اور وہی سلطنت کے ستون ہوتے تھے بیشک طبقۂ امرا ان سے بلند تر ہوتا تھا مگر ہندوستان کی اونچی ذات کی طرح پنچ ذاتوں سے ایک بالکل ہی جدا گانہ مخلوق نہیں تھے بلکہ انھیں میں سے ایک مرتفع اور ممتاز گروہ ہوتا تھا اور بہر نوع اُن سے منحدر رہتا تھا اور اس کی بنا اصلی بھی انھیں قومی حقوق پر مبنی ہوتی تھی جو آزاد اشخاص کے ہوتے تھے۔

آزاد اشخاص قدیم ترین زمانے میں بالعموم زمین کے مالک اور اس کے جوتنے بونے والے ہوتے تھے اتھنز کے ابتدائی نظام سلطنت میں گیوموری یہی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی حال اسپارٹا کے عامۃ الناس روم کے پلیبین (اجلاف) اور تمام جرمانی قبائل کے آزاد اشخاص کا تھا نسل اور ملک کے متعلق اُن کے آزادانہ حقوق کا احترام قانوناً خاص طور پر کیا جاتا تھا۔ وہ تجارت میں بھی حصہ لیتے تھے گو کہ ابتداءً وہ اُسے کم پسند کرتے تھے۔ اس لحاظ سے اُن کے طرز زندگی کو ہم گویا ویشوں کی زندگی کے مماثل قرار دے سکتے ہیں مگر وقعت عامہ میں وہ ویشوں سے فائق تھے کیونکہ وہ ہتھیار اٹھا سکتے تھے اور بیادہ فوج زیادہ تر انھیں سے مرتب ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ملت کے اندر وہ سیاسی حقوق بھی عمل میں لاتے تھے جن کی نوعیت نظام سلطنت کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھی۔

وہ اگرچہ حکومت کے محکوم ہوتے تھے مگر ایک آزاد شخص کی حیثیت سے وہ کسی خاص آقا کے تابع نہیں ہوتے تھے۔ ابتدا میں غالباً انھیں حق حمایت نہیں حاصل تھا اگر وہ اپنے خاص آدمی رکھ سکتے تھے ان کا طبقہ اصلاً ایک موروثی طبقہ تھا۔ عموماً یہ مانا جاتا تھا کہ ہر آزاد شخص آزادی پیدا ہوتا ہے۔

(۴) متوسلین وخدام

آخر میں ہمیں ایک ایسے طبقے کے بہت سے نشانات ملتے ہیں جو اسی ابتدائی زمانے میں (جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں) شکست ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس لئے اُس کی خصوصیات ہمارے لئے ایک معما سا رہ گئی ہیں۔ یہ طبقہ متوسلین وخدام کا ہے جو ہندوستان کے شدروں کے مانند زندگی کی ادنیٰ ضروریات میں مشغول رہتا تھا کہیں تو وہ مفتوح باشندوں پر مشتمل ہوتا تھا جو ہمیشہ فاتحین ہی کی نسل کے ہوتے تھے اور کہیں یہ طبقہ ان غریبوں پر مشتمل ہوتا تھا جن کے گلوں میں ظلم و قرض کی وجہ سے مستقل غلامی کا طوق پڑ گیا تھا یونان کے ہیلاٹ اور تھیت رد ما۔ گال اور برطانیہ کے کلی انٹ اور جرمانیا کے لیٹ سب اس میں داخل ہیں۔

ان کا کوئی نہ کوئی آقا ہوتا ہے جو ان کی حمایت و حفاظت کرتا تھا۔ جسے "حامی" کہتے تھے۔ یونانی اسے پروس تاتیس (Prostates) کہتے تھے اور رومی پاترونس (Patronus) اس طبقے کے افراد قوم کا جزو ہوتے ہیں غلاموں کے درجے میں نہیں ہوتے تھے مگر اُن کی آزادی اُن کے حقوق اور اُن کی وقعت آزاد اشخاص سے کم ہوتی تھی۔ اُن کا کام بالخصوص دستکاری تھی اور آزاد شدہ غلام بالعموم اسی درجے میں داخل ہوجاتے تھے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے قانون وسیاسیات کی بنا طبقات ہیں

ان طبقات کی تاریخ ہر جداگانہ سلطنت کی تاریخ میں بہت ہی گہرے تعلق کے ساتھ مدغم ہے نظام ہائے سلطنت کے تبدلات وانقلابات اکثر انھیں طبقات کے تعلقات و خیالات کے باطنی وغیر مرئی تغیرات کے ظاہری نتائج ومظاہر ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے قانون کا تمام مجسمہ طبقات کے تخیل کے رنگ میں رنگا ہوا اور انہیں کی خصوصیات کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے جس طرح ہر طبقے کا خاص لباس ہوتا تھا اُسی طرح ہر طبقے کے اپنے خاص قوانین اور معدلت گستری کے طریقے بھی ہوتے تھے۔ پادری مذہبی شریعت کے تابع تھے اُمرا ان قانون اعیان کے زیر اثر تھے، نائٹ جاگیردارانہ قانون کے پابند تھے، خدام اپنے خاص قانون

کے ماتحت تھے، شہری اپنے شہر کے قانون کے اور کسان اپنے علاقے کے رواج و قانون کے زیر فرمان تھے مگر ازمنۂ وسطیٰ میں ان امتیازی طبقات کی موروثی حیثیت گھٹتی گئی اور اس میں پیشے کی حیثیت بڑھتی گئی۔ زمانۂ ما بعد کی صدیوں میں چار خاص طبقات پائے جاتے ہیں۔

طبقات اولاً موروثی تھے بعد پیشے کی نسبت سے ہو گئے۔

(۱) طبقۂ مذہبی (۲) طبقۂ اعیان (۳) طبقۂ شہری یا طبقۂ سوم (۴) طبقۂ مزارعین۔ دو اول الذکر یعنی اعیانی طبقات نے حاکمانہ سیاسی حیثیت حاصل کر لی تھی تیسرے طبقے نے ملکی آزادی کو بچایا چوتھا طبقہ بالکل بے بس اور محکوم تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے اختتام پر یہ چاروں طبقے زوال پذیر ہو گئے اور بہت کچھ مٹ گئے مگر موجودہ زمانے میں اُن کے دو ایک نشانات اس طرح باقی رہ گئے ہیں جیسے کسی تباہ شدہ عمارت کے کچھ آثار رہ جاتے ہیں۔ جدید سلطنت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ہمیں ازمنۂ وسطیٰ کے ان طبقات کے معنی جاننے چاہئیں۔ انھیں سے مقابلہ کرنے سے موجودہ سلطنت کی حالت سمجھ میں آتی ہے۔

اور بالآخر زوال پذیر ہو گئے۔

نواں باب

(الف) قسّیس (طبقۂ مذہبی)

طبقۂ مذہبی نظری ظلم نہیں ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے طبقات میں مذہبی گروہ کو سب سے مقدم جگہ حاصل تھی۔ کلیسا کے صحیح اعتقاد کے موافق وہ قوم کا کوئی طبقہ نہیں تھا، وہ ایک مذہبی طبقہ تھا نہ کہ ملکی سلطنت محض اہل دنیا کی ایک تنظیم سمجھی جاتی تھی اور مذہبی گروہ اپنے تقدس کی وجہ سے ان سے بالاتر تھا۔ مسیحی قسّیس اپنے حقوق کو برہمنوں کی طرح اپنے مخصوص خدائی رشتے پر قائم نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کا سلسلہ ازدواج کے ذریعے سے نہیں چلتا تھا بلکہ وہ اپنے حقوق کی بنا زیادہ تر ایک ربانی تنظیم پر قائم کرتے تھے وہ روح القدس کے اثر سے بھرے ہوئے تھے اور کلیسا کے عہود نے انھیں مقدس بنا دیا تھا۔ پادریوں میں کا کمترین بلکہ بدترین شخص بھی دنیاوی لوگوں کے نہایت ہی بلند مرتبہ اور پاکباز شخص سے ایسا ہی فائق تھا جیسا سونا لوہے سے یا روح جسم سے۔

وہ سلطنت سے خارج اور سلطنت سے بالاتر تھا

پادریوں کا مطمح نظر تقریباً وہی تھا جو برہمنوں کا تھا فرق صرف یہ تھا کہ مسیحی پادریوں نے برہمنوں کے مانند دنیاوی حکومت کو ترک نہیں کر دیا تھا اور سلطنت کے قواعد کی پابندی کی جانب ان کا میلان برہمنوں سے کم تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے کلیسا کے منطقی اصول کے موافق سلطنت کے قوانین کی پابندی پادریوں پر عاید نہیں ہوتی تھی ان کا کام یہ تھا کہ وہ خود ان قوانین کے امتحان و اختبار کے بعد یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ برضائے خود ان کا اتباع کریں گے یا نہیں اور کریں گے تو کس حد تک۔ طبقۂ مذہبی کے حقوق یا کلیسا کے اغراض کو ذرا بھی خطرہ ہوتا تو پادری معاً ہر طرح کی اطاعت سے انکار کر دیتے اور کتاب مقدس کے ان الفاظ کو سپر بنا لیتے کہ "ہمیں انسان کے بجائے خدا کی اطاعت کرنا چاہیے" اور اپنی روحانی فوقیت پر زور دینے لگتے۔ دوسری جانب وہ دنیاوی حکومت سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ بلا چون وچرا کلیسا کے قوانین کا اتباع کرے اور ان کی تعمیل میں

اپنی قوت سے مدد دے۔ انھوں نے دیوانی بلکہ فوجداری مقدمات تک میں خود کو دنیاوی عدالت کے اقتدار سے علیحدہ کر لیا تھا۔ ان کے بڑھے ہوئے دعاوی دنیاوی منصفوں کی فوقیت کے روادار نہ تھے کیونکہ "بھیڑوں کا گلہ بانوں پر حکومت کرنا" کیسے ممکن تھا۔ وہ جنگ میں خدمت کرنے کے پابند نہیں تھے کیونکہ ان کا مذہبی شغل آلات آہنی سے مناسبت نہیں رکھتا تھا؛ لیکن یہیں تک نہیں تھا، وہ محصولات کے ادا کرنے کی ذمہ داری سے بھی گریز کرتے اور ہر موقع پر اپنی "برات خدمات" کو پیش کرتے تھے تاکہ ہر طرح کا بار جو سلطنت کی طرف سے عائد کیا جائے اسے دفع کر دیں۔ روما کے پادری ہونے کے لحاظ سے وہ قومیت کے حدود سے متنفر تھے۔ وہ کسی ایک قوم یا کسی خاص ملک کے متوطن نہیں تھے۔ وہ تمام ممالک عیسوی کے ایک عام تعلق کے قائل تھے جن کا مرکز دنیا کا صدر مقام اور پوپ کا مستقر روما تھا۔ مذہبی قانون ان کی زندگی کا قانون تھا اور سوا کلیسا کی نرم عدالت کے اور کسی کو جوابدہ ہونے سے وہ منکر تھے۔

مگر باوجود اس کے اپنی انتہائی طاقت کے زمانے میں بھی پادریوں نے خود کو سلطنت سے کبھی کلیتہً جدا نہیں کیا اس لئے کہ کچھ تو انکے تاریخی حالات اور کچھ ذاتی اغراض کا خیال علیحدگی کا مانع تھا۔

عیسوی کلیسا اور اس کے پادریوں کے گروہ کا آغاز اور اُن کا عروج قدیم رومی شہنشاہی کے دور میں ہوا جو دنیا پر مسلط اور وسیع اقتدار کی مالک تھی۔ روما کی سیاسی طاقتوں نے اپنے اقتدار کو ترک نہیں کیا تھا، وہ مقدس رومی شہنشاہی کے تمام باشندوں سے قوانین، شہنشاہی حکومت اور شہنشاہی عدالت کی اطاعت کی خواستگار تھی، طبقۂ مذہبی اپنے لئے منفرد امتیازات شہنشاہوں سے حاصل کر سکتا تھا مگر اُس کی محکومیت میں کوئی کلام نہیں تھا۔

ان کی سیاسی طاقت کی ترقی۔

فرانکی شاہی بھی بدستور اسی پر جمی رہی کہ اساقفہ اور قسیس بادشاہ کے اور شہنشاہی قوانین و عدالت کے تابع رہیں گو کہ سلطنت کی طاقت گھٹ گئی تھی اور کلیسا نے زیادہ آزادی حاصل کر لی تھی۔ جرمانی شہزادوں کے تحت میں کلیسا کی برائت آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ اول اول کسی قسم کے مذہبی قانون کے تسلیم کئے جانے کے بجائے زیادہ تر بادشاہ کے لطف و عنایت سے ان حقوق میں ازدیاد ہوا اور اب قانون کلیسا نے

متکبرانہ طور پر خود اپنے اقتدار کا دعویٰ شروع کر دیا تاہم جب کلیسا کے حقوق نے مخالفت ومقاومت کے باوجود بتدریج فتح حاصل کر لی اس وقت بھی ان کا اقتدار ہر جگہ یکساں نہیں تھا۔

اطالیہ

ذاتی اغراض نے بھی طبقہ مذہبی کو عوام اور سلطنت سے بہت ہی زیادہ مربوط کر دیا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں کلیسا کے سرگروہ یعنی پاپائے روما نے اس حصۂ ملک پر سیاسی اقتدار شاہی بھی حاصل کر لیا تھا جو ورثہ پیٹر (Petrimonium Petri) کہلاتا تھا، کچھ تو شاہی عطیے سے اور کچھ حکمرانوں کے نذرانوں سے کلیسا کی ایک سلطنت پیدا ہو گئی تھی جس پر قسیس حکمراں تھے۔ روما اور رومی مملکت میں اعلیٰ ترین روحانی اقتدار، دنیاوی اقتدار شاہی کے ساتھ مل گیا، پاپاؤں کا اب یہی کام نہیں رہا تھا کہ وہ بحیثیت اسقف اعلیٰ ہونے کے بوقت ضرورت شہنشاہ اور مختلف سلطنتوں کے سامنے کلیسا کے اغراض کی نیابت کریں بلکہ اطالیہ نے والیان ملک میں سب سے بڑے والی ملک ہونے کے لحاظ سے انھیں اطالوی اغراض سیاسیہ سے بھی بہت گہرا تعلق پیدا ہو گیا تھا یہی امر فی الاصل اطالیہ کی تباہی کا باعث ہوا (ماکیاویلی مباحث جلد ۱ - ۱۲) اطالیہ میں تفریقات کے قائم رکھنے کی تو ان میں کافی طاقت تھی مگر اطالیہ کو خود اپنی شاہی کے تحت میں متحد کر لینے کی طاقت ان میں نہیں تھی نہ وہ معاند قوموں کی یورش سے ملک کو محفوظ رکھنے کے قابل تھے۔ یہ البتہ تھا کہ اپنی ضرورت کے لئے وہ غیر ملکی طاقتوں کے بلا لینے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے۔

انھوں نے روما کو دوبارہ ممالک عیسوی کا اول شہر بنا دیا اور گرجاؤں اور صنعتی کاموں سے اسے مزین کر دیا مگر ان کی کلیسائی حکومت وانضباط کے تحت میں ذہین رومی تمدنی اوصاف و کمالات میں اطالوی جمہوریتوں کے باشندوں سے پیچھے رہ گئے اور کلیسائی حکومت بجائے اس کے کہ اعلیٰ سیاسی ترقی کا نمونہ ہوتی اس کے لئے ایک عبرت بھی ہو گئی۔ جدید دنیا نے یہ معلوم کر لیا کہ مذہبی حکمرانی سلطنت کی صحیح حکومت کے لئے موزوں نہیں ہے اور کلیسا کی سلطنتوں کا دنیاوی رنگ میں آجانا رومیوں کے لئے ایک بڑا سیاسی فائدہ ثابت ہوا ہے۔

جرمانیا

مذہبی حکمرانوں کی سیاسی طاقت کو بڑھانے میں اطالیا کے بعد جرمانیا نے

سب سے زیادہ فیاضی دکھائی - فرانکی شاہی کے زمانے میں بھی قومی مجالس میں اساقفہ کو ایک بلند درجہ حاصل تھا۔ وہ کبھی تو دنیاوی امرائے عظام خاصکر اضلاع کے کاؤنٹوں کے ساتھ مجلس اکابر میں شامل کر دیئے جاتے تھے کبھی ان کی جداگانہ مذہبی مجالس قائم کر دی جاتی تھیں مگر دنیاوی طاقت و عظمت کے ساتھ ان کا توسل جرمانی شہنشاہی کے نظام سلطنت میں سب سے زیادہ واضح طور پر نمایاں ہوا۔ اس نظام میں ہم دیکھتے ہیں کہ سات انتخاب کنندہ والیان ملک (Electors) میں سے تین مذہبی حکمران یعنی مائنس کولن اور ٹریویر کے اساقفہ اعظم ہیں اور ان میں سے بھی مائنس کا اسقف اعظم جرمانیا کے چانسلر اعظم کی حیثیت سے سب سے اول رائے دیتا ہے، حلقۂ انتخاب میں انھیں اول درجہ حاصل تھا اور اس کے ساتھ ہی ملکی حکمران ہونے کے لحاظ سے انھوں نے بہت جلد قریب قریب شاہانہ آزادی بھی حاصل کر لی تھی۔

۱۱ شہنشاہی نظام حکومت

ان کے علاوہ اساقفہ اعظم تمام اساقفہ اور روسائے خانقاہ کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جنھوں نے خاص خاص اضلاع پر اقتدار شاہی کے حقوق حاصل کر لئے تھے اور وہ شہنشاہی مجالس شوریٰ میں شریک ہوتے اور رائے دیتے تھے - یہ یاتو شہنشاہی کے معمولی حکمرانوں کی حیثیت سے فرداً فرداً دی جاتی تھیں چنانچہ بریمن ماگدے برگ زالس برگ کے اساقفہ اعظم اور ڈیوریٹس برگ، آؤگس برگ اور بازیل کے اساقفہ فرداً فرداً رائے دیتے تھے یا وہ مجموعی رائے میں حصہ لیتے تھے اور یکجائی مذہبی مجلس منعقد کرتے تھے جو کاؤنٹوں (یا قوامسہ) کی مجلسوں کے ہمپایہ سمجھی جاتی تھیں کتب قانون کی اعلاحی ترتیب میں مذہبی حکمرانوں کا درجہ بادشاہ کے بعد ہوتا تھا دنیاوی والیان ملک اگرچہ نظام شہنشاہی میں ان کے ہمسر تھے مگر تیسرے درجے پر رکھے جاتے تھے کیونکہ یہ ممکن تھا کہ وہ مذہبی حکمرانوں کے تابع ہو جائیں مگر اس کے برعکس ہونا نازیبا معلوم ہوتا تھا۔

پاپایان روما اور سکسونی شہنشاہوں کے مابین عطائے اسناد کے مناقشۂ عظیم میں یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ کلیسا کے حکمران دنیاوی حکومت کو ترک کر کے اپنی زندگی کلیسا کے لئے وقف کر دیں مگر یہ کوشش عبث ثابت ہوئی خود پوپ کی طرف سے بھی جب اس کا اشارہ ہوا تو جرمانیا کے حکمرانوں نے غصے کے ساتھ اسے مسترد کر دیا

نتیجہ یہ ہوا کہ جرمانیا میں بھی مذہبی عہدے سیاسی عہدوں اور سیاسی اغراض کے ساتھ مخلوط ہو گئے۔

شہنشاہی کے صوبوں میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ مقامی مقتدایان مذہبی یعنی اساقفہ، ربیان خانقاہ، پرائیروں اور زاہدوں کے مختلف فرقوں کے پیشواؤں نے اپنا ایک علحدہ طبقہ بنا لیا اور صوبے کی مجلس میں ایک جداگانہ گروہ کی حیثیت سے یا امرا کے ساتھ شامل ہو کر بیٹھنے کا حق حاصل کر لیا اور اپنی جاگیروں پر کم و بیش وسیع عدالتی اختیارات کام میں لانے لگے۔ صوبہ وار طبقات میں ان کے حقوق کی بنا بالعموم ان کے ملکی امرا ہونے کے اعتبار سے تھی اس لئے اگرچہ وہ اپنی ذات کے لئے محصولات و فوجی خدمات سے استثناء حاصل کر سکتے تھے مگر وہ اپنے خدام اور زرعی تابعین کیلئے جو ہمیشہ عام دنیاوی لوگ ہوتے تھے اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ ملک کو ان کے محصولوں کی ضرورت تھی اور ملک کا حکمران بہ حیثیت جاگیردارانہ آقا کے ان سے مسلح سواروں کے مہیا کرنے کا مطالبہ کر سکتا تھا۔

ایک فوقیت جو مذہبی طبقۂ امرا کو دنیاوی طبقۂ امرا پر حاصل تھی وہ یہ تھی کہ ان کا طبقہ موروثی نہیں تھا بلکہ شخصی تعلیم و انتخاب پر مبنی تھا۔ ایک دستکار کا لڑکا پوپ[۱] اور ایک کسان کا بیٹا اسقف اعظم ہو سکتا تھا۔

مگر جس قدر وقت گذرتا گیا، مذہبی طبقے کا یہ غلبہ اور مذہبی حکمرانوں اور دینی پیشواؤں کی پیرایانی طاقت متزلزل اور تباہ ہوتی گئی۔ سولھویں صدی کی جرمانی اصلاح نے اس دنیاوار کلیسا پر ایک بہت ہی کاری ضرب لگائی۔ پروٹسٹنٹی خیالات کی اشاعت کے ساتھ مذہبی ریاستیں دنیاوی رنگ میں آ گئیں۔ اساقفہ کی جائدادیں منسوخ کر دی گئیں خانقاہیں

---

[۱] پوپ گرگوری ہفتم جو خود ایک بڑھئی کا بیٹا تھا اس نے صاف الفاظ میں یہ بیان کیا ہے کہ رو ما کو کافروں اور عیسائیوں میں یہ عظمت حاصل ہوئی ہے اور اس لئے نسل کی نجابت یا ملکی عالی خاندانی اتنی زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں جتنی کسی شخص کی جسمانی اور روحانی خوبیاں، دیکھو لورین کے "مطالعات تاریخی" (Laurent, Etud. surl' Hist. حصہ ۷ صفحہ ۳۲۵

توڑدی گئیں اور مذہبی طبقے برطرف کردیے گئے اصلاح کے قبل جرمانی رائشس تاگ میں تین مذہبی حکمراں اور اُن کے سوا تین اسا قفہ اعظم اور انتالیس[۲۹] اسا قفہ نشست کرتے تھے۔ ویسٹ فالیا کی صلح کے بعد یہ تعداد گھٹکر تین انتخاب کنندہ حکمراں ایک زالتس برگ کا اسقف اعظم اور سینں اسا قفہ تک رہ گئی۔ اب صرف سوئیبیا اور رائن کے صوبوں کی مذہبی مجالسیں برقرار رہ گئی تھیں۔ شمال سارے کا سارا اور جنوب کا بڑا حصہ مذہبی فرمانروائی کے اثر سے نکل گیا تھا۔

جو ممالک کیتھولک طریق پر ثابت قدم رہ گئے تھے ان میں بھی یہ تغیر صرف ملتوی ہوگیا تھا۔ جرمانیا کا کوئی حصہ نہیں تھا جہاں انیسویں صدی کے اوائل کی انقلابی تحریک کے بعد مذہبی اقتدار شاہی قائم رہ گیا ہو۔ رائن کے بائیں کنارے کے انتخاب کنندہ حکمراں بھی اس طوفان میں بہہ گئے اور ان کے ممالک فرانس میں شامل کرلئے گئے۔ دوسرے مذہبی حکمرانوں کے ممالک دنیاوی فرمانرواؤں کو بطور معاوضے کے دیدیے گئے۔

شہنشاہی کے خاتمہ کے ساتھ مذہبی اُمرا کے شہنشاہی طبقے کی حیثیت جاتی رہی اور صرف بعض صوبوں کی ڈائٹ (مجالس شوریٰ) میں ایک غیر قابل اطمینان حیثیت قائم رہ گئی۔ کئی صدیوں کے بعد پھر ایک مرتبہ منصب اسقفی ایک خالص مذہبی عہدہ رہگیا جس میں سیاسی طاقت کا کوئی شائبہ شامل نہیں تھا۔ ان کا عدالتی اختیار بھی ان کے ملکی اقتدار کے ساتھ زائل ہوگیا۔

کیتھولک طبقۂ مذہبی جو اس طرح اپنی دنیاوی حیثیت و طاقت سے محروم ہوچکا تھا، وہ ازمنۂ وسطیٰ کے سطح خیال کو اب حاصل نہیں کرسکتا تھا جدید سیاسی احساس اس کا روادار نہیں تھا کہ مذہبی طبقہ عام دنیا داروں پر کسی قسم کا ظلم کرے اس نے سلطنت کے قوانین اور اس کے مشخصہ اقتدارات کے لئے ہمہ گیر اطاعت کا مطالبہ کیا، طبقۂ مذہبی کی برائت و امتیازات کا وقت گذر چکا تھا سب ایک قانون ایک اختیار عدالتی کے تابع تھے۔

انگلستان اور فرانس انگلستان اور فرانس میں بھی طبقۂ مذہبی کی تاریخ انھیں حالات سے ملتی جلتی سی ہے۔ ان ممالک میں انھیں وہ ملکی اقتدار کبھی حاصل نہوا تھا جو جرمانیا میں حاصل

ہوگیا تھا اور ان دونوں ملکوں میں سلطنت کا دنیا دی پہلو جرمانیا کی نسبت زیادہ قوت کے ساتھ حادی رہا تاہم پادریوں کا ایک طبقہ ضرور تھا، انگلستان میں امرائے دنیاوی کے ساتھ وہ دارالامرا میں نشست کرتے تھے۔[1] فرانس میں انھوں نے اپنا ایک جداگانہ طبقہ بنا لیا تھا جو سلطنت میں سب سے اول تھا مگر انگلستان میں اصلاح اور فرانس میں انقلاب نے ان کی حیثیت پر بڑا اثر ڈالا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی برائت، عام و یکساں اطاعت قانون کے اصول کے سامنے غائب ہوگئی۔

جب لوئس شانزدہم نے اسٹیٹس جنرل کو ۱۷۸۹ء میں طلب کیا تو طبقۂ مذہبی نے برضا خود اپنی جداگانہ حیثیت کو ترک کردیا، اور قومی مجلس میں (جو ازمنۂ وسطیٰ کے طبقات کی تھیں بلکہ آزادا اہالیان ملک کی قائم مقام تھیں) شامل ہونے میں امرا ملک پر سبقت لے گئے۔

اس طرح پادریوں کا ازمنۂ وسطیٰ والا طبقہ ہر جگہ شکست ہوگیا، مذہبی اور غیر مذہبی طبقات میں جو بڑا فرق تھا اس کا اثر عملاً زائل ہوگیا اور اپنے نظم حقوق میں سلطنت نے اسے مسلم سمجھنا ترک کردیا، پادریوں کا بڑا حصہ طبقۂ متوسط میں مل گیا اور کلیسا کے اعلیٰ عہدہ دار امرا و اعیان میں شامل ہوگئے۔

---

[1] پادریوں نے مجموعۂ پارلیمنٹی طبقہ کی اس حیثیت کے اختیار کرنے سے انکار کردیا تھا جو اڈورڈ اول نے پیش کی تھی، امرا روحانی اب بھی اپنے دنیا دی ہمسروں کے ساتھ دارالامرا میں بیٹھتے ہیں مگر اغلب یہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں انھیں یہ جگہیں دنیاوی جاگیردار ہونے کی حیثیت سے حاصل تھیں نہ کہ مذہبی اعزاز کے طور پر۔ انگریزی مترجم

دسواں باب

(ب) طبقۂ اعیان و امرا

(۱) فرانسیسی امرا

روما کے قدیم موروثی طبقۂ امرا کی جگہ پر ایک سیاسی طبقۂ امرا کا قائم ہونا۔

قدیم روما کے پیٹریسی (اشراف Patrician) موروثی امرا تھے مگر اندرونی فرقہ بندیوں کی کشمکش نے انھیں بہت جلد سیاسی طبقۂ اعیان میں مبدل کردیا جس کی بنا نسب پر نہیں بلکہ عام عہدوں کے لئے قوم کے آزادانہ انتخاب پر تھی۔ سیناتی خاندانوں کا یہ سیاسی طبقۂ اعیان، جمہوریت کے زمانے سے گذر کر شہنشاہی کے زمانے تک برقرار رہا، قدیم پیٹریسی خاندان جو آگسٹس کے زمانے میں گھٹ کر پچاس تک رہ گئے تھے اور جن میں بہت کم اضافہ ہوتا تھا قانوناً نہیں مگر واقعتہً وہی بدستور اس طبقۂ اعیان کی اصل و بنا تھے (شہنشاہوں کے خاندان بھی ازروئے قانون ہمیشہ پیٹریسی ہی ہوتے تھے) ان کے نام کی قدیمی عظمت و شوکت، سلطنت کے معاملات کا موروثی تجربہ نیز اکثر اُن کی بڑی بڑی جائدادیں اور ذاتی تعلقات بھی وہ اسباب تھے جنھوں نے ان کے لئے وہ وقعت حاصل کرلی تھی جس کی وجہ سے وہ سینات میں داخل کرلئے جاتے تھے لیکن ان کے علاوہ اُن ممتاز اشخاص کے اضافے سے جنھوں نے سپہ سالار، مدبر، مقرر، مقنن ہونے کے لحاظ سے شہرت حاصل کی ہوتی، طبقۂ اعیان میں ہمیشہ ہی نئی جان پڑتی رہتی اور نئی قوت آتی رہتی تھی۔ جمہوری دور میں یہ لوگ عام عہدوں پر منتخب ہونے کی وجہ سے سینات میں داخل ہوتے تھے اور شہنشاہی دور میں شہنشاہ کی طلب پر شامل ہوتے تھے۔ اس طرح زمانۂ مابعد کے رومی طبقۂ امرا کی بنا سیاسی قابلیت اور خدمات عامہ کے اعتبار پر قائم ہوگئی تھی اور تنزل و زوال کے زمانے میں بھی اس کی گزشتہ آزادی اور عظمت کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔

میسیناس کا منتہائے خیال۔

"فراںفقر شہنشاہی" (Principate) پر سیناس کا مشہور مقالہ اُن اساسی خیالات کا بہترین اظہار ہے جو ازمنۂ شہنشاہی میں طبقہ اعیان کی بابت ایک رومی مدبر کو ہو سکتے تھے۔ شہنشاہ کا یہ دوست اسے صلاح دیتا ہے کہ سینات کو اُن بہت سے ناقابل ارکان سے پاک کر دے جو خانہ جنگیوں کی ابتری کے دوران میں اُس میں داخل ہو گئے تھے اور جو جگہیں اس طرح خالی ہوں اُن کو غور و فکر کے ساتھ نامزدگیوں سے پُر کرے۔ وہ یہ سفارش کرتا ہے کہ غریبی کی پاداش میں کوئی رکن سینات سے خارج نہ کیا جائے بلکہ غریب قابل اشخاص کے لئے ضروری مالی ذرائع مہیا کر دیے جائیں نئے سیناتیوں کے انتخاب میں وہ صرف اٹالیا ہی تک اپنی نظر کو محدود نہ رکھے بلکہ اپنے حلیفوں پر اور صوبجات تک کے لوگوں پر نظر ڈالے اور اس طرح اپنے گرد شہنشاہی کی تمام قوموں کے اُن بہترین اشخاص کو جمع کر لے جو خاندان، اخلاق یا تمول کے لحاظ سے قوم کے سرگروہ مانے جاتے ہوں اور معاملات عامہ اور عالمگیر (رومی) حکومت میں اُنھیں حصہ دے اس طرح جتنے بھی زیادہ تعداد میں ممتاز اشخاص سینات میں شریک ہونے کے لئے روما میں جمع کئے جائیں گے اُتنے ہی زیادہ سلطنت کے ضروریات کو پورا کرنے اور صوبوں کی وفاداری کو قائم رکھنے کے ذرائع مہیا ہو جائیں گے "اساورۃ" جو زیادہ تر اپنی دولت کے لحاظ سے ممتاز ہیں اُن سے ایک دوسمیں طبقۂ اعیان مرتب ہونا چاہیے اور اُن کے بہترین افراد کو اُس میں شامل کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں اس خیال ہے کہ سیناتیوں کے بیٹے اپنے باپوں کی جانشینی کر سکیں اُن کو علوم و فنون اور سپہگری کی ایسی تعلیم دی جائے[۱] جو اُن کے رتبے کے شایاں ہو۔

فرانسیسی طبقۂ اعیان۔

فرانسیسی طبقۂ اعیان کی تاریخ بہت ہی ناہموار ہے، اس میں ہم ازمنۂ ذیل کو ممیز کر سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک دور خاص خصوصیات رکھتا ہے۔

میروونگی دور ۵۲۲ء–۸۱ء

(۱) فرانسیسی طبقۂ اعیان کا آغاز میروونگی[۲] دور (۸۱ء–۵۲۲ء) سے تعلق رکھتا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ فرانکی اعیان کے ایک قدیم موروثی طبقے کے آثار محض غیر متیقن ہیں

۱؎ Dio Cass. 52

۲؎ Merovingian

البتہ اُس زمانے میں شخصی وفاداری کی بنا پر ایک طبقۂ اعیان قائم ہوگیا تھا جس کی بنیاد زیادہ تر اُن تعلقات پر تھی جو بادشاہ اور اُس گروہ کے درمیان تھے۔ غالباً یہاں بھی امرا کے قدیم خاندانوں کا خاص لحاظ کیا گیا ہوگا مگر ان کے سوا دوسرے آزاد فرانکوں اور جرمانیوں کو بھی بادشاہ اپنے اعیان میں شامل کر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ رومانی بھی بادشاہ کے مہمانوں کی حیثیت سے اس قسم کے اعزاز سے مفتخر ہوتے رہتے تھے ایسی مثالیں بھی کچھ بہت کم نہیں ہیں کہ ادنیٰ درجے کے لوگ مثلاً غلام و خادم وغیرہ ترقی کرتے کرتے سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے اور اس طرح امرا میں شامل ہوگئے۔

پس یہ طبقۂ اعیان بہت ہی مخلوط اجزا سے پیدا ہوا تھا اور جیسا کہ شیفنر نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے زیادہ تر یہ طبقہ موروثی امرا کا طبقہ نہیں تھا بلکہ ذاتی امرا کا طبقہ تھا جو بادشاہ کے ساتھ وفاداری کے عہد کے ذریعے وابستہ تھا۔ زیادہ گراں دیت کا حق اس امر کا نشان و نتیجہ تھا کہ اس طبقے کے اراکین کی قدر و وقعت زیادہ تھی۔ اس کے سوا شخصی قانون میں اس کے امتیازات بہت ہی کم تھے، مگر سیاسی حیثیت سے اسے متعدد طور پر امتیازات حاصل تھے۔ اعیانی حیثیت کے ساتھ سلطنت کے اعلیٰ عہدے درباری منصب، مذہبی اعزاز بھی شامل ہو جاتے تھے۔ شاہی مجالس شوریٰ میں اس کی شرکت ہوتی تھی اور قومی اور ملکی مجالس میں اُسے بلند جگہ ملتی تھی۔

جس طرح اُن اشخاص میں جو اس نظام کے اعضائے ترکیبی ہیں ہم رومانی اور ٹیوٹنی (جرمانی) اجزا کو مخلوط پاتے ہیں وہی حال خود اس نظام کا بھی ہے مگر ٹیوٹنی خصوصیات غالب تھیں اور وہی عنصر روز بروز زیادہ تسلط حاصل کرتا رہا۔ اس جزو سے (۱) بادشاہ کی ذاتی وفاداری یعنی اعتماد شاہی کا تعلق تھا جو خاندانی روایات اور خاندانی اغراض سے پیدا ہوا تھا اور دوسرے روسا کے تابعین تک کے لئے وسیع ہو گیا تھا (۲) نیز بڑے بڑے امرا جو شاہی عطیات سے سرفراز ہوتے رہتے تھے جو (زیادہ تر اراضی کی شکل میں ہوتی تھیں) وہ اسی طبقے کے ہوتے تھے یہ مانا بعد

لہ شیفنر کی تصنیف "فرانس کے عدالتی نظام کی تاریخ" ج ۱ ص ۲۱۷ اور اس کے آگے۔
Schaffner, Geschichte der Rechtsver fassung Frankreichs.

کے جاگیرداری طریقے کی بنا زیادہ تر انھیں دو تعلقات پر ہے۔

کارولنگی دور ۷۵۳ء - ۹۸۷ء

(۲) حکمراں خاندان کے تغیر کا بڑا سبب طبقۂ امرا کا ایک انقلاب تھا محل کے کارولنگی حاجب بادشاہ کے قائم مقام کی حیثیت سے طاقتور فوجی اعیان کے سرگروہ بن گئے اور امرا کو ان کی ریاستوں میں استحکام حاصل کرنے میں مدد دی اور پھر انھیں امرا کی مدد سے کمزور بادشاہوں کو نکال باہر کیا۔

جیسا کہ گیزو نے (اپنی تصنیف[1] میں) بتایا ہے اس تحریک کو خاص اور مسلسل مدد شمالی فرانس اور آسٹریشیا سے ملی جہاں جرمانیوں کو غلبہ حاصل تھا اور جو اسی باعث سے جنوب کے رومانی فرانس کے مقابلے میں ٹیوٹنی (یا جرمانی) فرانس کہلاتا تھا۔ مغربی فرانس نے جہاں کے امرا رومانیوں سے بہت زیادہ مخلوط تھے بالکل علٰحدگی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب فرانسیسی طبقۂ امرا میں صاف طور پر ٹیوٹنی رنگ پیدا ہو گیا۔ امرا کا وہ طبقہ جو عہدوں اور خدمتوں کے اصول پر قائم تھا یوماً فیوماً بیرنوں، اکابر اور تابعین کا ایک جاگیرداری طبقہ بنتا گیا جن میں سے ہر ایک نے اپنی حد کے اندر اپنی آزادی کا سبق سیکھ لیا تھا اس طرح شاہی عہدہ داروں کی گروہ بندی نمایاں شاہی کے آزادانہ اقتدار سے مبدل ہو گئی اور امارت اور امرا کی جاگیریں موروثی ہو گئیں۔

کاپیٹی یا کاپے شنگی دور ۹۸۷-۱۲۲۰

(۳) نئے جاگیردار امرا کو تیسرے دور (یعنی شاہان کاپیٹ ۹۸۷ء سے سنٹ لوئس ۱۲۷۰ء تک کے عہد میں) انتہائی عروج و طاقت حاصل ہوئی۔ کارل اعظم اس کو سمجھتا تھا کہ سلطنت کا اتحاد کیونکر برقرار رکھا جائے اور شاہی طاقت کو کیونکر استحکام حاصل ہو مگر اس کے جانشینوں کے تحت میں فرانکوں کی عالمگیر شہنشاہی متعدد آزاد سلطنتوں میں منقسم ہو گئی اور خود فرانکی بادشاہی کے اندر عہدے اور جاگیریں زیادہ آزاد ہو گئیں، کارل اقرع کو مجبور ہو کر اپنے تابعین کے بلکہ ادنیٰ تابعین کے بیٹوں کے حق میں کاونٹ کے عہدے اور شاہی جاگیر کے موروثی ہونے کے اصول کو تسلیم کرنا پڑا[2]

---

[1] گیزو کے "مقالات فرانس کی تاریخ پر"، صفحہ ۲۵۔

Gnizot, Essais Sur l' histoire de Frauce

[2] جاگیروں کی وراثت فرانس میں بہت بعد کے زمانے تک عام طور پر تسلیم نہیں کی گئی تھی

اس کے بعد بہت ہی جلد جاگیروں میں قریبی رشتہ داروں کا موروثی حق بھی تسلیم کرلیا گیا۔ صرف کلیسا میں عہدے کے اعتبار سے شخصی امرا کا تخیل باقی رہگیا ورنہ سلطنت میں اس کی صورت موروثی جاگیرداری کی ہوگئی تھی۔ اس طرح موروثی حکمرانوں کی حکومت مختلف درجوں اور مختلف شکلوں میں تمام فرانس پر چھاگئی۔

اعلیٰ طبقہ امرا

ان امرا میں سے بعض کو تمام اہم معاملات میں اعلیٰ اختیارات حاصل تھے اور وہ بادشاہ کے لئے ایک بہت ہی محدود جاگیردارانہ اقتدار سے زیادہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔

اس اعلیٰ طبقے میں ڈیوک کاونٹ وائی کاونٹ اور بیرن شامل تھے زیادہ تر ان میں سے خود بادشاہ کے تابعین تھے بعض ان میں سے ڈیوکوں اور کاونٹوں کے بھی تابع تھے اور بہت ہی کم ایسے تھے جو اپنے علاقے میں آزاد مطلق ہوں۔ عدالت کے معاملے میں وہ اعلیٰ اقتدار رکھتے تھے اور فوجی نظام کے وہی سرگروہ تھے کیونکہ فوجی نظام میں اب اس کی پہلی سی قومی خصوصیت باقی نہیں رہی تھی، اور وہ جاگیرداروں اور نائیٹوں کی خدمت کا نظام رہ گیا تھا، دوسری طرف بادشاہ کی جو فوجی خدمت ان پر لازم تھی وہ قطعی طور پر معین و مشخص تھی۔ بادشاہ اُن کی رضامندی کے بغیر نہ تو قانون شائع کرسکتا تھا اور نہ محصول لگا سکتا تھا۔ اسی طرح سے وہ بھی اپنے حدود کے اندر اپنے تابعین کی رضامندی سے احکام نافذ کرتے اور محصول عاید کرتے تھے جو شخص بھی ان کے حدود اقتدار کے اندر رہتا تھا اسے اُن کی وفاداری کی قسم کھانا پڑتی تھی اور تابعین کو صداقت اور اطاعت کی قسم کھانا ہوتی تھی خلاصہ یہ کہ وہ اُن کی رعایا تھا۔

اس طرح سیاسی شاہی اقتدار ٹوٹ کر بہت سی ایسی موروثی شاہیوں میں منتشر ہوگیا جن کی بنا شخصی حقوق پر قائم تھی اور جن کے آپس میں ایک نہایت کمزور واسطہ باقی رہ گیا تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ گیارھویں صدی کے نصف ثانی تک بادشاہ اس اصول کی مخالفت کرتے رہے تھے۔

اعلیٰ طبقۂ امراب قوم کا ممتاز طبقہ نہیں رہا تھا نہ اس کی ہستی بادشاہ کی اس وفاداری اور ان خدمات کی شکل میں رونما تھی جو بادشاہ کے لئے اس پر لازم تھیں۔ اب تو اس طبقے کی خاص خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ارکان جاگیردار و والی اور حکمراں بن گئے تھے۔ اصل یہ ہے کہ اس نے خود بادشاہی کے حقوق حاصل کر لئے تھے۔

ادنیٰ طبقۂ امرا

ادنیٰ طبقۂ امرا میں بھی اسی قسم کی صورتیں پیش آئیں۔ دو ذرائع سے یہ طبقہ پیدا ہوا تھا ایک پیشۂ سپہگری۔ دوسرے درباری خدمات۔ ابتداءً پیشۂ سپہگری ہی تھا جس نے ان نائٹوں اور خادموں کی وقعت پیدا کی جو کسی رئیس کی مخصوص وفاداری کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے، لیکن نائٹ عام طور پر آزاد ہوتے تھے اور خدام اکثر بیشتر غلاموں کی اولاد سے ہوتے تھے مگر کچھ زمانہ بعد یہ پیشہ ور طبقۂ امرا بھی موروثی اور جاگیری طبقہ بن گیا۔ نائٹوں نے ریاستیں پیدا کرلیں جو ان کے خاندان میں موروثی ہوگئیں اور عہدہ داروں نے درباری جاگیریں حاصل کرلیں۔ صاحب ثروت ہونے کے لحاظ سے وہ عوام سے الگ ہوگئے اور تابعین کی حیثیت سے وہ اپنے رئیسوں سے قریب تر ہو گئے۔ جس طرح رئیس اپنے بادشاہ کے ساتھ میز (دسترخوان) پر بیٹھتا تھا اسی طرح نائٹ رئیس کی میز پر بیٹھتا تھا۔ جنگ اور دربار میں ان کی خدمتیں ان کی جائداد سے اسی طرح وابستہ ہوتی تھیں جس طرح حکمرانوں کے شاہانہ حقوق اُن کی مملکت سے وابستہ تھے۔ وہ بھی ایک طرح کا محدود مملکتی اقتدار شاہی رکھتے تھے۔ اور اپنے جاگیری رئیس کی عام رعایا کے اوپر ایک طرح کا ادنیٰ قسم کا اور دیہاتی عدالتی اختیار بھی انھیں حاصل تھا، ان کا طبقہ رفتہ رفتہ زیادہ علیحدہ ہوتا گیا اور نائٹوں کے طبقے کی بنا پہلے تو محض اُن کے پیشے پر تھی لیکن اب نائٹ کی نسل سے ہونا اور اسی کے مطابق تربیت یافتہ ہونا لازم ہوگیا تھا۔ نیا طبقۂ امرا اپنے نسب کی بنا پر طبقۂ معززین کہلاتا تھا، یہ ضرور ہے کہ محض نسب سے کوئی شخص "نائٹ" نہیں ہو جاتا تھا مگر یہ بھی تھا کہ جس شخص کا باپ نائٹ نہیں ہوتا تھا (یہاں سے بحث نہیں) وہ بالعموم نائٹ نہیں ہوسکتا تھا۔ صرف بادشاہ کسی شخص کو طبقہ امرا میں شامل کرسکتا تھا اس کے ساتھ ہی اول اول طبقۂ امرا کے ساتھ جاگیر کی ملکیت اس طرح وابستہ تھی کہ عام آزاد اشخاص جو جاگیر خرید لیتے اور وہیں رہتے تھے وہ اپنے اس علاقے کی وجہ سے احرار میں

داخل ہو جاتے ہیں اور جب ان کے پوتے اس جاگیر کے وارث ہو جاتے تھے تو وہ طبقۂ معززین میں شامل ہو جاتے تھے، مگر بغیر جاگیر کے آزاد شرفا بہت بورسن نوع انسانی کے پہلو بہ پہلو ترقی کرتی جاتی تھی وہ سب تعلیم اور پیشے کی بنا پر قائم تھی۔

اس ادنیٰ طبقۂ امرا کے تحت میں بھی تابع تابعین (Ranasseue) سے لیکر تابعین (Viques) تک بہت سے درجے تھے۔ آخر الذکر کی تعداد بالخصوص جنوب میں زیادہ تھی اور اکثر انھیں درمیانی درجے کے عدالتی اختیارات حاصل تھے، انھیں میں صاحبان قصر (Chatelains) تھے جن میں بعض اعزاز کے اعتبار سے بیرنوں کے ہم مرتبہ تھے اور انھیں میں وائی کاونٹ (Vicontes) تھے جن میں سے بعض بیرنوں سے تعلق رکھتے تھے اور بہت سے کاونٹ جاگیری خدمت میں نیچی حیثیت کے لوگوں میں شامل تھے مگر مدارج و امتیازات کے ان تمام پیچ در پیچ تو عات میں جاگیر دارانہ اصول ہر جگہ غالب نظر آتا ہے۔

سینٹ لوئس سے فرانسیسی انقلاب تک ۱۲۲۶-۱۷۸۹ء

(۴) چوتھے دور میں طبقۂ امرا کا کامل تغیر واقع ہو گیا۔ پہلے تو اقتدار شاہی کے لئے بادشاہ اور امرا میں کشمکش شروع ہوئی۔ بادشاہ قومی اتحاد کے بیدار شدہ جذبات اور سلطنت کے زندہ شدہ احساس کے نمائندے تھے۔ اس کشمکش میں وہ مقنن ان کی تائید پر تھے جو رومی قانون کے اصول پر زور دے رہے تھے اور بالآخر یہ عملدرآمد میں لے آئے۔ انھیں اپنے مسلمات کے لئے شاہی عدالت میں پارلیمنٹ کی شکل میں ایک قومی ذریعہ اظہار خیال کا ہاتھ آگیا۔ قوم اور بالخصوص شہروں کے باشندے اگرچہ مداخلت بہت کم کرتے تھے مگر بالواسطہ وہ بھی ان کی تائید پر تھے۔

شاہی عہدہ داروں کا ایک نیا نظام جو جاگیر دارانہ تعلق سے آزاد تھا بتدریج مروج کیا گیا۔ بادشاہ کی تنخواہ دار فوجیں کسی حصر و تعیین کے بغیر شاہی احکام کی بجا آوری کے لئے حاضر تھیں، ڈیوکوں اور کاونٹوں کی بڑی بڑی جاگیریں یکے بعد دیگرے بادشاہ کے قبضے میں آگئی تھیں، کبھی وراثت کے ذریعے سے کبھی معاہدے کے ذریعے سے اور بیشتر مسلح قوت کے زور سے ان پر تسلط ہو گیا تھا اور علٰحدہ شدہ شاہی طاقت ایک مرتبہ پھر تاج کے اندر مجتمع ہو گئی تھی اس طرح امرا کا آزادانہ اقتدار شاہی ٹوٹ گیا۔ اکا بر ملک پر بادشاہ کی فتح کو لوئس یازدہم (۱۴۶۱-۱۴۸۳)

نے مکمل کردیا۔

امرا کے پاس ان کے قدیم ملکی اقتدار شاہی کے تھوڑے بہت باقیات رہ گئے تھے۔ بعض صوبوں میں وہ صوبہ دار ہو گئے مگر مملکتی امرا کے طور پر ان کی حیثیت باقی نہیں رہی۔ رعایا میں ان کی حیثیت ایک ذی امتیاز طبقے کی رہ گئی تھی اور نئے خیالات اور اعتقادات ان کے اس اعزاز و امتیازات کے یوماً فیوماً مخالف ہوتے جاتے تھے۔ بادشاہ اور امرا میں بعد کو جو کشمکش ہوئی وہ بالکل ہی دوسری قسم کی تھی۔ درحقیقت وہ سیاسی اور مذہبی فرقوں کی کشمکش تھی اور بعض اوقات محض درباری فرقوں کی کشمکش بن جاتی تھی جن کے سرگروہ علی العموم امرا ہوتے تھے۔

امرا اگر اثر و قوت حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے تھے تو وہ صرف شاہی خدمت ہی کے ذریعے سے اس غرض کو پوری کر سکتے تھے وہ مجلس ملی (اسٹیٹس جنرل) میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لے سکتے تھے کیونکہ اس نے کوئی معین و منضبط شکل اختیار ہی نہیں کی۔

اس طرح جاگیر دارانہ طبقۂ امرا کے بجائے ایک درباری طبقۂ امرا قائم ہو گیا جس کا انحصار سیاسی حقوق کے بجائے زیادہ تر ظاہری درجہ و اعزاز پر تھا۔ ہنری چہارم نے امرا کو اپنی جاگیروں پر رہنے کا حکم دے دیا تھا۔ لوئیس چہاردہم نے انھیں دربار میں بلالیا تاکہ دربار کی شان و شکوہ سے خیرہ ہو کر انہیں کامل انقیاد پیدا ہو جائے اول درجہ فرانس کے ہمسروں کا تھا۔

جاگیر دارانہ طبقۂ امرا درباری طبقۂ امرا ہو گیا

اولاً ان کی تعداد بارہ تھی جن میں سے چھ مذہبی امرا ہوتے تھے اور چھ تاج کے دنیاوی

---

[1] وی توک ویل نے اپنی کتاب "سلطنت قدیم" میں ظاہر کیا ہے کہ طبقۂ امرا کے سیاسی حقوق کے برطرف کردینے اور اس کے ساتھ ہی ان کے اقتصادی امتیازات کو برقرار رکھنے سے کس طرح ان کے خلاف قومی منافرت کو حرکت ہوئی جبتک وہ عدالتی فرائض انجام دیتے تھے اور بالتخصیص امور عامہ میں اپنا وقت صرف کرتے تھے اس وقت تک محصولات سے ان کا مستثنیٰ رہنا اور زمین اور اشخاص کے محصولات سے انھیں رقوم کا ملنا قابل فہم معلوم ہوتا تھا مگر جب شاہی عہدہ دار سلطنت کے تمام انتظامی و عدالتی کاموں کو انجام دینے لگے تو پھر یہ اقتصادی امتیازات بالکل ناواجب معلوم ہوتے تھے۔

تابعین ہوتے تھے مگر بعد میں شہزادوں اور دوسرے دنیاوی امرا کے اضافے سے اُن کی تعداد بڑھادی گئی۔ اعزاز ہمسری (Peerage) موروثی تھا، انھیں بادشاہ کے حضور میں اور پیرس کی پارلیمنٹ میں جانے کا حق حاصل تھا اور ان کا مقدمہ صرف پارلیمنٹ ہی میں پیش ہو سکتا تھا۔ تاجپوشی کے موقع پر یہ لوگ ہمیشہ شاہی نشانات لیکر چلتے تھے۔ ہمسروں کے بعد ڈیوک، مارکوئس، کاونٹ، بیرن، وای کاونٹ، شاتیلیں (صاحبان قصر) کے درجے تھے جن کے مدارج ان کے خطابات ونشانات سے ظاہر ہوتے تھے۔

آخر میں اسکوائر اور معمولی جنٹلمین (شرفا) کا طبقہ تھا۔ قدیم طبقۂ امرا کا انحصار زیادہ تر وریثہ پر تھا مگر مملکتی حقوق پر متصرف ہونے کا بھی ایک حد تک اثر پڑتا تھا لیکن اب اس کے پہلو بہ پہلو ایک نیا طبقۂ امرا کا پیدا ہوگیا جس کی بنیاد خاصکر شاہی عطیے پر تھی، ان میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جو اعلیٰ ملکی اور فوجی عہدوں کے لئے نامزد ہوتے تھے اور سب سے زیادہ شاہی عدالتوں کے قانون داں اشخاص اس میں داخل تھے جو امرائے جبّہ (Noblesse de robe) کہلاتے تھے، یہ خدمتیں موروثی نہیں تھیں اور نہ زمین سے ان کا تعلق تھا پس اس لئے اس طبقے میں برابر نئے لوگ شامل ہوتے رہتے تھے۔ اسی سے قریب محققین علوم (Doctors of law) کا طبقہ تھا جو اور سب کے برخلاف شاہی عنایت پر مبنی نہیں تھا بلکہ علمی فضیلت پر مبنی تھا۔

استادی مرد

طبقۂ امرا میں ایک فروتر جزو اُن بہت سے افراد کا تھا جو اسناد کی بنا پر آبائی امرا کے زمرے میں شامل کئے جاتے تھے۔ یہ اسناد اکثر اُس رقم کے وصول کرنے کی غرض سے دیے جاتے تھے جن کا ادا کرنا ایسے امیروں پر لازم تھا اور کبھی کبھی خدمات کے انعام کے طور پر بھی عطا ہوتے تھے مگر وہ خدمات ہمیشہ عزت و آبرو والی خدمتیں نہیں ہوتی تھیں۔

انقلاب

(۵) فرانسیسی انقلاب کے مختصر مگر ہولناک آشوب نے طبقۂ امرا کا سارا نظام درہم و برہم کردیا، اس انقلاب کی ابتدا اس تبدیل سے ہوئی کہ ابتک جو طبقات علیٰحدہ علیٰحدہ تھے وہ سب ایک عام قومی مجلس میں شامل کردیے گئے اُس کے بعد طبقۂ امرا کی امتیازی حیثیت مٹادی گئی، اس لئے کہ امتیاز عمومی اصول مساوات کے خلاف تھا اور انجام کار امرا کا قتل عام کرکے کل سطح معاشرت کو ہموار کردینے کی کوشش کی گئی۔

(۶) جب جوش انقلاب ممتاز اشخاص کے خون سے پوری طرح سیراب ہو چکا اور نظریہ مساوات کی سربلند موجیں واقعات کی چٹانوں سے سر ٹکرا کر پست ہو گئیں تو خود فرانس میں کئی بار کوشش کی گئی کہ اگلے وقتوں کے زریں دور کے کھنڈروں پر ایک نئے طرز کے طبقۂ امرا کی بنیاد قائم کی جائے مگر ایسی کسی کوشش کو دیرپا کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ سب سے زیادہ دلچسپ کوشش نپولین کی تھی جس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ طبقۂ اعیان ایک طرف شاہی کو تقویت دینے اور دوسری طرف اس کے اختیارات کو محدود رکھنے کے لئے بہت ضروری ہے اُس نے "جیش اعزاز" کے طبقے کو قائم کر کے ایک طرح کے جدید نائٹ بنائے۔ اس اعزاز کا راستہ ہر اُس شخص کے لئے کھلا ہوا تھا جو سلطنت کی کوئی نمایاں خدمت انجام دے مگر فی الحقیقت یہ ایک محض شخصی اعزاز تھا۔ نپولین یہ بھی چاہتا تھا کہ ایک بلند تر موروثی طبقہ اعیان قائم کرے جس میں قدیم تاریخی امرا کے خاندانوں کے باقیات کے ساتھ موجودہ فرانسیسی سپہداروں، وزیروں اور دوسرے اعلیٰ عہدہ داروں کی اولاد بھی شامل کر لی جائے اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس کے مرکوز خاطر یہ تھا کہ قدیم رومی شہنشاہی کی تنظیمات کو فرانسیسی تاریخ کی روایات سے ملا دے لیکن یکم مارچ ۱۸۰۸ء کے قانون موضوعہ کو جاری کر کے اُس نے طبقۂ امرا کی تجدید میں پہلا ہی قدم اُٹھایا تھا کہ خود اس کا زوال ہو گیا۔

پنولین اول

لوئس شانزدہم (۱۸۱۴ء) اپنے طبقۂ اعیان میں انگریزی انداز کے قریب تر پہنچ گیا تھا مگر کسی قسم کا سیاسی طبقۂ اعیان قائم کرنے میں اُسے بھی ناکامی ہوئی۔ قدیم امرا کو انقلاب نے پوری طرح تباہ کر دیا تھا۔ حقوق کی مساوات اور املاک کے آزادانہ نقل و انتقال کا اصول لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسا بس گیا تھا کہ طبقۂ امرا کی تجدید کسی نوع سے بھی ہوتی وہ عام حقوق پر گویا ایک قزاقانہ دست اندازی معلوم ہوتی تھی۔ قدیم امرا میں سے ایک بڑے حصے نے خود اپنے ملک کے خلاف ہتھیار اُٹھائے تھے اور ان کے جدید دعاوی کا انحصار غیر ملکی فوجوں کے ذریعے سے فرانس کے فتح ہونے پر مبنی تھا۔ پرانی نفرت ایسی ہی قوی تھی جیسی پہلے تھی اور طبقۂ اعیان نے کسی قسم کی جدید خدمت ایسی نہیں کی تھی جس سے لوگ آشتی کے ساتھ اس پر مائل ہو جاتے کہ امرا کو پھر نئے سرے سے سیاسی عروج حاصل ہو۔ ۱۸۳۰ء کے جولائی والے انقلاب نے دوبارہ موروثی امرا اور طبقۂ اعظم کو منسوخ کر دیا اور حین حیاتی امارت جو اس کے بعد قائم ہوئی اسے فروری ۱۸۴۸ء کا طوفان بہا لے گیا۔ طبقۂ امرا کے ہر طرح کے خطابات و امتیازات کے خلاف سلطنت جمہوری نے

لوئس شانزدہم

دوبارہ اپنے منشا کا اعلان کر دیا۔

بنولین سوم

فرانسیسی طبقۂ امراء اس کے بعد پھر کبھی ترتیب نہیں دیا گیا۔ سینا تی کا منصب جو نپولین سوم نے اپنے نظام سلطنت میں اختیار کیا تھا اس میں طبقہ امراکے نو پانے کے آثار دکھائی دیتے تھے مگر اس دوسری شہنشاہی کے زوال کے ساتھ ہی یہ کوشش بھی ختم ہو گئی اس کے بعد فرانسیسی طبقۂ امرا صرف اس حد تک از سر نو قائم ہوا ہے کہ قدیمی خطابات کا جواز تسلیم کر لیا گیا ہے اور بیجا استعمال کا انسداد کر دیا گیا ہے۔

قوم میں اب بھی اعیانی عناصر ور جحانات موجود ہیں مگر عوام کی جمہوری طبیعت کے مقابلے میں انھیں کامیابی کا موقع نہیں ملتا ہے۔ اب فرانسیسی امرا صرف خطابی امرا ہیں ان کے کسی طرح کے خاص حقوق نہیں ہیں اور ان کا قیام زیادہ تر خاندانی خود نمائی کی وجہ سے ہے نہ کہ عام تنظیمات کی وجہ سے۔

گیارھواں باب

(ب) انگریزی طبقۂ امرا

اختلاط نسل

جدید یورپ میں بس انگلستان ہی ایک ملک ہے جہاں ابھی تک طبقۂ امرا ایک مستقل اور رفیع المنزلت قومی تنظیم کی حیثیت سے قائم ہے۔ یہ نتیجہ مختلف اسباب کے جمع ہونے سے پیدا ہوا ہے۔

(۱) فرانس کے طبقۂ امرا کی طرح ازمنۂ وسطیٰ کا انگریزی طبقۂ امرا بھی انگریزی اور نورمانی دو قومیتوں کے عناصر پر مشتمل تھا' فرانسیسی طبقۂ امرا کے بہ نسبت یہاں ان دونوں کے درمیان رابطۂ اتحاد زیادہ قریب تھا۔

اس میں شک نہیں کہ فتح (۱۰۶۶ء) کی ابتدائی صدیوں میں نورمانیوں نے سکسنیوں پر غلبہ قائم کر رکھا تھا مگر فرانس کے رومانیوں اور فرانکیوں کے تعلقات کے بہ نسبت ان کے تعلقات زیادہ گہرے تھے۔

سکسونی اَرل (Eorls) کو ایک قومی طبقۂ امرا کی حیثیت سے مدت سے عام آزاد گروہ (Ceorls) پر امتیاز حاصل تھا۔ اُن کی تعلیم اُن کی معاشرت' اُن کے خیالات وہی تھے جو نورمانی امرا کے تھے اور اپنے نئے بادشاہوں کے مقابلے میں بھی اُنھوں نے اپنے قدیمی حقوق کو قائم رکھا۔ فتح کا اثر صرف یہ ہوا کہ اُن کی آزادانہ طبیعت میں اور زیادہ تقویت آگئی اور جس مزید جوش و قوت کے ساتھ اُنھوں نے اپنے حقوق کو قائم رکھا' اس سے طبقۂ امرا میں بہ حیثیت مجموعی سیاسی آزادی کی وہ روح پیدا ہو گئی جو انگلستان کی اس عظمت کا باعث ہوئی۔

تاج کی طاقت

(۲) دوسری طرف فتح کا ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ شاہی طاقت جس پر ملک کے اتحاد و امن کا بہت کچھ انحصار تھا' امرا کے مقابل میں برقرار رہی اور فرانس کی طرح اقتدار شاہی چند بڑے بڑے تابعین کے درمیان منتشر نہیں ہو گیا۔

اور ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی جاگیردارانہ طریق کا دخل ضرور رہا مگر وہاں اُس کی حالت بدل گئی تھی، یہ پرانا خیال کہ انگلستان میں اول اول اسے نورمانیوں نے رواج دیا حال کی تحقیقات سے باطل قرار پاگیا ہے قدیم سکسونی "تھین" (متوسلین شاہی) ایک بڑی حد تک جاگیروں کے مالک تھے اور اس طرح بادشاہ کے ساتھ ایک خاص وفاداری اور فوجی خدمت کے رابطے کے ساتھ مربوط تھے، مگر یہ صحیح ہے کہ نورمانی حکومت نے فی الجملہ سلطنت کو زیادہ نمایاں جاگیردارانہ حیثیت میں تبدیل کر دیا، فتح کے وقت جاگیردارانہ طریقہ نورمانڈی میں انگلستان کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ حالت میں تھا، اور فاتحین اپنے خیالات اپنے ساتھ لائے تھے۔

ولیم اول (خود ولیم فاتح ہی نے یہ اصول رائج کیا تھا کہ نہ صرف بڑے بڑے متاجرین بلکہ ماتحت متاجرین اور بڑے بڑے قابضین اراضی براہ راست بادشاہ کی اطاعت کا حلف اٹھائیں تاکہ فوجی خدمت کے دائرے میں تمام رعایا براہِ راست بادشاہ کے تابع رہے۔ ایک صدی کے اندر اندر تمام ارضی جائدادیں جاگیرانہ بندش کے اندر آگئیں اور یہ مقولہ زبان زد ہو گیا کہ "بادشاہ اپنی مملکت کی تمام جائدادوں کا رئیس اعظم اور مالک اول ہے اور کوئی شخص بالواسطہ یا بلاواسطہ شاہی عطیے کے بغیر اس کے کسی جزو پر قابض نہیں ہو سکتا" اس طرح تمام ارضی ملکیت یکساں طور پر سلطنت کے تابع ہو گئی) ولیم جس جاگیری اقتدار شاہی پر عامل تھا وہ اس کے وقت کے فرانسیسی بادشاہ کے اقتدار سے بہت قوی تھا نورمانڈی کا ڈیوک (یعنی خود ولیم) جو جاگیرداری اصول سے شاہ فرانس کا ایک ماتحت رئیس تھا برائے نام اُس کے اثر میں تھا اور یہ بھی حقیقت سے خالی محض ایک ضابطہ پیمائی تھی۔

اس طرح نورمانی اور سکسونی امرا اگرچہ اپنے تابعین پر عدالتی اور حفاظتی اختیارات ازمنۂ وسطیٰ کے طرز پر عمل میں لاتے تھے۔ پھر بھی وہ حقیقتاً شاہی اقتدار کے اندر تھے اور سلطنت کا اتحاد بیرنوں کے اوپر نثار نہیں کیا گیا تھا۔

(۳) لیکن اگر اس اعتبار سے انگریزی طبقۂ امرا کے حقوق ایک طرف تنگ و محدود تھے تو دوسری جانب ان کے سیاسی حقوق بہت ہی اہم تھے یہی حقوق ہیں جو ان کی عظمت و مستقل اہمیت کا باعث ہوئے۔

پارلیمنٹ میں امرا کی قوت

ان سیاسی اور قومی حقوق کے اظہار کا موقع آن عظیم الشان مجلسوں میں آتا تھا جو بہت ہی جلد پارلیمنٹ کے زیادہ منکسرانہ نام سے موسوم ہو گئیں۔ پارلیمنٹ کی صورت میں قدیم انگلوسکسیونی مجلس عقلا ایک نئی شکل میں زندہ کی گئی تھی اور دونوں نسلوں کو عام اغراض وحالات کے سلسلے میں باہمی متحد کر دینے میں اس سے بڑی مدد ملی۔ بڑے بڑے تابعین کے اجتماع کی غرض اولاً اس سے زیادہ نہ رہی ہو گی کہ وہ ایسٹر، وٹسین ٹائیڈ اور کرسمس کے تیوہاروں میں تاج کی شان وشوکت کے بڑھانے کے باعث ہوں مگر آہستہ آہستہ اُنھوں نے بڑی سیاسی اہمیت حاصل کر لی اور سلطنت کے نہایت ہی اہم معاملات پر ان کے درمیان بحث وفیصلہ ہونے لگا، اگرچہ اولاً ان کے حدود واختیار کے لئے قطعی قواعد وضوابط معین نہیں تھے مگر تیرھویں صدی میں اُنھوں نے زیادہ منضبط صورت اختیار کی۔

منشور اعظم

امرا نے جب اپنی حفاظت حقوق کے لئے ہتھیار اُٹھایا اور فتحمندانہ طور پر شاہ جان سے ۱۲۱۵ء کا منشور اعظم بزور حاصل کیا تو اُس منشور میں یہ مرقوم تھا کہ اساقفۂ اعظم، دیگر اساقفہ، شیوخ الصوامع کاونٹ اور بڑے بڑے بیرن بادشاہ کے خطوط کے ذریعے سے پارلیمنٹ میں فرداً فرداً طلب کئے جائیں گے اور بادشاہ کے دوسرے بلا واسطہ تابعین شاہی عہدہ داروں کی وساطت سے عام حکم کے ذریعے سے بلائے جائیں گے اور یہ کہ جدید محصول ان کی رضامندی کے بغیر نہیں عائد کیا جائے گا۔

ایوان اعلیٰ ایوان ادنیٰ

مرور ایام سے طبقۂ اول جو بادشاہ کا موروثی مشیر تھا اور دربار وسلطنت کے بلند ترین عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے امور عامہ کے اہم انتظامات پر قابض تھا، ایوان اعلیٰ ہو گیا اور طبقۂ دوم ایوان ادنیٰ کا ایک جزو ہو گیا۔ اولاً دونوں کو کونسل میں نشست کا حق ذاتی حاصل تھا مگر پھر طبقۂ دوم کے لئے یہ حق نیابت کی صورت میں بدل گیا اور اس بارے میں یہ لوگ نائٹ تاج کے بڑے تابعین کے فروتر تابعین، شہروں اور قصبوں کے باشندوں کے ساتھ شریک کر دئے گئے۔ اس کے بعد سے لارڈ، اعلیٰ طبقۂ اعیان بن گئے اور دولتمند اہل شہر شرفا کے فروتر طبقۂ اعیان کے ساتھ شامل ہو گئے۔

طبقۂ امرا کو سلطنت میں اپنی فطری جگہ اس وقت ملی جب تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں نظام پارلیمنٹ مکمل ہو گیا۔ ہنری سوم کے عہد میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا بیرن ارل لیسٹر کی سرکردگی میں شاہی ہستی کو معرض خطر میں ڈال دیں گے اور حکومت

کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیں گے مگر یہ ایک عارضی مداخلت تھی اور بہت جلد یہ اصول دوبارہ قائم ہو گیا کہ طبقۂ اعیان امور عامہ میں ایک معین اثر اور توضیع قانون میں مخصوص شرکت کا مستحق ہے مگر حکومت کے شاہی حقوق کے عمل میں لانے کا اُسے کوئی استحقاق نہیں ہے۔

پارلیمنٹ کی وسعت

جب شہروں اور قصبوں کے نائبین کے اضافے سے پارلیمنٹ کو وسعت حاصل ہوئی تو ان امرا کی سیاسی طاقت اور بھی محدود ہو گئی اور ان کی طاقت پر اس کا بھی اثر پڑا کہ براعظم یورپ کی طرح انگلستان میں پارلیمنٹ کے لئے نائٹ خود اپنے طبقے کی طرف سے نامزد نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ آزاد مستاجرین کی طرف سے منتخب ہوتے تھے۔

خاص طبقۂ اعیان خالصۃً لارڈوں پر مشتمل تھا فرانس اور جرمانیا کی طرح یہ کبھی بھی خاندانی اور مملکتی طبقۂ اعیان نہیں بنا بلکہ ملک کے ایک طبقے کے طور پر باقی رہا۔ جسے بادشاہ اور قانون کے تحت میں فوجی اور عدالتی نظام کے اندر اور نیز اپنے تابع مستاجرین پر اپنے اختیارات کے عمل میں لانے کے حقوق حاصل تھے۔

نائٹ۔

نائٹ یعنی آزاد اشخاص جو بادشاہ یا امرا کو ایک خاص رقم ادا کرنے سے اس حق پر فائز تھے انھوں نے ایک با اثر حیثیت حاصل کر لی تھی، فوج محافظ میں انھیں اول درجہ حاصل تھا اور ناظمان امن کی حیثیت سے انھیں پولس و عدالت کے اختیارات تفویض تھے پارلیمنٹ کے لئے صوبوں کے قائم مقام انھیں میں سے منتخب ہوتے تھے۔ اعلیٰ شہری طبقے سے ان کے چھوٹے لڑکوں کا شمول اور نائبان قصبات کے ساتھ اُن کے پارلیمنٹی تعلقات ہی سے فی الواقع طبقۂ شرفا کا موجودہ خیال پیدا ہوا جس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو اپنے حسب و نسب، عہدے، تعلیم یا جائداد کی وجہ سے عامۃ الناس سے معزز ہیں۔

جنٹلمین (شرفا)

۴۔ انگریزی طبقۂ امرا کا جوش عامہ

(۴) انگریزی طبقۂ امرا کی ایک خصوصیت ہے جو خاص لحاظ کی مستحق ہے کیونکہ اس سے وہ فرانس کے اور ایک حد تک جرمانیا کے بھی طبقۂ امرا سے قابل اعزاز طور پر ممتاز ہیں۔ اُسی زمانے میں جب کہ صرف بیرن ہی سلطنت میں ایک سیاسی طاقت تھے، تو وہ اپنی ذوات خاص اور اپنے ذاتی حقوق کے سوا کچھ اور امور کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے ابتدا ہی میں بحیثیت ایک قومی جماعت کے اپنا یہ کام سمجھ لیا تھا کہ جمہور کے اعزاز عامہ کے لحاظ سے قوم کے حقوق کی مداخلت اور اس کی آزادی کی محافظت کریں۔ انگلستان کی سیاسی آزادی ایک بڑی حد تک انھیں کی حاصل کردہ ہے۔ جب یہ آزادی

ایک بار مضبوط بنیاد پر قائم ہو گئی تو اعلیٰ طبقۂ اعیان جمہوریت کی موجوں کے مقابلے میں ایک مستحکم پشتہ بن گیا، اُنھوں نے اپنی قومی آزادی کی محافظت کی حیثیت کو بدل دیا اور تخت اور مروجہ تنظیمات کی حفاظت کا کام اختیار کیا، جو اس درجہ ہر دلعزیز تو نہیں تھا، مگر نہایت ہی مفید تھا وہ بادشاہ اور عامۂ قوم کے درمیان میں تھے۔ وہ خود بذات خاص حکمراں ہونے کی قوت نہیں رکھتے تھے مگر ان کی آزادی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ عوام کی ہر ایک پرجوش جھپک یا بادشاہ کے ہر ایک مذاق طبعی کی اطاعت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے دونوں کی آزادی و حقوق کو ایک دوسرے کی زد اور دست برد سے محفوظ رکھا۔

انگریزی طبقہ امرا نے فرائض عامہ میں ہمیشہ مستقلانہ و رہبرانہ حصہ لیا ہے، اُن کی تعلیم سیاسی آزادی اور شخصی حریت کے اثر سے مملو ہے، فرقہ سیاسیات، ناظمان امن کی حیثیت سے ان کے کام انتخابات، انتظام ضلع اور مشاغل جوری میں ان کی شرکت، ان کی رضا کارانہ انجمنیں، اور اغراض عامہ میں ان کی امداد، غرض کہ مستعد کار زندگی کی یہ تمام شکلیں انھیں قوم کی زندگی سے باخبر رکھتی اور حکومت خود اختیاری کے فرائض اور خدمت حب وطن کی تعلیم دیتی ہیں۔

| (۵) طبقۂ امرا میں جانشینی کا صرف ایک وارث کے لئے محدود ہونا

(۵) انگریزی امرا   روثی اصول قانون عامہ کا ایک قاعدہ بن گیا اگرچہ اس نے ایسی قطعی اور وسیع الاثر شکل نہیں اختیار کی جیسی بر اعظم میں ہے۔ اول اول حق وراثت نیز اختیار امارت زمین یا عہدے کے قبضے سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے، امارت کی کیفیت قطعی طور پر ملکی تھی مگر بعد میں یہ تعلق توڑ دیا گیا اور امارت بہ حیثیت ایک ذاتی اعزاز کے وارثاً منتقل ہونے لگی۔

مگر کسی مخصوص جائداد، قصر یا عہدے سے امارت کے اس ابتدائی تعلق کی وجہ سے یہ اہم اصول پیدا ہوا کہ متوفی امیر کا صرف ایک ہی بیٹا یا ایک ہی رشتہ دار اس کے بجائے پارلیمنٹ میں شریک ہو سکتا ہے، جانشینی خلف اکبر کے اصول کے موافق صرف ایک بیٹا "لارڈ" ہوتا تھا باقیوں کو چھوٹے درجے ملتے تھے اور اعلیٰ طبقۂ امرا سے وہ خارج رہتے تھے۔ نہ صرف لارڈ کے چھوٹے بیٹے قانوناً اسکوائر ہیں بلکہ باپ کی زندگی میں بڑے لڑکے کو بھی "لارڈ" محض اخلاقاً کہتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو بڑے خاندانوں کا اعزاز و تمول ایک شخص کے اندر

مجتمع رہا اور دوسری طرف ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں آسانی کے ساتھ منتقل ہوجانے سے امتیازات نسب کی وقعت گھٹ گئی ۔

(۶) عقد

(۶) کسی امیر کے لئے یہ لازمی نہیں تھا کہ وہ کسی امیر ہی گھرانے میں شادی کرے ۔ "لارڈ" کی بیوی "لیڈی" کہلاتی ہے خواہ وہ عام باشندگان ملک کے طبقے میں سے کیوں نہ ہو۔ اس اصول سے طبقۂ امرا کے اعزاز میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور بہت سے وہ اعتراضات رفع ہوگئے جو برابری نسب کے اصول سے پیدا ہوتے تھے۔ جس سے طبقے کے بجائے ذات کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور جس پر جرمانی طبقۂ امرا بہت سختی کے ساتھ جما ہوا ہے ۔

(۷) جدید اضافہ ۔

(۷) آخر میں یہ کہنا ہے کہ طبقۂ امرا میں وقتاً فوقتاً نئے امرا کے اضافے سے وسعت و زندگی پیدا ہوتی رہی ہے ۔ نئے امیر بنانے کا حق بادشاہ کے لئے مخصوص ہے کیونکہ وہی تمام سیاسی عزتوں کا سرچشمہ ہے ۔ بادشاہ ہی طبقۂ امرا میں نئے ارکین کا اضافہ کرسکتا ہے اور ڈیوک، مارکوئس، ارل، وائکاونٹ یا بیرن کے خطابات کے ساتھ امارت کے حقوق عطا کرسکتا ہے مگر دستور یہ رہا ہے کہ یہ سیاسی اعزاز صرف اُن لوگوں کو دیا جاتا ہے جو بہ حیثیت سپہ سالار یا مدبر کے اپنے خدمات عامہ سے امتیاز حاصل کریں اور جن کے پاس اتنی جائداد موجود ہو یا اب مل جائے جو ان کی حیثیت کی ضرورتوں کی کفیل ہوسکے اس طرح ان سچی اعیانی قوتوں کے مسلسل اضافوں نے انگریزی طبقۂ اعیان کو جمود اور نا قابلیت کے خطرے سے بچا لیا۔ اس طریقے کی وجہ سے قوم کے قابل ترین اور ذہین ترین افراد یہ توقع کرسکتے ہیں کہ وہ اپنے کو اور اپنے خاندان کو سیاسی زندگی کی درخشاں بلندیوں پر پہنچا سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک میں چونتیس ۳۴ ڈیوک، انتیس ۲۹ مارکوئس ایک سو نو ۱۰۹ ارل پچاس (۵۰) وائکاونٹ اور دو سو اڑتالیس ۲۴۸ بیرن نئے بنائے گئے۔ اس اثناء میں پانچ سو سے زائد شخصوں کو بیرونٹ کا خطاب عطا ہوا۔ زمانۂ موجودہ میں وہ دولتمند اہل شہر جو قصبات میں بڑی بڑی جائدادیں خرید لیتے ہیں اگرچہ امارت کا خطاب نہیں رکھتے مگر قصباتی امرا میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے ۔

اب اگر ہم انگریزی طبقۂ اعیان کے ان خصوصیات پر مجموعۃً نظر کریں تو پھر کوئی وجہ استعجاب کی نہیں رہتی کہ کیوں تمام یورپ کے طبقۂ اعیان میں صرف انگلستان

ہی کے طبقۂ اعیان کا وجود بہ کمل طور پر باقی رہا اور نظامِ حکومت میں کیوں اُسے ایک کارآمد اور نمایاں جگہ دی گئی اور اس کے برخلاف براعظم کے ہر ملک میں طبقۂ اعیان یا تو بالکل ہی ناپید ہو گیا ہے، یا اگر باقی ہے تو کشاکشی اور پستی کی حالت میں ہے۔

بارھواں باب

(ج) جرمانی طبقۂ امرا (۱) پرنس

اگر ہم جرمانیا کے طبقۂ امرا کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہر جگہ ایک تعداد ایسے ممتاز خاندانوں کی ملے گی جو فوجی شہرت، تمول یا قوم کے رہنما ہونے کی وجہ سے تمام دوسرے آزاد شخصوں سے بلند تر ہوتے ہیں اور فی الاصل انھیں ایک طرح پر شہزادوں کی سی منزلت حاصل ہوتی ہے۔ یہ قدیم نسلی طبقۂ امرا جو اکثر صرف چند خاندانوں تک محدود رہا ہے، وہی ازمنۂ وسطیٰ کے خاندانی یا فرمانروا امرا کی بنا تھا۔

نائٹ کا فروتر طبقہ ازمنۂ وسطیٰ کی پیداوار تھا۔

دنیاوی اور مذہبی پرنس۔

دنیاوی مدارج میں سب سے اعلیٰ درجہ پرنس کا تھا، اُس کی حیثیت کو شہنشاہی نظام حکومت سے بہت گہرا تعلق تھا۔ جن خاندانوں کے بزرگ آزادی[1] واقتدار شاہی کے بلند ترین حد پر پہنچ گئے تھے وہ نہایت آزاد معززین یعنی احرار کامل میں شمار ہوتے تھے۔ (بارھویں صدی کے آخر سے صرف وہی دنیاوی اُمرا شہنشاہی کے پرنسوں میں سمجھے جاتے تھے جو بادشاہ کی جانب سے کم سے کم کاؤنٹی کی جاگیر رکھتے ہوں، اور کسی دوسرے دنیاوی امیر کے تابع نہ ہوں) مگر ان پرنسی خاندانوں کے افسر ہی صحیح معنوں میں امیر (یا لارڈ) خیال کیے جاتے تھے۔ خاندان کے دوسرے اراکین اس درجے سے محروم تھے وہ اُن پرنسوں اور امیروں کے محض ہم جنس (یا رفیق) تھے۔

شہنشاہی میں اس بلند درجے کا حصول صور ہائے ذیل پر منحصر تھا۔ (الف) پرنسا کے منصب (یعنی ابتداً ڈیوک کی فوجی نوت) پر فائز ہونا جس کے ساتھ نشان وعلم بھی

---

[1] جرمانی اصطلاح میں: "ہوخ فرائی" (Hochfrei) "زیند بار فرائی" (Sendbarfrei) "زیمپر فرائی" (Semperfrei)

عطا ہوتا تھا۔ دنیاوی پرنسوں کے زمرے میں ڈیوک، مارکوئس، کاونٹ پلیٹاین شامل تھے انھیں کے پہلو بہ پہلو اور بعض وقت اُن سے بھی مقدم شہنشاہی کے دینی پرنس تھے جن کے ہاتھوں میں صرف عصا ہوتا تھا۔ اول الذکر عہدہ موروثی ہوگیا تھا اور حسب دستور صرف اعلیٰ طبقہ امرا کی اولاد کو عطا ہوتا تھا۔ ثانی الذکر کلیتہً پرنسی خاندانوں تک محدود نہیں تھا۔ اکثر وہ پادری جو کسی نائٹ کی اولاد سے ہوتے تھے بلکہ ذی علم شہری بھی اس عہدے پر منتخب ہو جاتے تھے اور شاذ و نادر ایسا بھی ہوا کہ کسانوں کی اولاد کلیسائی مسند پر پہنچ گئی۔

کاونٹ (ب) کاونٹ کا عہدہ وہ بھی ایک موروثی و مملکتی حکومت بن گیا تھا۔ طاقتور قبائلی ڈیوکوں کے زوال اور اُن کی مملکت کے مختلف حکمرانوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد کاونٹ کے یہ خاندان اعزاز میں بڑھ گئے تھے اولاً ان کی حیثیت بادشاہ کی جانب سے شاہی نیابت پر منحصر تھی۔ اصل یہ ہے کہ یہ ایک خاندانی مملکتی امارت تھی۔

(ج) علاوہ ان کے ایک تعداد بڑے بڑے اراضی دار امرا کی تھی ان امرا نے

بیرن۔ معافیات اور اختیارات حکمرانی کے عطیے کی وجہ سے کاونٹوں کے مانند اقتدار شاہی و اختیار عدالتی حاصل کرلیا تھا۔ یہ لوگ بیرن کہلاتے تھے۔

قدیم قبائلی امرا کے وہ خاندان جنھیں شہنشاہی میں کوئی خاص جگہ حاصل نہیں تھی وہ زیادہ مدت تک شہنشاہی امرا کے اراکین میں شامل نہیں رہ سکے، اور دوسرے طبقات خاصکر نائٹ کے طبقات میں منقسم ہوگئے۔

ان کے سیاسی حقوق۔ شہنشاہی کا یہ طبقہ امرا، اپنے دو سیاسی حقوق کی وجہ سے بالتخصیص ممتاز ہے۔

(۱) مملکتی اقتدار شاہی۔

(۲) شہنشاہی درجات میں نشست۔

پس صحیح معنی میں یہ ایک پورا حکمراں طبقہ تھا، اپنے حدود میں وہ تنہا حکمراں، اور شہنشاہی میں مشترک حکمراں تھا، اقتدار شاہی کا یہ میلان طبیعتوں میں راسخ ہوگیا تھا اور شہنشاہی پر اُس کا بہت تباہ کن اثر پڑا اُسی کی وجہ سے نہایت ممتاز خاندانوں نے شہنشاہی کی عظمت کو پوپ کے دعاوی پر قربان، جرمانی شاہی کو کمزور و شل، اور جرمانی ممالک کو غیروں کے تابع کردیا، ساری دنیا اور اپنے ملک کے خلاف اُن کے اس جرم کا معاوضہ

نہ تو اُن کے درباروں میں اور محلوں کی شان وشوکت سے اور نہ ان صنعتی کاموں کی عظمت سے ہوسکتا تھا جنھوں نے ان کے زیر سایہ نشو ونما حاصل کی ۔

مملکتی امارت نے کچھ دنوں بعد بادشاہی کی سی صورت اختیار کرلی مگر اس میں نہ تو اصلی طاقت تھی اور نہ آئندہ کے لئے کوئی طمانیت تھی ۔

ان کی خود غرضانہ اور منفردانہ طبیعت ۔

بڑے بڑے مملکتی پرنسوں میں صرف چند ہی ایسے تھے جن میں کسی حد تک اپنی جداگانہ سیاسی ہستی کے قائم رکھنے کی قابلیت تھی ورنہ زیادہ تر اُن میں ایسے تھے جن کے وسائل اور جن کی قابلیت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی ۔ شہنشاہی طبقے کی حیثیت سے اُنھوں نے شاذ ونادر ہی اپنی طاقت جرمانی اغراض کے بڑھانے، عوام کے حقوق کے ترقی دینے اور عام آزادی کی تائید کرنے میں صرف کی ہوگی اُن کی قوت بالعموم قومی خدمات سے بچنے اور خاص اراکین شہنشاہی کی طاقت کے بڑھانے میں صرف ہوتی تھی ۔

ان میں خاندانی انفرادیت کا میلان خصوصیت کے ساتھ قوی تھا مساوات نسب کی سخت شرط غیر کفوؤں میں عقد کی ممانعت اور تمام لڑکوں کے لئے یکساں حقوق کی وسعت سے اس میلان کا اظہار ہوتا ہے ۔ عقد کی ایک ہی صورت تھی کہ دونوں فریق اعلیٰ خاندان سے ہوں اور اس میں تقریباً کسی طرح کا استثنا نہیں تھا ایک اعلیٰ طبقے کے مرد کا ایک متوسط طبقے کی عورت سے بھی عقد کرنا بہت سے خاندانوں میں کفوئیت کے خلاف سمجھا جاتا تھا ۔ اولاد کے حسب ونسب کے مساوات کو گھٹا دیتا تھا اور بیٹوں کے پرنسی حقوق پر اس کا اثر پڑتا تھا ۔ البتہ بادشاہ یہ کرسکتا تھا کہ بیوی کا درجہ بلند کرکے اس نے نقص کو رفع کردے یا کوئی خاندان اپنے تفرد پسندی کی وجہ سے زیادہ بلند اصول اختیار کرلے یا کسی غیر مساوی عقد کی صورت خاص کو منظور کرلے ۔

مساوات نسب کے سخت ترین اصول کے موافق ایک جرمانی خاندان بھی بالکل خالص نہ رہ سکا، لیکن بہت سی صورتوں میں غیر مساوی عقد اس علانیہ شرط کے ساتھ ہوتے تھے کہ اولاد اپنے باپ کے منصب کی وارث نہیں ہوگی ۔ بیوی کے پست درجہ ہونے کی غیر مشتبہ صورتوں میں بھی یہی نتیجہ ہوا کرتا تھا، خاصکر جبکہ بیوی شہریا دہات کے فروتر طبقے یا غیر آزاد طبقے کی ہوتا آنکہ بعد کے انتخابی قواعد کے موافق بادشاہ بھی اس دھبے کو مٹا نہیں سکتا تھا ۔

کثرت خطابات

دو آئینہ قوانین[۱]" کے زمانے میں پرنس، کاونٹ اور بیرن کا خطاب صرف اُنھیں لوگوں کو دیا جاتا تھا جو واقعتاً پرنس یا کاونٹ کے فرائض انجام دیتے یا کسی بیرنی پر قابض ہوتے تھے مگر کچھ زمانہ گذرنے پر پرنسوں اور کاونٹوں کے سب بیٹے اپنے باپوں کے خطابات اختیار کرنے اور اُنھیں اپنی اولاد میں منتقل کرنے لگے۔ یہ خالی خطابات بظاہر خاندانوں کی عزت بڑھانے کی غرض سے ہوتے تھے، مگر اُن کی کثرت کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ عوام میں ان کا اعزاز گھٹ گیا اور مملکتی رئیسوں کے مقابل میں وہ کمزور ہو گئے۔ اسی طرح عقد کے اصول مساوات کی سخت پابندی نے اس سرچشمے کو خشک کر دیا جس سے امرا میں تازگی پیدا ہوتی اور اسی کی وجہ سے قوم کو ان سے بے واسطگی ہو گئی۔

زوال

جنگ سی سالہ کے وقت سے خاندانی طبقۂ امرا برابر تنزل کی طرف مائل ہوتا گیا یہاں تک کہ انیسویں صدی میں وہ بالکل ہی شکستہ ہو گیا۔

اس کی تاریخ میں فیصلہ کن امور حسب ذیل تھے:۔

(الف) مذہبی امارت کا دنیاوی حیثیت اختیار کرلینا (۱۷۹۷-۱۸۰۳)

اس کے لئے ان معاہدات امن سے راستہ صاف ہوا جو ۱۷۹۷ء میں بمقام کامپو فورمیو اور (سنہ ۱۸۰۱ء میں) بمقام لیونویل فرانسیسی جمہوریہ اور جرمانی شہنشاہی کے درمیان طے ہوئے اور ایک فیڈی ڈایٹ کے ایک غیر معمولی فیصلے سے ۲۵ فروری سنہ ۱۸۰۳ء کو ان کی توثیق و تکمیل ہوئی۔

رائن کے بائیں کنارے پر دنیاوی امرا کو جو نقصان اپنی اراضیات کو فرانس کو دے دینے سے پہنچا تھا اُس کی تلافی کے لئے مذہبی امرا کی جرمانی جائدادیں کام میں لائی گئیں اور اطالیا کے امرا جو وہاں سے نکال دیے گئے تھے انھیں مذہبی جاگیروں سے ان کے لئے جرمانیا میں جاگیریں مہیا کی گئیں۔ تین مذہبی انتخاب کنندوں (الکٹرولس) میں سے صرف مائنس کا انتخاب کنندہ پرنس اپنی حالت پر باقی رہا اور بعد کو وہ مذہبی رئیس اعظم کی حیثیت

[۱] تیرھویں صدی کے اوائل میں آئکے (دساکن ریپگو) نے اُن قوانین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو سکسونیا میں رائج تھے اور اُس کا نام سکسونی آئینہ رکھا۔ کچھ زمانے بعد "سوابی آئینہ" شایع ہوا۔ انگریزی مترجم)

سے ریگنس برگ (Regensburg) کو اور کچھ دنوں بعد وہاں سے اشفین برگ (Aschaffenburg) کو تبدیل کر دیا گیا۔ وہ بھی اپنی رائن کے بائیں کنارے والی ارضیات کھو چکا تھا۔ ٹسکینی کے گرینڈ ڈیوک کو زالتس برگ کی اسقف عظمیٰ اور برشٹیسگاڈین کے صوبے کی جائدادیں عطا کی گئیں۔ بویریا کے پلٹینیٹ کو دیورتس برگ، بام برگ، فرائیزنگ آڈگس برگ، پساؤ وغیرہ کی اسقفی جائدادیں مل گئیں۔ پروسیا کو ہلڈیس ہائیم اور پادربورن کی جائدادوں پر قبضہ حاصل ہو گیا۔ بیڈن کو کونسٹانتس، اسٹراس برگ، اسپائیر، بازل وغیرہ کے حصے مل گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ان جائدادوں کا دنیاوی مصرف میں لانا شہنشاہی کے تاریخی حقوق کا توڑنا تھا، لیکن اس رائے عامہ کے تغیر اور آبادی کی ضروریات عامہ نے اس طریق عمل کو حق بجانب کر دیا کیونکہ رائے عامہ اب پادریوں کے اقتدار سیاسی کا تحمل نہیں کر سکتی تھی اور ضروریات عامہ کو دنیاوی حکومت کی حاجت تھی۔

(ب) ۱۲ جولائی ۱۸۰۶ء کے اتحاد رائن کی رو سے بہت سے دنیاوی رؤسا و امرا کا حالت محکومیت میں آ جانا۔

جاگیروں کے دنیاوی حیثیت میں تبدیل کرنے کے قانون کی طرح یہ محکومیت بھی زیادہ تر نپولین اور فرانسیسی انقلاب کے خیالات کے سبب سے عمل میں آئی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے جرمنیا کے سیاسی ارتقا کا ایک قدم آگے بڑھا دیا، جس میں چھوٹے چھوٹے امرا جا چکے تھے۔ بہتر "محکوم شدہ" رؤسا اور امرا اپنے ذاتی اقتدار اعلیٰ سے محروم ہو کر بڑے حکمرانوں کے تابع ہو گئے۔ تاہم انھیں زبردست عدالتی اختیارات اور بہت سے امتیازات اب بھی حاصل رہے۔ ان کی ریاستوں میں سے تیرہ ریاستیں بویریا کو، چھبیس ورٹیم برگ کو، نو بیڈن کو، سات ہیسے کو، سات نساؤ کو اور بارہ ہیسے کی گرینڈ ڈچی کو ملیں۔

کچھ زمانہ بعد باقی ماندہ رؤسا میں سے بھی بعض مثلاً نزالم اور ایرن برگ کے پرنس اور آریم برگ کا ڈیوک وغیرہ محکوم بنا لیے گئے یعنی دوسرے جرمانی رئیسوں کے تابع کر دیے گئے۔ بعض ریاستیں رجعت شاہی کے زمانے تک قائم رہیں اور نپولین کے محکوموں کی حیثیت میں آ گئیں۔

١٨٠٦ء

٦ اگست ١٨٠٦ء کو جرمانی شہنشاہی کے انتزاع نے شہنشاہی طبقے کی حیثیت سے ان امرا کے حقوق کا خاتمہ کر دیا۔

(ج) ٨ جون ١٨١٥ء کے جرمانی اتحاد نے ان خاندانوں کے شہنشاہی امتیازات کی یاد کو اس طرح تازہ کر دیا کہ انھیں حسب و نسب کے اعتبار سے اُن جرمانی حکمران خاندانوں کے برابر قرار دیا جنھوں نے شاہی اقتدار حاصل کر لیا تھا، اور اُن کے لئے چند اعزازات و امتیازات کا ذمہ لیا جن میں سے ایک یہ تھا کہ انھیں اپنے ملک کے ایوان اعلیٰ میں نشست کا حق دیا گیا۔ جرمانی اتحاد کے اراکین میں سے اولاً اڑتالیس پرنسی اور پچاس کاونٹی خاندان بحیثیت حکمران خاندانوں کے تسلیم کئے گئے تھے[۵۱] اُس وقت کے بعد سے اُن میں سے بعض خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا ہے، اور بہت سے خاندانوں کی جائدادیں جاتی رہی ہیں۔

اکثر سلطنتوں میں آئینی قانون کی جدید رفتار ان امرا کے موروثی حقوق کے لئے مضر تھی۔ ان قوانین کے مقابلے میں جو قانونی مساوات اور مرکزی انتظام پر زور دیتے تھے وہ اپنے مخصوص عدالتی اختیارات اور کوتوالی کی قوت کو زیادہ مدت تک برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ اور ١٨٤٨ء کے انقلاب کے بعد تو یہ بالکل ہی ناممکن ہو گیا۔ امرا خود اپنے جداگانہ اختیارات امارت سے دست بردار ہو گئے۔

١٨١٥ء اور ١٨٦٦ء

(د) ١٨١٥ء کے متفقی قانون کے بموجب چونتیس با اختیار جرمانی ریاستیں تسلیم کی گئی تھیں مگر اس کے بعد سے موت، دست برداری اور ضبطی کے ذریعے اُن میں بہت کمی آگئی۔

٧ دسمبر ١٨٤٩ء کو ہوہینت سولرن ہیشنگن اور ہوہینت سولرن زگمارنگن خاندانوں کے پرنسوں نے برضائے خود اپنے شاہی حقوق سے شاہ پروشیا کے حق میں دست برداری کر دی۔ شمالی جرمانی متفقیت کے قیام اور جنگ ١٨٦٦ء کی وجہ سے ہنوور کے شاہی خاندان ہیسے کے انتخابی خاندان اور نساؤ کے ڈیوکی خاندانوں کو اپنے حقوق شاہی کو پروشیا کے لئے چھوڑ دینا پڑا۔ جرمانی شہنشاہی میں اقتدار شاہی رکھنے والے مملکتی رؤسا کی موجودہ تعداد بائیس ہے۔

---

[۵۱] انگریزی ترجمہ میں "ایجاس پرنس، انچاس کاونٹ اور ایک بیرن" درج ہے۔

جدید طبقہ اعیان

لیکن اگرچہ قدیم مفہوم میں جرمانیا کے اندر شہنشاہی طبقۂ امرا کا خاتمہ ہوگیا ہے پھر بھی ممتاز خاندانوں کا ایک اعلیٰ طبقۂ اعیان اب بھی موجود ہے۔ اس میں کچھ تو پرانے شہنشاہی خاندان شامل ہیں اور کچھ ایسے نئے خاندان ہیں جو پرنس بسمارک کاونٹ مولٹکے وغیرہ کے مانند عالی مرتبت اشخاص کے خدمات عامہ کی وجہ سے عام طبقۂ اشراف سے سربلند ہو گئے ہیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ اس اعلیٰ طبقۂ اعیان کا انداز حریت پسندی کے بجائے قدامت پسندی کی طرف مائل ہے مگر ان کے خیالات میں خاص وسیع النظری موجود ہے اور اس لئے شخصیت کی تنگ خیالی و ذلت پسندی کے بجائے انھوں نے جرمانی شہنشاہی کے قومی ارتقا و عظمت کے متعلق کامل ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

تیرھواں باب

(ج) جرمانی طبقۂ امرا (۲) نائٹ

قدیم خاندانی امرا اور عام آزاد اشخاص کے مابین وہ لوگ تھے جو "شوابی اسپیگے" اصطلاح میں "مثل فرانکی" یعنی متوسط "آزاد" طبقے کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں جرمانیا کے جنوب میں فرانکی شاہی کے زمانے تک اُن کا نشان ملتا ہے مگر چودھویں صدی کے قبل تک وہ امرا میں شامل نہیں سمجھے جاتے تھے اور نہ عام اشخاص سے بالاتر اُنھوں نے فروتر طبقۂ امرا کی حیثیت پیدا کی تھی اس طبقے کے خاص عناصر حسب ذیل تھے:۔

فروتر طبقۂ امرا

(الف) آزاد اشخاص جو اسیسر کے عہدے کی قابلیت رکھتے تھے ابتداءً یہ وہ لوگ ہوتے تھے جو بڑی بڑی جائدادوں کے مالک تھے یعنی جن کے پاس تین سو ایکڑ یا اُس سے زیادہ زمین ہوتی تھی اور آزاد اشخاص میں زیادہ دولتمند اور زیادہ اہم ہونے کے سبب سے وہ اسیسر منتخب ہوجاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ عہدہ بھی مثل اور عہدوں کے موروثی ہوگیا اور عام آزاد کسانوں کے بہ نسبت یہ لوگ زیادہ مدت تک اپنی جائدادوں کو محصولات سے آزاد اور بیلفت (گماشتۂ شاہی) کے تحت اختیار میں آنے کے بجائے کاونٹ کے تحت اختیار میں رکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ بعد کو وہ نائٹ یا اراضی دار امرا کے طبقے میں جذب ہوگئے۔

(ب) امرا کے تابعین اور طبقۂ نائٹ کے امرا کے بعد وہ نائٹ جو اُس منصب کا نذرانہ ادا کرکے نائٹ بن جاتے تھے۔

(ج) بعد کو بہت سے نائٹ بغیر نذرانہ ادا کئے بھی اُس میں داخل ہوگئے ان میں سے زیادہ تر امرا کے تابعین کی اولاد میں سے تھے اور اُنھوں نے نائٹ کے مانند تعلیم پائی تھی لیکن بمرور ایام وہ سپاہی بھی اس میں شامل ہوگئے جنھیں شہنشاہ یا اُس کے

قائم مقاموں نے نائٹ کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔

(د) امرا کے کثیر التعداد حشم و خدم جو اکثر غلامانہ یا نیم آزادانہ طبقے سے نکلے تھے اور تیرھویں صدی تک ہیں یہ لوگ نسبتاً نائٹ سے بالکل علیحدہ تھے۔ یہ گروہ درباری خدمتوں اور عہدوں سے اور نیز اپنی بڑی بڑی جائدادوں اور شاندار طریق ماندوبود کی وجہ سے اس درجے تک پہنچا تھا، اولاً انھیں جاگیرانہ حقوق حاصل نہیں تھے مگر بتدریج وہ نائٹ کی سطح پر پہنچ گئے اور اسی فرقے میں جذب ہو گئے۔

(ہ) شہنشاہی کے بیشتر مگر صوبوں کے کمتر شہروں کے وہ شریف خاندان جو اصلاً اسیروں کے طبقے سے یا نائٹ کے اخلاف اور شہری حکومت میں اپنے کاموں کی وجہ سے ممتاز تھے وہ بھی اس زمرے میں داخل ہو گئے۔

اس کا موروثی ہو جانا۔ اس میں تفرد پسندی کا آجانا

جس طرح بلند تر طبقے میں ہوا اُسی طرح اُس فروتر طبقے میں بھی جائداد، سپاہیانہ زندگی، اور درباری خدمات سب امتیازات اصولِ وراثت کے سامنے دب گئے اور اس طرح امرا کی ایک کثیر تعداد ایسی پیدا ہو گئی جس کے پاس امارت کا کوئی حق ایک پرانے خاندانی شجرے کے سوا اور کچھ نہ تھا اسی کے ساتھ ہی عام آزاد اشخاص اور کسانوں کے طبقے کے ساتھ ان کی روش میں خاص اسی وقت اور زیادہ تفرد پسندی آگئی جبکہ اُن کا فرق وامتیاز حقیقی معنی میں ناپید ہوتا جا رہا تھا، اس طرح شاندار خطابات کا شوق اچھی طرح پورا ہو گیا اس فرقے سے بیرنوں بلکہ کاؤنٹوں اور پرنسوں تک کی ایک کثیر جماعت پیدا ہوئی جنھوں نے اپنے خطابات باقاعدہ عطیے سے یا غصب سے حاصل کر لیے تھے مگر فی الواقع اُن میں ان خطابات کی اہلیت مطلق نہ تھی۔

جرمانیا میں ملکی اور قومی عہدوں کے ذریعے سے طبقۂ امرا کو کبھی وہ عروج نہیں حاصل ہوا جو اُسے فرانس میں حاصل ہو گیا تھا۔ موروثی اصول کا صرف ایک استثنا علمائے قانون کے علمی طبقۂ امرا کا تھا لیکن سندات کے ذریعے سے امرا کے قیام کی فرانسیسی شکل کو قبول کرنے میں جرمانیا نے بہت آمادگی دکھائی۔

ان کی محدود آزادی

شہنشاہی کے نائٹوں نے جابجا اپنی جاگیروں میں ایک معقول حد تک آزادی حاصل کر لی تھی، مگر مجموعتہً امرا کے اس فروتر طبقے کو کسی قسم کا ملکی اقتدار شاہی یا شہنشاہی طبقات میں انھیں کوئی جگہ حاصل نہیں تھی البتہ جاگیردارانہ قانون میں انھیں دخل حاصل تھا

اور اماکن مذہبی اور اوقاف میں اُن کے بعض خاص امتیازات تھے اُن میں سے بعضوں کو بیلیف (گماشتۂ شاہی) اور مملکتی امرا کے عدالتی حقوق حاصل تھے جو اُنھیں اُن کی مخصوص جائداد کے ساتھ وراثتاً ملتے تھے ۔

آخری امر یہ ہے کہ وہ اپنے ملک (کی مجلس) کے طبقات کے ساتھ نشست کا حق رکھتے تھے اور دربار کے طبقۂ امرا میں داخل تھے ۔

سولھویں صدی کا وسط اُس کا زوال ۔

اس فرقے کی طاقت تیرھویں صدی کے بعد اپنے اوج کمال کو پہنچ گئی تھی اور سولھویں صدی کے وسط تک اس کی یہ حالت برقرار رہی مگر اُس کے بعد سے اقتصادی، فوجی، معاشرتی، اور سرکاری تعلقات کے ناقابل مقاومت انقلابات کے سبب سے وہ زوال پذیر ہونے لگی اور جنگ سی سالہ نے اُس کی تباہی کو مکمل کر دینے میں مدد دی ۔

جرمانیا میں آج امرا کا فروتر طبقہ ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے شہنشاہی تنظیم کے اعلیٰ طبقۂ امرا کی بہ نسبت بہت زیادہ ابتر ہو گیا ہے اُس کو متزلزل کرنے والے بہت سے اسباب جمع ہو گئے تھے جاگیر دارانہ بندش کمزور ہو گئی اور سلطنتوں کا جاگیر دارانہ رنگ اور جاگیری نظام حکومت جاتا رہا فوجوں کی حالتوں میں انقلاب ہو گیا سرکاری عہدے موروثی نہیں رہے، شہری خاندان اعلیٰ مدارج پر ترقی کر گئے قدیم جرمانی شہنشاہی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ریاستی تنظیمات میں ترقی ہو گئی نیز زیادہ قریبی زمانے کے کثیر التعداد تغیرات نے نیچے اور اوپر دونوں طرف سے عمل کر کے بہت سے امتیازات کو یکے بعد دیگرے اور کبھی مجموعۃً منسوخ کر دیا جس طرح پہلے فرانس میں ہو چکا تھا اب جرمانیا میں بھی طبقۂ سوم (یعنی عوام کا طبقہ) امیروں کے امتیازی حقوق کا روادار نہیں رہا بلکہ سرے سے اسی بات سے منکر ہو گیا کہ طبقۂ امرا کے قیام کی ضرورت بھی ہے ۔ امیروں کی ساری اولاد اور نسل کے لئے امتیازات کو غیر محدود وسعت دے دینے سے امارت کے دعاوی اور اُن کے واقعی حالات کے مابین جن کی بنا پر وہ قائم تھے نمایاں تضاد واقع ہو گیا اور شہریوں کے اعلیٰ طبقے سے اُن کا مقابلہ کرنے کے سبب سے ان میں ابتری اور بھی بڑھ گئی اور مخالف میں اور زیادتی ہو گئی مشترکیت رائن کے حکمرانوں کی جوع الارض کا مقابلہ جب شہنشاہی کے نیچے درجے کے حکمران نہ کر سکے تو شہنشاہی کے نائٹ کس شمار میں تھے ۔ اُن کی جائدادیں اُن حکمرانوں کی مملکتوں میں شامل کر لی گئیں ۱۸۱۵ء کے عہد نامۂ مشترکیت کا میلان اس جانب تھا کہ اُن کے خاندانوں کی

ایک ممتاز حیثیت قائم ہے نیز حکومت کا استقلال، صوبوں کے طبقات میں نشست، اعلیٰ عدالتی اختیارات اور سرپرستی کے حقوق، جنگلوں پر اقتدار، اور دربار وں میں ایک ممتاز حیثیت یہ سب باتیں انھیں حاصل رہیں، مگر یہ ساری بیوند کاری بیکار رہتی تھی قانون عامہ کے جدید تخیل کے لئے موروثی اختیار عدالت ایسا ہی ناقابل برداشت تھا جیسے ادائی محاصل سے بری رہنا۔

عام طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جرمانیا کے امرا کا یہ فرد تر طبقہ اب قانوناً کسی قسم کے خاص حقوق نہیں رکھتا، سیاسی شہنشاہی تنظیم کی حیثیت سے اس کی ہستی فنا ہو گئی ہے۔ اپنے نام اور نشانات کے سوا، قدیمی عظمت کی جو یادگاران کے پاس رہ گئی ہے اور جو کبھی کبھی عمل میں آجاتی ہے، اس میں اب محض قدامت پسندی کی شان باقی رہ گئی ہے مگر اب بھی ملکتی امرا اور اُن سے کمتر درجے میں دربار کے وہ امرا جو صاحب جائداد نہیں ہوتے دونوں سوسائٹی میں ایک خاص منزلت رکھتے ہیں اور بالواسطہ حکومت کے طرز عمل اور سرکاری تقررات پر معقول اثر ڈالتے ہیں۔ اعلیٰ فوجی عہدے درباری مناصب اور سفارت کی خدمات پر لازماً نہیں بلکہ بیشتر اسی طبقے کے لوگ مقرر ہوتے ہیں۔

جرمن طبقۂ امرا بحالت موجودہ

محض خطابی امرا ازدواج اور مشاغل کی وجہ سے معاشری و سیاسی دونوں اعتبار سے اعلیٰ شہری طبقے میں جذب ہو گئے ہیں۔ جرمانیا کے طبقۂ نائٹ کے حب قوم اور وطن پرستی کی تاریخ انگریزی طبقۂ اعیان کی تاریخ کی مثل نہیں ہے۔ صاحب ریاست امرا کے ایک بڑے حصے نے زمانۂ جدید کے خیالات اور اصلاحات کا ایک مدت تک سخت مقابلہ کیا۔ اس میں بعض امرا جن کو ازمنۂ وسطیٰ کی کیفیات کے ساتھ ایک افسانہ وار الفت تھی وہ قوم کی آزادی کی بہ نسبت مطلق العنان شاہی کی خدمت کے لئے زیادہ آمادہ تھے یہی وجہ ہے کہ جرمانی طبقۂ امرا اُس قدر ہردلعزیز نہیں ہے جس قدر انگریزی طبقۂ امرا ہردلعزیز ہے۔ فرانس کے اُن امرا کی طرح جو خاندان بار بن کے مؤید ہیں جرمانیا کے امرا کو بھی عوام اکثر شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تاہم اُنھوں نے بہت سے روشن خیال افراد اور ممتاز محبان وطن پیدا کئے ہیں، فوج کے بہترین رہبر انھیں میں سے نکلے ہیں اور قومی ترقی کے خطرۂ عظیم کے وقت اصلاح کے لئے جد وجہد کرنیوالوں کے بیشتر و اسی طبقۂ امرا میں سے ہوئے ہیں ایک تنظیم کی حیثیت سے جرمانی طبقے کی اصلاح

اس کی اصلاح

سکے متعلق حال میں بہت کچھ بحث ہوئی ہے مگر اس کے بہترین موقع یعنی ۱۸۵۲ء و ۱۸۶۰ء کے درمیانی زمانے میں اس امر پر خیال نہیں کیا گیا۔ اصلاح کی کوشش سے صرف اتنا ظاہر ہوا کہ اس طبقے کے اراکین پر مجبان اصلاح کا کس قدر کم اثر ہے اور ان کا گروہ ہر طرح کے کامل اور موثر تغیر کے کس قدر مخالف ہے۔

جرمانی شہنشاہی کے قیام سے اب امکان پیدا ہوتا ہے کہ ایک نئی ترتیب پائی ہوئی قومی جماعت اعیان پیدا ہو جائے اور اس جماعت سے قدیمی طبقۂ امرا کے بے جان و بے مصرف اعضا کو بلا رو و رعایت خارج کر کے صرف اُن کے مفید اجزا باقی رکھے جائیں اور ان میں دوسرے ایسے اجزا شامل کئے جائیں جن میں جدید خیالات موجود ہوں۔ ایک قومی آزاد اور تعلیم یافتہ طبقۂ اعیان کا ہونا جرمانیوں کی عظیم الشان قوم کی ضروریات زندگی میں داخل ہے اور جس حالت میں کہ عمومی گروہوں کا پلہ اس قدر بھاری ہوتا جارہا ہے ایسا ضروری ہے کہ امرا کے اوصاف پر اُن کی تعداد سے زیادہ لحاظ کیا جائے اس طرح کا صاف شدہ طبقۂ اعیان ایک درمیانی درجہ پیدا کرے گا اور وہ ازسرتاپا موروثی اصول میں غرق اور اس اصول کے غیر محدود غلبے کا تابع نہ رہے گا شخصی امارت کی عزت افزائی کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی نسلی امارت کی عزت افزائی کی ضرورت ہے۔ ایک امیرانہ نسل جو اپنی سوسائٹی کی بنیادوں سے جدا ہو جائے وہ ایک وقت میں شرافت کو بھی کھو بیٹھے گی۔

تعلیق ا۔ ریل (Riehl) نے اپنی کتاب "شہریوں کی معاشرت" (Burgerliche Gesellschaft) (مطبوعہ ۱۸۵۱ء) میں جرمانی طبقۂ اعیان کی معاشرتی اہمیت کی خوب ہی تصویر کھینچی ہے۔ طبقۂ اعیان کو معاشرتی حیثیت اس وقت تک حاصل ہے اور اس کی بجائے خود ایک قدر و قیمت ہے مگر سیاسی عضو بندی کے بغیر نہ وہ مستقل ہو سکتی ہے اور نہ پوری طرح موثر ہو سکتی ہے معاشرتی گروہوں کی حیثیت سے یہ طبقات اولاً عضوی اور پھر حقیقتہً سیاسی طبقات کی محض بنیاد ہیں۔

تعلیق ۲۔ جرمانی صفات سلطنت (جلد صفحہ ۳۰ وغیرہ اور صفحہ ۵۰ وغیرہ) میں میں نے اپنے تجاویز اصلاح کی بنا ساکت اور عامل طبقۂ امرا کے فرق پر قائم کی ہے اول الذکر نسب سے حاصل ہوتا ہے اور وہ محض بے جان ہے۔ ثانی الذکر شخصی تفوق سے رونما ہوتا ہے

اور اس میں نام کے بجائے واقعیت سے کام پڑتا ہے اس کے بعد مجھے افسوس کے ساتھ یہ پتا چلا کہ اب سے تین پشت قبل جسٹس موسیٹر (Justus Mosor) اپنی کتاب خیالات وطن پرستی" (Patriotische Phantasien) ج ۴ ص ۱۷۷۴ء میں اس خیال کو بیان کر چکا ہے مگر نتیجہ یہی ہوا کہ کسی نے اس پر توجہ نہ کی۔ دیکھو میری تاریخ علم السیاست" (Geschichte) de Staatswissenschaft صفحہ ۴۲۳

چودھواں باب

(ج) شہریوں کا طبقہ

یورپ کا شہری طبقہ اگرچہ امرا کے فرو تر طبقے کے بعد ظہور میں آیا مگر ازمنہ وسطیٰ ہی میں وہ اپنے ذاتی سیاسی حقوق کے اعتبار سے ایک قومی طبقہ بن گیا تھا اس کی اصل بنیاد ان آزاد اشخاص کا قدیم طبقہ موروثی ہے جو اولاً مختلف جرمانی قبائل یا اقوام میں اصلی قبیلے کی حیثیت رکھتے تھے مگر آزاد نشوونما انھیں شہروں ہی کے حدود کے اندر اور شہروں ہی کے قانون و نظام حکومت کے تحت میں حاصل ہوئی۔

دیہات میں زرعی غلامی کا میلان

ازمنہ وسطیٰ کا دور عمومی آزادی کے لیے مطلقاً ناموافق تھا۔ مذہبی خاندانی اور اعیانی طبقات کو تسلط حاصل تھا، اور یورپ میں تقریباً ہر جگہ آزاد مالکان اراضی جاگیری امیروں اور شاہی ناظموں کے پنجے میں گرفتار تھے۔

کارل اعظم کے پُر زور قوانین نے بدترین مظالم کو تو روکا مگر خرابی کی ترقی کو بند نہ کرسکا فرانکی شاہی میں زراعت پیشہ آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جو اپنی نسلی آزادی کی بنا پر کھرے جرمانی قبیلوں میں شامل تھا، شاہی یا کلیسائی جاگیروں پر یا ملکتی امرا کی زمینوں پر اس طرح آباد ہو گیا کہ وہ اپنی خاص مملوکہ زمین کی کاشت نہیں کرتا تھا یا مذہبی جذبات یا کسی خاص ضرورت کے باعث اپنی جائداد گرجاؤں اور خانقاہوں کو ہدیتہً دے دیتا اور پھر مستاجرانہ انھیں واپس لیتا تھا اس طرح یہ لوگ جاگیرداروں کے متوسلوں میں داخل ہو گئے پس اُن کی حیثیت زرعی غلاموں کی سی ہو گئی اور وہ اپنے بہت سے آزادانہ سیاسی حقوق سے محروم ہو گئے۔ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد چھوٹی چھوٹی جاگیریں جو آزاد مزارعین کی ملکیت رہ گئی تھیں وہ بھی شاہی ناظموں کے عدالتی اقتدار اور حکمران طبقۂ اعیان کے عاید کئے ہوئے بار سے نہ بچ سکیں۔ فوجی نظام میں جب قدیم اصول کے بجائے جس کے بموجب نائٹ اور جاگیردار فوجی خدمات انجام دیتے تھے اجیر سپاہیوں کا طریقہ رائج ہوا تو آزاد کسان اپنی جنگی قابلیت اور سپاہیانہ

اعزاز سے محروم ہو گئے اُن پر ہر صورت اور ہر حیلے سے محصولات عائد کئے جاتے تھے اور اکثر ان محصولات کی کوئی وجہ مُوجب بھی نہیں ہوتی تھی۔ عدالتوں میں اور اُس سے بھی زیادہ ملک کی سیاسی جماعتوں میں اُن کی وہ حیثیت باقی نہ رہی جو قدیم جرمانی آئین حکومت نے اُن کے لئے محفوظ کر دی تھی۔ آزاد مالکان اراضی بھی محصلین کے حلقہ اثر کے اندر داخل ہو جانے کے سبب سے بتدریج غلام کاشتکاروں کے درجے پر اتر آئے اور دونوں پر کسان کے عام لفظ کا اطلاق یکساں طور پر ہونے لگا۔

اس طرح جو طبقہ پہلے موروثی تھا وہ اب ایک پیشہ ور طبقہ بن گیا اور کسانوں کے سیاسی حقوق بہت بڑی حد تک گھٹا دیے گئے۔ صرف معدودے چند آزاد کسان جن میں زیادہ تر بڑے بڑے مالکان اراضی تھے ترقی کر کے نائٹ کے نئے طبقے میں شامل ہو گئے تھے صرف مستثنیات کے طور پر، موافق حالات میں آزاد اشخاص کی بعض منفرد جماعتوں کو اس قدر کامیابی ہوئی کہ وہ اپنی مالکانہ آزادی اور اپنے سیاسی امتیازات کو ازمنۂ وسطیٰ کے آنے والے خطرات سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس کی ایک بہت ہی نمایاں مثال اشوائنس کی دیہاتی جماعت ہے جس سے سوئٹزرلینڈ کی آزادی میں ایک حرکت پیدا ہو گئی اور اسی لئے وہ اشوئتسی آزادی کے نام سے موسوم ہوئی۔

شہروں کے اندر آزادی

اس طرح دیہاتوں میں تو قدیمی آزادی دبا دی گئی مگر اس اثنا میں شہر ایک نئی بلدی آزادی کا مسکن بن گئے تھے۔ آزادی و شہریت کے موجودہ خیال کے نشو و نما پر شہروں کی تاریخ نے ایک قطعی اثر ڈالا ہے۔ قومی حیثیت حاصل کرنے کے قبل یہ دونوں خیال بلدی ہی حیثیت رکھتے تھے شہر کے اندر شہریت کا خیال پیدا کرنے کے لئے صدیاں صرف ہو گئیں اور اس کے بعد کئی صدیاں درکار تھیں کہ یہ خیال سلطنت کی وسیع شہریت کی شکل اختیار کرے۔

اپنے تنوع اور تفرق کی وجہ سے (جو رومانی اور اُس سے بھی زیادہ ٹیوٹنی کے اجزاء امتزاج کا نتیجہ تھا) اولاً صاحب امتیاز طبقات شہروں کی زندگی پر اثر انداز ہوئے جہاں ایک تنگ حد کے اندر زیادہ آبادی واقع ہوئی تھی وہاں پر یہ تنوع زیادہ نمایاں تھا۔

شہروں کی آبادی

اکثر شہر پناہ کی دیواروں کے حلقے کے اندر ذیل کی مختلف الکیفیت آبادیاں پائی جاتی تھیں۔

(۱) مذہبی پرنس اپنی درباری شان اور اپنے خاص شاہی حقوق کے ساتھ اور انھیں کے ساتھ اساقفہ اور خانقاہوں کے روسا۔

(۲) ہر حالت اور ہر درجے کے ادنیٰ طبقے والے اہل کلیسا۔

(۳) اعلیٰ طبقے کے دنیاوی امرا شلاً شاہی کاونٹ یا اعلیٰ بیرن۔ اطالیا کے سردار جو زیادہ تر دیہاتوں میں رہتے تھے اور اگر ان کے خاص محل شہروں میں نہیں ہوتے تھے تو محض عارضی طور پر وہاں قیام کرتے تھے۔

(۴) نائٹوں کے خاندان جن کی جاگیریں اکثر دیہاتوں میں ہوتی تھیں۔

(۵) مذہبی اور دنیاوی امرا کے حشم و خدم۔

(۶) آزاد متوسطین۔

(۶ الف) اطالیا اور فرانس کے رومی شہروں میں زیادہ تر یہ لوگ ان رومی سپاہیوں کی اولاد سے تھے جو دس شخصوں پر سردار ہوتے تھے اور شہر کے اندر جائداد رکھتے تھے۔

یا (ب) جرمانی آزاد اشخاص جو شہر کے اندر خود اپنی زمین پر آباد اور اپنی جائداد اور سیاسی وقعت کے اعتبار سے ذی امتیاز تھے۔

(۷) معمولی آزاد اشخاص جو ہنوز شہر کے اندر زمین پر قابض تھے۔

(۸) وہ اشخاص جو شخصی حیثیت سے تو آزاد تھے مگر شہر کے اندر امرا کی زمینوں پر رہتے تھے اور اس لئے جاگیرداری قوانین مثلاً قواعد خانقاہ وغیرہ کے تابع تھے۔

(۹) مختلف امرا کے ادنیٰ خدام کا جم غفیر۔ ان کی حالتیں نہایت مختلف تھیں

(الف) بعض بہ حیثیت اہل حرفہ کے آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

(ب) بعض خدمتگاروں لازموں وغیرہ کی حیثیت سے کسی خاندان کے تابع ہوتے تھے۔

شہری طبقے کی ترقی۔

نظام ازمنۂ وسطیٰ کے ان عناصر کے ایک شہر کے اندر مجتمع ہوجانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ زمانہ گذرنے پر ان کی ایک دوسرے سے علحدگی رفع ہوگئی اور ایک نیا اجتماع پیدا ہوگیا معاشرت اغراض اور حوادث زمانہ نیز فریقانہ جد و جہد کے اتحاد نے ان میں زیادہ قریبی ربط پیدا کردیا اور ایسے نئے اختلافات برپا کردئے جو پیدائشی

اصول سے متعین نہیں ہوتے تھے۔

شہریت کے آئینی نظام کے ساتھ ساتھ نئی انجمنوں اور مجلسوں کا ظہور ہوا جن میں مختلف طبقات ایک نئے اتحاد کے دائرے میں داخل ہوئے۔ مختلف مقامات و اوقات کے حالات سے طریق عمل میں اختلاف پیدا ہوا مگر اصلاً وہ طریق عمل ہر جگہ اور ہر وقت میں ایک ہی رہا۔ اس ارتقا میں زیادہ اہم مدارج حسب ذیل تھے۔

لمبارڈی وغیرہ میں کونسلوں (مجالس کا عروج۔

(۱) کسی شہر میں مدنیت کے حقوق رکھنے والے شہریوں کی آبادی کا بڑا اور اہم حصہ نائٹوں اور کارکنوں اور آزاد متوسطین کے وہ ممتاز خاندان تھے جنھوں نے مجالس (کونسلوں) کے مشیروں (یا کارکنوں) کی حیثیت سے یہ کوشش کی کہ خود اُن کی آزادانہ حالت برقرار رہے۔ شہر کے قدیم امرا کے حقوق امارت کو اُنھوں نے محدود کردیا۔ پھر عام آزاد اشخاص کے شمول سے یہ جتھا اور بھی وسیع ہوگیا[۱] اور قدیم اعیانی خاندانوں اور آزاد شہریوں کے نوخیز اور سبقت جو طبقات میں نئی مخالفتیں پیدا ہوگئیں۔ چنانچہ گیارھویں صدی کے وسط کے قریب میلان میں قانون دانوں، طبیبوں، ساہوکاروں، تاجروں کا ایک سیاسی گروہ موٹا (Motta) کے نام سے پیدا ہوگیا۔ اس میں نائٹ خاندانوں کے وہ لوگ بھی شامل ہوگئے جن کی معاشرت نائٹوں کے مانند نہیں رہی تھی، لہذا ان لوگوں نے عوام کے نام سے امرا کی مخالفت کی اور بارھویں صدی میں اُن کے پہلو بہ پہلو مجلس عظمیٰ[۱] میں جگہ حاصل کرلی اور اس طرح شہر کی مجلس عام کی بنا پڑ گئی۔

قنصلوں کی صورت میں شہری حکام کا ظہور میں آنا شہر کے اعلیٰ طبقات کے باہم مخلوط ہونے کا پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد مجالس عظمیٰ کا صورت پذیر ہونا اور رئیسوں کے نام کا نکلنا ایک لازمی امر تھا۔ سب سے آخر میں گلڈ (مجلس امداد باہمی) رونما ہوئی اور اس طرح بتدریج قدیم و محدود الاثر سوسائٹیاں (جماعتیں) شہریت کے زیادہ وسیع حلقے میں داخل کرلی گئیں۔

---

[۱] دیکھو سوینی کی کتاب "رومی قانون کی تاریخ ازمنۂ وسطیٰ میں" جلد ۲ صفحہ ۱۰۸ وغیرہ؛ لیئو کی "تاریخ ایتالیا" جلد ۱ صفحہ ۲۹۹؛ ہے گل کی کتاب "شہروں کا آئین اتالیا میں" جلد ۲ صفحہ ۲۱۳ وغیرہ۔

بہ ترتی سب سے پہلے لومبارڈی میں نظر آئی یہاں معاشرت اور آزادی کے متحد کرنے کا ٹیوٹنی میلان روما کی قدیم یادوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ یہاں سے بارھویں اور تیرھویں صدی میں یہ تحریک جنوبی فرانس کے شہروں میں پہنچی۔ یہاں اسے قدیمی آزاد بلدی شہریت سے جس کی نمائندگی منتخب نائبین کرتے تھے (اور جو لومبارڈی کے بہ نسبت فرانس میں زیادہ پست حالت میں آگئی تھی) خاص تائید حاصل ہوگئی۔

فرانس کے کمیون

(۲) اس سے زیادہ قطعی جمہوری خصوصیت اور مجتمعہ شکل ان کمیونوں کے اندر شہریوں کے ان اشتراکیات میں پائی جاتی ہے جو اس زمانے میں شمالی فرانس میں شہروں کے امرائے ساتھ خونریز جنگ میں مشغول تھیں۔

گلڈ یا مجالس امداد باہمی

یہاں حقوق شہریت کے نئے عناصر بالتخصیص گلڈ کی صورت میں نظر آتے ہیں کیونکہ حقوق شہریت کا راستہ اسی گلڈ میں داخل ہونے سے مل سکتا تھا جس کے ساتھ قواعد کی اطاعت کا حلف بھی اٹھانا پڑتا تھا۔ اس طرح مدنی آزادی اور مدنی حقوق محض پیدائش یا ملکیت اراضی سے علیحدہ ہوگئے تھے اور اس کے بجائے ایک مجمع اتحاد پر زور دیا جاتا تھا۔ جاگیردارانہ اصول اور قدیمی ٹیوٹنی امتیاز نے ایک جدید اور شخصی اصول کے لئے جگہ خالی کردی تھی۔

مزید برآں مجالس شہری کا نظام شہر کی آبادی کے طبقۂ اسفل میں آزادی و حقوق شہریت کو وسعت دینے کے لئے زیادہ مفید تھا۔ اہل حرفہ کا گروہ عظیم جو حالت غلامی سے آزاد ہوگیا تھا اس سوسائٹی میں داخل ہوگیا اور یہ اصول قائم ہوگیا کہ جو سرف (زرعی غلام) شہر میں ایک برس اور ایک دن رہ جائے اور اس کا مالک اس کا دعویدار نہ ہو نہ اس کی جستجو کی جائے وہ آزاد ہوجائے گا۔ تمام یورپ میں شہری قانون اس اہم اصول کا شاہد ہے کہ شہر کی ہوا انسان کو آزاد کردیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شہروں کے اندر عمومیت کے مبالغے اور حد سے تجاوز کرجانے کے باعث سے اکثر رجعت قہقری پیدا ہوگئی۔ جن بادشاہوں نے اپنے امرا کی ملکیت سے شہروں کے آزاد کرنے میں مدد دی تھی انھوں نے اب شہروں کی حکومت اپنے عمال کے توسط سے خود اپنے ہاتھ میں لے لینے کا موقع نکالا اور اسے اور سخت کردیا۔ اس طرح چودھویں صدی کے اوائل میں لومبارڈی کے بہت سے شہروں کی حکومت خوداختیاری جاتی رہی اور

وہ خاص خاص حکمرانوں کے قبضے میں آگئے۔ تیرھویں صدی میں عوام کے نئے شہری گروہ نے (جس میں زیادہ تر شہری آبادی کے ادنیٰ افراد شامل تھے) اپنے جمہوری سرداروں کے تحت میں حصول تفوق کے لئے شہری امرا سے جنگ شروع کردی تھی اور اکثر اُنھیں بے بس کر کے شہر سے خارج کردیا تھا۔

فرانس میں اُن شہروں کے پہلو بہ پہلو جن میں قنصلی اور کمیونی نظام حکومت رائج تھا بہت سے شہر ایسے تھے جو امرا کے تحت میں رہ گئے تھے اور ان پر انھیں امرا کے عامل حکمراں تھے اور اکثر بہت ہی خودرائی سے حکومت کرتے تھے تاہم ان شہروں میں بھی غلامی کے بوجھ برطرف یا بہت ہلکے کردیئے گئے تھے اور اہل شہر کی ایک آزاد جماعت ہونے کا خیال ترقی کر گیا تھا اور ہر شخص شہر میں سکونت اختیار کرنے اور شاید شہری حقوق کے شاہی عطیے کے ذریعے سے بھی اس جماعت میں داخل ہوسکتا تھا۔

جرمانیا میں حق شہریت

(۳) جرمانیا میں بھی لفظ بورگر (شہری) کے مختلف معنی اس خیال کے مختلف مدارج ارتقا کو ظاہر کرتے ہیں۔

جیسا کہ اطالیا اور فرانس میں قبل ازیں ہوچکا تھا جرمانیا میں بھی تیرھویں صدی تک یہ دستور تھا کہ نائٹ اور شہری میں فرق کیا جاتا تھا۔ آخرالذکر سے وہ آزاد اشخاص مراد ہوتے تھے جو شہری سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے اور شہر کی مجلس کے لئے منتخب ہوسکتے تھے مگر وہ نائٹوں کی سی زندگی نہیں بسر کرتے تھے اس جماعت شہری کی بنا شہر کے وہ آزاد مکاندار تھے جو شہر کے اسیسر اور رکن مجلس ہونے میں بالعموم اُن خاندانوں کے شریک تھے جن کا نسب نائٹوں سے ملتا تھا یہ دو جماعتیں یعنے نائٹ اور شہری مجموعۃً کامل الحقوق شہری یا مثل "اہل خاندان" کے سمجھے جاتے تھے اور اہل حرفہ اور شہر کے دوسرے باشندوں سے متائز تھے۔

آزاد مکاندار

تجار

تیرھویں صدی حفاظت تجارت کے لئے بڑے بڑے "شہری اتفاقات" کے قیام کا زمانہ تھا معلوم ہوتا ہے کہ اسی صدی کے وسط کے بعد بہت سے جرمانی شہروں میں تجار ملکیت اراضی سے قطع نظر اپنی ذاتی آزادی کی بنا پر شہری تسلیم کرلئے گئے تھے اور شہر کی مجلس میں اُنھیں حق نیابت حاصل ہوگیا تھا۔

اس طرح ایک حد تک شہریت کا خیال اراضی کے تعلق سے علٰحدہ ہوگیا تھا اور

پیشے اور ذاتی اتحاد و روابط کو زیادہ نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ جب چودھویں صدی کے اوائل میں اہلِ حرفہ کی جماعتوں کا بہ حیثیت مجموعی ایک جدید رکن کے طور پر شہری گروہ میں شامل کرنا عام ہوگیا، تو اس میلان کو نئی قوت حاصل ہوگئی۔ اس طرح لفظ "شہری" (Burger) کے معنی زیادہ وسیع ہوگئے۔ اس زمانے کے بعد سے یہ لفظ باقاعدہ ان تمام افراد پر عائد ہونے لگا جو شہر اور اس کی جماعتوں کی زندگی میں شریک تھے۔ شہریت کے معاملے میں غلامی کا جہاں تک تعلق تھا وہ شہریت سے منسوخ کردی گئی۔ نسب کے امتیازات میں بہت بڑی ترمیم و تخفیف ہوگئی جاگیردارانہ قانون کی جگہ شہری قانون نے لے لی، یہ قانون عام اور شخصی تھا اور اس طرح تمام ساکنین شہر کا اپنے شہر کے ساتھ بلاواسطہ تعلق پیدا ہوگیا۔

ذاتی آزادی کی یہ شہریت جسے کبھی کم کبھی زیادہ حکومت خود اختیاری کی طاقت حاصل ہوجاتی تھی، وہ شہری اغراض کے اندر بھی ایک درجہ تک مختلف نظامہائے حکومت کے جزئیات، شہری تاریخ اور اس کے حالات کے لحاظ سے مختلف تھے۔

بعض شہروں کے ملکی اقتدار شاہی کے تحت میں تھے اور اس وجہ سے صوبجاتی شہر کہلاتے تھے۔ بعض نے اپنی مجالس کے لیے شاہی حقوق حاصل کرلئے تھے اور اس طرح وہ شہر خود ہی اپنی حاصل کی ہوئی امارت کے اور قرب و جوار کے دیہاتوں کے گویا ملکتی بن گئے۔ چونکہ شہنشاہ اور شہنشاہی سے اُن کا بلاواسطہ تعلق تھا اس لئے وہ شہنشاہی شہر کہلاتے تھے۔

سولھویں صدی تک جرمانی شہروں میں بدستور تمول، تہذیب اور خوشحالی کا دور دورہ تھا، اس عہد کی عمارتوں کی وہی شہرت ابتک قائم ہے جو ماکیا ویلی کے زمانے میں تھی، مگر جنگ سی سالہ نے شہروں کی طاقت خوشحالی کو تباہ کردیا اور وہ مبتذل اور پست حالت میں گر گئے جس سے نکلنے کے لئے انھیں ایک صدی تک مصیبتیں اٹھانا اور جد و جہد کرنا پڑی۔ صوبجاتی شہروں کی حیثیت صوبجاتی طبقات میں فنا ہوگئی اور شہنشاہی شہروں میں بھی کچھ یوں ہی سا آزادی کا پرتو باقی رہ گیا۔ شہروں نے مضطربانہ طور پر خود کو دیہات سے منقطع کرلیا، وہ مفلس و مفلوک ہوگئے اور تنگ دل و ذلیل علیحدگی کے خیال کے شکار ہوکر رہ گئے۔

(۴) ازمنہ وسطیٰ کے شہری طبقے کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

اہلِ حرفہ

ذاتی آزادی اور شہریت

صوبجاتی اور شہنشاہی شہر

شہروں کا زوال

ازمنہ وسطیٰ کے شہری طبقہ کی خصوصیات

(الف) پادریوں اور امیروں کے مانند یہ کوئی امتیازی فرقہ نہیں ہے بلکہ ایک قومی طبقہ ہے۔ اپنے شہری تعلق اپنی تعلیم و تربیت اپنی آزادی اور اپنے قانون کے سبب سے یہ طبقہ کسانوں سے ممتاز ہے۔

(ب) باوجود خاندانوں کی تاریخی مخالفتوں کے اور نسل و پیشہ کے اختلافات کے شہری جماعت اپنے تئیں ایک متحد و یکرنگ طبقہ سمجھتی ہے۔ یہ طبقہ شہری آزادی کا اور قانون کی نظر میں سب کی مساوات کا محافظ سمجھا جاتا ہے۔ وہ شہر کے ایک ہی شہری قانون کے تحت میں زندگی بسر کرتا ہے اور نظام حکومت کے لئے آزادانہ نظام کو مرتب رکھتا ہے اہل شہر اپنے شہر کے فرزند اور اس کی عام زندگی کے شریک کار ہیں۔ شہر کی سیاسی اور معاشرتی زندگی ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔

طبقۂ سوم

(ج) لیکن اس سے زیادہ یہ کہ ازمنۂ وسطیٰ میں شہری طبقے نے ایک ایسی سیاسی وقعت اور اہمیت حاصل کرلی تھی جو کسی ایک منفرد شہر کے حدود سے متجاوز تھی اور جس نے متعدد شہروں کے باشندوں کو ایک مشخصہ طبقے میں گھیر لیا تھا اس نئی ترقی کا اظہار ازمنۂ وسطیٰ کے صوبجاتی اور شہنشاہی طبقات کی نظم و ترتیب سے ہوتا ہے تیرھویں صدی کے وسط سے انگریزی شہروں کے باشندوں نے اولاً نائٹوں سے الگ اور بعد کو ان کے ساتھ شریک ہوکر قومی پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق حاصل کرلیا تھا فرانس میں اہل شہر ہی کے قائم مقاموں سے طبقۂ سوم بنتا تھا۔ اولاً وہ وقتاً فوقتاً علیحدہ طلب کیا جاتا تھا مگر چودھویں صدی کے آغاز سے طبقات عامہ میں وہ بھی شامل کردیا گیا۔

جرمانیا میں شہنشاہی ڈائٹ کے اندر شہروں کی نشستیں (خاندان ہاپسبرگ شہنشاہ روڈولف تخت نشین ہونے کے بعد سے ایک حد تک شہری طبقے کی قائم مقام ہوگئی تھیں اور صوبے کی ڈائٹوں (کونسلوں) میں امیروں اور پادریوں کے پہلو بہ پہلو طبقۂ سوم کی حیثیت سے شہروں کو نشست و رائے دہی کا حق حاصل ہوگیا تھا۔

سلطنت کی شہریت

(۵) انجام کار شہروں کے اس طبقے میں شہریت کے نئے خیالات قائم ہوگئے وہ تمام قوم کے وسیع حدود میں پھیل گئے اور شہر کی شہریت سے سلطنت کی شہریت کا جدید خیال پیدا ہوا۔

پندرھواں باب

(د) کسانوں کا طبقہ

طبقۂ غلامان زرعی کی ترقی

اگر ازمنۂ وسطیٰ میں آزاد اشخاص کا قدیمی طبقہ نقصان میں رہا تو غلامانہ طبقہ فائدے میں رہا آزاد اشخاص کی پستی اور غلامان زرعی کی بلندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقے باہم غلط ملط ہونے لگے زرعی غلاموں کے طبقے کا ایک چھوٹا حصہ شاہی خدمات کی انجام دہی کی وجہ سے آزاد شخصوں سے بلند ہوگیا، اور فروتر طبقہ امرا کا جزو بن گیا، درباری خدمت کی وجہ سے انھیں رؤسا سے زیادہ قریبی تعلق پیدا ہوگیا، اور درباری تربیت و آداب کے حاصل کرنیکا موقع ملا۔ اس قابلیت کے ساتھ ان کی زرخیز جائدادوں نے ملکر انھیں ایک وقت میں طبقۂ ثالث کے امرا کا ہمپایہ بنا دیا۔

آزادی

ان کا ایک دوسرا اور بڑا حصہ شہروں میں آباد ہوگیا جہاں تجارت کے ذریعے سے متمول ہوکر انھوں نے شخصی اور شہری آزادی حاصل کرلی اٹالیا کے شہروں کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھیں نے سب سے پہلے اپنے سرف غلاموں کو آزاد کیا شہر بولون جو ہمیشہ سے آزادی کا مقدمۃ الجیش رہا ہے اس نے اپنے ناظم اعلیٰ (Podesta) آکرسیس دے سورچینا (Accursius de Sorrecina) کی تجویز کے موافق یہ فیاضی دکھائی کہ اپنے حدود کے کل سرف غلاموں کی آزادی خریدلی اور آئندہ کے لئے اس طریق غلامی کے خاتمے کا اعلان کردیا۔

فرانس اور جرمانیا میں گلڈ (یعنی اہل حرفہ کی انجمنیں)

شہری زندگی کی ترقی سے دستکاروں کے طبقے نے بھی عروج حاصل کرلیا اب تک لوگ تمام یورپ اور بالخصوص اس کے ٹیوٹنی حصص میں ادنیٰ درجے پر تھے اور اس طبقے میں زیادہ تر زرعی غلام داخل تھے۔ آزاد شہریت نے اول اول اٹالیا میں بروبار پیدا کئے اور یہیں سے اہل حرفہ کی تعلیمی انجمنیں اسکولے[1] کے نام سے فرانس پہنچیں جہاں ٹیوٹنی اثر کے تحت میں

[1] واحد: اسکولا (Schola)۔

اُنھوں نے منسٹیریا (Meniteria) اور گلڈ کی مشخصہ شکل اختیار کی اور بالآخر جرمانیا میں بھی رائج ہوگئیں ان کا اثر یہ ہوا کہ اُن کے اراکین کے حقوق قوی ہو گئے اور ان کے مالکوں کا اعزاز بڑھ گیا۔ دستکار طبقے کی منظم تعلیم اور اُن کا تدریجی ارتقا، فنی مہارت، اور دولت میں اُن کی ترقی، اپنی مجلس یا جماعت کے علم کے نیچے ہتھیار رکھانے کا نیا استحقاق۔ شہر کے مفاد اور اس کی مرفہ الحالی سے ان کا مستقل تعلق، ان تمام امور نے دستکاروں میں اپنی اہمیت اور اپنے حقوق کا احساس پیدا کر دیا، ان میں بہت سے صرف غلام تھے مگر مکاتبت، یا غداری سے اُنھوں نے آزادی حاصل کر لی تھی اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ اپنے شہریت کے حقوق سے وہ محروم رکھے جا سکتے۔

دیہات میں زرعی غلامی

دیہات میں آزادی کا راستہ زیادہ دشوار گزار تھا، بہت سی جگہوں میں یہ اصول تھا کہ ”ہوا غلام بنا دیتی ہے“، زرعی غلاموں کا بالکل آزاد ہو جانا مستثنیات سے تھا، مگر آہستہ آہستہ اُنھوں نے عام طور پر ایک طرح کی شخصی آزادی حاصل کر لی، یہ آزادی بھی اگرچہ بہت گرانبار اور سیاسی حیثیت سے بے اثر تھی مگر حفاظت قانونی سے معمور اور برابر وسعت کی طرف مائل تھی۔ اُنھوں نے آزاد کسانوں سے ملکر مساویانہ حقوق کا ایک پیشہ ور طبقہ بنا لیا۔

آزادی

زرعی غلامی اور آزادی کے تفصیلی تعلقات، اور ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونے کے حالات بہت ہی مختلف تھے۔ غلامی کی منسوخی کے مانند، زرعی غلاموں کا ترقی کرنا بھی بہت کچھ کلیسا کے اثر کا زیر بار احسان ہے۔ جہاں گرجے یا خانقاہی جماعتیں کسی علاقے کی مالک تھیں وہاں اُنھوں نے اپنے زرعی غلاموں کو معین حقوق اور مستثنیات دیکر بالعموم ایک راستہ کھول دیا، اور اس طرح اماکن مذہبی کے توابع آزاد کسانوں کے درجے پر پہنچنے میں سب سے مقدم تھے۔ اس کے بعد بادشاہوں نے اس مثال کی تقلید کی۔ شارلیمن کے سلسلے کے بادشاہوں نے سکیلینوں کو آزادی عطا کی، اور لوئس دہم نے ۱۳۱۵ء میں شاہی علاقوں کے زرعی غلاموں کو آزادی عطا کر کے یہ اعلان کیا کہ اُس نے شاہ فرانس کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔

کسانوں نے حقوق ذاتی حاصل کر لئے۔

جس میلان زمانہ نے بڑے بڑے بیرنوں کے حقوق شاہانہ کو موروثی جاگیر میں تبدیل کر کے انھیں اراضی سے متعلق کر دیا تھا اور جس نے ماتحت زمینداروں کو اپنے آقاؤں کے

مقابلہ میں محفوظ و مستقل حقوق عطا کئے تھے، اُسی میلان زمانہ نے علاقوں کے غلامان زرعی کے لئے ان کی مقبوضہ اراضی کے حقوق تسلیم کرا دیئے اور علاقہ جاتی قانون کے ماتحت ان میں توریث کا طریقہ جاری کر دیا اور خاص قسم کا موروثی آئین انصاف کا رواج قائم کیا جس میں کسان اپنے سرگروہوں (Meyer) کی سرکردگی میں شریک ہوتے تھے۔

فرانس

فرانسیسی سرف (غلامان زرعی) اور ویلین (وابستہ اراضی کسان) کی حالت جیسا کہ خود ان کے نام سے ظاہر ہے جرمانی ہوف لوٹے (Hofleute) اور گرنڈ ہولڈن کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی مگر موخر الذکر کو ترقی بعد میں حاصل ہوئی اور فرانس کے صاحب حقوق کسانوں کے اعلیٰ طبقے یعنی (Coutumiers) اور (Roturiers) اور (Hospites) Ostes آزاد اشخاص کی حیثیت کے زیادہ قریب پہنچ گئے۔

انگلستان

برخلاف اس کے انگلستان میں کالی وبا (۱۳۴۸ء) کے بعد زرعی غلاموں کی آبادی کو شخصی آزادی حاصل ہوگئی مگر زمین اُن کے پاس نہیں تھی اور اس طرح آزاد کسانوں کے بجائے آزاد مزدوروں کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا۔

جرمانیہ کے کسانوں کی جنگ

کسانوں کی یہ تبدیلی آزادی بالعموم شخصی قانون اجتماعی و عدالتی نظام تک محدود تھی۔ آزاد کسان جو بیلف (محصلین) موروثی اقتدار کے تابع ہو گئے تھے اور جن کی اراضیاں ان کے آقا کے نفع کے لئے بہت سے مستقل محصولوں سے زیر بار تھیں انھیں کے ساتھ ملکر ان سب لوگوں سے نام نہاد طبقہ کسان بنتا تھا۔ چند ملکوں کے سوا کسی جگہ بھی کسانوں کا گروہ پورے معنی میں سیاسی طبقہ نہیں بنا تھا، یہ مستثنیٰ ممالک اسکینڈینیویا ، ڈرون، سویزرلینڈ وغیرہ تھے۔ اسکینڈینیویا میں خوش قسمتی سے ان کی قدیم عام آزادی اور قدیم نظام حکومت قائم رہ گیا تھا، ڈرون میں والیان ملک انھیں صوبجاتی مجالس شوریٰ میں طلب کرتے تھے اسویزرلینڈ میں اُنھوں نے آزاد حرانی جمہوریتیں قائم کرلی تھیں۔

اپنے آقاؤں کے بھاری جوئے کو اُتار پھینکنے کے لئے سولھویں صدی والی کسانوں کی عظیم جنگ جرمانی کاشتکاروں کی سخت مگر بیکار کوشش تھی۔ جب ہم اس زمانے میں اُن بارہ دفعات کو پڑھتے ہیں جن میں کاشتکاروں نے اپنے مطالبات کا خلاصہ درج کیا تھا اور اُس نہایت شدید غصے کا خیال کرتے ہیں جو اس مطالبے سے اُس وقت کے

تعلیم یافتہ گروہوں اور حکمراں اعیان میں پیدا ہوگیا تھا، تو ہمیں یہ دیکھکر گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ ہماری اس صدی میں بلا کسی طرح کی کشمکش کے کاشتکاروں کو انسانی اور شہری حقوق کی حیثیت سے اس سے زیادہ حاصل ہوگیا ہے جس کے طلب کرنے کی اس زمانے میں اُنھوں نے جرأت بھی نہیں کی تھی۔

مگر آہستہ ہی آہستہ لوگ اس خیال کے عادی ہوئے کہ کسان محض ایک ایسا محکوم گروہ نہیں ہے جو صرف فوج کی بھرتی ہی کے لائق سمجھا جائے اور دوسروں کی مرضی سے اُس پر محصول عائد کردیا جائے۔ انگریزی آئین حکومت نے اُن عوام (Yeomen) کو جو اپنی اراضی سے معمولی آمدنی رکھتے ہیں دارالعوام کے لئے صوبے کے انتخاب میں حصہ دیکر ایکبار پھر اپنی عام آزادی کی قدرشناسی کو ظاہر کردیا۔

سیاسی حقوق

مگر بہت ہی قریبی زمانے تک یہ نہ ہوسکا کہ پوری شخصی آزادی اور سیاسی حقوق بالعموم تمام طبقات کے لئے وسیع کردیے جاتے۔ اٹھارہویں صدی کے فلسفے نے انسان کے فطری حقوق کے خیال کو تسلیم کرکے اس ترقی عظیم میں ذہنی اُمنگ پیدا کردی جرمانیا میں پروشیا کے شاہ فریڈرک اول نے سنہ۱۷۱۹ء میں شاہی جائدادوں میں زرعی غلامی کے طریقے کو برطرف کرکے اس معاملہ میں تقدم حاصل کیا، فریڈرک ثانی کے فرامین نے دوسرے زرعی غلاموں کی خلاصی کی بھی تائید کی اور اُسے اور وسیع کیا اور شہنشاہ جوزف ثانی نے ۱۷۸۲ء میں جرمانیا اور آسٹریا کے لئے اور ۱۷۸۳ء میں کارل فریڈرس نے بادن (Baden) کے لئے اس مثال کی تقلید کی۔ لیکن اس دوران میں بیشتر جرمانی سلطنتیں اس کے اجرا سے رکی رہیں یہانتک کہ ۴ اگست ۱۷۸۹ء کے پرجوش اعلان اور فرانسیسی قومی مجلس کے اعلان و حقوق انسان نے تمام مہذب یورپ کو چونکا دیا۔ زرعی غلامان توابع کی آزادی نئے زمانے کے فرض عام اور غیر قابل رد مطالبے کے طور پر تسلیم کی گئی اور مغربی یورپ میں انیسویں صدی کے نصف اول میں اور مشرقی یورپ میں اُس کے بعد سے اس پر عملی کارروائی ہوئی اسی زمانے میں بلکہ اُس کے بعد بھی سیاسی شہری حقوق شہروں کے باشندوں کے مانند کسانوں کے لئے بھی وسیع کئے گئے۔

سولھواں باب

(۵) غلامی اور اُس کی منسوخی

غلام جس قوم یا خاندان کا تابع ہوتا ہے اُس میں وہ ایک اجنبی کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں غلامی کو جیسی کچھ وسعت حاصل تھی وہ ظاہر ہے مگر مجھے کسی ایسی قوم کا علم نہیں ہے جس نے غلامی کو ایک قومی طبقہ کی حیثیت دی ہو اور یہی ایک بات اس امر کے ثابت کرنے کو کافی ہے کہ یہ انسانی فطرت کے لوازم میں سے نہیں ہے۔

غلامی کی نسبت ارسطو کی رائے۔

ارسطو نے پالیٹکس" (سیاسیات کتاب اول باب ۴ - ۶) میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ بعض انسان فطرتاً آقا اور بعض فطرتاً غلام ہیں بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ مگر اس کے استدلال جہاں تک صحیح ہیں اُن سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ایک خادم طبقے کی ضرورت ہے نہ کہ ایک ایسے مملوک طبقے کی جو حقوق سے معرا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی اعلیٰ قابلیت کا شخص اگر اپنا کام پورا کرنا چاہتا ہے تو بالفاظ ارسطو اسے "جاندار اوزار" کی ضرورت ہوتی ہے، اور اس میں بھی شک نہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو فطرتاً جسمانی محنت کے لئے خصوصیت کے ساتھ موزوں ہیں اور اُن کے فرائض کی انجام دہی کے لئے حکمانہ رہبری کی ضرورت ہے۔ اس سے صرف اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک طرح کی باہمی احتیاج ہے جو آقا و خادم، کارخانہ دار و کاریگر، کاشتکار و مزدور، اہل صنعت و دستکار کو باہم متحد کرتی ہے، مگر یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ مستخدم کا تعلق خادم سے وہ ہو جو پالتو جانوروں کا اُن کے مالکوں سے ہوتا ہے، نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ کام کرنے والے اپنی ذاتی آزادی اور انسانی شخصیت سے دست بردار ہو جائیں اور کسی خاص آقا کے اشیائے محض اور اوزار محض ہو جائیں یعنی اس کے غلام بن جائیں۔ انسان فطرتاً شخص ہے وہ شے نہیں ہو سکتا

یعنی غلام نہیں بن سکتا، رومی مقننین نے اپنے نظریۂ قانون میں غلاموں کو شے مملوکہ قرار دینے کا خیال اس سختی سے قائم کیا ہے کہ زمانۂ قدیم تک میں وہ انگشت نما ہوگیا تھا، اُنھوں نے غلاموں کو حقوق سے معرا ہستیاں یا محض اشیا قرار دیا ہے، اگر اُنھوں نے بھی اس امر کو محسوس کیا تھا کہ غلامی فطرت کے خلاف ہے اور محض قوموں کے عام رواج سے پیدا ہوگئی ہے، اس لئے اُنھوں نے یہ حکم لگا دیا تھا کہ غلام کو آزاد کرنا اُس کے فطری حق کا اُسے واپس دینا ہے۔
مگر باوجود اس علم کے رومی قوانین ہزار برس سے زائد تک سخت تسلسل کے ساتھ غلاموں پر اشیائے مملوکہ کا اصول عائد کرتے رہے، غلاموں پر مالکوں کے حد سے بڑھے ہوئے یا بیوجہ تشدد کے خلاف جو شہنشاہی احکام صادر ہوتے تھے وہ بدترین ستمگاریوں کے روکنے میں اُتنا ہی اثر رکھتے تھے جتنا اس زمانے میں جانوروں پر ظلم کرنے کے خلاف قوانین کا اثر ہے مگر اس سے اصول پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا، اور غلام مثل سابق کے نہ صرف کسی قسم کی ملکیت نہیں رکھتے تھے بلکہ مناکحت اور رشتہ داری کے حق سے بھی محروم تھے۔

جرمانی قانون

جرمانی قانون نے بھی اسے پوری صفائی کے ساتھ تسلیم کیا تھا جیسا کہ "آئینہ سکسونی" کے مصنف کے پُرزور الفاظ سے ظاہر ہے کہ ہر طرح کی غلامی جبر، اسیری اور ناواجب سختی سے پیدا ہوئی ہے اور اب جس شے کو حق کہتے ہیں وہ محض رواج ہے، یہ رواج اگرچہ قدیمی ہے مگر نامنصفانہ ہے۔
ٹیوٹنی قوموں نے ہمیشہ اپنے زرعی غلاموں کے کچھ نہ کچھ حقوق تسلیم کئے ہیں، ان کے ملکیتی اور خاندانی حقوق ناکمل تھے اور ان کی ناکافی حفاظت ہوتی تھی بلکہ درحقیقت وہ ان کے آقا کی شفقت پر منحصر تھی، مگر ان کی آزادی مابعد کا تخم رومی قانون سے زیادہ قوی تھا۔ جرمانی غلاموں کی شخصیت کہیں ضائع نہیں ہوئی تھی اور اس لئے ان کی حالت کو ترقی دینا ممکن تھا۔

رقیت زرعی غلامی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کے دوران میں مغربی یورپ میں رقیت (یعنی مطلق غلامی) زرعی غلامی کی زیادہ نرم صورت میں بدلکر ایک بڑی حد تک ناپید ہوگئی، اٹھارھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں زرعی غلامی کی حتمی تنسیخ سے اُس کے آخری آثار ناپید ہوئے۔

عیسائیت اور ٹیوٹنی جذبہ

اس کوشش میں ابتدائی اور تدریجی کارروائی اور حال کے زمانے کی زیادہ کامل آزادی، ایک حد تک عیسائیت کی ممنون احسان سمجھی جاسکتی ہے، عیسائیت نے

اگرچہ غلامی کے ظاہری قوانین پر سخت اعتراض نہیں کیا مگر اس کی باطنی بنیاد کو ہلا دیا۔ انسان پر حق ملکیت پیدا کرنا اس اعتقاد کے منافی تھا کہ تمام انسان خدا کے عیال اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں اس تغیر کا باعث عیسائیت سے زیادہ قوم ٹیوٹن کا پاس قانون و آزادی اور انسانیت کی ترقی کن روح ہے۔

روس — روس میں غلامی کی تاریخ مخصوص نوعیت کی ہے، ابتدائی زمانے میں ایک طرح کی شخصی بندش موجود تھی مگر سولھویں صدی میں کسان زیادہ تر آزاد تھے۔ وسیع جائدادوں کے لئے مزدوروں کی تعداد کثیر کی حاجت تھی اور اراضی داروں کے حق میں یہی مفید تھا کہ کسانوں کو مختلف مراعات کے ذریعے سے اپنی جائدادوں سے وابستہ کریں اور اس طرح ان کی مزدورانہ نقل و حرکت اور مسلسل تغیر مکان کی عادت کو (جو قدیمی خانہ بدوشی کے شوق کی وجہ سے اب بھی جاری تھی) بند کر دیں مگر کسان اس وقت تک زرعی غلام نہیں بنے تھے جبتک کہ سلطنت کی مالی اور فوجی ضرورتوں نے ان کو زمین سے اور زیادہ وابستہ کر کے انھیں ان کے مالکوں کے رحم پر نہ چھوڑ دیا۔ سترھویں صدی میں کسانوں کی آزادی کو کسی جگہ ایسا شدید نقصان نہیں پہنچا جیسا روس میں پہنچا یا زرعی غلام اور کسان ایک ہی غلامانہ حالت میں ڈھکیل دیے گئے، جس سے ان کی ذات اور جائداد بالکل ان کے مالک کی مرضی پر منحصر ہو گئی مگر روس میں بھی نئے زمانے نے بہتری کی طرف قدم بڑھائے اور ہمارے وقت میں پہنچکر غلاموں کو آزادی بھی حاصل ہو گئی۔ غلاموں کے آزاد کرنے کا کام جسے باوجود کثیر التعداد امرا کی مخالفت کے زار الگزنڈر ثانی نے ۱۹ فروری ۱۸۶۱ء کے قانون سے پورا کر دیا، اسی سے روس میں شخصی آزادی کے نئے دور کی ابتدا ہوئی۔

امریکی غلامی — اس طرح بتدریج یورپ ازمنۂ وسطیٰ کی غلامی کی لعنت سے پاک ہو گیا، مگر نئی دنیا میں اسے نہ صرف ایک نئی زمین ملگئی بلکہ بعض اعتبارات سے وہاں اس کا شر بھی زیادہ بڑھ گیا ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک کی امریکی خانہ جنگی جذبۂ انسانیت کی اسی ہتک کی سزائے اعمال تھی۔

حبشیوں کا غلام بنانا اس اعتبار سے کم قابل اعتراض تھا، کہ یونان اور روما کے غلاموں کے مانند یہ غلام اسی گوری نسل سے نہیں تھے، جس نسل سے خود ان کے مالک تھے، بلکہ وہ سیاہ فام اور فطرتاً پست نسل سے تھے مگر دوسری جانب اس فرق سے سفید رنگ مالکوں کی نفسانی

اور نخوت کو اور ترقی ہوگئی تھی کیونکہ اُن حبشیوں کے متعلق وہ مشترک انسانی فطرت کے قبول کرنے پر نہ مائل تھے نہ مجبور کئے جاتے تھے اور اس لئے اُن کی جفا کاریاں زمانۂ قدامت کے بہ نسبت بہت بڑھی ہوئی اور زیادہ سخت تھیں۔

مونٹسکیو

ان گورے مالکوں کی اپنے حبشی غلاموں کی طرف متکبرانہ نفرت کو مونٹسیکو نے اپنی کتاب (Montesquieu Exprit des Lois XV) کے صفحہ پر جس تلخ و تند طنز سے ظاہر کیا ہے اس کا قوی اثر دل پر پڑتا ہے: "یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا نے جو حکیم مطلق ہے ایک روح اور پھر ایک نیک روح کو ایک کالے جسم میں ڈال دیا ہے"۔

پس امریکی غلامی یوربی غلامی سے بہت ہی زیادہ سخت تھی مالک اگر غلاموں کی کچھ غور و پرداخت کرتے تھے تو وہ ایسی غور و پرداخت تھی جیسے ایک کسان اپنے مویشی کی کرتا ہے۔ اُن کی انسانی عزت کا انکار، ان کے ازدواج اور خاندان کا عدم لحاظ، مذہبی یا اخلاقی تعلیم کا فقدان، ان کی بے روک ٹوک تجارت (جو اکثر دل ہلا دینے والے مظالم کے ساتھ ہوتی تھی) ان تمام امور نے ملکر انھیں اخلاقاً وقانوناً خانگی جانوروں کی حالت میں ڈھکیل دیا تھا، یہ تمام آسمانی و دنیاوی نظم کے خلاف ایک سخت گناہ تھا۔

جیفرسن

امریکہ کی بدقسمتی تھی کہ جیفرسن کہ ہر جولائی سنہ ۱۷۷۶ء کے اعلان آزادی میں (جس نے آزادی کو انسان کا ناقابل انفکاک حق قرار دیا ہے) اپنی اس تجویز کو اتمام کو نہ پہنچا سکا کہ شاہی حکومت کی وجہ سے حبشی غلامی کا جو رواج ہوا اور اُس کی جو ہمت افزائی ہوئی اس پر اعتراض کیا جائے۔ غلامی کی تدریجی برطرفی کے ابتدائی خیال کی ایسی کمزور تائید ہوئی کہ اپنی ملکیت کی حفاظت و ترقی کے بابت غلام رکھنے والوں کی کوشش پر غالب نہ آسکی۔

آزاد ریاستیں غلام رکھنے والی ریاستوں کے مقابلے میں مستقل حکومت کے اندر اپنے توازن کو مشکل سے قائم رکھ سکتی تھیں، ایک صدی کے اندر اندر لاکھوں کی اکائی سے گزر کر دہائی میں پہنچ گئی تھیں روئی اور گنے کی زراعت کی عاجلانہ ترقی کا اثر اس معاملہ میں تباہ کن پڑا تھا۔

امریکی خانہ جنگی

جنوب کی غلام رکھنے والی مشترکیت پر سلطنہائے متحدہ کی فتح نے شمالی امریکہ سے حبشی غلامی کی یک قلم منسوخی کو حتمی و قطعی بنا دیا، اب سلطنہائے متحدہ اپنے حدود انتہا

کے اندر غلامی کو جائز نہیں رکھتیں (ترمیم نظام سلطنت مورخہ ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء بالواسطہ یہ قانون تمام براعظم (امریکہ) کے مسئلہ غلامی کیلیے فیصلہ کن ہے، کیونکہ جنوبی امریکہ زیادہ زمانے تک اس اصول کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرسکتا۔ فی الحقیقت برازیل میں ۲۸ ستمبر ۱۸۷۱ء کے قانون کی رد سے غلامی منسوخ ہوچکی ہے۔

حبشیوں کے حقوق۔

اس وقت تک رنگدار قوموں کی محض ذاتی آزادی اور ان کے شخصی حقوق تسلیم کئے گئے ہیں، حبشیوں کی حیثیت اور ان کے سیاسی حقوق کے مشکل سوال کا حل کرنا ابھی باقی ہے، اس وقت شمالی امریکہ حبشیوں کو پورے سیاسی حقوق دینے پر مائل ہے مگر یہ مشکوک ہے کہ یہ حالت کبتک قائم رہے گی۔ سیاسی حقوق کے لئے مقدم شرط سیاسی قابلیت کا ہونا ہے۔

آیا یہی عمومیت جسے ابتک صرف سیاسی حیثیت سے ترقی یافتہ قوموں ہی میں کامیابی ہوئی ہے، حبشی گروہوں کے لئے حکومت کی ایک فطرتی صورت ہوسکتی ہے، آیا ایک عمومی نظام حکومت کو جس میں بڑے ہی تحمل اور مردانہ مستعدی کی ضرورت ہے یہ حبشی اُسے قابلیت کے ساتھ قائم رکھنے اور جوانمردی کے ساتھ اس کی حفاظت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جو لوگ انسانی فطرت اور سیاسی تاریخ سے اچھی طرح آگاہ ہیں وہ شاید ہی اس کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت کرسکیں۔

سلطنت اور غلامی۔

بہرحال انسانیت کی بنا پر سلطنت کے اصول سے ذیل کے عمومی کلیات تسلیم کئے جاسکتے ہیں :۔

(۱) ہر سلطنت کا حق و فرض ہے کہ اگر شخصی غلامی کے کچھ بھی اثرات اُس کی مملکت میں باقی رہ گئے ہوں تو اُنھیں صاف کردے۔ ایسا کرنا بے انصافی کا رفع کرنا ہے۔

(۲) سلطنت غلامی کے کسی نئے رواج کی روادار نہیں ہوسکتی خواہ کوئی انسان خود ہی غلام بننے کا خواہاں کیوں نہو۔

(۳) کوئی غیر ملکی اگر سلطنت کے حدود کے اندر اپنے غلام پر ملکیت قائم رکھنا چاہے تو سلطنت کو اُس کی قانونی حفاظت سے انکار کرنے کا حق ہے [1]

[1] انگلستان کے لئے بلیک اسٹون کی شرح دیکھنا چاہیے (کتاب اول باب ۱۴) ۲۹ اگست ۱۸۳۳ء

(۴) غلام جو آزاد زمین پر قدم رکھے وہ حقیقتاً آزاد ہے اور اس آزادی کے لئے وہ عدالت سے حفاظت کا استحقاق رکھتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے انگریزی قانون نے انگریزی نو آبادیوں میں آزادی کے قاعدے معین کئے ہیں اور یہ اعلان کر دیا ہے کہ کوئی غلام جو اپنے مالک کی مرضی سے برطانیۂ عظمیٰ یا آئرلینڈ میں آوے وہ آزاد ہے۔

سترھواں باب

جدید زمانے کے درجات کا اصول

ذی امتیاز طبقات کی معدومی

ازمنۂ وسطیٰ کے ذی امتیاز طبقات ہر جگہ شکست ہوگئے ہیں یا دربوں کو کسی قوت میں مذہبی عظمت کی وجہ سے جو برتری حاصل تھی وہ زائل ہوگئی ہے اب ان کی حیثیت بالعموم جداگانہ سیاسی طبقے کی نہیں رہی ہے مقتدایان دین طبقۂ اعیان میں شامل ہوگئے ہیں اور باقی پادری عوام میں بالائی طبقے کا جزو بن گئے ہیں۔ زمانۂ حال کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہوجائے گا کہ کیا اعلیٰ اور کیا ادنیٰ ازمنۂ وسطیٰ کے طبقۂ امرا کا شیرازہ بالکل بکھر گیا ہے اور وہ ایک ذی امتیاز طبقے کے طور پر اپنی آزادانہ حیثیت قائم کرنے کے لئے بالکل ہی ناموزوں ہوگیا ہے۔ شہری طبقے کے ایک منضبط فرقے کی قدیمی حیثیت زائل ہوگئی ہے تعلیم یافتہ طبقوں کو جدید ریاستی سلطنتوں میں سابق کے بہ نسبت بہت ہی مختلف حیثیت حاصل ہے کسانوں تک کا طبقہ جو روایتی خیالات رواج کے مضبوط و خاموش تعلق سے وابستہ تھا زمانے کی تحریک میں کھنچ آیا ہے اور اُس کی ترقی سے موثر ہورہا ہے۔ حرفت نے بھی ملک میں مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ لی ہے اور کسانوں کی سادگی آمیز زندگی میں اضطراب پیدا کردیا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے طبقات کی اصلاح کرنے اور سلطنت کو ان کی بنیاد پر قائم کرنے کی تمام کوششیں اس وقت تک کلیتہً ناکام ہوچکی ہیں قوم کا ادراک و شعور ان پر اعتبار نہیں کرتا بلکہ خود یہ محسوس کرتی ہیں کہ وہ ازمنۂ وسطیٰ کے نظم سے آگے بڑھ گئی ہیں اور تجدید شدہ شکل میں بھی ان کی دوبارہ بحالی کی روادار نہیں ہیں۔

تاہم یہ عیاں ہے کہ جماعتہائے قوم میں جو ناقابل انکار تفاوت موجود ہیں وہ حقیقی سیاسی اہمیت رکھتے ہیں اور یہ کہ محض تمام درجات کا ایک میں خلط ملط کردینا ناقابل اطمینان ہے۔ اگر کسی نظام حکومت میں اس تفاوت کو ہم کوئی جگہ دینا چاہتے ہیں

تو ہمکو طبقات کے بجائے درجات قائم کرنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی جن مراتب کو ہم طبقات کہتے ہیں وہ اکثر فی الواقع طبقات نہیں بلکہ درجات ہیں [۱]۔

درجات و طبقات

درجوں اور طبقوں میں فرق یہ ہے کہ درجات سلطنت سے شروع ہوتے اور سلطنت ہی کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں لیکن طبقات کی بنیاد سلطنت کے حدود سے خارج ہوتی ہے۔ درجات اتحاد قوم کو پہلے ہی سے تسلیم کر لیتے ہیں، طبقات اس کی پروا نہیں کرتے۔ درجات ایک سیاسی نظم ہیں جو اتحاد قومی اور قانون عامہ پر مبنی ہوتے ہیں طبقات وہ گروہ ہیں جو انفرادی اور شخصی حقوق کی بنا پر قائم کئے گئے ہیں اور ان کا مقصد کلیتہً یا اصلاً سیاسی نہیں ہے۔ پادری کلیسا کو سلطنت سے مقدم رکھتے ہیں امراء اولاً اپنا اور اپنے خاص تمدنی اغراض کا خیال کرتے ہیں شہری اپنے کاروبار کو اور کشتکار اپنی زراعت کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں پس طبقات میں ہمیشہ مشترک تعلیم اور مشترک طریق زندگی کا تعلق نظر آتا ہے۔ ان گروہوں کی تقسیم فرق لوازم پر ہے اور اس میں سلطنت کا خیال محض بالواسطہ کیا جاتا ہے۔

طبقات کی نشوونما فطری ہے، درجات مہذب تمدن کے کرشمے اور فراست سیاسیہ کی قوت منضبط کے قومی نتیجے ہیں۔ اس لئے ہم ان متمدن اقوام میں جن میں سیاسی احساس ترقی پا جاتا ہے صرف درجات ہی درجات دیکھتے ہیں۔ یونانیوں بالخصوص ایتھنز میں سولن کے نظام سلطنت کے بعد اور روما میں سرویس کے نظام سلطنت کے بعد یہی صورت نظر آتی ہے اسی قانون سے ابتداءً درجے (class) کا لفظ نکلا۔ یہی حال موجودہ یورپی سلطنتوں کا ہے۔

اس کی کوئی وجہ نہیں کہ درجات کے قائم کرنے میں موجود الوقت طبقات کا لحاظ کیوں نہ کیا جائے مگر درجات اور طبقات کا تطابق نہ ضروری ہے نہ مفید۔ اگر ایسا ہو تو طبقات ہی سلطنت کی تنظیم کا تعین کریں گے جیسا کسی حد تک ازمنۂ وسطیٰ میں ہوتا تھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبقات متحد ہو جائیں اور سلطنت منقسم ہو جائے۔ مخصوص طبقات کے اغراض و میلان کو جب سیاسی مساعدت حاصل ہو جائے گی تو وہ

---

[۱] دیکھو اسی مقالہ کا ساتواں باب۔ انگریزی مترجم۔

قوم کے عام اغراض اور اُس کے بہترین خیال پر آسانی سے غالب آجائیں گے برخلاف اس کے تقسیم شمولی کے جس میں ہر درجے میں مختلف طبقات کے ارکان شامل ہوتے ہوں قومی زندگی میں زیادہ استیناس پیدا ہوجاتا ہے اور سیاسیات میں انواع واقسام کی تحریک پیدا ہوجاتی ہے اور ایسے بلند تر رتبہ حاصل ہوجاتا ہے۔

املاک کی درجات

درجات بیشتر ملکیت کی بنا پر قائم ہوتے ہیں اس قسم کے نظامات میں از روئے شمار ملکیت ہی پر سیاسی قوت کا تعین ہوجاتا ہے اور اہل ملک کی قدر کا اندازہ ان کی آمدنی کی مقدار سے ہوتا ہے لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ یہ انتظام واقعات سے موافق ہو اور اس کا اصول قانون عامہ اور سیاسیات کے بجائے اقتصادیات اور شخصی قانون سے زیادہ قریب رکھتا ہے۔ اس قسم کے خالص حسابی اصول کا مقابلہ کسی ذی حیات تقسیم کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا جس کی نگاہ سب سے پہلے سیاسی اہلیت و قابلیت کے اختلافات پر (جہاں تک ان کا جانچنا اور اندازہ کرنا ممکن ہے) پڑتی ہو۔ سلطنتہائے جدیدہ میں بالعموم چار خاص درجات ممیز ہوسکتے ہیں۔

(۱) درجۂ حکمراں۔ سلطنت کے سب سے اعلیٰ مدارج پر بادشاہ اور وہ عمال ہوتے ہیں جنھیں اقتدار عام حاصل ہو جس سے انھیں تمام دیگر درجات پر فوقیت حاصل ہوجاتی ہے۔

(۲) درجۂ اعیان۔ جسے اس قسم کی حکومت تو نہیں حاصل ہوتی مگر جماعت حکمراں اور عام قوم کے درمیان ایک آزادانہ ممیز حیثیت ضرور حاصل ہوتی ہے۔

(۳) نام نہاد "طبقۂ سوم" یعنی امصار و دیار کے تعلیم یافتہ اور آزاد اہل ملک کی جماعت صحیح معنوں میں بھی "درجۂ متوسط" ہے۔

(۴) عوام "یا طبقۂ چہارم" اس میں شہروں کے ادنیٰ درجے کے باشندے اور نیز کسان شامل ہیں۔ یہی کارکن جماعات یعنی مزدوروں کا گروہ عظیم ہے۔

درجۂ حکمراں سلطنت کا کنگرہ اور عوام اس کی بنیاد ہیں، ہر قوم کی قوت اور اور حقیقی طاقت زیادہ تر انھیں دو درجات کے صحت بخش تعلقات پر منحصر ہوتی ہے۔ درمیان کے درجے اس طرح اس کی تکمیل کرتے ہیں کہ وہ درجۂ اول کے افعال کی روک تھام کرتے یعنی طبقۂ اعیان اور نیابتی عمومیت کے اثرات سے اس میں اعتدال

پیدا کردیتے ہیں۔ اپنی اعلیٰ تعلیم اور زیادہ ممتاز معاشرتی حیثیت سے انھیں موقع ملتا ہے کہ جس طرح پر قانون اور آزادی کا اعلیٰ احساس انھیں آمادہ کرتا ہے وہ عام قومی بہبود کے حالات کی نگہداشت کریں۔ وہ فزوترین اور کثیرترین درجے کے فطرتی محافظ، رہبر اور قائم مقام ہیں۔

اٹھارھواں باب

جدید زمانے کے درجات کا تبصرہ

حکمراں درجہ (جماعت)

اس وقت کا حکمراں درجہ (جماعت) اپنے سرگروہوں یعنی رئیسوں کے توسط سے قدیمی طبقۂ امرا کے ساتھ مربوط ہے۔ اگرچہ اب اس نے سلطنت میں خود امرا پر اقتدار شاہانہ حاصل کرلیا ہے اس درجے کے فرو تر ارکان، عہدہ داران وعمال اور جمہوریتوں میں تمام اعلیٰ ترین عہدہ دار بھی زیادہ تر وہ درمیانی درجات کے لوگوں میں سے ہوتے ہیں اور معاشرتی طور پر انھیں سے تعلق رکھتے ہیں یا اگر ان کے والدین ادنیٰ طبقے کے وسیع تر گروہ سے ہوتے ہیں تو خود ان کی اعلیٰ تعلیم اور ان کے کام انھیں معاشرتی حیثیت سے طبقۂ اعیان یا جماعت متوسط کے اعلیٰ گروہ کی بلند سطح پر پہنچا دیتے ہیں، اور ان کی یہ حیثیت اس وقت بھی قائم رہتی ہے جب وہ اپنے عہدے سے مستعفی یا کنارہ کش ہوجاتے ہیں لیکن عہدے کا اقتدار انھیں ان کے ہمسایوں سے بالاتر بنا دیتا ہے۔ ادنیٰ ترین جگہیں او خدمتیں سب سے فروتر درجہ یعنی غیر تعلیم یافتہ عوام کو حاصل ہوتی ہیں۔

طبقۂ اعیان اب مخصوص الحقوق متحدہ طبقہ نہیں رہا ہے قانون عام وخاص دونوں کے لحاظ سے امرا معاشرۃً اور قانوناً شہریت کے مشترک حقوق اور حقیقی مساوات کی بنا پر دوسرے درجات کے ساتھ مربوط ہیں ادنیٰ درجات کے ممتاز اشخاص وقتاً فوقتاً خود اپنے کو اور اپنے خاندانوں کو طبقۂ اعیان کی معاشرتی حد پر پہنچا دیتے ہیں اور بتدریج اس سے متعلق سمجھے جانے لگتے ہیں اس سے بھی زیادہ ایسا ہوتا ہے کہ طبقۂ اعیان کے ارکان یا ان کے اخلاف اس حالت میں آجاتے ہیں جس سے انھیں اپنی حیثیت کا قائم رکھنا ممکن نہیں ہوتا اور مجبور ہو کر انھیں امیرانہ زندگی کی تابناک بلندیوں سے سوسائٹی کی پست تر سطح پر گرنا پڑتا ہے، یہ غیر ممکن ہے کہ طبقۂ اعیان کی ظاہری حالت یا اس کے لوازم بلا جائداد یا آزادانہ پیشہ یا اعلیٰ تعلیم کے حاصل ہو سکیں اس لئے یہ درجہ فی الحقیقت

تغیر پذیر اور اپنے ارکان کے مسلسل مد و جزر کے لئے وقف ہے۔ اسی مسلسل تحرک سے اس کا نہایت ہی قوی تعلق شہری طبقے کے اعلیٰ و تعلیم یافتہ جماعت سے قائم رہتا اور اپنے سے نیچے طبقے کے ساتھ تحت باہمی میں آسانی پیدا کرتا ہے۔

ازمنۂ وسطےٰ کے طبقۂ امرا کا موجودہ طبقۂ اعیان کی صورت میں بدل جانا اولاً انگلستان میں ایک اعیان پسند قوم کے درمیان بتدریج مکمل ہوا، برخلاف اس کے براعظم یورپ میں جاگیردارانہ امرا کے ذریات باقیات کبھی کبھی عام زندگی کے راستہ میں رکاوٹ اور خرابی پیدا کر دیتے ہیں اور نئے طبقۂ اعیان ہنوز محض غیر واضح تعلقات زندگی اور متنازع فیہ حیثیت رکھتا ہے۔ طبقۂ اعیان کا اثر نظم معاشرت و آداب دربار اور اعلیٰ عہدوں کی تقررات میں نمایاں نظر آتا ہے مگر یورپی اقوام کے ذہن و احساس میں قانونی اور سیاسی حیثیت سے اسے ابھی تک کوئی مسلمہ جگہ نہیں ملی ہے۔

جرمانی شہنشاہی کو بر وقت اصلاح سے اس کمی کو پورا کرنا چاہیے اور یہ اصلاح اصولاً اسی روش پر ہونا چاہیے جس کا راستہ تاریخ عالم کے تجربے نے دکھا دیا ہے، طبقۂ اعیان اب ایک منفرد یا شاہی طبقہ نہیں رہ سکتا ہے، اس کی حیثیت اب اس درمیانی شخص کی ہونا چاہیے جو حکام کی سختیوں کو نرم کرے، عوام کے جذبات کو قابو میں رکھے اور عام زندگی میں بلند انداز پیدا کرے۔

تعلیم یافتہ شہری طبقہ یا "طبقۂ سوم"

(۳) شہری طبقہ

فرانسیسی انقلاب کی تاریخ اس طبقے کے خصوصیات کو بہت واضح طور پر نمایاں کرتی ہے، فرانس میں طبقۂ سوم کی اصطلاح جاگیردارانہ سلطنت کے نظم سے لی گئی تھی، اس جاگیردارانہ سلطنت میں اس لفظ سے وہ شہری مراد تھے جو اسٹیٹس جنرل (مجلس شوریٰ رائے عام) میں طلب کئے جاتے تھے اور وہاں انھیں فرقۂ مذہبی اور امرا کے اعیانی طبقات کے تحت میں ایک طرح کی مودبانہ پست حیثیت حاصل ہوتی تھی۔

۱۷۸۹ء سے فرانس میں طبقۂ سوم کی حالت

پادری سیئے (Abbe Sieyes) جس کے مشہور رسالہ "دربارۂ طبقۂ سوم" نے فرانسیسی انقلاب کی آگ بھڑکائی اس نے دو سوال کئے اور خود ہی ان کے جواب دیئے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ طبقۂ سوم کیا ہے، جواب یہ ہے کہ وہ سب کچھ ہے۔ دوسرا سوال

یہ ہے کہ سیاسی عضویت طبقۂ سوم کی اب تک کیا حیثیت ہے؟ جواب یہ کہ لاشئے محض، دونوں جواب مبالغہ آمیز ہیں۔ مگر پہلے جواب میں طبقۂ سوم کے دعاوی میں مبالغہ کرنے سے اس کا تصور ہی قائم کرنا ناممکن ہوگیا۔ اگر فی الحقیقت یہی سب کچھ ہے تو پھر اول یا دوم یا چہارم طبقے کا کوئی وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ پس یہ کوئی طبقہ یا جداگانہ درجہ باقی نہیں رہتا بلکہ تمام قوم کے مرادف ہو جاتا ہے۔

پہلے فرانسیسی انقلاب کے دوران میں طبقۂ سوم نے واقعتاً یہ مطالبہ کیا کہ فرانس کے دونوں پہلے طبقات یعنی پادری اور امراء اس کے ساتھ متحد ہو کر ایک قومی جماعت قائم کریں۔ جب اس کی تکمیل ہوگئی تو طبقۂ سوم نے سب کو اپنے میں جذب کر لیا اور ایک متحد القوۃ اور متساوی الحقوق قوم کی حیثیت سے سلطنت کے تمام قدیمی نظم و نسق کو جو اس وقت تک قائم تھا توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا مگر ان سب کو برابر حقوق دینے کے نظریے کے باوجود قوم کے آپس کے فطری اختلافات اپنا اثر دکھا کر رہے پادری اور امراء طبقۂ سوم میں غرق ہو گئے مگر پادری اور امیر ہونے کی جہت سے ان پر ظلم ہونے لگے اور وہ انقلاب کی خونی قربانی کے نذر ہو گئے مگر حکومت اس وقت تک بھی ایک ہیولائے محض تھی جس میں نئے مناقشات جوش زن تھے۔ اسی زمانے میں طبقۂ چہارم نے قوت حاصل کر لی اور اسی میں سے مجلس عارضی کے سرگروہ پیدا ہوئے جن کی خونی حکومت کے سامنے "جیروندا" اور طبقۂ سوم کی قوت بھی ٹھہر نہ سکی۔ پس جس انقلاب سے سیئیے کے الفاظ کو صحیح ثابت کرنا چاہا تھا اس سے صرف یہ ظاہر ہوا کہ یہ الفاظ باطل اور غیر مکتفی ہیں۔ طبقۂ سوم نے اپنے کو قوم کا مرادف قرار دیا تھا اور اس کا قائم مقام بن بیٹھا تھا لیکن اسے یہ سبق لینا باقی تھا کہ اس سے خارج اور بھی بہت سے بڑے بڑے گروہ تھے جو اس کی رہبری میں ایک عام جماعت میں جذب ہو جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔

تعلیم یافتہ شہری جماعت اور عوام کی ادنیٰ جماعتوں کے درمیان وہی مخالفت ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی انقلاب اور ۱۸۴۸ء کے پولینی رجعت میں بہت ہی بیّن طور پر ظاہر ہوئی اور پھر ۱۸۴۸ء کی گنگیوں میں اس نے دوبارہ زیادہ شدید صورت اختیار کی پولین سوم نے طبقۂ چہارم کی تائید پر بھروسہ کر کے طبقۂ سوم کو جسے مجلس قومی میں بہت بڑی کثرت حاصل

بھی بزور دبا دیا، اس کے بعد سیڈان میں اُس کے شکست کھانے کے بعد عوام الناس کے تیسرے اور چوتھے طبقوں نے اپنے جوش وخروش کی حالت میں اُسے تخت سے اتار دیا (۴ ستمبر ۱۸۷۰ء) لیکن طبقۂ چہارم نے بہت جلد پاریس (پیرس) کے تیسرے طبقے کے ہاتھ سے اغنیا رات چھین لئے اور کمیون قائم کردئے۔

جرمانیا

کسانوں کی جنگ کے وقت بھی مخالفت جرمانیا میں بھی نمودار ہوگئی مگر جرمانیا کی خوش قسمتی تھی کہ اس مخاصمت نے پیرس میں جس تندی و عناد کا اظہار کیا تھا وہ اس زمانے میں وہاں نہیں پیش آئی تاہم شہری اور دیہاتی کسی آبادی میں بھی یہ تحریک بالکل بے اثر نہیں ہوگئی ہے آخر الذکر میں یہ مخالفت زیادہ تر مذہبی معاملات اور غیر تعلیم یافتہ عوام اور حکام کلیسا کے باہمی تعلقات میں ہوتی ہے اور سابق الذکر میں اقتصادی اور معاشرتی معاملات کے اندر اپنا رنگ دکھاتی ہے۔

شہری درجہ (جماعت) کوئی طبقہ نہیں ہے۔

یہ شہری جماعت اگرچہ تاریخی طور پر ازمنۂ وسطےٰ کے طبقۂ سوم سے تعلق رکھتی ہے مگر صحیح طور پر وہ اس نام کو نہیں اختیار کرسکتی۔ اب یہ مخصوص حقوق کا منفرد طبقہ نہیں ہا جیسا طبقۂ اعیان کے مانند یہ بھی ایک رواں شے ہے جس کے اجزا برابر آتے اور جاتے رہتے ہیں مگر زیادہ تعلیم یافتہ شہری یعنی تعلیم یافتہ درجات' اب بھی حقیقتاً طبقۂ اعیان اور عوام دونوں سے ممیز ہیں اور اس امتیاز کا اثر انتظام سلطنت پر پڑتا ہے اور نظام سلطنت سے بھی زیادہ سلطنت کا طرز عمل اور اس کا انتظام متاثر ہوتا ہے۔ وہ طبقۂ اعیان سے اس امر میں مختلف ہیں کہ وہ کسی اقتداری حیثیت کے لئے کوئی خاص دعویٰ نہیں کرتے اور اسلئے نہ وہ خطاب ومنصب کے خاص امتیازات کے طالب ہیں اور نہ ایوان اعلیٰ میں نمائندگی کے خواہاں انکی تعلیم وتربیت میں مدنیت کا عنصر غالب ہے، ان کا معاشری اور سیاسی درجۂ عام قومیت اور عام حقوق کی بنیاد پر قائم ہے لہذا وہ بالطبع عام نیابت میں شریک ہیں رعایا کے عام حجم غفیر پر انھیں اپنی علمی یا ترقی قابلیت، تمدنی آداب اور آزاد انہ پیشوں کی وجہ سے برتری حاصل ہے اس لئے کہ وہ ہاتھ کے بجائے دماغ سے کام کرتے ہیں اور اعلیٰ ذہنی کوششوں کے بہ نسبت زندگی کی مادی ضروریات کی طرف کم متوجہ ہوتے ہیں۔

بلکہ ایک عام درمیانی درجہ ہے۔

وہ بھی عوام ہی کی ایک جماعت ہیں مگر عام انبوہ سے بلند تر طبقۂ اعیان کے مانند

وہ ایک درمیانی طبقہ ہیں مگر وہ چوتھے درجے سے زیادہ قریب ہیں اور اُسی سے برابر اضافہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ انگلستان میں شرفا (جنٹلمین) اسی عنوان کے تحت میں آتے ہیں مگر جرمانیا، فرانس اور اطالیا کی اعلیٰ شہری جماعت کے بہ نسبت وہ زیادہ محدود و منتخب جماعت ہیں۔ اس عنوان کے تحت میں آبادی کے درجات ذیل آجاتے ہیں:۔

اس کی ہیئت ترکیبی

۱۔ ایسے سرکاری عہدہ دار جن کو اعلیٰ اقتدار حکومت حاصل نہیں اور جو بالکل ادنیٰ درجے کے ملازم یعنی اہل عملہ بھی نہیں ہیں۔

۲۔ عموماً پادری اور معلمین،

۳۔ ڈاکٹر یعنی یونیورسٹی کے سند یافتہ، قانون پیشہ، طبابت پیشہ، دواساز، غیر پیشہ ور اہل علم اور مصنفین،

۴۔ فنون لطیفہ کے ماہر، انجینیر اور اعلیٰ صنعتی پیشوں کے ارکان،

۵۔ بڑے تاجر اور کارخانہ دار،

۶۔ ہنرور دستکاروں کی اعلیٰ جماعت،

۷۔ سرمایہ دار۔

۸۔ بڑے بڑے زمیندار جو طبقۂ اعیان میں شامل نہیں ہیں۔

اس جماعت کا حقیقی وصف اعلیٰ تعلیم ہے اگرچہ یہ لازمی نہیں کہ یہ تعلیم کسی جامعہ یا اعلیٰ صنعتی تعلیم گاہ ہی میں حاصل کی گئی ہو اور اس میں بالعموم یہ بھی مرعی رہتا ہے کہ ذرائع آمدنی ایسے ہوں کہ عام کاموں کے لئے وقت مل سکے۔ سرکاری عہدوں کے انتخاب کے لئے جامعہ کی تعلیم لازماً فرض کرلی جاتی ہے اور سیاسی جماعتوں کے کام میں حصہ لینے کی اعلیٰ مناسبت کے باعث اگر کوئی خاص قانون اس کے خلاف نہ ہو تو انھیں لوگوں کو قومی مجلسوں اور قانونی ایوانوں میں غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اس کی سیاسی قوت۔

موجودہ زمانے کی سلطنت کی زندگی میں عموماً یہ درجہ سب سے زیادہ با اثر ہوتا ہے، معاملات عامہ میں اسے بیشتر وہی حاصل ہو جاتی ہے اور وہی عام رائے کو متعین کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی شمولیت کا انحصار تعلیم، جائداد اور پیشے پر ہوتا اور نسب کا کچھ ایسا لحاظ نہیں کیا جاتا، تاہم ایسے قدیمی "اشخاص آزاد" کے درجے کو ازمنۂ وسطیٰ

کے درجۂ متوسط کے مقابل قرار دینا مناسب ہوگا انھیں کے مانند یہ بھی سیاسی حقوق رکھنے والوں کی خاص الخاص جماعت ہوتی اور سرکاری عہدوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

قوم کے وسیع درجات "نام نہاد طبقۂ چہارم" اور غیر ملکیوں کی جماعتیں

۴۔ درجہ ادنیٰ یا عوام

اس چوتھے درجے میں ہم عوام کے اس جم غفیر کو شامل کرتے ہیں جو اوپر کے تین درجوں میں داخل نہیں ہیں، انھیں کو ہم بسا اوقات "عوام" کہتے ہیں اس میں بہت ہی مختلف پیشوں اور بہت ہی متباین زندگی کے لوگ شامل ہیں مگر سب کے سب ایک عام ملک و قومیت کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ مشترک حقوق شہریت کے تعلق سے باہم وابستہ ہیں۔ اس میں ذیل کے گروہ شامل ہیں اور سلطنت کے اقتصادیات میں ان کی مختلف جگہیں ہیں۔

(الف) کسانوں کا گروہ کثیر جو بطور خود اپنے نوکروں کی مدد سے کام کرتا ہے جو ہل چلاتے، میدانوں کی گھانس کاٹتے، غلہ جمع کرتے، انگور کی بیلوں کو چھانٹتے، کھلیان جمع کرتے اور پالو جانوروں کی سیوا کرتے ہیں، یہی لوگ اس درجے کے سب سے کثیر اور سب سے قوی جز و ہیں اور یہی اس رئیس قومی قوت کا منبع ہیں جس سے دوسرے درجات نئی زندگی اور نئی طاقت حاصل کرتے ہیں۔

(ب) گلہ بان، ماہی گیر، شکاری، ملاح، کان کن اور بالعموم وہ تمام مزدور جنھیں پیشے کے تعلق سے براہ راست فطرتی اشیا (یعنی زمین) پانی، جانوروں اور زمین سے اگنے والے پھل پھول) سے ہر وقت کام پڑتا ہے۔

(ج) شہر اور قصبے دونوں کی فروتر شہری جماعت۔ اس میں اولاً کارخانہ دار کاریگر مع اپنے آدمیوں کے اور چھوٹے چھوٹے تجارت پیشہ لوگ شامل ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی نیچے درجے کی حرفتی جماعت بھی خواہ خود اپنے گھروں کے اندر کرگھے وغیرہ پر

۱؎ قدیم روما میں سب سے فروتر طبقہ پرولیٹاریئس (Proletarius) کہلاتا تھا وہ سلطنت کی خدمت دولت سے نہیں بلکہ اپنی اولاد سے کرتا تھا۔ پرولیس ( ) کے معنی اولاد کے ہیں مگر اب ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس کوئی ملک نہ ہو، صحیح ترجمہ اس کا غیر "ملکی" ہے۔ مترجم۔

کام کرتی ہوں، خواہ کارخانوں میں کام کرتی ہوں، دونوں اس میں داخل ہیں۔

(د) سلطنت کے اور پیشہ ور اشخاص کے ادنیٰ ملازمین یا فوج کے معمولی سپاہی دفتروں کے محرر نقل نویس وغیرہ۔

(ہ) غیر ملکی یا عامی جن میں ادنیٰ ترین درجے کے ملازمین اور مزدوری پیشہ لوگ داخل ہیں۔ ان سب گروہوں میں ما بہ الاشتراک یہ ہے کہ وہ جسمانی محنت اور مادی ضروریات کے پیدا کرنے میں مشغول ہیں، فی الحقیقت یہ غیر ممکن ہے کہ دماغی اور جسمانی کام کے درمیان کوئی قطعی حد فاصل قائم کی جاسکے کیونکہ یہ لازمی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بغیر کمزور پڑ جاتا ہے مگر ان کا فرق ایک صحیح اور قابل تسلیم فرق ہے۔ دماغی کام میں نسبتاً اعلیٰ ذہنی تربیت اور اعلیٰ معاشرتی حیثیت کی ضرورت ہے، ہاتھ کا کام بہت ہی کم تعلیم اور سادے اور معمولی طرز زندگی کے ساتھ ممکن ہے، اس لئے یہ دونوں کام بالطبع دو مختلف طبقوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔

درجۂ چہارم کی ایک مزید خصوصیت یہ ہے کہ وہ اگرچہ تمام سلطنتوں اور عام قومی زندگی کی لابدی بنیاد ہوتے ہیں مگر ان میں حکمرانی کی قابلیت نہیں ہے، اس لئے انھیں رہبروں اور قائم مقاموں کی ضرورت پڑتی ہے۔ معاشرتی جماعت میں وہ بالعموم ساکت و تابع جزو کو ظاہر کرتے ہیں، مگر جب ان کے جذبات انقلاب کے لئے بھڑک اٹھتے ہیں تو پھر موجودہ انتظام کے الٹ دینے اور اپنی مرضی کو قانون بنا دینے کی جو طاقت ان میں ہوتی ہے اسے کوئی شے روک نہیں سکتی۔ کسی حکومت کے بدل دینے یا کسی قسم کے نظام سلطنت کے بزور حاصل کرلینے کی ان میں پوری قوت ہے وہ تخت شاہی کو الٹ سکتے اور نئے لوگوں یا نئے خاندانوں کو اختیار تفویض کرسکتے ہیں مگر خود حکمرانی کرنے کی قابلیت ان میں نہیں ہے جہاں کہیں ان کو اس کوشش کا موقع ملا کہ خود حکومت کریں وہاں سلطنت کی حالت اس آدمی کی سی ہوگئی جو سر کے بل کھڑا ہو اور ٹانگیں اوپر کو ہوں۔

اس طبقہ کی موجودہ اہمیت

سیاسی زندگی میں اس طبقے کو ابتک کبھی ایسی اہمیت نہیں حاصل ہوئی تھی جیسی اس وقت اسے یورپی سلطنتوں میں حاصل ہے۔ خدمتگار جماعت کے تنگ و محدود مفہوم میں یہ پہلا موقع ہے کہ وہ آزاد ہوگئی ہیں، فروترین جماعت تک یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ سلطنت کی

بہبودی میں اُن کا بھی حصہ ہے اور سیاسی حقوق پر انھیں بھی استحقاق ہے۔ حالات کے اعتبار سے اب سلطنت کے ارباب حل و عقد مجبور ہیں کہ اس طبقۂ چہارم کی حالت پر خاص توجہ کریں اب صرف اس قدر کافی نہیں ہے کہ صرف تعلیم یافتہ جماعت کی رائے سن لی جائے اور اس پر غور کیا جائے۔ اب عوام کے اپنے احساس و جذبات کا اثر اگلے زمانے کے بہ نسبت بہت زیادہ قوی ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی موجودہ زمانے کی سلطنت میں (جس سے سب سے پہلے یورپی یعنی آریائی نسل کی قوموں کی سلطنت مراد ہے) زیادہ انسانی خصائل و شمائل پیدا ہو گئے ہیں۔

لیکن طبقۂ چہارم اس قدر وسیع ہے کہ مختلف پیشوں اور مختلف مدارج زندگی کے بڑے بڑے گروہ سب اس میں شامل ہیں، سیاسی جماعت کے جسم کے اقوی ترین وصعب ترین اجزا اسکے اندر متحد ہیں، سلطنت کے حفظ و بقا کے لئے اُس کی ہستی لازمی ہے مگر اُس نے خود سلطنت ہی کی ہستی کو خطرے مین ڈال رکھا ہے، اُس کا صحیح ترین حصہ کسانوں کی جماعت میں پایا جاتا ہے لیکن اگر انتظام عام کو تباہی سے بچانا ہے تو ان کسانوں کے واسطے بھی ضرورت ہے کہ کسی مذہبی یا ذہنی تحریک سے ان میں زندگی پیدا کی جائے ان کے بعد ادنی شہری جماعت کا درجہ ہے دونوں میں ایک مختص المقام تنظیم قائم ہے مگر شہروں کے انبوہ در انبوہ عوام الناس کی ضروریات کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ درانحالیکہ اور دوسرے معاشری تعلقات ٹوٹ چکے ہیں، وہ قدیم انتظام جس سے بڑے بڑے اہل حرفہ خود آپس میں اور اپنے کاریگروں کے ساتھ متحد رہتے تھے تباہ ہو چکا ہے یہ قدیم نظم زائل ہو چکا ہے اور یہ تمام جماعتیں خاصکر کارخانوں کے کام کرنے والے ابتری میں پڑ گئے ہیں کام کرنے والوں کی خود ساختہ انجمنیں اور مزدوروں کے جتھے تنظیم جدید کے تخم اولین ہیں اس فساد تنظیم سے سوسائٹی (نظم معاشرت) کو نقصان پہنچ رہا ہے، مختلف مزدوری پیشہ طبقات میں تعلیم کی یکرنگی اور اغراض اور طبائع کی یکجہتی اگر بالکل معدوم نہیں ہو گئی ہے تو اس میں ابتری ضرور آگئی ہے اور اس ہیجان عام کا رخ اس طرف ہے کہ ہر شخص اپنے ہمسایہ سے بے ضرورت برسر پرخاش ہے۔ پولیس کی کارروائیاں لاحاصل رہتی ہیں کیونکہ وہ مختص حالات میں خرابی کو روک سکتی یا اسے دبا سکتی ہیں۔ مگر جہاں معالجانہ اصلاحی تدابیر کی ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ اپنے پریشان کن طریق عمل سے اکثر اُس خرابی میں

اُس کی تنظیمی کمی

اور اضافہ کردینی ہیں یہ امر تعجب انگیز نہیں ہے کہ دہریت اور اشتراکیت کو طبقۂ چہارم کے زرین سطحوں میں بار آور زمین مل گئی ہے اور اکثر بڑے بڑے شہروں میں بلکہ دیہات کے بھی بعض حصص میں یہ اندیشہ دامنگیر ہوگیا ہے کہ خس و خاشاک قدیم زمانے کی شریف تر پودوں کو بالکل دبا نہ دیں۔

غیر ملکی

"غیر ملکی" حلقۂ چہارم کے فروترین درجے میں ہیں۔ اسے طبقۂ چہارم کے مرادف نہیں سمجھنا چاہیے نہ اسے ایک درجے یا فرقے کے طور پر ترتیب دینا چاہیے بلکہ ملکی مدبر کا کام یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے اُسے دوسرے طبقات میں جذب کردے اور اس طرح ایک جداگانہ جماعت کی حیثیت سے اس کی ترقی کو روک دے یہ زیادہ تر دوسرے درجات کا "جزو فضول" ہے یا آبادی کے وہ اجزا ہیں جنھیں اُن کی بےبسی اور غربت کی وجہ سے سوسائٹی (معاشرت) کی معینہ تنظیم میں کوئی جگہ حاصل نہیں ہوتی یہ امر فی نفسہٖ غلط اور سیاسی نظر سے خطرناک ہے کہ سلطنت کے باشندوں کے درمیان ذی املاک اور غیر ذی املاک کی ایک معینہ تفریق قائم کی جائے اور آخر الذکر کے مجموعے کو "غیر ملکی" قرار دیکر اُن میں اور "ملکیوں" میں مخاصمت پیدا کردی جائے اگر عدم ارتباط کا یہ خیال جس کی زمانۂ ازضرورت ہمت افزائی کی گئی ہے اسی طرح پھیلتا رہا اور اُسے غلبہ حاصل ہوگیا تو یہ بربریت کے ایک نئے طوفان سے مہذب سوسائٹی کو غرقاب کردے گا۔ خوش قسمتی سے غیر ذی املاک اشخاص کا بڑا حصہ ہنوز دوسرے درجوں سے جسمانی ربط و تعلق رکھتا اور اُس پر مطمئن ہے۔ بے ملک لڑکے "غیر ملکیوں" کے زمرے میں شامل نہیں ہیں کیونکہ وہ اپنے خاندان کی حفاظت و ترتیب میں ہیں اور اپنے والدین کی حیثیت میں شریک ہیں مذہبی حلقوں کی تنظیم میں یتیموں تک کو خاندانی زندگی حاصل ہے۔ نیز کھیتوں میں کام کرنے والے مرد و عورت جن کی کوئی ملک نہیں ہوتی وہ بھی "غیر ملکیوں" کے تحت میں شامل نہیں کیے جاسکتے کیونکہ وہ دنیا میں تنہا نہیں ہیں بلکہ زراعت گاہ یا کسان کے خاندان میں انھیں جگہ ملتی ہے اور کسانوں کے طبقے کی زندگی میں وہ شریک ہیں دستکاروں کا انتظام جب بہتر تھا تو امیدوار کام کرنے والا اپنے استاد کے خاندان کا ایک رکن ہوتا تھا اور اب اس تعلق کے ٹوٹ جانے پر بھی دستکار جماعت سے متعلق ہونے کا خیال اُسے "غیر ملکیوں" سے بلند رکھتا ہے، خانگی ملازم بھی کسی قدر آرام کی حالت میں رہتے ہیں

اور اپنے آقاؤں کی معاشرت میں اُن کا کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے سپاہی کو تنخواہ ملتی اور سپہگری کا کام اُس کی عزت کا موجب ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ خطرناک صورت عام مزدوروں کی غیر منتظم حالت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی جماعت ہے جس میں "غیر ملکیوں" کا اجتماع نہایت درجہ وسیع اور خطرناک حد کو پہنچ گیا ہے۔ مدبر سلطنت کا اصلی تدبیر یہ ہونا چاہیئے کہ ایک طرف وہ کوشش کرے کہ مزدوروں کی منتظم جماعت کے ارکین کو غیر منتظم "غیر ملکیوں" میں شامل ہوجانے سے روکے اور دوسری طرف تا حد امکان "غیر ملکیوں" کو اس منتظم جماعت تک ترقی کرنے میں مدد دے جہاں وہ نسبتاً زیادہ قابل اطمینان ذریعۂ معاش حاصل کرسکیں "غیر ملکی" اس طرح محدود ہو کر جدا گانہ تنظیم کی ضرورت نہ سمجھیں گے جس کے لئے وہ ناموزوں ہیں بلکہ انھیں صرف ایسے سرپرستوں کی ضرورت ہوگی جو اُن کے اغراض کی حفاظت اور اُن کی نیابت کا حق ادا کریں۔

طبقۂ چہارم کے سیاسی دعاوی

طبقۂ چہارم سلطنت کے عہدوں کے کام انجام دینے کی قابلیت نہیں رکھتا مگر اُس کے بہتر افراد بلدی عہدوں کی خدمات انجام دے سکتے ہیں اور وہ ان سے محروم نہیں کئے جاسکتے۔ قوم کی نیابت میں اُنھیں حصہ ملنا چاہیئے اور سلطنت کو اس امر پر نظر رکھنا چاہیئے کہ طبقۂ سوم اپنی اعلیٰ تعلیم اور زیادہ فرصت کی وجہ سے اس طبقۂ چہارم کو کلیتہً محروم نہ کردے جیسا کہ ابتک ہوتا رہا ہے لیکن چونکہ اس درجے کے ارکین کو بذات خود اپنے اغراض کی نیابت کی نہ فرصت ہے نہ قابلیت اسلئے انھیں موقع ملنا چاہیئے کہ وہ اپنی جماعت سے باہر کے لوگوں کو اپنا قائم مقام منتخب کرسکیں آخر میں یہ کہنا ہے کہ اس درجے کی اہمیت اُسے اظہار رائے کا مستحق قرار دیتی ہے مگر جہاں افراد مشترکہ کی معاشری اہمیت اور قابلیت اس درجہ مختلف ہو وہاں یہ ناانصافی ہے کہ سب کو برابر کا اختیار دیا جائے۔

حقیقی "غیر ملکیوں" کے حقیقی اغراض کا تقاضا قائم مقاموں سے زیادہ سرپرستوں کے لئے ہے کیونکہ وہ خود اپنے اندر قائم مقامی کے لائق افراد نہیں پاسکتے اور سرپرست کی حیثیت اور اس کا اثر جس قدر بلند ہوگا اسی قدر "غیر ملکیوں" کے حقوق کی حفاظت زیادہ موثر طور پر ہوگی۔

انیسواں باب

سلطنت کا تعلق خاندان سے

(ا)۔ قبائلی سلطنت۔ پدرسری حکومت۔ ازدواج

متقدمین و متاخرین سب نے خاندان کو سلطنت کا نمونہ قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سلطنت ایک طرح پر خاندان کی توسیع ہے۔ سرسلطنت باپ کے بجائے ہے اور رعایا اُس کے بچے ہیں۔

سلطنت اور خاندان کے درمیان فرق

یہ مقابلہ صرف ایک محدود مفہوم میں صحیح ہے۔ یہ صرف ایک پدرسری سلطنت پر صادق آسکتا ہے۔ سلطنت کی اعلیٰ صورتوں پر جن کی بنا قومیت اور انسانیت پر ہے یہ خیال منطبق نہیں ہوتا۔ پس ضروری ہے کہ اُن اصولی فرقوں کی تشریح کردی جائے جن سے سلطنت اور خاندان میں تمیز ہوتی ہے۔

ا۔ خاندان کی بنا ازدواج پر ہے اُس کے اراکین ازدواج کے رشتے یا خون کے تعلق سے متحد ہوتے ہیں مگر یہ خیالات جو خاندان کے لازمی ہیں سلطنت کیلئے کسی اعتبار سے لازمی نہیں ہیں ایک ہی سلطنت کے رکن ہونے کی حیثیت سے لوگوں کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ ازدواج اور خون کے وسیلے سے نہیں ہوتا انھیں ہمیشہ ازدواج باہمی کا حق حاصل نہیں ہوتا چہ جائے کہ وہ سب کے سب ایک ہی نسل سے ہوں پس خاندان کے بنیادی حقوق سلطنت سے بالکل آزاد ہیں۔

۲۔ سلطنت کی بنا قوم کی تنظیم اور اُس کے ارضی تعلق پر ہے مگر خاندان میں ان خیالات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ سلطنت خاندانوں کے بجائے زیادہ تر افراد طبقات، یا جماعات پر مشتمل ہے اور صرف مستثنیٰ حالتوں میں خاندانی واسطے سے اپنے

اراکین تک پہنچتی ہے خاندانی زندگی میں وہ صرف اُسی وقت دخل دیتی ہے جب کوئی خاص ضرورت داعی ہوتی ہے یا تولیت کی صورت پیش آتی ہے۔ آخراً یہ کہ خاندان کا کوئی واسطہ زمین سے نہیں ہوتا۔

۳۔ دونوں عضویے (یعنی سلطنت اور خاندان) اپنی کیفیت میں مختلف ہیں۔ خاندان کا بزرگ باپ ہوتا ہے جس کا اقتدار یہ ہے کہ ایک بالغ شخص خود اپنے دم و لحم کی حفاظت کی فکر کرتا ہے فی الاصل یہ ایک طرح کی تولیت ہے۔ سلطنت میں مختلف جماعت کے اغراض اپنے سردار یعنی بادشاہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے خاندانوں کا تعلق بادشاہ کے خاندان سے نہیں ہوتا، نہ سلطنت کے افراد اس کے بچے یا اس کے زیر تولیت ہوتے ہیں، سلطنت کی حکومت ایک سیاسی حکومت ہے پس خاندان عام سلطنت کا نہیں بلکہ اس کی صرف ایک صورت خاص یعنی پدر سری سلطنت کا نمونہ[1] ہے اس لئے خاندانی قانون، قانون شخصی سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ قانون عام سے مگر سلطنت کی ابتدا آریائی اقوام تک میں خاندان اور قبیلے ہی کے روابط سے تعلق رکھتی ہے اول اول ہادیان قوم، منصفوں اور حاکموں کو اپنے اختیار کی ضروری تائید خاندان ہی سے حاصل ہوئی اور صرف تدریجی طور پر یہ ہوا کہ ایک سیاسی نظم ایسا پیدا ہوا جو ان حدود سے تجاوز کر گیا۔

قبائلی نظام　قبائلی نظام نے خاندان اور سلطنت کے مابین ایک پل کا کام دیا اور جس وقت سلطنت اپنے قیام کی طرف سے مطمئن ہو گئی اُس وقت یہ پل گرا کر الگ کر دیا گیا اکثر قدیم اقوام میں ہمیں ایسے قبائل ملتے ہیں جو سیاسی اہمیت رکھتے تھے مگر جو بعد میں ناپید ہو گئے۔ ایسے قبیلے قدیم موسوی نظام حکومت میں بھی اُسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح قدیم یونانی یا قدیم رومی نظام حکومت میں جس طرح قدیم عربی قبیلے اپنے

---

[1] گوبینو نے اپنی کتاب "انسانی نسلوں کی نامساویت (Sur e'inegalite "des races humaines) میں یہ بیان کیا ہے کہ پدر سری تصور حکومت جو باپ کے اقتدار کو فرمانروایانہ اقتدار کا نمونہ قرار دیتا ہے، اُسے آریائی قوموں نے بہت سمجھ بوجھ کے اور اہم مستثنیات کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ برخلاف اُن کے چینیوں کو جو زرد نسل کی سب سے بڑی قوم ہیں۔ اس طرز حکومت کی کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

سرداروں کا پدرانہ احترام کرتے تھے اُسی کا نمونہ ہمیں اسکاٹلینڈ کی جرگوں میں ملتا ہے جرمانی دیہاتوں کے نام اس بات کا کافی ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ وہاں جو لوگ سکونت پذیر تھے وہ قبائل یا خاندانوں کی صورت میں منضبط تھے۔ بعد کو انھیں قبیلوں نے اپنے تئیں جتھوں کی صورت میں عضو بند کرلیا۔ اور قدیم سلاو کسانوں کے جتھوں کی نوعیت بھی ایک خاندان کی سی ہے۔

قبیلے اور خاندان میں فرق یہ ہے کہ ایک قبیلے کے اندر متعدد یک جدی گروہ داخل ہوتے ہیں مگر قبیلے کا انتظام خاندان کے انتظام کے مثل ہوتا ہے، قبیلے کے سردار بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں جنھیں خاندانوں کے اندر بلند مرتبہ حاصل ہوتا ہے مگر اتحادی ضرورت قبیلے کی سرداری کو ایک خاندان کے ایک ہی سرگروہ (سردار) تک محدود رکھتی ہے اور ایسا ہوسکتا ہے کہ خاندانی حق کے بجائے انتخاب یا قرعہ اندازی کے طریقے پر عمل کیا جائے۔

پدرسری سلطنت

جو سلطنت قطعی طور پر خاندان کے نمونے پر قائم کی گئی ہے وہ پدرسری سلطنت ہے۔ چین کی کاملہ شہنشاہی (جسے خود چینی، وسطی شہنشاہی کے نام سے یاد کرتے ہیں) صدیوں سے مضبوطی کے ساتھ اس خیال پر جمی ہوئی ہے کہ سلطنت کا سرتاج رعایا کا باپ ہے۔ گوبینو جس نے اس یقین کے وجوہات ظاہر کئے ہیں کہ سلطنت کی اول بانی آریائی نسلیں ہیں وہ پدرسری خیال (سلطنت) کو انھیں کی تجویز کی طرف منسوب کرتا ہے مگر اس شہنشاہی عظمیٰ کی نہایت کثیر آبادی جو بتدریج ایک خاندان میں متحد ہوگئی ہے اُس کی اصل ملایائی نسل سے ہے جس میں زرد نسل کا جزو نہایت غالب ہے گو کالی نسل کے میل سے وہ بالکل بے غش نہیں رہی ہے۔ یہ آبادی جو آسان پسند مادی زندگی کی طرف مائل ہے حکمرانوں کی پدرانہ مطلق العنانی پر خوشی سے راضی ہوجاتی ہے اور سلطنت کے روایتی نظام کو ایک منجانب اللہ نظام تمدن سمجھ کر اس کا احترام کرتی ہے۔ آریائی قوموں میں آزادی کا جو مضبوط احساس خلقتاً موجود ہے اس کا اس پر کچھ اثر نہیں ہے اور نہ اس کے حوصلوں میں کچھ بلندی ہے نظریے کے لحاظ سے تو شہنشاہ اقتدار مطلق رکھتا ہے مگر حقیقت میں قوم کے سارے طبقوں کے سکون پسند طبائع، مندارینوں (یعنی چینی عالموں) کی قدیمانہ فضیلت نما تعلیم و تربیت اور سب سے بڑھکر نسلاً بعد نسل کے خاندانی رواج

کی قوت نے اس اقتدار مطلق کو بہت کچھ محدود کر دیا ہے۔ چنانچہ کونفیوشس کہتا ہے کہ "آسمان کا بیٹا (یعنی ظل اللہ) سب کچھ کر سکتا ہے مگر اسی شرط پر کہ وہ صرف وہی کرنا چاہے جس کا علم اور جس کا رواج پرانے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔" مگر جہاں سلطنت اور اس کے اراکین ایک پدرانہ نظام سلطنت کے ذریعے سے دائمی طفولیت کی حالت میں رکھے جائیں وہاں زوردار سیاسی ترقی کا ہونا ناممکن ہے۔

خاندان کا اثر سلطنت پر

سلطنت کی بہبود پر خاندانی زندگی کا اثر ایک بالکل ہی جداگانہ سوال ہے اس کا اثر اگرچہ زیادہ تر بالواسطہ ہوتا ہے لیکن یہ دوررس اثر ہے اور جس قدر بھی اسے بلند سمجھئے کم ہے اس لیے سلطنت پر نہ صرف یہ لازم ہے کہ وہ خاندانی قانون کی شخصی قانون کے ایک جزو کے طور پر محافظت کرے بلکہ خاندانی زندگی کی بہبود کے ترقی دینے اور اس کے برقرار رکھنے پر بھی اُسے خاص توجہ کرنا چاہیے چونکہ خاندان کسی قسم کی سیاسی تنظیم نہیں ہے اس لیے اس معاملے میں سلطنت کی طاقت کم اور زیادہ تر بالواسطہ ہے مگر بعض تعلقات ایسے ہیں جن میں وہ شخصی خودسری کو روک سکتی ہے اور اُسے روکنا چاہیے۔ مثلاً ازدواجی تعلق کے معاملات میں۔

ازدواج، اس کی اعلیٰ ترین صورت توحد ازدواج ہے

تمام اعلیٰ ترقی یافتہ قومیں۔ توحد ازدواج کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ ایک ہی بیوی کے کئی شوہر ہوں تو خود نسل ہی میں ابتری پڑتی ہے اور ایک مرد کی کئی بیویاں ہوں تو خاندان میں مناقشہ پیدا ہوتا ہے۔ ازدواج کی کامل یکجہتی تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت میں باہم اتحاد کا رشتہ قائم ہو۔ جنسوں کی دوئی جس میں انسانی دنیا منقسم ہے توحد ازدواج کے ذریعے سے وہ دوئی پھر مل کر ایک ہی بن جاتی ہے اس لئے تعدد ازدواج نہ فطرت کے مطابق ہے نہ اخلاق کے پس سلطنت کو اُس کا روادار نہ ہونا چاہیے۔ جب گال کے اسقفہ میرونگی بادشاہوں کے تعدد ازدواج کی پرجوش مخالفت کر رہے تھے اور اُنھوں نے اس وقت تک سپر نہ ڈالی جب تک کہ ان بادشاہوں نے ٹیوٹونی بادشاہوں کے اُس قدیم شاہی حق سے دست برداری نہ اختیار کی جس کی رو سے اُن کو کئی بیویاں کرنا مباح تھا۔ اس وقت یہ اسقفہ محض ایک مسیحی اصول کی حفاظت میں سینہ سپر نہ تھے بلکہ وہ ایک سیاسی اصول کی بھی حفاظت کر رہے تھے۔ توحد ازدواج سے معاشرت میں بیوی کا مرتبہ پوری طرح پر شوہر کے مرتبے کے برابر ہو جاتا ہے اور شوہر

پر اس کا ایک عمدہ اثر مترتب ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے تعدد ازدواج عورتوں کو مردوں کی مخفی نفسانی خواہشات کے آلے بنا کر اُن کو ذلیل کر دیتا ہے اور عورت کی اس ذلیل وخوار حالت کا عکس خود شوہر پر پڑتا اور اسے بھی مبتذل بنا دیتا ہے تو حدازدواج یورپی اور مسیحی قوموں کی ایک خاص افضلیت ہے اور تعدد ازدواج مشرقی قوموں کا موروثی طوق لعنت۔ میاں بیوی کے قانونی تعلقات کا مسئلہ بھی ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔

میاں بیوی کا قانون

اس میدان میں رومی قانون، رومی تخیل ازدواج سے پیچھے رہ گیا۔ رومیوں کے خیال کے مطابق میاں بیوی کا تعلق مرد اور عورت کا ایک دلی اور عمر بھر کا اتحاد تھا مگر اُن کا قدیم قانون بیوی کو لڑکی کے مثل قرار دیتا تھا۔ شوہر کو اس پر ویسا ہی اختیار مطلق حاصل تھا جیسے باپ کو اولاد پر یا مالک کو غلاموں پر۔ برخلاف اس کے زمانہ مابعد کے قانون نے اس اتحاد کو محض دو آزاد شخصوں کا تعلق قرار دے دیا۔ رومی جمہوریہ کے آخری زمانے میں جس قدر رومیوں کا اخلاق خراب ہوتا گیا اُسی قدر ازدواج کا یہ آزاد طریقہ زیادہ عام ہوتا گیا اور جمہوریہ کے زوال کو آگے بڑھانے میں اس نے مدد دی۔

اس کے مقابلے میں جرمانی قانون ہے جس کا قدیم تر اصول تو یہ تھا کہ مناکحت کے اتحاد اور یکجہتی کی بنا پر بیوی قانوناً شوہر کی حفاظت میں آجاتی تھی گو مرد اور عورت دونوں اپنی اپنی ملکیت کے مالک رہتے تھے مگر بعد کے اصول کے موافق ملکیت بھی متحد ہو جاتی ہے۔ یہ قانون اُس خیال کے مطابق ہے جو موسوی شریعت کے نہایت قدیم احکام میں ان دو دلکش جملوں میں ظاہر کیا گیا ہے:۔ "میاں اور بیوی ایک ہی جسم ہیں اور شوہر بیوی کا سرتاج ہے۔"

بیاہ کی رسمیں

ازدواج کی ظاہری صورتوں سے بھی لاپروائی نہیں اختیار کی جا سکتی۔ اُس صورت کو جو بیاہ کے تعلق کی گہری یکجہتی اور تقدس کو ظاہر کرنے کے لئے زیبا ہے اُس صورت کے مقابلے میں ترجیح ہے جو اُسے محض ایک معاہدے کا اختیاری نتیجہ قرار دیتی ہو۔ قدیم رومی اصول کہ "دو شخصوں کا آپس میں رضامند ہو جانا ہی بیاہ ہے" محل تامل ہے کیونکہ یہ اس خیال کی طرف منجر ہوتا ہے کہ مناکحت ایک معاہدہ محض سا تعلق ہے۔

پس اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ اکثر اقوام کے رسم و رواج میں عقد کیلئے مذہبی رسوم قرار دیے گئے ہیں اور مسیحی قوموں کا عمل بھی اس پر زور دیتا ہے کہ بیاہ گرجا میں ہو

اس بات سے بھی زیادہ اہم ہے خاندان کی قانونی حفاظت جو خفیہ عقد کے منافی ہے اور اس معاملے میں صرف اعلان اور تحریری توثیق ہی سے اطمینان ہو سکتا ہے۔ غیر کلیسائی یا قانونی صورت میں یہ شرائط پورے ہو جاتے ہیں۔ اگر سلطنت کی تسلیم کردہ آزادیٔ مناکحت میں دخل دیکر اور قانون کو خیالات پر منحصر قرار دیکر پادریوں نے مذہبی شکل ازدواج سے بیجا کام نہ لیا ہوتا تو موجودہ سلطنتیں اس طریقے سے مطمئن رہتیں مگر ان خرابیوں اور مذہبی آرا کے موجودہ اختلاف نے ایک خالص قانونی صورت کی ضرورت لاحق کر دی ہے۔ اب دو شکلیں رائج ہیں۔

ا۔ عمال سلطنت کے روبرو قانونی مناکحت، جو کسی عقد کے صحیح قرار دینے کے لئے ضروری ہے۔

۔ مابعد کی کلیسائی رسم جسے پادری انجام دیتے ہیں۔ اس سے مناکحت کو مذہبی قبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ امر اختیاری ہے۔

ازدواج کی ہمت افزائی

شہنشاہ آگسٹس نے قانون کے ذریعے سے مناکحت اور آبادی کے بڑھانے کی وسیع پیمانے پر کوشش کی۔ اس قسم کے قانون کی ضرورت اُسی وقت ہوتی ہے جب قوم ایسی غیر تندرست حالتوں میں مبتلا ہو جن کے باعث افراد جذبۂ فطری کے مطابق آپس میں اتحاد قائم کرنے سے باز رہیں۔ یہ حالات خصوصاً بڑے شہروں کی معاشرت میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ شہروں میں لوگوں کو مباشرت کی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ ازدواج کے اور بھی بہت سے موقعے حاصل ہیں ان کی وجہ سے ایک بے لگام اور اور قابل نفرت زندگی عام ہو گئی ہے۔ دوسری جانب شہر میں رہ کر ایک خاندان کے مصارف برداشت کرنے میں بھی خاصی دشواری ہے۔ ایسی باتیں خاصکر اعلیٰ طبقوں میں مناکحت کی قرار واقعی روک تھام کر دیتی ہیں۔

روما میں وصیت کی آزادی نے اس راہ میں ایک اور بھی روک پیدا کر دی تھی کیونکہ ایک غیر شادی شدہ دولت مند شخص کو یہ یقین ہوتا تھا کہ اُس کے بڑھاپے میں اُس کے پُر طمع اعزا و احباب ترکہ پانے کے شوق میں غلاموں کی طرح اُس کی خدمت اور خوشامد کریں گے۔ آگسٹس بجا طور پر یہ کہہ سکتا تھا کہ "مکانوں" "مسقف راستوں اور خالی بازاروں سے شہر نہیں بنتا ہے بلکہ شہر آدمیوں سے بنتا ہے اگر تم تنہائی پر مصر رہے

توڑ روتا ئیوناہیوں بلکہ وحشیوں کا شکار ہو جائے گا۔"

مگر دیہات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کسانوں کی اراضی کے قائم رکھنے اور جائدادوں کی تقسیم کے روکنے کے خیال سے اس قسم کی بندشیں موجود ہیں۔ چنانچہ اکثر مقامات میں صرف دو اولادوں کو وراثت ملتی ہے۔ بعض جگہ بڑے بیٹے کے سوا باقی کل بیٹے زرعی خادم سمجھے جاتے یا باہر بھیج دئے جاتے ہیں۔ مناکحت اور تناسل کے بڑھانے کے لئے سلطنت جن ذرائع کا استعمال کرسکتی ہے وہ بلاشبہ محدود ہیں اور جیسا کہ آگسٹس کو تجربہ ہوگیا ہر صورت میں ناگوار سمجھے جاتے ہیں۔ مناکحت پر کسی کو قطعی طور پر مجبور کرنا ممکن نہیں کیونکہ اُس کے لئے جانبین اور اُن کی آزادانہ مرضی لازمی ہے۔ ایک صاحب تاج و تخت کے معاملے میں جہاں مفاد عامّہ کے لئے مناکحت بسا ضروری ہے سلطنت کی مرضی کو شخصی حقوق میں مداخلت کرنے اور انسانی آزادی میں دست انداز ہونے کے بجائے زیادہ تر خود اپنی مرضی کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ اس معاملے میں ملکہ وکٹوریا نے شاہی آزادی کو اہم سیاسی اغراض کے مقابلے میں کامیابی کے ساتھ قائم رکھا۔ سلطنت صرف اس طرح بالواسطہ کارروائی کرسکتی ہے کہ ازدواج کے لئے خاص امتیازات مقرر کرے اور تجرد کے منافع کو کم کردے مگر اُسے جرم نہ قرار دے۔ رومی قانون نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

ازدواج کی روک۔

اس کے برخلاف موجودہ سلطنتوں میں عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بہبودی عامہ کے خیال سے ازدواج میں روک پیدا ہو جاتی ہے[۱] اس قسم کے قانون کی ضرورت سوسائٹی (نظم معاشرت) کی غیر تندرست حالت اور خاصکر بے املاک اور بے پیشہ جماعتوں کی سقیم حالی کی وجہ ہے۔ اس صورت میں قوم اپنے نفع کے خیال سے یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ جو لوگ عقد کرنا اور نئے خاندان کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ثابت کریں کہ قوم یا سلطنت پر بار ڈالے بغیر وہ خود اپنے خاندان کا بوجھ اُٹھا سکتے ہیں مگر اس حد سے تجاوز کرنا اور مناکحت کو سلطنت کی حکمانہ مرضی پر منحصر کرنا شخصی حقوق میں ایک ناواجب مداخلت ہے۔ مزید براں مناکحت پر قانونی بندشیں عائد کرنے سے حرامی بچوں کی تعداد گھٹنے کے بجائے

[۱] ازدواج کے روکنے والے قوانین و رسوم کے متعلق مل کی پولیٹکل اکانومی (اقتصادیات) کتاب دوم باب یازدہم دیکھنا چاہئے۔ (انگریزی مترجم)

اور بڑھتی ہے اور اس طرح ایسے بے گھرے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے جن کی نہ پرورش ٹھیک ہوتی ہے اور نہ اچھی تربیت۔ خاندان کے قیام اور بیوی کی مدد سے شوہر پر عمدہ اخلاقی اثر پڑتا ہے اور اقتصادی نظر سے بھی سودمند ہو سکتا ہے اسلئے علی العموم مناکحت کی کامل آزادی کو مستحسن سمجھنا چاہیے۔ اگر قانون سب کی بھلائی پیش نظر رکھتا ہے تو اسے غربا کے لئے یہ امکان پیدا کرنا چاہیے کہ ایک غریب کسی کو اپنی غربت کا رفیق اور اپنے بچوں کی جائز اور باحرمت ماں بنا سکے۔

سلطنت زن و شوہر کے خانگی تعلقات میں مداخلت نہیں کر سکتی لیکن نقصان رسیدہ فریق کی شکایت پر حق ازدواج کے توڑنے والے کو سزا دے سکتی ہے اور سزا دینا چاہیئے تاکہ مناکحت کی پاکیزگی کی حمایت ہو سکے۔

افلاطون نے اپنی خیالی سلطنت کے محافظین کے لئے بیویوں کی جس قسم کی جماعت عام کی تجویز کی ہے وہ ازدواج کی ذلت اور خاندان کی تباہی کا موجب ہے۔ بیویوں سے فاحشہ عورتوں کی طرح کام لینا جس پر بعض صورتوں میں اسپارٹا میں عمل ہوتا تھا وہ وحشت کی یادگار ہے، لیکن بیج کن اجتماعی فریق، انفرادی آزادی کی ترقی کے زعم میں آزادئ جسم کی جس طرح طرفداری کر رہا ہے اس سے انسان کی اخلاقی آزادی کو کتوں کی شہوانی آزادی سے پست تر بنا دیتا ہے۔

نکاح و طلاق

آخر میں ازدواج کے بقا اور طلاق کے حصر کے لئے سلطنت کا قانون بیان کرنا ضروری ہے عیسوی زمانے کے قبل بھی عقد مناکحت کا انفساخ محض زن و شوہر کی مرضی پر نہیں چھوڑ دیا گیا تھا، البتہ مختلف قانونی طریقوں سے شوہر کے لئے جائز تھا کہ وہ اپنی بیوی کو علیحدہ کر دے لیکن ایسا کرنے کے لئے شوہر کو بالعموم کافی وجہ ظاہر کرنی پڑتی تھی، اور جیسا کہ ہم قدیم ٹیوٹونی قوانین میں دیکھتے ہیں، اگر مرد ایسا نہ کر سکتا تو اسے بھی سخت نقصانات برداشت کرنا پڑتے، برخلاف اس کے بیوی مناکحت کو فسخ نہیں کر سکتی تھی، یہ قواعد جن پر رواج نے مہر تصدیق لگا دی تھی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عام طور پر مناکحت زندگی بھر کا تعلق سمجھی جاتی تھی، روما نے جب التخفیر کا اصول اختیار کر کے آزاد مناکحت کو جانبین کی مرضی پر قابل فسخ قرار دیا تو اس نے اس خیال کی صاف صاف خلاف ورزی کی۔ یہ امر ایک بڑی حد تک روما کے اخلاقی تنزل کا نتیجہ تھا اور پھر

اپنی باری میں اُس نے خود اخلاق کو خراب کیا۔

عیسویت نے اس معاملے میں ایک نیا اور زیادہ مکمل قانون شائع کیا۔ طلاق کے خلاف خود حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ اس قدر سخت تھے کہ اگرچہ ان سے قطعی طور پر کوئی نیا قانون نہیں پیدا ہوتا تھا، نہ کوئی پرانا قانون بدلتا تھا، پھر بھی ان الفاظ نے بالواسطہ عیسائی سلطنتوں کے قانونی تخیل پر اثر ڈالا۔ کیتھولک مذہب نے قانون ازدواج کا ایک سخت نظم قائم کیا اور باوجودیکہ حضرت عیسیٰؑ نے زناکاری کو صاف طور پر طلاق کی وجہ قرار دیدیا تھا اس پر بھی ایک وقت ایسا آیا کہ کیتھولک کلیسا نے طلاق کامل کی قطعاً ممانعت کردی تھی اور صرف ظاہری طلاق کی اجازت دی تھی اور وہ بھی صرف چند سخت وجوہات کی بنا پر۔ ازمنۂ وسطیٰ کی عیسوی سلطنتوں نے اس خیال کو یہاں تک قبول کیا کہ انھوں نے طلاق کے تمامی معاملات کو صرف مذہبی ہی عدالتوں کے سامنے پیش کرنے کی اجازت دی۔ زیادہ قریبی زمانے میں ان معاملات کے متعلق سلطنت نے خود کارروائی کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کیا ہے اور پروٹسٹنٹ فرقے نے زناکاری اور معناً اُس کے مماثل وجوہ پر طلاق کو تسلیم کرلیا ہے۔ آخرالامر کچھ تو طبعی حقوق کے جدید خیال کا لحاظ کرکے اور کچھ شخصی آزادی کی غرض سے موجودہ زمانے کے قانون نے طلاق کے وجوہات کو وسعت دے دی اور اسے زیادہ آسان بنادیا ہے مگر دو اصول بالعموم برقرار رکھے گئے ہیں۔

(۱) عقد کا انفساخ محض کسی ایک فریق کی مرضی یا جانبین کی تراضی باہمی سے نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کے لئے عدالت کی وساطت اور منظوری کی ضرورت ہے۔

(۲) ایسی منظوری بلا کافی وجہ کے نہ دی جائے گی۔

کلیسا اس وجہ سے کہ وہ انسان کی اخلاقی اور روحانی طبیعت کا مظہر ہے اس اصول کا حامی ہے کہ عقد کو ناقابل انفساخ سمجھنا چاہیے کیونکہ عقد کا منتہائے خیال یہی ہوسکتا ہے۔ سلطنت اس وجہ سے کہ وہ مقتضیات خارجی سے تعلق رکھتی ہے مجبور ہے کہ حالات واقعی کی کمزوریوں پر نظر کرے اور عقد میں جب حقیقی اتحاد و یکجہتی باقی نہ رہے تو ظاہری طور پر بھی اس فسخ کی اجازت دیدے۔ مگر جہانتک قومی رسم و رواج اور شخصی ترقی کی حالت

اجازت دے اسے ناقابل انفساخ عقد کے اصول کو منتہائے خیال کے طور پر قائم رکھنا اور طلاق کو سخت قیود کے تابع کر دینا چاہئے ۔

بیسواں باب

سلطنت کا تعلق خاندان سے

(ب) عورتوں کا درجہ

عورتوں کے سیاسی حقوق

اس وقت تک تمام قوموں نے عورتوں کو اُسی ملّت و قوم سے متعلق سمجھا ہے جس سے ان کے شوہر یا باپ کا تعلق ہو، سلطنت سے ان کا تعلق بالواسطہ سمجھا گیا ہے اور وہ پورے حقوق کے ساتھ سلطنت کی کامل رکن نہیں قرار دی گئی ہیں۔ لیکن دور جدید نے ایک نیا خیال پیدا کر دیا ہے۔ اب سے بہت پہلے ۱۷۸۹ء کے فرانسیسی انقلاب کے وقت میں عورتوں نے بادشاہ کو ایک درخواست دی تھی کہ عورتوں کو سیاسی (یعنی رائے دہی و انتخاب کے) حقوق دئیے جائیں اگرچہ اُس زمانے کے فلسفی کوندورسے نے اس درخواست کی تائید کی تھی مگر مجلس قومی نے حقارت کے ساتھ اُسے مسترد کر دیا۔ ہمارے وقت میں بھی مختلف ممالک میں اس مطالبے پر زور دیا گیا ہے اور بالخصوص جان اسٹوارٹ مل نے اپنی تحریروں میں اور نیز پارلیمنٹ میں اُس کی حمایت کی ہے۔ فرانس میں اید وارد لابولیے نے بھی وہی روش اختیار کی ہے۔ امریکہ کے بعض ممالک میں کوشش کی گئی ہے کہ عورتوں کو سیاسی حقوق اور فرائض میں حصہ دیا جائے۔

مل

سلطنت میں عورتوں کو براہ راست شریک کرنے کے لئے مل نے جو خاص وجوہ پیش کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(الف) مردوں کی طرح عورتوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اُنھیں عمدہ حکومت کا فائدہ حاصل ہو اور عمدہ حکومت ہی نیابت کا مقصود ہے۔

مگر لڑکوں کو بھی عمدہ حکومت کا فطری حق حاصل ہے۔ یعنی سلطنت پر ان کی حفاظت فرض ہے لیکن اس بنا پر کوئی یہ بحث نہیں پیش کرتا کہ انھیں بھی رائے دہی کا

حق حاصل ہونا چاہیے۔ عمدہ حکومت سے انتفاع حاصل کرنے کے حق میں یہ امر داخل نہیں ہے کہ حکومت میں شرکت یا اُس پر اقتدار بھی حاصل ہو۔ اول الذکر ایک ساکت حق ہے ثانی الذکر میں شخصی قابلیت کا ہونا شرط مقدم ہے۔

(ب) حقوق ذاتی اور حقوق عامہ میں ایک طرح کا خیرہ کن تضاد ہے جسے رفع کرنا ضروری ہے، شخصی قانون کے ضمن میں عورتیں اولاً اپنے افعال میں محدود الاختیار رہتیں اور وہ اپنے شوہروں کی تولیت میں سمجھی جاتی تھیں۔ مگر جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ عورتیں اپنی ذاتی ملک کا خود انتظام کر سکتی ہیں تو یہ تولیت اور نگرانی منسوخ قرار پا گئی اور مرد عورت دونوں برابری کے درجے پر قائم ہو گئے، لیکن دوسری طرف قانون عام میں یہ فرق بدستور برقرار ہے۔ ہم عورتوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ مردوں کے ساتھ محصول تو ادا کریں مگر انھیں اس حق کے دینے سے انکار کرتے ہیں کہ وہ ان محصولات کی منظوری دیں یا اُن کے اخراجات کی نگرانی کریں۔ یہ ناانصافی ہے کہ جس قابلیت کو ہم اور جگہ تسلیم کر چکے ہیں یہاں اس سے انکار کر دیں اور جو مساوات خانگی زندگی میں مفید ثابت ہو چکی ہے اسے معاملات عامہ میں وسعت دینے سے باز رہیں۔

حکمران عورات کی مثال سے اجتماع ضدین

(ج) ہمارے موجودہ قوانین میں ایک اور بھی تناقض ہے، وہ یہ کہ بہت سی قومیں جو عورتوں کو سیاسی حقوق دینے سے انکار کرتی ہیں کبھی کبھی حکومت کا اعلیٰ سیاسی اقتدار ایک عورت کو تفویض کر دیتی ہیں اور اپنے تئیں اُس کی رعایا مانتی ہیں۔

البتہ یونانیوں اور رومیوں نے استثنا کے طور پر بھی کسی عورت کو اپنا فرمانروا نہیں بنایا۔ زنانہ مزاج شہنشاہ ہیلیوگیبالس جب اپنی ماں کو سینات میں لے آیا تو رومیوں کے خیال کو اس سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اُس کے اور اُس کی ماں کے قتل کے بعد مجلس نے ایک حکم یہ نافذ کیا کہ جو شخص کسی عورت کو سینات میں لاوے گا وہ تحت الثری کے دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھا دیا جاوے گا (یعنی قتل کر دیا جائے گا)۔ اکثر ٹیوٹانی قوموں نے بھی شاہی کو مردوں کے لئے محدود کر دیا تھا۔ ٹاسیٹس برطانیوں کے خصوصیات کے طور پر یہ ذکر کرتا ہے کہ وہ عورتوں کی حکومت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اہل لومبارڈی نے بھی اکثر عورتوں کے سلسلے سے شاہی جانشینی کو جائز رکھا۔ ادھر جدید تر زمانے میں عورتیں بکثرت تخت نشین ہوئی ہیں اور آخری چند صدیوں کے اندر انگلستان، آسٹریا، روس، اسپین، پرتگال اور دوسرے

ممالک میں مختلف اشکال حکومت کے تحت میں عورتوں نے حکمرانی کی ہے ۔
یہ عجیب و غریب استثنا کیوں ہے جب عورتیں کسی سیاسی حق کی مطلقاً مستحق نہیں ہیں تو پھر اُن کو سب سے بڑا سیاسی حق کیوں دیا جاتا ہے ؟ کیا اس سے زیادہ قرین عقل یہ بات نہ ہوگی کہ ایک عورت سلطنت کے کسی ادنیٰ درجے کے عہدے پر کارگزار ہو یا مجلس میں اپنی رائے ظاہر کرے بجائے اس کے کہ وہ سلطنت کی ملکہ بنا دی جائے ؟
اس کی توجیہہ صرف یہ کی جاسکتی ہے کہ سلطنت کے اقتدار و اعزاز کی حیثیت ایک خاندانی ملک کی سی سمجھی گئی ہے اور عورت کے لئے تخت کی جانشینی کا وہی حق روا رکھا گیا ہے کہ جو اسے اپنے باپ کی جائداد پر حاصل ہے ۔ سلطنت کی زمین جائداد یا جاگیر کے مثل قرار دی گئی ہے اور سلطنت کی وراثت بھی قانون شخصی کے اصول وراثت کے تابع رکھی گئی ہے ۔ اس حق کی ابتدا زمانۂ قدامت میں ہوئی اور بعد کو اسے وسعت دی گئی اور زمانۂ جدید کی بہت سی سلطنتیں اگرچہ جاگیردارانہ سلطنت کے خیال سے آگے نکل گئی ہیں اور دوسرے معاملات میں قانون شخصی اور قانون عامہ میں قطعی فرق کرتی ہیں مگر قدیمی دستور کی اس یادگار کو ہنوز باقی رکھے ہوئے ہیں جس میں خاندانی رشتۂ خون کو سلطنت کی نوعیت اور عورت کے حق کارکنی سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے ۔
(د) چونکہ اکثر عورتیں خاندان میں رہتی ہیں وہ عملاً اکثر اپنے بزرگ خاندان کے ساتھ ہوں گی ۔ بیوی اپنے شوہر کے ساتھ رائے دے گی اور لڑکیاں اپنے باپ کے ساتھ اس طرح بزرگان خاندان کو جنھیں سلطنت کی ریڑھ کی ہڈی کہنا چاہئے زیادہ سیاسی قوت حاصل ہو جائے گی ایسے باشندوں کے مقابلے میں جو نا کتخدا یا بے گھرے اور بیفکرے ہیں ۔
(ہ) سیاسیات میں عورتوں کا اثر جو آج بھی سوسائٹی میں اور گھروں کے اندر نمایاں ہے اُس سے ہرگز مفر نہیں ہو سکتا مگر سردست یہ اثر غیر منتظم طریقے پر اور زیادہ تر خفیہ طور سے مرتب ہوتا ہے اور ہمیشہ اس صورت سے کہ عورتیں اُس کی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتیں ، اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ اس اثر کے لئے ایک صحیح راستہ نکال دیا جائے جس کی حفاظت کا بھی بندوبست کر دیا جائے اور عورتوں کو سلطنت کے کاموں میں شریک بنا کے اُن پر واضح کر دیا جائے کہ کسی امر کا فیصلہ کرنے یا اُس پر رائے ظاہر کرنے میں اُن پر ذمہ داریاں کیا ہیں ۔

عورتوں کو رائے دہی کا حق دینے کی ان دلیلوں میں جو اوپر بیان ہوئیں غالباً چوتھی دلیل سب سے زیادہ قوی ہے مگر اس سے بھی زیادہ قوی دلیلیں دوسری جانب سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

عورتوں کے حق رائے دہی کے مخالف دلائل۔

(الف) تمام متمدن قوموں کا کسی امر میں متحد الرواج ہونا؛ ایک قطعی دلیل کی قوت تو بلاشبہ نہیں رکھتا لیکن یقیناً ہمکو ایک ایسے تغیر سے خبردار کرتا ہے جو نوع انسان کے مستقل حالات اور احساس کے منافی ہو۔

(ب) عورت کی فطرت۔ عورتوں کی تخلیق کا بڑا مقصد خانہ داری کا انصرام ہے اور اگر وہ سیاسی کاموں اور سیاسی جد وجہد میں زیادہ مشغول ہوئیں، تو اُن کے اصلی فرائض کی اہلیت ان سے جاتی رہے گی، زنانی خوبیوں کو اس سے نقصان پہنچے گا ماں اور بیوی کی حیثیت سے عورتوں کی محبت والفت خانہ داری کی مہارت، اخلاق کی لطیف حیثیت وحلاوت یہ سب خوبیاں برباد جائیں گی اور اس کی تلافی کے لئے سیاسی قابلیت سے کچھ نفع نہ پہنچے گا۔

(ج) سلطنت کی مردانہ فطرت۔ سلطنت جو بحیثیت ایک قوم کے بالارادہ اپنا تعین اور اپنے اوپر حکمرانی کرتی ہے وہ اپنی مردانہ خصوصیت اور مردانہ روح کو زنانہ کمزوری اور زنانہ مزاجی کی آمیزش سے کمزور کرنا ہرگز گوارا نہ کرے گی۔

(د) یہ عظیم خطرہ کہ ملک کے سیاسی فریقوں کے مناقشوں میں (عورتوں کی ذکی الاحساس فطرت کے باعث) جذباتی جوش وخروش بڑھ جائے گا اور مردانہ شعور کی کارفرمائی گھٹ جائے گی اور اس پر ایک روک عائد ہو جائے گی۔ انفعالی قوتیں ترقی کرکے سلطنت کو نقصان پہنچائیں گی اور فاعلی قوتیں کمزور پڑ جائیں گی۔

پس اگرچہ ہم خاص خاص مستثنیات جیسے عورت کی تخت نشینی کے روادار ہو سکتے ہیں جس سے موزوں حالات اور متمدن ملک میں کسی خطرے کا اندیشہ نہیں ہوسکتا لیکن عورتوں کو عام طور پر سیاسی حقوق دیدینا مہلک ثابت ہوگا۔

عورتوں کا بالواسطہ اثر

پس اگرچہ عورتیں معاملات عامہ میں براہ راست حصہ لینے سے اس طرح پر خارج رکھی گئی ہیں تاہم بہبود عامہ کے کاموں میں ان کے بالواسطہ اثر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے لیکن یہاں بھی اگر اس اثر کی رہبری سیاسی اغراض کے تابع ہوگی تو وہ آسانی سے ذلت کی حالت

میں آجائیگا۔ وہ صاف اور سودمند اسی وقت رہتا ہے جبتک اخلاقی اور مذہبی محرکات اس کے باعث ہوں۔ جو عورتیں سیاسیات میں مشہور رہی ہیں۔ اُنھوں نے بالعموم اپنی سلطنت اور اپنے دوستوں کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ ان کی چالاکی اور زیرکی خطرناک سازش میں متبدل ہوجاتی ہے اور جب ایکبار سیاسی نفرت، انتقام، اور حرص کی آگ عورت کے سینے میں جلنے لگتی ہے تو پھر وہ بےطرح بھڑک اُٹھتی اور ایسی پھیل جاتی ہے کہ مرد بھی اُس کی جھپیٹ میں آئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ بات کچھ فرمانرواؤں کی آشناؤں ہی تک محدود نہیں بلکہ اُن شریف بیویوں اور ماؤں تک پر صادق آتی ہے جنھوں نے دنیا کی تاریخ میں نام پیدا کیا ہے۔ روما کی تاریخ، فرانسیسی انقلاب، فرانسیسی بادشاہوں کے دربار سب یہی قصّہ دُہراتے ہیں۔

برخلاف اس کے مدبّرین کو عورتوں کے اُس خاموش اثر سے اکثر نفع پہنچا ہے جس کا ذکر تاریخ میں کہیں شاذونادر ہی آتا ہے۔ بہت سے مدبّروں کو اپنے گھروں میں وہ آسائش حاصل ہوتی ہے جس سے سیاسی زندگی کے شوروشر کی تلافی ہوجاتی ہے اور فرائض کے ادا کرنے کے لئے اُن میں ازسرِنو تازگی اور قوت پیدا کردیتی ہے۔ بارہا عورتوں کی نرم دلی نے مردوں کی سخت مزاجی کو متعدل کرکے اُن کو افراط و تفریط سے بچایا ہے اور اکثر اُن کے حزم نے مردوں کو خطاؤں سے بازرکھا اور اُن کے رواج واخلاق کے احساس نے غلط کاریوں سے محفوظ رکھا ہے اور عورتوں کی ہمت نے آڑے وقت میں مردوں کو بچایا ہے عورت کی طاقت کسی وقت میں بھی ایسی قوی و معاون نہیں ہوتی جیسی خطرے اور مصیبت کے وقت میں ہوتی ہے۔ مردوں سے زیادہ صابر ہونے کی وجہ سے وہ ذلت اُٹھائے بغیر مصیبت کے برداشت کرنے میں مرد کی مدد کرسکتی ہے۔ عورت کی وفاشعاری مرد کو اپنے ملک پر قربان ہوجانیکے لئے آمادہ کرتی ہے اور اس کی جانب سے مرد کی جرأت وشجاعت کی ثنا وصفت مرد کو اس وصف کے حصول پر برانگیختہ کرتی ہے۔

اس لئے خصوصاً ٹیوٹونی قوموں کے قانونِ عامہ کی یہ ایک لطیف خصوصیت ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے سیاسی مرتبے میں شریک سمجھی جاتی ہے اس طرح عورت کو نظم سلطنت میں اپنی صحیح جگہ حاصل ہوجاتی ہے اور سیاسی حقوق کی محرومیت کا کافی ووافی معاوضہ ہوجاتا ہے۔

تعلیق

ریل (Riehl) نے اپنے اُس معاشرتی وسیاسی مقالے میں جو اُس نے "عورتوں" پر لکھا تھا (اور جو جرمانی سہ ماہی رسالے" (Deutsche Viertet jahrssehoift) میں ۱۸۵۲ء میں شائع ہوا تھا) اور اپنی کتاب "خاندان" (die Familie) میں دوسری بہت سی لطیف رایوں کے ساتھ ساتھ مختلف طبقات میں مرد و عورت کے اختلاف تعلق کی بابت بھی نہایت صحیح طور پر توجہ دلائی ہے۔ کسان کی عورت کے عادات اور اُس کے اطوار زندگی بہت کچھ کسان ہی کے عادات اور اطوار زندگی کے مانند ہوتے ہیں لیکن اعلیٰ طبقے کی تعلیم یافتہ شہری عورت عادات و خصائل میں اپنے مرد سے نسبتاً اتنی مماثل نہیں ہوتی مگر اس کے ساتھ سابق الذکر پر خانگی پابندیاں بھی زیادہ سختی کے ساتھ عائد ہوتی ہیں جو آخر الذکر پر اُس حد تک نہیں ہوتیں اس لئے کہ وہ نسبتہً زیادہ آزاد ہوتی ہے۔ مجھے ریل کی اس رائے پر ضرور اعتراض ہے کہ وہ عورت کے لئے ایک بیّن فریقی خصوصیت پیدا کر کے اُسے کنسروٹیو قرار دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی فرقوں سے عورتوں کی دلچسپی صرف بالواسطہ ہے اور یہ دلچسپی تمام فریقوں پر مشتمل ہے۔ اگر ہم فرقوں کی تقسیم رومر کی رائے کے موافق مردانہ اور زنانہ فرقوں میں کریں تو صاف ظاہر ہے کہ احرار و محافظین اول الذکر کے تحت میں آئیں گے اور اصولی استبدادی ثانی الذکر کے تحت میں ہوں گے۔

اکیسواں باب

سلطنت کا تعلق افراد سے

(الف) اپنے ملک والے اور غیر ملک والے

افراد کا تعلق سلطنت سے کسی خاندان، طبقے یا جماعت کے رکن ہی ہونیکے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ سلطنت سے ان کو بلا واسطہ بھی تعلق ہے۔ زمانۂ حال کے سیاسی نظریے اور جدید نظامہائے حکومت اس بلا واسطہ تعلق پر زور دینے کی طرف مائل ہیں، اسلئے ہمیں امور ذیل پر خیال کرنا ہے:-

(۱) اہل ملک یعنی سلطنت یا قوم کے اراکین اور غیر ملک کے اشخاص کے درمیان فرق۔

(۲) قوم کے شہری اور اس کے دیگر اراکین کے درمیان فرق۔ شہری جماعت کے مختلف مدارج پر ہمیں اس وقت تک بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے جبتک کہ ہم نظام حکومت پر تفصیلی بحث نہ کریں۔ پہلا فرق زیادہ تر نسل پر منحصر ہے اور ابتدائے کار میں محض شخصی فرق ہے۔ وطن پذیری کے ملحوظات دوسرے درجے پر ہیں۔ انسان کا پہلا تعلق قوم سے ہے۔ زمین سے اس کا تعلق اتنا ضروری نہیں ہے۔

قدیمی خیال یہ تھا کہ غیر ملک کے شخص کو کسی قسم کا حق حاصل نہیں ہوتا اور اسے ایک معرا از حقوق ہستی سمجھنا چاہیے جبتک کہ وہ کسی خاص شخص کی حفاظت میں نہ آجائے۔ یونانی[1] اگرچہ اس خیال پر قائم تھے مگر فی نفسہ یہ خیال قدیمی تمدن پر وحشت کا ایک دھبا ہے۔

[1] روما کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس خیال کا یہ منشا نہیں تھا کہ غیر ملکی غلام کے درجے پر

یٹوونی اصول میں زیادہ انسانیت تھی - ان کا اصول یہ تھا کہ ہر شخص اپنی قوم کے قانون کا پابند ہو زمانۂ موجودہ کا قانون اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ غیر ملکی حقوق رکھتے ہیں اور اُن کے بموجب قانون اُن کی حفاظت کرتا ہے۔

کن اصول سے کون شخص ملکی ہوتا ہے

(۱) ملکی کسے خیال کرنا چاہیے اور کوئی شخص کسی قوم کا رکن کس طرح ہو جاتا ہے؟ اس سوال کے مختلف جواب دیے جاتے ہیں نسب اور توطن اس کے لازمی اجزا ہیں مگر ان عناصر کے باہم جمع ہونے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں جن کو ہم مختلف نظاموں سے تعبیر کرتے ہیں اور اُن کی تفصیل یہ ہے :-

الف- مقام پیدائش

(الف) مقام پیدائش از منۂ وسطیٰ کے آخری حصے میں یہ خاص خیال رائج تھا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ملک میں پیدا ہونا مولود کی خصوصیات کی بنا ہے - انگریزی قانون کا اصول ابھی تک یہی ہے جو فطری رعایا اور اجنبیوں میں امتیاز کرتا ہے۔ کسی انگریزی جہاز پر یا کسی انگریزی سفارت خانے میں پیدا ہونا انگلستان میں پیدا ہونے کے برابر سمجھا جاتا ہے لیکن اس اصول میں اب اس حد تک ترمیم روا رکھی گئی ہے کہ انگریزوں کی اولاد جو بیرون ملک میں پیدا ہو وہ بھی انگریزی شہریوں میں شمار ہوتی ہے اور حقوق توطن کا طریقہ حصول زیادہ آسان کر دیا گیا ہے۔[1] ممالک[2] متحدہ امریکہ کا قانون بھی اسی اصول پر چل رہا ہے۔

ب- مقام سکونت-

(ب) مقام سکونت[3] یہ شکل جو ملکی اصول پر مبنی ہے۔ وہ زمانۂ حال کے خیالات سے زیادہ موافقت رکھتی ہے کیونکہ یہ اتفاقیہ مقام پیدائش پر زور نہیں دیتی بلکہ یہ والدین کے مستقل مقام سکونت پر اور ان کو خود اس شخص کے مقام سکونت پر زور دیتی ہے لیکن

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) نہ بلکہ اس سے صرف یہ مقصود تھا کہ ان کے حقوق رومی سلطنت میں غیر محفوظ تھے۔ ہوسٹس (Hostis) کے اصلی معنی مہمان کے ہیں اجنبی اور دشمن کے نہیں ہیں۔

[1] قانون ۱۸۷۰ء کے بموجب حقوق توطن کا حصول اور بھی آسان کر دیا گیا ہے۔

[2] ممالک متحدہ کے حدود کے اندر پیدا ہونے سے حقوق شہریت حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اہل ملک کی جو اولاد بیرون ملک میں پیدا ہو اُس کو بھی نسب کی بنا پر حق شہریت حاصل ہوتا ہے۔ اجنبیوں کو حقوق توطن حاصل کرنے کیلئے ممالک متحدہ میں آباد ہونا شرط لازمی ہے اور یہ صورت نہایت کثرت سے پیش آتی رہتی ہے۔

آباد کاری جس قدر آسان یا مشکل کر دی جائے اسی اندازے سے اس میں بھی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ سابق زمانے میں آسٹریا کا کسی حد تک یہی اصول تھا اور منفرد جرمانی سلطنتوں کا بھی یہی اصول ہے وہاں بھی وطنی حقوق کے شخصی عطا کی مختلف صورتوں سے اس میں اعتدال پیدا کر دیا گیا تھا۔

کمیون کی رکنیت

(ج) ان دونوں کے بین بین کمیون کی رکنیت کا سویزرلینڈ کا اصول ہے جو کمیون (ضلع) اور سویزرلینڈ کی متحدہ رکنیت کی رکنیت کے لئے بنا کار ہے۔ کمیون میں حقوق کا انحصار بجائے پیدائش یا سکونت پذیری پر نہیں ہے بلکہ ایسے والدین کی اولاد ہونے پر منحصر ہے جو کمیون کے رکن ہوں خواہ وہ اس سے باہر ہی کیوں نہ رہتے ہوں۔ یہ اصول اہل روما کے اس قدیم بلدی قانون سے غیر مشابہ نہیں ہے جس کی بنا بھی کسی خاص رکن بلدی کے سلسلۂ نسب میں ہونے پر منحصر تھی۔

سلطنت سے شخصی تعلق

(د) قومیت۔ جدید سلطنتیں بالعموم قومیت کو شخصی تعلق کی بنا پر تسلیم کرتی ہیں اور اسے مقام پیدائش یا سکونت پذیری پر خصوصیت کے ساتھ منحصر نہیں کرتیں بلکہ اراکین قوم کی اولاد ہونے یا شخصی طور پر سلطنت کی رکنیت میں قبول کئے جانے پر منحصر سمجھتی ہیں۔ بجائے پیدائش و سکونت پذیری اس خیال کی تکمیل کرتی ہیں یہ اصول بالتخصیص فرانس، پرشیا[۵۲] اور جرمانی شہنشاہی میں رائج ہے، یہ طریقہ جدید سیاسی خیال سے بہت مطابقت رکھتا ہے

---

[۵۱] آسٹریا کا مجموعۂ قوانین دفعہ ۲۹ "اجنبیوں کو ملکی حقوق صورتہائے ذیل میں حاصل ہو سکتے ہیں اسرکاری ملازمت میں داخل ہوں، ایسا کاروبار اختیار کریں جس سے ملک میں معین طور پر رہنا لازمی ہو مسلسل دس برس تک ملک میں سکونت پذیر رہے ہوں" لیکن ۲۱ دسمبر ۱۸۶۷ء کے قانون اساسی کی دفعہ ۲ کے بموجب اجنبی اس وقت تک سرکاری ملازمت میں داخل نہیں ہو سکتے جبتک کہ انھوں نے حقوق شہریت حاصل نہ کرلئے ہوں دوسرے شرائط یکم مئی ۱۸۳۳ء کے شہنشاہی فرمان اور ۲۷ اپریل ۱۸۶۰ء کے فیصلۂ عدالت کی رو سے برطرف کر دئے گئے۔

[۵۲] قانون مجریہ ۳۱ دسمبر ۱۸۴۲ء کے بموجب پروشیا میں قومیت بالتخصیص نسب پر منحصر ہے اہل پروشیا کے جائز لڑکے پروشیا کے ملکی شہری شمار ہوتے ہیں خواہ وہ باہر کیوں نہ پیدا ہوئے ہوں۔ توطن پذیری کے لئے خاص شرط سکونت ہے۔

[۵۳] جرمانی شہنشاہی کی رکنیت کے لئے شرط مقدم شہنشاہی کے کسی صوبے میں حقوق شہریت کا حاصل ہونا ہے

جو قوم سے شخصی تعلق کو تخیل سلطنت کا بنیادی اصول سمجھتا ہے۔

مگر مختلف طریقے ایک دوسرے کے قریب پہنچتے اور اُس کی طرف مائل ہیں۔ نسب، مقام پیدائش، مقام سکونت، توطن، مناکحت جو از نسب سب کے سب بالواسطہ یا بلاواسطہ حقوق شہریت کے شرائط پر اثر ڈالتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ کسی سلطنت کی رکنیت ذیل کے طریقوں سے حاصل ہوتی ہے:۔

(۱) پیدائش۔ جائز لڑکوں کی حالت میں باپ کو سلطنت کا رکن ہونا چاہیئے ناجائز لڑکوں کی حالت میں ماں کو۔ رکنیت سلطنت کے لئے سب سے زیادہ عام بنا یہی ہے لاوارث بچے اس ملک سے تعلق رکھتے ہیں جس میں وہ پائے جائیں۔

(۲) ازدواج (مناکحت) غیر ملکی بیوی اپنے شوہر کے خاندان و قوم کی رکن ہوجاتی ہے۔

(۳) حقوق توطن اس ذریعے سے ایک اجنبی شخص اپنی خواہش پر رکن سلطنت بنایا جاسکتا ہے لیکن مختلف ممالک میں اس کے شرائط مختلف ہیں۔ بعض ممالک داخلہ ملک کی ترغیب دیتے ہیں اور بعض اس سے کارہ ہیں۔ بعض ملکوں میں اطلاع یا بلا اطلاع کے مستقل سکونت اختیار کرلینا ہی کافی ہے، دوسری جگہ حکومت بلکہ مجلس تشریعی کے خاص حکم کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہیں سرکاری عہدے پر تقرر کے ساتھ ہی حقوق ملکی بھی حاصل ہوجاتے ہیں کہیں ایسا نہیں ہوتا۔ بعض سلطنتیں چاہتی ہیں کہ غیر ملکی اپنی قدیم سلطنت کے حقوق سے بالاعلان بری کروئے جائیں یا کم از کم وہ خود علانیہ طور پر اس تعلق کو ترک کردیں۔ بعض سلطنتیں اس شرط کی پروا نہیں کرتیں۔

(۲) کسی شخص کا تعلق سلطنت سے حالات ذیل میں منقطع ہوجاتا ہے۔

سلطنت کی رکنیت کن امور سے ختم ہوجاتی ہے۔

(۱) موت۔ اکثر لوگ اپنی زندگی بھر اُسی ایک سلطنت کے رکن رہتے ہیں جس میں وہ پیدا ہوئے تھے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اور اس کا انحصار بیشتر نسل یا توطن پذیری پر ہے۔ جرمانی قانون مجریہ یکم جون ۱۸۷۰ء کی دفعہ ۳ حسب ذیل ہے: غیر ملک میں پیدا ہونے کی صورت میں (شمالی) جرمانی باپ کی جائز اولاد اور (شمالی) جرمانی ماں کی ناجائز اولاد دونوں جرمانی شمار ہوں گی۔

(۲) عقد۔ جو عورت غیر ملکی شخص سے نکاح کرکے اُس کی قومیت کو قبول کرلیتی ہے وہ اپنی سابقہ قومیت کو زائل کردیتی ہے۔

(۳) قوم کی رکنیت سے خارج کردیا جانا۔ چونکہ اب یہ رکنیت بالعموم ایک شخصی حق سمجھی جاتی ہے اس لئے یہ محض کسی غیر ملک میں آباد ہوجانے بلکہ مستقل اقامت اختیار کرلینے سے بھی زائل نہیں ہوتی۔ یہ تعلق اس صورت سے منقطع ہوتا ہے کہ اس حق کا رکھنے والا شخص اپنی طرف سے اپنے حق سے دست بردار ہوجائے اور سلطنت کبھی اپنی جانب سے اُسے سبکدوش کردے۔ اسی سے اس تعلق کی باہمی کیفیت ظاہر ہوتی ہے لیکن زمانۂ حال کی بیشتر سلطنتیں اس بات کو اپنی شان کے شایاں نہیں سمجھتیں کہ کسی شخص کو جو قومیت سے دست برداری کا خواہاں ہو اس فعل سے روکیں۔ اس طرح یہ شخصی آزادی کا لحاظ کرکے وہ آزاد دست برداری کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ بہت سی صورتوں میں مثلاً ایسے ترک وطن کی حالت میں جس میں واپسی کا خیال نہ ہو اس شخص کے فعل سے ترک قومیت مراد لی جاتی ہے[۵]۔

انگریزی قانون

آزادانہ ترک وطن کے حق کے تسلیم کرنے میں انگریزی قانون اگرچہ سب سے اول تھا مگر اس نے اس جاگیر دارانہ نظریہ کو ہمیشہ برقرار رکھا کہ بادشاہ کی مرضی کے بغیر رعایا اس کی اطاعت کو ترک نہیں کرسکتی اس لئے انگریزی رعایا محض ترک وطن سے اپنی اس حیثیت سے خارج نہیں ہوتی۔

---

۵ فرانسیسی ضابطۂ دیوانی، دفعہ ۱۷: "ایک فرانسیسی اگر کسی غیر ملک میں جا بسے اور واپسی کا ارادہ اُس کے افعال سے نہ ظاہر ہوتا ہو تو وہ اپنی حیثیت کو کھو دیتا ہے۔ تجارتی ضروریات سے غیر ملک میں بسنے سے یہ نہ تصور کیا جائے گا کہ وہ واپسی کا ارادہ نہیں رکھتا۔ آسٹروی قانون اساسی مجریہ ۲۱ دسمبر ۱۸۶۷ء دفعہ ۴۔ ترک وطن کی آزادی صرف فوجی خدمت کے فرض سے محدود ہے اور ۱۸۰۵ء کا پروسی نظام حکومت بھی اس کے مثل ہے" (دفعہ ۱۱) پروسی قانون اور بھی سخت تھا۔ جرمانی شہنشاہی کے قانون مجریہ یکم جون ۱۸۷۰ء کے بموجب دس برس باہر رہنے سے ملک اور شہنشاہی کی رکنیت زائل ہوجاتی ہے مگر اس زمانے کا حساب اُس وقت سے ہوتا ہے جب پاسپورٹ کی میعاد ختم ہوجائے لیکن کسی قونصل خانے میں اندراج حاضری سے اُس کی تجدید ہوسکتی ہے (دفعہ ۲۱)

فرانسیسی قانون

کسی غیر ملک میں توطن اختیار کر لینے یا فرانسیسی حکومت کی منظوری کے بغیر کسی غیر ملکی ملازمت میں داخل ہو جانے کو فرانسیسی قانون ترک وطن کے برابر سمجھتا ہے[۵۱] یہ طریقہ دست برداری کے اصول سے تجاوز کر جانے کا ہے کیونکہ اکثر ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی غیر ملکی حکومت سے تعلق پیدا کرے مگر خود اپنی سلطنت سے قطع تعلق کی اسے مطلقاً خواہش نہ ہو تاہم فرانس کے قانون نے اتنی گنجائش رکھی ہے کہ واپس آنے کی صورت میں اُس کے لئے حقوق سابقہ کا حاصل کر لینا آسان ہو۔

دو سلطنتوں میں وطنی حقوق

یہ ناممکن نہیں ہے کہ ایک ہی شخص کو ایک ساتھ دو سلطنتوں میں وطنی حقوق حاصل ہوں[۵۲] اور موجودہ حالات فی الواقع اُس کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ جب شاذ و نادر فرائض میں تصادم ہو جاتا ہے تو ان دونوں کو پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے یہ اصول ہمیشہ محفوظ اصول نہیں سمجھا جاتا کہ سابق حق کو تقدم حاصل ہونا چاہیئے خاصکر ایسی صورت میں کہ وہ حق معطل ہو اور مابعد کا حق عملاً موجود ہو۔ ان صورتوں میں پہلا فرض یعنی فوجی خدمت اسی ملک کے لئے واجب ہے جس میں وہ شخص رہتا ہے[۵۳] اس سے بالطبع یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو سلطنت کسی غیر ملکی کو حق توطن عطا کرتی ہے یا اسے کسی عہدے پر مامور کرتی ہے وہ مجاز ہوتی ہے کہ اس سے حقوق سابقہ کے ترک کا مطالبہ کرے یا انھیں بحال خود

---

[۵۱] فرانسیسی ضابطہ دیوانی دفعہ (۱۷)

[۵۲] ایک شخص دو سلطنتوں کی نیابت میں ایک ہی وقت میں شریک ہو سکتا ہے۔ بہت سے جرمانی روسا دو دو تین تین سلطنتوں کے دیوان اعلیٰ کے رکن ہیں اور ان سب میں ان کی جاگیریں واقع ہیں اور انھوں نے ہر ایک کی وفاداری کا حلف اُٹھایا ہے۔ یہ خیال کرنا بالکل ناممکن نہیں ہے کہ کسی شخص کی دو مختلف سکونتیں ہوں مثلاً ایک شہر میں ایک دیہات میں یا ایک کاروباری شخص کی حیثیت سے اور ایک خانگی شخص کی حیثیت سے فون بار (Von Bar) اپنی تصنیف میں قومی شخصی و فوجداری قانون صفحہ ۸۵ میں ان ساری امکانی صورتوں سے انکار کرتا ہے لیکن اگر واقعی حالات پر نظر کیجئے تو ثابت ہو جائیگا کہ واقعات نظریے سے زیادہ وسیع ہیں کسی شخص کو یہ اجازت دینا کہ وہ نئی سلطنت کا رکن ہو جائے بغیر اس کے کہ اپنی سلطنت سے تعلق منقطع کرے ترک وطن کے آزادانہ حق کا محدود کرنا نہیں ہے۔

[۵۳] بلیک اسٹون اپنی تصنیف میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے لکھتا ہے کہ "میرے ذاتی تجربے نے مجھے

رہنے دے۔[۱۵]

تصادم فرائض

(۳) چونکہ قومی حقوق کے حاصل کرنے اور ان کے زائل ہونے کے شرائط مختلف ملکوں میں مختلف ہیں اس لئے جب دو سلطنتیں کسی ایک ہی شخص کے اپنی رعایا ہونے کی دعویدار اور اس کے خدمات کی خواہاں ہوں یا دونوں اُسے قبول کرنے سے انکار کردیں تو ایک تصادم پیدا ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے تصادم رفع کرنے کے لئے امریکی سفیر بنکرافٹ کی کوشش سے شمالی جرمانی مشترکہت اور ممالک متحدہ امریکہ میں ایک معاہدہ ۲۲ فروری ۱۸۶۸ء کو طے پایا تھا۔ اس معاہدے میں یہ قرار دیا گیا کہ جانبین میں سے کسی سلطنت میں پانچ برس کا توطن سابقہ تعلق کو منقطع کردے گا اور دونوں سلطنتیں اُسے تسلیم کریں گی۔ یہی اصول انگلستان اور ممالک متحدہ کے درمیان ۱۸۷۰ء میں قرار پایا اور اب یہ اصول عام طور پر پسند کیا جاتا ہے۔

ملکی شخص کی حیثیت (الف) شخصی حقوق۔

(۴) کسی سلطنت کی رکنیت کے نتائج کا تعلق ایک حد تک شخصی قانون اور ایک حد تک عام قانون سے ہے۔ شخصی قانون میں ملکی اور غیر ملکی شخص کے درمیان امتیاز اس وقت کے بہ نسبت پہلے بہت زیادہ تھا۔ اس زمانے میں شخصی اور عام قانون کے حدود زیادہ قطعی طور پر معین ہوگئے ہیں اور اس لئے شخصی قانون میں قومیت کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ یہ فی الاصل ایک سیاسی خیال ہے۔ علی العموم شخصی قانون میں ملکی اور غیر ملکی دونوں کے لئے کامل حقوق کے انتفاع کا حق سمجھا جاتا ہے۔[۱۶]

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ یہ کھلایا ہے کہ ان حالات میں کسی شخص کے اصلی وطن کو اس خدمات پر پہلا دعویٰ ہے۔

سلہ۔ بویریا کا فرمان دفعہ ۶۔ اتحاد سویزرلینڈ کا نظام حکومت (مجریہ ۱۸۷۴ء دفعہ ۴۴) اس کے خلاف ہے۔ کوئی صوبہ غیر ملکیوں کو ملکی حقوق نہیں دیسکتا جبتک کہ وہ اپنے سابقہ حقوق کو ترک نہ کردیں اس وقت کے قانون کے لئے سویزرلینڈ کا قانون اتحادی مجریہ ۳ جولائی ۱۸۷۶ء دیکھنا چاہیئے۔

سلہ۔ پروسی قانون تمہید دفعہ ۳۴۔ غیر سلطنتوں کی رعایا جو ملک میں رہتی یا کاروبار کرتی ہے اس کا مقدمہ بھی قوانین محولۂ بالا کی رو سے ہوگا۔ ضابطہ آسٹروی دفعہ ۳۳ غیر ملکیوں کو اہل ملک کے برابر ملکی حقوق حاصل ہیں اور اس پر ویسی ہی ذمہ داریاں عائد ہیں بجز ان حالتوں کے جہاں سلطنت کی رکنیت صریحاً مشروط ہے۔ ضابطہ دیوانی دفعہ ۱۱

قدیمی اصول کہ غیر ملکی زمین کی ملکیت نہیں حاصل کرسکتے اب صرف مستثنات میں شمار ہوتا ہے[1] بعض بعض پیشوں کے اور خصوصاً کسی دستکاری کے مستقلاً اختیار کرنے بلکہ خوردہ فروشی کیلئے بھی غیر ملکیوں پر عام طور سے زیادہ بندشیں عائد ہیں[2]۔

دوسری جانب غیر ملکیوں کا قانون (Jus albinagu) ہے جس کی رو سے ملک کا بادشاہ وہ غیر ملکیوں کی جائداد کا وارث ہوجاتا تھا اور جو وراثت بیرونِ ملک میں جاتی تھی ان پر محصول لگایا جاتا تھا۔ اب تقریباً ہر جگہ یہ طریقہ ناپید ہوگیا ہے اور اس طرح ترک وطن کی آزادی عام طور پر تسلیم کی گئی ہے[3]۔

(ب حقوق عامہ۔) مگر قانون عامہ کی حد میں ملکی اور غیر ملکی کا فرق پوری قوت کے ساتھ باقی ہے خاص عطا کردہ حالات کے سوا حقوق ذیل صرف ملکیوں کے لئے مخصوص ہیں۔

(الف) ملک میں دائمی قیام کا حق[4] کوئی ملکی شخص کسی غیر ملکی کے حوالے نہیں کیا جاسکتا اور نہ سخت سیاسی وجوہ کے بغیر جلاوطن کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] انگلستان کے متعلق بلیکسٹن کی تصنیف شرح جلد اول باب دہم دیکھنا چاہئے ۱۸۷۰ء کے بعد سے غیر ملکی جائداد غیر منقولہ حاصل کرسکتے ہیں قانون موضوعہ (Statute) ۳۳ و ۳۴ وکٹوریا باب ۱۴۔ سوئیٹزرلینڈ کے بعض عمومی صوبوں میں یہ ممانعت ابھی نافذ ہے۔

[2] جبتک گلڈ (انجمن دستکاران) کا وجود قائم تھا یہ روک حق بجانب تھی مگر ان انجمنوں کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی اکثر یہ حال تھا کہ صرف ملکیوں کو ان پیشوں کے کرنے کی اجازت تھی۔ ۱۸۴۸ء کے فرانسیسی قانون اساسی دفعہ ۱۳ کی رو سے پیشہ اور حرفت کی آزادی شہریوں ہی کے حق میں محفوظ کی گئی۔ لیکن فرانسیسی طرز عمل غیر ملکیوں کے حق میں بھی پیشے کی آزادی کو روا رکھا۔

[3] منقیحہ سوئیٹزرلینڈ کے نظام سلطنت کی دفعہ ۶۲ کی رو سے غیر ملکی سلطنتوں میں آباد ہونیکی ذمہ داری عوض معاوضہ کی شرط پر کی جاتی تھی۔ دیکھو جرمانی مشترکیت کا قانون مجریہ ۱۸۱۵ء اور تجویز مجریہ ۱۸۱۷ء یکم نومبر ۱۸۶۷ء کے جرمانی شہنشاہی قانون نے جرمانی سلطنتوں کے مابین نقل وطن کی کامل آزادی عطا کی۔ اب یہ آزادی عام طور پر غیر ملکیوں کے لئے بھی وسیع کردی گئی ہے۔

[4] سوئیٹزرلینڈ کا ۱۸۷۴ء منقحہ نظام سلطنت دفعہ ۷۰ مشترکیت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مملکت سے ایسے غیر ملکیوں کو خارج کردے جو اس کی حفاظت کے لئے خطرناک ہوں۔

(ب) اپنی سلطنت کے زیر حفاظت ہونے کا حق خواہ وہ ملک سے باہر ہی کیوں نہ رہتا ہو۔

(ج) رائے دہی اور ایک کامل شہری کے حقوق کو کام میں لانے کا اختیار۔

(د) سرکاری خدمت حاصل کرنے کا حق[1]

(ہ) بعض وقت اس قسم کے عام سیاسی حقوق مثلاً انجمن یا جتھا قائم کرنے عرضداشت پیش کرنے یا آزادانہ اخبار نویسی کے حقوق ملکیت کے حقوق میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غیر ملکی ان حقوق سے کلیتہً محروم کر دیئے گئے ہیں بلکہ وہ ذاتی طور پر یہ حقوق نہیں رکھتے اور صرف سلطنت متعلقہ کی مراعات یا روا داری کی بنا پر ان سے انتفاع حاصل کر سکتے ہیں۔

---

[1] لبیریا کا ۱۸۴۷ء کا فرمان دفعہ ۔ کوئی غیر ملکی اعلیٰ شاہی عہدے، ملکی ملازمت کے خدمات، قوم کے اعلیٰ عہدے، کلیسائی عہدے یا وظائف حاصل نہیں کر سکتا اور نہ بویریا کے شہری ہونے کے حقوق سے کام لے سکتا ہے۔

بائیسواں باب

سلطنت کا تعلق افراد سے

(۳) سلطنت کے شہری

کامل شہریت

قوم اور ملک کے افراد کے عام مجمع سے سلطنت کے شہریوں کی وہ بلند رتبہ جماعت پیدا ہوتی ہے جو اس لقب کی پوری مستحق ہے۔ سلطنت کے شہری اپنی شہریت کی حیثیت سے سیاسی حقوق رکھتے ہیں، اور خاص کر مجلس ملی میں نمائندہ کو منتخب کرنے کا حق۔ اس مفہوم کے لحاظ سے سلطنت کی شہریت کے حق کے لیے پہلی بنیادی شرط ہے قوم کی رکنیت لیکن مزید براں اس میں کامل سیاسی حقوق بھی داخل ہیں۔ پس یہ سلطنت کے ساتھ افراد کے تعلق کا مکمل اظہار ہے۔

قدیم یونانی اور قدیم رومی سلطنتوں میں اس کا انحصار حکمراں شہر (یعنی صدر شہر) کی شہریت کے حقوق رکھنے پر تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں حریت کے رتبے پر اور ازمنۂ وسطیٰ کے اخیر دور میں نیز امتیاز طبقے کے حقوق اور اراضی ملک رکھنے پر۔ موجودہ زمانے کی سلطنت کی رو سے یہ وصف اکثر ملکوں میں ایک بڑی حد تک قوم کی رکنیت کے مرادف ہو گیا ہے۔

اس کے حدود۔

اب عام طور پر سلطنت کی شہریت کے حدود حسب ذیل تسلیم کئے جاتے ہیں:۔

(۱) عورتیں اس سے خارج ہیں۔ سیاسیات مردوں کا کام ہے اس لئے سیاسی حقوق بھی مردوں ہی کے لئے ہیں۔ (دیکھو اسی مقالہ کا بیسواں باب)

(۲) نابالغ اس وجہ سے خارج ہیں کہ سیاسی حقوق کے عملدرآمد کے لئے پختہ رائے کی ضرورت ہے۔ زمانۂ حال کی بعض سلطنتوں میں سیاسی بلوغ کی عمر شخصی قانون کی عمر بلوغ سے مختلف مقرر کی گئی ہے سیاسی اغراض کے لئے سن تمیز کو بڑھا کر مقرر کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے

کہ روزانہ زندگی کے معمولی معاملات کا صاف طور پر سمجھ لینا زیادہ آسان ہے بہ نسبت سیاسی معاملات کے جن میں ایک یہی امر بہت مشکل ہے کہ انتخاب کے وقت امیدواروں کی سیاسی قابلیت کا محاکمہ کیا جائے۔ فرانس، انگلستان، شمالی امریکہ اور اطالیا میں سیاسی اور قانونی حد بلوغ دونوں اکیس۲۱ برس مقرر ہیں اور بویریا کے مانند بعض جرمانی سلطنتوں میں بھی ایسا ہی ہے لیکن پروشیا، جرمانی شہنشاہی اسپین اور پرتگال وغیرہ میں رائے دہی کے لئے پچیس۲۵ برس کی حد مقرر ہے۔ آسٹریا میں چوبیس برس، سویزرلینڈ میں بعض صوبے، سیاسی حد بلوغ تمدنی حد سے قبل مقرر کرتے ہیں یعنی بالعموم بیس برس پورے ہونے پر[1]

(۳) بہت سے لوگ ایسے خارج کئے جاتے ہیں۔ جن کی ملکی حیثیت خراب ہوگئی یا ضائع ہوگئی ہے مثلاً سزا یافتہ یا جو لوگ فضول خرچ قرار دیئے گئے ہوں، یا دوالیئے یا جن لوگوں کو خیرات خانے سے امداد ملتی ہے۔

بعض سلطنتوں میں شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے لئے مزید اوصاف بھی درکار ہوتے ہیں:۔

خود مختاری

(۴) ایک حد تک ظاہری خود مختاری جس کی مختلف سلطنتوں میں مختلف حدیں مقرر کی گئی ہیں قدیم جرمانی قانون میں زمین کا یا علیحدہ گھر کا ہونا ضروری تھا۔ بعد کے جرمانی قانون میں آزادانہ پیشے یا کسی کمیون کی عاملانہ رکنیت۔ پہلا خیال انگلستان[2] اور شمالی امریکہ کے بعض ممالک میں پھیلا ہے اور دوسرے خیال کو جدید جرمانی

---

[1] سویزرلینڈ کا قانون متفقہ ۱۸۴۸ء، دفعہ ۳۷۔ بیس برس سے زائد عمر والا سویزرلینڈ کا ہر باشندہ رائے دہی کا حق رکھتا ہے۔ زیوریچ کا قانون اساسی (۱۸۶۹ء) سیاسی حد بلوغ بیس برس مقرر کرتا ہے حالانکہ وہاں کے ملکی قانون کی رو سے حد بلوغ چوبیس۲۴ برس ہے۔

[2] قانون اصلاح ۱۸۶۷ء کے بموجب قصبات کی رائے دہندگی پیشے اور ادائے ابواب (محصولات) پر منحصر ہے۔ ۱۸۸۴ء کے قانون رائے دہی نے ضلع کی رائے دہی کو قصبہ کی رائے دہی سے ملا دیا ہے اور "خدمتی رائے دہی" کا اضافہ کیا ہے۔

نظامہائے سلطنت[ا] میں جگہ ملی ہے۔ یہ قاعدہ تمام اجرتی ملازموں کو اور اکثر کارخانوں میں کام کرنے والوں کو کم از کم ان میں سے ادنی درجہ والوں کو اور اکثر مزدوری پیشہ دستکاروں کو خارج کر دیتا ہے۔ بعض جدید سلطنتوں نے عام حق رائے دہی کی طرف قدم بڑھائے ہیں اور اس شرط کو نرم کر دیا ہے یا بالکل ہی منسوخ کر دیا ہے۔ سوئیزرلینڈ کے نظامہائے حکومت کا سنہ ۱۸۴۸ء کے بعد سے یہی حال ہے سنہ ۱۸۴۸ء اور سنہ ۱۸۷۰ء کی فرانسیسی جمہوریتوں کا بھی یہی حال تھا۔ علیٰ ہذا فرانسیسی شاہی سنہ ۱۸۵۲ء کی شمالی جرمانی شرکت سنہ ۱۸۶۷ء کی جرمانی شہنشاہی اور سنہ ۱۸۶۴ء کا یونانی نظام حکومت سب اسی جانب مائل ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ بھی اسی رجحان کی متابعت کی کوشش میں ہیں کہ ہر شخص کو انتخاب کا حق ملے۔ پس یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے زمانے کا عام میلان اسی عمومیت کی طرف ہے۔

ملکیت

۵۔ بعض سلطنتوں میں ملکی حقوق ایک خاص مقدار جائداد کی ملکیت پر مشروط ہوتے ہیں۔ یہ بالکل بجا ہے کہ اختیار رائے دہی کی تقسیم میں جائداد کو ایک اہم جزو قرار دینا چاہیے مگر کسی شخص کو محض ناکافی جائداد کی بنا پر حقوق شہریت سے محروم کرنا سلطنت کے خیال کی بیحرمتی کرنا ہے، بشرطیکہ وہ شخص اخلاقی و ذہنی طور پر معاملات عامہ میں حصہ لینے کی قابلیت اور خود مختارانہ حیثیت رکھتا ہو۔ اگر ملکیت سے مراد آمدنی یا محاصل کا ذریعہ ہے اور حد ایک معمولی گذر اوقات پر مقرر کی جائے، تو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر اس صورت میں یہ شرط سابقہ وصف کے ہم معنی ہو جائے گی۔ ممالک متحدہ امریکہ، بویریا (سنہ ۱۸۴۸ء) اور کسی حد تک آسٹریا اور پروشیا کے نظامات حکومت کے نتیجے ایک ہی ہیں۔ ان سب مجموعوں میں رائے دہی کا حق بلا واسطہ ادائی محصول پر ہے۔

مذہب

۶۔ کچھ زمانہ قبل تک مسیحی سلطنتوں میں نصرانیت کا اقرار بھی ضروری تھا، یہودیوں اور مسلمانوں، اور دوسرے مذہب والوں سے اگرچہ رواداری کا برتاؤ کیا جاتا تھا مگر

[ا] بویریا کا نظام سلطنت (سنہ ۱۸۱۸ء دفعہ ۸) ملکی حقوق کے لئے نہ صرف اصل باشندہ ملک ہونے بلکہ سلطنت میں رہنے کا بھی خواہاں ہے، یہ سکونت خواہ محصول جائداد، سامان وغیرہ کے قبضے کیوجہ سے ہو یا قابل المحصول تجارت کا کام کرنے کے باعث ہو، یا سرکاری عہدے کی خدمت کیوجہ سے ہو۔ آسٹریا کا شہنشاہی قانون انتخاب (۲ اپریل سنہ ۱۸۷۳ء دفعہ ۹) کسی جماعت عامہ کی رکنیت کو آزادی کے ہم معنی خیال کرتا ہے۔

* اصل جرمانی کتاب (طبع چہارم) میں سنہ ۱۸۱۸ء ہے، اور انگریزی ترجمہ میں سنہ ۱۸۴۸ء، غالباً سنہ ۱۸۱۸ء ہی صحیح ہوگا، مترجم۔

سیاسی حقوق سے محروم رہتے تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں مذہب و قانون کلیسا و سلطنت ایک دوسرے سے قوی طور پر وابستہ تھے، مذہبی سوسائٹی سے خارج ہونا سیاسی سوسائٹی سے خارج ہونے کے ہم معنی تھا۔ غیر مذہب والے زیادہ سے زیادہ جس امر کی امید کرسکتے تھے وہ رواداری تھی۔ خود امت مسیحی کے اندر اختلاف عقاید سیاسی نتائج پیدا کرتا تھا۔ بعض ملکوں میں صرف کیتھولیکوں اور بعض میں صرف پروٹسٹنٹوں کو پورے حقوق حاصل تھے۔ ویسٹ فیلیا کی صلح نے جرمانیا میں ملکی حقوق کے لحاظ سے کیتھولیکوں اور پروٹسٹنٹوں کو ایک حد پر کردیا، مگر سیاسی حقوق کے اعتبار سے ایسا نہیں ہوا۔ ۱۸۱۵ء کی جرمانی مشترکیت نے جرمانیا کے مسلمہ مذہبی فرقوں کے لئے سیاسی مساوات قائم کردی ان میں کیتھولک، پیروان لوتھر اور پیروان کالوین داخل تھے مگر اور جماعتوں کی حیثیت کو غیر متعین چھوڑ دیا [1]

زمانۂ حال کی سلطنتوں کا قطعی میلان یہ ہے کہ سیاسی حقوق مذہبی اعتقاد سے کلیۃً آزاد کردئے جائیں، اس کا باعث محض مذہبی لاپروائی نہیں ہے، چنانچہ ۱۷۸۹ء کی امریکی کانگریس نے جب کسی ایسے قانون کے منظور کرنے کو روک دیا جس کی رو سے کسی ایک مذہب کو غلبہ حاصل ہو تو اس کا مقصود یہ نہیں تھا کہ وہ مسیحیت کی طاقت سے لاپرواہ ہے، نہ اس کا یہ ارادہ تھا کہ عیسوی تنظیمات کو مدد دینے یا ان کی حفاظت کرنے سے سلطنت کو باز رکھے۔

مذہبی آزادی

موجودہ اصول کی بنیاد فی الحقیقت اس خیال پر ہے کہ مذہبی اعتقاد کا تعلق تمام و کمال دل سے ہے، اور وہ جبر کی حد سے خارج ہے، اس لئے مسیحی اعتقاد سے ہٹنے کی وجہ سے کسی قسم کی سیاسی نااہلیت نہ عاید کرنا چاہئے۔ اہل امریکہ نے مذہب اور سلطنت کے مابین ایک قطعی تمیز قائم کی اور وہ اس طرف مائل تھے کہ دونوں کو آزاد چھوڑ دیں اور اسی خیال سے انھوں نے مذہبی بنا پر ان لوگوں کو سیاسی حقوق دینے سے بھی انکار نہیں کیا جو اور اعتبار سے اس کی اہلیت رکھتے تھے لیکن دوسری جانب انہیں اصول کا فرانسیسی انقلاب میں اختیار کیا جانا یقیناً آزادی کی رعایت پر مبنی نہیں تھا بلکہ اس وقت کی متواتر مذہبی ستم شعاریوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی بنا زمانے کی ناکن خیال پرستی تھی جو ہرزہ گردی سے شروع

---

[1] قانون مشترکیت جرمانی دفعہ ۱۱۶ "جرمانی مشترکیت کے ممالک میں عیسوی مذہب کے اندر اختلاف عقاید کی وجہ سے ملکی یا سیاسی حقوق میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا جائے گا۔"

ہوکر مسیحیت کی وحشیانہ نفرت پر ختم ہوئی عل۱

جرمانیا میں بھی اس اصول کا قطعی ظہور ۱۸۴۸ء میں ہوا اور اب وہ مسلم سمجھا جاتا ہے شہریوں کے عام حقوق کی بابت آسٹریا کا قانون اساسی ۱۸۴۹ء (دفعہ ۱) اور ۲۱۔ دسمبر ۱۸۶۷ء کا قانون نیز پروشیا کا ۱۸۵۰ء والا نظام سلطنت اس شہنشاہی نظام سلطنت کے مسودے سے متفق ہیں جو فرانک فورٹ اور برلن میں تیار ہوا تھا اور جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ملکی اور سیاسی حقوق کے انتفاع کو مذہبی اعتقاد سے کوئی تعلق نہیں دانشمندانہ طور پر یہ بھی اضافہ کر دیا گیا تھا کہ "مذہبی اعتقاد ملکی فرائض کی بجا آوری کے لئے عذر نہیں ہو سکتا"

شمالی جرمانی شرکیت کے ۳۔ جولائی ۱۸۶۹ء والے قانون میں (جو اب شہنشاہی کا قانون ہے) یہ قرار دیا گیا ہے کہ ملکی اور سیاسی حقوق کے جس قدر قیود اختلاف عقاید پر مبنی ہیں وہ سب اس قانون کے ذریعہ سے منسوخ کئے جاتے ہیں خاصکر جماعتی اور قومی نیابت کی شرکت اور سرکاری عہدوں کا تقرر مذہبی اعتقاد سے آزاد ہوگا۔

اس سے ان ممالک میں یہودیوں کی حیثیت بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے یہ لوگ جرمانیا میں سیاسی حقوق سے تقریباً بالکل ہی محروم تھے مگر اب مذہب کی بنا پر ان کے لئے ان حقوق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مذہبی آزادی ابھی کامل حاصل نہیں ہوئی ہے

لیکن یہ نیا اصول ابھی عالمگیر طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے بلکہ پوپ کے ماننے والوں کی طرف سے برابر ملعون ٹھہرایا جا رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ ان کیتھولکی سلطنتوں میں جہاں پادریوں کا اثر غالب ہے جزءاً یا کلاً مسترد کیا گیا ہے۔ بلکہ ناروے عل۲ اور سویڈن ابتک اس سے منکر ہیں۔ سویزرلینڈ میں ۱۸۶۶ء کے نظام سلطنت تک میں سیاسی حقوق عیسوی مذہب کے اقرار پر منحصر تھے، انگلستان تک میں جہاں منحرفوں اور کیتھولیکوں (اور یہودیوں) کے موانع اس صدی کے اوائل میں

عل۱ یہ نیا اصول ۱۷۸۹ء میں اعلان حقوق انسان کی دفعہ اول میں ظاہر ہوا بعد کے کسی نظام سلطنت نے شہریت کا انحصار عقیدے پر نہیں رکھا ہے۔

عل۲۔ ناروے میں لوتھر کی پیروی نکرنے والے اب سلطنت کے صرف اعلیٰ عہدوں سے خارج ہیں ۲۱۔ جولائی ۱۸۵۱ء کے قانون نے یہودیوں کو بھی داخل کر لیا ہے + اصل جرمانی متن میں سویڈن کا ذکر نہیں ہے بلکہ ناروے اور روس ہے۔ مترجم۔

رفع کئے جاچکے ہیں، وہاں بھی جدید اصول ابھی کامل طور پر مسلم نہیں ہوا ہے۔

بہرحال جدید سلطنت جو اپنی آزادانہ اور قومی بنیاد پر صداقت کے ساتھ قائم ہے۔ مختلف مذاہب کے پیروؤں کو اپنی عام تنظیمات میں داخل کرکے متحد کرنے کی طرف قطعی طور پر مائل ہے اور ازمنۂ وسطیٰ کے خیالات کے مطابق حقوق عامہ کو معین مذہبی شرائط یا کلیسائی قواعد سے وابستہ کرنے کے مسلک کو بتدریج منسوخ کرتی جاتی ہے۔

تیسرا مقالہ

سلطنت کا بنیادی اصول پر [illegible] فطرت کے لحاظ سے

تمہید

پہلا باب

آب و ہوا

قومی خصلت پر آب و ہوا کا اثر

سارے ادنیٰ حیوانات کے برخلاف انسان دنیا کے ہر خطّے میں رہنے کی قابلیت رکھتا ہے اور اپنی خصوصیات کو قائم رکھ سکتا ہے۔ خارجی اثرات کی مقاومت کی قوت اور ہر خطر آب و ہوا کے مقابلہ کا سامان اس کے پاس نسبتاً وافر اور مکمل ہے مگر پھر بھی گرمی اور سردی، دلیل و نہار کا اثر اس کے جسم و دماغ پر پڑتا ہی ہے۔ وہ خط استوا یا قطبین سے جس قدر قریب ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی زندگی کے حالات بدلتے جاتے ہیں۔ اگرچہ شمال یا جنوب میں سفر کرنے سے یا کسی خاص عرض البلد میں زیادہ قیام کرنے سے ایک منفرد شخص کی حالت بہت کم بدلتی ہے مگر من حیث المجموع ایک گروہ پر آب و ہوا کا اثر پڑتا ہے اور چند نسلوں کے گزرتے پر بدن کی ساخت میں اور اس سے زیادہ اس کی جبلت میں تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مشرق میں جاکر روسیوں میں زنانہ پن آگیا۔ افریقہ کے شمالی ساحل پر پہنچ کر جرمانیوں کا کس بل نکل گیا اور ہندوستان میں جاکر انگریز بہت جلد سست اور شہوت پرست ہو جاتے ہیں۔

بودین (کتاب پنجم) مونٹسکیو (کتاب چہارم) فیلنگیری (کتاب چہاردہم پانزدہم) اور بکل (تاریخ تمدن جلد اول باب دوم) نے عام زندگی پر آب و ہوا کے اثرات کے متعلق بحث کی ہے اور اس کے قوانین معین کرنے کی کوشش کی ہے۔

معتدل اقلیم

بہت زمانہ قبل یہ خیال ظاہر کیا جا چکا ہے کہ گرم ممالک (۲۳ درجے ۲۸ دقیقے تک) اور سرد قطبی اقلیم (۶۶ درجے ۳۲ دقیقے کے آگے) سلطنتوں کے نشو و نما کے لئے اس قدر موزوں نہیں ہیں جس قدر ان کے درمیان کے معتدل اقلیم موزوں ہیں۔ زمین کی خشکی کا آدھے سے زیادہ حصہ انھیں معتدل اقلیموں میں واقع ہے اور شمالی نصف کرے میں جہاں بیشتر متمدن قومیں آباد ہیں، خشکی اور تری کا حصہ قریب قریب برابر ہے۔ یعنی ۱۱۷۶۰۰۰۰ مربع میل خشکی اور ۲۳۱۰۰۰۰۰ مربع میل تری۔ اس کے خلاف دیگر حصص میں پانی کا حصہ بہت ہی زیادہ ہے۔ سرد ممالک میں انسان کے لئے اجتماعی

سردی اور گرمی کی تنہا

حالت میں رہنا دشوار ہے کیونکہ غذا اور ایندھن وہ اپنی آس پاس کی جگہوں سے مہیا نہیں کر سکتا اور منتشر خاندانوں کو اپنی ہستی ہی قایم رکھنے کے لئے فطرت سے اس قدر سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ اعلیٰ اغراض پر کماحقہ توجہ کرنے کے لئے نہ انہیں وقت ملتا ہے، نہ ان کو اس کی خواہش ہوتی ہے۔ دوسری جانب گرم ممالک کاہلی پیدا کر دیتے ہیں اور جذبات کا ہنگامہ خیز جوش وقتاً فوقتاً بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ انسان کی فاعلی قوتوں کو اس کے ساکت میلانات کے مقابلے میں بہت کم ترقی دیتے ہیں مگر سلطنت کو جس کا مقصد خود داری و آزادی ہے مستعد کاری اور مردانہ صفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرد اقلیموں کے باشندے آزاد ہوتے ہیں مگر ان میں سیاسی اتحاد کی کمی ہوتی ہے۔ دوسری طرف گرم اقلیموں کے باشندے اپنے حقوق کی حفاظت کرنے یا ایک آزاد سلطنت کے ترقی دینے کے بجائے مطلق العنان قوت کو زیادہ آمادگی سے انگیز کر لیتے ہیں۔ بودین آج سے بہت پہلے اپنی تصنیف کے (مقالہ ۵، ص ۱، ۶ بب) کہہ گیا ہے کہ "درمیانی خطوں کے باشندے جنوبی اقلیم کے رہنے والوں سے قوت میں زیادہ اور چالاکی میں کم ہوتے ہیں اور شمالی اقلیم والوں سے دماغی جوہر میں زیادہ اور قوت میں کم۔ اور (اس لئے) وہ جمہوریتوں پر حکمرانی کرنے اور ان کو چلانے کے لئے زیادہ موزوں اور اپنے افعال میں نہایت عدل پسند ہیں۔" [دیکھو ارسطو کی سیاسیات باب ۷، فصل ۷۔ انگریزی مترجم]

آج کل کے ریاضی علوم کی مدد سے شمسی حساب کے بموجب آب ہوا عرض بلد سے ظاہر کی جاتی ہے اور جس کا انحصار آفتاب کے ساتھ سطح زمین کے تعلق پر ہے اس کے علاوہ موجودہ سائنس نے طبعی آب و ہوا بھی دریافت کی ہے۔ مختلف مقامات کی اوسط حرارت و برودت کا اندازہ کرنے سے وہ خطوط اتحاد الحرارت قائم کرتی ہے جو دوائر عرض بلد سے تماماً موافق نہیں ہوتے بلکہ جس جس طرح آب و ہوا پر سمندر کی سطح سے زمین کی بلندی، خلیج و بحر کی قربت، آب و باد کی

رفتار وغیرہ دوسرے اسباب کا اثر پڑتا ہے اُسی طرح یہ خطوط شمالاً یا جنوباً مڑتے جاتے ہیں۔ اسلئے انھیں زیادہ کثیر التعداد اور نازک امتیازات کے معلوم کرنے کا موقع ملتا ہے مگر اس سے صرف اسی سابقہ تحریر کی تائید ہوتی ہے کہ انتہائی اقلیموں کے مقابلے میں معتدل اقلیم تمدن کے لئے زیادہ موزون ہے۔

دارالسلطنتوں کا محل وقوع

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ تقریباً تمام اہم سلطنتوں کے مستقر معتدل اقلیم کے عین وسط میں واقع ہیں جہاں گرمی کا اوسط (سو درجے والے حرارت پیما کی رو سے) ۸ اور ۱۶ درجوں کے درمیان رہا کرتا ہے یعنی تقریباً تمام ہی یورپی سلطنتوں اور بیشتر ایشیائی سلطنتوں کے (جہاں خطوط اتحاد الحرارت بہ تیزی تمام جنوب کیطرف مڑ جاتے ہیں) اور اسی طرح شمالی امریکہ کی اکثر سلطنتوں کے پایہ تخت اسی اقلیم کے اندر واقع ہیں۔ ان میں بلاد ذیل شامل ہیں۔ روما (۱۵ درجے ۴ دقیقے) میڈرڈ (۱۴ درجے ۲ دقیقے) پیرس (۱۰ درجے ۸ دقیقے) لندن (۹ درجے ۸ دقیقے) وینیا (۱۰ درجے ۵ دقیقے) قسطنطنیہ (۱۳ درجے ۷ دقیقے) برلن (۹ درجے ۱ دقیقہ) ہامبرگ (۸ درجے ۹ دقیقے) کوپن ہاگن (۸ درجے ۲ دقیقے) زیورچ (۸ درجے ۸ دقیقے) ہاغ (ہیگ) (۱۰ درجے ۵ دقیقے) ڈریسڈن (۸ درجے ۳ دقیقے) میونک (۹ درجے ۱ دقیقہ) بوسٹن (۹ درجے ۶ دقیقے) واشنگٹن (۱۳ درجے ۵ دقیقے) فلاڈلفیا (۱۱ درجے ۹ دقیقے) رچمنڈ (۱۳ درجے ۸ دقیقے) پیکن (۱۱ درجے ۳ دقیقے) یورپ کے جو مستقر زیادہ سرد اقلیم میں واقع ہیں وہ بس چند ہی ہیں۔ پیٹرسبرگ (۳ درجے ۱ دقیقہ) کرسٹیانا (۵ درجے ۳ دقیقے) اسٹوک ہولم (۵ درجے ۶ دقیقے)۔ مگر گرمی میں ان کی اوسط حرارت ۱۵ یا ۱۶ درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ مونٹ ریل کا اوسط مزاج (۶ درجے ۴ دقیقے) ہے مگر موسم گرما میں حرارت (۲۰ درجے ۵ دقیقے) پر پہنچ جاتی ہے۔ زیادہ جنوبی شہروں کا اوسط مزاج معتدل اقلیم کی حد سے کچھ ہی متجاوز ہے۔ ان میں نیپلز (۱۶ درجے ۴ دقیقے) لسبن (۱۶ درجے ۴ دقیقے)۔ میکسیکو (۱۶ درجے ۲ دقیقے)، بیونس ایرس (۱۶ درجے ۹ دقیقے) پارزو (۱۶ درجے ۲ دقیقے) سڈنی (۱۸ درجے ۱ دقیقہ) ناگاساکی (۱۸ درجے ۳ دقیقے) داخل ہیں۔ برخلاف ان کے کنٹن کی اوسط حرارت (۲۱ درجے ۲ دقیقے) قاہرہ کی ۲۲ درجے ۴ دقیقے) ری یوڈی جینیرو کی (۲۳ درجے ۱ دقیقہ) کلکتہ کی (۲۵ درجے ۸ دقیقے) سنگاپور کی (۲۶ درجے ۸ دقیقے) ہے مگر یہ خیال رکھنے کے قابل ہے کہ چین پر حکمرانی پیکن سے ہوتی ہے اور ہندوستان کا تمدن پنجاب اور بالائی گنگا کے زیادہ معتدل مقامات سے آیا ہے۔

معتدل اقلیم میں چار موسموں کا یکے بعد دیگرے بدل بدل کر آنا اور ان چاروں کا ایک دوسرے سے واضح طور پر ممتاز ہونا انسان کے دماغ میں ایک امنگ پیدا کرتا ہے، اس لئے کہ مناظر فطرت کے پیہم تغیرات اسے نئے مشاغل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اقلیموں کا یہ اختلاف ہر ایک اقلیم کے اندر بھی واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے گو اس سختی کے ساتھ نہیں جیسا دو اقلیموں کے درمیان میں ہوتا ہے۔ ایک ہی قوم اور ایک ہی ملک کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ ذہانت، اعتدال پسندی، جسمانی طاقت اور قوت برداشت اسی ملک کے زیادہ سرد حصوں میں نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے اور اسی طرح چالاکی، قوت تخیل، محرور المزاجی اور اشتعال پذیر اعصاب زیادہ گرم حصوں میں پائے جاتے ہیں ہم اطالیوں، فرانسیسیوں، جرمانیوں اور روسیوں پر نظر کریں اور ہر ملک کی شمالی آبادی کا اس کی جنوبی آبادی سے مقابلہ کریں (لیکن مقابلہ مجموعات کا ہو افراد کا نہو) تو یہ حقیقت فوراً ہی منکشف ہو جاتی ہے۔ بوڈین نے تو مبالغے کے ساتھ یہاں تک کہدیا ہے کہ شمالی قومیں جنوبی قوموں کو جنگ میں شکست دیدیتی ہیں اور تدبیر سیاسیہ میں خود ان سے شکست کھا جاتی ہیں لیکن معتدل اقلیم کی شمالی اور جنوبی آبادی کا مزاجی فرق ایک حقیقی فرق ہے اور مدبر کے لئے لازم ہے کہ وہ اس کا لحاظ کرے۔

آب وہوا اور توضیع قانون

آب وہوا کے خراب اثرات کے خلاف سیاسیات بہت کم کچھ کر سکتی ہے فطرت کی طاقتیں سیاسیات سے زیادہ قوی ہوتی ہیں۔ آب وہوا کے فوائد سے متمتع ہونے اور اس کے مضرات سے بچنے کے لئے مدبر سے جو کچھ ممکن ہو وہ اسے کرنا چاہئے۔ تعلیم اور قانون سے کچھ ہو سکتا ہے، مختلف آب وہوا سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں انھیں کے موافق قانون بھی مختلف بنانا پڑے گا مگر اس وضع قانون میں مختلف آب وہوا کے ضروریات پر بھی لحاظ کرنا پڑے گا مثلاً یہ کہ سرد ممالک کے مزدوروں کو گرم ممالک کے بہ نسبت گوشت اور شراب کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اور سخت نشیات جو گرم ملکوں میں خطرناک ہوں گی وہ سرد ملکوں میں ضروریات میں داخل ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ شراب کے متعلق آنحضرتؐ کی ممانعت، عرب کے موافق ہے مگر اہل یورپ کے لئے غیر ممکن ہے[1] زیادہ سرد ممالک میں مزدوروں کو بحال خود چھوڑ دینا چاہیے

[1] الحق لیلو ولا لیلیٰ۔ خدا کی قدرت ہے کہ امریکہ میں شراب کا کلی سدباب ہو گیا۔ یورپ کے بیشتر ممالک

مگر زیادہ گرم ملکوں میں ان کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے لیکن ان تمام معدلات کے باوجود جو آب وہوا سے پیدا ہوتے ہیں انسانی فطرت تمام اقلیموں میں ایک ہی رہتی ہے اور ایک حد تک ہر آب وہوا کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ اصحاب قوت وثروت کو اس سے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی۔

جب کسی دارالحکومت کی بنا ڈالنے یا منتقل کرنے کا سوال پیش آتا ہے تو آب وہوا کے خیالات کو بہت اہمیت دیجاتی ہے۔ اوٹو سوم سے سخت سیاسی لغزش سرزد ہوئی کہ اس نے روما کو جرمانی شہنشاہی کا دارالحکومت بنانا چاہا اور اسی طرح کلکتے سے ہندوستان پر حکمرانی کرنا کوئی اچھی رائے نہیں ہے۔ برلن کو پروسیا کے دارالسلطنت منتخب کرنے کے خلاف بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے مگر کوئینگس بیرگ سے یہ بہر نوع بہت بہتر ہے۔ سلطنت اطالیا کے دارالسلطنت کے لئے فلورنس کا عارضی انتخاب اس لحاظ سے اچھا تھا کہ ٹیورن کی سختی اور نیپلز کی نرمی کے بین بین خوشگوار آب وہوا قومی خصلت کی میزان کو برقرار رکھنے کے لئے خوب موزوں ہے۔[۲۰]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اسی طرف کامزن ہیں اور جو ممالک شراب کے استعمال کو روا رکھتے ہیں وہ بھی اب اس حد تک تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اس کا مفاد کم اور ضرر زیادہ ہے، کوئی دن جاتا ہے کہ وہ اسے "رجس من عمل الشیطان" ماننے پر مجبور ہوجائیں گے۔ (مترجم)

۲۰ کسی شہر کی بہترین جائے وقوع کی نسبت ارسطو کی رائے کے لئے (جو صرف یونانی ممالک اور بہت ہی چھوٹی چھوٹی شہری حکومتوں کے لحاظ سے لکھی گئی ہے) "سیاسیات" ارسطو باب ہفتم فصل یازدہم دیکھنا چاہیے۔ (انگریزی مترجم)

دوسرا باب

ملک کی ہیئت اور قدرتی اشکال

ملک کی ہیئت اور اس کے باشندوں کے تمدن کے باہمی تعلق پر کارل ریٹر کے وقت سے جغرافیہ دانوں نے زیادہ توجہ کی ہے مگر یونانی بہت پہلے اسپر نظر ڈال چکے ہیں [۱]

دریا

قدیم ترین متمدن سلطنتیں پنجاب میں اور پائیں گنگا، نیل، دجلہ و فرات اور پیہو کی وادیوں میں قائم ہوئی تھیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بڑے دریاؤں کے کنارے کی زندگی انسانی قوی اور انسانی تخیل کی ابتدائی ترقی کے لئے خصوصیت کے ساتھ موزوں ہے۔ انسان جب جہازات بنالیتا ہے نہریں کاٹ لیتا ہے اور دریاؤں سے کام لینے لگتا ہے تو اسے خود اپنے پر اعتماد پیدا ہوجاتا ہے اور وہ دولت کے حاصل کرنے میں لگ جاتا ہے اور پانی کی زندگی سے اس میں مبادرت و تجارت کا شوق ترقی کرجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جزائری ممالک جن میں بندرگاہیں واقع ہوتی ہیں جلد ترقی کرجاتے ہیں۔

سمندر

یونان اور اطالیا کی قدیمی فوقیت، مغرب میں اسپین اور پرتگال کی کامیابی انگلستان اور ولندیز میں آزاد سلطنتوں کا عاجلانہ عروج یہ سب کچھ زیادہ تر ان کے بحری مواقع کی وجہ سے تھا اگر سمندر کو تابع فرمان کرنے میں زیادہ محنت اور کوشش کی ضرورت ہوئی ہے تو اس کا اثر بھی دریاؤں کے بہ نسبت زیادہ زوردار ہوتا ہے۔

پہاڑ

خصلت اور طینت پر پہاڑی ملکوں کا خصوصیت کے ساتھ قوی اثر پڑتا ہے

---

[۱] { ارسطو "سیاسیات" باب ۷، فصل ۵-۶۔ انگریزی مترجم۔ }

انسانی طبائع کے بلند اور قوی کرنے میں مختلف الجامات پہاڑوں کی شوکت ہنگیں سمندروں سے کم موثر نہیں ہوتی پہاڑوں کے رہنے والے مجبور ہیں کہ روزانہ اپنی انتہائی قوت سے کام لیں اس سے ان میں ایک طرح کی طاقت اور اپنی آپ مدد کرنے کی ایسی قوت پیدا ہوجاتی ہے جو ان میں مردانہ صفات پیدا کر دیتی ہے علاوہ اس کے پہاڑی ملک کی منتشر کیفیت اور اس کی ایک دوسرے سے بے تعلق کثیر التعداد وادیاں چھوٹی چھوٹی ملتوں کی ترقی کی معاون ہوجاتی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر زور دار آزادی کے ساتھ ترقی کرتی اور ہر طرح کے حملوں کے روکنے میں ثابت قدم رہتی ہیں۔ یہ خصوصیات اسرائیلیوں اور عربوں میں اسی طرح ہویدا ہیں، جس طرح ایرانیوں میں۔ کوہ قاف کے قبائل میں اس کا ظہور، یونانیوں، سوئزرلینڈیوں اور سمنائیوں سے کم نہیں ہوا مگر آزادی کا جوش سمندر اور پہاڑ کے اثر سے مختلف رنگ اختیار کر لیتا ہے روما کی یہ خاص خوبی قسمت تھی کہ اسے پہاڑ اور سمندر دونوں کے اثرات سے ایک ساتھ فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

اندرونی ممالک

اندرونی ممالک خاصکر وہ ممالک جن میں وسیع میدان ہوں، اپنی رفتار ترقی میں نسبتاً زیادہ سست ہوتے ہیں کیونکہ وہاں کوئی قدرتی محرک نہیں ہوتا، سلطنت کو فرانس میں اٹالیا کے بعد اور جرمانیا میں انگلستان کے بعد نشو ونما حاصل ہوا۔

سب سے بدتر موقع سمندر سے دور افتادہ سطح ملکوں کا ہے جن میں نہ کوئی بڑا دریا ہوتا ہے نہ پہاڑ بلکہ صرف وسیع دشت و بیابان ہوتے ہیں۔ افریقہ کا یورپ سے ایشیا کے اندرونی ممالک کا ان کے سواحلی ممالک سے، مغربی یورپ کا مشرقی یورپ سے مقابلہ کیجئے تو یہ فرق فوراً ہی عیاں ہو جاتا ہے۔ ایسے ممالک کی بلید الطبع آبادی مطلق العنان حکومت کی اطاعت کو بے چون وچرا اپنے اوپر لازم کر لیتی ہے۔

انسان کی طاقت قدرت پر

انسان ان قدرتی حالات کو پیدا نہیں کر سکتا، مگر آب وہوا کے بہ نسبت اسے ان حالات پر زیادہ قدرت حاصل ہوتی ہے وہ پہاڑوں کو جگہ سے ہٹا نہیں سکتا نہ سمندر کو اپنے ملک سے ملا سکتا ہے مگر وہ دریاؤں کو قابل سفر بنا سکتا، نہریں کاٹ سکتا ہے، ریل جاری کر سکتا اور تار برقی کا ایک جال سارے ملک میں پھیلا سکتا ہے۔ وہ ملک کی ساکت حالت میں تجارت کے ذریعے سے زندہ دلی پیدا کر سکتا اور ملک کے اندرونی حصے کو سمندر سے ملا سکتا ہے۔ کرۂ ارض کے تمام قابل سکونت حصوں کو ایک مسلسل اور

بارآور اتحاد کے روابط میں وابستہ کرتی ہے کا عظیم الشان کام تہذیب جدید کے پیش نظر
ہے اور انجام کار تکمیل کو پہونچ جائے گا۔

ٹامس بکل نے زیادہ تر ذہنی اور تغیر پذیر نوامیس کے اثرات کی طرف توجہ دلائی ہے
یہاں بھی سمندر اور پہاڑ کے مناظر، اندرونی میدان کے منظرون کے بہ نسبت زیادہ گہرا
اور دل پذیر اثر پیدا کرتے ہیں مگر اس کے سوا اور اثرات بھی ہیں گرم اقلیم کے ملکون میں فطرتی
حالت اکثر ایسی بے قابو کر دینے والی ہوتی ہے کہ انسان اسے مغلوب کرنے سے مایوس ہو کر
تمام کوششیں ترک کر کے بیٹھ رہتا ہے اور اس کے تخیل میں فطرت کی ہیبت قوت کے سوا
اور کوئی بات نہیں رہتی۔ اس کا دل خوف اور وہم سے بھر جاتا ہے۔

برف باری کی شدت، برف کی چٹانوں کی روانی، پہاڑی اقطاع میں
ہوا کا طوفان شدید بارش اور سیلاب اور اکثر گرم ممالک میں خوفناک طوفان اور بگولون کا اٹھنا زمین
کا سرسبز حالت سے دفعتاً لق و دق میدان ہو جانا۔ حشرات الارض کا تباہ کن دل، وحشی
جانورون کا خطرہ یہ سب وہ اثرات ہیں جو ان ممالک کے باشندون کی طبیعتون کو ابھارنے
کے بجائے پست اور پریشان کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے انسانی طبائع کی ترقی کے لیے
معتدل ملک سب سے زیادہ موزون ہے۔ یکسان آب و ہوا میں طبیعت کو کافی
تحریک نہیں ہوتی اور شدت انسان کو پریشان کر دیتی ہے۔ انسانی خیالات کے ابھرنے
اور اس کی کوششوں کے برانگیختہ ہونے کے لئے متنوع اور معتدل آب و ہوا کی ضرورت
ہے۔ انسانی طبیعت جو گرم اقلیم کے ملکون میں از خود رفتہ ہو جاتی ہے وہ معتدل حالت
میں ایک منتظم و معقول رفتار سے نشوونما حاصل کرتی ہے۔

معتدل آب و ہوا کا فائدہ

مگر نوامیس طبعی کی اہمیت میں بہت مبالغہ نہ کرنا چاہئے۔ ان تمام باتون کے باوجود
ان پر زیادہ انحصار نہیں ہے بلکہ انحصار خود انسان کے ذریعے سے انسان کی اخلاقی اور ذہنی
تعلیم پر ہے۔ گرم ممالک میں شعور فطری (عقلیت) کی تربیت ہو سکتی ہے اور احساس حسن کے
ذریعے سے وہم (تخیل) کی روک ہو سکتی ہے، اور اسی طرح (بلا تعلیم) معتدل ملک میں اوہام خودرو
گھانس کی طرح بڑھ کر تخیل صحیح کو دبا سکتے ہیں۔ انسان فطرت کی قوتون کا بندہ نہیں ہے
اسے ہمت اور آزادی کے ساتھ فطرت کا مقابلہ کرنا چاہئے جو مدد فطرت سے مل سکتی ہو اس
سے فائدہ اٹھائے اور جو مضرتیں اس میں ہوں اُن کے انسداد اور اصلاح میں جدوجہد کرے

تیسرا باب

زمین کی زرخیزی

جس ملک کی زمین زرخیز ہوتی ہے وہاں بسر اوقات نسبتاً آسان ہوتی ہے اور اسی اندازے سے آبادی بھی بڑھ جاتی ہے۔ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ زرخیز زمین نظم معاشرت وسلطنت کی بہبود کے لئے سب سے زیادہ مفید شئے تھی اسی سے خوش عیش بہشت کا خیال پیدا ہوا جہاں رنگ برنگ کے خوش ذائقہ پھلوں کے لئے صرف ہاتھ بڑھانے کی ضرورت ہوگی اور طفل مزاج اور سست طبع لوگوں کا انتہائے خیال ابھی تک یہی ہے مگر پختگی سن اور انسانی کوشش سے اس حالت سے ایک نفرت پیدا ہو جاتی ہے جس میں زندگی کے صحیح مقصد اور فطرت انسانی کے نمو اور تکمیل کا کوئی خیال نہ ہو۔

بنجر زمین

یہ یقینی ہے کہ بالکل بنجر زمین معاشری زندگی کے لئے ناموزوں ہے کیونکہ اس حال میں انسان مجبور ہوتا ہے کہ تجارت کے ذریعے سے اپنی غذا کسی دور دراز مقام سے مہیا کرے ان حالتوں میں تجارتی شہر قائم ہو جاتے اور ترقی کرتے ہیں۔ جیسا کہ بے ثمر سمندر کی آغوش میں شہر وینس نے پرورش پائی مگر بنجر ملکوں میں پوری پوری قومیں صرف تنگدستی اور تکلیف ہی کے ساتھ بسر کر سکتی ہیں۔ آبادی کم ہوتی ہے اور اس کی ترقی بھی خفیف ہوتی ہے کسی معین جگہ کا توطن بھی بدشواری ممکن ہوتا ہے الوگ منتشر خاندانوں اور گروہوں کی صورت میں خانہ بدوش زندگی بسر کرتے ہیں۔ بکل نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مغلوں اور تاتاریوں نے خود اپنے بنجر میدانوں میں بہت کم ترقی کی اور چین اور ہند کی قابل زراعت زمینوں میں پہنچ کر

انھوں نے ایک تمدن کو حاصل کیا۔ اسی طرح اہل عرب بھی اس وقت تک کوئی ترقی یافتہ سلطنت نہ قائم کر سکے جب تک کہ وہ عرب کو چھوڑ کر ایران کی زرخیز زمین اور بحر متوسط کے ساحل پر نہیں پہنچے۔ سرد آب وہوا میں سلطنت کی سست ترقی کا صرف یہی سبب نہیں ہوتا کہ گرم سامان کے مہیا کرنے اور فطرت سے سخت کشاکشی کی مشکل درپیش رہتی ہے بلکہ یہ بھی سبب ہوتا ہے اور بہت بڑا سبب ہوتا ہے کہ سرد ممالک کی زمین بنجر ہوتی ہے۔ یہی اثرات ان گرم ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں جہاں ظاہرا زرخیزی بہت ہوتی ہے مگر کثرت او [illegible] اتفاقی حادثات جیسے کیڑوں کی بلا یا سیلاب اسے غارت کرتے رہتے ہیں کیونکہ [illegible] کے جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کی مشکلات بھی معاشری زندگی کے لئے ویسی ہی [illegible] پیداوار کی قطعی قلت۔

زرخیز زمین سے یہ نتیجے ہوتے ہیں

نہایت ہی زرخیز زمین جو بلا محنت کے کافی غذا مہیا کردے ایسی زمین سے بہتر ہے جس میں کچھ پیدا ہو لیکن سلطنت کے لئے کسی نہج سے یہ بہترین بنیاد نہیں ہے اور اس کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کاہلی

انسانی کوشش کا خاص محرک غذا کے مہیا کرنے کی خواہش ہے۔ اگر یہ ضرورت فطرت کی فیاضی سے رفع ہو جائے تو انسان بہت ہی کم کام کرتا ہے بلکہ مطلقاً کام نہیں کرتا اور بالعموم کاہلی اور شہوت پرستی میں غرق ہو جاتا ہے۔ جہاں انسان کام سے باز رہتا ہے وہاں اس کی فطرت کے مخفی وسائل کو نشو ونما نہیں ہوتی اور اس لئے معاشرت میں بھی ترقی نہیں پیدا ہوتی۔ گرم اقلیم کے متعدد جزیروں میں لوگ خوشحالی کے ساتھ عیاشانہ زندگی بسر کرتے مگر اس کے ساتھ ہی عوام غیر متمدن رہتے ہیں۔ ہیپلز نے جب اپنے کاہل آوارہ گروہوں کو محنتی مزدوروں کی حالت میں بدل دیا تو اس نے انسانی تہذیب میں بہت ترقی کرلی

۲۔ محنت کی ذلت

جہاں محنت کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں محنت اور محنت کرنے والے دونوں حقیر نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ قوم کے عام آدمیوں کی زندگی کسی شمار میں نہیں ہوتی۔ انسانی زندگی سے ایسی وحشیانہ لاپروائی کہیں نہیں برتی جاتی جیسی آفریقہ کی حبشی مطلق العنان سلطنتوں میں ہوتی ہے، جہاں بلا کشت و درو کے زمین سے پیداوار حاصل ہو جاتی ہے اور محنت کو وقعت دینے کے لئے کوئی صنعت و حرفت موجود نہیں ہے۔

۳۔ ملکیت کا غیر مساویت

زمین کی زیادہ زرخیزی سے ملکیت کی غیر مساوی تقسیم کو ترقی ہوتی ہے۔ چند دولتمند

عیش فراوان میں زندگی بسر کرتے ہیں، متوسط طبقہ ہوتا ہی نہیں اور عام لوگ مفلسانہ اور غلامانہ حالت
میں رہتے ہیں۔ چونکہ زمین کی بارآوری انسانوں کی بارآوری کو بھی ترقی دیتی ہے یعنی نئے خاندان
آسانی سے بنتے ہیں اور روزی کمانے کی فکر بچوں کی پیدائش اور پرورش کے مواقع کو
نہیں گھٹاتی اس لئے ان ممالک میں آبادی پر کوئی روک نہیں ہوتی بلکہ اُس میں تیزی
کے ساتھ ترقی ہوتی جاتی ہے مگر وقتاً فوقتاً قحط یا جنگ اس بے پروا آبادی کو مصیبت
میں مبتلا کر دیتی ہے (اور اس وقت) وہ چند اشخاص جنھیں اپنی پیداوار کے جمع کر رکھنے
کا سامان حاصل ہوتا ہے وہ عوام کو مجبور کرتے ہیں کہ غذا کے عوض وہ اپنے پھلوں کے
درخت اور زمین ان کے حوالے کر دیں۔ فوجی سردار محافظت کے عوض میں محصول اور
خدمت لیتے ہیں، پروہت جو دیوتاؤں کو راضی کرتے اور ان کی نوازش حاصل کرتے
ہیں، اپنے معتقدین سے بڑی بڑی جائدادیں پاتے ہیں اس طرح آہستہ آہستہ دولتمند
زمینداروں اور رئیسوں، امیروں اور پروہتوں کا ایک طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو سارے
ملک کا مالک ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی حد تک تہذیب بھی حاصل کر لیتے ہیں اور بہت
بڑی دنیاوی ثروت کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ ماتحت طبقات سے محنت لیتے
ہیں مگر اس محنت کو ارزاں رکھتے ہیں کیونکہ مزدوروں کی کثرت ہوتی ہے اور اس لحاظ
سے انسان کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ عوام فلاکت زدہ، حقیر اور بالکل ہی دوسروں کے
تابع ہو جاتے ہیں۔ وہ خدمتگاری کی سست اور وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر طرح
کے مہذب کن اثر سے بالکل ہی الگ ہوتے ہیں۔

ہندوستان

بکل پہلا شخص تھا جس نے زمین کی بہت زیادہ زرخیزی کے ان نقصانات پر پورا
زور دیا اور تاریخی طور پر انھیں قائم کیا، لیکن جب وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب اور
ذاتوں کے طریق کو اسی سبب کے تابع قرار دیتا اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ تمدن سے پہلے
دولت کی کثرت ضروری ہے تو یقیناً وہ حد سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ تمام اثر [illegible]
کے مانند وہ بھی اقتصادی حالات پر زائد از ضرورت زور دیتا ہے۔ حقیقت [illegible]
نہایت بلند مرتبہ برہمنوں اور بودھ مت والوں نے افلاس کو دولت پر ترجیح دی ہے
چھتری دولت سے زیادہ طاقت کے دلدادہ اور جرأت و ہمت کے قدردان تھے
البتہ ویش اپنی محنت و تجارت اور سود سے دولت جمع کرتے اور اس کی بڑی قدر کرتے

تھے لیکن ان کا تعلق طبقہ اعیان سے نہیں تھا۔ شودر غلامانہ حالت میں ڈال دئے گئے تھے، نہ اس وجہ سے کہ وہ غریب تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک پست درجے کی مفتوح قوم سے تھے۔

تاہم یہ صحیح ہے کہ چاول کی فراواں پیداوار آسانی کے ساتھ ایک بڑی آبادی کی بسر اوقات کو کافی ہوتی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب آہستہ آہستہ سارے ملک کی زمین رئیسوں اور امیروں کی جاگیر ہوگئی تو معدودے چند دولتمندوں اور کثیر التعداد غربا کے درمیان ایک فرق قایم ہو گیا اور ابتک باقی ہے۔ ایک طرف ایک مختصر اور اعلیٰ متمدن جماعت ہے جسے غایت درجے کی دنیاوی آسائش حاصل ہے اور دوسری طرف ایک حقیر و مظلوم جمّ غفیر ہے۔

مصر

یہی حال مصر کا ہوا۔ وہاں بغیر زیادہ تردد کے کھجور کے درختوں سے کثیر پیداوار ہوجاتی ہے۔ مصری بادشاہوں کی عالیشان تعمیرات کی بہتات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان عمارات میں انسانی خدمات اور محنت کا کیسا خطیر صرف ہوا ہے۔ غلامانہ مزدوروں کی شکستہ حالت کی داستان یہودیوں کے (عبرانی) وقایع سے معلوم ہوتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کی صلاح فرعون کے خزانہ کے لئے کارآمد ہو تو ہو مگر رعایا کے لئے بربادکن تھی۔

مکسیکو اور پیرو

مکسیکو اور پیرو میں بھی ہم دولتمند اور صاحب قوت اشخاص کی ایک مختصر جماعت دیکھتے ہیں کہ عوام کے ثمرۂ محنت پر قابض تھی اور یہاں بھی اس خرابی کی وجہ ایک حد تک بظاہر فطرت کی فیاضی ہے، جس نے جوار، کیلا اور آلو بکثرت پیدا کردیا ہے۔ نچلے طبقوں میں برہنہ تنی اور غلامی، اوپر کی طرف دولت کی زیادتی، فنون لطیفہ اور حکومت، باہر کی جانب کمزوری، ایک طرف سر بفلک عمارات دوسری طرف فلاکت زدہ جھونپڑیاں بس یہی تصویر ہے ان مبارک ملکوں کی۔

آیا مدبر اس خرابی کو رفع کرسکتے ہیں؟ اگر وہ ایک صحتور قومی زندگی کے دل سے ترقی دینے میں منہمک ہوجائیں تو بیشک وہ اسے رفع کرسکتے ہیں۔ باوجود زمین کی زرخیزی کے یہ ممکن ہے کہ ادنیٰ طبقات اعلیٰ طبقات کی حرص اور زیادتی سے محفوظ رکھے جائیں، انھیں آزاد انسان بننے کی تعلیم دیجائے، املاک کی زیادہ بہتر تقسیم کو ترقی دیجائے اور متوسط طبقے جو نہایت ضروری ہیں قایم کیے جائیں۔

معتدل زرخیز زمین سب سے بہتر ہے۔

پس انسان کی اجتماعی زندگانی کے لئے سب سے زیادہ موزوں معتدل زرخیز زمین ہے کہ جس کے لئے قرار واقعی اور بالاستقلال محنت صرف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں محنت اور محنت کرنے والوں کی مناسب قدر کی جاتی ہے گران پرزائد از ضرورت بار نہیں پڑتا اور نہ ان کی حالت تباہی کو پہنچتی ہے۔ انسانی طاقتوں کو نشو ونما اور شرائط زندگی کی تکمیل ہوتی ہے معقول خوشحالی کے ساتھ خاندانوں کو محفوظ ہستی کا لطف حاصل ہوتا ہے اور دولت کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ متوسط طبقوں کے لوگوں کی کثرت ہوتی اور ان کی حالت اچھی رہتی ہے۔ بتدریج ایک طبقہ دوسرے طبقے سے جاملتا ہے اور یہ خطرہ نہیں رہتا کہ نیچے کا طبقہ غلام بنالیا جائے گا یا اوپر کا طبقہ ایک ذی امتیاز طبقہ ہوجائیگا۔ پیشوں کے اختلافات بکثرت ہوتے ہیں مگر قوم کا ایک مربوط مجموعہ قایم رہتا اور ان میں ایک مشترک جوش موجزن ہوتا ہے۔

بیشک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حالات سے یہ لازم نہیں آتا کہ دولت کی مساوی تقسیم ہوجائے اور تنومند قومی زندگی پیدا ہوجائے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے قوی اسباب شامل ہیں لیکن اگر ہم یورپ کا مغربی اور جنوبی ایشیا سے یا شمالی امریکہ کا وسطی اور جنوبی امریکہ سے بلکہ اگر صرف جنوبی اٹالیا کا لومبارڈی اور سوئزرلینڈ سے مقابلہ کریں تو یہ امر عیاں ہوجائے گا کہ ایک اوسط درجے کی حاصل خیز زمین اور اس کے ساتھ اوسط درجے کی محنت کا صرف کرنا اس سے ہر طرح پر بہتر ہے کہ محض زمین کی زرخیزی بیحد زیادہ ہو اور محنت کی تقریباً ضرورت ہی نہ ہو۔ اس میدان میں سلطنت کا خاص کام یہ ہوگا کہ صحت ور فطرتی حالات کو انسانی مداخلت سے محفوظ رکھے اور طاقتوں کا ایسا توازن قایم رکھے کہ باہمی امداد و ترقی کو برتری حاصل ہو۔ وضع قانون اور اقتصادی حالت سے زمین کے خراب ہوجانے یا بیکار ہوجانے سے بچانے میں مدد ملے۔ اراضی کا چند افراد کے پاس مجتمع ہوجانا (خاصکر رہن کی صورت میں) رک جائے اور دولت کی فطرتی تقسیم میسر آئے۔ حکومت بعض وقت بنجر زمین کو زرخیز بناسکتی اور علی ہذا دلدلوں کو خشک کرکے اور میدانوں میں آبرسانی کا سامان کرکے ملک کی پیداوار کو بڑھا سکتی ہے۔

قانون

چوتھا باب

زمین

جس طرح سلطنت کی شخصی بنیاد قوم پر قائم ہے اسی طرح اس کی مادّی بنیاد زمین پر قائم ہے۔ کوئی قوم مستقل سلطنت نہیں ہو سکتی جبتک کہ وہ ایک رقبۂ زمین نہ حاصل کرلے۔

سلطنت اور اس کی ملک ارضی

دنیا کا جس حصہ پر کوئی قوم قابض ہوتی ہے یا کوئی سلطنت حکمرانی کرتی ہے وہ اس کی زمین یا مملکت (ملک ارضی) کہلاتی ہے۔ اس مملکت کی وسعت قوم کے نشو و نما کے مانند تاریخی واقعات سے متعین ہوتی ہے۔ سلطنت کی قانونی ہستی کے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی شاہیاں اور جمہوریتیں ہمیشہ رہی ہیں اور ایک حد تک انہوں نے اپنے بڑے بڑے ہمسایوں کے پہلو بہ پہلو برابری کے مرتبے کو قایم رکھا ہے اسلئے سلطنت کی ملک ارضی کے لئے کسی اوسط حد کے مقرر کرنے کی کوشش غیر ممکن ہے یونانیوں کی شہری سلطنتیں رومی شہنشاہی کے مقابلے میں ہیچ معلوم ہوتی ہیں مگر تاریخ عالم میں اتھینز کو روما کے پہلو بہ پہلو جگہ ملتی ہے۔ بایں ہمہ سلطنت کی وسعت اس کی سیاسی حیثیت اور اہمیت پر بڑا اثر رکھتی ہے اور بہت سے وسیع سیاسی مسائل سے اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔

سلطنت کے یہ دو ضروری عنصر (زمین اور قوم) بدیہی طور پر ایک دوسرے پر اثر رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ زمین قوم کے لئے بہت تنگ اور اس کی دماغی (ذہنی) اور مادی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے ناکافی ہو، آبادی کی زیادتی سے ضرورت پیش آئے کہ نو آبادیاں قائم کی جائیں تاکہ فاضل حصہ وہاں بس سکے۔ یا قوت کا احساس اور تمدن کی

ضروریات کا تقاضا یہ ہو کہ مملکت کو وسعت دیجائے اور یہ غرض الحاق باثیہ سے حاصل کی جائے۔ اس صورت میں یہ مشکل ہے کہ وسعت و ترقی کے طبعی حق کو دوسری قوموں کے تاریخی حقوق سے موافقت دیجا سکے۔

ماسوا اس کے جب کوئی سلطنت اس قدر چھوٹی ہو جائے کہ دوسری ترقی پذیر سلطنتوں کے مقابلے میں وہ اپنی ہستی کو محفوظ نہ رکھ سکے تو وہ یا تو کسی دوسری سلطنت کی حلیف ہو جاتی ہے یا اپنے کو کسی زیادہ قوی سلطنت میں یوں ہی جذب ہو جانے دیتی ہے۔

دوسری جانب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک منتشر آبادی اپنی املاک ارضی کو ضرورت سے زیادہ وسیع سمجھے یا اس کا کوئی خاص حصہ خود مختار ہو جانے کا خواہشمند ہو۔ صورت اول میں سلطنت بیرونی آبادکاروں کی آمد کی ہمت افزائی کرے گی اور صورت ثانی میں وہ انفراق یا انتشار کی روش اختیار کرے گی۔

بڑی سلطنتوں کی جانب میلان

اس امر میں زمانۂ حال کا میلان ازمنۂ وسطیٰ کے رجحان سے بالکل ہی مختلف ہے اس زمانے میں عام میلان چھوٹی سلطنتوں کی طرف تھا اور اب بڑی سلطنتوں کی جانب ہے۔ اس زمانے میں اٹلی۔ فرانس۔ جرمانیا۔ اسپین اور ابتداءً جزیرۂ برطانیا اور سلاوی ممالک سب چھوٹی چھوٹی شاہیوں یا جمہوریتوں میں منقسم تھے۔ رومی شہنشاہی کا اتحاد عملی ہونے کے بجائے زیادہ تر خیالی تھا۔ بڑی سلطنتیں قائم کرنے کا میلان انگلستان سے شروع ہوا اور براعظم میں پندرھویں صدی کے نصف آخر سے نظر آتا ہے اور ابھی تک اپنی پوری حد کو نہیں پہنچا ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنتیں لاتعداد تھیں۔ تقریباً ہر امارت، ہر شہر اور امکنۂ مذہبی بلکہ دیہات تک اپنی آزادانہ سیاسی ہستی رکھتے تھے۔ ان نظامہائے حکومت میں سے اب صرف چند ہی باقی رہ گئے ہیں اور ان کے بھی قائم رہنے کی بہت کم امید ہے۔ قدیم رومی تخیلِ اتحاد کے ان لاتعداد نظاموں میں منقسم ہو جانے میں بہت سے اثرات نے ایک دوسرے کی مدد کی۔ انھیں میں ذیل کے وجوہ بھی تھے سڑکوں اور منزلوں کی کمی، ذرائع نقل و حرکت کا نامکمل ہونا، خاص حقوق کی جانب میلان، پولیس کا ناقص طریقہ جاگیردارانہ نظام (جس کی فوجی خدمتیں معین تھیں اور جس کا سامان جنگ ناقص تھا) روپیہ کا محدود رواج) جائدادوں کی علیحدگی، خاندانی حکمرانی اور شخصی قانون کے بنیادی

خیالات۔ ایک (مشترک) قومی احساس کی کمی اور جسر مانیوں کا آزادی اور مجموعی نظامات کی جانب میلان۔ برخلاف اس کے بڑی سلطنتوں کے قیام کو ذرائع آمد و رفت کی وسعت اور ترقی انتہا ہمویل، ریل، دخانی جہاز، امراسلت اور تار کے نظم و نسق تجارت اور سوداگری کی تیز تحریک، فوجی و مالی وسائل کی زیادتی کی وجہ سے ترقی ہوئی ہے۔ بالفاظ مختصر یہ کہ موجودہ تمدن کی جملہ ترقی اور بیدار شدہ قومی احساس اور زیادہ قرین عقل قوانین (جو اس کے ساتھ پیدا ہوگئے ہیں) اس میلان کا باعث ہوئے ہیں۔

وسعت مملکت کے حدود

جدید سلطنت کو اس سے زیادہ وسیع حد کی ضرورت ہے، جسقدر محض ایک بلدی یا عدالتی ضلع کے لئے درکار ہوتی ہے، جس طرح ذی امتیاز طبقے اور قبیلے کو امت و قوم کے لئے جگہ خالی کرنا پڑتی ہے اسی طرح شہروں اور قصبوں کو ملک کے زیادہ وسیع اتحاد میں غرق ہوجانا پڑتا ہے، قوم کا تخیل صرف اسی طرح مقامی شہریت یا تنگ تعلق پر غالب آسکتا ہے۔ سلطنت کے جدید تخیل کے لئے ملک اور قوم دونوں لازمی ہیں۔ ملک کے بغیر سلطنت بہترین صورت میں بھی غیر محفوظ اور بے اثر ہے اس قسم کی سلطنت کچھ دنوں کے لئے محض ایک اعجوبے کی طرح قایم رکھی جاسکتی ہے مگر جدید زندگی سے بالکل منقطع ہونے کی وجہ سے وہ چھوٹی سلطنتوں کے گروہ کی عام نفرت میں شامل ہوجائے گی یہ اصول سلطنت کی وسعت کی حدِ ادنیٰ معین کرتا ہے، اس کی حدّ اعلیٰ کا اصول یہ ہے کہ ہر جزو مرکزی قوت کی رسائی کے اندر ہونا چاہیئے مگر بہر نوع اس حد میں گھٹنے بڑھنے کی قوت ہے۔ دخانی ذریعہ آمدورفت اور تار کی ایجاد کے بعد سے کوئی ملک بھی رسل و رسائل کے ذریعے سے اپنے دارالحکومت سے زائد از ضرورت بعید نہیں کہا جاسکتا۔ اب کہ بین الاقوامی قانون (جس کا اصول موضوعہ یہ ہے کہ متعدد سلطنتیں ایک مجموعی انسانیت میں متحد کرلی جائیں) ارض مسکونہ کے بیشتر حصص پر وسیع ہے اس حالت میں اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تمام کرۂ ارض کو ایک سیاسی نظم کے اندر متحد کرلینا ممکن ہے کرۂ ارض کے مجموعی خشک حصہ میں سے جن کا اندازہ پانچ کرور چالیس لاکھ مربع میل کیا جاتا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ نوے لاکھ مربع میل پر حکمران ہے۔ روس تقریباً اسی لاکھ تیس ہزار مربع میل پر، چین پینتالیس لاکھ مربع میل پر اور ممالک متحدہ امریکہ تیس لاکھ مربع میل پر حکومت کررہے ہیں۔ ان حکومتوں میں وسیع و بعید قطعات ہیں مگر پھر بھی سب ایک ہی سیاسی جذبے سے مشتعل ہیں۔

آبادی حدودِ ارضی سے زیادہ اہم ہے

مگر کسی سلطنت کی قوت کا اندازہ محض اس کی وسعت سے نہیں ہونا چاہئے جرمانی شہنشاہی کی ملک ارضی دو لاکھ دس ہزار مربع میل ہے مگر یورپ میں وہ سب سے زیادہ طاقتور سلطنت ہے فرانس کی وسعت یورپ میں دو لاکھ چار ہزار مربع میل ہے مگر بدرجہا اعلیٰ اس کی قوت روس کے برابر ہے جس کے حدود ارضی ایک اکیلے یورپ ہی میں اس سے دہ چند ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ کی یورپی مملکت صرف ایک لاکھ اکیس ہزار دو سو چھتیس مربع میل ہے مگر اس کے ذریعہ سے وہ ان مستعمرات و تابعات پر حکومت کرتی ہے جو خود اس سے بدرجہا زیادہ وسیع ہیں کسی قوم کی طاقت کے تعین میں آبادی کو وسعت ارضی کے بہ نسبت بدرجہا زیادہ اہمیت حاصل ہے گو کہ ملک کی وسعت بھی بجائے خود ایک اہمیت رکھتی ہے۔

حدود ارضی جس قدر وسیع ہوتے جاتے ہیں اسی قدر نقل و حمل کی مشکلات بڑھتی جاتی ہیں اور اسی نسبت سے حکمرانی میں مشکل پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس کی منتشر قوتیں صرف آہستگی کے ساتھ جمع کی جا سکتی ہیں اور اس کے دور افتادہ صوبجات کامل نگرانی کے اندر نہیں ہوتے۔ آمد و رفت کے ترقی یافتہ ذرایع سے اس مشکل میں کمی ہو گئی ہے مگر وہ بالکل رفع نہیں ہو گئی ہے۔ سلطنت کی انتہائی حد پر بجلی کی تیزی کے ساتھ حکم پہنچ سکتا ہے مگر بالمشافہ اقتدار کا زور اس میں نہیں ہوتا۔ اس میں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے یا اگر رعایا اس پر رضامند نہ ہو تو اس سے گریز کر سکتی ہے۔ ریل کے ہوتے ہوئے بھی آدمی، خوراک اور سامان کے پہنچانے میں وقت صرف ہوتا ہے اور جن صوبوں کی آبادی کم ہوتی ہے ان میں ریل کا جاری کرنا بھی ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا، اکثر شاہراہوں کی بھی کمی ہوتی ہے۔

اس لئے مملکت کی وسعت سے ہر حال میں طاقت کی وسعت کے معنی نہیں لئے جا سکتے۔ اگر نسبتاً چھوٹی مملکت پر حکمرانی آسان ہو تو ایسی حالت میں فتوحات کے پھیلانے سے سلطنت کمزور ہو سکتی ہے۔

بڑی سلطنتوں کی قوت اور کمزوری

کسی وسیع الحدود سلطنت کے مختلف مقامات پر حملہ کر کے اسے پریشان کرنا آسان ہے مگر کوئی مستقل کامیابی حاصل کرنا دشوار ہے۔ دشمن کے لئے یہ ممکن ہے کہ وسیع قطعات کو بلا مخالفت طے کر جائے مگر اس پر قائم رہنا اس کے لئے مشکل ہے اس کا موقع صرف یہی ہے کہ وہ سلطنت کی مجتمعہ طاقت پر حملہ کرے اور اسے شکست دیدے۔ روس اور جنوبی امریکہ کی حال کی جنگوں سے اس دعوی کی تائید ہوتی ہے لیکن سلطنت کا زیادہ پھیلاؤ

جہاں اسے بے بس اور پریشان کر دیتا ہے وہیں اس کے فوائد بھی ہیں۔ بڑی سلطنت کے ذرائع وسیع ہوتے ہیں جو ایک لمحے میں ختم نہیں ہو جاتے اس لئے خطرناک نازک وقت میں وہ واقعات کے تغیر کا انتظار کر سکتی ہے۔ ایک ضرب سے اس کا مغلوب ہو جانا شاذ و نادر ہی ہو سکتا ہے

وسعت کا اثر نظام حکومت پر

سلطنت کی وسعت، اس کے نظام حکومت کی صورت پر بھی اثر رکھتی ہے۔ بلا واسطہ عمومیت (Democracy) صرف چھوٹے ملکوں میں ممکن ہے، جہاں لوگ مجلس ملی میں اکثر جمع ہو سکتے ہیں۔ آئینی شاہی کے طریقۂ نیابت کے واسطے، زیادہ وسیع حدود کی ضرورت ہے۔ رومی شہنشاہی کی وسعت، حدود جمہوریت کے تنزل کرنے اور قوت کے ایک مطلق العنان شہنشاہ کے ہاتھ میں آجانے کے اسباب میں سے ایک خاص سبب تھی۔ روس میں بھی زار کی مطلق العنان طاقت کا باعث ایک حد تک اس کی یہی وسعت سلطنت ہے۔ اور انگلستان تک یہ نہیں چاہتا کہ ہندوستان کو پارلیمنٹی تنظیمات دیدیجائیں۔ لہذا سلطنت کی آئینی حکمت عملی کو اپنے ملک کی خصوصیت اور وسعت پر خیال کرنا اور اسی کے مطابق روش اختیار کرنا چاہئے۔

سلطنت کے ملکی حدود دائمی اور ناقابل تغیر نہیں ہیں وہ محض قوتوں کی ترقی و تنزل پر منحصر ہیں لیکن پھر بھی وہ اس کی آبادی کے حدود سے زیادہ معین و مستقل ہیں اور صرف بڑے واقعات ہی کی وجہ سے کہیں کہیں ان میں تغیر ہوتا ہے۔

حدود

سلطنت کے حدود یا تو اسے کسی دوسری سلطنت کے حدود سے جدا کرتے ہیں یا کسی ایسی زمین سے جدا کرتے ہیں جو کسی سلطنت کی ملک نہ ہو۔ اول الذکر حالت میں سرحد کا ایک معین خط ہوتا ہے اور پتھروں، خندقوں اور دیواروں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ثانی الذکر صورت میں کسی قطعی خط کے کھینچنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ بغیر اس کے کہ دوسری سلطنتوں سے پیچیدگی پیدا ہو، حدود گھٹائے بڑھائے جا سکتے ہیں۔ اول الذکر صورت میں اشیائے ذیل داخل ہیں۔

(الف) دریا اور چشمے، لیکن یہ سرحدیں ایسی قطعی طور پر معین نہیں رہتیں جیسی ارضی سرحدیں معین ہوتی ہیں۔ دو سلطنتوں کے درمیان قطعی سرحد یا تو دریا کے وسط میں مقرر ہوتی ہے یا اس دریا کی تہ میں یعنی بہاؤ زیادہ سے زیادہ جہاں تک پہنچتا ہے لیکن چونکہ

کشتی رانی اور تجارت کے لئے بیچ کے دھارے ہی سے بالتخصیص کام پڑتا ہے اس لئے ان اغراض کے لئے یہ دونوں سلطنتوں میں مشترک سمجھا جاتا ہے مگر یہ دونوں حدیں دریا کے کناروں کے کاٹ دینے یا چھوڑ دینے یا دھارے کے بہاؤ کے بدل جانے کی وجہ سے بدل سکتی ہیں۔

(ب) پہاڑ۔ پہاڑ بالعموم ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے سے اور ایک تمدن کو دوسری قسم کے تمدن سے جدا کر دیتے ہیں۔ آمد و رفت کے وسائل کم ہوتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں تو صرف ایک ہی ایک راستہ ہوتا ہے۔

علی العموم پہاڑ کی بلند ترین چوٹی جو پانی کے حصوں کو بھی جدا کرتی ہے فطرتی سرحد خیال کیجاتی ہے

ثانی الذکر صورت اشیا، ذیل کو شامل ہیں۔

(الف) سمندر اور وسیع خلیج جو فطرتاً کسی سلطنت کے تابع نہیں ہوتے اور تمام دنیا کے کام کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔

(ب) صحرا و بیابان اور بعض وقت جنگل اور غیر آباد پہاڑ۔ جس قدر تمدن کو ترقی ہوتی جاتی ہے یہ قطعات سلطنت کے مقاصد کے لئے کار آمد ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے فطرتی سرحد کا کام یہ شاذ و نادر ہی دیتے ہیں۔

حد بندیوں کی مزید تشریح قانون بین الاقوامی سے تعلق رکھتی ہے۔

متعدد مملکتوں کا اتحاد

بعض وقت متعدد ممالک متحد کر دیئے جاتے ہیں یہ صورت مختلف طریقوں سے واقع ہو سکتی ہے۔

(الف) جو ممالک متحد ہوں وہ اپنی ہستی کو قائم رکھیں اور سب برابر کے درجے پر ہوں جیسے ممالک متحدہ امریکہ یا جرمانی شہنشاہی میں ہے۔

(ب) ممالک کی جداگانہ ہستی قایم رہے مگر مدارج مختلف ہوں ایک ملک شہنشاہی کے رتبے پر سمجھا جائے اور دوسرے ممالک اس کے ماتحت ہوں۔ جیسے برطانیہ عظمیٰ اور اس کے مستعمرات و توابع یا فرانس مع الجیریا۔

(ج) سابقہ ممالک ایک سلطنت کے صوبے ہو جائیں جیسا کہ روس کی وسعت سے ہوا

اتم و اکمل مملکت

لیکن چونکہ مکمل سلطنت کے منتہائے خیال کی بنا قوم پر نہیں بلکہ نوع انسان پر ہے اس لئے مکمل مملکت تمام روئے زمین ہے۔ جن میں مختلف ممالک کے متضاد اوصاف ایک ہم رنگ مجموعے میں متحد ہوں، جس سے ایک دوسرے کی تکمیل و تقویت ہو

لیکن موجودہ سیاسیات کے لیے جو ابھی منتہائے خیال کے حصول سے بہت دور ہے،
عملی اصول یہ ہے کہ ایک مختلف النوع مملکت سلطنت کے لئے بہترین مملکت ہے
یہ مملکت ایسی ہو جس میں پہاڑ اور وادیاں، دریا اور جھیلیں سمندر کے ساحل اور میدان سب کچھ ہوں
اسے بہترین کچھ اس وجہ سے قرار نہیں دیا ہے کہ ایسے ممالک زیادہ زرخیز ہوتے ہیں بلکہ
اس وجہ سے کہ اس طرح باشندوں کے مختلف قویٰ کو حرکت اور انتہائی ترقی حاصل
ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف بدترین مملکت اندرون ملک کے وسیع اور ویران بیابان
کی مملکت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قطعات ہمیشہ خانہ بدوش قبائل کے مسکن بنے رہتے
ہیں جو سیاسی زندگی کے رتبے کو نہیں پہنچتے۔

پانچواں باب

مملکتی فرمانروائی

ملک سلطنت

تمام مملکت پر سلطنت کے شاہی حقوق اکثر ملک سلطنت کے لفظ سے موسوم ہوتے ہیں لیکن یہ نام اگرچہ ایشیا کی قدیم سلطنتوں یا جاگیری طرق کی سلطنتوں کے لئے ناموزوں نہیں تھا مگر موجودہ سیاسی خیالات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ جیسے یہودیوں کی قدیم سلطنت میں ساری زمین صرف خدا ہی کی ملک سمجھی جاتی تھی اور مصر میں فراعنہ تمام زمین کے تنہا مالک خیال کئے جاتے تھے اور دیگر اشخاص کو اس سے عارضی انتفاع کا حق حاصل تھا۔ اسی طرح رومی شہنشاہی میں مفتوح صوبجات کی زمین حسب ضابطہ رومی قوم یا شہنشاہ کی ملکیت خیال کی جاتی تھی اور اہل صوبہ اگرچہ واقعتاً زمین پر قابض رہتے تھے مگر ان کی ملک ادنیٰ درجہ کی سمجھی جاتی تھی۔ ازمنہ وسطیٰ کی بعض سلطنتوں میں (مثلاً نارمنی فتح کے بعد انگلستان میں) بادشاہ تمام زمین کا مالک اعلیٰ اور جاگیردارانہ رئیس متصور ہوتا تھا اور رعایا اپنی جائدادوں پر جاگیر کے طور پر قابض ہوتی تھی۔ ان تمام حالات میں ملک سلطنت کا خیال بالطبع اس طرح پیدا ہوا کہ شخصی ملکیت کا تخیل سیاسی فرمانروائی سے مخلوط کر دیا گیا، مگر اب کہ شخصی قانون اور عام قانون ایک دوسرے سے کلیتہً ممیز ہیں۔ یہ خیال ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔

سلطنتی فرمانروائی

اس لئے چاہئے کہ ہم سلطنت کی ملک کے اندر اس کے حقوق فرمانروائی کو اسکی ملک سے ممیز کریں۔ ملک ایک شخصی قانون کا معاملہ ہے خواہ وہ ملک سلطنت ہی کی کیوں نہو۔ فرمانروائی فی الحقیقت ایک سیاسی شے ہے اور اس کا تعلق صرف سلطنت یا سلطنت کے گروہ سے ہو سکتا ہے[1]

[1] قدیم زمانے کے لوگوں نے بھی اس فرق کو پہچانا ہے، ہوغو غروشیس (اپنی لاطینی تصنیف "قانون جنگ امن"

اس کے نتائج

(۱)۔ ایجابی جانب اس فرمانروائی کا منشا یہ ہے کہ سلطنت کو اپنی تمام مملکت پر اپنے قوانین کے نفاذ، اپنے احکام کی تعمیل اور اپنے اختیارات عدالتی کے عملدرآمد کی پوری طاقت حاصل ہے۔ اس کی طاقت صرف اشخاص ہی پر نہیں بلکہ زمین واشیا پر بھی وسیع ہے مگر یہ طاقت صرف سلطنت سے تعلق رکھتی ہے اور شخصی قانون کی حد سے خارج ہے۔

(۲)۔ سالبی جانب میں سلطنت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر ایک دوسری سلطنت یا طاقت کو اپنی مملکت کے اندر فرمانروائی کے نفاذ یا اور کسی طرح کی مداخلت سے باز رکھے، اس لئے موجودہ زمانے کی سلطنت اپنی مملکت میں کسی غیر ملکی طاقت کو عدالت یا پولیس کے اختیار کے عمل میں لانے کی اجازت نہیں دیتی۔ کسی ملک کا کلاً یا جزءً علیحدہ ہو کر رہنا ملکی فرمانروائی کے اس سیاسی تصور کے منافی ہے ازمنہ وسطیٰ کے رؤسا جس طرح اپنے ممالک کو ذاتی ملک کی طور پر فروخت کر دیتے، یا رہن رکھدیتے یا تقسیم کر دیتے تھے[10]۔ اب ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

جدید قانون عام اس اصول پر پختگی سے قائم ہے کہ سلطنت کی ملک ارضی نہ قابل انفکاک ہے اور نہ قابل تقسیم[11]

مستثنیٰ حالتوں میں انفکاک صرف قانون عامہ کی صورتوں میں اس وقت ممکن ہے جب کوئی قانون اس ضرورت سے وضع کیا جائے، یا بین الاقوامی معاہدات عمل میں آئیں جن میں صلح کے عہدنامے بھی شامل ہیں[12]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی جلد ۲ باب ۳، دفعہ ۴ میں سنیکا کا یہ قول نقل کیا ہے "بادشاہ کو پورا اقتدار حاصل ہوتا ہے اور منفرد اشخاص کو محض حق ملکیت حاصل ہے"۔ اور ڈیو کریسوسٹ کا قول ہے کہ "تمام ملک سلطنت کی ملک ہے مگر پھر بھی ہر منفرد شخص اپنی حاصل کردہ جایداد کا پورا مالک ہے"۔

[10] قدامت میں، اس کی مثالیں صرف انھیں صورتوں میں ملتی ہیں جہاں حکمران کو ملک اور آبادی پر اختیار مطلق حاصل ہوتا تھا۔ اس کی مثالوں کے لئے دیکھو ہوگو گروشیس، ج ۱، فصل ۳، ص ۱۲۔

[11] فرانسیسی نظام سلطنت ۱۷۹۱ء، ۲، دفعہ ۱۱ "سلطنت ایک چیز ہے اور تقسیم نہیں ہو سکتی۔ جرمانی سلطنتوں کی مثالوں کیلئے دیکھو تسخاریئے (Zacharia) کی کتاب "جرمانی سلطنت اور مشترکیت کا قانون"، ج ۱ دفعہ ۸۳۔

[12] روسی نظام سلطنت ۱۸۳۱ء فقرہ ۲ "اس ملک کے حدود صرف ایک قانون کے اجرا سے بدل سکتے ہیں"۔

فطری حق کے نتیجے کے طور پر غرض بعض یہ مطالبہ مزید کرتا ہے کہ جب ملک کا کوئی حصہ [illegible]
کیا جائے تو تمام سلطنت کی منظوری کے ساتھ خاص اس حصہ ملک کے باشندوں کی منظوری
بھی حاصل کرنا چاہئے۔ یہ مطالبہ ایک منصفانہ مطالبہ ہے کیونکہ ان کی تمام سیاسی ہستی ہی
خطرے میں آجاتی ہے اور مجلس وضع قانون جب اتحاد سلطنت کے شکست کرنے پر آمادہ
ہو تو اس صورت میں یہ مجلس اس حصہ ملک کی موزوں نمائندہ تسلیم نہیں کی جاسکتی، مگر اکثر
حالتوں میں "ضرورت" حقوق فطری سے زیادہ قوی ثابت ہوگی علہ

کسی سلطنت کی فرمانروائی کا دوسری سلطنتوں کے حق میں محدود کردینا اگرچہ
از روئے شخصی قانون کی نظر سے یہ غلامی کے مثل ہے۔ مگر اس کی بنا قانون عام پر ہونا چاہئے اور
اس کی غرض عام غرض ہونا چاہئے۔ ہمسایہ کو اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ اس کی
مملکت کے اندر سے ہو کر کسی فوجی سڑک سے گزر جائے یا اس کے ڈاکخانوں کو کام
میں لائے یا وہ اپنی بندرگاہوں کو اس کے لئے کھول دے مگر فرمانروائی کی آزادی
کو مداخلت بیجا سے محفوظ رکھنے پر اس سے زیادہ فکر کی ضرورت ہے جس قدر شخصی
قانون میں آزادی ملک کی حفاظت کی حاجت ہے، کیونکہ کسی قسم کی مستقل پابندی
سلطنت کے اتحاد و یکجہتی اور بہبود عام کی غرض سے اس کے تنظیمات کی آزادانہ نشوونما
کے لئے ایک مہلک صدمہ ہے علہ

تعلیقات (۱) انقلاب پر فرانسیسی بادشاہوں کا خطاب بجائے شاہ فرانس
کے شاہ فرانسیسیان ہو جانا اس سابقہ خیال سے مخالفت کو ظاہر کرتا ہے کہ فرانس ایک
موروثی بادشاہی ہے اور اس حد تک اس سے سیاسی خیال کی ترقی کا اظہار ہوتا ہے۔

علہ۔ دیکھو ہوگو گروٹیس کی دوسری جلد فصل ۱۶ دفعہ ۴ وغیرہ۔ وینا کا آخری [illegible] ۱۸۲۰ء [illegible]
علہ کسی شرکت کی مملکت کے حقوق فرمانروائی سے برضائے خود دستبردار ہو جانے کے لئے [illegible]
کرنا شرکت ہی کے کسی رکن کے نفع کے لئے ہو۔ شرکت کی سلطنت کے تمام اراکین کی رضامندی کا حاصل کرنا [illegible]
دیکھو بلنٹشلی کی تصنیف "جدید قانون اقوام" دفعہ ۲۸۶
علہ شمٹ ہینر "قانون سلطنت" صفحہ (۲۰۹)، "کسی سلطنت کی ملک ارضی میں ایک غیر سلطنت یا بادشاہ کی
ذاتی ملکیت کے واقع ہونے سے اس سلطنت کے اقتدار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

[شاہ فرانسیسیاں کا خطاب اولاً ۱۷۹۱ء کے نظام سلطنت میں پیش ہوا اور ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی ایوان نے لوئیس فلپ کو یہی خطاب دیا تھا مگر لوئیس ہیژدہم اور چارلس دہم اس خطاب کو استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنے سابقین کے مانند شاہ فرانس تھے} مگر ملکی بادشاہی کی اہمیت جب ایک بار مسلم ہوگئی تو پھر اس کا کوئی اثر نہیں کہ خطاب کی کونسی صورت اختیار کی جاتی ہے اسٹال (اپنی تصنیف "نظریۂ سلطنت" جلد دوم صفحہ ۳۸ میں) جب قومی خطاب کو دخیانہ کہتا ہے تو وہ حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ رومی اور جرمانی شہنشاہیوں نے اسے ترجیح دی ہے اور ملکی خطاب کے بہ نسبت یہ زیادہ موثر ہے کیونکہ قوم کا درجہ ملک سے بڑھا ہوا ہے۔

۴۔ سرحد کی تصحیح انفکاک کے تحت میں شامل نہیں ہے کیونکہ اس سے محض حدود موجودہ کا تعین ہوتا ہے لیکن جب کوئی سلطنت درستی حدود کے لئے پورے کے پورے آباد قطعات کا کر دوسرے قطعات سے انھیں بدل لے تو اسے محض تصحیح سرحد نہیں کہہ سکتے۔

{ملکی فرمانروائی کے تصور کے لئے مین کی کتاب قانون قدیم (صفحہ ۱۰۲) دیکھنا چاہئے۔ انگریزی مترجم}

چھٹا باب

ملک کی تقسیم

سلطنت کی ملک ارضی علی العموم اتنی وسیع ہوا کرتی ہے کہ حکمرانی کے اغراض کے لئے اس کا تقسیم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس تقسیم کی چار متمیز قسمیں ہیں :-

۱۔ صوبجات

(۱) صوبجات۔ رومی شہنشاہی کے صوبجات فی الاصل وہ آزاد سلطنتیں تھیں جو رومائی محکوم بنالی گئی تھیں۔ زمانہ حال کے صوبجات بھی اکثر قدیم سلطنتوں کی یادگار ہیں جو نسبتاً ایک بڑی سلطنت میں جذب ہوگئے ہیں مگر بسا اوقات سلطنتیں خود اپنے صوبوں کی بنا ڈالتی ہیں اور (جرمانی شہنشاہی کے مانند) اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ صوبجات (Duchies) سے نئے ممالک پیدا ہوجاتے ہیں۔

صوبجات کی مخصوص نوعیت اس کا نسبتاً آزادانہ اختیار ہے، ان کی حکومت عام حکومت کے تابع ہوتی ہے مگر خود اپنے وسیع اختیارات بھی رکھتی ہے۔ مزید براں، نیابتی نظام سلطنت میں بسا اوقات اس میں اپنے معاملات کیلئے مجلس وضع قوانین بھی ہوتی ہے جو (ایک معنی کر) صوبے کی پارلیمنٹ ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے کا میلان اتحاد سلطنت کے اندر اس تقسیم کا طرفدار نہیں ہے۔ صوبجات کے جداگانہ وضع قانون کے اختیارات، فرانس اسپین اور انگلستان میں منسوخ ہوگئے ہیں اور آسٹریا کے شاہی ممالک (Kronlander) میں اقتصادیات اور تعلیم کی حد تک محدود کردئے گئے ہیں، لیکن اگرچہ اتحاد تنظیم سلطنت کے لئے مفید ہے مگر ساتھ ہی اس کے (صوبوں کی) آزادی کلیتاً منسوخ کردینا (جس سے مختلف اضلاع کی مخصوص ضروریات وخصوصیات لازماً نظرانداز ہوجاتی ہیں) قومی زندگی کے صحت ور

دبار آور اجزا کے لئے مضر ہے۔ ٹیوٹونی اقوام رومانی اقوام کے بہ نسبت صوبجاتی آزادی کی ضرورت کو زیادہ شدت سے محسوس کرتی ہیں۔

۲۔ حلقجات

۲۔ حلقجات، وسیع سیاسی اضلاع پر مشتمل ہوتے ہیں مگر علٰحدہ ممالک خیال کئے جانے کا انھیں حق نہیں ہوتا۔ قدیم فرانکی اور جرمانی شہنشاہی کے نظام سلطنت میں امارتیں (Duchies) اور ریاستیں (Princedoms) صوبوں کے بجائے سمجھی جاتی تھیں اور کینٹن (اضلاع (Cantons) حلقجات کے بجائے۔ اس تحت میں انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ کی کونٹی جرمانیا کے حلقے (کرائز (Kreise) فرانس کے صیغے (دے پارتماں (Departments) اور پروسیا کے حکومتی حلقے یا ضلعے (Regierungsbezirke) داخل ہیں۔ یہ تقسیم مقامی یا قبائلی اختلافات کی بنا پر نہیں قائم کی گئی ہے بلکہ ایک منضبط انتظام عمل کی ضرورت سے قائم کی گئی ہے لیکن پھر بھی ضلع کے تاریخی تعلقات اور اس کی آمدورفت کے نظرتی وسائل کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ صوبجات کو ایک قصر کی مختلف عمارتوں سے اور حلقجات کو ایک مکان کی مختلف منزلوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

ان کے انتظام کی بالعموم ایک مرکزی قوت اور ایک اعلیٰ عدالت ہوتی ہے۔ مزید برآں اس زمانے کی سلطنتوں میں یہ میلان بھی پیدا ہوگیا ہے کہ حلقے کی آبادی اپنے خاص اغراض پر توجہ کرے اور ایسے حدود میں عام ضروریات مثلاً سڑکوں، مخزنوں (میگزینوں)، شفاخانوں، مدرسوں، محتاج خانوں، تادیب خانوں وغیرہ کا انصرام کرے اس سے حکومت خوداختیاری اور تنظیمات نیابتی کے لئے ایک بارآور موقع پیدا ہوجاتا ہے۔[1]

۳۔ اضلاع

۳۔ اضلاع بالعموم حلقجات کی تقسیم ثانی ہوتے ہیں اور انھیں تحتانی قسم کا نظم و نسق اور اختیار عدالتی حاصل ہوتا ہے۔ اپنی جگہ پر انھیں بھی ایسی مشخصہ جماعات سمجھ سکتے ہیں جو اپنی خاص ملکیت اور تنظیمات رکھتی ہیں۔[2]

---

[1] ۔ ویوین (Vivien) کی تصنیف "مطالعات" (Etnd. etc) ج ۲ باب ۱۔

[2] ۔ دیکھو ویوین کی تصنیف محولہ بالا ج ۲، باب ۳۔ فرانس کے کینٹن کی حیثیت ایک کارپوریشن کی سی نہیں ہوتی بلکہ محض عدالتی اور انتخابی اغراض کے لئے سرکاری طور پر حلقے قرار دیئے جاتے ہیں۔

جرمانیا میں ٹیوٹونی عہد کے "تعلقہجات" عہد النہائے صوبہ اور تحصیلات، فرانس میں کینٹن کی اور پروسیا میں کرائز کی یہی نوعیت ہے۔

صرف انتخاب کی غرض سے جو حلقے قرار دئے جائیں وہ اس صنف میں داخل نہیں ہوتے کیونکہ وہ محض عارضی ہوتے ہیں اور سلطنت کا عضوی جزو نہیں ہوتے۔ اس قسم کی غیر عضوی تقسیمات پر خیال رجوع کرنے کی ضرورت بہت کم ہوتی ہے۔

۴۔ کمیون

شہر اور بیرونجات کے کمیون۔ یہ کمیون، سلطنت کی سادہ ترین تقسیم ہیں مگر لغایت اہم ہیں۔ کمیون ضلع کے لئے وہی حکم رکھتا ہے جو سیاسی طور پر منضبط قوم اپنے ملک کیلئے رکھتی ہے۔ اپنی عام زندگی سے وہ اس میں جان ڈال دیتی ہے، گوکہ یہ زندگی سیاسی زندگی نہیں ہوتی بلکہ عام معاشرتی اور اقتصادی اغراض پر مشتمل ہوتی ہے۔

بڑے بڑے شہر، ضلع کے مثل اور بڑے بڑے دار الحکومت (جیسے برلن) ایک حلقے بلکہ صوبہ کے مانند ہوتے ہیں۔

اصول تقسیم

کسی ملک کی سیاسی تقسیمات کا ردوبدل، ایک قانونی معاملہ ہے۔ ان تمام مراحل میں سلطنت کو اپنے عام اغراض اور اپنی تنظیم کی ہم رنگی پر نظر رکھنا پڑتی ہے مگر اعلیٰ مراحل میں اغراض عامہ کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور سلطنت کو تقسیمات کے تعین میں زیادہ آزادی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے کمیون موجودہ مشخصات سے فطرتاً اس قدر گہرا تعلق رکھتے ہیں کہ ان کی خواہشوں پر لحاظ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ان انتظامات میں سلطنت کو جن خاص خیالات کا پابند ہونا پڑتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(الف) تقسیم کی سیاسی غرض؛
(ب) فطری اثرات جیسے دریا، وادی وغیرہ کا تعلق؛
(ج) باشندوں کی تاریخ؛
(د) تجارتی تعلقات۔

تعداد اور رقبے کا حسابی لحاظ ان خیالات کے تحت میں آتا ہے۔

ساتواں باب

مِلک شخصی سے سلطنت کا تعلق

ملک کی تاریخ

مِلک شخصی یعنی دولت پر انسان کا اختیار اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔ اولیں انسان جب اپنی غذا کے لیے پھل توڑتے یا کوئی غار اپنی سکونت کے لئے پسند کرتے بلکہ جب وہ پتوں یا چمڑے سے اپنے جسم ڈھانکتے تھے تو وہ اپنے ان افعال سے ملک پیدا کر رہے تھے ملک اصلاً سلطنت کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ اپنی نہایت قدیم، غیر مکمل اور غیر محفوظ شکل میں، یہ انفرادی زندگی کا فعل ہے۔ گویا یہ افراد کے وجود خارجی کی ایک طرح کی وسعت ہے۔ انسان ان چیزوں پر قبضہ کرتا ہے جو اس کے آس پاس واقع ہوتی اور اس کی طاقت کے حد میں آجاتی ہیں، وہ انھیں اپنے خاص صرف و خدمت میں لاتا یعنی ان سے منتفع ہوتا ہے۔ جب اس کے ساتھ یہ احساس شامل ہو جاتا ہے کہ اسے ان چیزوں کو قبضے میں رکھنے کا حق حاصل ہے تو ملک کا خیال مکمل ہو جاتا ہے۔ خانہ بدوش جنھیں کسی قسم کا مفید سیاسی ربط نہیں ہوتا وہ بھی اپنے لباس، اپنے ہتیار اپنے گلے اور اپنے سامان کی ملک رکھتے ہیں رابنسن کروسو تک نے اپنے ویران جزیرے میں اپنی ملکیت کو ترقی دی تھی۔

اشتراکیت

اشتراکیت جو ملک شخصی کے قرین انصاف ہونے سے انکار کرتی اور اسے قزاقی قرار دیتی ہے[1] وہ انسانی فطرت سے جیسا کچھ کہ اسے خدا نے پیدا کیا ہے جنگ

[1] یہ پردودون کا قول ہے "جسے لوگ حق مالکانہ کہتے ہیں وہ (حقیقت میں) قزاقی ہے"

کرتی ہے: "سمندر کی مچھلیاں، ہوا کے پرندے اور زمین کے مویشی اور جو کچھ اس پر ہے سب پر ان کو قدرت دو" (کتاب پیدائش باب اول آیت ۲۶) یہ طریق بنی نوع انسان کی تمام تاریخ کے بھی خلاف ہے جو تمام اقوام اور تمام اوقات میں ملک کو تسلیم کرتی رہی اور اب بھی اس کی ترقی میں مشغول ہے۔

اشتراکی جس طرح ملکیت کا بطلان تجویز کرتے ہیں وہ شخصی آزادی کی فنا اور تمدن و خاندان کی بربادی کے مرادف ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ وہ ایسی وحشت ہے جو وحشی ترین معاشرت میں بھی نہیں پائی جاتی ہے[1]

اجتماعیت

اجتماعیوں کا اصول بظاہر زیادہ معتدل اور انسانیت کو لئے ہوئے ہے مگر وہ بھی ایسا ہی ناممکن العمل اور اشتراکیت سے بھی زیادہ متناقض ہے ہم فروبل (Frobel) کو اس خیال کا نمائندہ سمجھ سکتے ہیں اس کے نزدیک ملک "ایک جاگیر ہے جو سوسائٹی کی جانب سے قابض کے اختیار میں ہوتی ہے"، اور انفرادی حق "عام مرضی کا ایک نتیجہ ہے جسے ان لوگوں کی ایک تعداد نے تسلیم کیا ہے جو فرمانروایانہ جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں"[2] انسان کی انفرادی فطرت و آزادی کے لئے یہ عقیدہ بھی اشتراکیت سے کچھ کم غلط نہیں ہے۔ ہر چند کہ یہ اصول محول اور وقتی قبضے کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کا منشا یہ ہے کہ آزادانہ ملک کو ازمنۂ وسطے کے جاگیردارانہ طریق کی ایک مبالغہ آمیز مماثلت سے مبدل کردے یعنی تمدن کے فرد زن طبقے کی طرف پلٹ جائے، کیونکہ اس خیال کی اس سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں ہے کہ یہ وہی غلامی کا اصول ہے جسے تاریخ کے تاریک ترین زمانوں کے خود مختار حکمرانوں کو ملکانہ تعلق نے سکھایا تھا اور جسکے چہرے کو اب اجتماعیت کے خوش آئند فقروں نے اپنے پردے میں چھپا کر دلفریب بنا دیا ہے۔

سلطنت ملکیت کی محافظ ہے۔

ملک شخصی پر سلطنت کو اختیار مطلق ہرگز حاصل نہیں ہے اور اس حیثیت سے

---

[1] دیکھو تیرس کی کتاب "ملکیت" جلد ۲ بظہمارے اشتراکیت و اجتماعیت کی تنقید اس نے بہت خوب کی ہے مگر تصور ملکیت کے متعلق فلسفیانہ ماخذ کے قرار دینے میں وہ کامیاب نہیں ہوا ہے۔

[2] فروبل کی تصنیف "اجتماعی سیاسیات" (Sociale Politik) ج ا صد ۳۹۲ و ۴۰۰

وہ قانون عامہ کے حدود سے قطعاً خارج ہے۔ سلطنت نہ اسے پیدا کرتی اور نہ اسے برقرار رکھتی ہے اور اس لئے اسے لے بھی نہیں سکتی ہے۔ وہ جسطرح تمام انفرادی حقوق کی حفاظت کرتی ہے، صرف اسی طرح اس کی بھی حفاظت کرتی ہے اور اس پر اس کو وہی اقتدار حاصل ہے جو اپنے باشندوں پر حاصل ہے پس ملک شخصی کے ساتھ سلطنت کے تعلق کے خاص خاص اصول حسب ذیل ہیں۔

(۱) سلطنت ملکیت کی حفاظت اور آزادی کی ضامن ہوتی ہے[عله]

(۲) ملک کے علیحدہ کردینے کے لئے سلطنت کو علی الاطلاق اختیار حاصل نہیں ہوتا۔

(۳) سلطنت کو حق حاصل ہے کہ اغراض عامہ کے لئے ملکیت پر محصول عائد کرے۔

ملکیت شخصی سے سلطنت کے تعلقات انھیں امور پر ختم نہیں ہوجاتے بلکہ چند پابندیوں کے ساتھ اس کے حقوق ملک شخصی کی آزادی پر حاوی ہوتے ہیں۔

ملک شخصی کے حدود

بعض اشیا فطرتاً ایسی ہیں کہ ملک شخصی ہونے کے لئے ناموزون ہیں اور عامۃ الناس کے استعمال میں آتی ہیں۔ اس قسم کی جمہوری چیزیں ندیاں اور سمندر، سواحل جہاں مد و جزر کی آمدورفت رہتی ہے اور بندرگاہیں وغیرہ ہیں[عله]

اس تحت میں وہ برف اور یخ سے ڈھکی ہوئی بلند پہاڑی زمینیں اور میدان بھی داخل ہیں جنمیں کچھ پیدا نہیں ہوتا ناقابل گزر غار اور میدان وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں

عله۔ یہ اصول بہت سے ملکوں کے نظام سلطنت میں پایا جاتا ہے۔ ہنری سوم نے جو منشور اعظم ۱۲۲۵ء میں دوبارہ جاری کیا اس میں بھی اس مضمون کے کئی جملے تھے۔ فرانسیسی نظام جمہوریت ۱۸۴۸ء کے فقرہ ۱۱ اور منشور ۱۸۱۴ء کے فقرہ ۸ میں یہ جملہ موجود ہے: "ہر ملکیت غیر قابل دست اندازی ہے" پروسی نظام سلطنت ۱۸۵۰ء فقرہ ۹ "ملک غیر قابل دست اندازی ہے"۔

عله۔ مارکیانوس (Dig I Tit 8.) میں کہتا ہے "ندیاں تقریباً سب کی سب اور بندرگاہیں عام (یعنی جمہوری چیزیں) ہیں"، الپیانوس (Dig XLIII Tit 12.) میں کہتا ہے "کاسیوس کی تعریف کے مطابق وہ ندی عام ہے جو ہمیشہ بہتی ہو" نپولیوں کے ضابطے کی دفعہ ۵۳۸ کی رو سے عام (یا جمہوری) ندی کا مفہوم زیادہ محدود ہے: "سڑکیں، راستے، اور گلیاں جو سلطنت کی نگرانی میں ہیں، نالے اور ندیاں جن میں جہازرانی یا کشتی رانی ہوسکتی ہے، کنارے یا سواحل، وہ زمینیں جن پر سے سمندر کا پانی ہٹ گیا ہو، بندر، بندرگاہیں، گھاٹ اور عموماً فرانسیسی زمین کے وہ سب حصے جو کسی شخصی ملکیت میں نہیں ہیں۔ اراضی عامۃ میں شامل سمجھے جاتے ہیں" نیز دیکھو

گر برف کے پہاڑوں کی برف ایک تجارتی شئے ہو گئی ہے اور برفیلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر مہمان خانے (ہوٹل) تعمیر ہو گئے ہیں۔ ان صورتوں میں یہ ملکیت سلطنت سے حاصل ہوتی ہے۔ ان فطری انعامات کے پہلو بہ پہلو متمدن سلطنت کے وہ کام ہیں جو عام اغراض کے لئے وقف ہیں، خاصکر عام سڑکیں اور نہریں، عام میدان وغیرہ یہ سب جمہور کی ملک ہیں اور جب تک اس حالت میں رہیں سلطنت بھی شخصی ملک کے طور پر ان پر قبضہ نہیں کر سکتی، گو کہ سلطنت کی نگرانی کو بعض وقت ملک سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ ان کے سوا ایسی بھی چیزیں ہیں کہ وہ اگرچہ فطرتاً اس قابل ہیں کہ ملک شخصی ہو سکیں مگر وہ سلطنت کے لئے محفوظ ہیں کیونکہ بہبود عامہ سے ان کا گہرا تعلق ہوتا ہے یا یہ کہ ان کے انتظام کے لئے ایسے وسائل درکار ہوتے ہیں کہ شخصی مالک بالعموم ان وسائل پر قابو نہیں پا سکتے۔ اس صنف میں معادن نمک کی کانیں اور دوسرے اسی طرح کے اور اجارات شامل ہیں۔

۳۔ ملک عامہ کے محدود مفہوم سے علیحدہ ایسی چیزیں بھی ہیں جو بالتخصیص ضروریات عامہ کے لئے علیحدہ کر دی گئی ہیں، خاصکر عمارات عامہ، سرکاری عاملوں یا حاکموں کی اقامت گاہیں، قلعے، سلاح خانے (دار الصناعت) اور بارکیں (سپاہیوں کی قیام گاہیں) ان چیزوں کو صحیح طور پر سلطنت کی ملک کہہ سکتے ہیں، مگر خدمات عامہ میں استعمال ہونے کے باعث وہ شخصی ملک اور شخصی کاروبار کی حد سے خارج ہو جاتی ہیں۔ ان کا سلطنت کی نگرانی میں رہنا ضروری ہے تاکہ وہ عام اغراض کے کام آ سکیں۔

۴۔ اگلے زمانے میں سلطنت اپنی مفتوحہ زمین کو اپنے جنگ آوروں اور قبائل میں تقسیم کر دیتی تھی اس لئے اولاً وابتداءً جائداد زیادہ تر سلطنت ہی سے حاصل کی جاتی تھی بہت سی سلطنتوں میں اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جب کئی خاندانوں کے ترک وطن کرنے یا موت کے ہاتھوں نیست و نابود ہو جانے سے زمین پر اس کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے تو زمین سلطنت کے پاس واپس ہو جاتی ہے، ابھی تک انگریزی اور امریکی قانون اسی رائے پر قائم ہے کہ جدید مستعمرات کی زمین سلطنت کی ملک ہے اور آباد کاروں کے لئے لازم ہے کہ اسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) "سکسونی آئینہ"، ج ۲، ص ۲۸، دفعہ ۴ یا "سرسری ملکی قانون"، ج ۲، ص ۱۵، دفعہ ۴۳ و ۴۱؛ اور "آسٹروی ضابطہ"، دفعہ ۴۰۰۔

سلطنت سے خرید کریں؛ جو زمین ہنوز ملک شخصی میں نہیں آئی ہے یا اس کی یہ حیثیت ختم ہو گئی ہے اس کے متعلق یہ عملدرآمد مملکتی فرمانروائی کے اصول کے مطابق (جس سے شخصی ملکیت کا انضباط ہوتا اور ملک شخصی کی عدم موجودگی میں اسے خود پورا اختیار حاصل ہوتا ہے) [عــه] بالکل بجا ہے لاوارث جائداد بھی اسی طور سے سلطنت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر ہرکس وناکس کے قابض ہو جانے سے سخت ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔

رومی قانون نے زیادہ صحیح طریقہ اختیار کیا تھا کہ لاوارث شئے (Res nullius) پر سلطنت کو دیگر اشخاص سے زیادہ حق حاصل نہیں تھا۔ ملکی اور غیر ملکی دونوں اس پر قبضہ کر سکتے تھے اور اسی قبضے سے وہ اس کے مالک ہو جاتے تھے [عــه]۔ برخلاف اس کے ازمنۂ وسطے کی جاگیری شاہی شخصی، ان اشیا پر بھی ملک سلطنت کے وسیع کرنے کے جانب مائل تھی، جن پر شخصی قانون کا اطلاق ہوتا تھا اور یہ خیال بہت سی جدید سلطنتوں کے قانون میں قائم رہ گیا ہے۔

الف۔ پروسی قانون کے مطابق بعض ایسے املاک پر جن کا کوئی دعویدار نہو یا جو متروک پڑے ہوں خاصکر زمین یا مویشی وغیرہ کے قسم سے، سلطنت کو قبضے کا مقدم حق حاصل ہے، مگر ان چیزوں کے علاوہ جو ایسی چیزیں ہوں کہ ان کا دعویدار کوئی نہو ان کے متعلق پروسی قانون بھی آزادانہ قبضے کا حق تسلیم کرتا ہے [عــه]

عــه۔ دیکھو (اتیالی مصنف) پیپر انتونی کی کتاب ”نیپلز کا قانونِ اساسی“ ج ۱، ص ۳۰۶ اور اس کے آگے، ”سلطنت کی ملکیت“ کا بیان۔

عــه۔ یوستینیانوس کے ضوابط ۲، ۱، ف ۱۲ ”جو چیز بے مالک (لاوارث) ہے اس پر جو قبضہ کرے وہی اس کا مالک ہے“ دیکھو گایوس ج ۲ دفعہ ۶۶۔ بلیو نر نے ”جرمانی شترکیت کے قانون نامہ“ دفعہ ۴۳ میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ لاوارث چیز کو ایک غیر ملکی سلطنت کے اندر اپنے قبضے میں نہیں لا سکتا مگر جب کوئی غیر ملکی شخص ایک چڑیا کو جو اُڑ کر اس کے پکڑے میں آگئی ہو پکڑ لے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے بھی ویسا ہی حق حاصل نہو جیسا ایسی حالت میں ایک ملکی شخص کو ہوگا۔

عــه۔ پروسیا کا ”ملکی قانون“ ج ۲، ص ۱۱ دفعہ ۱ وغیرہ۔

(ب) انگریزی قانون بیشتر غیر موعودہ املاک کا مالک بادشاہ کو قرار دیتا ہے[1] مگر بعض قابل انتقال اشیاء پر قبضہ کرلینے کا آزادانہ حق وہ اب بھی تسلیم کرتا ہے[2]

(ج) فرانسیسی قانون انگریزی قانون کے مثل ہے وہ اپنا عام اصول یہ بیان کرتا ہے کہ "جن چیزوں کا کوئی مالک نہیں وہ سلطنت کی ملک ہیں"[3]

(د) آسٹروی قانون نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ جن چیزوں کا کوئی مالک نہو ان پر آزادانہ تصرف کیا جاسکتا ہے[4]

۵۔ ملک اور رعایا پر سلطنت کی فرمانروائی اور اعضائے سلطنت کے مستمر و مستقل بقا کے تحفظ کی ذمہ داری کی وجہ سے جو قیود پیدا ہوتے ہیں ان میں ملک ذاتی پر اجرائے محصول اور انتظام کو توالی شامل ہیں۔

بیدخلی

۶۔ حق بیدخلی سے پیدا شدہ قیود۔ بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ رومی، حق بیدخلی کو تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ جب نفع عامہ کے لئے بھی ترک ملکیت کی ضرورت ہوتی تھی تو بھی آزادی ملکیت غیر مشروط طور پر محفوظ رہتی تھی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ کسی عام حق ترک کو تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن اگر انفرادی حالتوں میں سلطنت کو ترک ملکیت کے نافذ کرنے کا اختیار نہیں حاصل تھا، تو پھر ان کی طویل نہریں، ان کی مستقیم فوجی سڑکیں، ان کے پانی کے خزانے اور ان کے قلعے آخر کیونکر وجود میں آسکے۔ غالباً انھوں نے وہی کیا ہوگا جو اس وقت انگریز کرتے ہیں یعنی خاص خاص حالتوں کے لئے مخصوص قانون منظور ہوتے رہے ہوں گے۔

---

[1] ۔ بلیک اسٹون (ج ۱، ص ۸) بریکٹن کا ایک قول نقل کرتا ہے: "ایسی لاوارث چیزیں جن کا شمار املاک میں ہو اور فطری قانون کے مطابق اس شخص کے ہاتھ میں آگئی ہوں جس نے انھیں سب سے پہلے پایا ہو تو وہ اس سے قبل ہی قانون اقوام کی رو سے بادشاہ کی ملک ہوچکی ہوں گی۔"

[2] ۔ بلیک اسٹون ج ۲، ص ۱۲، ۲۶

[3] ۔ فرانسیسی "ضابطۂ دیوانی" فقرہ ۱۳: "جس مال کا کوئی مالک نہ ہو وہ سلطنت کی ملک ہے۔" مقابلہ کرو فقرہ ۵۳۹، ۷۲۳، ۷۶۸

[4] ۔ دفعہ ۳۸۱ وغیرہ

انگلستان میں اگر عام مقاصد کے لئے مالکوں کو ان کی ملکیتوں کے ترک کرنے پر مجبور کرنا ہوتا ہے تو اس کے لئے پارلیمنٹ کے خاص قانون کی ضرورت ہوتی ہے[1]۔

معاوضہ

بر اعظم یورپ میں حق بیدخلی عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے، اور اس کے قواعد معین ہو گئے ہیں، بہت سے جدید نظامہائے سلطنت میں یہ اصول داخل ہے کہ پورا معاوضہ ادا کرنے کی صورت میں سلطنت کو یہ حق حاصل ہے کہ بہبود عامہ کے اغراض کے لئے ترک ملک کو جبراً عمل میں لا سکے[2]۔

اس خیال سے کہ جہاں افراد کے حقوق شخصی اور عوام کے حقوق عامہ کا تصادم ہو جائے وہاں موخر الذکر کو غلبہ حاصل ہونا چاہیئے، یہ اصول بالکل بجا ہے مگر اسی حد تک جس قدر مقتضائے حالات ہو متضاد اغراض میں آشتی کی صورت اس طرح پیدا کیگئی ہے کہ ایک طرف سے ترک حق کیا جائے دوسرے طرف سے معاوضہ دیا جائے۔

---

[1] مقابلہ کرو بلیک اسٹون ج ا ص ۱۱ اور متعدد نئے قوانین نہروں اور ریلوں کے متعلق مثلاً ان کے لئے دیکھو "جدید ترین ضابطہ بیدخلی" مطبوعہ نیورن برگ ۱۸۳۷ء [خصوصاً دیکھو گریون ہوٹ کا "قانون بیدخلی" ص ۶۶ اور آگے۔]

[2] بویریا کا ملکی قانون ۱۷۵۶ء ۴ (۳)، دفعہ ۲۔ پروسی ملکی قانون ا (۱۱) دفعہ ۴، [تمہید، دفعہ ۵، ۳۲] نپولین کا ضابطہ، فقرہ ۵۴۵: "کوئی شخص اپنی ملک سے دست بردار ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا بشرطیکہ سود مندی عامہ کی غرض سے ایسا نہ کیا جائے اور پہلے سے ایک واجبی معاوضے کے ذریعے اس کے نقصان کی تلافی نہ کر دی گئی ہو۔" آسٹروی ضابطہ (دفعہ ۳۶۵) "اگر نفع عام کیلئے ضرورت ہو تو ہر رکن سلطنت کو اپنی ملکیت (املاک) واجبی معاوضے پر دے دینا چاہیئے۔" فرانس کے نظام سلطنت ۱۸۴۸ء، فقرہ ۱۱ منشور ۱۸۱۴ء فقرہ ۹ اور ضابطے کا، نیز بلجیم کے نظام ۱۸۳۱ء، فقرہ ۱۱ اور اٹالیا کے نظام ۱۸۴۸ء فقرہ ۲۹ اور آسٹریا کے قانون اساسی ۲۱ دسمبر ۱۸۶۷ء، فقرہ ۵ کا منشا بھی یہی ہے۔ پروسی نظام حکومت ۱۸۵۰ء فقرہ ۹ "ملکیت ناقابل تنقیص ہے اور بجز بہبود عامہ کی بنا پر حسب قانون پیشگی معاوضہ ادا کرکے یا شدید ضرورت کی صورت میں کم سے کم اس قدر معاوضہ دے کہ جتنا بحالات موجودہ تخمینہ کیا جا سکے، اور کسی صورت میں نہ مالک اس سے بیدخل کیا جا سکتا ہے اور نہ اس پر کسی طرح کی قید عاید کی جا سکتی ہے۔"

یہ سوال کہ کسی خاص حالت میں اغراض عامہ کے لئے بیدخلی کی ضرورت ہے یا نہیں، اس کا تعلق قانون عامہ سے ہے اور اس لئے عدالت دیوانی سے اس کا فیصلہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کا تصفیہ خاص ارکان حکومت کا کام ہے، خواہ وہ وضع قانون کے ذریعے سے ایسا کریں جیسا انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ میں ہوتا ہے یا خود عمال سلطنت اس کا فیصلہ کردیں، جیسا جرمنی میں دستور ہے یا عدالتہائے انتظامی کے ذریعے سے ایسا کیا جائے۔ آخرالذکر طریقہ زیادہ قرین انصاف ہے کیونکہ یہ کام حکومت کا ہے کہ وہ ہر ایک صورت خاص میں یہ طے کرے کہ نفع عام کے لئے کیا درکار ہے اور مجوزہ ذرائع کے اندازہ کرنے کے لئے سب سے زیادہ وہی موزوں ہے، مگر طریق کارروائی ایسا ہونا چاہئے کہ مطلق العنان حرص وہوس کو شخصی حقوق میں مداخلت بیجا کا موقع نہ ملے[1]

ترک ملک پر مجبور کرنے کا حق صرف سلطنت سے یا مختصر حلقوں میں کمیون سے تعلق رکھتا ہے منفرد اشخاص سے کسی صورت میں اس کا تعلق نہیں ہوسکتا، مگر سلطنت افراد یا جماعتوں کو خاص کاموں کے لئے ترک ملک کے مطالبے کا حق دے سکتی ہے۔ انگلستان اور امریکہ میں ریلوے کمپنیوں کو اکثر یہ اختیارات دیئے جاتے ہیں۔

بہت سی مجالس وضع قوانین اس حق کو جائداد منقولہ اور بعض خاص نامزد اشیاء تک محدود رکھتی ہیں، مگر یہی اصول بالکل اسی طرح جائداد غیر منقولہ (یعنی سامان وغیرہ) اور اغراض عامہ پر جو نئے انکشافات اور ترقی تمدن سے پیدا ہوں عائد ہوتا ہے۔

تشخیص معاوضہ

دوسری جانب تشخیص معاوضہ کلیتہً شخصی قانون کا مسئلہ ہے اور اس کا تصفیہ بھی اگر باہمی معاہدے کے ذریعے سے نہ ہوگیا ہو تو عدالت دیوانی سے ہونا چاہئے سلطنت کا بہرحال یہ فرض ہے کہ وہ پورا معاوضہ ادا کرے یعنی محض معمولی قیمت نہ دے بلکہ اتنی بڑھا کر قیمت دے کہ مالک کے نہ صرف بلاواسطہ بلکہ بالواسطہ مفاد کا بھی کافی عوض

---

[1] بوئریا کا قانون مجریہ ۱۸۳۷ء۔ دیکھو تراکش لر کی تحریر "جبری بیدخلی" پر "رسالہ قانون جرمانی ج ۱۲ حصہ ا میں" [بعد کی تحریریں اس بحث پر یہ ہیں گریون ہوبٹ کا "قانون بیدخلی ۱۸۷۴ء"، وہ تحریریں جن کا حوالہ فون ہولتس دورف کی "قانونی قاموس ج ا ص ۴" وغیرہ میں دیا گیا ہے۔]

ہو سکے بخلاف اس کے سلطنت کے لئے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی قدر و قیمت کا معاوضہ دے جس کا وجود حقیقت میں نہیں ہے بلکہ جسے مالک نے محض بزعم خود فرض کر لیا ہے۔

بعض جگہ کے قوانین اُس بالواسطہ منفعت کو جو اس تغیر سے پیدا ہو جائے مالک کے بالواسطہ نقصان کے مقابل میں قرار دیتے ہیں[1] مگر بعض بعض جگہوں کے قانون اس پر لحاظ کرنے سے انکار کرتے ہیں[2] طریقہ اول جس طرح پر کہ زیوریچ (Zurich) کے قانون نے اسے محدود کر دیا ہے، زیادہ قرین انصاف ہے کیونکہ نفع و نقصان کے حقیقی تعلقات سے وہ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

[تعلیق۔ اس سارے مسئلے پر رل کی "علم الاقتصاد" کتاب دوم باب پنجم و دوم دیکھا جائے نیز لاویلیے کی اجتماعیت عصریہ (Le Socialisme Contemporier) اور رسے کی بھی اجتماعیت عصریہ (Contemporary Socialism) دیکھنی چاہئے۔ انگریزی مترجم۔]

---

[1] ۔ فرانسیسی قانون ۱۸۴۱ء فقرہ ۵۱۔ زیوریچ کا قانون ۱۸۳۸ء دفعہ ۶: "ملکیت کا جو حصہ مالک کے ہاتھ میں باقی رہ جائے اس کے نقصان بعیدہ کا اندازہ کرنے کے لئے اس نفع کو اس کے مقابل قرار دینا چاہئے جو اسے حاصل ہوتا ہو مثلاً کسی باغ کے اندر سے اگر سڑک نکلے تو جو حصہ بچ رہے گا وہ باغ کی حیثیت سے کم قیمت ہو جائے گا مگر عمارتی زمین کی حیثیت سے اس کی قیمت بڑھ جائے گی۔ سلطنت کے لئے خلاف انصاف ہے کہ وہ نقصان اول کا معاوضہ دے۔"

[2] ۔ بویریا کا قانون ۱۸۳۷ء فقرہ ۶۔

چوتھا مقالہ

سلطنت کا عروج اور زوال

پہلا باب

تمہید

عروج سلطنت کی دونوں حیثیتیں تاریخی اور تخیلی

عروج سلطنت کے سوال پر دو مختلف نظروں سے بحث ہوسکتی ہے۔ ہمارا منشا یا تو یہ ہوگا کہ واقعی سلطنتوں نے جسطرح عروج حاصل کیا ہے ان کے شرایط و حالات کی جانچ کریں یا یہ کہ اس لابدی سبب کو معلوم کریں جس پر تمام سلطنتوں کی بنیاد قائم ہے یعنی یہ کہ قانوناً و انصافاً سلطنت کی بنیاد کیا ہے۔ پہلے سوال کا جواب تاریخ کو دینا چاہئے اور دوسرے کا جواب تخیل یا فکر کو۔ تاریخ جن کثیر واقعات پر بحث کرتی ہے ان کے لحاظ سے وہ ان مختلف شکلوں میں امتیاز کرتی ہے جن سے سلطنتیں پیدا ہوتی ہیں۔ تخیل سلطنت کے توحد خیال کو لئے ہوئے شروع ہوتا ہے اور اس لئے وہ توحد بنا کا بھی خواستگار رہتا ہے۔

ہمیں اول تاریخ کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور جبتک کہ ہمیں اقوام کے تجربے کا حال نہ معلوم ہو جائے اس وقت تک ہمیں تخیلی بحث میں نہ پڑنا چاہئے۔

ہمارا تاریخی علم جس زمانے تک پہنچتا ہے اس سے بہت پہلے ابتدائی سلطنتوں کا قیام ہو چکا تھا۔ تاریخ کا احساس اس وقت تک نہیں ہوا تھا جب تک کہ زمین پر بہت سی سلطنتیں قائم نہیں ہو چکیں۔ یہودیوں کی قدیم مقدس کتابوں میں بھی جن سے ہمیں سلطنت یہود کی آفرینش اول کا حال معلوم ہوتا ہے، مصری سلطنتوں کا مقدم وجود مان لیا گیا ہے

گر یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ سلطنتیں پیدا کس زمانے میں ہوئی تھیں، شاید ہندوستان کی سلطنت نے مصری سلطنت کیلئے نمونے کا کام دیا ہوگا۔ گر ہندوستانیوں کی مقدس تحریریں بھی اس معاملہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالتیں۔ اس زمانے کے بعد سے تاریخ نے بہت سی سلطنتوں کا آغاز و انجام دیکھا ہے اور اس لئے ان کے عروج و زوال کے متعلق ہمیں محض قیاس و تخمین کی نسبت تاریخ کے ذریعے سے زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ تمام قدیم یورپی سلطنتیں صدیاں گزر گئیں کہ فنا ہو چکی ہیں اور تقریباً تمام قدیم ایشیائی سلطنتوں کا بھی یہی حال ہو چکا ہے حال کی سلطنتوں میں بیشتر ایسی ہیں جو اس زمانے میں قائم ہوئی ہیں جس کا علم تاریخ کو حاصل ہے ان میں سے اکثر ابھی بالکل نوعمر ہیں۔ اگرچہ تمام روحانی اور جسمانی تخلیق کے مانند ان سلطنتوں کی قوت تخلیق بھی ایک خدائی راز کی طرح پوشیدہ ہے مگر جو حالات و اثرات ان سلطنتوں کے وجود میں آنے کے باعث ہوئے ہیں وہ ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

لیکن بہر نوع سلطنت کے عروج کا طریقہ محض عظیم ذہنی و تاریخی دلچسپی ہی کا مظہر عجیب نہیں ہے بلکہ سلطنت کی تمام زندگی میں اس کا اثر برابر جاری رہتا ہے اور ایک بڑی حد تک دوسری سلطنتوں کے ساتھ اس کے تعلقات کا تعین بھی اسی سے ہوتا ہے[1]

اس وجہ سے قانون عامہ کے مطالعے کے لئے سلطنتوں کی مختلف النوع آفرینش پر غور کرنا اس سے زیادہ اہم ہے جس قدر کہ شخصی قانون کے لئے حصول ملکیت کی مختلف صورتوں کی جانچ کرنا اہم ہے مگر اس زمانے کے لوگوں نے سابق الذکر تحقیقات سے بالکل ہی غفلت اختیار کر رکھی ہے حالانکہ موخر الذکر پر وہ بہت ہی توجہ کے ساتھ غور و فکر کرتے ہیں۔ ہم اس میں تین مختلف گروہوں کو تمیز کر سکتے ہیں:۔

عروج سلطنت کی تین تاریخی شکلیں۔

۱۔ اولین تکوین سلطنت، یعنی کسی قوم و ملک میں سلطنت کی بنا اس طرح پڑے کہ وہ کسی سابق سلطنت کی قائم مقام نہ ہو۔

---

[1] فرانسیسی مصنف دی توک وِل کی تصنیف جمہوریت امریکہ میں (Democracy in America) دیکھو انگریزی ترجمہ مترجمہ (Reene) حصہ اول باب دوم " تمام قوموں میں ان کی تکوین اول کے کچھ نہ کچھ نشانات پائے جاتے ہیں اور جو حالات بوقت آفرینش ان کے ساتھ تھے اور جنھیں ان کے عروج میں حصہ ملا ہے وہ ان کی ہستی کے تمام اخیر زمانے پر موثر ہوتے ہیں "

۲- اشکال ثانوی، یعنی سلطنت اپنی اندرونی حیثیت سے کسی ایک قوم کے ذریعے سے پیدا ہو مگر پھر بھی اس کا انحصار ایسی سلطنتوں پر ہو جو پہلے سے قائم ہوں اور اب یا تو باہم مل کر ایک ہو جائیں یا کئی مختلف سلطنتوں میں منقسم ہو جائیں۔

۳- تخریبی تکوین سلطنت۔ یعنی سلطنت کو تحریک و ہدایت خود اندرون سلطنت سے نہ ہو بلکہ بیرون سلطنت سے ہو۔

یہاں ہم صرف نئی سلطنتوں کے بننے کا ذکر کر رہے ہیں، اسے محض نظام سلطنت کے تغیر میں خلط ملط نہ کر دینا چاہیے۔ بودین نے اس فرق پر بہت صحیح طور پر توجہ دلائی ہے، (وہ اس دوسری صورت کو "تبدل" کہتا ہے) قدیم رومی شاہی کے جمہوریت میں مبدل ہو جانے سے کوئی نئی سلطنت نہیں پیدا ہوئی اور اسی طرح دوبارہ جمہوریت کے شکست ہو جانے اور شہنشاہی کے قائم ہو جانے سے بھی کوئی نئی سلطنت وجود میں نہیں آئی حکومت کی صورت کے تغیرات سے ایک ہی سلطنت کی زندگی کے مختلف زمانے ظاہر ہوتے ہیں، اس سے مختلف سلطنتوں کا آغاز نہیں ہوتا۔

دوسرا باب

تاریخی تکوین کی صورتیں

(۱) تکوین اولین کی صورتیں

ایک بالکل نئی سلطنت کی تکوین

جن متعدد طریقوں سے کوئی سلطنت پیدا ہو سکتی ہے ان میں سب سے زیادہ اصلی طریقہ روما کی بنیاد کے افسانے سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں ہر چیز نئی ہے۔ بہت سی مختلف نسلوں کے اجزا اس سے نکل نکل کر لوگ عام سرداروں کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور یہ سب متحد ہو کر ایک رومی قوم بن جاتے ہیں۔ غیر مزروعہ و غیر مستاجرہ اراضی پر قبضہ کیا جاتا ہے اور یہی زمین اس ابدمدت شہر کی بنیاد ہو جاتی ہے۔ اس افسانے سے ہمیں ایک بالکل ہی نئی تکوین کا تصور حاصل ہوتا ہے ایک انبوہ کا منتظم ہو کر ایک قوم کی شکل اختیار کر لینا ملک ارضی کے حصول سے قبل نہیں ہوتا بلکہ اول ہی سے ان کا تعلق شہر کے ساتھ قائم ہو چکتا ہے۔ دونوں اجزا متفق ہو جاتے ہیں اور دیوتاؤں کی مبارک دعاؤں کے ساتھ معاً سلطنت کی بنا قائم کر دی جاتی ہے اور نئے بادشاہ کی جانب سے رعایا کو فرامین عطا ہونے سے اور رعایا کی جانب سے ان کے قبول کئے جانے سے قانوناً سلطنت قائم ہو جاتی ہے۔ بادشاہ کا تکوینی خیال اور قوم کی سیاسی مرضی سلطنت کے قانون میں اس طرح یکجا ہو جاتی ہیں گویا وہ دونوں ایک متحد فعل ہیں[1] اور سلطنت، یا ارادہ قومی مرضی کا ایک آزادانہ فعل ہو جاتی ہے

[1] لیئو اپنی "تاریخ عالم" (Weltgeschichte) میں لکھتا ہے کہ روما کی بنا میں معاہدہ ایک تخمیس

اس امر میں شک کرنے کی کافی وجہ ہے کہ آیا اس قسم کا سیاسی "عمل تکوین" فی الحقیقت کبھی واقع بھی ہوا مگر اس سلطنت کے تخیل کے یہ نہایت ہی کامل طور پر موافق ہے جو ہمہ تن مکمل ہو کر اس طرح وجود میں آجائے گو یا زیوس کے سر سے اتھینے پیدا ہو گئی۔

۲۔ ایک معین مملکت کے باشندوں کی تنظیم سیاسی

ثانیاً یہ کہ مملکت اور قوم دونوں موجود ہوں مگر قوم میں اس وقت تک الصاق سیاسی کا احساس نہ پیدا ہوا ہو۔ ایسے موقع پر جو شے سلطنت کو پیدا کرنے والی ہوتی ہے وہ قوم کی تنظیم ہے۔ اس کا بھی ایک نمایاں نمونہ قدیم افسانے میں ہمیں ملتا ہے۔ اہل ایتھنز اٹیکا زمین (آؤ توخ تھونیس (A'v Jones) کے فرزند ہیں اور انھیں سلطنتوں کے قیام سے صدیوں پہلے وہ اس ملک میں رہتے تھے۔ اس سلطنت کا آغاز کیاک روپس (Cecoops) کے زمانے سے سمجھا جا سکتا ہے جس نے ان اکھڑ باشندوں کو اول اول دیوتاؤں کا احترام کرنا سکھایا، خاندان کا نظم بر پا کیا، زراعت اور زیتون کے درخت لگانے کو رواج دیا، لوگوں کو قبیلوں یا ذاتوں میں ترتیب دیا اور حکومت اور عدل کو قائم کیا۔ ایک دوسرے قصے کے بموجب یہ تمام باتیں شاہ تھیسے سے اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں جس نے ملک کی منتشر جماعات کو ایک سلطنت کی صورت میں جمع کیا اور ایتھنز کو حکومت کا مرکز بنایا[1]۔ بہر حال دونوں بیانوں کے موافق سلطنت کا وجود میں آنا اسی طرح ہوا کہ اس قوم کی تنظیم کی گئی جو زمین کی مالک تھی۔

سنہ ۹۳۰ء میں آئسلینڈ کی سلطنت جمہوری کا قائم ہونا اس قسم کی تکوین سلطنت کی ایک نہایت معروف تاریخی مثال ہے کہ ایک خاص ملک میں قوم کی تنظیم سے کس طرح سلطنت قائم ہو گئی۔ اول اول اس جزیرے میں صرف کثیر التعداد سرداروں (گوڈون (Goden) کی منفرد آبادیاں تھیں۔ یہ آبادیاں آزاد گوڈورڈون (Godorde) کی زیر حکومت بستیاں تھیں جنہیں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ جزو ہے اور فی الحقیقت رومی وضع قانون کی قدیمی صورت لازمی معاہدے کی رواجی شکل کو یاد دلاتی ہے، بایں ہمہ رومی قانون نفس واقعہ میں دو آزاد شخصوں کے درمیان کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہے بلکہ بحیثیت مجموعی رومی قوم کا ایک واحد عمل ہے۔

[1] مختلف جماعتوں (یا ضلعوں) سے اس طرح باہم مربوط ہو کر جو سلطنت بنی ہو اسے اہل ایتھنز زینوئی کیا (Suvoikid) کہتے تھے۔ اس بحث پر دیکھو و شر (W. Vischer) کا مفید رسالہ "قدیم یونان میں سلطنتوں اور اجتماعوں کا قائم ہونا" جو بازل (Basel) میں سنہ ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔

ان کی عبادت گاہیں اور جائدادیں (Dingstatte) داخل تھیں مگر اس زمانے میں اُلف لیوٹ (Ulfljot) کی تجویز پر سرداروں کے اتفاق سے جزیرے کی تمام آبادی کے لئے ایک عام مجلس (Alding) قائم کی گئی اور قانون سازی اور انتظام عدالت کے لئے ایک مشترک ذریعہ مہیا کیا گیا اور سب سردار (Godorde) اس کے تابع ہوئے۔ اس طرح جزیرے کی آبادی ایک سلطنت والی قوم بن گئی۔

سلطنت کلیفورنیا کی بنا ہمارے ہمعصروں کی آنکھوں کے سامنے کی بات ہے۔ یہ تکوین ممالک متحدہ امریکہ کی حدود کے اندر بسنے والی ایک نئی قوم کے برضائے باہمی اپنے لئے ایک مملکت قائم کر لینے کی عمدہ مثال ہے۔ سونے کی طمع تمام دنیا سے ہر قسم کے لوگوں کا ایک غیر متفق انبوہ جمع کر لائی تھی۔ انھوں نے یکم ستمبر ۱۸۴۹ء کو ایک موسس مجلس کیلئے قائم مقام منتخب کئے اور ۱۳۔ اکتوبر کو نئی سلطنت کا مجوزہ نظام قوم کی منظوری کے لئے پیش کر دیا گیا۔ تمام تاریخ میں اس سے بہتر مثال اس امکان کے ثابت کرنے کے لئے نہیں مل سکتی کہ کس طرح افراد کے آزادانہ اتفاق سے ایک سلطنت بن سکتی ہے اور پھر بھی اگر اس واقعے کو زیادہ غور سے دیکھئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ فیصلہ بھی تمام افراد کے معاہدے پر منحصر نہیں تھا بلکہ کثرت کی مرضی پر اس کا انحصار تھا اور یہ کہ قوم (جماعت) کا اتحاد ضرورۃً پہلے فرض کر لیا گیا تھا۔ نظام سلطنت افراد کی مرضی سے نہیں بلکہ تمام آبادی کی مشترک مرضی سے پیدا ہوا تھا۔

ممالک متحدہ امریکہ کی موجودہ تعمیر سلطنت میں بھی تمامتر یہی خصوصیت رہی ہے۔ پہلے ایک "مملکت" کی پیمائش کر کے اسے آبادکاروں کے لئے کھول دیا ابتداءً وہ امریکہ متحدہ کا ایک صوبہ سمجھی جاتی رہی اور حکومت متحدہ اس کے انتظام کا سامان کرتی رہی، جب آبادی بڑھ گئی اور نشو پا کر ایک قوم کی شکل اختیار کرنے لگی تو اسے ایک نیا نظام سلطنت عطا ہوا اور کانگریس (مؤتمر) نے اس مملکت کو ایک نئی سلطنت تسلیم کر لیا۔

۳ کسی موجودہ قوم کا کسی مملکت پر قابض ہوجانا

زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک قوم بن جاتی ہے اور بعد کو ہستی سلطنت کے دوسرے لابدی جزو کے طور پر وہ زمین پر قبضہ حاصل کرتی ہے۔ اسے قبضۂ مملکت کہہ سکتے ہیں۔ پس تکوین سلطنت کی پہلی صورت ہم فتح کو قرار دے سکتے ہیں۔ جس سے اکثر کام لیا گیا ہے یعنی سلطنت قائم کرنے میں پہلے کوئی آباد ملک فتح کر لیا جاتا ہے۔

فتح

یہودیوں کی پہلی سلطنت، ڈوریا کی یونانی سلطنتوں کا ایک معتدبہ حصہ، اور جرمانی قوموں کی سلطنتیں جو رومی صوبوں اور سلاوی زمینوں پر قائم ہوئیں وہ سب کی سب اسی طرح وجود میں آئیں، اس صورت میں مفتوحہ ملک کے باشندوں پر فاتح قوم کی فوجی قوت کا غلبہ قائم کیا جاتا ہے، جنگ جہاں ایک طرف تباہی کا ایک آلہ ہے وہاں دوسری طرف ایک مثبت طاقت یعنی سلطنتوں کے پیدا کرنے کی قدرت بھی رکھتی ہے۔ جنگ حصول غلبہ اور مردانہ اقتدار کے صفات کو ترقی دیتی ہے اور ایک فتحیاب قوم، مفتوح ملک میں ایک نئی سلطنت قائم کرنے کی خصوصیت کے ساتھ قابلیت رکھتی ہے۔

جو سلطنتیں اس طریقہ سے پیدا ہوتی ہیں انھیں ابتدائے وجود میں بہت سی اندرونی، نیز بیرونی مشکلات پر غالب آنا پڑتا ہے۔ اگر مسلح مخالفت کی تجدید نہ بھی ہو تو بھی عام طور پر فاتح و مفتوح کے تمدن میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور یہ کشمکش اس وقت تک جاری رہتی ہے، جب تک کہ مخلوط قوم کا سیاسی اتحاد مکمل نہو جائے۔ اپنی جدید تنظیم کردہ قوم کو اس خطرے سے بچانے کے لئے حضرت موسیٰ نے یہود کو حکم دیا تھا کہ جو ارض مقدس خدا نے انھیں عطا کی ہے، اس کے تمام باشندوں کو آگ اور تلوار سے فنا کر دیں۔ بہت سی فاتح قومیں اس خطرے میں غرق ہو گئی ہیں اور مفتوح نسل کے اعلیٰ تمدن نے دوبارہ انھیں دبا لیا ہے۔

فتح طاقت ہی کے زور سے کیوں نہو مگر تمام قوموں میں وہ ہمیشہ سیاسی حق کا منبع سمجھی جاتی رہی ہے۔ سکندر اعظم کا مقولہ آج بھی صحیح ہے کہ فاتح قانون عطا کرتا ہے اور مفتوح اسے قبول کرتا ہے۔

طاقت و حق

جہاں بیرونی قوت نئے حقوق کے پیدا کرنے اور پرانے حقوق کے تباہ کرنے پر اس قدر قوی اثر ڈالتی ہو وہاں بالیقین نظم حقوق ہنوز نامکمل حالت میں ہوگا، لیکن فتح کی صورت کیسی ہی خشن کیوں نہو پھر بھی اس میں ایک اخلاقی وقعت شامل ہے۔ جس کی اہمیت وضع قوانین میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ قدیم اور خاص کر ٹیوٹونی قومیں جنگ کو ایک بڑا بین الاقوامی مقدمۂ قانونی اور فتح کو فاتح کے حق میں خدا کا فیصلہ سمجھتی ہیں[1]

[1] بلنچلی، "مطالعات" (Studien) صفحہ ۲۰۲ "جنگ قانون بین الاقوام کے برقرار رکھنے کی وہ بدہیئت شکل ہے جو اس وقت تک جاری ہے مگر اب یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ جنگ اس

اس وجہ سے کہ فتح سے محض جسمانی غلبے کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ اس اخلاقی قوت کی بھی تصدیق ہوتی تھی جو اقتدار سیاسی کو حق بجانب ثابت کرتی ہے۔ یہ خیال سلطنت کے تخیل جدید سے، جو اسے ایک انسانی تنظیم سمجھتا ہے، خلاف نہیں ہے لیکن فی الحقیقت ہر فتح حق کا ثبوت اور ہر شکست غلطی کا نشان نہیں سمجھی جا سکتی۔ آلات جنگ کا غلبہ اب کسی حیثیت سے بنائے حق نہیں خیال کیا جا سکتا۔ مگر عظیم تاریخی ارتقا کا نتیجہ جو وقتاً فوقتاً متخاصم قوموں کے مناقشے کو طے کر دیتا ہے، وہ وسیع فوجی اور سیاسی رفتار میں زمانے اور فطرت کا فیصلہ سمجھا جاتا ہے اور چونکہ اس میں اخلاقی اجزا کا عمل بھی ہوتا ہے اس لئے اسے تاریخ عالم کے فیصلے کی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ "دنیا کی تاریخ دنیا کا دیوان عدالت ہے" بعد میں حالت جدید کا تسلیم کیا جانا خواہ عہد نامہ صلح کے ذریعہ سے ہو یا باشندوں کی اختیاری اطاعت سے ہو، ابتدائی قبضے کے قانونی نقائص کو درست کر دیتا ہے[1]۔

پُر امن آبادکاری

زمین پر قبضہ کرنے کی ایک دوسری اور زیادہ پر امن صورت یہ ہے کہ کوئی سیاسی جماعت کسی غیر آباد یا کم ترقی یافتہ زمین پر نئی سلطنت قائم کرنے کی غرض سے جا بسے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بہت سی یورپی نوآبادیوں کی یہی نوعیت ہے۔ اگر آباد کاری آبائی سلطنت کی نگرانی میں عمل میں آتی ہے تو وہ تدریجی تکوین سلطنت کی ایک مثال ہے (دیکھو اسی مقالے کا باب ۸ ف ۱) لیکن اگر آبادکار اپنا ایک منظم اجتماع قائم کر چکے ہوں (جیسا کہ نیو انگلینڈ میں آبائے زائرین (Pilgrim Fathers) نے کیا) اور خاص اپنی کوششوں اور اپنی ذمہ داری سے ایسی زمین پر جو ابتک کسی سلطنت سے متعلق نہو، ایک نئی جماعت قائم کریں تو یہ اصلاً و واقعاً ایک نئی سلطنت کی بنا ہوگی۔ اگر ملک کے قدیم وحشی باشندے نوآبادی کی مملکت میں رہیں تو دونوں آبادیوں کے درمیان تعلقات کے درست کرنے کی مشکلات تقریباً ویسی ہی سخت ہوتی ہیں جیسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کارروائی کی صرف تمہید ہے جو انسانیت کے لئے زیادہ قرین انصاف اور زیادہ سزاوار ہے [یہ خیال سب سے پہلے مشہور جرمانی شاعر شلر نے اپنی ایک نظم میں ظاہر کیا دیکھو جرمانی فلسفی ہیگل کی تصنیف "فلسفۂ حقوق" فقرہ ۳۴۰]

[1] بلنچلی "اقوام جدیدہ" (Moderne Volker) فقرہ ۱۔ فتح سے ایک جدید پر امن قانونی حالت اس وقت تک نہیں پیدا ہوتی۔ جبتک کہ مفتوح اطاعت نہ قبول کرے یا صلح کا معاہدہ نہ ہو جائے۔

کسی مفتوحہ ملک میں ہوں مگر وحشی قوم پر متمدن قوم کی فوقیت لازماً آخر الذکر کے غلبے کا سبب ہو جاتی ہے ۔

تیسرا باب

(۲) تکوین ثانوی کی صورتیں

الف: متعدد سلطنتوں کے معاہدے سے ایک مرکب سلطنت کی تکوین

دو یا زیادہ سلطنتیں جنھیں انفرادی حالت میں رہ کر اپنے کمزور ہو جانے کا اندیشہ ہو یا جو ایک ہی قوم کے اجزا ہوں اور اس لئے قومی اتحاد کے حاصل کرنے کی خواہاں ہوں وہ باہم ایک جدید اور وسیع متحدہ سلطنت میں متفق ہو سکتی ہیں۔ اس کی بنا افراد کے معاہدے سے نہیں ہوتی بلکہ سلطنتوں کے معاہدے ایسے اتحاد کو قائم کرتے یا کم سے کم اس کے لئے راستہ تیار کرتے ہیں مگر ایک نئی مجموعی سلطنت اس وقت تک وجود میں نہیں آتی جبتک کہ اس کے لئے ایک متفقی نظام سلطنت نہ مرتب کر لیا جائے۔

سلطنت کی اس نئی صورت کی مثالیں بوئیوٹیا (Bœotia) کی قدیم یونانی مشترکیت میں، ایپامی نونڈاس کی اس ناکام کوشش میں جو اس نے آرکاڈیا والوں کو متحد کرنے میں کی تھی، پیلوپونسیا کے محالفے میں، جو اسپارٹا کے تحت تھا، اور ایٹولیا اور اکیا کے معاقدات میں پائی جاتی ہیں۔ اطالیا میں معاقدہ سمنائی اور ازمنۂ وسطی کے آخری حصے میں جرمانیا کے تجارتی شہروں (Hause towns) کے معاقدات اہل سویزرلینڈ اور ولندیزی سلطنتوں کے مشترکیات سب اس کی مثالیں ہیں۔

اس طریق سے جو سلطنت پیدا ہوتی ہے، وہ مفرد نہیں بلکہ مخروج (یا مرکب) ہوتی ہے کیونکہ مختلف سلطنتیں جن سے اس کی ترکیب ہوتی ہے وہ بحال خود برقرار رہتی ہیں اور صرف ایک نئے تعلق میں متفق ہو جاتی ہیں۔ چونکہ یہ تعلق ابتدا ً قانون

سلطنت سے زیادہ معاہدہ سلطنت پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے آیندہ نسلیں ایسی حالت متضاد کی وارث ہوتی ہیں جس میں متعدد سلطنتیں اصلاً ایک دوسرے سے بالکل آزاد ہوتی ہیں اور دوسرے اعتبارات سے اس مرکب سلطنت کی فی الواقع تابع بھی ہوتی ہیں۔ اس تضاد سے ایک مستقل عمل اور ردِّ عمل (Reaction) پیدا ہوتا ہے اور اکثر مجموعی اور خصوصی میلان میں ایک طرح کا تصادم رونما ہو جاتا ہے۔

اگر اتفاق کا احساس زیادہ قوی ہو جاتا ہے اور مشترک تنظیم کو زیادہ نشو و نما حاصل ہو جاتی ہے تو پھر معاہدہ سلطنت کی صورت کے بجائے آئینی قانون کی صورت قائم ہو جاتی ہے، اس امتیاز پر اتحاد سلطنت کی دو خاص شکلیں بنتی ہیں۔ یعنی مشترکیت (Confederation) اور متفقیت (Federtion) [1] دونوں مرکب سیاسی اجسام ہیں اور اس حد تک محالفۂ (Alliance) محض سے، جس سے کوئی نئی سلطنت نہیں بنتی، مختلف ہیں۔ مگر اول الذکر میں سلطنتوں کے اجتماع میں معاہدے کی خصوصیت قائم رہتی ہے اور ثانی الذکر میں ایک اجتماعی سلطنت یا اتحاد سے بننے کی طرف میلان کی ترقی مضمر ہوتی ہے۔

۱۔ مشترکیت

متعدد سلطنتوں کو ایک سیاسی ارتباط میں جمع کر لینے سے، مشترکیت کم از کم خارجی اعتبار سے ایک سلطنت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اگرچہ یہ ہمہ وہ ان مخصوص سلطنتوں سے جداگانہ مرکزی سلطنت کی صورت میں منتظم نہیں ہوتی؛ مجموعی سلطنت کا انتظام یا تو بہ حیثیت صدر کے کسی ایک سلطنت کو تفویض ہو جاتا ہے یا تمام مختلف سلطنتوں کے وکلاء نائبین کی جماعت کے سپرد ہوتا ہے۔ اسپارٹا اور ایتھنز کی سرگروہی (Hegemony) میں معاہدات یونان کی نوعیت اول الذکر قسم کی سی تھی، اور ثانی الذکر صورت ۱۸۴۸ء تک سوئزرلینڈ کی مشترکیت اور ۱۸۱۵ء کی جرمانی مشترکیت کی تھی۔

۲۔ متفقیت

برخلاف اس کے متفقیت میں یہی نہیں ہوتا کہ اس کی بعض سلطنتیں اپنی اپنی جگہ پر بہمہ وجوہ منضبط ہوں بلکہ ایک منضبط و مشترک مرکزی سلطنت بھی ہوتی ہے متفقیت

[1] مقابلہ کرو فریمین کی "حکومت متفقی" جلد اول باب دوم صفحہ ۹ - ۱۵ "مقابلتی سیاسیات" صفحہ ۲۸۷ انگریزی مترجم۔

کے اختیارات منفرد سلطنتوں میں سے کسی ایک سلطنت کے ہاتھ میں نہیں رہتے، نہ ان سلطنتوں کی کسی مجلس کو سپرد ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے مخصوص متفقی اور قومی اعضائے کار پیدا کر لیتی ہے جن کا تعلق صرف اسی مجموعی جسم سے ہوتا ہے۔ اکیبا کا معاقدہ جس میں قوم کی ایک مشترک مجلس بہ حیثیت جماعت وضع قوانین کے تھی، محاربے کے سردار کی حیثیت سے ایک متفقی سپہ سالار تھا اور متفقی مجلس شوریٰ عدالت موجود تھی۔ یہ معاقدہ ایک حد تک اس قسم کی متفقی سلطنت رہ چکا ہے۔ ازمنۂ جدیدہ میں سلطنت کی یہ شکل اولاً شمالی امریکہ کی سلطنہائے متحدہ میں پیدا ہوئی مگر ۱۷۸۷ء کے قانونِ اتحاد کے قبل اس کا اظہار کامل نہیں ہوا اس کے بعد سوئزرلینڈ نے اپنے ۱۸۴۸ء کے متفقی نظام سلطنت میں اس کی نقل کی۔ ان دونوں نظامہائے سلطنت کا انحصار اب سلطنتوں کے کسی باہمی معاہدے پر نہیں رہا ہے، بلکہ ایک عام قوم اور ایک عام سلطنت کے مفہوم پر شامل ہے، جس کی تنہا مرضی سے نظام سلطنت کی ترتیب ہوتی ہے اور وہ قلیل التعداد جماعتوں بلکہ منفرد سلطنتوں تک سے بھی اطاعت کی خواہاں ہوتی ہے اس طرح مشترکیت کے ابتدائی درجے کو چھوڑ کر متفقیت یا اتحاد کے اعلیٰ درجے پر قدم رکھدیا گیا ہے۔

مرکب سلطنت کی یہ دونوں شکلیں شاہیوں کی بہ نسبت جمہوریتوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں اگر ہم شمالی امریکہ اور سوئزرلینڈ کے نظامہائے حکومت کی تاریخ کا مقابلہ اس کشاکش سے کریں جو جرمانی مشترکیت کی اصلاح کی بابت پیش آتی رہی ہے تو یہ امر صاف طور پر واضح ہو جائے گا[1]

۱۸۶۷ء کی شمالی جرمانی مشترکیت اور ۱۸۷۱ء کی جرمانی شہنشاہی کے نظام سلطنت علاً قانوناً فی الواقع جرمانیا کی مختلف سیاسی طاقتوں اور قوتوں کو ایک عام قومی دائرۂ عمل میں متحد کرتے ہیں لیکن اگر ہم اصول پر خیال کریں تو اس نظام سلطنت کی مثال اس تتلی کی سی ہے جو ابھی پوری طرح پر خول سے نکل نہیں چکی ہے ایک جانب اس کے ابتدائے کار کی صورت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام منفرد سلطنتوں یعنی بادشاہوں

جرمانی مشترکیت ایک متفقی شہنشاہی بنائی گئی

[1] اس بحث پر خاص کر دیکھو ہیملٹن اور میڈسن کی تصنیف ”(Federalist)“ اور ممالک متحدہ کے نظام سلطنت کی شرح مصنفہ اسٹوری، بلنچلی کی تصنیف ”سوئزرلینڈ کے قانون متفقیت کی تاریخ“ ج ۱۔ ص ۵۲ ۳ بادالش کی سیاسیات ۱۸۶۳ء

نیز مجلسوں کے آزادانہ معاہدے سے اس کی ابتدا ہوئی ہے مگر دوسری جانب واقعے کی حیثیت سے یہ نظام سلطنت پروسی حکومت اور (جرمانی قوم کے قائم مقام کی حیثیت سے) شہنشاہی ڈایٹ کی محنتوں کے اشتراک سے وجود میں آیا ہے۔ اس موقع پر معاہدہ اور قانون کچھ عجیب طرح پر باہم ملگئے ہیں مگر مجلس متفقی (Federal council) میں متعدد سلطنتوں کی نیابت ابتک مشترکی جرمانی مجلس کی یاد دلاتی ہے۔ صدارت متفقی کا ابتدائی لقب جو پروشیا کے تاج شاہی کو دیاگیا تھا اس میں بھی اس مشترکی خصوصیت کی صفت پائی جاتی ہے، لیکن اگر ہم صدر کے واقعی اختیار خاصکر اس کے سپہ دار اعظم ہونے کے لحاظ سے، اس اختیار پر نظر کریں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ شہنشاہی جرمانی کا سرتاج ہمارے سامنے موجود ہے اور آب شہنشاہی کے نظام سلطنت نے اسے شہنشاہ جرمانیا کے پرشوکت لقب کے ذریعے سے تسلیم کرلیا ہے۔ شہنشاہی ڈائٹ کی تنظیم خیالاً اور عملاً دونوں طرح پر شمالی امریکہ کی کانگریس (موتمر) اور سوئیزرلینڈ کی مجلس متفقی دونوں سے زیادہ متحد مرکوز ہے۔

جرمانی شہنشاہی اور جمہوری متفقیات کے فرق

جرمانی شہنشاہی کا نظام سلطنت جمہوری متفقیات سے جن اہم امور میں مختلف ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(الف) اس نظام سلطنت کی روسے مجموعی سلطنت کے بعض اعضائے اعلیٰ کی ذات میں لازماً یا اتفاقاً منفرد یا تحت سلطنتوں کے مناصب حکومت بھی جمع ہوگئے ہیں۔ مثلاً جرمانی شہنشاہ پروسیا کا بادشاہ بھی ہے مجلس متفقی کے ارکان اور منفرد سلطنتوں کے حکمران ایک ہی ہیں۔ شہنشاہی صدر اعظم اور نیز شہنشاہی کے اعلیٰ عہدہ داروں میں سے بہت سے عہدہ دار وہی ہیں جو پروسیا کے وزیر ہیں۔ برخلاف اس کے متفقی سلطنتوں میں یہ دونوں فرائض کلیتہً جدا ہوتے ہیں۔

(ب) متفقیات میں مختلف سلطنتیں طاقت اور وسعت کے لحاظ سے فی الواقع ایک دوسرے کے برابر نہیں ہوتیں مگر اتحاد کے مقابلے میں بہت ہی کمزور ہوتی ہیں اور اس اعتبار سے ایک دوسرے کے مثل ہوتی ہیں لیکن جرمانی شہنشاہی میں سلطنت پروسیا باقی تمام شریک سلطنتوں کے مجموعے سے بھی زیادہ طاقتور ہے اور اس لئے اسے سب کا سرتاج اور سب پر با اقتدار سمجھنا چاہیے اسی پر شہنشاہی کی اصلی قوت کا انحصار ہے۔ بغیر اس کے جرمانی شہنشاہی کچھ بھی نہیں ہے اور اسی کے گرد بقیہ جرمانی سلطنتیں مجتمع ہیں۔

(ج) شہنشاہی اور بیشتر منفرد سلطنتوں کا نظام سلطنت شاہی ہے۔

یہ اختلافات ایسے اہم ہیں کہ متفقی سلطنت کے رائج الوقت خیال کے تحت میں جرمانی نظام سلطنت کا شامل نکرنا ہی بہتر ہے۔ اسے متفقی شہنشاہی کا نام دینا چاہیے اور متفقی سلطنت کی ایک جدید و متوازی صورت خیال کرنا چاہیئے۔

ب۔ اتحاد

جس صورت پر ہم بحث کر رہے تھے اسی کے قریب قریب دو یا زائد سلطنتوں کا (ایک خاص مفہوم میں) اتحاد ہے۔ خواہ ایک مشترک حکمران کے تحت میں ہو یا ایک نئی سلطنت کی صورت میں۔ اس کے مختلف اقسام و مدارج ہیں۔ اتحاد جب تک محض ذاتی وجہ پر مبنی ہوتا ہے وہ ناممکل رہتا ہے۔

۱۔ شخصی اتحاد

اگر ایک ہی شخص اتفاق سے دو مختلف سلطنتوں کے تخت کا وارث ہوجائے تو یہ اتحاد بالکل عارضی ہوتا ہے اور بعد میں اگر پھر جانشینی دو مختلف شخصوں کو حاصل ہوجائے تو یہ اتحاد زائل ہوجاتا ہے۔ چارلس پنجم کے تحت میں جرمانی شہنشاہی اور اسپین کا متحد ہوجانا یا آگسٹس (دوم و سوم) کے تحت میں پولینڈ اور سکسونیا کا یا خاندان برنس وِگ کے مرد حکمرانوں کے تحت میں انگلستان اور ہنوور کا یا ۱۶۲۰ء کے معاہدے کے موافق اسلیش وگ ہول اشٹائن اور ڈینمارک کا اتحاد؛ یہ سب اسی قسم میں داخل تھے۔ اتحاد کا یہ طریقہ سب سے کمتر درجے کا ہے اس سے کوئی نئی متحدہ سلطنت نہیں پیدا ہوتی بلکہ دو آزاد سلطنتیں محض بیرونی تعلقات کے لحاظ سے ایک بادشاہ کے تحت اقتدار میں آجاتی ہیں۔

جب دو سلطنتوں کا تاج ایک ہی خاندان کے پاس ہو اور ایک ہی قانون وراثت کے موافق اس کا سلسلہ جاری رہے تو یہ شخصی اتحاد مستقل صورت اختیار کرلیتا ہے اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔ تاج آسٹریا کے تحت میں جو سلطنتیں متحد تھیں ان کے لئے ۱۷۱۳ء کا فرمان شہنشاہی (جسے ۱۷۲۲ء میں ہنگری کی مجلس نے بھی سلطنت ہنگری کیلئے منظور کرلیا تھا) ۱۷۰۷ء میں شاہ پروسیا کا امارت نیوشاٹل کا حاصل کرلینا؛ ۱۸۱۴ء میں ناروے اور سویڈن کا متحد ہوجانا؛ ۱۸۶۷ء میں سلطنت ہنگری اور آسٹریا کا وفاق اس مستقل خاندانی اتحاد سے حقیقتاً ایک نئی مرکب سلطنت پیدا ہوسکتی ہے مگر یہ اتحاد بہت ہی ناممکل ہوتا ہے اور بالعموم اس میں کسی قسم کی عملی اہمیت نہیں ہوتی جبتک کے

خود حکمران کی ذات میں مطلق العنان اختیار مجتمع نہ ہو جائے۔ اس کے سوا تمام دوسری حالتوں میں فی الحقیقت ایک طرح کے تضاد و تخالف کی صورت رونما ہو جاتی ہے۔ ایک طرف متضاد اغراض و خیالات کی دو سلطنتیں ہوتی ہیں، دوسری طرف ایک مشترک بادشاہ ہوتا ہے جو ایک سلطنت کے حکمران کی حیثیت سے دوسری سلطنت کے خلاف اعلان جنگ تک کے لئے مجبور ہو سکتا ہے۔ اس لئے شخصی اتحاد کی یہ صورت نیابتی حکومت کے ساتھ باحسن طریق جمع نہیں کی جا سکتی۔

۵۔ حقیقی اتحاد

اعلیٰ توحد اس ملاپ میں پایا جاتا ہے جسے "حقیقی اتحاد" کا نام دیا جاتا ہے منفقیت سے اسے وہی نسبت ہے جو شخصی اتحاد کو مشترکیت سے ہے۔ اس صورت میں نہ صرف حکمران کی شخصیت ایک ہوتی ہے بلکہ قانون سازی اور حکمرانی بھی ایک ہوتی ہے[۱]۔ بلاشبہ متحدہ سلطنتوں میں گونہ اندرونی آزادی ہو سکتی ہے اس لئے کہ معین حدود کے اندر ان کے خاص مجالس وضع قوانین اور ان کے خاص عمال ہو سکتے ہیں مگر پھر بھی تمام سلطنت کا ایک نظم ہوتا ہے اور اس کے سب سے اعلیٰ اغراض ایک ہی ہاتھوں میں مجتمع ہوتے ہیں۔ ایسے حقیقی اتحاد کی مثالیں یہ ہیں: ۱۵۳۶ء* کے شاہنشاہی قانون کے موافق ناروے کا سلطنت ڈینمارک سے متحد ہو جانا۔ کیسٹائل اور ارگون کا اتحاد اگرچہ ابتداہی (یعنی ۱۴۷۹ء) میں مکمل نہیں ہوا مگر بعد کو شاہان باپس برگ کے تحت میں مکمل ہو گیا۔ سب سے نمایاں مثال ۱۸۴۹ء کے قانون اساسی اور ۱۸۶۱ء کے نظام سلطنت کے موافق آسٹروی شاہی کی ہے۔ ۱۸۶۷ء سے آسٹریا ہنگری کا نظام سلطنت دو خاص سلطنتوں کی دوگونگی کے ساتھ اتحاد شخصی کی شکل کو پہنچ گیا ہے اس وجہ سے کہ معاملات خارجہ کی وزارت شہنشاہی فوج اور مالیات ایک ہیں۔ نیز آسٹریا اور ہنگری کی دو قائم مقام جماعتوں کی ایک مشترک سفارت ہے۔ اس شخصی اتحاد

[۱] بلنٹسلی ("قاموس علم السیاسۃ" کی فصل "اتحاد" میں) شخصی اور حقیقی اتحاد میں کچھ اور امتیاز قائم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک شخصی اتحاد ایک اتفاقی چیز ہے اور حقیقی اتحاد، دو یا زیادہ سلطنتوں کے اقتدار کا بنیادی قانون کی بنا پر ایک ہی شخص کی ذات میں جمع ہو جانا ہے۔ اس طرح پر اس کی نظر میں سویڈن اور ناروے کا اتحاد بھی حقیقی اتحاد ہے۔

* اصل جرمانی متن میں ۱۵۳۲ء ہے

میں حقیقی اتحاد کے عناصر موجود ہیں۔ یہ دونوں خاص سلطنتیں اپنی اپنی جگہ پر شخصی اتحاد سے شروع ہوئیں مگر اب ان کا اتحاد حقیقی ہو گیا ہے۔

۲۔ اتحاد کامل

اتحاد کامل سے متحدہ سلطنتوں کی تفریق ختم ہو جاتی ہے، اور اس سے ایک مرکب نہیں بلکہ ایک واحد سلطنت بن جاتی ہے۔

انگلستان اور اسکاٹلینڈ ابتدائً محض شخصی اتحاد سے مربوط ہوئے تھے مگر ۱۷۰۷ء میں برطانیہ عظمی کا نام پاکر ان کے متحد ہو جانے اور بعد میں (۱۸۰۱ء میں) برطانیہ عظمی اور آیرلینڈ کا اتحاد ہو جانے سے وہ اتحاد کامل کی مثال بن گئے۔ ان کی جداگانہ پارلیمنٹیں ختم کر دی گئیں اور اب تمام قلمرو کے لئے ایک پارلیمنٹ ہے۔ زیادہ جدید زمانے کی مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۸۴۹ء میں امارتہائے ہوہنت سولرن کا پروسیا میں شامل ہو جانا ۱۸۶۰ء میں اطالی امارتہائے ڈیوکی اور سلطنت سیسلز کا اطالیا کی ایک نئی سلطنت بنانے کی غرض سے پدمونٹ میں ملحق ہو جانا سب سے بڑھ کر یہ کہ ہنوور کی سلطنت ہیسے۔ نساؤ، اشلیس وگ اور ہول اشٹائن کی امارت اور فرانک فرٹ کے آزاد شہر کا پروسی صوبوں میں مبدل ہو جانا۔

زمانۂ سابق میں قانون عامہ ان اتحادات و تغیرات کو خالصتہً خاندانی نقطہ نظر سے دیکھنے کی طرف مائل تھا۔ گویا یہ معاملہ ایک ہی شخص کا ذاتی حیثیت سے متعدد قطعہائے اراضی کا حاصل کر لینا یا ان کا وارث ہو جانا تھا اور بس۔ (وصیت اور وراثت کی صورتوں میں) شخصی قانون کسی شخص کی زندگی میں اور نیز موت کے وقت انتقال ملک کی جو صورتیں تجویز کرتا ہے وہی اس معاملے میں بھی مسلم سمجھی جاتی تھیں۔ گویا قوم اور ملک ایک ترکہ تھا جسے ایک شخص واحد جس طرح چاہتا کام میں لا سکتا تھا۔ جدید قانون عامہ اس رائے کو جو ہمارے تخیل سلطنت سے متصادم ہے مسترد کرتا اور اس امر پر زور دیتا ہے کہ اس قسم کے تغیرات چونکہ حقیقتاً قوم کے عام نظام سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے عوام کے قائم مقاموں کی مرضی کے بغیر انھیں طے نہ کرنا چاہئے

۳۔ تقسیم

اتحاد کا عکس ایک بڑی سلطنت کا دو یا زائد نئی سلطنتوں میں منقسم یا متفرق ہو جانا ہے۔

تقسیم باعتبار قومیت

قومیت کے اعتبار سے تقسیم کا موقع بالخصوص ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں مختلف قومیں جو اپنے املاک ارضی ہی کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہوں حقیقی اتحاد کے بغیر ظاہری طور پر ایک نئی سلطنت میں متحد ہوگئی ہوں اگر وہ جامع قوت جو ابتک انھیں متحد کئے ہوئے تھی کمزور ہو جائے تو طبعی اختلافات رونما ہو جاتے ہیں اور انفراق کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور اس موجودہ اجتماع کو متعدد جدید و آزاد سلطنتوں میں منتشر کر دیتا ہے چنانچہ وہ عظیم الشان عالمگیر سلطنت جسے سکندر نے اپنی قابلیت سے ذرا دیر کے لئے بنا دکھایا تھا اس کے مرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ نویں صدی کی فرانکی شاہی کے بھی قومیتوں کے اعتبار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ نتیجہ کسی قدر خاندانی اختلافات کی وجہ سے بھی ہوا۔ نپولین کی شہنشاہی جس میں اسکی بنائی ہوئی تابع سلطنتیں بھی شامل تھیں۔ اس کے زوال کی بھی ایک بڑی حد تک یہی وجہ ہوسکتی ہے اور یہی وجہ سنہ ۱۸۳۰ء میں بلجیم کے ولندیز (ہالینڈ) سے جدا ہونے کی ہے۔

بذریعہ تقسیم وراثت

از منہ وسطی میں اکثر ایک سلطنت متوفی حکمران کے مختلف بیٹوں میں بالکل اسی طرح تقسیم ہو جاتی تھی جیسے کوئی وراثت مختلف وارثوں میں تقسیم ہو جائے۔ یہ طریقہ جو شخصی قانون کے اصول سے متفرع ہے سلطنت کے بہبود و اتحاد کے بالکل منافی ہے اور صرف زمانہ جدید کے سیاسی ناقابل التقسیم اصول کے تسلیم کئے جانے سے یہ طریقہ ساقط ہوا ہے۔

۹۔ اعلان آزادی

دوسری صورت اس وقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب کسی سلطنت کا کوئی حصہ اپنے تئیں آزاد ظاہر کرتا اور ایک جداگانہ سلطنت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

بالعموم سلطنت کے جزو ہونے کی حیثیت سے اس حصے کو کل کے خلاف بغاوت کرنے اور بزور اس سے جدا ہونے کا استحقاق نہیں ہے۔ تاریخ نے انفراق کی بہت سی ناروا جیسے اور بدبخت کوششوں کی روایتیں ہم تک پہنچائی ہیں اور وہی تاریخ آزادی کے ایسے اعلانات کا بھی حال بتاتی ہے جو پوری طرح تسلیم کئے گئے ہیں اور جنھوں نے کافی طور پر اپنے کو حق بجانب ثابت کیا ہے۔

سنہ ۱۵۷۹ء میں اسپین سے سوبجات متحدہ کی علیحدگی سنہ ۱۷۷۶ء میں شمالی امریکہ کی سلطنتوں کا اعلان آزادی اور ہمارے زمانے میں یونان کا ترکی تسلط سے

آزاد ہو جانا، یہ سب اسی طریقے کی یاد دلاتے ہیں اس اصول میں کسی قدر حصر کی ضرورت ہے جسے بطریق ذیل بیان کر سکتے ہیں:۔ مستثنیٰ حالتوں میں جزو کا کل سے علٰحدہ ہو جانا حق بجانب ہے بشرطیکہ اس کے دائمی اور اہم اغراض اس کل کے اندر محفوظ اور قابل اطمینان نہ ہوں جس سے اس کا تعلق ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہو کہ خود اس جزو میں اپنی فکر کرنے اور اپنی آزادی کے برقرار رکھنے کی اہلیت موجود ہو۔ صرف حقیقی ضرورت اور ناقابل برداشت مصیبت ہی علٰحدگی کے لئے کافی وجہ ہو سکتی ہے اور اس کے مُسلم سمجھنے کا حق صرف اس اخلاقی قوت سے پیدا ہوتا ہے جو خود کو فتحیاب ثابت کر دے اور تمام مشکلات پر غالب آجائے ان دو مفروضات کے ساتھ تاریخ کا فیصلہ اس پر مہر اعتراف لگا دے گا۔[۱]

---

[۱] امریکہ کا اعلان آزادی اس اصول کو زیادہ ہلکے طور پر زیر بحث لایا ہے، اور اس وقت کے حقوق فطری کے رائج الوقت نظریئے کو ان لفظوں میں تسلیم کرتا ہے:۔ "ہم ان صداقتوں کو بدیہی سمجھتے ہیں کہ تمام آدمی یکساں درجے پر پیدا کئے گئے ہیں۔ خالق اکبر نے انھیں بعض نہ بدلنے والے حقوق عطا فرمائے ہیں اور اس زندگی کے ساتھ آزادی اور اپنی خوش حالی کی کوششیں وابستہ ہیں جو انھیں حقوق کے تحفظ کے لئے انسانوں میں حکومتیں قائم کیگئی ہیں جو اپنے جائز اقتدار کو محکوموں کی مرضی سے حاصل کرتی ہیں۔ جب حکومت کی کوئی شکل ان اغراض کے منافی ہو جاتی ہے تو قوم کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس حکومت کو منسوخ کر دے اور اس کی جگہ پر نئی حکومت قائم کرے اور اس کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھے اور اس کے اختیارات کو اس طرح پر ترتیب دے جو اپنی حفاظت اور خوشحالی کے لئے قوم کی نظر میں سب سے زیادہ انسب معلوم ہوں۔ عاقبت اندیشی کا اقتضا ضرور یہ ہوگا کہ جو حکومت مدت دراز سے قائم ہو وہ خفیف اور عارضی وجوہ سے تبدیل نہ کی جائے اور اسی لئے تمام تجربا سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ خرابیاں جبتک قابل برداشت ہوتی ہیں لوگ انھیں برداشت کرتے رہتے ہیں اور یہ نہیں کرتے کہ حکومت کے جن اشکال سے وہ مانوس ہوں انھیں منسوخ کر کے خود حاکم بن بیٹھیں لیکن جب کجروی اور بدکرداری کا ایک طویل سلسلہ بلا تغیر اسی ایک غرض کے لئے جاری ہو جائے کہ ابنائے ملک کو مطلق العنان حکمرانی کے تحت میں لے آئے تو پھر لوگوں کا یہ حق بلکہ ان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ ایسی حکومت کو برطرف کر دیں اور آئندہ کے لئے اپنی محافظت کی تدبیریں عمل میں لائیں" [اس اعلان کے خیالات و الفاظ کا لاک کے رسالہ "حکومت ملکی" (جلد دوم فقرات ۲۲۲ و ۲۲۵) سے مقابلہ کرو۔

چوتھا باب

(۳) تاریخی تکوین کی صورتیں

ا۔ آبادکاری

(الف) یونانی

یونانیوں کی آبادکاری، جس نے ایشیائے کوچک، اطالیا اور سسلی میں بحرِ متوسط کے ساحلوں کو اور یونانی جزیروں کو نئے شہروں اور سلطنتوں سے پُر کر دیا تھا، وہ فی الواقع نئی سلطنتوں کی ارادی تکوین تھی۔ نئی آبادی اپنے آبائی شہر سے اس طرح نکلتی تھی جیسے بیٹا خود اپنا گھر بنانے کے لئے اپنے باپ کے خاندان سے نکلتا ہے۔ یہ نئی آبادی فوراً ہی ایک نئی سلطنت ہو جاتی تھی جو آبائی شہر سے آزاد ہوتی مگر اپنی نسل، اخلاق، قانون اور مذہب کے روابط سے اس کے ساتھ وابستہ رہتی تھی۔ نوخیز شہر اپنے آبائی شہر کے ایوان (Prytaneum) سے آتشِ مقدس لے جاتا تھا اور اس طرح خاندانی دیوتا نئے وطن کو منتقل ہو جاتے تھے[1]۔ یونانیوں نے کوئی بڑی شہنشاہی نہیں قائم کی مگر ان کی منتشر نو آبادیوں نے مشرق کو یونانی رنگ میں رنگ دیا۔

(ب) رومی

رومی نو آبادیوں کا حال اس سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی غرض رومی تسلط

[1] مقابلہ کرو ہرمن (Herrmann) "یونانی سلطنت کے آثارِ قدامت" باب ۴۔ فونیقیا کی قدیم آبادکاری ابتدا ہی سے نئی سلطنت کی بنیاد نہیں ہوئی تھی مگر بعد میں تھوڑے ہی دنوں میں اس نے یہ شکل اختیار کر لی۔

اور اقتدار کی حفاظت اور توسیع تھی اور اس لئے مستقر سے ان کا تعلق سخت تابعانہ حیثیت میں قائم رہنا تھا۔ وہ نئی سلطنتوں کی بنائیں نہیں تھیں بلکہ ایک ہی قائم شدہ سلطنت کی توسیع تھیں۔

(ج) جدید

اب جدید آبادکاری اس سے بھی مختلف ہے اگر ہم یورپی سلطنتوں کی قائم کردہ زمانہ حال کی نوآبادی کے ابتدائے کار پر غور کریں، خاصکر امریکہ کی نوآبادیوں پر تو یہ واضح ہوجائے گا کہ ان سے براہ راست نئی سلطنتوں کی بنیاد نہیں پڑی بلکہ زیادہ تر ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ قدیم ملک کے تسلط اور تمدن کو وسعت دیجائے یا نئی اقتصادی ہستی پیدا کی جائے اور کبھی وطن کے جور و تعدی سے بچنا بھی اس کا باعث ہوا کرتا تھا۔ جنوبی امریکہ کی نوآبادیوں کی وابستگی یورپ کی رومانی سلطنتوں سے، شمال کی نوآبادیوں کی بہ نسبت زیادہ تھی۔ اس لئے کہ شمال میں آزادی کا ٹیوٹونی احساس اور قیام شخصیات کا میلان ایک بڑی حدتک آبادکارانہ آزادی کا باعث ہوا یا کم ازکم یہ کہ اس آزادی کا موید رہا۔

لیکن ان نوآبادیوں کی مابعد کی ترقی اور تاریخ پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یورپی حکومت سے اپنی آزادہستی خود حاصل کی ہے اور اس طرح ان سے علحدہ ہوکر آزاد سلطنتیں بن گئی ہیں۔ اس قسم کی نوآبادی کی صحیح مثال بچے کی پیدائش سے دیجا سکتی ہے، جو ایک تابع رکن کی حیثیت سے خاندان کی افزائش کا باعث ہوتا ہے مگر جب وہ جسمانی اور عقلی ترقی کرجاتا ہے تو الگ ہوکر خود ایک نیا خاندان قائم کرلیتا ہے

۴ فرمانروایانہ حقوق کا عطا کرنا

ازمنۂ وسطیٰ میں ایک دوسری طرح کی تکوین سلطنت اکثر یوں واقع ہوتی رہی ہے کہ سلطنت کے مخصوص حصوں کو فرمانروایانہ حقوق عطا کردئے جاتے تھے اس طور پر بادشاہ سے مخصوص فرمانروایانہ حقوق حاصل کرکے (بالتخصیص جرمانی اضلاع، امارات، ممالک اور شہنشاہی امصار کا) ایک پورا سلسلہ قائم ہوگیا اور بتدریج ان کے حقوق بڑھتے رہے یہاں تک کہ بادشاہ کے لئے کسی قسم کی اصلی قوت باقی نہیں رہی، محض ایک ظاہری فوقیت رہگئی۔ اس طرح جو ممالک ایک ہی سلطنت کے اجزا تھے وہ صدیاں گزرنے پر آزاد سلطنتیں بن گئے۔ ان عطیات کی خارجی صورت اکثر خریداری یا قرض کے ذریعے سے شخصی حصول حق ہوا کرتی تھی اور اس لئے یہ طریقہ موجودہ سلطنت کے لئے موزوں نہیں ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ تک میں یہ لازمی شرط نہیں تھی اور اس لئے موجودہ زمانے میں عملاً یہ

ممکن ہے کہ کوئی سلطنت اپنے ممالک جن کے کسی حصے کو صاف طور پر یہ سمجھ کر کہ وہ اسے فرمانروایانہ حقوق عطا کرے گی اس طرح تربیت دے کہ وہ اس قابل ہو جائے اور اسے یہ حق عطا کر دے۔ انگلستان، کناڈا اور اپنے دوسرے ملحقات کے ساتھ اسی روش پر چل رہا ہے۔

۳۔ غیر ملکی حکمران کی بنائے سلطنت

کسی نئی سلطنت کی بنا کا آخری طریقہ یہ ہے کہ کوئی غیر ملکی حکمران اسے قائم کرے، خاصکر فاتح جسکے حکم سے قدیم سلطنتیں برباد اور نئی سلطنتیں پیدا ہو جائیں نپولینی حکومت کے دور ان میں یورپ نے دیکھ لیا ہے کہ شہنشاہ کی مرضی سے متعدد سلطنتیں برباد اور ان کے بجائے نئی سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں مگر ایک آن واحد کی طاقت کے ان خود رایانہ مخلوقات کو کسی طرح کی حقیقی زندہ قوت نہیں حاصل ہوئی اور انھیں وجود میں آئے ابھی دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ از خود فنا ہو گئیں یا برباد کر دی گئیں یہ ایک بدیہی ثبوت اس امر کا ہے کہ تکوین سلطنت کی تمام صورتوں میں سب سے زیادہ ناتکمل اور سب سے کم محفوظ صورت یہی ہے۔

پانچواں باب

سلطنتوں کا زوال

فنائے سلطنت کا مشترک سبب اسکی حیاتی فطرت میں پایا جاتا ہے

ہماری زمین منہدم سلطنتوں کے کھنڈروں سے بھری پڑی ہے اور دنیا کی اب تک کی تاریخ سلطنت کے غیر فانی ہونے کے خلاف شہادت دے رہی ہے۔ جس طرح افراد میں موت کے اسباب مختلف ہوتے ہیں اسی طرح سلطنتوں میں بھی ان زوال کے مواقع اور اشکال مختلف ہیں، لیکن اس امر واقعی سے کہ تمام سلطنتیں بالآخر زوال میں آجاتی ہیں ہم ان کے فنا ہونے کے ایک مشترک سبب کو غالباً دریافت کر سکتے ہیں۔ یہ سبب قوموں کی اخلاقی پستی میں نہیں مل سکتا کیونکہ زوال کے لئے اخلاق کی پستی نہ لازمی ہے اور نہ ہر ایسے موقع پر اس کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ پست اخلاق والی قومیں اسی طرح مدتوں زندہ رہ سکتی ہیں جس طرح ایک بد اخلاق آدمی بسا اوقات بڑی عمر تک پہنچ جاتا ہے۔ حکومت کی خرابی کو بھی اس کا سبب قرار نہیں دے سکتے کیونکہ بہت سی سلطنتیں خراب حکمرانوں کی کئی کئی نسلوں تک زندہ رہی ہیں نہ جیسا کہ گوبی نو نے حال میں دعویٰ کیا ہے نسل کے اختلاط اور پستی میں یہ سبب نظر آتا ہے۔ اس امتزاج خون سے بہت سی سلطنتوں نے عظمت و قوت حاصل کر لی ہے اور اگرچہ قومی نسل حقیقتاً بدل گئی مگر سلطنت برابر سرسبزی حاصل کرتی رہی۔ روما

انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ اس کی مثالیں ہیں۔ پس اصل سبب وہی ہے جو تمام دنیوی عضوی زندگی کے قانون عظیم میں پایا جاتا ہے کہ مرور ایام اسے ترقی دیتا اور اسے ختم بھی کر دیتا ہے قوموں اور سلطنتوں کی زندگی پردہ خفا سے نکلتی اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے اسے بتدریج ظاہر کرتی ہوئی اپنے مقصد کو پورا کرتی اور فنا ہو جاتی ہے، یعنی زمانے کی نہ تھکنے والی ترقی اس سے آگے نکل جاتی اور اسے پیچھے چھوڑ دیتی ہے اس لئے کہ فرسودہ زندگی اس کا ساتھ نہیں دیسکتی۔

ترقی پذیر عالم انسانی کو کسی مخصوص سلطنت میں کامل اطمینان نہیں حاصل ہوتا اور وہ تمام سلطنتوں کو نگل جاتا ہے۔ اگر کبھی انسانیت کی وسیع بنیاد پر تمام نسل انسانی کی ایک عالمگیر سلطنت وجود میں آجائے تو ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ یہ سلطنت اس وقت تک باقی رہے گی جبتک انسان خود باقی رہیں۔

سلطنتوں کے زوال کی خاص خاص شکلیں

سلطنتوں کے زوال کی خاص شکلیں ایک بڑی حد تک تکوین سلطنت کی صورتوں کے مقابل ہوتی ہیں اور بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ نئی سلطنتوں کے قائم ہونے سے پرانی سلطنتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

قومی فساد تنظیم

لاحکمیت

قوم کی تنظیم کا عکس ہے قومی تنظیم کا فساد یا اس کا بکھر جانا۔ تنظیم کے بکھر جانے کی مخصوص صورت لاحکمیت ہے۔ اگر اقتدار حکومت کا پاس و لحاظ قوم میں باقی نہ رہے اور جس شخص کی نظر میں جو مناسب معلوم ہو وہ وہی کر گزرے اور کوئی شخص جماعت کے لئے نہ کسی طرح کی فکر کرے نہ اس کے لئے کسی قسم کا ایثار کرے۔ تو ایسے وقت میں سلطنت نفی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ایک منتظم قوم ایک غیر منتظم انبوہ میں مبدل ہو جاتی ہے لاحکمیت نہ صرف سلطنت کی موجودہ صورت کو بلکہ نفس سلطنت کو اٹھا دیتی ہے مگر ایسی قطعی اور دیرپا لاحکمیت، جو سلطنت کی موت کے ہم معنی ہو جاتی ہے، اقوام کی تاریخ میں نہایت ہی شاذ و نادر پائی جاتی ہے۔ زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ لاحکمی کیفیتیں صرف گزر جانے والی چیز اور ایک بخار کا عارضی بحران ہوتی ہیں جن سے سلطنت کی زندگی خطرے میں ضرور پڑ جاتی ہے مگر اکثر یہ کیفیت نظام سلطنت کی ایک نئی ہیئت کی تیاری ثابت ہوتی ہے یہی وہ پر آشوب اور ہنگامہ خیز اوقات ہیں جنمیں آریائی قوموں کی عجیب خصلت کا اظہار ہوتا ہے۔ جس وقت کہ وہ پر غضب نفرت کے ساتھ سیاسی نظم

کو الٹ دیتی ہیں اس وقت میں بھی وہ سیاسی ہستی کی لازمی صورتوں کی مطیع ہوجاتی ہیں،
اور جس حال میں کہ خیالات کی پراگندگی سے وہ لاحکمیت کی شیدائی ہوتی ہیں۔ اس
حالت میں بھی وہ آنکھ بند کرکے ان سرگروہوں کی تقلید کرتی ہیں جو سب سے زیادہ بیباک
اور سب سے زیادہ سخت گیر ہوتے ہیں۔ آزادی کے نشے سے مست، اور ساری قیدوں
سے آزاد انبوہوں کے جلوس فتحمندی کے بالکل عقب میں آمر مطلق (Dietator) کے
چہرے کے فولادی خط و خال دکھائی دیتے ہیں اور قدیم نظام سلطنت کے منہدم آثار
پر قوم فوراً ہی اپنے لئے ایک نیا اور شاید پہلے سے بدتر سیاسی مسکن تیار کرتی ہے۔
جلیل القدر آریائی النسل کی قومیں بھی غیر فانی نہیں ہیں مگر جبتک ان کی زندگی باقی
ہے وہ اپنی ہستی کی سیاسی زندگی سے اس سے زیادہ بے نیاز نہیں ہوسکتیں جس قدر
مچھلی پانی سے یا چڑیا ہوا سے بے نیاز ہوسکتی ہے۔ تمام تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں
ہے کہ ایک آریائی قوم سلطنت کے قیود سے مستقلاً آزاد ہوگئی ہو، خانہ بدوشوں کی حالت
میں واپس چلی گئی ہو۔ سولھویں صدی میں باز اصطباغیوں نے سلطنت کے خیال کو
اسی طرح کلیتہً مسترد کردیا تھا، جس طرح ہمارے زمانے میں اشتمالی اسے مسترد کرتے
ہیں مگر جب انھیں اپنی غیر سیاسی جماعت کے قائم کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے بھی ایک
سلطنت بنا کر کھڑی کی گو وہ کیسی ہی مضحکہ خیز رہی ہو۔

۲۔ ترک وطن

جب کوئی قوم اپنے آبائی وطن کو ترک کردیتی ہے (جیسے قیصر کے عہد میں اہل
سوئٹزرلینڈ نے کوشش کی تھی) یا کوئی قوم اپنے وطن سے خارج کردی جاتی ہے (جیسا کہ
شہنشاہی روما کے زوال پر وحشیوں کے نفوذ کے دوران میں اکثر واقع ہوا) تو ان
دونوں صورتوں میں سلطنت کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور یہ امر بالعموم غیر متیقن ہوتا ہے کہ
آیا اس طرح اپنے وطن سے نکلنے والی قوم کسی دوسرے ملک میں پائدار حکمرانی کے حاصل
کرلینے اور اس طرح ایک نئی سلطنت کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہوگی یا نہیں۔

۳۔ فتح

کسی غیر ملکی طاقت کا کسی ملک کو فتح کرلینا اور کسی تا حال آزاد قوم کا مطیع
کرلینا ایک نئی سلطنت پیدا کرنے کے بجائے زیادہ تر ایک قدیم سلطنت کا برباد کردینا
ہوتا ہے۔ نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ فاتح سلطنت میں کچھ اور زیادہ وسعت ہوجاتی ہے
اسی طریق پر روما بہت سی سلطنتوں کو نگل گیا اور ان کے ملک اور آبادی پر اپنے

تسلط کو وسعت دیدی مگر ہر قوم کی اطاعت ظاہر میں رضامندانہ ہوا کرتی ہے مگر بالعموم ضرورت اور مجبوری سے ایسا ہوتا ہے اور اس وجہ سے یہ محض استیلا کی ایک صورت ہوا کرتی ہے

۴۔ رضامندانہ انجذاب

کامل اتحاد کے ساتھ سا تھ وہ سلطنتیں جو اتحاد میں شامل کرلی گئی تھیں ناپدید ہوجاتی ہیں لیکن چونکہ اس وقت میں اسی اتحاد سے ایک بڑی نئی سلطنت پیدا ہوجاتی ہے جسکے افراد انھیں ناپدید قوموں کے افراد کو شامل ہوتے ہیں اسلئے منفرد سلطنتوں کی جانب سے اپنی جداگانہ ہستی کا ترک ایک رضامندانہ فعل قرار دیا جاسکتا ہے۔

۵۔ رضامندانہ جدائی اور مجبورانہ تقسیم

چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے ایک بڑی مجموعی سلطنت میں جذب ہوجانے کا عکس ہے ایک شہنشاہی کا کئی سلطنتوں میں منقسم ہوجانا یا ایک سلطنت کا کئی مغائر سلطنتوں میں متفرق ہوجانا اول الذکر بلا کسی بیرونی دباؤ کے منتظم طریقے پر اس طرح واقع ہوسکتا ہے کہ مختلف حصے یوماً فیوماً اپنی خصوصیت کو زیادہ مستحکم کرتے جائیں اور بالآخر ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں لیکن آخرالذکر صورت بالعموم کسی غالب غیر ملکی قوت کے فعل سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جو اپنی روشن خیالی اور انسانیت پر نازاں تھا، پولینڈ کی تقسیمات (۱۷۷۲ء، ۱۷۹۳ء، ۱۷۹۵ء) اس قسم کی ناجائز زبردستی کی ہولناک مثال ہیں۔

۶۔ شاہی حقوق سے دست کشی یا ان کا ترک

جسطرح فرمانروایانہ حقوق کے عطیے سے نئی سلطنتیں بنجاتی ہیں اسی طرح ان حقوق سے دستکش ہوجانے یا ان کو ترک کردینے سے موجودہ آزاد سلطنتیں بتدریج اپنی سیاسی ہستی کو زائل کردیتی ہیں۔ جرمانی شہنشاہی کی تاریخ اس قسم کی سلطنتوں کے بننے کے طریقے اور فرانس کی تاریخ ان کے مٹنے کی طریقے کی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ فرانس نے ایک مرکز کی طرف رجوع ہوجانے نے بالخصوص لوئیس یازدہم کے زمانے سے ایک ایک کرکے ذی اقتدار امارتوں کی ایک کثیر تعداد کو شکست کردیا مگر جرمانیا نے بھی انقلاب کے وقت سے بہت سی چھوٹی ریاستوں کو بڑی سلطنت کے بالواسطہ تابع بناکر ایسا ہی طرز عمل اختیار کیا ہے۔

چھٹا باب

تخمینی (یا تخیلی) نظریے

(۱) نام نہاد فطری حالت

۱۔ عہد زریں

فلسفیانہ تخیل اس کا مشتاق ہے کہ پہلے ایک ایسے عہد ابتدائی کا تصور پیدا کرے جب انسان بلا کسی قسم کی سلطنت کے رہتا تھا اور اس کے بعد یہ بحث کرے کہ انسان اس حالت سے سلطنت کی حالت میں کیونکر آیا۔ عوام کی قوت تخیل نے اس ابتدائی حالت کو معصومیت کی اور فطری مسرتوں کے وفور کی خنداں و شاداں تصاویر سے مزین کیا ہے اور اس جنتی عہد زریں کا خواب دیکھتی رہی ہے جس میں ابھی خرابیوں اور نا انصافیوں کا دخل نہیں ہوا تھا اور سب کے سب اپنی پر امن ہستی سے غیر محدود آزادی و خوشحالی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ان تخیلات کے مطابق اس ابتدائی حالت میں کسی قسم کی ملک نہیں تھی۔ کیونکہ قدرت کی بہتات سے ہر شخص کو کافی طور پر وہ تمام چیزیں ملجاتی تھیں جو اس کے بے تصنع اور غیر مکدر ذوق کے لئے ضروری تھیں۔ اس وقت تک درجات بلکہ پیشوں تک کا کوئی فرق نہیں تھا۔ ہر شخص دوسرے کے مانند تھا۔ نیز اس وقت میں نہ کوئی راعی تھا نہ کوئی رعیت نہ کوئی حاکم تھا نہ کوئی منصف تھا نہ کوئی فوج تھی اور نہ کسی قسم کا محصول لگتا تھا۔

سلطنت ایک لابدی خرابی کی حیثیت سے

ایسے تخیل کے مقابلے میں انسان کی مابعد کی سیاسی حالت لازماً ایک طرح کا تخریب و تنزل معلوم ہوگی ایک ایسی طاقت کی ضرورت، جو بدکاروں کی تخویف و تنبیہ کرسکے اور سب کے

انتفاعات کو خلل اندازی سے محفوظ رکھ سکے، پہلے پہل اس وقت لاحق ہوئی جب لوگوں کو ان وباؤں سے سابقہ پڑا جن کا پہلے کہیں نام و نشان بھی نہ تھا، جب ان کے دلوں میں جذبات نے بھڑک کر نئے خطرات پیدا کر دئے اور جب ارتکاب جرائم نے ان کی روحوں کے سکون کو غارت کر دیا۔ پس لوگوں نے اگر سلطنت کو ایک ایسی خرابی نہیں بھی سمجھا جس کے اختیار کرنے سے کوئی مفر نہ تھا تو کم سے کم یہ ضرور تصور کیا کہ سلطنت ایک ضرورت اور مجبوری کی چیز ہے جس کے ذریعے سے خود اس سے بڑی ہوئی خرابیوں سے ہم محفوظ رہ سکیں گے۔

فطری حالت جنگ کی حالت تھی

بہشت کے اس بچوں کے سے دل خوش کن تصور کے مقابلے میں دوسرے فلسفی اور اکثر خشک مزاج فلسفی انسان کی قدیم غیر سیاسی حالت کو اس کی سیاسی حالت سے کہیں بدتر سمجھتے ہیں۔ ان کا خوف زدہ تصور اس غیر سیاسی حالت کو بجائے ایک خدائی امن کے ایک ایسی حالت جانتا ہے جس میں ہر شخص دوسرے جملہ اشخاص کے خلاف نامتناہی تنفر اور جنگ میں مبتلا تھا،[1] اور یہ فلسفی اگر سلطنت کو برا بھی سمجھتے ہوں تو بھی ان کے نزدیک یہ خرابی اس ابتدائی فطری حالت کے مقابلے میں جس میں انسان وحشی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ (الف) زیادہ قابل برداشت اور کم تکلیف دہ ہے۔ اس فلسفیانہ خیال کو اس مذہبی تصور کی خوش آیند تصدیق بھی حاصل ہوگئی جو سلطنت کو بہشت کی نہیں بلکہ ہبوط یافتہ انسان کی تنظیم سمجھتا ہے۔

دونوں رائیں انسان کی سیاسی فطرت کو نظر انداز کر گئی ہیں۔

یہ دونوں رائیں انسان کی سیاسی فطرت کو نظر انداز کر جاتی ہیں، دونوں اس صداقت سے اغماض کرتی ہیں[2] جیسے ارسطو نے نہایت ہی خوبی سے ظاہر کیا ہے کہ انسان

---

[1] شیکسپیر نے اپنے ڈراما "طوفان" (Tempest) باب ۲، پردہ ۱ سطر ۱۴۰ سے ۱۷۰ تک میں بہت ہی نفیس ہجو کی شکل میں اس حالت فطری کا نقشہ کھینچا ہے۔

(الف) ہابس کی رائے کے موافق "لے ویاتھن" (Leviathan) حصہ ۱۔ باب ۱۳-۱۴ انسان کی فطری حالت (یعنی ملکی سلطنتوں سے خارج اس کی حالت) ایک دوسرے کے خلاف جنگ کی حالت تھی۔ اسپینوزا کا بھی یہی خیال ہے دیکھو (Tract Pol) باب ۲۔ ف ۱۴ "انسان فطرتاً ایک دوسرے کے دشمن ہیں" اور باب ۵ ف ۲ "انسان متمدن پیدا نہیں ہوتا مگر متمدن بن جاتا ہے"۔ مگر ہابس اور اسپینوزا کے

ایک سیاسی حیوان ہے۔ ہم انسان کی ایک ایسی حالت تصور کر سکتے ہیں جو سلطنت کے پیدا ہونے کے قبل تھی مگر یہ حالت اعلیٰ ضروریات[۱۵] کو کبھی پورا نہ کر سکی ہوگی اور انسان کے ارتقا میں وہ ساعت ایک غیر محدود ترقی کی ساعت تھی جب اس کی سیاسی قابلیت کا تخم ظاہر ہوا اور روشنی میں آیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ان بیانات کو زیادہ تر یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ایک منطقی استدلال ہے کہ مدنی معاشرت (سلطنت) سے خارج انسان کی کیا حالت ہوتی، نہ یہ کہ ان بیانات سے کسی قسم کے تاریخی نظریے کا اظہار ہوتا ہے، ان کی غلطی یہ نہیں ہے کہ وہ غلط تاریخ کا دعوےٰ کرتے ہیں بلکہ غلطی یہ ہے کہ تاریخ کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ لفظ فطری محض لامدنی یا لاسیاسی کے منفی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اس لئے یہ ارسطو کے Puois سے بالکل مغائر ہے کیونکہ خود ارسطو نے بتایا ہے کہ یہ حالت آخر میں یا کسی شخص کی کامل ترین ترقی کے بعد پائی جاتی ہے۔ دیکھو ارسطو کی "سیاسیات" (۲،۱ ف ۸، ۱۲۵۲ ب ۳۲۔) دوسرے موقع پر اس نے تقریباً وہی کہا ہے جو اسپینوزا نے کیا ہے۔ (انگریزی مترجم)

۱۵۔ افلاطون "ری پبلک" جلد دوم صفحہ ۳۶۹ سلطنت کے قیام کی ضرورت اس وجہ سے قرار دیتا ہے کہ منفرداً آدمی بجائے خود کافی نہیں ہے بلکہ فطرتاً دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا محتاج ہے۔

ساتواں باب

(۲) سلطنت بہ حیثیت تنظیم ربانی

سلطنت کے ربانی تنظیم ہونے کا اعتقاد، زمانۂ قدیمہ و ازمنۂ وسطیٰ دونوں میں ہمارے ان وقتوں سے زیادہ پھیلا ہوا اور زیادہ قوی تھا مگر اس وقت بھی سلطنت کی اس ربانی بنا کے مختلف مفہوم سمجھے جاتے تھے۔

۱۔ خدا کا سلطنت کو بلا واسطہ قائم کرنا۔

ایک خیال کے موافق قیام سلطنت خداوند تعالیٰ کا بلا واسطہ فعل یعنی زمین پر خدائی حکومت کا بلا واسطہ ظہور تھا۔ اسی خیال پر یہودیوں کی مذہبی سلطنت مبنی تھی اور اس کا منطقی نتیجہ ہمیشہ مذہبی سلطنت کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا ہے کیونکہ صرف یہی صورت اس کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ اگر خدا نے سلطنت کو بلا واسطہ قائم کیا ہے تو یہ ایک طبعی امر ہے کہ وہ اسے براہ راست برقرار رکھے اور اس پر حکمرانی کرے۔

۲۔ خدا کا سلطنت کو بالواسطہ قائم کرنا۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ خدا نے سلطنت کو بالواسطہ قائم کیا اور وہ بالواسطہ ہی اس پر حکومت کرتا ہے[۱]۔ اس خیال میں اہل یونان اور اہل روما دونوں شریک تھے ان کی سلطنتیں کسی اعتبار سے مذہبی سلطنتیں نہیں بلکہ اصلاً و کاملاً انسانی سلطنتیں تھیں۔ تاہم قدیم زمانے میں کوئی

[۱] اس مفہوم میں نی بور نے (اپنی تصنیف "زمانۂ انقلاب کی تاریخ" ج ۱۔ ص ۲۱۷ میں) سلطنت کو وہ تنظیم قرار دیا ہے جسے خدا نے معین کیا ہے اور جو ازدواجی اور پدری تعلق کے مانند انسان کی حقیقی فطرت سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر یہ ایک ایسی تنظیم ہے

کارروائی عامہ جس میں کچھ بھی اہمیت ہو بلا دعا اور قربانی کے عمل میں نہیں آتی تھی اور طیور سے شگون لینے کے کام کو (جس سے دیوتاؤں کی مرضی معلوم ہوتی تھی) رومیوں کے قانون عامہ میں بہت بلند مرتبہ حاصل تھا ان میں انسانی آزادی اور تعین ذاتی کا احساس اس اعتقاد کے ساتھ ملا ہوا تھا کہ انسانی معاملات کی رہبری خدا کے ہاتھ میں ہے اور جبکہ افراد کی قسمتوں میں دیوتاؤں کی طاقت واضح اور محسوس تھی تو وہ اسے اور بھی زیادہ بین اور بدیہی سمجھتے ہیں کہ وہ اخلاقی جماعت جسے ہم سلطنت کہتے ہیں، خدا کی مرضی اور اس کے فعل سے کسی طرح جدا نہیں کی جاسکتی[1] تو کیا یہ لوگ غلطی پر تھے؟ یہ بجائے خود مسلم ہے کہ عیسائیت سلطنت کو دنیا کے خدائی انتظام و حکومت سے خارج نہیں قرار دے سکتی۔ مسیحیوں کے خیال کے لئے یہ امر نہایت اہم ہے کہ جبکہ شہنشاہ نیرو عیسائیوں پر سلطنت کے لئے جور و ستم کر رہا تھا اس وقت رسول پادلوس نے رومیوں سے ان مشہور الفاظ میں خطاب کیا تھا "ہر شخص کو اس حاکم کے تابع ہونا چاہئے جس کا اقتدار اس پر ہے کیوں کہ کوئی حاکم نہیں مگر خدا کی طرف سے، اور اگر کوئی حاکم ہے تو وہ خدا ہی کے حکم سے ہے" (پادلوس کا تیرہواں خط رومیوں کے نام فقرہ (۱)) اس لئے یہ کچھ محل تعجب نہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے سارے دور میں ہر ایک عیسائی سلطنت کے اندر فرمانروایانہ اقتدار خدا ہی سے حاصل شدہ قرار دیا جاتا تھا اور شہنشاہ کا اعلیٰ ترین اقتدار بلا کسی غیر کے واسطے کے خدا ہی سے حاصل شدہ سمجھا جاتا تھا۔[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) جو اس عالم میں مکمل نہیں ہوسکتی۔ سلطنت واقعتاً جس حال میں موجود ہے وہ سلطنت کے ربانی تصور کا صرف سایہ ہے۔

[1] ہالر (Haller) نے پلوٹارک کا ایک نفیس جملہ نقل کیا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ "ایک شہر کا بلا زمین کے قائم کر لینا اس سے آسان ہے کہ خدا پر اعتقاد رکھے بغیر سلطنت قائم کر لیجائے" زمانۂ حال میں بھی واشنگٹن اپنی دسمبر ۱۷۸۹ء کی کانگریس کی تقریر افتتاحی کا وہ کہتا ہے کہ "نہایت نامناسب ہوگا کہ اپنے اس پہلے سرکاری کام میں اس خداوند قادر مطلق کے نسبت اپنی پرجوش اطاعت کا ذکر نہ کروں جو تمام عالم پر حکومت کرتا قوموں کے مشوروں کی رہبری کرتا اور اپنی کارسازانہ امداد سے ہر انسانی نقص کی تلافی کرسکتا ہے۔ اسی کا فضل ہے کہ ممالک متحدہ کی آزادی و خوشحالی کے لئے ایک ایسی سلطنت عطا ہوئی جسے خود اہل ملک نے ان اہم اغراض کیلئے قائم کیا ہے اور اس کے فضل سے یہ امید ہے کہ اس سلطنت کے نظم و نسق میں جسقدر ارکان شامل ہیں ان میں

سلطنت کی خدائی نوعیت کے نسبت بعض غلط خیالات

جو خیال سلطنتوں کے عروج و زوال کو دنیا کی ربانی حکمرانی سے متعلق کرتا ہے وہ کیسا ہی پرہیبت کیوں نہو اور ہمیشہ اسکی اخلاقی اہمیت کیسی ہی اعلیٰ کیوں نہ سمجھی گئی ہو مگر ہمیں کسی حال میں اس امر کو نظر انداز نکرنا چاہیئے کہ یہ از ابتدا تا انتہا ایک مذہبی خیال ہے۔ سیاسیات سے اسے تعلق نہیں ہے اور اس وجہ سے یہ خیال جب ایک سیاسی اور قانونی اصول قرار دیا جاتا ہے تو وہ غلطیوں اور خرابیوں کے پیدا ہونے اور ان کے شائع ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ مثلاً

شاہانہ تعصبات

۱۔ اس میں شک نہیں کہ خدا نے انسان کو ایک سیاسی مخلوق بنایا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اسے اس امر میں آزاد رکھا ہے کہ وہ سلطنت کے اس خیال مرکوز کو اپنی خاص کوششوں اور اپنے فہم و ادراک کے موافق اپنے مناسب حال صورتوں میں عمل میں لائے۔ یہ ایک سخت غلطی ہے کہ سلطنت کی خاص خاص شکلوں کو مثلاً جمہوریت کو اس بنا پر رد کر دینا چاہیئے کہ خدا دنیا پر مثل ایک بادشاہ کے حکومت کرتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سے ہر ایک کو وہ اپنے فرض کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کی قوت عطا فرمائے گا میرا یقین ہے کہ تمام عام و خاص افعال نیک کے لئے خالق اکبر کے حضور میں اس اظہار اطاعت سے میں اپنے ہی احساس کو نہیں بلکہ اس سے زیادہ آپ کے احساس کو اور اس سے بھی بڑھ کر اپنے تمام ہموطنوں کے احساس کو ظاہر کر رہا ہوں۔ ممالک متحدہ امریکہ کی قوم سے زیادہ کسی قوم پر اس پوشیدہ دست ایزدی کے اعتراف وتعظیم کا فرض عائد نہیں ہوتا جو انسانی معاملات کا ہادی و رہبر ہے۔ ایک آزاد قوم کی حیثیت حاصل کرنے میں انھوں نے جو قدم اٹھایا اس میں خدائی مدد کا کوئی نہ کوئی نشان ضرور پایا گیا ہے۔ (سوانح عمری واشنگٹن جلد دوم مصنفہ اسپارکس)

(حاشیہ صفحہ نمبر ۲۹۸) ۵۲۔ لڈوگ شاہ بویریا کے نظام سلطنت ۱۳۳۸ء کا منشا بھی یہی ہے "جو حکمرانی کے جلال و اقتدار والا مان لیا گیا ہے وہ بلا واسطہ محض خدا کی طرف سے (یعنی پوپ کے واسطے سے نہیں) ہے اور انتخاب کرنے والے امرا کے انتخاب ہی سے مقرر ہوا ہے اور سچا بادشاہ اور رومیوں کا شہنشاہ تسلیم کئے جانے کا قطعاً مستحق ہے"۔ آوگس برگ کے اقرار ۱۵۳۰ء کا فقرہ ۱۶ یہ تعلیم دیتا ہے کہ دنیا میں جتنا کچھ اقتدار اور حکومت اور نظم و قانون ہے اسے خدا ہی نے بنایا ہے اور اسی نے قائم کیا ہے"۔ خلاصہ یہ کہ تمام قانونی نظم خدا کی مرضی کا نتیجہ ہے۔

بادشاہ بحیثیت نائب خدا

۲۔ اس میں شک نہیں کہ اقتدار حکومت اصولاً و عملاً خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا نے چند معین اور مخصوص افراد کو انسانی کمزوریوں سے بالاتر کر کے اپنے سے زیادہ قریب کر لیا اور انھیں گویا نیم خدا (یا اوتار) بنا دیا ہے، نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے انسانی حکمرانوں کو اپنا ذاتی قائم مقام بنایا ہے اور ان سلطنتوں کے حدود کے اندر انھیں بالکل اپنے مثل قوی اور مقتدر کر دیا ہے[۱] اس قسم کے تصورات جو مذہب اور سلطنت کو خلط ملط کرنے سے پیدا ہوتے ہیں وہ ان لوگوں کی انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہیں جنھیں سلطنت کی حکمرانی کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ لوئس چہار دہم کا یہ پرغرور مقولہ کہ "ہم بادشاہ اس ذات کی زندہ تصویریں ہیں[۲] جو قدوس و قادر مطلق ہے خدا کی شان میں گستاخی اور اسکی زیر فرمان مخلوق کی (جس کا ہر فرد لوئس کے برابر ہے) توہین کرتا ہے۔

اختیار کا من حیث الاختیار خدائی ہونا

۳۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان شخصوں کی ذات سے علیحدہ جو اسے عمل میں لاتے ہیں اقتدار اعلیٰ بجائے خود فوق الانسان اور سیاست خداوندی ہے۔ اشٹال کہتا ہے[۳] کہ "سلطنت کا اقتدار خدا کا اقتدار ہے" نہ صرف اس معنی کر کہ تمام حقوق مثلاً ملکیت، ازدواج، اقتدار پدری سب خدا کے حقوق ہیں، بلکہ اس کے صاف اور قطعی معنی یہ ہیں کہ یہ خدا ہی کا فعل ہے اور وہی اس کو چلاتا ہے۔ سلطنت صرف اسی بنا پر حکمرانی نہیں کرتی کہ خدا نے اسے اقتدار دے رکھا ہے۔ جیسے باپ بچوں پر حکمرانی کرتا ہے

---

[۱] دیکھو اشٹال کا "نظریہ سلطنت" (Staatslehre) کی دوسری اشاعت ج ۲ ف ۴۴ "از منۂ وسطیٰ کے نظری تصور کے موافق عالم عیسوی کے سردار خود خدا کے قائم مقام ہیں اس لئے جملہ حکمران (پوپ، شہنشاہ، بادشاہ) اپنی ذات میں خدا کی طرف سے پورے اختیارات رکھتے ہیں"۔

[۲] دیکھو لوئس چہار دہم کی تصانیف ج ۲ ص ۲۱۷، جہاں یہ تشریح بھی درج ہے "جس ذات نے انسانوں پر بادشاہ مسلط کئے ہیں اس کا منشا یہ ہے کہ بادشاہ کا احترام اس کے نائب کی حیثیت سے کیا جائے صرف یہ اختیار ذات باری نے اپنے لئے رکھا ہے کہ حکمرانوں کے فعل اور ترک فعل پر محاکمہ کرے جو رعایا کی حیثیت سے پیدا ہوا ہے اس کو بے چون و چرا اطاعت کرنا چاہیئے۔ یہی ہے مشیت الٰہی۔

[۳] "نظریہ سلطنت ج ۲ ف ۴۳ دوسری جانب کے لئے میکالے کی عبارت کو دیکھنا چاہیئے جو اس کتاب کے مقالہ ۲ باب ۴ کے حاشیہ (۲) میں منقول ہے۔

بلکہ وہ خدا کی طرف سے حکمرانی کرتی ہے اور یہی باعث سلطنت کے نشان عظمت کا ہے"۔
مگر ایسا کرنا فی الحقیقت حکومت مذہبی کے خیال پر واپس آجانا ہے اور اس کا نتیجہ عملاً یہی ہوتا ہے کہ حکمران خدا کا ذاتی قائم مقام سمجھا جانے لگے اور تمام مفروضات اور خرابیاں جو اس سے وابستہ ہیں، وہ پھر پیدا ہو جائیں۔ یہ ایسا خیال ہے کہ اسٹال خود اسے رد کرتا ہے۔ خود حضرت عیسیٰؑ نے یہ فرما کر کہ "جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو" نہایت ہی واضح اور قطعی طور پر سلطنت کی انسانی خصوصیت ظاہر کر دی ہے، اور سیاسی اقتدار کو مختص خدائی حکمرانی کے مرادف کرنے کے ہر ایک خیال کو مسترد کر دیا ہے۔ اس لئے علم السیاست کا یہ طریقہ بہت اچھا ہے کہ وہ سلطنت کے وجود اور اس کے تنظیمات کو انسانی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔

خدائی حق

۴۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک قائم شدہ نظام سلطنت اور بالخصوص حکمران کی ذات یا اس کا خاندان اس اصول پر ناقابل تبدل قرار دیدیا گیا ہے کہ موجود الوقت اقتدار خدا کی مرضی سے قائم ہوا ہے مگر تمام تاریخ عالم سے یہ ظاہر ہے کہ بیرونی اشکال اور شخصی تعلقات کا ناقابل تبدل ہونا بانی حکومت عالم کا کوئی لازمی جزو نہیں ہے اور پادلوس کی یہ نصیحت کہ حاضر الوقت اقتدار کی اطاعت کرنا چاہئے بجائے خود تنظیمات سیاسی کا قابل تغیر ہونا بالمعنی تسلیم کرتی ہے۔ سترہویں صدی میں یہ نصیحت یقیناً بہت سے متورع انگریزوں کے دلوں میں ایک صادقانہ پیچ و تاب پیدا کر سکتی تھی کہ آیا جیمز ثانی کے ظلم و جور کا مقابلہ کرنا اور اسے تخت سے اتار دینا درست ہوگا یا نہیں، مگر جب ولیم آرنج کو قوم اور پارلیمینٹ نے بادشاہ تسلیم کر لیا تو نہایت ہی محتاط اور باایمان مذہب پرست ٹوری کے لئے بھی اس کی طاقت کو مرضی خدا سمجھ کر اس کا احترام کرنا ممکن ہو گیا (الف)

غیر ذمہ داری

۵ - ذمہ داری کے مسئلے کا بھی یہی حال ہے۔ جو اصول اوپر بیان ہوا ہے اس سے

(الف) [غیر معاہد ٹوریوں نے ولیم سوم کو بادشاہ تسلیم کرنے میں کوئی ایسی علت نہیں کی وہ اس رائے پر قائم رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص عملاً بادشاہت پر قابض ہو وہ قانوناً بھی بادشاہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلنٹلی نے محتاط مذہبی ٹوری کا یہ خیال "ڈاکٹر آف برے" سے اخذ کیا ہے۔ انگریزی مترجم۔]

یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مدبرین، جن کو بہت کچھ تفویض کیا گیا ہے، اور بادشاہ، جن کو اقتدار عطا کیا گیا ہے، اپنے فعل اور ترک فعل کے لئے خدا کے سامنے ذمہ دار ہیں مگر اس اصول سے اس مزید سوال کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا کہ یہ لوگ کسی انسانی منصف کو بھی جوابدہ ہیں یا نہیں اور ہیں تو کس حد تک۔ سلطنت کی اعلیٰ ترین طاقت کے لئے انسانی منصف کے روبرو عدم جوابدہی کا دعویٰ اس وجہ سے نہیں کیا جاتا کہ وہ مخصوص ربانی طاقت ہے بلکہ یہ دعویٰ محض اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے فائق طاقت ہے کسی مدبر کو اس اعتقاد کے بھروسے پر کہ خدا قوموں اور سلطنتوں کی قسمت کو معین کرتا ہے اور اس اعتماد پر کہ خدا کی حکومت ہر حال میں اچھی ہی ہوتی ہے، یہ نہ کرنا چاہئے کہ خدا کو پھنسا کر آپ دامن جھاڑ الگ ہو جائے۔ اس سے تو اور زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری سے اس وقت تک بری نہیں ہو سکتا، جبتک وہ اپنی بہترین طاقت سے ایمانداری کے ساتھ اس کام کو پورا نکرے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے[۱]

فقرہ بعنایت ایزدی کی تاریخ

تعلیق۔ بادشاہوں کے لقب کے ساتھ فقرہ ”بعنایت ایزدی“ کا جو طرّہ لگا ہوتا ہے، اس کی تاریخ قابل توجہ ہے مختلف اوقات میں اس کا مفہوم مختلف رہا ہے۔

(**الف**) یہ فقرہ بالتخصیص از منۂ وسطیٰ میں استعمال ہوتا تھا۔ فرنگی بادشاہ فقرات ذیل اول بدل کے استعمال کیا کرتے تھے: ”بفضل خدا“، ”خدائے نگہبان کے حکم سے“، ”خدائے مہربان کے فضل سے“، ”خدا کے رحم و فضل سے“، ”مراحم ربانی سے“۔ اس زمانے میں ان فقروں کا مفہوم صرف اس قدر ہوتا تھا کہ بادشاہ کی طرف سے خدا کے حضور میں عاجزانہ تقدیس اور مذہبی امتنان کا اظہار ہو کیونکہ وہ اپنی ذاتی رفعت کو خدا ہی کی طرف منسوب کرتے تھے۔ شاہ پپن جسے ایک انقلاب کی وجہ سے بادشاہی حاصل ہوگئی تھی ان متداول فقروں کا استعمال اسی طرح کرتا تھا جس طرح اس کا بیٹا چارلس اعظم کرتا تھا۔

---

[۱]۔ لمارتین اپنی تصنیف ”۱۸۴۸ء کا انقلاب“ (Revolution de 1848) ج ۱، ص ۴۰ میں خود اپنے متعلق کہتا ہے اور خوب کہتا ہے: ”لمارتین نے خدا اور انسانوں پر اس بار کو ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اب اپنے تئیں اس غلطی پر سخت ملامت کرتا۔ یہ نہایت سخت ناانصافی ہے کہ جو چیز خدا نے انسان پر عائد کی ہے، یعنی ذمہ داری، انسان الٹا اسے خدا پر ڈال دے۔ یہ گویا خدا سے لڑنا ہے۔“

فرانکی دور میں ان سے فرمانروایانہ قوت کا اظہار نہیں ہوتا تھا اساقفہ اور روسائے خانقاہ اگرچہ قانوناً بادشاہ کے منتخب کردہ یا مقرر کردہ ہوتے تھے اور دنیاوی کاونٹ اگرچہ شاہی عہدہ دار ہوتے تھے مگر یہ لوگ بھی اپنے القاب کے ساتھ یہ فقرے لگا دیا کرتے تھے۔

(ب) اجزائی رومی امتوں کی شہنشاہی میں یہ فقرہ اولاً اسی طریقے پر جاری رہا۔ یہ صرف منتخب شدہ بادشاہ بلکہ ڈیوک اور کاونٹ جو بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے اور اسافقہ اور رؤسا خانقاہ سب کے سب یکساں طریقے پر عنایت ایزدی کو مسلّم سمجھتے تھے۔ بعض اوقات دنیاوی امرا عنایت خدا کے ساتھ "عنایت شہنشاہ" کا اور مذہبی امرا "عنایت پوپ" کا بھی اضافہ کر لیتے تھے مگر آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ عنایت خدا کے فقرے کے مخصوص معنی یہ سمجھے جانے لگے کہ یہ اقتدار بلا توسط اور براہ راست خدا سے حاصل ہوا ہے اور کسی ماتحت کا حاصل شدہ اختیار ایک شئے جداگانہ ہے۔ اس فقرے کو ازمنۂ وسطیٰ کے اس میلان سے بہت زیادہ مناسبت تھی کہ تمام اقتدار خدا سے حاصل ہوا ہے۔

(ج) "اصلاح" کے بعد لوتھر کے ماننے والے عالموں نے پادلوس کے اس قول کو کہ "موجودہ اقتدارات خدا کی مرضی سے قائم ہوئے ہیں" عیسوی معتقدات میں داخل کر دیا اور صاحبان اقتدار کو خدا کا مقرر کردہ قائم مقام ثابت کرنے لگے۔ لوتھر خود اس معاملے میں بہت زیادہ آزاد خیال تھا اس نے ایک مرتبہ ہنری ہشتم شاہ انگلستان کو لکھا تھا کہ "مارٹن لوتھر کی جانب سے بعنایت ایزدی اہل کلیسا میں داخل ہے ہنری کو جو خدا کی عدم عنایت سے انگلستان کا بادشاہ ہے"۔ جن مذہبی عالموں نے محض الفاظ کو پکڑ رکھا تھا انھوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ رسول پادلوس نے یہ قول رومی شہنشاہ نیرو کی نسبت کہا تھا جسے رومی قوم کی طرف سے اختیار حاصل ہوا تھا اور اس قول سے پادلوس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اُن مذہب پرست یہودی صفت عیسائیوں کی رائے کی مخالفت کرے جو اس کافر شہنشاہ سے متنفر تھے۔ انھوں نے اس واقعے کو نظر انداز کر دیا کہ رسول پطرس نے جب عیسائیوں کو انسانی حکومت کی اطاعت کی صلاح دی ہے تو اس کا بھی بالکل یہی منشا تھا (پطرس باب دوم درس ۱۳)۔ وہ اس امر پر نازاں تھے کہ وہ دنیاوی بادشاہوں کے خدائی اختیار کے محافظ ہیں۔

(د) فرانس کے لوئس چہار دہم اور انگلستان کے جیمس دوم نے اس سے بھی

زیادہ قطعی طور پر "عنایت خدا" کو ایک سیاسی اعتقاد بناکر بادشاہ کی مطلق العنانی کے لئے ایک اعلیٰ منظوری حاصل کرنا چاہی۔ "ملک" "خاندان" "پارلیمنٹ" غرض تمام انسانی حقوق کے برعکس بادشاہ کے اقتدار کا بالتخصیص خدا کی طرف سے ہونا چاہا جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے اختیار مطلق حاصل ہو جائے یعنی وہ انسانی قانون کے دست رس سے بالاتر قرار دیدیا جائے اس اثنا میں فرانسیسی طبقات نے بادشاہ کے منجانب اللہ ہونے کو از روئے قانون مان لینے سے انکار کیا اور انگریزی پارلیمنٹ نے اور بھی زیادہ زور کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ انگلستان کے انقلاب ۱۶۸۸ء اور فرانس کے انقلاب ۱۷۸۹ء نے اس مذہبی اصول کو قطعی طور پر مسترد کر دیا۔

(ھ) اس اصول کے نہایت مسلم دشمن جرمنی کے اہل قلم پفنڈرف اور تھوماسیئس تھے مگر اس کا سب سے زیادہ مخالف فریڈرک اعظم تھا۔ جس نے یورپی سیاسیات کی اس اصولی غلطی کو سمجھ لیا تھا۔

(و) زمانۂ حال میں اسٹال نے اس غلط خیال کو از سر نو جامۂ قبول پہنانے کی کوشش کی ہے اور مطلق العنان بادشاہ کی شخصیت کو مرجع اختیار قرار دینے کے بجائے اختیار کو فی نفسہ ایک خدائی حق بتاکر اسے از سر نو نظریہ سلطنت میں خفیہ طور پر داخل کر دینے کی کوشش کی ہے مگر یہ فعل عبث ہے دنیائے جدید اس کمزور خیال کے بے نتیجہ رشحات سے ہرگز فریب میں نہیں آسکتی۔

آٹھواں باب

(۳۴) نظریۂ جبر

قوت ہی حق کی دلیل ہے

سلطنت قہری تسلط کا نتیجہ ہے اور اس کی بنا زیادہ قوت رکھنے والے کے استحقاق پر ہے۔ اکثر فلسفی اور ان سے بھی زیادہ مطلق العنان بادشاہ یہی باور کرانا چاہتے ہیں[۱]۔ یہ اصول موضوعہ مطلق العنانی کے لئے مفید ہے کیونکہ اس سے ہر زیادتی حق بجانب ثابت ہو سکتی ہے مگر انقلاب پسند جس وقت اتنی قوت حاصل کر لیں کہ علانیہ اسے استعمال کر سکیں تو ان کی غرض بھی اسی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حق کو پامال کرنے والی جابرانہ قوت اکثر اسی کو پسند کرتی ہے۔ یہ ایک طرح کا مغالطہ ہے جو صرف طاقتوروں کو پسند ہے۔ وہ اس سے کمزوروں کو تباہ کر سکتے ہیں اگر انہیں دھوکا نہیں دے سکتے۔ جو شخص اس اصول کا حامی ہو وہ اس کے فریب میں آ سکتا ہے۔ دوسرے لوگ اس فریب میں نہیں آ سکتے

کیا تاریخ کی تصدیق ہے

کہا جاتا ہے کہ تاریخ سے اس رائے کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔ بیشک سلطنتوں کے قائم کرنے میں ہمیشہ سے زیادہ جبر کا اظہار ہوتا ہے مگر ایسا بہت کم ہوا ہے کہ محض جابرانہ

۱۔ پلوٹارک نے سوانح کیملوس باب ۱۷ میں یہ فقرہ شاہ گال کی زبان سے یہ نظریہ ادا کیا ہے کہ "تمام قوانین میں سب سے قدیم تر قانون جو خدا سے لیکر بہائم تک وسیع ہے، قوی کو کمزور پر حکمراں بناتا ہے"

قوت نے خاص اپنے زور سے سلطنتیں قائم کر دی ہوں اور ایسا ہوا بھی ہے تو ایسی سلطنتیں کبھی وسیع اور دیرپا نہیں ثابت ہوئی ہیں۔ علی العموم نئی سلطنتوں کے قیام میں اگر قوت کو خاص کر جنگ کی صورت میں دخل ہوا ہے، تو بھی یہ طاقت ہر طرح پر اصل دعاوی حق کے تابع تھی، وہ خود حق کا مخرج نہیں تھی بلکہ اس نے صرف ان موانعات کو رفع کر دیا تھا جو حق بحقدار رسید" میں حائل تھے۔ قوت نے حق کو پیدا نہیں کیا بلکہ اس کی تائید کی اور اس کے تسلیم کئے جانے پر لوگوں کو مجبور کیا۔ تاریخ میں جہاں کہیں قوت اپنی وحشیانہ سختی کے ساتھ رونما ہوئی ہے وہاں یہی ثابت ہوا کہ اس میں کسی نئی چیز کے پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے بلکہ وہ بنی بنائی چیزوں کے بگاڑنے کا اور موت و تباہی کا ایک آلہ ہے۔

یہ اصول موضوعہ شخصی آزادی کے خیال کا نہایت ہی سخت مخالف ہے۔ یہ اصول صرف آقا اور غلام کو جانتا ہے۔ آزاد شخص سے آزاد شدہ شخص مراد لیتا ہے۔ اسی طرح یہ اصول حق اور قانون کے خیال کا بھی سختی کے ساتھ مخالف ہے، اس لئے کہ قانون میں ارزوعات اور اخلاق کو بہت زیادہ دخل ہے اور برخلاف اس کے اصول مذکور، ظاہری قوت کی وحشیانہ برتری کو تخت حکومت پر متمکن کرتا ہے۔ طاقت محض کو حق کی خدمت گزار بننا چاہیئے۔ پس اگر وہ خود حق بننے کا ادعا کرے تو وہ اپنے مالک کے خلاف سرکشی کرتی ہے[علہ]

اس اصول میں صداقت کا جزو

تاہم اس اصول کی غلطیوں میں بھی کسی قدر صداقت کا شائبہ مضمر ہے۔ سلطنت کے لئے جو اجزا لابدی ہیں ان میں سے ایک جزو یعنی قوت کو یہ اصول نمایاں کرتا ہے اور مخالف نظریے کے مقابلے میں، جو سلطنت کی بنا افراد کی آزادانہ مرضی پر قرار دیتا اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سلطنت کی اقتداری طاقت سلب ہو جاتی ہے، یہ اصول گو نہ حق بجانب ہے۔ یہ اصول ظاہری صورت کی حقیقت اور لاحق حالات پر زیادہ زور دیتا اور محض خیالی خوابوں کے

علہ۔ اشمٹ ہنر د "علم السیاست" ج ۱، ص ۳۱ میں اس بحث سے متعلق روسو کے اس نفیس مقولے کو نقل کیا ہے کہ "قوی سے قوی بھی اپنی قوت کا سکہ سلطنت کے معاملے میں نہیں بٹھا سکتا جب تک کہ اس میں یہ قابلیت نہ ہو کہ اپنی قوت کے غلبے کو قانون اور محکوموں کی اطاعت شعاری میں مبدل کر سکے"۔ (دیکھو روسو کی کتاب "معاہدہ معاشرتی" (Contract Social ج ۱، ص ۳

پورا کرنے کی عبث کوششوں کے خلاف (جہاں فطرتی قوتوں کے آپس میں تصادم ہوتا ہو) متنبہ کرتا ہے۔

طاقت کے بغیر نہ کوئی سلطنت وجود میں آسکتی ہے اور نہ قائم رہ سکتی ہے۔ اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کی ضرورتوں کے لئے طاقت کی حاجت ہے۔ طاقت جب پائدار اور دیرپا صورت پیدا کرلیتی ہے تو پھر وہ حق کے ساتھ واسطہ پیدا کرنا چاہتی ہے اور اکثر وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے یعنی وہ حق کے ذریعے سے خود کو تسلیم کرانا اور پاک اور محترم بنانا چاہتی ہے۔ حق کے بغیر قوی کا زور محض بہائم کا سا زور ہے؛ وہ ایک بھیڑیا ہے جو بکری کو پھاڑ کر ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ مگر حق سے مل کر یہی زور انسان کی اخلاقی طبیعت کے سزاوار ہو جاتا ہے۔

نواں باب

(۴) نظریۂ معاہدہ

معاہدہ عمرانی کا نظریہ

خاصکر روسو کے وقت سے اس نظریے کو بہت وسیع قبول عام حاصل ہوگیا ہے کہ سلطنت ناس معاہدے یعنی باشندوں کے آپس کے قرارداد کا نتیجہ ہے۔ اس سے لوگوں کے عجیب و غریب مگر بڑی شدید ملکی کیونکہ ہر شخص اپنے تئیں ایک بانی سلطنت خیال کرسکتا تھا۔ یہ نظریہ ہر شخص کی خواہش کے موافق ہوسکتا تھا کیونکہ ہر شخص جس طرح چاہتا اس معاہدے کے شرائط کی تاویل کرسکتا تھا۔ فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں اس نظریے کو نہایت ہی مہلک اقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ اس کی مدد سے تمام سیاسی صور و اشکال شکست کردئے گئے اور مختلف طرح سے کوششیں کی گئیں کہ اس کھنڈر پر ایک ایسی نئی عمارت تعمیر ہو جس سے ہر شخص راضی ہوسکے مگر کبھی اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اگرچہ نظریہ انقلاب کا نہایت مقبول اصول تصور کیا جاتا ہے تاہم اس سے قبل اس نظریے سے مطلق العنان حکومت کی حقیقت ثابت کرنے کا کام بھی بارہا لیا جاچکا تھا (الف)۔

(الف) [یہ مدنظر رکھنا چاہئے کہ ہابس، لاک اور روسو نے نظریۂ معاہدہ کو مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے ہابس کی رائے کے موافق لیوی یاتھن باب ۱۸ انسان حالت فطرت سے حالت معاشرت میں صرف اسطرح

نظریۂ جبر (قوت) کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا عکس یہاں صادق آتا ہے۔ نظریۂ جبر عام طور پر قوت کی مطلق العنانی کا موید ہے مگر مستثنیٰ صورتوں میں انقلاب کے نتائج کے لئے اسے عذراً پیش کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے نظریۂ معاہدہ خصوصیت کے ساتھ لاحکمیت کا معاون ہے، مگر مستثنیٰ صورتوں میں وہ قلیل التعداد گروہوں کو دبانے میں مطلق العنان کثیر التعداد گروہوں کا مطلق العنان کثرت کے قلت پر زیادتی یا اطاعت پذیر مفتوحوں پر ظلم کرنے کے معاملے میں فاتح کا مددگار بھی ہوتا ہے۔

یہ نظریہ واقعات تاریخی کے خلاف ہے

یہ نظریہ اپنی ہمہ گیر صحت کا دعویدار ہے اس نظریے کی رو سے تمام سلطنتوں کا وجود میں آنا اور بعض امور کے لحاظ سے ان کا قائم رہنا بھی معاہدے پر منحصر ہے۔ مگر تاریخ میں جس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) آتے ہیں کہ وہ اپنے حقوق کسی ذی اختیار (بادشاہ) کو سپرد کر دیں (یہ ذی اختیار شخص ایک ہو، چند ہوں یا کثیر التعداد ہوں)۔ لاک (رسائل حکومت "کتاب دوم باب ۶ دفعہ ۶ میں) حقوق یعنی آزادی اور ملک کو ایسا قرار دیتا ہے کہ وہ حالت فطرت میں موجود ہیں۔ پھر "ابتدائی اجتماع" کے ذریعے سے حکومت کی ایک شکل قائم کی جاتی ہے تاکہ یہ حقوق محفوظ ہو جائیں (یہ مدنظر رہے کہ لاک اجتماع کا لفظ استعمال کرتا ہے نہ کہ معاہدے کا)، روسو کے خیال کے موافق انسان حالت فطرت سے حالت معاشرت میں معاہدۂ معاشری کے ذریعے سے آتا ہے (یہی نظریہ ہابس کا ہے)، مگر یہاں وہ "ذی اختیار" جسے سب اپنے حقوق تفویض کر دیتے ہیں وہ خود قوم ہے پس اس طرح ہر شخص بادشاہ بھی ہے اور رعایا بھی (دیکھو اس کی تصنیف "معاہدۂ معاشری" (Contrat social) ج ۱، باب ۶) یہ اقتدار فرمانروائی ناقابل انتقال ہے (جلد ۲، باب ۱) حکومت معاہدے سے نہیں قائم ہوتی (ج ۳، باب ۱۶) بلکہ حکومت صرف مرضی عامہ کو عمل میں لاتی ہے۔ اس طرح ہابس کے قول کے موافق حکومت موجودالوقت کے خلاف جسے وہ بادشاہی کے مرادف قرار دیتا ہے کسی قسم کا انقلاب حالت فطرت اور لاحکومیت کی طرف بازگشت کرتا ہے، اور یہ کسی طرح جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لاک کے قول کے موافق انقلاب اس وقت حق بجانب ہو سکتا ہے، جب حکومت اپنے کار مفوضہ یعنی آزادی شخصی کی حفاظت کرنے سے معذور ہو جائے۔ روسو کے قول کے موافق انقلاب صرف وزارت (قوت عاملہ) کا تغیر ہے۔ عام خیال کے بالکل برعکس لاک حکومت اور رعایا کے کسی معاہدے کا مطلقاً کوئی ذکر نہیں کرتا، اس کا نظریہ قریب قریب وہی ہے جو روسو کا ہے۔ ٹی۔ ایچ گرین کے تصانیف جلد ۲ ص ۳۶۶-۳۶۲۔ انگریزی مترجم]

تکوینِ سلطنت کے متعلق ہمارے لئے معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ مہیا کر دیا ہے ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس میں فی الواقع افراد کے باہمی قراردادوں اور معاہدوں سے کوئی سلطنت پیدا ہوئی ہو البتہ بعض منفرد مثالیں ایسی ہیں کہ دو یا زائد سلطنتوں کے درمیان ایسے معاہدے ہوئے ہیں جن سے ایک نئی سلطنت پیدا ہوگئی۔ ایسی بھی چند صورتیں موجود ہیں جن میں بادشاہوں یا سرداروں نے قوم کے مخصوص درجات یا طبقات کے معاہدے سے نئے نظامِ سلطنت قائم کر لیئے ہیں مگر ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس میں تجارت یا بیمے کی کمپنی کی طرح ملک کے "ہم رتبہ" شہریوں نے شرکت باہمی سے کوئی سلطنت قائم کر لی ہو اس خیال کی بھی تاریخ سے کسی طرح تائید نہیں ہوتی کہ بقائے سلطنت افراد کے درمیان مسلسل تجدیدِ معاہدہ پر منحصر ہے بلکہ بجائے اس کے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر فرد رکن سلطنت کی حیثیت سے پیدا ہوتا اور تربیت پاتا ہے اور قبل اس کے کہ وہ اس حد کو پہنچے کہ اپنی کوئی رائے قائم کر سکے اور اس رائے کو ظاہر کر سکے، اس کی پرداخت، نشو و نما اور تعلیم معین قومی اور ملکی خصائص کے موافق پوری ہو چکتی ہے۔

پس تاریخ کی شہادت قطعاً اس نظریئے کے خلاف ہے۔ جس زمانے میں معاہدہ معاشری کے اصول کے ماننے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں تھے اور یہ نظریہ اپنے اثر میں نہایت کامل تھا، اس زمانے میں بھی اسے کبھی یہ قدرت نصیب نہیں ہوئی کہ فطرت کی واقعیت پر جس سے وہ متناقض تھا غالب آگیا ہو۔ یہ البتہ ہوا کہ قوم "آزاد اور ہم رتبہ شہریوں" میں منقسم ہوگئی تھی مگر قلت کی ابتدائی مجالس تک میں کثرت کے ساتھ میزان نہ بٹی اور کثرت اس طرح غالب رہی گویا اس کی مرضی کو فوقیت ہے اور صرف اسی کی مرضی کو اقتدار حاصل ہے نظامِ سلطنت کو وضع کرنے والی عام مجلس (Constituent assembly) کے نسبت بیشک یہ خیال کیا گیا تھا کہ وہ ملک کے جملہ باشندوں کی قائم مقام اور ان کی پسند کردہ ہے اور اس کا مفوضہ کام یہ تھا کہ وہ بالاتفاق ایک نظامِ حکومت قرار دے، اس میں بھی انفرادی معاہدے کے بجائے طریق کار نے یہ صورت اختیار کی کہ ایک متحدہ جماعت ہر کام کا فیصلہ کر لیتی تھی۔ لوگوں نے معاہدے کا ایک "وہم" پیدا کر لیا تھا اور خود اپنے کو اور دوسروں کو افراد کی مرضی کہہ کہہ کر دھوکا دیتے تھے حالانکہ کثرت سب کی طرف سے آلہ کار بن کر اختیارات کو اس طرح کام میں لا رہی تھی کہ یہ اختیارات اکثر ناقابل برداشت

ظلم کی حد کو پہنچ جاتے تھے۔[1]

یہ نظریۂ منطق کے بھی خلاف ہے

یہ نظریہ جس طرح تاریخ سے غلط ثابت کیا گیا اسی طرح معقولی تنقید کے سامنے بھی وہ نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ نظریہ معاہدہ کرنے والے افراد کی آزادی اور ان کی مساوات کو مسلم سمجھتا ہے، مگر سیاسی آزادی جو یہاں پہلے ہی مان لی گئی ہے صرف سلطنت کے اندر ہی ہو سکتی ہے، سلطنت سے باہر اس کا ہونا خیال میں بھی نہیں آسکتا۔ یہ ضرور ہے کہ انسان میں اس آزادی کا شوق بالکل اسی طرح موجود ہوتا ہے جس طرح اس میں سلطنت کے ولولے اور اس کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے مگر اس آزادی کا عملی حصول سلطنت کے عضوی تعلقات باہمی کے باہر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مزید براں اگر انسان سب برابر ہوتے تو سلطنت کبھی وجود میں نہ آسکتی اس لئے کہ (سیاسی) مراتب کی غیر مساوات، جس کے بغیر نہ کوئی حاکم ہو سکتا ہے نہ محکوم ہو سکتا ہے، سلطنت کے وجود کے لئے ایک لازمی شرط ہے[2]۔ مزید براں اس نظریے کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ افراد کو معاہدہ کرنے والا فرض کرتا ہے۔ افراد اگر معاہدہ کرتے ہیں تو اس سے شخصی حقوق پیدا ہوتے ہیں سلطنتی حقوق ہرگز نہیں پیدا ہوتے۔ ایک منفرد شخص کی حیثیت سے کسی کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی ذاتی املاک اور اس کا شخصی مقبوضہ ہوتا ہے۔ اس پر اسے پورا اختیار ہے اور اس کے متعلق وہ جو چاہے معاہدہ کر سکتا ہے۔ مگر معاہدوں کو سیاسی نوعیت اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتی جب تک کہ پہلے ہی سے افراد سے بالاتر ایک متحد الاغراض جماعت نہ موجود ہو کیونکہ معاہدہ اگر سیاسی ہوتا ہے تو وہ افراد کی ذاتی بہبود سے بحث نہیں کرتا بلکہ جماعت کی عام بہبودی سے بحث کرتا ہے۔

غرضکہ افراد کے باہمی معاہدے سے نہ کوئی قوم پیدا ہو سکتی اور نہ کوئی سلطنت، انفرادی مرضیوں کے مجموعے سے کوئی مشترک مرضی نہیں پیدا ہوتی۔ شخصی حقوق کتنی ہی بڑی تعداد میں کیوں نہ ترک کر دئے جائیں مگر ان سے کوئی حق عامہ نہیں پیدا ہوتا۔

---

[1] روسو (ج ۱، ص ۷) ایک ابتدائی اتحاد رائے کو فرض کرتا ہے جس سے اس کے خیال میں بعد کو کثرت کا قانون پیدا ہوا، اگرچہ یہ فرضی شکل بھی تناقض کو رفع نہیں کرتی۔

[2] ارسطو "سیاسیات" (جلد ۲-۱، ۴)

یہ نظریہ عملاً خطرناک ہے

عملی سیاسیات کے لئے یہ اصول نہایت درجہ خطرناک ہے کیونکہ یہ اصول سلطنت اور اس کی تنظیمات کو افراد کی حرص و ہوس کا ایک شگوفہ بنا دیتا ہے اور موجود الوقت افراد کی مرضی کے موافق اسے قابل تغیر قرار دے دیتا ہے۔ یہ قانون عامہ کے تصور کو تباہ کر دیتا ہے، باشندگان ملک کو غیر آئینی حرکات کے لئے اکساتا ہے اور سلطنت کو غایت درجے کی بے اطمینانی اور ابتری کے لئے وقف کر دیتا ہے اس لئے اسے ایک سیاسی اصول سمجھنے کے بجائے لاحکومیت کا نظریہ سمجھنا زیادہ موزوں ہے۔

تاہم اس میں صداقت کا کچھ عنصر بھی ہے

بایں ہمہ اس نظریے میں بھی صداقت کا کچھ عنصر مضمر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نظریے کی غلطی سخت دھوکے میں ڈالنے والی اور نہایت ہی خطرناک ہے پھر بھی اسی کے اندر ایک ایسی سچائی بھی چمک رہی ہے جو ہر شخص کو دکھائی دے رہی ہے۔ اس نظریے کے مقابلے میں جو سلطنت کو محض فطرت کی پیداوار سمجھتا ہے یہ نظریہ اس امر واقعی کو ابھارتا ہے کہ انسانی مرضی سلطنت کی تکوین کو متعین و متاثر کر سکتی ہے اور اس کا ایسا کرنا ایک جائز فعل ہے خلاف عقل استبداد کے مقابلے میں یہ نظریہ انسانی آزادی کے حقوق کی حمایت کرتا ہے اور سلطنت کے مطابق عقل ہونے کو ثابت کرتا ہے۔

تعلیقات

۱۔ ارسطو کے اس مشہور جملے سے کہ سلطنت منفرد شہریوں سے اسی طرح سابق ہے جس طرح کل، جزو سے سابق ہے (''سیاسیات''، ج ۱، فصل ۲، فقرہ ۱۲) اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ افراد سلطنت کو پیدا کر سکتے اور بنا سکتے ہیں۔ ایک سیاسی فرد یا شہری جسم سلطنت کا صرف ایک عضو ہے اور کل سے علٰحدہ ہو کر اس کی کوئی ہستی عضوِ سلطنت کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکتی۔

۲۔ سلطنت کو افراد کی مرضی پر مبنی جاننے کی غلطی کا تعلق ایک دوسری غلطی سے ہے جو بہت زیادہ رائج ہے اور جس میں وہ لوگ بھی جو نظریۂ معاہدہ کو مبتذل سمجھتے ہیں اکثر مبتلا ہیں یعنی یہ فرض کر لینا کہ حق یا قانون، ''آزاد مرضی'' ہی کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی آزاد مرضی کو یہ قدرت ہے کہ وہ بعض حالتوں میں حق یا قانون کو وضع کرے، بدلے یا اسے نئی شکل میں ڈھالے لیکن حق و انصاف کا بیشتر حصہ نظم عالم فطرت انسانی اور حالات ماحول کے بموجب ازل سے متعین ہو چکا ہے اور انسانی مرضی سے ''کلیتہً'' آزاد ہے۔ حق کا سب سے زیادہ حصہ وہ ہے جو ایجاد نہیں کیا جاتا بلکہ منکشف ہوتا ہے اور لوگ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ وہ دستیاب ہو جاتا ہے، بنایا نہیں جاتا۔ قانون کے پیدا کرنے میں ''ہم چاہتے ہیں'' کے بجائے ''تمہارا فرض ہے'' زیادہ موثر ہے۔ ہیگل نے حق کا استخراج مخصوص انفرادی مرضی سے نہیں بلکہ ''مرضی صادق'' سے کیا ہے جو انسان کے اندر مرکوز اور از خود قائم ہے، لیکن اس نے بھی

حق کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھا نہیں ہے گو کہ نظریۂ معاہدہ کی غلطی کو اس نے پوری طرح سے سمجھ لیا ہے دیکھو فلسفۂ حقوق" (Rechtsphilosophie)، فقرہ ۲۵۸) ۳ جنیوا (ژنیو) کے شہری) روسو نے اپنی قوت مناظرہ کے زور سے عام رائے میں نظریۂ معاہدہ کو فتحمند کر دکھایا۔ ایک دوسرے سوئس یعنی شہر برن (سوئٹزرلینڈ) کے پیٹریسی لڈوگ فون ہلر نے مروجہ عقیدۂ قانونِ فطرت پر بہت شدومد سے حملہ کیا اور نظریۂ معاہدہ کو پوری طرح سے باطل ثابت کر دکھایا لیکن اسے اپنے طریق کے مثبت حصے میں جسے وہ "رجعت" کہتا تھا کم کامیابی ہوئی۔ اس کے اصول کو نظریۂ قوت میں خلط ملط کر دینا اور اسے ہر طرح کی مطلق العنانی کا موئید سمجھنا حق بجانب نہیں ہے۔ بلکہ جسطرح روسو انقلاب کا معلم ہے اسی طرح وہ رجعت قہقری کا معلم ہے۔

ہلر سلطنت کی بنیاد اس فطری قانون پر قائم کرتا ہے کہ قوی تر حکمراں ہوتا ہے۔ ساری حکومت اور ساری ماتحتی کا انحصار وہ ایک کی فوقیت اور دوسرے کی حاجت پر قرار دیتا ہے اسے وہ خدا کا ایک ابدی اور نہ بدلنے والا نظم جانتا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک قوت جبر کے ہم معنی نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں کے فرق کو وہ زیادہ تفصیل کے ساتھ یوں بتاتا ہے: "قوت کو احساسِ فرض کے اس اخلاقی قانون نے محدود کر رکھا ہے جسے خدا نے انسانوں کے دلوں پر نقش کر دیا ہے جس کا اظہار بچوں کی قوت امتیازی سے اور نیز تمام قوموں میں تمام وقتوں میں ہوتا رہتا ہے وہ اخلاقی قانون یہ ہے کہ بدی سے بچو اور نیکی کرو اور کسی کو صدمہ نہ پہنچاؤ، اور جو جس کا ہے وہ اسی کے پاس رہنے دو' 'قانون عدل' اور 'قانون الفت' طاقت کو تعدی کی شکل اختیار کرنے سے بچاتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں قانون خدا نے انسان کے اندر جما دئے ہیں وہ اس کی پیدائشی صفت ہو گئے ہیں اور وہ عالمگیر اور لابدی ابدی اور ناقابل تغیر ہیں۔ ہر شخص انھیں سمجھ سکتا ہے اور جس بلند ترین اور قوی ترین شخص کے تابع تمام انسانی قوانین ہوں اسے بھی کوئی شخص ان قوانین کی پابندی سے آزاد نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ قوانین نہایت ہی نرم اور نہایت ہی محبت آمیز بھی ہیں' ان کی پابندی آسان اور ان کا بار ہلکا ہے۔ اس فرض شناسی کے قانون کی بنیاد نہ تو تمام قوم کی مرضی ہے' نہ عام نفع کا خیال' نہ کسی انسانی زیادتی کا خوف' بلکہ صرف خدا کی مرضی اس کی اصل ہے اور اس وجہ سے صاحب قوت پر اس کا پورا پورا اطلاق ہوتا ہے۔ اس سے کسی طرح بھی تجاوز کرنا قوت کے ناجائز استعمال کی حد میں داخل ہو جاتا ہے' خواہ اس کا ارتکاب کسی چھوٹے سے خاندان

کے بزرگ سے ہو یا کسی بڑے سے بڑے، بادشاہ سے۔ اس سے عدل و حمیت کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ عدل کا مطالبہ قوی سے اسی طرح ہونا چاہیئے جس طرح کمزور سے۔ محبت اور بخشش طبیعت انسانی کا شریف ترجزو ہے اور انسان سے اس کی توقع کی جانا چاہیئے۔ اعلیٰ ترین طاقت کی امکانی غلط روی کا کوئی چارۂ کار انسانی انتظامات کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ بادشاہ کے مقابلے میں کوئی انسانی حکم نہیں ہے۔ سوا خدا کی مدد کے اور کوئی علاج نہیں ہے۔ بقول پلوٹارک کے خدا کا اعتقاد ہی تمام انسانی نظم معاشرت کا واسطہ و رابطہ اور عدل کا پشتیباں ہے۔ صرف مذہب ہی وہ شئے ہے جو قوت کو اس کی حد کے اندر رکھ سکتی ہے اور کمزور کی تقویت کا باعث ہوسکتی ہے۔

ہلر کے اصول (مسلمات) کے خاص مباحث کو ہم نے اسی کے الفاظ میں ادا کر دیا ہے یہ عجیب بات ہے کہ وہ حق کو اور سلطنت کو عدل پر نہیں بلکہ قوت پر مبنی کرتا ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے لئے ایک حد بندی سمجھتا ہے۔ اس کی رائے میں قوت اور صرف قوت ہی سے حق کا ظہور ہوتا ہے جس قدر قوت بڑھی ہوئی ہوگی اسی قدر حق بھی بڑھا ہوا ہوگا گو اس کے برخلاف اصلیت یہ ہے کہ قوت بجائے خود واقعتاً ضرور ایک شئے ہے مگر قانوناً مسلم نہیں ہے۔ یہی سلسلۂ خیال ہلر کے سارے نظام استدلال میں جاری وساری ہے۔ طاقت واقعی کے احترام کی وجہ سے وہ اکثر قانون کی انتہائی اخلاقی خصوصیت کے دیکھنے سے باز رہجاتا ہے۔ اعلیٰ ترین طاقت اور بادشاہ کے حق کو ہر طرح کی مدافعت سے محفوظ کرنے کی خواہش سے رعایا کی ان تمام کوششوں کی طرف سے جو اس اعلیٰ طاقت کے غلط استعمال کے خلاف ہوں اور اس کے عملدرآمد کو محدود کرنا چاہیں ایک طرح کی حقارت و نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسانی تطاول کے مقابلے میں انسانی انتظامات کے ذریعے سے خدائی قانونِ فرض کی حفاظت کرنا ایک جرم ہے، اس لئے ہلر تمام آئینی طریق کا مسلمہ مخالف ہے اور از منہ وسطیٰ کے اس خیال کی کہ شاہی ایک مِلک ہے وہ نہایت غلو کے ساتھ تدوین کرتا ہے۔

[بلنچلی کی اس باب کی تنقید کے لئے فوہوکے کی علم معاشرت

ہم عصر" (A. Fouillee La Science Sociale Contemporaine)
باب اول دیکھنا چاہیے موسیو تو ہیے معاہدۂ معاشرتی کے نظریے" کی اس
خیال سے حمایت کرتا ہے کہ اس سے کامل ترین سلطنت کا اظہار ہوتا ہے
انگریزی مترجم۔]

دسواں باب

(۵) انسان کی فطری تمدن پذیری اور اس کا سیاسی احساس

سلطنت فطرت انسانی کے وجدان معاشری سے پیدا ہوتی ہے

مروجہ تخمینی نظریوں کا مسترد کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ ضرورت ہنوز باقی ہے کہ ہم سلطنت کے اشکال ظاہری کی متعدد ہیئتوں سے ممیز اس ایک سبب کو دریافت کریں جس سے سلطنت کی تکوین ہوئی ہے۔ یہ مشترک سبب جو تمام تکوین سلطنت کی علت العلل ہے ہمیں انسانی فطرت میں ملتا ہے فطرت انسانی میں اس کے انفرادی اختلافات کے ساتھ ساتھ اجتماع واتحاد کے میلانات بھی موجود ہیں یہ میلانات ترقی کرتے ہیں اور لوگوں (People) میں ایک قوم بننے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس احساس کے مناسب حال ایک ظاہری صورت قائم ہو جائے۔ پس اس طرح معاشرت کا یہ باطنی وجدان ایک مردانہ خود اختیاری حکومت کی صورت میں مشترک زندگی کا ایک بیرونی نظم پیدا کر دیتا ہے یعنی اس سے سلطنت کی شکل رونما ہو جاتی ہے۔

یہ معاشری وجدان غیر قوتی درجہ سے گزر کر قوتی درجہ پر آجاتا ہے

سلطنت بنانے کا یہ معاشری میلان ابتداءً محض جبلت کی بنا پر عمل کرتا ہے ارادے کو اس میں دخل نہیں ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں کی نظریں ایک ساتھ کسی ایسے سردار پر پڑتی ہیں جس کی اعلیٰ ہمت اور دماغی قابلیت کے وہ قائل ہوتے ہیں اور اپنی جماعت کے اعلیٰ فرد کی حیثیت سے اس کی عزت کرتے ہیں اور وہ اس پر بھروسا بھی رکھتے ہیں

اور اس سے ڈرتے بھی ہیں۔ پس وہ اس کے تحت میں خود کو منتظم کرتے اور اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔ مگر تمدن اور تجربے کی ترقی کے ساتھ پوشیدہ وجدان بتدریج ظاہر ہونے لگتا ہے اور سلطنت کے لئے وقوف وارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک طبعی امر ہے کہ اولاً اس کا احساس قوم کے رہبروں اور سرداروں ہی کو ہوتا ہے ان میں سلطنت کا مستعد انہ وقوف اور اس کے لئے منتظم و موثر ارادہ پیدا ہو جاتا ہے مگر عام محکومین ہنوز سلطنت کے انفعالی وقوف سے آگے نہیں بڑھتے۔ آہستہ آہستہ یہ وقوف نظم معاشرت کے اعلیٰ جماعات و طبقات میں بڑھتا جاتا ہے اور بالآخر نیچے کے جماعات و طبقات میں بھی سرایت کر جاتا اور ان میں بھی فاعلی اور موثر حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

فطرت انسانی میں اس سیاسی میلان کا پہلے بلا وقوف اور بعد میں باوقوف حیثیت سے تسلیم کرنا سلطنتوں کی تاریخی آفرینش کے مخالف نہیں بلکہ اس کا واضح کرنے والا ہے طاقت رکھنے والوں میں اس سے غلبہ حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ کمزوروں میں سے یہ غلامانہ اطاعت کی صورت اختیار کر لیتا ہے مگر آزاد لوگوں میں یہ احساس فہم و ادراک کے ذریعہ درخشاں اور اس اخلاقی خود شناسی سے مملو ہو جاتا ہے جو اجتماعی وقوف اخلاقی کے ہمنوا ہوتی ہے۔ صرف آزاد سلطنت ہی سچی سلطنت ہے کیونکہ صرف اسی میں وہ عام سیاسی جذبہ پایا جاتا ہے جو تمام طبقات قوم میں جاری و ساری ہوتا ہے

اس رائے میں جیسے قدماء بھی اس سے پہلے ظاہر کر چکے ہیں[1] وہ تمام صحیح خیالات شامل ہیں جو غلط تخمینی نظریوں میں پائے جاتے ہیں مگر اس کے ساتھ ان کی غلطیاں اس میں داخل نہیں ہیں۔ سلطنت بالواسطہ ربانی ہے کیونکہ خدا ہی نے معاشرتی وجدان فطرت انسانی میں ودیعت کیا ہے اور اس طرح سلطنت کا صورت پذیر ہونا اسی کی مرضی سے ہوا ہے۔ پس ہمارے اس اعلان سے کہ سلطنت کی ابتداء کے کار انسان کے عمل واقعی سے ہوئی ہے' سچے مذہبی احساس کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ مزید براں' ہماری اس رائے

اس رائے میں وہ تمام صداقتیں داخل ہیں جو مختلف نظریوں میں پائی جاتی ہیں

[1] دیکھو اوپر باب (۹) تعلیق (۱) اور سسرو کی کتاب "جمہوریہ" ج ۱' فقرہ ۲۵: "قوم کا اولیں مقصد لوگوں کا باہم جمع ہو جانا ہے اور یہ کچھ اس سبب سے نہیں کہ انسان کمزور ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس وجہ سے کہ وہ بالطبع اجتماع کی طرف مائل ہے۔

میں قوت واقعی کی وہ اہمیت تسلیم کی گئی ہے جو تکوین سلطنت کے لئے لابد ہے کیونکہ حقیقی طاقت فطرت انسانی کے وجدان عام پر منحصر ہے۔ آخر میں مرضی آزاد کے جزو کو بھی اس کے مناسب حقوق دیئے گئے ہیں مگر ہم منتشر انفرادی مرضیوں کے بجائے قوم یا سلطنت کی ایک مشترک مرضی کو تسلیم کرتے ہیں۔

قوم میں جس طرح اتحاد تنظیم کا میلان (جسے ہم سیاسی میلان کہتے ہیں) طبعاً پایا جاتا ہے اسی طرح اس اجتماعی مرضی کا تخم بھی اس کی سرشت میں مضمر ہوتا ہے۔ یہ مشترک مرضی جب ظاہر ہوتی ہے تو وہ سلطنت کی مرضی بن جاتی ہے۔ برخلاف اس کے انفرادی مرضی اس حالت میں بھی انفرادی ہی رہتی ہے جب دو افراد باہم کوئی معاہدہ کریں اس لئے اس مشترک مرضی کے لئے مناسب لفظ معاہدہ نہیں ہے بلکہ اس سے اگر مستقل نظم مقصود رہے تو اسے اجتماعی قانون کہنا چاہیئے، اسی طرح جیسے "حکم" وہ ہے جو ضبط انتظامی کی بنا پر ہو اور "فیصلہ" اسے کہیں گے جو نفاذ عدل کے لئے ہو۔ سلطنت کے اندر وہ ذرائع عمل موجود ہوتے ہیں جن سے اجتماعی مرضی کو خود اپنا وقوف ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ارادوں کو مستحکم کرنے اور ان کے عمل میں لانے کے قابل ہو جاتی ہے۔

سلطنت ایک ضروری عمل نیک ہے

پس سلطنت کوئی ایسا انتظام نہیں ہے جس کی غرض صرف بدخواہشوں کو قابو میں رکھنا اور گر ضرورت بود روا باشد کی مصداق ہو بلکہ وہ ایک ایسا عمل نیک ہے جسے لازماً و ضرورتاً ہونا چاہیئے۔ سلطنت ہی کے ظہور پذیر ہونے سے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اقوام (Peoples) اور بنی نوع انسان بہ حیثیت مجموعی اپنے حقیقی باطنی اتحاد کو ظاہر کریں اور ایک آزاد اجتماعی ہستی پیدا کریں، سلطنت نظم مشترک کے اہتمام اور جملہ امور عامہ میں حیات مشترک کی تکمیل کی تنظیم ہے۔

جب اس طرح دیکھا جائے تو سلطنت اولاً ایک انسانی اور ارضی ہی تشکیل معلوم ہوتی ہے مگر اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم ایک غیر مرئی کلیسا کے مذہبی خیال کے پہلو بہ پہلو ایک غیر مرئی سلطنت کا سیاسی خیال قائم کریں کیونکہ اول الذکر ایک طرح کا اجتماع جذبات ہے جو مذہبی طور پر متحد ہو گیا ہے اور ثانی الذکر وہ اجتماع جذبات ہے جو سیاسی طور پر متحد ہو گیا ہے۔ جس طرح اہل مذہب آسمان پر ایک زیادہ مکمل کلیسا کے ہونے کا ذکر کیا کرتے ہیں اسی طرح اہل سیاست

بھی دنیاوی سلطنت کو آسمانی سلطنت تک پہنچنے کا محض پہلا زینہ تصور کر سکتے ہیں۔
مگر واقعی کلیسا کی طرح واقعی سلطنت بھی وہی ہے جس میں ہم رہتے اور کام کرتے ہیں۔ علم السیاست کو صرف اسی سلطنت سے بحث ہے اور فطرت انسانی پر غور کرنے سے اس قسم کی سلطنت کی پوری طرح توضیح و تشریح ہو سکتی ہے۔

پانچواں مقالہ

سلطنت کی غایت

پہلا باب

سلطنت غایت ہے یا وسیلہ؟ کس حد تک غایت ہے اور کس حد تک وسیلہ؟

اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ سلطنت غایت المرام ہے یا وسیلۃ المرام یعنے سلطنت فی نفسہ مقصود بالذات ہے یا اس سے محض یہ غرض ہے کہ وہ افراد کے لئے حصول غایت کا وسیلہ ہو۔

نظریۂ قدیم سلطنت غایت المرام ہے

قدما کا خاصکر یونانیوں کا نظریۂ سلطنت؛ انسانی زندگی کا بلند ترین مقصد سلطنت کو سمجھتا تھا اور سلطنت ہی کو کامل انسانیت تصور کرتا تھا۔ اس لئے اس کا میلان اس طرف تھا کہ وہ سلطنت کو فی حد ذاتہ غایت المرام سمجھے۔ افراد کا جب سلطنت سے مقابلہ کیا جاتا تھا تو وہ محض اس کے اجزا معلوم ہوتے تھے، یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت سے علٰحدہ بھی ان کے کچھ شخصی حقوق ہیں۔ جس طرح جسم کا ہر عضو مجموعۃً جسم کی خدمت کرتا ہے اسی طرح سلطنت کا ہر فرد سلطنت کا خدمتگزار تھا۔ سلطنت افراد کی خدمت گزار نہیں تھی۔ اس لئے

لوگوں کے ذاتی مفاد بلا تامل سلطنت پر قربان کر دئے جاتے تھے، اور صاف تو یہ ہے کہ لوگوں کی ہستی اسی حد تک ضروری اور قابل قدر سمجھی جاتی تھی جس حد تک وہ سلطنت کے کام آسکتی تھی۔ اسی طرح ہر شخص کی آزادی، قومی آزادی کا محض ایک جزو سمجھی جاتی تھی اور جب کوئی شخص قوم و سلطنت کی بہبود عام کے خلاف اپنے خاص طریق پر آزادانہ چلنا چاہتا تھا تو نہ اس کی ہمت افزائی ہوتی تھی اور نہ اسکی حفاظت کی جاتی تھی۔

نظریۂ جدید۔ سلطنت وسیلۃ المرام ہے

قدما کے اس اساسی نظریئے کے بالکل برعکس ان انگریز اور امریکی مصنفین کی رائے ہے جن کا یہ دعویٰ ہے کہ سلطنت فی نفسہ مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ وہ محض افراد کے حصول بہبود کا ایک ذریعہ ہے۔ میکالے نے اپنے تحریرات[1] میں متواتر یہ دعویٰ کیا ہے کہ قدیم مدبرین اور ماکیاویلی کی سیاسیات کا خاص نقص یہی ہے کہ یہ لوگ متاخرین کی طرح اس اصول اعظم کو تسلیم نہیں کرتے کہ نظامہائے معاشرت اور قوانین صرف شخصی خوشحالی کی مجموعی مقدار کے بڑھانے کے لئے ہیں۔ یہ فرقہ متاخرین، سلطنت کو محض ایک ایسی تنظیم یا کل سمجھتا ہے جس سے افراد کو اپنے جان و مال اور شخصی آزادی کی حفاظت حاصل ہوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ ایک مصنوعی آلہ ہے جو اس غرض سے پیدا کیا گیا ہے کہ تمام یا کم سے کم اکثر افراد کی بہبود اور خوشحالی کو بڑھائے اور ترقی دے۔ بیکن کے زمانے سے لیکر اب تک نہ صرف ارباب سیاست نے بلکہ ان ارباب فن نے بھی (جنھیں محض نظریات سے بحث تھی) جوش کے ساتھ اس رائے کی حمایت کی ہے جو شخص سلطنت کو محض افراد کا ایک مجموعہ سمجھتا ہے وہ فی الواقع اس رائے سے انکار نہیں کرسکتا۔ میکالے تو یہاں تک یقین کرتا ہے کہ جدید زمانے میں امور عامہ میں جو ترقی ہورہی ہے وہ بیشتر اسی نظریئے کے اثر سے ہے۔ روبرٹ فون مول اسے بالکل محال خیال کرتا ہے کہ انسان کو اور ایک ایسی تنظیم محض کو جو انسان کی بہتری کے لئے ہو یکساں اہمیت دیجائے۔

---

[1] دیکھو "میکالے کے مضامین" معمولی اشاعت صفحہ ۴۰ میں سے وہ مضمون جو اسنے ماکیاویلی پر لکھا ہے۔ انگریزی مترجم

دونوں نظریے یکطرفہ ہیں

میرے نزدیک ان قدیم اور جدید دونوں دعووں میں صداقت کا ایک عنصر ضرور شامل ہے مگر دونوں میں یہ غلطی ہے کہ وہ معاملے کے صرف ایک ہی رخ پر نظر ڈالتے ہیں اور دوسرے رخ کو نظرانداز کر جاتے یا اس سے انکار کرتے ہیں۔

یہ سوال کہ "سلطنت وسیلہ ہے یا غایت ہے" ایک ایسا سوال ہے جس کا اسلوب ہی انسان کو صرف ایک رخ پر نظر کرنے اور اس سے غلطی میں پڑنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ ایک ہی شئے ایک نظر سے دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ معلوم ہوتی ہے اور دوسری نظر سے وہ خود اپنی غایت ہوتی ہے۔ ایک تصویر اکثر کسی مصور کی معاش یا کسی تصویر فروش کے نفع کا ذریعہ ہوتی ہے لیکن ایک اہل فن کی نگاہ میں اسکا انتہائی مقصود صنعت کا اعلیٰ کام ہوتا ہے اس میں اسے اپنی حیات کا نہایت ہی نمایاں اظہار اور اپنے منتہائے خیال کا مجسمہ نظر آتا ہے اس اعتبار سے اس کی غایت خود اسی میں ہوتی ہے، اسی طرح بلاشک وشبہ مناکحت میاں بیوی دونوں کی انفرادی ضروریات زندگی کے پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے اور اس سے دونوں کے لئے زیادہ مسرت آمیز زندگی ممکن ہو جاتی ہے مگر وہی مناکحت ان دو جنسوں میں اتحاد بھی قایم کرتی ہے جنھیں فطرت نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے اور اسی اتحاد سے خاندان کی بنا قایم ہوتی ہے، یعنی اسی اتحاد سے ایک اعلیٰ مجموعی فرد بن جاتا ہے اور تمام ارکان خاندان کی انفرادی ہستی اسی کے تابع ہوتی ہے۔ خاندان کا ہر رکن اس امر پر آمادہ رہتا ہے کہ وہ اپنے شخصی اغراض ومرضی کا ایک حصہ اس اعلیٰ مقصد پر قربان کر دے جو مناکحت اور خاندان پر محتوی ہے۔

یہی امر سلطنت پر بھی صادق آتا ہے۔ ایک طرف سلطنت اپنے مشتملہ افراد کے نفع کا ایک وسیلہ ہوتی اور دوسری نظر سے وہ خود اپنی غایت المرام ہوتی ہے اور افراد اس کی ضرورت کے تابع اور اسکی

خدمت پر مجبور ہوتے ہیں۔

نظریۂ قدیم کا خطرہ

متقدمین کی یکطرفہ رائے نے قوم کے اندر افراد کو نظر انداز کر دیا تھا اور اس سے افراد کی آزادی و بہبود سخت خطرے میں پڑ گئی تھی اور اسکا بلاواسطہ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کی قدرت مطلق کا تصور پیدا ہو گیا جو آسانی سے مطلق العنانی کی بتذل صورت میں مبدل ہو گیا۔

نظریۂ جدید کا خطرہ

اسی طرح متاخرین کی یکطرفہ رائے جنھیں درختوں کے کھڑے ہونے کی وجہ سے جنگل دکھائی نہیں دیتا سلطنت کی عظمت و جلالت کے تسلیم کرنے میں ناکامیاب رہی اور اس طرح اسکا میلان یہ ہو گیا کہ سلطنت کو افراد کے ایک پریشان انبوہ میں تحلیل کر دے اور اختلالِ سلطنت کی ہمت افزائی کا باعث ہو۔

افراد کا وجود خیال

متقدمینِ سلطنت کے اس اہم فرض کی طرف توجہ کرنے میں ناکام رہے کہ شخصی آزادی اور سواد اعظم کی شخصی بہبود کا ترقی دینا سلطنت کا فرض ہے۔ متاخرین ارباب سیاست یہ فخر کر سکتے ہیں کہ انھوں نے سلطنت کے اس فرض کو تسلیم کیا اور قدما کے بہ نسبت وہ اسے زیادہ وسعت کے ساتھ عمل میں لائے۔ موجودہ زمانے میں وہ حکومت ضرور حقارت اور نفرت کی مستوجب ہے جس کا طرز عمل یہ ہو کہ افراد کی بہبودی ایک گیند ہے جسے حکمراں اپنی خواہشِ نفس کے موافق جدھر چاہیں لڑھکاتے رہیں یا اسے محض اتفاقاتِ زمانہ کے بھروسے پر چھوڑ دیں۔ اب یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ قانون اور اس کے عمل میں لانے والے افراد پر محض حکمرانی نہیں کرتے بلکہ وہ ان کی نہایت ہی ضروری اہم خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس زمانے کی بہت سی کارآمد اور نفع بخش تنظیمات کی اصل اسی خیال پر مبنی ہے۔ یہی وہ شئے ہے جس سے ازمنۂ جدیدہ کی شخصی آزادی اور آزادی رائے کا پتہ چلتا ہے۔ عیسائیت نے اس سے مذہبی زندگی میں کام لیا اور ٹیوٹنیوں کے احساس قانون نے اسی کو افراد کی تمام قانونی ہستی پر

عائد کیا۔

سلطنت ایک شئے واقعی ہے

مگر باوجود اسکے یہ دعویٰ کرنا ایک منطقی اور سیاسی غلطی ہے کہ سلطنت محض افراد کے ذاتی اغراض کے لئے ہے اور نظم و نسق سلطنت کی کوئی غرض سوا اسکے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ افراد کی بہبود کا خیال کرے۔ اس قسم کا ادعا سلطنت کے اصلی جوہر ہی کو برباد کردے گا اور "قانون عامہ" کو محض "قانون شخصی" کی ایک تمہید بنا دے گا۔ جن قوموں میں مردانگی ہوتی ہے ان میں سلطنت کے خطرے یا ضرورت کے وقت ہزارہا آدمی بارگراں برداشت کرنے اور اپنی جانوں اور اپنے خاندانوں کو خطرے میں ڈالنے کے لئے آمادہ ہوجاتے ہیں۔ اس جذبۂ ایثار کی تعبیر سوا اس خیال کے اور کسی طرح پر نہیں ہوسکتی کہ یہ لوگ سلطنت کی حفاظت و بہبود کو اپنی ذاتی حفاظت و بہبود پر ترجیح دیتے ہیں، اگر سلطنت صرف انفرادی اغراض کے پورا کرنے کا وسیلہ ہوتی، اگر قوم کی مجموعی زندگی افرادِ کثیر کی زندگی سے کوئی بلند تر حقیقت نہ رکھتی ہوتی تو پرانے وقتوں کے سورماؤں نے جو کارہائے نمایاں کئے ہیں وہ محض مجنونانہ حماقت سمجھے جائیں گے۔ قومی زندگی کو جب مشکلات شدیدہ و خطرات عظیمہ کا سامنا پیش آجاتا ہے تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ سلطنت محض باہمی بیمے کی کمپنی نہیں ہے بلکہ کوئی اعلیٰ و ارفع شئے ہے۔ جس وقت وطن کی محبت کے شعلے بھڑک رہے ہوں اس وقت افراد کی خودغرضانہ حرص و ہوس جل کر خاک ہوجاتی ہے، اور عوام میں جب ایک مرتبہ سلطنت کی نسبت اپنے فرض کا احساس برانگیختہ ہوجاتا ہے تو اس سے ان کی طبیعتوں میں جوش اور خیالات میں رفعت پیدا ہوجاتی ہے۔

سلطنت و افراد کی بہبود ناقابل تفریق ہیں۔

جس طرح سلطنت اپنے اشخاص مشتملہ کے مجموعے سے کچھ زائد شئے ہے بعینہ اسی طرح قومی بہبود انفرادی بہبود کے مجموعے سے کچھ زائد ہے یہ صحیح ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے اور یہ کہ عام طور پر ان کا عروج و زوال ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ اگر سلطنت کے سوادِ اعظم

کی انفرادی بہبود کم ہو جاتی ہے تو اس سے بالعموم سلطنت کی بہبود میں بھی سخت خرابیاں لاحق ہو جاتی ہیں مگر دونوں کی سمتیں اور راہیں ہمیشہ متوازی نہیں ہوتیں بعض وقت وہ ایک دوسرے کی مخالف اور بعض وقت بالکل ہی ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً سلطنت خود اپنی بقا یا اپنی آیندہ نسلوں کے مفاد کے خیال سے مجبور ہوتی ہے کہ اپنے موجود الوقت اراکین سے سخت مطالبات کرے یا ان پر بہت بھاری بوجھ ڈال دے۔ کبھی یہ بھی صورت پیش آجاتی ہے کہ انفرادی بہبود سلطنت سے غیرمعمولی امداد و تائید کی خواہاں ہوتی ہے اور اس سے سخت ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں زیادہ دقت نظر سے اس امر کو جانچنا چاہئے کہ کن حالات میں سلطنت انفرادی اغراض کا وسیلہ ہے اور کن حالات اور کن حدود کے اندر سلطنت خود اپنی غایت المرام ہے اور اپنے ارکان کو فرداً فرداً اپنی ضرورت کے تابع کرنے کا حق رکھتی ہے۔

دوسرا باب

سلطنت کی غایت کے متعلق غلط خیالات

سلطنت کی غرض حکمراں قوت کا قائم رکھنا ہے!

نظریات میں اور اس سے بھی زیادہ عملیات میں اکثر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ سلطنت کی غرض یہ ہے کہ اعلیٰ طاقت حکمرانی کرے خاص کر پادشاہ اپنی رعایا پر حکمراں رہیں۔

اگر سلطنت کی غایت اسی حکمرانی کا برقرار رکھنا ہے تو اس خیال کا منطقی نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے کہ حکومت جس قدر بھی ممکن ہو مطلق العنان اور وسیع ہو یعنی سیاسی کوشش کا آخری نتیجہ یہ ہو کہ ایک عالمگیر مطلق العنان پادشاہی بلکہ ایک عالمگیر خود سر پادشاہی قائم ہو جائے لیکن یہ منصوبہ ہم کو سلطنت کے حقیقی منتہائے خیال تک نہ پہنچائے گا بلکہ اس کے ساتھ قومی آزادی اور انسانی قویٰ کی ترقی کا جمع ہونا ناممکن ہو جائے گا۔

اس تمام خیال کی بنا نہ تو انسانی فطرت میں پائی جاتی ہے، نہ ان معاشرتی تحریکات میں جو فطرت کی طرف سے انسان میں ودیعت کی گئی ہیں، بلکہ جو کچھ ہے وہ حکمرانوں کی خود پرستی اور اپنی عظمت کو بلند کرنے کی مغرورانہ خواہش ہے۔

ارسطو اپنے مشہور مقالے[1] میں مدتوں قبل اس رائے کو مسترد کر چکا ہے جس نظام

---

[1] "سیاسیات"

سلطنت سے محض حکمران کا نفع مقصود ہو وہ صحیح نظامِ سلطنت کی تحریف یا تخریب ہے۔ لوگ اسے بھلا دیتے ہیں کہ سلطنت کے اندر قوم بھی کوئی شئے ہے، یہ کہ رعایا بھی حکمرانوں ہی کی طرح کے انسان ہیں اور ان میں بھی وہی انسانی صفات، حسیات اور قویٰ موجود ہیں جو حکمرانوں میں ہیں اور اس لئے یہ امر اصولِ فطرت کے بالکل منافی ہے کہ ایک حصہ تو تمام سیاسی حقوق کا تنہا مالک سمجھا جائے اور دوسرے کی غرض محض یہ سمجھی جائے کہ اس پر حکومت کی جائے یعنی وہ شخص کے بجائے شئے قرار دے دیا جائے۔ وہ ساری دلیلیں جو غلامی کے خلاف پیش کی جاتی ہیں، اس مطلق العنانی کے خلاف بھی عائد ہوتی ہیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ حکمراں طاقت، سلطنت کی ایک لازمی صفت ہے مگر وہ سلطنت کی غایت نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ غایتِ سلطنت کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ حکمرانوں کے حظِ نفس کے لئے ایک حق ہونے کے بجائے حکمرانی ایک فرض ہے جو قوم کی جانب سے عائد کیا گیا ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ نظامِ سلطنت کے ذریعے سے حکمرانی کی حد و تعریف معین کر دی جائے۔ سلطنت کا وہ تصور جو امکانی حدِ کمال تک پہنچ سکتا ہے وہ مطلق العنان حکمرانی کا نہیں بلکہ آئینی حکمرانی کا تصور ہے یعنی آئینی حکمرانی باہمی حکمرانی کے مرادف ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک خاص قسم کی حکومت نیک نیتی سے قائم کی گئی مگر کچھ زمانہ گزرنے کے بعد وہ قوم کے تبدیل شدہ حالات کے موافق نہیں رہی۔ اس صورت میں صحیح حکمت عملی یہ نہیں ہو سکتی کہ سلف سے طریقِ حکمرانی جس طرح چلا آتا ہے اسی طرح بلا تغیر و تبدل برقرار رکھا جائے بلکہ ایسے وقت میں کوشش یہ ہونا چاہیئے کہ اس از کار رفتہ طریق میں اصلاح کر کے اس میں اور قومی زندگی کے دوسرے حالات میں ہم آہنگی پیدا کر دی جائے۔

سلطنت کی غرض خدا کی مرضی کو پورا کرنا ہے

مذہبی حکومت کے نظریئے کے موافق سلطنت کی غایت یہ ہے کہ زمین پر خدا کی بادشاہی کا ظہور ہو جائے۔ اِشتال[1] کہتا ہے کہ "سلطنت کا ادائے فرض خدا کی خدمت کی بجا آوری ہے۔ سلطنت پر لازم ہے کہ خدا کی حکومت قائم کرے اور عدل، انتظام اور اخلاق جو معاشرتی زندگی کے لئے خدا کے احکام ہیں انھیں برقرار رکھے"۔ از منۂ وسطیٰ

---

[1] "فلسفۂ قانون" (Rechtsphilosophie) ج ۲ ص ۲۔

میں عیسائی اور مسلمان دونوں علی العموم اسی خیال کے معتقد تھے۔ دنیائے جدید اگرچہ اس رائے کی مذہبی اہمیت سے انکار نہیں کرتی ہے اور اس امر کو پوری طرح سمجھتی ہے کہ کیونکر دنیا کے تمام کاروبار کے طریقے ربانی نظم و نسق کی روشنی میں برگزیدہ نفوس پر ظاہر ہوئے مگر جس طور پر حکومت ربانی معاملات کی رہبری کے لئے کام میں لائی جاتی تھی اسے وہ قطعاً لغو اور مہلک قرار دیتی ہے۔

جس تمثیل پر مذہبی حکومت کے خیال کا دارومدار ہے، یعنی "بادشاہ ایک قوم پر اسی طرح حکومت کرتا ہے جس طرح خدا دنیا پر حکومت کرتا ہے" وہ خود علانیہ غلط ہے۔ اس لئے کہ دنیا پر خدا کی حکومت مقید ہستیوں پر ایک طاقت علی الاطلاق کی یا مخلوق پر خالق کی حکومت ہے۔ پس وہ ایک ایسی حکومت ہے کہ ہم نہ اس کی کنہہ کا پتہ چلا سکتے ہیں، نہ اس کے ذرائع اور غایت کو معین کر سکتے ہیں۔ کسی قوم پر بادشاہ کی حکمرانی ایک انسان کی دوسرے انسانوں پر حکمرانی ہے جو اسی کے مثل ہیں اور جن کی زندگی کا منبع وہی ہے جو بادشاہ کی زندگی کا، جن کے صفات اسی طرح محدود ہیں جس طرح بادشاہ کے صفات۔ پس محکوموں میں بھی اس امر کی پوری قابلیت ہے کہ وہ انسانی نقطۂ نظر سے بادشاہ کی نسبت ایک رائے قائم کریں۔ اس لئے بادشاہ کو خدا سے تشبیہہ دینا ہر اعتبار سے غلط ہے اور چونکہ اس سے غرور اور انتہائی خودپسندی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے یہ مضر بھی ہے۔ سلطنت کا مقصد وہ ہونا چاہئے جسے انسان تسلیم کر سکے، انسانی فطرت کے مطابق اس کا تعین کیا جا سکے اور اگر بالکل نہیں تو جہاں تک ممکن ہو انسانی دسترس کے اندر ہو

یہ امر بالکل ہی مردود ہے کہ سلطنت کی غایت اس قوم اور اس ملک سے باہر قرار دی جائے جس پر سلطنت مشتمل ہے اور اس طرح وہ محض بیرونی اغراض کے حصول کا ایک وسیلہ بن جائے۔

سلطنت کی غرض کسی بیرونی مقصد کا حاصل کرنا ہے۔

پادریوں کی جماعت کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ کلیسا کی سلطنتوں کی ضرورت اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ رومن کیتھولک کلیسا کی آزادی و اقتدار کے لئے ایک پوپ کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے روما کا با اقتدار حکمراں بھی ہونا چاہئے مگر وہ اس پر نظر نہیں کرتے کہ یہ استدلال خود ہی رومی مذہبی سلطنت کا واضح طور پر

بطلان کرتا ہے اس لئے کہ اس سے ان سلطنتوں کی آزادی کا انکار واجب ہو جاتا ہے جو پوپ کے تابع ہوں اور اس حالت میں ان کی حیثیت ہی سلطنت کی نہیں باقی رہتی کیونکہ کوئی سلطنت جو اپنی مرضی پر عامل نہ ہو سکے اور قانونی حقوق سے دست بردار ہو کر کسی بیرونی طاقت کی غلام بن جائے سلطنت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی خواہ یہ بیرونی طاقت رومن کیتھولک کلیسا ہی کی کیوں نہ ہو۔ پادری صاحبان یہ فرض کر لیتے ہیں کہ رومی قوم نے جس پر یہ سلطنت مشتمل ہے ایک مذہبی اور غیر سیاسی جماعت کے مفاد کے خیال سے سیاسی زندگی کو ترک کر کے سیاسی غلامی اختیار کر لی ہے مگر یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو اس قوم کی طبیعت اور کلیسا کی مذہبی نوعیت دونوں سے یکساں طور پر مغائر ہے۔

تاریخ عالم نے اس صریح ضلالت کے خلاف اپنا فتویٰ صادر کر دیا ہے۔ روما اب کیتھولکی عیسویت کے تابع نہیں ہے جو خود ہی مختلف سلطنتوں میں منقسم ہے، روما کا تعلق اب رومی بلکہ ایتالوی قوم سے ہے اور اس ایتالوی قوم کے اجزاء و عناصر رومی ہیں۔

لیکن حیرت یہ ہے کہ موجودہ زمانے تک میں اس غلطی کی متعدد مثالیں موجود ہیں لیشتن اشتائن کی امارت کا وجود بحالات ظاہر اس چھوٹے سے گاؤں اور اس کی مختصر سی آبادی کے لئے نہیں ہے، اس سے صرف ایک خارجی غرض پوری ہوتی ہے، وہ اسی امیر خاندان کی عزت و وقعت کا کام دیتی ہے جو ملک سے باہر آسٹریا کے شہنشاہی دربار میں رہتا ہے صاف ظاہر ہے کہ اس سلطنت کی غایت خود اس کے اندر نہیں ہے۔

تیسرا باب

سلطنت کے غایت المرام کی نسبت ناکمل یا مبالغہ آمیز خیالات

سلطنت کا مقصد اشخاص و املاک کے حقوق کا محفوظ کرنا ہے۔

کانٹ اور فشتے کے زمانے سے ایک مدت تک جرمانیا میں یہ رائے قائم رہی کہ سلطنت کی اصلی غایت محض تحفظِ حقوق ہے خاصکر اشخاص و املاک کا تحفظ حقوق۔

کانٹ نے "نظریۂ حقوق" (Rechtslehre) فقرہ ۴۷-۴۹ میں) تاکید کے ساتھ یہ کہا ہے کہ "سلطنت کی سلامتی (یعنی اس کی غایت) باشندوں کی بہبود و خوشحالی میں نہیں بلکہ اس کے نظام سلطنت اور اصول قوانین کے تطابق میں مضمر ہے" فشتے "حقوق طبعی" (Naturecht تصانیف ج ۳ ص ۱۵۲) میں کہتا ہے کہ "عام خلائق کے حقوق کا تحفظ ہی عام مرضی (یعنی سلطنت کی مرضی) ہے۔ کانٹ کی اس رائے کو بنیاد قرار دے کر ولہلم فون ہمبولٹ "سلطنت کے میدانِ عمل" کے نہایت ہی تنگ حدود معین کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ "بیرونی دشمنوں اور اندرونی تنازعوں سے محفوظ رکھنا ہی" غایت سلطنت[الف] ہے۔ خود ہماری اس انیسویں صدی میں جبکہ قومیت کا خیال اس درجہ قوی ہوگیا ہے اے اوے ٹویٹس اپنی تصنیف "خیالات جدیدہ" Mdrne Ideen ج ۲ ص ۱۹۱ میں اسی

(الف) [مل نے اپنی کتاب "آزادی" کا طغرائے عنوان ہمبولٹ ہی کی تصنیف حدود فرائض حکومت

خیال پر قائم ہے کہ سلطنت کی غرض افراد کی حفاظت ہے۔

یہ رائے گزشتہ صدی کے نصف آخر کی ہے۔(ب) اُن دنوں لوگوں کو ضرورت تھی کہ اس زمانے کی روشن خیال مطلق العنانی کے وفور حکمرانی کے لئے کوئی اصولی حد قائم کریں یہ وفور اگرچہ بہی خواہی پر مبنی تھا مگر لوگوں کے لئے ایک بار گراں اور شخصی آزادی کا تباہ کرنے والا اور بہبود عامہ کے عذر سے خاندانی زندگی اور آزادانہ ذرائع معاش اور ذاتی آمدنی کے انتظام میں دخل دینے کو حق بجانب سمجھنے لگا تھا۔ پس لوگوں نے یہ رائے قائم کی اس حد سے بڑھی ہوئی حکمرانی کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ تحفظ قانون کو سلطنت کی غایت قرار دیں۔ چنانچہ اس طرح کی محدود سلطنت کا نام "قانونی سلطنت" (Rechtsstaat) قرار پا گیا اور اس کے مقابلے میں دوسری صورت جس سے لوگ متنفر تھے "احتسابی سلطنت" (Polizeistaat) کہلائی۔ (ج)

غایت سلطنت کو اس طرح مقید کر دینے سے زندگی عامہ میں جو تنگی پیدا ہوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ Spl ere and duties of Govt سے لیا ہے۔ مل کے خیالات کے لئے اس کی تصنیف "علم سیاست مدن" کی کتاب پنجم بھی دیکھنا چاہئے، لیکن عملاً مل سلطنت کے لئے بہت وسیع اختیارات جائز رکھتا ہے ہربرٹ اسپنسر کی رائے کے مطابق یہ حدود اور بھی زیادہ وسیع ہیں۔ دیکھو اس کی کتاب انسان اور سلطنت کا مقابلہ" (The Man Vergus the State انگریزی مترجم]

(ب) [اس خیال کا سلسلہ قدامت یونان کے سوفسطائیوں تک پہنچتا ہے۔ ارسطو نے اپنی سیاسیات میں لیکافرن سوفسطائی کی زبان سے یہ ادا کیا ہے کہ قانون کا مقصد صرف حقوق باہمی کا تحفظ ہے وہ باشندوں کو اچھا یا برا نہیں بنا سکتا۔ لاک نے بھی اپنے رسائل حکومت Treatises as Government میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سیاسی اجتماع دحکومت کا مقصد یا خود اسی کے الفاظ میں یہ کہ انسان جس وجہ سے سوسائٹی میں داخل ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ اس طرح سے ہر شخص اپنی ذات اپنی آزادی اور اپنی ملک کو زیادہ محفوظ بنا لیتا ہے۔ انگریزی مترجم۔]

ج (دیکھو اوپر پہلا مقالہ ساتواں باب ص ۶۸) انگریزی مترجم۔]

وہ نہ موجودہ قوموں کے مذاق کے موافق ہوئی اور نہ انکے ضروریات کو پورا کرسکی۔ اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ حقوق کا تحفظ قانونی سلطنت کے فرائض میں داخل ہے مگر موجودہ زمانے کی کوئی قوم یا حکومت اپنے سیاسی میدان عمل کے لئے ایسی تنگ وسعت کو پسند نہیں کرسکتی اس رائے کے بڑے حامیوں کو بھی ذاتی تجربے نے مجبور کردیا کہ ان حدود سے تجاوز کرکے عملاً اعلیٰ مقاصد کی طرف توجہ کریں۔ فشتے نے پہلے یہ دعویٰ کیا تھا کہ حفاظت ملک سلطنت کی بڑی غایت ہے مگر نپولین کی ہمہ گیر مطلق العنانی کے مقابلے کے لئے وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا گوکہ نپولین مطلق العنانی ملک کی حفاظت کے لئے کافی طور پر آمادہ تھی۔ اس دوران میں فشتے کا خیال ایک ایسی قومی سلطنت کی طرف مائل ہوا جو قومی جذبات کی ترجمانی کا کام دے سکے دلہیلم نون ہمبولٹ جب پروشیا کا وزیر تھا تو اس نے سلطنت کے مدارس کے ذریعے سے اہل پروشیا کی ذہنی ترقی کی کوشش کی گوکہ اپنے نظریہ میں وہ اس کی تردید کرچکا تھا۔ معہذا اس نے سلطنت پروشیا کی طاقت کو بھی وسعت دی حالانکہ قانونِ حقوق وجرائم کو نافذ کرنے کے لئے یہ طاقت پہلے ہی کافی تھی۔

اس خیال کے نقائص

فی الحقیقت تحفظ قانونی کا یہ اصول سلطنت کی غایت کو اور خاصکر موجودہ زمانے کی مہذب سلطنتوں کی غایت کو کلیتہً ختم نہیں کردیتا ہے یہ اصول ازمنۂ وسطیٰ کے خیالات کے زیادہ مناسب ہے، جس میں خیالات شخصی قانون کے تصور سے زیادہ آگے نہیں بڑھے تھے۔

کسی قوم کی عملی قوت صرف پاس قانون ہی تک محدود نہیں ہے۔ سڑک نہر۔ ریل۔ ڈاکخانہ وغیرہ کی سی بہت سی اقتصادی ضرورتیں بھی ہوتی ہیں جنھیں تحفظ قانون سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ صرف سلطنت ہی ان ضروریات کو پورا کرسکتی ہے، لیکن اگر سلطنت کی غایت صرف تحفظ حقوق ہی ہے تو وہ ان کاموں کے کرنے کی جراءت نہیں کرسکتی۔ ان کے علاوہ قوم کے اہم ذہنی اغراض بھی ہیں مثلاً قومی مدارس۔ مدارس علوم وفنون، حرفتی وصنعتی مدارس۔ ان کے لئے سلطنت کو فکر کرنا لازمی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ چیزیں شخصی وہم وخیال اور کلیسا کے خود غرضانہ اقتدار کے بھروسے پر (جو ہمیشہ سلطنت کو زیر اثر لانے کی فکر میں رہتا ہے) چھوڑدی جائیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں چونکہ سلطنت کی نسبت یہ تنگ خیالی شائع تھی کہ وہ قانونی حقوق کے تحفظ کی ایک تنظیم ہے

اس لئے اس زمانے میں ان اغراض سے بے پروائی برتی جاتی تھی۔
مزید براں قوم ایک سیاسی ہستی ہے، جس کا منصب صرف یہی نہیں ہے کہ شخصی حقوق کی حفاظت کے لئے قانون بنائے اور اس کو عمل میں لائے بلکہ سیاسی حکومت اور آزادی کی ترقی کا نہایت ہی اعلیٰ فرض بھی اس پر عائد ہوتا ہے۔

اس کے نتائج

سلطنت کی اس نامکمل تعریف کی جب حالات واقعی پر تطبیق کی جائے تو اس سے نتائج ذیل ظہور پذیر ہوتے ہیں۔
(الف) اقتصادی اغراض سے بے پروائی۔
(ب) عام ذہنی اغراض سے بے پروائی۔
(ج) قوم کے جذبات عامہ کا مفلوج اور مردہ ہو جانا اور اس باعث سے سلطنت کا کمزور ہو جانا۔
(د) قانون کی خفیف اور رکیک کج بحثیوں کا رواج، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں مقدمہ بازی کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور یہ سلطنت کے لئے مہلک ہے۔

۲۔ سلطنت کی غرض خوشحالی عام کا حاصل کرنا ہے۔

جس طرح خیال سابق، ضرورت سے زیادہ تنگ ہے اسی طرح دوسرا مروج خیال کہ "سلطنت کی صحیح غایت خوشحالی عامہ کا حصول ہے" ضرورت سے زیادہ وسیع ہے بیشتر انسان کی فراغ بالی کو سلطنت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بہت سے مادی اسباب بھی ہیں جن پر انسان کی خوشحالی کا انحصار ہے مثلاً مکان، غذا، لباس اور آمدنی، یہ سب سلطنت کے ذریعے سے نہیں بلکہ افراد کی محنت اور جفاکشی سے حاصل ہوتے ہیں۔ روحانی امور کی بابت جن پر انسان کی دماغی دولت اور خوشحالی کا انحصار ہے یہ کلیہ اور بھی صادق آتا ہے۔ انسان کی ذہانت اور قابلیت، سلطنت نہیں عطا کرتی ہے۔ یہ فطرت کے عطیے ہیں اور وہ سب میں یکساں ہونے کے بجائے افراد کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ سلطنت کسی کو دوستی اور محبت کی مسرتیں مطالعۂ علمی شاعرانہ، مصورانہ تخلیق کا لطف، مذہبی اطمینان و تسلی یا خدا کے ساتھ روح کے تعلق کی پاکیزگی و لطافت نہیں عطا کر سکتی۔
انسان اپنی تمام زندگی و ہستی کے اعتبار سے محض سلطنت کا ایک جزو نہیں ہے بلکہ مختلف افراد اپنی اپنی طبیعت کے مطابق ایک مخصوص قابلیت اور خاص خاص

فرائض زندگی رکھتے ہیں، سلطنت کی بنا قوم کے اجتماعی خصائص پر ہے، نہ کہ افراد کے اخلاقی طبائع پر۔ اس لئے اس کی غایت شخصی زندگی کی عام غایات پر شامل نہیں ہوسکتی

اس خیال کے مضر نتائج

سابق الذکر غلطی کی طرح اس غلطی کو بھی جب واقعی حالات پر تطبیق دیجائے تو اس سے سخت مضر نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

(**الف**) سلطنت زندگی کے ایسے شعبوں میں دخل دینے لگتی ہے، جو اس کی حکمرانی سے تعلق نہیں رکھتے اور جس حال میں کہ اسے خود کو شخصی آزادی کی حفاظت تک محدود رکھنا چاہیئے، وہ تعدی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

(**ب**) چونکہ سلطنت میں شخصی زندگی کے اُن شعبوں کے انتظام کی فی الحقیقت قابلیت نہیں ہوتی اس لئے شخصی خوشحالی کے مجموعے کو بڑھا دینے کی خواہش کے باوجود سلطنت اپنی ناشستگی کی وجہ سے شخصی زندگی کے لئے نقصان رساں ہوتی اور اس کی فطری ترقی میں خلل ڈال دیتی ہے۔

(**ج**) چونکہ اس طرح سلطنت ایسے مقاصد کے لئے سعی کرتی ہے جن کا حاصل کرنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں اور اس غلط سمت میں کوشش کرکے وہ اپنی قوتوں کو ضائع کرتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے اصلی اغراض سے ہٹ جاتی اور بعض افتادہ فرائض کے پورا کرنے میں اپنی قوت کا ایک حصہ ضائع کر دیتی ہے۔

قدیم زمانے کی سیاسی زندگی میں یہ غلطی سخت نقصان کا باعث ہوئی مگر اٹھارویں صدی کی روشن خیال جماعت بھی اسی طرح سے بہک گئی موجودہ زمانے کے سیاسیات میں سلطنت کی غایت المرام کی زیادہ صحیح تعریف و تحدید ہونا چاہیئے۔

چوتھا باب

سلطنت کی صحیح غایت

سلطنت کی صرف ایک ہی عام غایت ہے

اگرچہ مختلف قوموں، ملکوں اور زمانوں میں مختلف طور پر عمل درآمد ہوا ہے مگر سلطنت کا تصور صرف ایک ہی ہے، اس لئے باوجود اِس کے کہ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف صاحب سلطنت قومیں مختلف اغراض کے درپے رہی ہیں پھر بھی غرض مشترک کا اتحاد ان تمام مخصوص اختلافات کو قبول کرلیتا ہے مگر وہ ان سب میں ربط اور یکرنگی بھی پیدا کردیتا ہے۔ روبرٹ فون مول کا یہ دعویٰ صحیح تھا کہ ہر قوم کا فرض ہے کہ اپنی مخصوص نوعیت اور ضروریات کے اعتبار سے مختلف اغراض کے حصول کی فکر کرے (انسکلوپیڈیا صفحہ ۳)، مگر اس کے نظریے میں تخیل کی اس یکرنگی کی کمی تھی جو غلط خیالی سے روکتی ہے اور کج راہی کا انسداد کرتی ہے۔ برخلاف اس کے فون ہولشٹین دورف جس نے اس موضوع پر خاص توجہ صرف کی ہے ہمارے اتحاد غایت سلطنت کو "اغراض سلطنت کی ہمنوائی" کا نام دیتا ہے

۲۔ "عدل" بہت تنگ ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس واحد اعلیٰ غایت سلطنت کی تعریف کس طرح کی جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ "عدل" یعنی حصول مقصد قانون ہے۔ یہ تعریف ہمیں بہت ہی تنگ معلوم ہوتی ہے اور اگر قانون میں قانون عامہ اور قانون بین الاقوام دونوں شامل ہیں اور وہ افراد کے قانونی تحفظ تک محدود نہیں ہے تو یہ بجائے خود غلط ہے

ملاحظہ ہو باب سوم۔ قانون منجملہ شرائط سیاسیات کے ایک شرط ہے، اس کی غائت نہیں ہے۔ اقوام کی زندگی محض عدالتی زندگی نہیں ہے اقوام میں اقتصادی اور ذہنی زندگی بھی ہوتی ہے اور اس کے سوا طاقت قومی کی بھی ایک زندگی ہوتی ہے، رومی جو بالطبع قانون کی طرف مائل تھے وہ بھی عدل کو سلطنت کی غایت اعلیٰ نہیں سمجھتے تھے۔

"اخلاق" زائد از ضرورت وسیع ہے

ہیگل کا قول ہے کہ "اخلاق" اور "قانون اخلاق کا عمل پیرا ہونا سلطنت کی غائت ہے" اور اس سے مدتوں قبل افلاطون کا بھی یہی قول تھا" مگر وہ دو طاقتیں جنسے اخلاق زندگی معین و مرتب ہوتی ہے یعنی خدا کی مرضی اور انسان کی روح انفرادی، یہ دونوں کی دونوں انسانی قدرت سے باہر ہیں۔ اخلاق کے حدود سلطنت کے حدود سے بہت زیادہ وسیع ہیں اور اگر سلطنت اخلاق کے نگران ہونے کی کوشش کرے تو وہ اپنے حدود مناسب سے تجاوز کر جائے گی اور اخلاق پر مضر اثر ڈالے گی۔

۳۔ حصول بہبود عامہ

رومی سلطنت کا اصلی فرض بہبود عام کو سمجھتے تھے ان کے دو فقرے، "شئے عامہ" (Res publica) اور "عافیت عامہ" (Salus publica) زبان اور منطق دونوں کے لحاظ سے آپس میں ربط رکھتے ہیں ان دونوں میں وہی واسطہ ہے جو جوہر اور عرض میں یا قوت اور فعل میں ہے۔ غائت سلطنت کے اس کلیے کا مفہوم اکثر غلط سمجھا گیا ہے، خاصکر اس وجہ سے کہ افراد کی ہیئت اجتماعی پر نہیں بلکہ ان کے انبوہ پر یا حکمرانوں کی بدا حکامیوں پر زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ بادشاہوں یا جماعتہائے غالب کی مطلق العنان خود مختاری کے عذر کے لئے بہت کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے اور پیرس کی مجلس تحفظ عامہ (۱۷۹۳ و ۱۷۹۵ء) کے ہولناک اعمال نے اسے بالکل ہی ساقط الاعتبار کر دیا ہے

غلط نہیں ہے

لیکن اگر سلطنت کے حدود طبعی اور خاص کر اس کے عدالتی انتظام اور نظم و نسق پر لحاظ کیا جائے اور ان حدود سے خارج امور (جیسے افراد اور مذہبی جماعتوں کی آزادانہ زندگی) میں دخل دینے سے پرہیز کیا جائے تو یہ فقرہ فی الحقیقت اعتراض سے پاک ہے کبھی اور کہیں کوئی مدبر ایسا نہیں ہوا جس کی جد و جہد کا نصب العین اپنی قوم کی بہبودی نہ ہو اور ملک کا ہر محب وطن باشندہ اپنے وطن کی سلامتی کا جوش رکھتا ہے۔ اس لئے بہبود عامہ، حکمت عملی کی ایک لازمی غرض ہے اور اس کا ترقی دینا بے شک و شبہ سلطنت کا خاص فرض ہے۔ غایت سلطنت کی اس تعریف میں قانون کا ارتقا و کمال

اور زندگی کے عام تعلقات و حالات کی ترقی عمومی بھی شامل ہے، اس میں قانون کا عملدرآمد بھی داخل ہے جو امن رفتار زندگی کے تحفظ کے لیے ضروری ہے اور جس سے جماعت کو نقصان ہونے والی زیادتیوں کی روک اور تادیب ہوتی ہے۔ رومیوں کے اس سیاسی اصول میں کہ "قوم کی سلامتی سب سے برتر قانون ہے" غلطی یہ نہیں ہے کہ وہ زائد از ضرورت تنگ ہے بلکہ اس کا سقم یہ ہے کہ وہ سلطنت کی طاقت کو بہت پھیلاتا ہے اور اسے غیر متعلق امور پر وسیع کرتا ہے۔

بعض مشکلات میں ناکافی ہے

تاہم ایک نظر سے یہ فقرہ ناکافی ہے۔ اگرچہ معمولی اوقات میں سلطنت کی حکمت عملی یہ ہوگی کہ قومی بہبود کے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے مگر قوموں کی زندگی میں ایسے بھی اوقات آتے ہیں جب انہیں غیر معمولی فرائض سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایسے حالات پیش آجاتے ہیں، جبکہ افراد کی طرح سلطنت کو بھی اپنی ہستی اور اس کے ساتھ قومی خوشحالی کو خطرہ میں ڈال دینا پڑتا ہے۔ ایسے وقت میں حب وطن کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ زندگی جب عزت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی تو اس زندگی ہی کو خیرباد کہہ دینا چاہیے۔ فرض کیجیے کہ ایک نہایت ہی قوی دشمن کسی چھوٹی قوم کو بہت سے خارجی فوائد دیتا ہے مثلاً وہ محصولات کم کر دیتا ہے، امن کا تحفظ کرتا ہے، ملک کے نظم و نسق کی حالت کو بہتر کر دیتا ہے پس اگر محض بہبود عامہ پر خیال کیا جائے تو اس شرط کا قبول کر لینا ہی قطعاً مناسب معلوم ہوتا ہے اور اس کے رد کرنے میں سلطنت کے مشکلات میں پڑ جانے بلکہ تباہ ہو جانے کا احتمال غالب ہوتا ہے مگر بایں ہمہ اس آڑے وقت کا فرض یہی ہوگا کہ برضائے خود غیر ملکی قوت کے مطیع ہو جانے پر جان جوکھوں اور عزت کی موت کو ترجیح دی جائے اور شاید یہی دلیرانہ اور جانبازانہ کوشش آگے چل کے سلطنت میں از سر نو زندگی پیدا کر دینے کی ضامن ثابت ہو۔ تھیمس ٹوکلیس کے زمانے میں اہل ایتھنز نے اس کی ایک بہت ہی شاندار مثال پیش کی ہے۔ بسا اوقات جب ہستی کا قائم رکھنا ممکن نہیں ہوتا تو اس کا ختم کر دینا ہی ہر طرح پر ضروری اور شایان شان ہوتا ہے۔ کارتھیج یا یروشلم کے عبرتناک خاتمے پر افسوس ہوتا ہے مگر جو کچھ ہوا اس سے کوئی مفر نہ تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ جب کسی سلطنت کے باشندوں میں یہ قابلیت باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنی مستقل ہستی کو قائم رکھ سکیں اور وہ لوگ قوم کی اعلیٰ تر مجموعی زندگی میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو سلطنت کو فنا کر دینا پڑتا ہے کوئی بے تعصب جرمانی یا اٹالوی

ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے تباہ ہو جانے پر افسوس نہیں کرے گا جو بیکار اور بیجان ہوگئی تھیں بلکہ وہ اس بات پر فخر کرے گا کہ ان سب نے ملکر ایک زیادہ وسیع اور زیادہ مقتدر سلطنت بن گئی۔ ایسی صورتوں میں ہمارا بہبود عامہ کا کلیہ ناکافی ثابت ہوتا ہے بجز اس کے کہ وہ نئی جماعت پر عائد کیا جائے۔

صحیح تعریف

لیکن اگر ہم سلطنت کا محض و بلاواسطہ مقصد اس اصول پر قرار دیں کہ قوم کی قابلیتوں کا نشو و نما قومی زندگی کا کمال اور بالآخر اس کا اتمام سلطنت کا غایت المرام ہے تو یہ تمام اعتراضات رفع ہوئے جاتے ہیں مگر اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ یہ اخلاقی سیاسی ارتقا اور نوع انسانی کے مقصد آخری کے خلاف نہو۔ اس کلیئے میں وہ تمام امور جمع ہوگئے ہیں جو سلطنت کے موزوں فرائض قرار دیے جاسکتے ہیں اور جو امور سلطنت کی حد سے باہر ہیں وہ سب خارج ہوگئے ہیں۔ اس میں مختلف اقوام کے مخصوص خیالات اور مختلف ضروریات کا لحاظ کیا گیا ہے اور اس طرح جہاں وہ غایت سلطنت کے اتحاد کو مضبوطی سے قائم رکھتا ہے وہیں وہ اس کے مختلف طریق ارتقا کو بھی محفوظ کر دیتا ہے اور اس طرح سلطنت کو خود ایک شخص تسلیم کر کے قوم کی پوشیدہ طاقتوں کو ترقی دینا اور اس کی قابلیت کو ظاہر کرنا اس کا فرض قرار دیتا ہے۔ لہذا سلطنت کے دہرے فرائض قائم ہو جاتے ہیں اول قومی طاقتوں کا قائم رکھنا دوسرے ان کو کمال پر پہنچانا سلطنت پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ عہد ہائے گزشتہ کے فتوحات کو محفوظ رکھے اور مستقبل میں انھیں وسعت دے

اور یہ عام تعریف خاص میلانات پر حاوی ہے۔

اس عام غایت کے اندر بعض خاص میلانات بھی داخل ہیں اکثر انھیں خاص میلانات کے مطابق عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جاتی ہے اور کسی خاص قوم کے مخصوص حالات کی بنا پر ایسا طرز عمل جائز قرار دیا جاتا ہے مگر یہ طریقہ سلطنت کے لئے بہ حیثیت مجموعی خطرات سے خالی نہیں ہے اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں:-

بیرونی طاقت کا ترقی دینا۔

(۱) سلطنت کی طاقت کا نشو و نما۔ سلطنت کو اپنی آزادی کے قائم رکھنے اور اپنے احکام کے نافذ کرنے کے لئے طاقت کی ضرورت ہے صرف طاقت ہی سے سلطنت کی ہستی اور زندگی باقی رہ سکتی ہے مگر اس طاقت کی نوعیت اور مدارج کے لحاظ سے سلطنتوں میں بڑا تفاوت ہے۔

(الف) عالمگیر طاقتیں (بڑی دول)، ہم ان سلطنتوں کو کہتے ہیں جن کی اہمیت اور

حدودِ عمل ان کی خاص مملکت سے بہت ہی دور دراز ممالک تک وسیع ہوں اور جو دنیا کے دو مختلف حصوں یا تمام عالم کی سیاسیات میں نمایاں حصہ رکھتی ہوں اور اس لئے ان کو ساری دنیا کے امن اور نظم ونسق کی فکر بھی ہو۔

(ب) بڑی طاقتیں (یا دولتیں)۔ ہر بڑی طاقت (یا طاقتِ عظمیٰ) کے لئے ایک عالمگیر طاقت ہونا ضروری نہیں لیکن کوئی عالمگیر طاقت ایسی نہیں ہے جو طاقت عظمیٰ نہ ہو۔ عالمگیر طاقت کے لئے ضروری ہے کہ وہ بحری طاقت ہو کیونکہ سمندر کے تعلق کے بغیر وہ دنیا کے معاملات پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتی مگر کسی طاقت عظمیٰ کے لئے یہ شرط ضروری نہیں ہے۔ ایک برّی طاقت بھی طاقت عظمیٰ ہو سکتی ہے جیسے جرمنی شہنشاہی کی تکمیل سے پہلے پروسیا کی سلطنت تھی اسی طرح آسٹریا ہنگری ایک عالمگیر طاقت ہونے کے بجائے زیادہ تر ایک طاقتِ عظمیٰ تھی اور اب بھی ہے ایک طاقت عظمیٰ بھی اپنے خاص حدود ملک سے بہت دور دراز تک اپنے وسیع اثر کو کام میں لاتی ہے اور جس براعظم میں وہ واقع ہے اس کی حالت میں اگر اہم تغیرات واقع ہوں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ نظر انداز کر دی جائے یا اس کی آواز پر لحاظ نہ کیا جائے اگر کسی وقت میں ان دونوں قسم کی سلطنتوں میں سے کوئی سلطنت بھی اپنی قوت کے بیجا استعمال سے دوسری جائز سلطنتوں کو پریشان کرے تو دوسری طاقتوں کو اس کے روکنے کا حق حاصل ہے نپولین اول کی سی اعلیٰ قابلیت کا شخص بھی فرانسیسی قوم کی طاقت عظمیٰ کا غلبہ تمام یورپ پر قائم نہ کر سکا اور اسی کوشش کی ناکامی اس کے زوال کا باعث ہوئی اسی طرح روس کو اتنی قوت نہیں حاصل ہو سکی کہ وہ ٹرکی کو اپنا مطیع کر لیتا۔ آسٹریا اینتا لیا پر اپنی حکومت نہیں قائم رکھ سکی۔ انگلستان باوجود اپنی بحری فوقیت کے دوسری قوموں کی ہمسری کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

(ج) متوسط اور صلح پسند طاقتوں (یعنی غیر جانبدار سلطنتوں) میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ ممالک غیر کے سیاسی معاملات میں زیادہ دخل دے سکیں وہ زیادہ تر اپنے اندرونی ہی معاملات میں مستغرق رہتی ہیں۔ ان سلطنتوں کی حکمت عملی اگرچہ بہت ہی معتدل ہوتی ہے مگر یہ حکمت عملی صرف اپنے ہی باشندگان ملک کے لئے خاص اہمیت نہیں رکھتی بلکہ اس اعتبار سے بھی اہم ہوتی ہے کہ وہ ہمہ گیر سیاسیات کی رفتار

محدود اور معتدل کر دیتی ہے۔

(۷) ہمارے زمانے میں جبکہ وسیع تر اور قوی تر سلطنتوں کے قیام کو ترجیح دی جاتی ہے صحیح معنوں میں چھوٹی سلطنتوں کا وجود بہت ہی مشکوک اور غیر محفوظ ہے۔ انکی بقا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ وہ کسی بڑی سلطنت کو اپنا محافظ بنالیں یا کسی قوی تر سلطنت سے ملجائیں مگر ازمنۂ وسطیٰ کا میلان اس کے خلاف تھا اور یورپ کی قوموں خاصکر جرمانیوں اور اٹالیوں کا رجحان اس طرف تھا کہ جہاں تک ممکن ہو چھوٹے سے چھوٹا سیاسی اتحاد اختیار کیا جائے۔

کسی سلطنت کے لئے غیر سلطنتوں کے مقابلے میں اپنی طاقت کو بڑھانے کے دوہی بڑے ذریعے ہیں ایک سیاسی فراست (ڈپلومیسی) دوسرے فوج (بری اور بحری) جو سلطنت اپنی فوجی قوت اپنے ارکان کی جنگی ہمت اور اپنے سلاح جنگ کے قائم رکھنے کو اپنا خاص فرض سمجھتی ہو وہ "جنگی سلطنت" کھلاتی ہے۔ اس قسم کی سلطنتوں کی مثال یونانیوں میں اسپارٹا اور جرمانی شہنشاہی کے قیام کے پہلے سلطنت پروشیا تھی جب کسی سلطنت کو باہر سے خطرہ ہو اور وہ اپنے ضروری حدود تک پھیلنا چاہتی ہو تو اس کی جنگی قوتوں پر یہ غیر معمولی بار لابد ہو جاتا ہے مگر ایک اوسط درجے کی سلطنت جو اپنی پوری ترقی پر پہنچ گئی ہو اسے کبھی اس امر کو فراموش نکرنا چاہئے کہ فوجی قوت اسکے اجرائے کار کا صرف ذریعہ ہے، غائت نہیں ہے اور اس قوت پر غیر ضروری بار ڈالنا سلطنت کے صحیح اغراض کے لئے مضرت رسان ہوگا

اغراض اقتصادی

(۲) بعض اوقات "اقتصادی اغراض" کو خاص طور پر نمایاں جگہ دیجاتی ہے چنانچہ جب باشندوں کا بڑا کام مویشیوں کی پرورش اور پرداخت ہو تو سلطنت کو "سلطنت راعیہ" (Pastoral) اور زراعت سب سے اہم مشغلہ ہو تو "سلطنت زرعیہ" اور صنعت و حرفت پر دار و مدار ہو تو "سلطنت صناعیہ" اور تجارت اصل چیز ہو تو "سلطنت تجاریہ" کہتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ یہ اغراض زیادہ تر خاص افراد کے ہوتے ہیں اور صرف جزدی طور پر تمام قوم کے اغراض میں شمار ہوتے ہیں مگر خاص اسی وجہ سے کہ لوگ انھیں میں کلیتہً یا غیر ضروری طور پر منہمک ہو جاتے ہیں، سلطنت کے دوسرے فرائض کی طرف

سے غفلت پیدا ہو جاتی ہے اور تمام دیگر اغراض کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ علاوہ اس کے ایسی قوموں میں سیاسی جذبے کو کبھی پوری ترقی نہیں ہوتی بلکہ ذاتی اغراض کے محدود اور خود غرضانہ انہماک میں وہ خراب ہو جاتا ہے۔ ایک زراعی سلطنت میں قوم غریب اور جاہل رہے گی۔ زرعی سلطنت میں لوگ اعلیٰ تعلیم و تربیت کو شک اور تنفر کی نظر سے دیکھیں گے، کیونکہ ان کے کام کے لئے طبعاً سختی پسند عادات کی ضرورت ہے۔ صناعی سلطنت میں محنت مزدوری کرنے والوں کی بدامنیاں اور اشیائے بیرونی کے اخراج سے خاص خطرے پیدا ہونے رہتے ہیں اور علیٰ ہذا سلطنت تجاریہ محض دکانداری کو اپنا منتہائے خیال سمجھکر بے راہ روی میں پڑ سکتی ہے۔

یا اغراض ذہنی (۳) یہ بھی ممکن ہے کہ کسی قوم کی زندگی خاص کر ذہنی و دماغی اغراض کی طرف مائل ہو اور اس سے ایسی سلطنت پیدا ہو جائے جسے ہم "ذہنی سلطنت" کہتے ہیں پیرکلیس کے زمانے میں اسپارٹا کی فوجی سلطنت کی مقابل ایتھنز کی ذہنی سلطنت تھی ایتھنز کی ذہنی سلطنت اپنے شغف علمی اور اپنے باشندوں کے حصول علم کی قابلیت کا غیر فانی ثبوت اپنے بعد کی نسلوں کے لئے چھوڑ گئی ہے۔ فلورنس و وینس اور اینٹورپ میں ایسے دور گزرے ہیں جب ذہنی اغراض تمام دوسرے اغراض پر غالب آ گئے تھے۔ اس زمانے کی چینی سلطنت بھی اس کی ایک مثال ہے مگر اس کی ذہنی قابلیت ترقی کن نہیں رہی ہے بلکہ ساکت ہو گئی ہے اسی طرح زیورچ اور جنیوا دونوں کو اس امر پر فخر ہے کہ وہ اپنے مدارس عامہ پر خاص توجہ کرتے ہیں۔ ان اغراض کے اعلیٰ و افضل ہونے میں کوئی شک نہیں مگر قوم کی دوسری طاقتوں کو نقصان پہنچا کر انھیں غیر معمولی ترقی دینا ایک مضر طرز عمل کی علامت ہے۔

یا آزادی کی قانونی ضمانتیں (۴) بعض سلطنتوں میں خاص کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ قومی اور انفرادی آزادی کی قانونی ضمانتوں کو ترقی دیجائے اور اس طرح آزاد قانونی سلطنتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی نمایاں مثالیں سوئزرلینڈ کے شمالی صوبجات اور شمالی امریکہ کی ریاستیں ہیں۔ جن کلیات کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ان سب سے زیادہ یہی کلیہ غایت سلطنت کی عام خیال کی تہ میں موجود ہے۔

یا اتحاد قومی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جب قومیت کا احساس زیادہ قوی جوش کے ساتھ

سیاسی زندگی کو متاثر کر دیتا ہے اور جبکہ قومی اتحاد کا اظہار ہی سلطنت کی خاص غایت سمجھا جانے لگتا ہے تو اس سے "خونی سلطنتیں" پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگلے زمانے میں فرانس کا یہی حال تھا اور ہمارے زمانے میں سلطنت اٹالیا اور جرمانی شہنشاہی پر یہی اثر غالب ہے۔

سلطنت کے بالواسطہ فرائض

سلطنت کی اس لازمی اور بلاواسطہ غایت کے علاوہ جس کا تعلق خود قوم سے ہے سلطنت کے ان تمام بالواسطہ فرائض پر بھی لحاظ کرنا چاہیے جن کا تعلق محض شخصی زندگی سے ہے اس موقع پر بالتخصیص ضروری ہے کہ سلطنت کے حدود عمل کے لیے کوئی تعیین قائم کیا جائے۔ سلطنت کے فرائض کی طرح افراد کے فرائض کا بھی یہ کلیہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ انفرادی خصوصیت و قابلیت کا ارتقا و اظہار ان کا کام ہے مگر اس کے ساتھ ہی خاندان قوم اور نوع انسان کے اغراض سے اس کا ہم آہنگ ہونا بھی ضروری ہے۔ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے شخصی آزادی لازمی ہے۔ سلطنت کا پہلا فرض یہ ہے کہ شخصی آزادی کو ناواجب دست اندازی سے محفوظ رکھے اور خاص کر خود اپنی طرف سے اس شخصی آزادی کو محدود کرنے اور اسے مضطر و پریشان کرنے سے بچتی رہے۔

عمل سلطنت کی حد بندی

ایک مقدم ضرورت یہ ہے کہ سلطنت خود اپنی نوعیت کے لحاظ سے جس طرح محدود ہے اس کا ایک صاف تصور قائم کر لیا جائے۔

(۱) سلطنت حیات عامہ کی ایک خارجی تنظیم ہے اس لیے اس کے قوائے عمل صرف انھیں اشیاء کے لیے ہیں جو خارجاً محسوس ہوتی ہیں واضح ہو باطنی روحانی زندگی کے لیے نہیں ہیں جس کا اظہار کبھی الفاظ و اعمال سے نہیں ہو سکتا ہے اس لیے سلطنت کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ حیات انفرادی کے تمام اغراض پر محتوی ہو جائے کیونکہ اس زندگی کے بہت سے پہلو اور ایسے پہلو جو سب سے زیادہ اہم ہیں اس کی نظر سے مخفی رہیں اور وہاں تک اس کی طاقت کی رسائی نہیں ہے۔ افراد کے فطری خطرات سلطنت سے بالکل آزاد ہیں۔ سلطنت بیوقوف کو باعقل بزدل کو باہمت اور نابینا کو بینا نہیں بنا سکتی۔ دلوں میں محبت کے شعلے زن ہونے میں سلطنت کا کوئی دخل نہیں ہے وہ کسی پڑھنے والے کے خیال کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ نہ روایات کی غلطیوں کی اصلاح کر سکتی ہے جس وقت افراد کی زندگی اور خاص کر روحانی زندگی کا سوال پیش آ جاتا ہے سلطنت کو فوراً یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی دوربینی اور طاقت ایسے حدود کے اندر بند ہیں جن سے وہ کسی

طرح گزر نہیں سکتی۔

(۲) سلطنت کی بنا تمام تر انسان کی عام فطرت اور خاص کر اپنی ہی قوم کی عام فطرت پر قائم ہے اس لئے شخصی زندگی کی خالص انفرادی کیفیت پر اسے قابو نہیں مل سکتا بلکہ اسکا قابو صرف وہیں تک ہے جہانتک کہ یہ زندگی انسان کی عام فطرت اور مشترک ضروریات کے تابع ہے۔ مثلاً سلطنت یہ کر سکتی ہے کہ تمام لوگوں کے لئے کسی مادی شے یعنی ملک کا قبضہ مساویانہ طور پر محفوظ کر دے مگر اس ملک کا مصرف و انتظام اسے افراد ہی پر چھوڑنا پڑیگا پیگنینی کے پاس بیلیا (وائیولن) اور لسٹ کے پاس پیانو اور کاول باخ کے پاس کھریا کی رنگین پنسلوں کا ہونا بالکل اس سے مختلف حیثیت رکھتا ہے کہ یہی آلات کسی ناواقف شخص کے پاس ہوں۔ ملک کی اس مزید کارآمد صورت سے سلطنت کو کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ یہ مشترک حیثیت نہیں بلکہ انفرادی حیثیت ہے۔ علی ہذا سلطنت سرسری اور عمومی طور پر مناکحت کے شرائط اور زوجین کے حقوق معین کر سکتی ہے بلکہ حقیقتاً یہ اس کا فرض ہے کیونکہ اس پر خاندان کی حفاظت اور قوم کی صحت اخلاقی کا دارومدار ہے مگر یہ کہ کوئی خاص عقد کس طرح تکمیل کو پہنچا اور خاندانی زندگی کی جزوی صورتیں کیا ہیں، یہ امور سلطنت کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہیں۔ ولہلم فون ہمبولٹ نے اسے محسوس کیا اور وہ اسی خیال میں بہک گیا کہ معاملات مناکحت کو قانونی اثر سے نکال لے اور اسے بالکل ہی افراد کی مرضی پر چھوڑ دے۔ مذہبی قانون اس کے برعکس غلطی میں مبتلا ہو گیا اور اس نے ان معاملات پر ایسے قانونی ضوابط عائد کرنا چاہے جن کا تعلق ذاتی آزادی سے تھا۔ سلطنت نے جب ارتداد کو جرم قرار دے کر اس کے لئے سزا دی تو وہ اپنے فطرتی حدود سے متجاوز ہو گئی اور شخصی آزادی میں اس نے غیر ضروری مداخلت کی۔

(۳) سلطنت کی حکمرانی حد قانون سے زائد وسیع نہیں ہے کیونکہ ہر ایسی حکمرانی جسے جبر کی طاقت حاصل ہو قانون ہی کی بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے، مگر قانون خود اپنی جگہ پر اسباب ذیل سے محدود ہے۔

(**الف**) افراد کے باہم امن و آشتی کے ساتھ رہنے کی ضرورت یعنی حیات عامہ کے ضروری شرائط کا تسلیم کرنا (اس ضمن میں قانون شخصی اور قانون قصاصی وغیرہ داخل ہیں) اور

(**ب**) قوم کی ہستی اور ارتقاء اور جہاں تک تحفظ و بہبود کی حاجت ہے۔ افراد

کی شخصی زندگی کا اس کے تابع ہونا (اس ضمن میں محصول، فوجی خدمات، آئینی اور انتظامی قوانین شامل ہیں)۔

جہاں تک قانون کی بحث ہے سلطنت کو اعلیٰ اختیار حاصل ہے کیونکہ قانون کی توضیع اور اس کا عملدرآمد فی نفسہ وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق سلطنت سے ہے۔

(۴) سلطنت اپنی انتظامی خبرگیری اور نتیجتہً اپنے اثر کو تنظیمات قانونی کے حدود سے آگے بڑھا سکتی ہے مگر اس صورت میں اسے جبر کا اختیار باقی نہیں رہتا اور اس کے فرائض صرف اس حد تک رہتے ہیں کہ جن اہم معاشری امور میں سلطنت کی امداد کی ضرورت ہو وہ ان کی تائید وہمت افزائی کرے اس کی مثال سلطنت کی اقتصادی اور تعلیمی کارروائیاں وغیرہ ہیں۔ اس موقع پر سلطنت کی خبرگیری قومی بہبود سے تجاوز کرکے معاشری بہبود پر وسیع کی گئی ہے مگر صرف اس وجہ سے کہ آخر الذکر کو اس کی مدد کی ضرورت ہے۔

تعلیق۔ مل اور اسپنسر کے ان تصانیف کے علاوہ جن کا ذکر تیسرے باب کی تعلیق (الف) میں ہو چکا ہے افعال سلطنت کے تحدیدات کے متعلق انگریزی کی کتب ذیل میں بھی مختلف نقطۂ نظر سے بحثیں کی گئی ہیں۔

برگس علم السیاست (Political science) حصہ اول کتاب دوم باب چہارم۔ کننگہم سیاسیات واقتصادیات (Politics and Economics) ڈانستھراپ "انفرادیت" (Individualism) گرین "خطبات دربارہ ذمہ داری سیاسیہ" (در تصانیف جلد دوم) اور خطبہ دربارۂ آزادانہ وضع قانون' و آزادی معاہدہ" (در تصانیف جلد سوم) گوشن خطبہ عدم مداخلت ودست اندازی حکومت (ڈمبر افلاسفیکل انسٹیٹوٹ) فیرر "سلطنت بہ تعلق تجارت" جیونز "سلطنت بہ تعلق مزدوری" (یہ دونوں انگلش سٹیزن سیریز میں ہیں) میکے (مدیر) عذر حریت (A plea for Liberty) (مع تمہید از اسپنسر) ڈانیسکو "تحدیدات آزادی افراد" (Limits of Individual Liberiy) چی ٹی "اصول مداخلت سلطنت" (Principles of State Interference) لوک "علم الاقتصاد" (Political Science) کتاب سوم۔ مبادی سیاسیات حصہ اول جے۔ ایف اسٹفن حریت مساوات واخوت (Liberty, Equality. Faternity) وولزی "علم السیاست" حصہ دوم باب پنجم۔ انگریزی مترجم۔

چھٹا مقالہ

سلطنت کی شکلیں

پہلا باب

ارسطو کی تقسیم

ارسطو کی تقسیم

دو ہزار برس سے زیادہ ہو گئے کہ ارسطو نے اشکال سلطنت کی تقسیم کی تھی جو آج بھی عموماً مسلم مانی جاتی ہے۔ اس تقسیم کے قائم کرنے میں اُس نے فرمانروائی بلکہ حکومتی اقتدار کے تصور سے ابتدا کی۔ اُس نے یہ قرار دیا تھا کہ ہر سلطنت میں ایک سب سے بڑا کارکن ایسا ہوتا ہے جو طاقت کا مرکز ہو، اور تمام دوسرے کارکن اس کے تابع ہوں۔ اس اعلیٰ کارکن کی ہیئت، سلطنت پر اپنا خاص نقش قائم کر دیتی ہے پس یہ قرین فطرت اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہی سلطنتوں کی تقسیم کی بنیاد قرار دیا جائے۔

جائز سلطنتیں

ارسطو سلطنت کی جائز شکلوں میں اُن سب کو شمار کرتا ہے جن کا مقصد جماعت (یا ملت) کی بہبودی ہے۔ بہ خلاف اسکے جو سلطنتیں صرف حکمرانوں کے مطلب پر نظر رکھتی ہیں انہیں وہ "فاسد" قرار دیتا ہے۔

اس خیال کی بنا پر اسے سلطنت کی صحیح بنیادی شکلیں صرف تین ملتی ہیں اور اُن میں ہر ایک کے ساتھ ایک فاسد شکل بھی لگی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اعلیٰ طاقت یا تو کسی ایک فرد واحد میں مرکوز ہوگی یا چند افراد (قلت) یا متعدد افراد (کثرت) کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس سے حسب ذیل صحیح قسمیں پیدا ہوتی ہیں:-

۱۔ بادشاہی یعنی فرد واحد کی حکومت جسے ارسطو "بادشاہی" کہتا ہے آج کل کے محاورے میں اُسے شاہی حکومت (Monarchy) کہتے ہیں۔

۲۔ اعیانی حکومت یعنی چند (قلیل التعداد) ممتاز ترین افراد ملک کی حکومت۔

۳۔ کثرت یا عوام کی حکومت کو ارسطو نے حکومت عامہ (پالیٹی Polity) کہا ہے اسکے زمانے میں یونانی شہروں اور خاصکر ایتھنز کی عمومی حکومت ذلیل ہوگئی تھی اس لئے وہ کثرت کی اس حکومت کے لئے جو اغراض عامہ کو مدنظر رکھے "حکومت عمومی" کا لفظ استعمال کرنے سے بچنا چاہتا ہے اور اس لفظ کو اس حکومت کی فاسد صورت کے لئے مقرر کرتا ہے مگر بعد کو اس تیسرے طریقۂ حکومت کیلئے حکومت عمومی کا لفظ پھر عام طور پر استعمال ہونے لگا اور ہم اسی مفہوم میں اسکا استعمال کریں گے۔

فاسد صورتیں

تین فاسد صورتوں کو ارسطو نے حسب ذیل بیان کیا ہے۔

۱۔ حکومت خودسری، یعنی ایک فرد واحد کی حکومت جسکی مقدم غرض خود اپنے ذاتی اغراض ہوں۔

۲۔ عدیدیت، اہل ثروت کی حکومت خاص اپنے فائدہ کے لئے۔

۳۔ ازدحامیت، یعنی غریب (اور غیر تعلیم یافتہ) عوام الناس کی بے قید حکومت اسکو ارسطو "عمومیہ" (Democracy) کا نام دیتا ہے۔

کمیت کے بہ نسبت کیفیت زیادہ اہم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس تقسیم میں ارسطو نے صاحبان اقتدار کی تعداد پر خاص زور دیا ہے مگر یہ امر خود اسی کے اس بنیادی اصول کے خلاف پڑتا ہے کہ سلطنت کی شکل حکمرانوں کی کیفیت سے متعین ہونا چاہیئے نہ کہ کمیت سے۔ ارسطو نے خود اس لغزش کو محسوس کرلیا تھا اور اس لئے اس نے یہ جتا دیا تھا کہ تعداد کا فرق بالطبع حکمران طاقت کے خصائص سے تعلق رکھتا ہے اور اس آخرالذکر صفت کو آخری منبع قرار دینا چاہیئے، تاہم اصول کیفیت کی قطعیت کو اس نے کافی طور پر ظاہر نہیں کیا ہے۔

لے ارسطو، سیاسیات اس مسئلے کے متعدد جدید بیانات سے غلطی میں پڑکر پہلے اسے نظرانداز کرگیا تھا اور اسلئے اس سیاسی فلسفی اعظم پر بیجا اعتراض کیا تھا۔ اسپارٹا میں اگرچہ دو بادشاہ ایک ساتھ حکومت کرتے تھے مگر وہ حکومت شاہی تھی دیگر ارسطو کی رائے کے موافق ایسا نہیں تھا کیونکہ وہ اسے "اعیانیت" اس پست تر مفہوم میں کہتا ہے جس مفہوم میں یہ لفظ مرکب سلطنت کی شکل پر عاید ہوتا ہے۔ اسپارٹا کی بادشاہیت کو وہ صرف "موروثی حین حیات سپہ سالاری" خیال کرتا ہے اور یہ ایک عہدہ تھا جو حکومت کی ہر شکل سے مطابقت پیدا کرسکتا تھا) وینس میں اعیانیت تھی گو کہ سلطنت کا سرگروہ "ڈوج" ہوا کرتا تھا۔

ارسطو کی تقسیم ناکمل ہے

ایک اور اعتبار سے بھی ارسطو کی تقسیم میں اصلاح کی ضرورت ہے یہ تقسیم ناکمل ہے کیونکہ تاریخ میں بہت سی ایسی سلطنتوں کے حالات ملتے ہیں جو اُسکی ان تینوں جائز اشکال میں سے کسی شکل کی تحت میں نہیں آسکتیں۔ ان تینوں شکلوں میں اعلیٰ طاقت کا تعلق انسان سے ہے، خواہ وہ ایک شخص سے ہو یا چند افراد سے یا تمام قوم سے۔ مگر ایسی سلطنتیں بھی ہوگزری ہیں جن میں کسی قسم کا انسانی اقتدار نہیں تسلیم کیا گیا ہے بلکہ اعلیٰ طاقت خدا، یا کسی دیوتا، یا کسی دوسرے فوق الانسان ہستی یا کسی تخئیل کے تابع سمجھی گئی ہے۔ حکمرانی کرنیوالوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ خود اپنے اختیار سے حکومت نہیں کرتے بلکہ وہ کسی غیر مرئی حکمران کے خادم یا نائب ہیں جو انسان کی فطری کمزوریوں سے مبرا ہے۔

سلطنت کی یہ چوتھی شکل جب رعایا کے بہبود کی جانب مائل ہو تو اصطلاح میں حکومت مذہبی ہوسکتی ہے اور اسکی فاسد صورت "حکومت ادہامیہ" ہوگی۔

تعلیق۔ اشلائیر ماخر نے یہ دعوی کیا ہے کہ سلطنت کی یہ تین قدیم قسمیں یعنی حکومہائے شاہی واعیانی وعمومی، سب کی سب ہمیشہ ایک دوسرے میں ملی رہتی ہیں۔ مثلاً حکومت عمومی میں سربرآوردہ اشخاص کو اعیان حکومت سے تشبیہہ دیجاسکتی ہے اور بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ پریکلیس کی طرح ایک شخص بادشاہ کا انداز اختیار کرلیتا ہے۔ حکومت شاہی پر بھی یہی امر صادق آتا ہے اور مرابو کا یہ کہنا بجا تھا کہ "ایک اعتبار سے جمہوریت شاہی ہے اور ایک اعتبار سے شاہی جمہوریت ہے"، تاہم یہ قدیم تقسیم بے معنی نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ اعلیٰ طاقت کی ہیئت ظاہری کا قطعی اثر تمام نظام سلطنت پر پڑتا ہے اور نہایت ہی اہم سیاسی اصول کا اس سے قریب ترین واسطہ ہوتا ہے۔

دوسرا باب

نام نہاد ممزوج سلطنت

جمہوریہ روما

قدیم زمانے میں بھی یہ کوشش کیگئی تھی کہ ارسطو کی تقسیم میں ایک چوتھی شکل ممزوج سلطنت کی بڑھا دیجائے [الف] سسرو کا یہ خیال تھا کہ روما کی سلطنت ایک ایسی سلطنت ہے جو اس چوتھی شکل کا نمونہ ہے، یعنی وہ بادشاہی، اعیانی اور جمہوری، سب شکلوں کا ایک مجموعہ مرکب ہے اور سسرو کا یہ دعوے ہے کہ چاروں میں یہی شکل سب سے بہتر ہے۔

سلطنت ممزوج سے کیا مقصد ہے

سلطنت ممزوج کا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ اس میں بادشاہی، اعیانی اور عمومی اشکال حکومت معتدل کردئے گئے ہیں یا دوسرے سیاسی عناصر نے اُن کی وسعت کو محدود کردیا ہے، مثلاً اعیانی سینات (یعنی ایوان اعلیٰ) یا نیابتی مجلس عوام کے قیام سے حکومت شاہی کے اختیارات محدود کردئے جائیں۔ اس صورت میں یہ صحیح ہے کہ اس قسم کا تقسیم شدہ نظام سلطنت اُس سے بہتر ہے کہ ایک شخص واحد، یا چند افراد یا فریق غالب بلا روک ٹوک مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرے، مگر اس قسم کے امتزاج سے سلطنت کی کوئی نئی شکل نہیں پیدا ہوتی۔ کیونکہ حکمرانی کی اعلیٰ طاقت بہر نوع بادشاہ، اعیان مملکت یا عوام کے ہاتھ میں مرکوز ہوتی ہے۔

برخلاف اسکے، اگر اس سے یہ سمجھا جائے کہ اعلیٰ حکمران طاقت بنفسہٖ بادشاہ، اعیان مملکت اور عوام میں تقسیم کردی گئی ہے اور اس طرح دو اعلیٰ حکومتیں پہلو بہ پہلو قائم ہوگئی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک دوسرے سے آزاد ہے تو اس صورت میں ٹاسی ٹس کا یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ اس قسم کی مرکب سلطنت کا خیال ہی ترک کردینا چاہئے اُسکا دعوے ہے اور صحیح دعوے ہے کہ اول تو اس قسم کی سلطنت کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے اور اگر ایک وقت کیلئے وجود میں آبھی جائے تو اسکا برقرار رہنا کسی صورت سے نہیں ہوسکتا۔

(الف) ارسطو نے خود بھی ممزوج نظام ہائے سلطنت کو تسلیم کیا ہے۔ انگریزی مترجم)

زمانہ مابعد کے لوگوں نے انگلستان کو اسی قسم کی ایک ممزوج سلطنت خیال کرلیا ہے جہاں حکمرانی بادشاہ، امرا، اور عوام کی تین اعلیٰ طاقتوں میں منقسم ہے اور ان لوگوں نے یہ دعوے کیا ہے کہ انگریزی نظام سلطنت ہر طرح پر مکمل ہے محض اسوجہ سے کہ اس ممزوج شکل کی عملی صورت کی یہ انتہائی حد ہے مگر یہ خیال کرنا غلطی ہے کہ انگریزی نظام سلطنت، اعلیٰ طاقت حکمرانی کی تقسیم سے پیدا ہوا ہے (ب) قدیم زمانہ میں یہاں کی سلطنت کی مخصوص شکل بادشاہی کی تھی اور یہی بادشاہی اولاً امرا کے ذریعے سے اور بعد ازاں عوام کے شمول سے بتاریخ محدود کردی گئی ہے۔ سلطنت کی خارجی شکل ہمیشہ شاہی رہی ہے اور نہ صرف اعلیٰ طاقت حکمرانی (یعنی عاملانہ طاقت) بلکہ جماعات قانون سازی (یعنی پارلیمنٹ) میں بھی بلند ترین منصب بادشاہ ہی کی جانب منسوب رہا ہے۔

خیال کرنا کہ شے حکومت ہے نہ کہ مجلس وضع قوانین

علاوہ اسکے بالعموم اسکا خیال نہیں رکھا جاتا کہ ارسطو کا اصول تقسیم تشریعی اختیار کی نوعیت و ترکیب پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ ہر ایک ترقی یافتہ سلطنت میں قانون سازی میں بالعموم تمام قوم کے خاص عناصر کی نمائندگی ہوا کرتی ہے، اسکے بجائے اس اصول کا انحصار حاکم و محکوم کے تخالف باہمی اور اس امر کے تصفیے پر ہے کہ اعلےٰ انتظامی قوت کس کے اختیار میں ہے۔ یہ انتظامی طاقت تقسیم نہیں ہوسکتی حتیٰ کہ ایک بادشاہ اور اسکے وزرا کے درمیان بھی اسے منقسم نہیں کرسکتے کیونکہ اس سے دوعملی یا سہ عملی پیدا ہوجائیگی اور یہ امر بجائے خود سلطنت کی خصوصیت حقیقی کے خلاف ہوگا اس لئے کہ ایک زندہ جسم کے مانند سلطنت کو اتحاد کی ضرورت ہے تمام ذی حیات موجودات میں مختلف قویٰ اور مختلف اعضائے عمل ہوتے ہیں مگر اس تعدد کے باوجود سب کے سب

(ب) (کسی حکومت کا ممزوج ہونا اور کسی حکومت کا اجزائے مرکبہ سے پیدا ہونا ایک ہی بات نہیں ہے۔ ایتھنز میں سولن کے ترتیب دادہ نظام حکومت کے متعلق ارسطو نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں انھیں دیکھنا چاہئے۔ انگریزی مترجم)

(ج) (اس تمام کتاب میں بنجلی نے انگریزی نظام حکومت میں بادشاہ کی طاقت کو جس مبالغے سے بیان کیا ہے اُس میں اُسے مغالطہ ہوا ہے۔ اسکے بارے میں زیادہ صحیح خیال معلوم کرنے کے لئے بجٹ کی کتاب "نظام سلطنت انگلشیہ" دیکھنا چاہئے۔ انگریزی مترجم)

متحد ہوتے ہیں، بعض اعصاب علیہ اعلیٰ (رئیس) ہوتے ہیں اور بعض ادنیٰ (خادم) مگر ہمیشہ ایک اعلیٰ عضو ہوتا ہے اور وہی کار فرمائی کی تمام قوت کا مرکز ہوتا ہے۔ سر اور جسم زندگی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علٰحدہ اور آزاد نہیں ہیں مگر وہ دونوں ہم مرتبہ بھی نہیں ہیں اسی طرح سلطنت میں بھی ایک اعلیٰ کارفرما کا ہونا اسکی ہستی کے لئے لازمی شرط ہے اور اگر اتحاد سلطنت کا قائم رکھنا مقصود ہو تو اعلےٰ قوت کو مختلف اجزا میں منتشر نہیں کر سکتے۔

پس سلطنت کی کوئی ایسی چوتھی شکل نہیں ہے جسے سلطنت ممزوج کا نام دیا جاتا ہے اور امتزاج جہاں تک ممکن ہے اُس پر اقسام تین مذکورۂ بالا مجرد سلطنتوں کے بیان میں بحث کیجا چکی ہے۔

تعلیق - ہمارے اس زمانے میں "جمہوریت نما شاہی" کا بہت چرچا ہو رہا ہے اور اس قسم کی سلطنتوں کا قائم کرنا اس زمانے کا مابہ الامتیاز کام سمجھا گیا ہے، اگر اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ آنذوں شاہی کی بنیاد پسندیدگی جمہور پر قائم ہونا چاہئے اور شاہی کو جمہور سے قریبی تعلق ہونا چاہئے تو یہ خیال صحیح ہے مگر اس قسم کی سلطنت خالص شاہی حکومت ہوگی۔ کسی اعتبار سے وہ ممزوج سلطنت نہیں ہوگی۔ اگر اسکا مفہوم یہ ہے کہ شاہی جمہوری تنظیمات سے محدود ہو۔ جیسے فرانس میں ۱۸۳۰ء میں جولائی والی بادشاہی تھی جو "جمہوری تنظیمات سے گھری ہوئی تھی" تو اسکا بھی ایک مطلب ہے مگر تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس صورت میں یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ دونوں طریقوں کے اصول ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور ترقی کن عمومیت جمہوریت شاہی کو الٹ دیگی، لیکن اگر اس قسم کی سلطنت کا مفہوم یہ ہو کہ اعلیٰ اختیار عاملانہ اس طرح پر مخلوط یا منقسم ہے کہ نصف شاہی اور نصف عمومی ہے تو اسکا کوئی قرین عقل مطلب نہیں معلوم ہوتا اور باغلب وجوہ ایسی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ ۱۷۸۹ء کے فرانسیسی مجلس واضع نظام سلطنت کا بہ شمول روسو یہ خیال تھا کہ اقتدار شاہی کا دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا ممکن ہے تاکہ اس میں سے ایک قوم کے اختیار میں ہو اور دوسرا بادشاہ کے اختیار میں، مگر عمل میں آتے ہی معلوم ہو گیا کہ یہ طریقہ بر خود غلط اور ناقابل انضباط تھا پیرہ فریڈرا نے اصول حقوق عامہ (Principes du droit public)

میں یہ ظاہر کیا ہے کہ شاہی میں جب امتیازات برطرف کر دئے جائیں تو وہی جمہوریت ہے مگر امتیازات کے تحت میں اُسنے ہر طرح کے اعیانی اعزاز کو بھی داخل کیا ہے پس اُسکے نزدیک اس فقرے کے مفہوم میں صرف وہ بادشاہی داخل ہے جس میں عمومی جماعات ہوں مگر اعیانی جماعات نہ ہوں یعنی یہ ایک ناکمل صورت سلطنت کی ہوگی جس میں اعیانی اجزا کا لحاظ نہ کیا گیا ہو یا اُسے دبا دیا ہو۔ مقابلہ کرو اسی مقالے کے باب ۱۴، ۱۵، ۱۶ سے جن میں آئینی بادشاہی سے بحث کی گئی ہے۔

تیسرا باب

نظریہ ارسطو کے ترقیات مابعد

مونٹیسکیو — مونٹیسکیو نے اگرچہ اصلاً ارسطو کی تقسیم کی پیروی کی ہے مگر اُس نے بادشاہی، اعیانی اور عمومی تینوں حکومتوں کے لئے (حکمرانوں کی تعداد سے قطع نظر) روحانی اور اخلاقی اصول کا پتا لگا کر ایک نمایاں علمی ترقی دکھائی ہے۔ یہ ایک دوسرا سوال ہے کہ اس مقصد میں اسے کامیابی ہوئی یا نہیں، اسکی رائے میں نیکوکاری (صلاح) جمہوریت کا، اعتدال اعیانیت کا اور اعزاز بادشاہی کا اور خوف، حکومت خودسرانہ کا اصول ہے۔ اُس نے اسطرح خودسرانہ حکومت کو سلطنت کی ایک چوتھی قسم قرار دیدیا ہے۔ مگر ارسطو کے نزدیک وہ معتدل حکومت کی فاسد شکل ہے" اور یہی زیادہ بہتر ہے۔

اشلائیر ماخر — اشلائیر ماخر نے قابل قدر کوشش یہ کی ہے کہ سلطنت کی متعدد شکلوں کو سیاسی احساس کے ارتقائی مدارج کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ سلطنت کی ابتدا اُس وقت ہوتی ہے جب لوگوں میں "حکومت اور رعایا" کے امتیاز لازمی کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ اس جانب پہلا قدم اُس وقت اُٹھایا جاتا ہے جب کسی چھوٹی سی قوم (People) یا کسی قبیلے میں یہ احساس پیدا ہوجاتا ہے اور یہ نیا جذبہ بالعموم "اُس تمام جماعت میں جو سیاسی زندگی کے لئے تیار ہوتی ہے، سرایت کرجاتا ہے"۔ اُسکے بعد اس امتیاز کا خیال سب میں نشو و نما پاتا ہے۔ وہ سب کے سب حکومت کے بنانے میں متحد ہوجاتے ہیں اور پھر اُس سے الگ ہوکر رعایا کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ یہ ابتدائی حکومت جمہوریت ہوتی ہے جس میں جذبات عامہ اور اعراض شخصیہ کے درمیان تخالف بہت ہی خفیف صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگرچہ تمام جماعت سیاسی زندگی کے لئے تیار ہو مگر سلطنت قائم کرنیکی تحریک سب پر یکساں اثر نہ ڈالے بلکہ سیاسی احساس اولاً کسی ایک فرد یا چند افراد میں نشو و نما پائے۔ اس سے نامساوات پیدا ہوجاتی ہے اور اسکا نتیجہ شاہی یا اعیانی حکومت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس درجے میں جب تک کہ

سلطنت چھوٹی رہتی ہے، تینوں شکلیں ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہوتی ہیں اور بہت آسانی سے ایک دوسرے کی صورت اختیار کرسکتی ہیں مگر فطری میلان ہمیشہ عمومیت کی طرف رہتا ہے کیونکہ عوام بہت جلد اُس ایک شخص یا اُن چند اشخاص کے برابر ہوجاتے ہیں جن میں سب سے پہلے سیاسی احساس پیدا ہوا تھا۔

دوسرے درجے میں متعدد قومیتیں شامل ہوجاتی ہیں اُن میں سے کوئی ایک قبیلہ باقی دوسرے قبیلوں پر حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ جسطرح سابقہ درجے میں سلطنت کی شکل اصلاً جمہوری ہوتی ہے، اُسی طرح اس درجے میں اُسکی شکل اصلاً اعیانی ہوتی ہے۔ اُسکا جمہوری ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ تمام قبیلے ایک حکمران قبیلے کے تابع ہوتے ہیں اور اسلئے ان میں مساوات نہیں ہوتی۔ خارجی حیثیت سے یہ بادشاہی کی شکل اختیار کرسکتی ہے مگر بادشاہ لازماً حکمران قبیلے کا ہوگا اور اسطرح وہ اعیان میں شامل سمجھا جائیگا۔

اس آخرالذکر درمیانی درجے سے گزر کر تیسرا اور آخری درجہ اُسوقت آتا ہے جب ایک بڑی قوم (People) پوری طرح قومی اتحاد کو محسوس کرنے لگتی ہے۔ پہلے درجے کی عمومی خصوصیت میں حاکم و محکوم کا سیاسی امتیاز پوری طرح نشوونما نہیں پاسکتا۔ اور نہ اس حالت میں ایک بڑی قوم کی وسعت پیدا ہوسکتی ہے۔ دوسرے درجے کی اعیانی حکومت میں حکمران قبیلے کے اغراض ہمیشہ اوروں سے علحدہ ہوتے ہیں اور قومی اتحاد اس سلطنت کا اصول نہیں ہوسکتا مگر تیسرے درجے میں اگر صحیح معنوں میں بادشاہی پورا نشوونما حاصل کرتی ہے اور بادشاہ اپنی ذات سے سلطنت کے اتحاد اور حکومت کی پوری طاقت کا مظہر بن جاتا ہے۔

اشلائیر ماخر کا یہ خیال سلطنت کی تینوں مسلمہ شکلوں کو ایک ذہنی بنیاد پر قائم کرتا اور سیاسی خیال کے ارتقا کے مدارج کے ساتھ انھیں متحد کرتا ہے۔ جمہوریت سب سے پہلے درجے میں اور بادشاہی سب سے آخری درجے میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں اگرچہ کوئی نیا اصول تقسیم نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ انھیں مختلف شکلوں کی تہ میں نظر غائر سے کام لیا گیا ہے مگر اشلائیر ماخر کے اس منطقی ارتقا سے تاریخ کا دور کسی طرح پر موافقت نہیں کرتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی ترتیب اکثر اسکے برعکس ہوتی ہے۔ پہلے شاہی پھر اعیانی پھر عمومیت واقعاً

یہی زیادہ فطری ترتیب معلوم ہوتی ہے کیونکہ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات جو زیادہ بہتر حالات میں ہوتے ہیں انھیں میں اولاً احساس سیاسی اپنا زور دکھاتا ہے اور اُن سے گزر کر بتدریج وسعت حاصل کرتا ہوا ادنےٰ حلقوں میں پہنچتا ہے۔

چوتھا باب

سلطنت کی چار بنیادی شکلوں کے اصول

سلطنت کی چار شکلیں

ارسطو کے قیاس کے مطابق سلطنت کی مختلف شکلوں کی تقسیم تعیینی کا انحصار حکومت اور رعایا کے بابت مختلف خیالات امتیازی پر ہے۔ اس میں خاصکر حکمرانی کی کیفیت کو (نہ کہ اسکی کمیت کو) زیادہ دخل ہے۔

تصوری حکومت

۱۔ پہلی شکل تصوری حکومت ہے، جسکا اعلیٰ ترین نمونہ مذہبی حکومت ہے اس میں لوگ اپنے حکمران کو ایک مافوق الانسان ہستی سمجھتے ہیں جو از روئے فطرت ان سے بالاتر ہے۔ خود خدا سلطنت کا حقیقی حاکم سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ تصوری حکومت کے بالکل برعکس عمومی حکومت ہے۔ اول الذکر میں لوگ اپنے سے کسی خارج و برتر بیرونی طاقت کے تابع ہوتے ہیں اور موخر الذکر میں لوگ خود اپنے اوپر حکومت کرتے ہیں۔ یعنی مجموعۃً وہ حاکم ہوتے ہیں اور منفرداً رعایا۔

۳۔ اعیانی حکومت میں حاکم و محکوم کا امتیاز خصائص انسانی کے تابع اور قوم کے حدود کے اندر ہے۔ کوئی اعلیٰ طبقہ یا قبیلہ حکمران ہو جاتا ہے اور دوسرے طبقات و قبائل محکوم ہو جاتے ہیں۔ درانحالیکہ موخر الذکر طبقات کو حکمرانی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا مگر حکمران طبقے کے افراد بھی اپنی انفرادی حیثیت سے رعایا ہی میں شمار ہوتے ہیں۔

۴۔ شاہی میں حاکم و محکوم کا امتیاز کامل ہو جاتا ہے مگر پھر بھی وہ انسانی ہی حد کے اندر رہتا ہے۔ حکومت ایک فرد واحد میں مرکوز ہو جاتی ہے، وہ صرف حکمران ہوتا ہے، اسکا شمار کسی حیثیت سے رعایا میں نہیں ہوتا گو وہ ہمہ تن سلطنت سے متعلق ہوتا ہے اور اسکی شخصیت اتحاد قوم کا مظہر ہوتی ہے۔

انکے ابتدائی نمونے

یہ چاروں بنیادی شکلیں ایک ایک ابتدائی نمونے کے پرتو ہیں۔

مذہبی حکومت، خدا کی حکومت عالم کی قائم مقام ہے مگر یہ حکومت براہ راست ہوتی ہے اور ایک اعتبار سے سخت و علی الاطلاق حکومت ہے۔

شاہی، ایک فرد واحد کے وسیلے سے نوع انسان کے اتحاد کی شان وشوکت کو بڑھاتی ہے۔ حکمران تمام سلطنت کا نمایندہ ہوتا ہے اور بادشاہ کی ذات میں قومی اتحاد کا جلوہ نظر آتا ہے۔

عمومیت، قوم یا افراد کی جماعتی حیثیت کو ظاہر کرتی ہے اور سلطنت کو ایک مذہبی حلقے یا کمیون کے رنگ میں دکھاتی ہے۔

اعیانی حکومت قوم کے اعلیٰ اور ادنےٰ اجزا کے امتیاز پر مبنی ہوتی ہے اور حکومت اول الذکر کے ہاتھ میں دیدی جاتی ہے۔ جسطرح عمومیت کا نمونہ کمیون ہے اسی طرح اعیانی حکومت کا نمونہ عالی خاندان اور بلند رتبہ امرا ہیں۔

ایک نقطہ خیال کے موافق مذہبی اور شاہی حکومت، اعیانیت اور عمومیت کے مقابل معلوم ہوتی ہیں۔ دو اول الذکر صورتوں میں حکومت کا اعلیٰ اختیار و اقتدار اس درجہ مجتمع ہوگیا ہے کہ حکمران میں کسی نوع سے رعایا کی حیثیت باقی نہیں رہتی اور وہ کسی قسم کے شخصی اغراض کا نہیں بلکہ صرف سلطنت کے اغراض کا نمایندہ ہوتا ہے۔ مذہبی حکومت میں حکمرانی کی وقعت وعظمت ربانی ہوتی اور اس وجہ سے وہ حکومت علی الاطلاق ہوتی ہے۔ شاہی میں جلالت وشوکت انسانی ہوتی ہے، اور اس لئے اس میں نسبت باہمی قائم رہتی ہے۔ اسکے خلاف اعیانی اور عمومی حکومتوں میں حاکم ومحکوم کے درمیان کوئی ایسا قطعی فرق ظاہر نہیں ہوتا۔ وہی لوگ ایک وقت میں حکمران ہوتے ہیں اور دوسرے وقت میں مطیع احکام۔ اُنکے اغراض عام و خاص دونوں ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر اُن دونوں کو ایک ہی نام ریپلک (جمہوریہ) کے تحت میں شامل کر دیتے ہیں۔ عمومیت میں فرائض کا یہ امتزاج تمام قوم (People) میں وسیع ہوتا ہے اور اعیانیت میں حکمران طبقے تک محدود رہتا ہے۔ آخر الذکر، دوسرے افراد قوم کے مقابلے میں محض حکمران ہوتے ہیں اور باخود ہا انکا نظم بالعموم عمومیت کا ہوتا ہے اور اس لئے وہ ایک ہی وقت میں حاکم بھی ہوتے ہیں اور محکوم بھی۔ پس اعیانیت ایک طرح پر عمومیت اور شاہی کے بین بین ہوتی ہے۔

لیکن ایک دوسری نظر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہی اور اعیانیت ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں اور بقیہ دو شکلوں کے خلاف ہیں۔ ان میں حاکم ومحکوم کا امتیاز منجانب انسان،

ان شکلوں پر غور و فکر

ایسے طور پر مرتب ہوا ہے کہ حکمران اس امر کو محسوس کرتے اور جانتے ہیں کہ وہ آزاد ہیں قوم انھیں ایسا ہی سمجھتی ہے، وہ اپنے ہی نام اور اپنے ہی آزادانہ اختیار سے حکومت کرتے ہیں، البتہ اعیانیت کی بہ نسبت شاہی میں یہ حالت زیادہ کامل ہوتی ہے۔ برخلاف اسکے جب خدا یا قوم کو حکمران سمجھا جائے تو لازمًا اونکا اختیار کسی وسیلے سے عمل میں آئے گا خواہ کاہنون کے وسیلے سے عمل میں آئے، یا دنیاوی حکام کے وسیلے سے۔ یہ لوگ بذات خود طبقہ رعایا سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ خدا یا قوم کے خادموں کی حیثیت سے صرف مفوضہ اختیار کو عمل میں لاتے ہیں، اس لئے انھیں حقیقی حکمران نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ ان حقیقی حکمرانوں کی جانب سے جو بذات خاص کار حکومت کو انجام نہیں دے سکتے صرف انتظام کرتے ہیں۔ انھیں ہمیشہ ایک اعلیٰ طاقت کی طرف رجوع کرنیکے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے جو خود اُن پر حکومت کرتی ہے اور جو انھیں وہ اختیارات تفویض کرتی ہے جنھیں وہ براہ راست خود نہیں حاصل کر سکتے۔

اشکال حکومت کے اعتبار سے سلطنتوں کا فرق نظام سلطنت کے قوانین کی بنیاد ہے، اور اسکا تعلق قانون عامہ سے ہے۔ یہی فرق اُنکی سیاسی زندگی کے میلانات میں بھی پایا جاتا ہے اور یہ میلان اُنکے نظام سلطنت کی ظاہری شکل کے مخالف بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا ہونا ممکن ہے کہ کوئی سلطنت کلیسائی فرمانروا قسیسوں کی کسی جماعت کے بجائے انسانی حکمران کو تسلیم کرتی ہو، مگر اسکے ساتھ اسکا انداز حکومت مذہبی کی جانب مائل ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی سلطنت اعیانیت کی طرف مائل ہو اگرچہ اُسکا قانون عام کسی قسم کی اعیانیت کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اسکی مثال سلطنت انگلستان ہے جسکی شاہی شکل اعیانی روح سے مملو ہے۔ ایسی بھی سلطنتیں ہیں جو اصولاً عمومی نہیں ہیں مگر عمومیت کی جانب مائل ہیں۔ جیسے ناروے۔ اسی طرح بعض سلطنتوں میں اگرچہ کوئی واقعی بادشاہ نہیں ہوتا مگر اُنکا میلان بادشاہی کی طرف ہوتا ہے جیسے جمہوریۂ فرانس۔

تعلیق۔ ف۔ رومر ("اصول فرق سیاسیہ" فقرہ ۲۱۶ وغیرہ میں) انسان کی زندگی کے موافق سلطنت کو چار مدارج میں تقسیم کرتا ہے اور اس تقسیم میں وہ سلطنت کی شکل کا خیال نہیں کرتا بلکہ اس کے سیاسی جذبات یعنی خصوصیت فرق کا خیال کرتا ہے۔ اُسکی

چار تقسیمیں حسب ذیل ہیں :-

مودبی سلطنت (اڈول اشٹاٹ Idolstaat) جسکا سیاسی جذبہ استیصالی (Rodical) ہوتا ہے۔

انفرادی سلطنت (انڈوڈوال اشٹاٹ Individualstaat) جسکا سیاسی جذبہ آزادخیال (Libral) ہوتا ہے۔

قبائلی سلطنت (راسّے اشٹاٹ Rassestaat) " " مستحفظ (Conservative) ہوتا ہے۔

شخصی سلطنت (فورمن اشٹاٹ Formenstaat) " " مطلق العنان (Absolutist) ہوتا ہے۔

پس ایسا ہوسکتا ہے کہ کوئی شاہی ان سیاسی جذبات کے تمام مدارج سے سلسلہ وار گزر کر آخری درجے پر پہنچے ۔ ر ۔ فون مول نے "علم سلطنت" ج ۱ ص ۲۶۲ میں اس نظریئے پر یہ اعتراض کیا ہے کہ قوم نہ جوان ہوسکتی ہے نہ بوڑھی، کیونکہ قوم میں بچے بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے بھی مگر انکا یہ اعتراض اس نظریئے کے غلط سمجھنے پر مبنی ہے ۔ قدما نے صاف طور پر یہ محسوس کرلیا تھا کہ اقوام مجموعۃً ذی حیات ہونیکے لحاظ سے افراد کے مانند جوانی اور بڑھاپے کے دور زندگی سے گزرتی ہیں، اور فون سوینی نے جرمانیا کے قانونی حلقوں میں اس خیال کو بہت واضح طور پر سمجھا دیا تھا، مگر کسی قوم کی تاریخ میں ان دوران کے پیہم گزرنیکے علاوہ یہ بھی خیال کرنا ضروری ہے کہ ہر قوم کی اپنی خاص اندرونی خصوصیت ہوتی ہے ۔ جسطرح بعض افراد کا مزاج فطرتاً بچوں کا سا ہوتا ہے اور زیادہ عمر پر پہنچکر بھی انکی یہی کیفیت رہتی ہے اور اسکے برخلاف بعضوں کے مزاج میں پختگی ہوتی ہے اور یہ پختگی سن بلاغت میں بھی نمایاں رہتی ہے، بالکل اسی طرح بعض قوموں میں فطرتاً بچپن اور بعض میں پختگی ہوتی ہے ۔ کئی ہزار برس گزرجانے پر بھی حبشی قوم کا مزاج ابتک بچوں کا سا ہے ۔ برخلاف اسکے امریکہ کے اصلی باشندوں نے کئی صدی تک پختگی سن کے خصوصیات کا اظہار کیا ہے ۔ براعظم یورپ جہاں متعدد قومیں آباد ہیں وہاں بلا اس خیال کے کہ ہسپانیوں نے کتنے مدارج طے کرلئے ہیں اُن سے پختگی سن کا اظہار ہوتا ہے اور جرمانیا سے توجوانانہ جوش کا ۔ بہرحال جوانی ہو یا بڑھاپا اور یہ جوانی اور بڑھاپا فطری خصوصیت کے باعث ہو یا حسب معمول، دورہائے تاریخی کے گزرنے کے باعث، ہر قوم کی حالت کا اثر اُس سلطنت پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا جس میں وہ رہتے ہیں آئینی شاہی کی مردانہ وضع قوم بالغی میں پہنچکر محض بچوں کا کھیل ہوجاتی ہے۔

پانچواں باب

سلطنت کے اشکال ثانوی کا اصول

سلطنتوں کی تقسیم با عتبار حقوق رعایا

سرگروہ سلطنت کی حیثیت پر سلطنت کی کل شکل کا دار و مدار ہے لیکن نظام سلطنت کی قانونی حیثیت کو پوری طرح منضبط کرنے اور ارسطو کی تقسیم کی تکمیل کیلئے یہ ضروری ہے کہ دوسرے درجے میں رعایا کے حقوق پر بھی بحث کیجائے ۔

جسطرح حکومت کی بحث میں حکمران جماعت پر نظر پڑتی ہے اُسی طرح رعایا یعنی محدود معنی میں قوم کی بحث میں اس امر پر نظر کرنا پڑتا ہے کہ انھیں حکومت پر کس حد تک نگرانی حاصل ہے اور قانون سازی میں اُنکا کیا حصہ ہے ۔

تقسیم کے اس اصول کی پیروی کرنے سے حسب ذیل تین (یا چار) ثانوی شکلیں حاصل ہوتی ہیں ۔

غیر آزاد

۱ ۔ رعایا محض جسم بے جان سمجھی جاتی ہے اور بغیر کسی شرط کے اُس پر حکمران جماعت کی اطاعت فرض ہوتی ہے، اُنھیں نہ نگرانی کا کوئی حق ہوتا ہے، نہ قانون سازی میں اُنکا کوئی حصہ ۔ اس قسم کی سلطنت میں مطلق العنان حکومت ہوتی ہے اور ہم اُسے غیر آزاد شکل کہہ سکتے ہیں ۔ سلطنت صرف اُسی صورت میں غیر آزاد نہیں ہے جب وہ کسی خود سر بادشاہ کی خود رایانہ آزو حرص کی شکار ہو (یعنی خود سر بادشاہی قائم ہو) بلکہ اُس صورت میں بھی وہ غیر آزاد ہے جب کہ حکمران قانون کی پابندی کو تسلیم کرتا اور شخصی ملک و شخصی آزادی کی حفاظت کرتا ہو (یعنی حکومت علی الاطلاق ہو)

نیم آزاد

۲ ۔ رعایا کا کچھ حصہ یعنی طبقات اعلیٰ، نگرانی کا حق رکھتے ہوں اور معاملات عامہ میں انھیں دخل ہو اور اس طرح حکومت محدود ہو جائے لیکن رعایا کا باقی حصہ اور خاصکر ادنیٰ طبقوں کو کسی قسم کا سیاسی حق اور آزادی نہ حاصل ہو ۔ یہ سلطنتیں نیم آزاد ہیں ۔ انکی مثال از منہ وسطیٰ کی وہ سلطنتیں ہیں جو جاگیردارانہ اصول یا طبقاتی حقوق پر مبنی ہیں ۔

آزاد

۳ ۔ تمام طبقات کو سیاسی حقوق حاصل ہوں ۔ تمام ملک و قوم کو حکومت پر نگرانی

اور قانون سازی میں شرکت حاصل ہو۔ یہ آزاد سلطنت' یا اس لفظ کے وسیع مفہوم میں جمہوریت ہے (اسی کو "قوم کی سلطنت" بھی کہہ سکتے ہیں)۔

حکومت میں اس شرکت و نگرانی کا عملدرآمد یا تو (الف) اہل شہر کی مجالس کی توسط سے براہ راست ہوتا ہے جیسا قدیم زمانہ کی جمہوری سلطنتوں میں تھا۔ یا (ب) بالواسطہ مجالس و نائبین کے ذریعے سے ہوتا ہے جیسا موجودہ زمانے کی نیابتی سلطنتوں میں رواج ہے۔

ابِ اگر ہم بنیادی شکلوں اور ان ثانوی تقسیموں کو یکجا کریں تو نتائج ذیل حاصل ہونگے۔

سلطنت کے چار بنیادی اشکال پر اس تقسیم کی تطبیق

۱۔ مذہبی حکومت اپنے اصول کے لحاظ سے غیر آزاد سلطنت کی طرف مائل ہوتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ خود سر حکومت ہو کیونکہ ممکن ہے کہ کار فرما "خدا" یا صاحب الہام کاہن (پروہت) ملت کے قانون کو تسلیم کرتا اور اسکی عزت کرتا ہو اسلیئے اس خدائی حکومت میں جس حد تک اعیانی جماعت یا قومی مجلس کی شرکت ہوگی اُس حد تک ممکن ہے کہ وہ دوسری یا تیسری شکل تک پہنچ جائے۔ اس لحاظ سے یہودیوں کی مذہبی حکومت جمہوری تھی۔

۲۔ اعیانی حکومت بالطبع دوسری صنف یا نیم آزاد سلطنت کی طرف مائل ہوتی ہے، لیکن جب عوام کو مطلق کسی قسم کے سیاسی حقوق نہ حاصل ہوں تو اُسے غیر آزاد سمجھنا چاہئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب روما کی طرح عوام کو حقیقی نیابت کا موقع دیا جائے تو یہ سلطنت ایک آزاد قومی سلطنت تک ترقی کر جائے۔

۳۔ عمومیت فطرتاً تیسری صنف سے تعلق رکھتی ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ قلت کیلئے عمومیت خود سرانہ حکومت کی حیثیت اختیار کر لے یا شہریوں کیلئے فرداً فرداً وہ ایک مطلق العنان حکومت بن جائے۔ ماسوا اسکے مملوک طبقے کے لئے (جیسے قدیم زمانے میں غلام اور نیم غلام تھے یا اس زمانے میں امریکہ میں حبشی ہیں) یہ نیم آزاد سلطنت کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

۴۔ شاہی جو سلطنت کے تمام اصناف میں سب سے زیادہ مختلف النوع ہے وہ ان تینوں صنفوں سے ملکر بہت سی شکلیں پیدا کر لیتی ہے۔ مشرق کی خود سر حکومتیں اور مغرب کی مطلق العنان حکومتیں بدیہی طور پر غیر آزاد ہیں۔ ازمنۂ وسطی کی بادشاہتیں اور امارتیں جن پر پادریوں اور ملکی امیدوں کی روک قائم تھی وہ نیم آزاد تھیں۔ روما کی بادشاہت کو (جس صورت سے کہ اُسے سرویس تولیس نے ترتیب دیا تھا) اور قدیم فرانسیسیوں اور جدید اہل ناروے کی بادشاہتیں آزاد شاہی کے مثال کا کام دے سکتی ہیں، کیونکہ ان سب

بادشاہتوں میں قومی مجلس کو حکومت میں صریحی حصہ دیا گیا تھا۔ زمانۂ حال کی آئینی بادشاہت اُس آزاد سلطنت کے بہت ہی قریب پہنچ گئی ہے جس میں نیابتی نظام سلطنت رائج ہو۔

ارسطو کی تقسیم اوپر سے شروع ہوتی ہے اور یہ بالکل بجا ہے۔ ہم نے اس تقسیم کو نیچے سے شروع کر کے اس پر بحث کی ہے۔ جب ارسطو کی تقسیم کو اس سے ملا کر اسکی تکمیل کر دی گئی تو اسکے تمام اعتراضات رفع ہو گئے۔ اب یہ دعویٰ کرنا ممکن نہیں ہے کہ اُس میں قطعیت نہیں ہے یا وہ زمانۂ حال کی نیابتی عمومیت اور آئینی بادشاہت کے باہمی تعلقات یا مطلق العنان بادشاہت اور ازمنۂ وسطیٰ کی محدود بہ حقوق طبقات بادشاہت کے حقیقی فرق کے مباحث سے عاجز ہے۔

تعلیق۔ سلطنتوں کی ان ثانوی شکلوں کو قائم کرنیکا خیال مجھے گیئورنگ وائتس کی سلطنتوں کی مختلف شکلوں کی دلچسپ تحقیق سے پیدا ہوا۔ (سیاسیات Politik صفحہ ۱۰۰ وغیرہ)

وائتس جمہوریت، اس سلطنت کو کہتا ہے جس میں حکومت کا انحصار یا تو قوم پر ہو یا قوم کے منتخب کردہ قائم مقاموں پر ہو۔ برخلاف اسکے، بادشاہت وہ ہے جہاں ایک شخص واحد اپنی ذاتی قوت کے بل پر قوم سے بالکل آزاد ہو کر حکومت کرتا ہو۔ وائتس کے خیال میں ارسطو کی تقسیم، ثانوی تقسیم ہے اور خود اسکی تقسیم اولین تقسیم ہے۔ اس کی رائے کی رو سے روما کی شہنشاہی جمہوریت قرار پاتی ہے اور جرمانی شہنشاہی بادشاہت قدیم رومی سلطنت امیانی بادشاہت ٹھہرتی ہے اور نپولین کی شہنشاہی جمہوریت ہو جاتی ہے لیکن اس ترتیب سے دونوں تقسیموں کے اندر خوبی کے بجائے ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔ اوپر جو ترتیب دی گئی ہے اور جسکی بنا حسکمران کے اوصاف اور رعایا کے حقوق دونوں پر رکھی گئی ہے نہایت ہی صاف وواضح ہے، اور ارسطو کی تقسیم کے مکمل کرنیکے لئے ضروری ہے۔ اس سے قابل اطمینان طور پر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کیوں آئینی بادشاہت مطلق العنان بادشاہت کے بجائے نیابتی عمومیت سے زیادہ قریب ہے۔

چھٹا باب

تصوری یا مذہبی حکومت

مذہبی حکومت کا ابتدائے عالم میں طبعی ہونا

مذہبی حکومت سلطنت کی وہ شکل ہے، جسکا تعلق نوع انسان کے عہد طفولیت سے ہے سیاسی ارتقا کو سب سے پہلے ایشیا اور شمالی افریقہ میں نشو و نما حاصل ہوا اور یہیں پہلے پہل مذہبی سلطنتیں دکھائی دیں۔

نوع انسان کے زمانۂ طفولیت میں امداد ربانی اور فطرت کی پراسرار قوتوں پر انحصار کرنا بہت نمایاں نظر آتا ہے اور انسان کی زندگی یا تعلیم پر خدا یا فطرت کا اثر اُس سے زیادہ بلا واسطہ اور قوی تھا، جیسا اسکے بعد رہا ہے۔ قدیم زمانے کے تمام قصے کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کے ایک یا زائد دیوتاؤں کے ساتھ شخصی تعلقات قائم تھے۔ افلاطون نے یونانی قوم کی جو ابتدائی حالت بیان کی ہے وہ تمام دوسری قدیم اقوام کی حالت سے متفق ہے۔ اُس نے مفصل لکھا ہے کہ کیونکر اسوقت کے انسان کی کمزوری اور ناقابلیت پر خیال کر کے کرونوس نے آدمیوں کے بجائے انسان سے بالاتر اور خدائی نسل کے دیوتاؤں کو بادشاہ اور حکمران مقرر کیا۔" افلاطون خود بھی اس مذہبی تصور کا جانبدار تھا اور اس قدیم ربانی حکومت کی طرف لوگوں کو مائل کرنیکے لئے اس نے اپنے نظریۂ سلطنت میں طرح طرح کے حیلے استعمال کئے ہیں۔

اس سے قسیسوں کی حکومت لازم ہو جاتی ہے

خداؤں اور دیوتاؤں کو سلطنت کا اصل حکمران سمجھنے کے اعتقاد کا نتیجہ یہ تھا کہ قسیسوں کا اثر سب پر حاوی ہو جائے کیونکہ فانی انسانوں میں یہی وہ برگزیدہ لوگ تھے جو خداؤں کی خدمت کیلئے وقف ہوتے تھے اور وہی اُنکی مرضی اور اُنکے کلام کو سمجھ سکتے تھے۔ لامحالہ اس قسم کی قوموں میں قسیسوں کو سب سے اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بعض قوموں میں قسیس براہِ راست ایک یا زاید خداؤں کے نام سے حکومت کرتے ہیں بعض میں سلطنت کی زمام حکومت بادشاہوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے مگر اُن کی حکمرانی صرف خدا کے نائب اور اُس کے عامل کی حیثیت سے ہوتی ہے اور یا تو وہ خود قسیس اعظم ہوتے ہیں یا دوسرے

قسیسوں کے اثر و اقتدار میں ہوتے ہیں۔ اول الذکر کو خالص سلطنت قسیسی اور ثانی الذکر کو محدود سلطنت قسیسی کہہ سکتے ہیں اور اس سے حکومت مذہبی سے گزر کر شاہی کی طرف قدم آگے بڑھتا ہے۔

میروئے

میروئے میں اہل حبش کی سلطنت خالص قسیسی سلطنت تھی۔ قسیسوں کی ذات سب ذاتوں سے بلند مرتبہ تھی، وہ اپنے گروہ میں سے چند بہترین افراد کو نامزد کرتے تھے اور با وقار رسومات کے ساتھ خدا ان میں سے ایک کو منتخب کر لیتا تھا۔ لوگ خدا کے اس نامزد کردہ شخص کے سامنے فوراً اظہار اطاعت کرتے اور نائب خدا کی حیثیت سے اسکی وقعت کرتے تھے مگر خدائی قوانین اور قسیسوں پر مرضی خدا کے انکشافات کے ذریعے سے اس سردار کے اختیار ہر طرف سے محدود ہو گئے تھے۔ نہایت سخت رسومات نے اسکے جملہ حرکات کو منضبط کر دیا تھا اور اسکے لئے آزادانہ روش کا کوئی موقع باقی نہیں چھوڑا تھا۔ قسیس ہر جگہ اسکے ہمراہ اور اسکے کاموں میں شریک رہتے تھے۔ اسکی زندگی تک محفوظ نہیں تھی اگر وہ خدا کو ناخوش کرتا تو خدا قسیسوں پر اسکو منکشف کر دیتا تھا اور وہ خدائی غضب سے اسے مطلع کر دیتے تھے اور اسکے لئے کوئی چارہ کار سوا اسکے باقی نہیں رہتا تھا کہ وہ خودکشی کر کے خدا کے غصے کو فرو کرے[۲]۔

مخلوط قسیسی سلطنت کی مثال مصر کی سلطنت میں ملتی ہے؛ عام روایت یہ ہے کہ اولاً دیوتا براہ راست حکومت کرتے تھے۔ چند صدی بعد انسان بادشاہ ہونے لگے مگر وہ بھی یا خدا ہی سمجھے جاتے یا خدا کی اولاد سمجھے جاتے تھے اور انکے اختیارات خدائی قانون، معینہ رسوم و آداب اور ایک اعلیٰ فرقہ قسیسین کے اثر سے محدود تھے۔ خدائی احکام اس قدر جزئیات پر حاوی تھے کہ بادشاہ اپنا کھانا تک خود پسند نہیں کر سکتا تھا بلکہ اس کی قلیل غذا ہمیشہ کیلئے مقرر ہو جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اسکی زندگی میں قسیس یہ جرأت نہیں کر سکتے تھے کہ اس پر کوئی حکم صادر کریں مگر اس کے مرنیکے بعد وہ ایک عام عدالت قائم کر کے اسکے متعلق فیصلہ صادر کرتے تھے اور اسی فیصلے پر اخلاف میں اس کی عزت کا دارومدار ہوتا تھا اور دوسرے عالم میں اسکی روح کو اس کے موافق جزا و سزا ملتی تھی بلکہ اسکا

---

[۲] ڈیوڈورس۔

حشر ثانی بھی اُسی پر منحصر ہوتا تھا۔ اہل مصر کو حیات بعد از ممات پر اسقدر قوی اعتقاد تھا کہ وہ مردے کے جسم کو خراب ہونے سے بچانیکے لئے بے انتہا کوشش کرتے تھے۔ اُسکی تزئین میں نہایت اسراف کرتے اور اُسکے رکھنے کیلئے ایسا محل بناتے تھے، جس میں تمام ضروریات زندگی کا لحاظ ہوتا تھا۔ پس ظاہر ہے کہ اُس فیصلے پر کیسی کچھ امید و بیم کی حالت رہتی تھی اور اس ذریعے سے قسیسوں کے ہاتھ میں کیسی مہیب طاقت آگئی تھی۔

ہندوستانی

قدیم ہندوستانی سلطنت بھی مصر کی سلطنت سے مشابہ تھی اور بالکل تصوری سلطنت تھی۔ ذات کی ترتیب میں بادشاہ برہمن سے نیچے درجے پر تھا۔ برہمن اپنی لڑکی بادشاہ کو دینا اپنی اور اپنی لڑکی کی ذلت سمجھتا تھا۔ بایں ہمہ شاہی عظمت کا پایہ اس قدر بلند خیال کیا جاتا تھا کہ اُس میں ایک حد تک الوہیت کا شمول سمجھ لیا گیا تھا۔ منو کے قوانین کے موافق بادشاہ کا جسم پاک اور مقدس ہے کیونکہ اسکی ترکیب اُن عناصر سے ہوتی ہے جنکی تخلیق دنیا کے آٹھ خدائی محافظین سے ہوتی ہے" وہ آفتاب کی طرح آنکھ اور دل کو خیرہ کر دیتا ہے اور کوئی شخص اُسے رو در رو دیکھنے کی جراءت نہیں کرسکتا۔ خدا نے اُسے تمام مخلوقات کے محفوظ رکھنے کیلئے پیدا کیا ہے، بچپن میں بھی کوئی اسکی تحقیر نہیں کرسکتا اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک معمولی انسان ہے کیونکہ ایک بہت بڑی خدائی قوت اسکے اندر موجود ہوتی ہے۔[۴۵]

ہندوستانی بادشاہ کے گرد پروہتوں کا مجمع رہتا تھا تخت نشینی کے وقت لازم تھا کہ وہ اسکی تقدیس کریں۔ سات یا آٹھ وزرا جن سے تمام معاملات میں صلاح لینا اُس پر لازم تھا وہ تقریباً سب کے سب برہمن ہوتے تھے۔ ذی علم برہمنوں کی صلاح لئے بغیر وہ کوئی اہم کام نہیں کرسکتا تھا۔ نہایت سخت رسوم ورواج نے اُسے پابند بنا رکھا تھا اور اگرچہ منو کے قوانین اسکی ذمہ داری کو بہت قطعی الفاظ میں ظاہر نہیں کرتے تاہم وہ نہایت پرہیبت الفاظ میں اُسکی ذمہ داری اُسے یاد دلاتے رہتے ہیں "وہ بیوقوف جو اپنی ناانصافی سے اپنی رعیت کو پریشان کرے بہت جلد وہ خود اور اُسکا سارا خاندان اپنی سلطنت اور اپنی جان کھو دیگا"۔[۴۶]

۴۵ "منو کا دھرم شاستر" (انگریزی ترجمہ۔ سر ولیم جونس۔ ۵-۹۶-۹۷، ۷، ۴، ۳، ۸)

۵۰ [?] ،، ،، ۷، ۴۸، ۵ وغیرہ

پھر بھی ہندوستانی سلطنت چونکہ اعلیٰ آریائی خصوصیات رکھتی تھی اس وجہ سے وہ مصر کی سلطنت سے زیادہ آزاد تھی۔ پیرو ئے اور مصر کی سست اور کاہل سلطنتوں کے مقابلے میں یہاں شاہی عظمت وسطوت زیادہ کامل طور پر ترقی کر گئی تھی مگران سب سلطنتوں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ذات کا طریقہ سختی کے ساتھ قائم تھا اور قسیسوں کو بہت بڑے امتیازات حاصل تھے۔ قوم کی آئینی زندگی بالکل انھیں کے قبضے میں تھی اور دنیاوی ساز و سامان سے بھی وہ بافراط بہرہ اندوز تھے۔ مصر میں وہ ایک تہائی زمین کے مالک تھے[۵۶] اور ہندوستان کا قانون یہ تھا کہ[۵۷] بادشاہ اگر تنگدستی کی وجہ سے مر بھی رہا ہو تو بھی کتب مقدسہ کے عالم برہمنوں پر کسی قسم کا محصول نہیں لگا سکتا اور نہ وہ اسکا روادار ہو سکتا تھا کہ ایک ایسا برہمن فاقہ کشی کی تکلیف اٹھائے ۔ نیچے طبقے کے لوگ ہر طرح پر پریشان کئے جاتے اور قابل نفرت سمجھے جاتے تھے اور شخصی ترقی کے ذریعے سے اپنی اس سخت قسمت کو آسان بنانیکا ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مصر کے کسان محض وابستۂ اراضی غلام تھے جنکا کام صرف یہ تھا کہ وہ قسیسوں، بادشاہوں اور جنگجویوں کی زمین کی کاشت کریں۔ گڈریئے اور دستکار اپنے موروثی پیشے کا کام کرنے پر مجبور تھے۔ ان پر بیدریغ محصول لگائے جاتے اور سیاسی تنظیمات میں انھیں کسی قسم کا عملی حق حاصل نہیں تھا۔ ہر قسم کی جبری مزدوری (بیگار) اُن ممالک میں عام تھی۔

صدیوں تک مذہبی حکومت کی خصوصیت ایشیا کی سلطنتوں میں قائم رہی۔ اور اب بھی مشرقی ممالک میں اسکا اثر برابر محسوس ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملکی حکمرانوں نے جب وسیع ممالک کے فتوحات سے اپنی طاقت بڑھالی تو مذہبی پیشواؤں کا اقتدار ماند پڑگیا اور انکی منزلت گھٹ گئی، مگر ان حالتوں میں خود حکمران ہی خدا بن گئے اور اسطرح ہر سلطنت کا مذہبی طریق حکمرانی بدستور قائم رہا۔ البتہ اسکی قدیم شکل میں فرق پڑگیا۔ اولاً خدا بذات خود حکمرانی کرتا تھا اور بادشاہ اور مذہبی پیشوا اسکے کارکن تھے اُس کے بعد حکمرانی آہستہ آہستہ کر کے مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں آنے لگی اور انھیں میں سے یا فوجی لوگوں میں سے

---

۵۶ ڈیوڈورس ج ۱ صفحہ ۷۳۔

۵۷ منو کا دھرم شاستر۔ ۷، ۱۳۳۔

کوئی شخص اُنکے سرگروہ کے طورپر بادشاہ ہونے لگا ۔ آخر میں بادشاہ نے خود خدائی عظمت و منزلت حاصل کرلی اور فوق انسانی مطلق العنانی پیدا ہوگئی ۔ ایرانیوں کی شہنشاہی میں یہی صورت پیش آئی اور یہانتک کہ موخر زمانے کے مسلمان سلاطین[عـه] اور شاہان چین کی بھی کچھ ایسی ہی روش تھی ۔

ایرآن

گشتاسپ (وشتاسپ) جو ۵۵۰؁ق م کے قریب ایرآن کا بادشاہ تھا اور جسکے زمانے میں زردشت کا ظہور ہوا تھا وہ اپنے کو " مُوبد بادشاہ " کہتا تھا اور ایران کی کتب مقدس " زند و اوستا[عـه] " میں ہندوستان کی طرح بادشاہ اہل سیف کی ذات سے نہیں ہوتا تھا بلکہ اسکا شمار مُوبدوں (یعنی عالمان قانون و مذہب) میں کیا جاتا تھا[۵] ۔ تمام سیاسی نظم و نسق مذہبی اصول پر تھا قانون اور اخلاق کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا ۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یزدان اور اہرمن کا غیر مرئی عالم انسان کے عالم مرئی سے ہمہ وقت تعلق رکھتا ہے ، مگر جب ایران میں فرقہ مذہبی سے باہر بادشاہ ہونے لگے تو سلطنت یوماً فیوماً خود سرانہ ہوتی گئی اور مُوبدوں کا اثر اگرچہ پھر بھی بہت کچھ باقی رہا مگر قدیم زمانے کا اُتنا نہیں رہا ۔ بادشاہ کو ویسی ہی ہمہ گیر طاقت حاصل ہوگئی جیسے خود اُس خدا کو تھی جس نے اُسے بادشاہ بنایا تھا ۔ اُسکا دربار دنیا میں یزدان کے آسمانی دربار کی نقل تھا ۔ خدا کے مانند اُسکی تعظیم و تکریم کیجاتی تھی ۔ وہ سرخ لباس پہنکر اور سر پر طرہ لگا کر اپنے بلند سونے کے تخت پر بیٹھتا تھا اُس کے ہاتھ میں سونے کا عصا ہوتا تھا اُسکی بغل میں آفتاب کی سی چمکدار تلوار ہوتی تھی اور غیر ملک کے سفیر اسکے سامنے اس طرح زمین بوس ہوتے تھے

عـه ۔ (مسلمان بادشاہوں سے متعلق مصنف کا یہ خیال مبالغے پر مبنی ہے ۔ اردو مترجم ۔)

عـه (یہاں ہونا چاہئے تھا: " ایران کی مقدس کتاب اوستا " ۔ مینگلی کے زمانے تک تقریباً سارے مصنف یہ غلط خیال رکھتے تھے کہ زند اور اوستا دو کتابیں ہیں حقیقت میں " اوستا " اصل مقدس کتاب ہے اور " زند " اور " پازند " اسکے ترجمے اور تفسیریں ہیں ۔ اردو مترجم)

۵ ۔ فلرس کی تصنیف " چند اوراق زردشت کے مذہب کے متعلق " (Fragmente ueber die Religion des Zonoastro) صفحہ ۳۳ تا ۶۹ ۔ مقابلہ کرو اشپیگل تصنیف " اوستا " لائپزگ ۱۸۵۲-۶۳؁ء ۔

جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے سامنے یا عبادت کرنیوالا اپنے خدا کے سامنے سر بسجود ہو۔ اُسکے سامنے نذریں اس طرح پیش ہوتی تھیں جیسے خدا کے سامنے قربانی پیش ہوتی ہے اور جب وہ مر جاتا تو اصطخر، (Persipolis) کے شاندار مقبرے کے اندر رکھا جاتا تھا کہ وہاں وہ (ظاہری موت کے بعد بھی) اپنی متبرک زندگی کا سلسلہ قائم رکھے۔ بادشاہ مقدس مراسم اور معینہ رسوم سے موقر ہوتا مگر درحقیقت یہ مراسم اُسے ایک زرین جال کی طرح سے گھیر لیتے تھے۔ اسکی تمام آزادی جاتی رہتی تھی اور اُسکا پر فخر امتیاز مطلق' ایک مضحکہ بن جاتا تھا۔

با ایں ہمہ، مذہبی فرقے سے نکل کر مطلق العنان شاہی کی طرف بڑھنا ترقی کا ایک قدم آگے بڑھنا تھا۔ ستاروں کی گردش کو مذہبی فرقے کے لوگ خدائی الہام جانتے تھے اور اُسی سے امور سلطنت کو بھی طے کرتے تھے اور سلطنت کے احکام کو خدائی احکام سمجھ کے ایسا اٹل بنا دیا تھا کہ اُن میں ایک نقطے کی کمی بیشی ممکن نہ تھی۔ اُنکی ان سخت بندشوں کو اس تغیر نے شکست کر دیا۔ مطلق العنانی ہی سہی مگر معاملہ عامہ میں ایک آزاد انسانی رائے اپنا عمل کرنے اور سیاسی حالات کے تغیر اور قوم کی نئی ضروریات پر توجہ کرنے لگی اس طرح ذات کی آہنی بیڑی ایران میں بہت پہلے ٹوٹ گئی۔

یہودیوں کی حکومت مذہبی

قدیم مذہبی حکومتوں میں سب سے زیادہ نمایاں حکومت یہودیوں کی حکومت تھی جو حضرت موسیٰؑ کے ارشادات کے بموجب قائم ہوئی تھی موسوی مذہب کی پاکیزگی اور دنیا کے بنانے اور قائم رکھنے والے خدائے واحد پر پکا ایمان وہ مستحکم بنیاد تھی جس پر یہودیوں کی مذہبی حکومت کی عمارت تعمیر ہوئی تھی۔

یہودیوں میں خود خدا یاوے　　　یا یہوا (Gehovah) کے نام سے بادشاہ تھا' وہ ایک فانی مگر برگزیدہ قوم کا غیر فانی رب تھا وہ مقنن بھی تھا اور حکمران بھی تھا۔ وہ تمام نظام قانون جسے ہم موسوی قانون کہتے ہیں، اُس خدا کا الہام کردہ قانون سمجھا جاتا تھا جس سے حضرت موسیٰؑ قلہ کوہ کی تنہائی میں ہمکلام ہوتے جس کے احکام کو وہ خوف و دہشت کے ساتھ قبول کرتے، اور اپنے رب کے حکم کے مطابق حرف بحرف اپنی امت میں انھیں شائع کرتے تھے۔ کوہ سینا پر رعد و برق سے خدا کی موجودگی کا اظہار ساری امت پر ہوتا تھا۔

اس ربانی حکومت سے تمام قوم کی سطح بلند ہوگئی تھی، مگر مصر میں لوگ ہنوز

اُس سے نفرت کرتے اور ہر اعلیٰ ذات والا مصری یہودیوں کو مردود سمجھتا اور یہ یقین کرتا تھا کہ اُن سے میل جول رکھنے سے انسان نجس ہو جاتا ہے۔ اب انکے خیالات اس تصور سے بلند ہو گئے تھے کہ وہ خدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ لوگ (راست) ہیں۔ اگرچہ وہ خاندانی قبائل میں منقسم تھے اور ان میں سے لیوی (Leuvi) قبیلہ خاص طور پر مذہبی قبیلہ تھا مگر وہ سب کے سب حضرت ابراہیمؑ اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کی اولاد میں سے تھے اور ساری قوم مذہبی پیشواؤں کی ایک قوم مانی جاتی تھی۔ معہذا ذاتوں کا بین امتیاز اصولاً اٹھ گیا تھا اور قبائل کی برادری نے ایک اصول کی حیثیت حاصل کر لی۔

خدا کا قانون ایک تابوت کے اندر رکھا ہوا تھا جس پر سونا چڑھا ہوا تھا اور اسکے اوپر زریں عرش رحمت تھا دو کروبیاں اسکی حفاظت کرتے تھے اور الہامات ربانی کے مقام کے طور پر لوگ اُسے مقدس سمجھتے تھے تابوت اور "عرش رحمت"، دونوں مقام اقدس کے اندر قبتہ العہد (Tabernaell) میں ایک پردے کے پیچھے رکھے ہوئے تھے اور یہ قبہ گویا خدا کا قیام گاہ سمجھا جاتا تھا اور احبار نہایت احتیاط کے ساتھ اسکی حفاظت کرتے تھے۔ یہیں پر ربی اعظم یاوے کے احکام حاصل کرتا اور انھیں لوگوں کو سناتا تھا۔ ربی اعظم موسٰیؑ کے بھائی ہارونؑ کی اولاد میں ہونیکے باعث مرضی خدا کے اظہار کا طبعی ذریعہ تھا اور خدا کے حضور میں اپنی قوم کا نائب بھی تھا۔ مستثنیٰ طور پر نازک وقتوں میں یاوے، نبی بھیجتا تھا تاکہ وہ اسکے احکام کی طرف سے لوگوں کی غفلت کو دفع کریں۔ بادشاہوں یا خود امت کے خوابیدہ ایمان کو بیدار کریں، مذہب کے ترک کرنیکی سزا دیں، استغفار اور کفارے کی تاکید کریں اور امت کی آئندہ قسمت کا اظہار کریں۔ قبائل میں عدل رسی کے انتظام کے لئے جو قضاۃ مقرر ہوتے تھے وہ یاوے کے نام سے احکام نافذ کرتے تھے کیونکہ "عدالت خدا ہی کی ہے" اسلئے اُن پر لازم تھا کہ "فیصلہ میں کسی کے رتبے کا خیال نہ کریں بلکہ ادنیٰ و اعلےٰ سب کی سنیں اور کسی انسان سے خائف نہ ہوں"۔ اگر کوئی مقدمہ انکی قوت فیصلہ سے باہر ہوتا تو اُن کو لازم تھا کہ "قبتہ العہد" کی طرف رجوع کریں اور وہاں سنیں کہ خدا ربیّوں کی زبان سے کیا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اُنکا فرض تھا کہ اس فیصلہ کی تعمیل کریں ورنہ اپنی جان دیدیں۔

جسطرح کہ قوم یاوے کی سخت مگر بابرکت حکومت کی رعایا تھی اسی طرح سے ارض موعودہ کی

تمام اراضی یاوے کی ملک تھی، اور مختلف خاندان محض مستاجر کے طور پر اس پر قابض تھے۔ خدا کی ملکیت کے اقرار میں زمین اور مویشی کی پیداوار کا دسواں حصہ ربیوں کی گزراوقات کے لئے تقبۃ العہد میں پیش کرنا لازم تھا جس طرح انسان کیلئے ہر ساتواں دن آرام کا دن تھا اسی طرح زمین کے لئے ہر ساتواں سال آرام کا سال تھا۔ اس سے وہ زمین بھی مستثنیٰ نہیں تھی جس پر کاشت نہ ہوئی تھی۔ جب اسی طرح ساتواں برس سات مرتبہ ہو چکتا تو جشن کا زمانہ آتا اور زمین از سر نو تقسیم کیجاتی، اور افلاس زدہ خاندانوں کو انکی زمینیں واپس ملجاتیں اور جن لوگوں نے دولت جمع کرلی ہوتی انھیں اپنی دولت کا زائد حصہ چھوڑنا پڑتا تھا۔ کوئی یہودی کسی حال میں غلام نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ اگر افلاس کی وجہ سے وہ خود اپنے کو فروخت کرنے پر مجبور ہوتا تو وہ ایک اجرتی خادم یا مزدور سمجھا جاتا اور جشن کے سال میں آزاد ہو جاتا تھا۔ یہودیوں میں غلام ہمیشہ غیر نسل کے ہوا کرتے تھے۔

بعد کے زمانے میں، جب یہودیوں نے اپنے میں ایک بادشاہ ہونیکی خواہش کی [۱] تاکہ وہ بھی دوسری قوموں کی ہمسری کرسکیں، تو یاوے نے اُن کے قاضی القضاۃ شموئیل (سموئل) [۲] نبی کی زبان سے انکی اس خواہش کے پورے ہونیکی انھیں اطلاع دی۔ اور خوشنودی کو ان الفاظ میں تسلی دی کہ "قوم کے لوگ تم سے جو کچھ کہیں اُسے سنو۔ کیونکہ انھوں نے تم سے نہیں بلکہ مجھ سے انکار کیا ہے تاکہ میں اُن پر حکمرانی نکروں"۔ پس اسطرح سلطنت خالص مذہبی حکومت سے گزر کر شاہی بن گئی، مگر یہ شاہی ہمیشہ ایک حد تک مذہبی رہی اور قوم یہود کی سرتاپا مذہبی طبیعت اور مقصد کا اُس پر اثر پڑتا رہا۔

یورپ میں اس قدیم حکومت مذہبی کا اثر کہیں خال خال نظر آجاتا ہے اور وہ بھی کمزور۔ رومی قیصر کا لیمنوا سونے کی ڈاڑھی لگائے ہوئے اور بجلی کی سی چمک کے ساتھ جو پیٹر (مشتری) کی حیثیت سے عوام میں ظاہر ہوتا۔ ہیلیوگبالس ایک قسیس کی حیثیت سے آفتاب کو نذر چڑھاتا ہے۔ سوئزرلینڈ کے حصوں میں گیسلر آزاد پہاڑیوں کو حکم دیتا ہے کہ شہنشاہ کی ٹوپی کی عزت کریں۔ یہ سب ایک سلطنت کی تباہ شدہ شکل کے

---

[۱] سموئیل، ہشتم

[۲] (عبرانی شموئیل (شین ساکن اور ی مجہول) کا معرب ہے سموئل۔ اردو مترجم)

صرف خدا کے ہیں اور انھیں دوام حاصل ہونیکا کوئی حق نہیں ہے مگر حکومت مذہبی کے کچھ آثار رومی شہنشاہی میں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً زندہ شہنشاہوں کے مجسموں اور انکے مندروں کا بننا۔ مرنیکے بعد انھیں "خدا" کے نام سے یاد کرنا۔ زمانہ مابعد کے بزنطینی دربار کے آداب و رسوم بھی اسکے شاہد ہیں۔

ازمنۂ وسطیٰ میں پادریوں کے اثر نے عیسوی سلطنتوں کو ایک طرح کی مذہبی حکومت کا رنگ دیدیا تھا کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ مذہبی حکومت کے اصول کے قائل رہے اور اس پر زور دیتے رہتے تھے۔ یہ رنگ دنیاوی اور مذہبی دونوں قسموں کی امارتوں میں نمایاں تھا لیکن آخرالذکر پر طبعاً یہ رنگ زیادہ گہرا چڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ شہنشاہ کیلئے ضروری تھا کہ وہ اہل مذہب کے ہاتھ سے تقدیس حاصل کرے (ب)

لیکن ازمنۂ وسطیٰ میں لوگ ہر قسم کے استحقاق و اقتدار کو خدا کی طرف منسوب کرنیکے کیسے ہی شائق کیوں نہ رہے ہوں، انھوں نے اپنے حکمرانوں کو کبھی انسان سے زیادہ نہیں سمجھا اور انھوں نے انکے اختیار پر بے شمار انسانی قیود عائد کردئے تھے۔

یورپ میں حقیقی مذہبی حکومت کلیسائے عیسوی ہے، جسے پادریوں نے اپنی "حکومت مقدس" بنالیا ہے۔ دنیاوی حکمرانوں اور حکومتوں کو کلیسا ہمیشہ انکی انسانی حیثیت یاد دلاتا رہتا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنتوں کی بنیادی شکل درحقیقت مذہبی حکومت کے بجائے امیرانی یا شاہی حکومت کی ہے۔

برخلاف اسکے ازمنۂ وسطیٰ میں جو اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں انکی نوعیت کے لحاظ سے ہم انھیں مذہبی حکومت کہہ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان، یہودیوں کی طرح یہ یقین نہیں رکھتے تھے کہ خدا براہ راست اور باقاعدہ حکمرانی کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موسوی مذہبی حکومت کو دوبارہ قائم نہیں فرمایا مگر قرآن شریف نے یہ تعلیم دی ہے کہ

(ب) سات الکٹر (انتخاب کنندے) جب ایک حکمران کو منتخب کردیتے تھے تو وہ "شاہ رومیاں" کا لقب امتیاز کرتا تھا وہ باضابطہ اسوقت تک شہنشاہ نہیں ہوتا جبتک کہ پوپ اُسے تاج نہ پہنائے اور اس میں اکثر تاخیر ہوا کرتی تھی۔ چارلس پنجم آخری شہنشاہ تھا جس نے پوپ کے ہاتھ سے تاج پہنا۔ اسکے جانشینوں نے انتخاب کے ساتھ ہی "شہنشاہ" کا لقب اختیار کرلیا۔ ۱۸۰۶ء میں فرانسس ثانی کے دست کش ہوجانے پر مقدس رومی شہنشاہی کا خاتمہ ہوگیا۔

خدا جسے چاہتا ہے حکومت عطا فرماتا ہے اور اسکی رو سے سلطنت کا حکمران خدا کا مقرر کیا ہوا عامل اور نائب خدا ہوتا ہے۔ اسلام کے سیاسی نظم کا منتہائے خیال خلافت ہے اس میں امام اور بادشاہ دونوں کے فرائض داخل ہیں۔ گویا خلیفہ شہنشاہ بھی ہے اور پوپ بھی مذہب اور قانون کے درمیان اور دینیات اور فقہہ میں کافی امتیاز نہیں کیا جاتا جو علمائے دین ہیں وہی فقیہہ بھی ہیں۔ عیسویت کی بہ نسبت اسلام مذہبی حکومت سے زیادہ موافق ہے۔

دنیائے جدید سلطنت کے اس مذہبی انداز اور اُس سے مشابہت پیدا کرنیوالی تمام چیزوں کے علانیہ خلاف ہے۔ مذہبی امارات کا توڑ دینا۔ اور ۱۸۷۰ء میں پوپ کے دنیاوی اختیارات کا سلب کرلینا اس زمانے کے میلان کے شاہد عادل ہیں۔

مذہبی رنگ کی سلطنتوں کے عام خصوصیات حسب ذیل ہیں:—

۱۔ اُن میں مذہب اور قانون، مذہبی اور سیاسی تنظیمات و اقوال بہت ہی خلط ملط ہوجاتے ہیں اور وہ اسطرح پر کہ مذہبی جُز کو غلبہ حاصل رہتا ہے۔ حیات بعد ممات کا خیال دنیاوی زندگی پر اس قدر طاری ہوجاتا ہے کہ اسکے آزادانہ نشو و نما میں خلل پڑجاتا ہے۔

۲۔ اصول اقتدار، فوق انسانی حد تک بلند ہوجاتا ہے اور از خود اُس میں مطلق العنانی پیدا ہوجاتی ہے۔ تمام معاشری و سیاسی زندگی اُسی پر منحصر ہوجاتی ہے۔ حاکم و محکوم کے درمیان انسانی تعلق باقی نہیں رہتا۔ مشترک حب الوطنی، مشترک قومیت اور مشترک نسل کا واسطہ جاتا رہتا ہے۔ حکمران کی وقعت و عظمت کو کوئی پہنچ نہیں سکتا، اور وہ حاکم علی الاطلاق بن جاتا ہے۔

۳۔ جب یہ اقتدار ایسے وحی و الہام پر مبنی ہوجاتا ہے جسکا سلسلہ مدتوں قبل منقطع ہوچکا ہے، جیسے یہودیوں میں موسوی احکام اور مسلمانوں میں قرآن شریف، تو اس میں ایک مستحکم مگر ناقابل تغیر نظم قائم ہوجاتا ہے۔

لیکن اگر اسکے خلاف یہ صورت سمجھی جائے کہ تغیر پذیر حالات اور وقتی ضروریات کیلئے خدا نئے احکام جاری کرتا رہتا ہے تو اُس کے انسانی قائم مقاموں کے لئے اُس خدائی مرضی کے سمجھنے کے صرف دو طریقے ہوتے ہیں یا تو اسکے اظہار کی کوئی معینہ ظاہری علامت ہوتی ہے یا اسکا مسلسل باطنی انکشاف سے ہوتا ہے۔ کلدانیوں نے اول الذکر طریقے پر چل کر ستاروں کی شناخت سے کام لیا۔ یہودیوں نے طلوع آفتاب کی حالت پر

نظر کی۔ رومی کاہنوں اور پیشین گویوں نے قربانی کے جانوروں کی آنتوں اور چڑیوں کے اڑنے سے شگون لئے۔ یونانیوں نے خاص خاص مقامات میں الہامی قوت سمجھکر ان مقامات سے سوال کئے اور جرمانیوں نے پالنوں سے کام لیا۔ اس سے ہمیشہ وہم پرستی اور فریب وہی کا زور رہا۔ دوسری جانب انکشاف پر اعتماد کرنے سے قوائے ذہنی اپنے فعل سے معطل ہو جاتے ہیں، اور متوقع انکشاف پر ایک غیر معمولی اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذہبی حکومت میں قوائے انسانی جو قانون و حکومت کے معاملات کے فیصلے کے لئے لازمی ہیں، بہت ہی نامکمل طور پر ترقی کرتے ہیں اور کبھی اُن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ دنیاوی حکام قسیسوں کے تابع ہوتے ہیں جو اپنے کو خدا سے زیادہ قریب سمجھتے ہیں۔ اگر وہ خود براہ راست حکومت کرتے ہیں تو سلطنت صاف طور پر مذہبی سلطنت ہے اور اگر کوئی دنیاوی بادشاہ بھی اُنکے ساتھ شریک کار ہوتا ہے تو بھی پس پردہ قوت اُنھیں کو حاصل رہتی ہے اور مذہبی سلطنت کی صرف صورت پوشیدہ ہو جاتی ہے۔

ہر ایک مذہبی گروہ میں عورتوں کی سی کچھ نہ کچھ کمزوری ضرور ہوتی ہے، اس لئے لامحالہ مذہبی سلطنت میں مردانہ قوتیں زنانہ قوتوں کے تابع ہو جاتی ہیں اور خود اعتمادی و آزادی کبھی پوری طرح نشوونما نہیں حاصل کرتی۔ اہل مذہب کی حکمرانی میں عام لوگوں کو ہمیشہ دقتیں پیش آئیں گی اور وہ پس پشت ڈالدئے جائیں گے۔

۵۔ جرم کے قوانین سخت اور سزائیں ظالمانہ ہوتی ہیں۔ انسانی عدالت کا حکم خدا کے غضب کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ عقل انفرادی کو کام میں لانا ایک فعل شنیع تصور ہوتا ہے۔ اور ادنیٰ سا تعرض بھی اجلالِ خداوندی کی ہتک سمجھا جاتا ہے۔

۶۔ قوم کی تعلیم تمامتر فرقہ مذہبی کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ مدارس مذہبی اغراض کے حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ علوم و فنون اور تمام مذہبی کمالات کی وہیں تک ہمت افزائی کی جاتی ہے جہاں تک وہ مذہبی اغراض کو پورا کریں اس کے سوا عام طور پر علوم و فنون مشتبہ نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور اُن سے اغماض ہوتا جاتا ہے اور اگر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اُن سے مذہبی

اقتدار پر کوئی اثر پڑے گا تو وہ حکماً ممنوع قرار دیدئے جاتے ہیں اور اُن کے پڑھنے پڑھانیوالوں کو سزائیں دیجاتی ہیں علم و ہنر ہیں فی نفسہ کوئی خوبی نہیں سمجھی جاتی نہ وہ ذہن انسانی کی آزادانہ تخلیق خیال کئے جاتے ہیں بلکہ وہ محض مذہب کے غاشیہ بردار متصور ہوتے ہیں۔

ساتواں باب

شاہی کی بڑی بڑی قسمیں

روئے زمین کی مختلف قوموں میں سلطنت کی سب سے زیادہ مسلمہ شکل شاہی ہے۔ یہ شکل تمام زمانوں میں پائی جاتی ہے۔ ایشیا اور یورپ میں تقریباً ہر جگہ یہی شکل ہے اور تاریخ کے شروع ہونے سے اسوقت تک یہی حالت رہی ہے مگر شاہی کا تخیل اور اسکی صورتیں ایک دوسرے سے اسقدر مغائر ہیں کہ انھیں جنسی اصناف پر منضبط کرنا مشکل ہے۔

۱۔ سلطنت نے جب مذہبی طرز حکومت سے گزر کر انسانی بادشاہت کی شکل اختیار کی تو اُس نے خودسری کی شکل اختیار کی۔ یہ شکل ایشیا میں بالتخصیص زیادہ مروج ہوئی۔ خودسر حکومت کا خاص نشان یہ ہے کہ تمام حقوق بادشاہ کی ذات واحد میں اس طرح جمع ہو جائیں کہ اُس سے علٰحدہ یا اُسکے مخالف کوئی حق باقی نہ رہتے۔ ممکن ہے کہ وہ خود اپنے اوپر مذہبی یا اخلاقی فرائض کے قیود کو تسلیم کرے یا اپنے کو خدا کا ذمہ وار سمجھے مگر رعایا کے حقوق سے اسکی طاقت پر کسی طرح کا حصر نہ ہو کیونکہ رعایا اسکے آزادانہ رحم وکرم کے بندے اور اسکے تابع ہیں۔

اس قسم کی خودسر حکومت خود کو حق بجانب ثابت کرنیکے لئے کسی حد تک خدا کے اقتدار مطلق کی طرف رجوع کرتی ہے۔ خودسر حکمران کو مذہبی حکومت سے بہت گہرا تعلق ہے اور باوجود حکمران کے انسانی حیثیت کے اُس میں مذہبی حکومت کے نقائص موجود ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کی اسلامی سلطنتوں میں خودسری کی جانب یہ میلان موجود تھا اور صرف اب ہمارے زمانے میں وہ ایک گونہ بقیہ یورپ کی انسانی شاہی کی حد کے قریب پہنچی ہے۔

۲۔ خودسرانہ حکومت کو شاہی کی وحشیانہ شکل کہہ سکتے ہیں۔ آریائی نسل کی قوموں نے اسے ذلیل سمجھکر مدت سے ترک کر دیا اور بادشاہوں اور حکمرانوں سے علٰحدہ طبقات وافراد کے حقوق کو تسلیم کر لیا ہے۔ رعایا اپنے کو غلام نہیں بلکہ آزاد سمجھتی رہی ہے جب کبھی

ایسا ہوا کہ اقتدار شاہی خود سری کی حد کو پہنچا معلوم ہوا تو رعایا نے اُسے ناانصافی خیال کیا اور پہلا ہی موقع ملنے پر انھوں نے بادشاہ کو اپنے حقوق کی وقعت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس نئے مہذب شاہی حقوق عامہ کی حفاظت کے لئے ہمیشہ عدالتی انتظام نے مشروط و محدود رہی ہے۔ اس سے بادشاہ کی منزلت و طاقت گھٹنے کے بجائے بڑھ جاتی ہے کیونکہ ایک غلامانہ انبوہ کی حقیرانہ اطاعت کی رہبری کرنیکے بجائے ایک آزاد قوم کی سیاسی قوتوں کی رہنمائی کرنا زیادہ معزز اور شریفانہ کام ہے۔ سلطنت میں جس قدر زیادہ لوگوں کا اتحاد اور زور شامل ہوگا اور جس قدر اُسکے ارکان کو آزادانہ ترقی کا موقع حاصل ہوگا، اسی قدر اسکا نظم و نسق مکمل ہوگا مگر یہ صرف مہذب شاہی میں ممکن ہے، خود مختار حکومت میں بالکل ناممکن ہے۔

انسان نے اپنی عقل کے مطابق مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اُن قطعی حدود کے تعین کی کوششیں کی ہیں جو شاہی پر عائد ہونا چاہیئے۔

ایک قدیم ترین شکل خاندانی یا پدر سری بادشاہت کی ہے۔ بادشاہ کسی خاص خاندان کا سرگروہ اور تمام نسل کا بزرگ اور باپ سمجھا جاتا ہے یہ قدیم و سادہ انتظام جو ہندوستانی اقوام کے وزرا پاتی میں اور جرمانی قبائل کے کوننگ میں پایا جاتا ہے۔ اسکا انضباط خاندانی تعلقات و خیالات سے ہوتا ہے۔

اسی طرح ازمنۂ وسطیٰ کی موروثی امارتیں خواہ وہ جاگیری طریق کی ہوں یا براہ راست حکمرانی کرتی ہوں، شخصی ملک و حفاظت کی تنظیمات سے مقید نہیں۔ خاندانی حقوق اور سلسلۂ حکمرانان کے خیالات کا اُن پر اثر پڑتا تھا مگر اُن میں بھی سلطنت کے ساتھ ملک ارضی خلط ملط ہو جاتی ہے اور حکمران کی ملکیت کا حق بھی داخل ہو جاتا ہے۔

یہ دونوں شکلیں جن میں سیاسی ادراک نے ابھی پوری طرح نشو و نما نہیں پایا ہے شاہی کی ناممکل صورتیں کہی جاسکتی ہیں۔

۳۔ جب کہ سیاسی ادراک میں صرف جزوی بیداری پیدا ہوئی ہو اور اُسکا رجحان حکمران قوت کے صرف ایک فرض کی انجام دہی کی طرف ہو تو اُسے شاہی کی یکطرفہ شکل کہہ سکتے ہیں۔ اس صورت میں جب مقدم خیال فوجی ضرورت کی طرف ہو تو اُسے فوجی ولایت کہیں گے اور جب حاکم انصاف ہی حکمران ہو تو اُسے عدالتی ولایت

کہیں گے۔ اول الذکر زیادہ مطلق العنان اور زوردار ہوتی ہے۔ اور ثانی الذکر نسبتاً زیادہ مفید اور باامن ہوتی ہے۔
۴۔ جب حکمران میں سیاسی ادراک بہت زیادہ ترقی کر جاتا ہے تو مرکزی قوت بغلبۂ تمام اسکے ہاتھ میں آجاتی ہے اور رعایا کو کسی قسم کے سیاسی حقوق نہیں حاصل ہوتے یہ شاہی علی الاطلاق، وحشیانہ خود سری کے مقابلے میں حکومت کی ایک مہذب شکل ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس شکل میں بادشاہ ایک عدالتی تنظیم کو تسلیم کرتا اور کم از کم اصولاً اُسے موقر سمجھنے پر رضامند ہوتا ہے۔ موجودہ سلطنتوں کی بہ نسبت رومی شہنشاہی میں یہ قوت زیادہ مطلق العنان تھی بلکہ ازمنۂ وسطیٰ تک میں آزادی کی نشو ونما اور عیسائیت سے اس مطلق العنانی میں روک پیدا ہوگئی تھی۔
۵۔ محدود شاہی زیادہ معزز ہونیکے ساتھ ہی زیادہ متناسب بھی ہوتی ہے۔ اس میں مرکزی قوت کی وحدت و فوقیت قائم رہتی ہے اور اُسکے ساتھ ہی قوم کے تمام طبقات وافراد کی آزادی بھی شامل ہوجاتی ہے۔ اس قسم کی شاہی جسطرح زمانہ حال میں نیابتی اور آئینی صورتوں سے محدود ہے اُسی طرح ازمنۂ وسطیٰ میں امرا اور طبقات رعایا کے حقوق خاص سے مقید تھی۔
۶۔ شاہی کی بحث میں یہ ضروری ہے کہ بادشاہی اور شہنشاہی میں فرق کیا جائے یہ فرق ترقی کے تمام مدارج میں پایا جاتا ہے۔ خواہ ایشیا کی وحشیانہ خود سر حکومت ہو یا یورپ کی مہذب سلطنت۔
بادشاہی کے خیال کا تعلق قوم سے ہے۔ شہنشاہی کا تعلق انسان سے ہے۔ بادشاہی نام ہے، ایک واحد قومی سلطنت کی تنظیم اعلیٰ کا برخلاف اسکے شہنشاہی دنیا کی حکمرانی ہے۔ جس طرح نوع انسان کو مجموعاً منفرد اقوام پر فوقیت حاصل ہے، اسی طرح شہنشاہ کا درجہ بادشاہوں سے بلند ہے۔ مشرقی شہنشاہوں کے حکمران ہمیشہ بادشاہوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ قیصر جولیس نے یہ خیال پیدا کیا کہ روما کی عالمگیر سلطنت قائم ہو اور تاریخ نے سلطنت کے اس اعلیٰ خیال کو اسی کی جانب منسوب کرکے اُسکا نام "قیصریت" رکھ دیا، لیکن اس خیال کی پوری تعبیر اُس وقت تک نہیں ہوسکتی، جب تک کہ دنیا اس درجے تک ترقی نہ کرجائے کہ تمام بنی نوع انسان کا ایک عالمگیر نظم قائم ہوجائے جب تک یہ نہو،

اُس وقت تک شہنشاہی کے دوبارہ قائم کرنیکی تمام کوششیں مثل سابق کے جزوی اور ناکمل ہوں گی۔[1]

---

[1] "قیصریت" کے تخیل و تاریخ کے متعلق "جرمانی قاموس سیاسیات" (Deutsches staatswoerterbuch) میں اُسکے متعلق مضمون کو دیکھنا چاہئے۔

آٹھواں باب

(الف) یونانیوں اور جرمانیوں میں خاندان بادشاہی

یونان اور جرمانیا کی ابتدائی زمانے کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں قوموں کے قبیلوں اور سلطنتوں کی باگ بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں میں سلطنت کا تخیل کیا تھا اور وہ اُسے کسطرح چلاتی تھیں اور یہ کہ ان دونوں قوموں کے تخیل اور عمل میں کیسی تعجب خیز یکسانیت تھی۔ برخلاف اسکے قدیم رومیوں میں (جو زمانے کے اعتبار سے ان دونوں قوموں کے درمیان ہیں) بادشاہی کا خیال اپنی اہم خصوصیات میں ان دونوں سے مغائر ہے۔

یونانیوں اور جرمانیوں کی بادشاہی سلطنت کی ایک ایسی شکل تھی جو مشرق کے شخص واحد کی مذہبی حکومت کی صورت سے منقلب ہو کر انسانی اور سیاسی تنظیم کی شکل میں آگئی تھی۔ اسکے بادشاہ اپنے نسب کا سلسلہ عموماً دیوتاؤں سے ملاتے تھے، یونانی زیادہ تر زیوس سے اور جرمانی ووڈن (یا اوڈن) سے، اور عوام بھی اس عقیدے کو مانتے تھے؛ مگر باوجود اس خدائی رشتہ داری کے بادشاہ خود انسان تصور کیئے جاتے تھے اور انسانی پابندیوں کے بھی تابع تھے۔

اس لئے بادشاہ کی جس قدر عزت کیجاتی تھی وہ اسکے اختیارات سے بہت بڑھی ہوئی تھی۔ وہ دیوتاؤں کے سامنے قوم کا قائم مقام ہوتا تھا اور قربانی اور عبادت کی انجام دہی جب کسی خاص فرقہ کے پروہت سے متعلق نہیں ہوتی تھی تو قوم اور دیوتاؤں کے درمیانی ہونیکی حیثیت سے ان کاموں کو بھی بادشاہ ہی انجام دیتا تھا[1]۔

---

[1] ارسطو، "سیاسیات"۔ اسکینڈینوی ممالک میں یہ خصوصیات جسقدر نمایاں ہیں اسقدر کسی جرمانی سلطنت کی معلومہ تاریخ میں نظر نہیں آتے ہاکون (شاہ ناروے) اگرچہ عیسائیت کی جانب مائل تھا مگر ہنوز کاشتکاروں کی وجہ سے مجبور ہو گئے سے قدیمی طرز پر تھنگ میں قربانی کرنا، جام مقدس میں شراب پینا اور گھوڑے کا گوشت کھانا پڑتا تھا۔

چنانچہ ایتھنز میں جب شاہی کا خاتمہ ہو گیا۔ تب بھی وہ ارخون (عہدہ دار) جسکے سپرد قربانی (یا نذر نیاز) کا کام تھا، بادشاہی کے لقب سے موسوم تھا۔
بادشاہوں کی مالی قدر و قیمت دوسرے ارکان ملت کے بہ نسبت بہت زیادہ سمجھی جاتی تھی جسے رمانیا میں بادشاہ کی دیت بالعموم امرا کی دیت سے چند در چند زیادہ ہوتی تھی۔ دولت کے اعتبار سے بھی وہ اپنی رعایا سے بہت بڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ زمین کا بہت بڑا حصہ ان کی ملک میں ہوتا تھا اور مفتوحہ علاقے میں انھیں سب سے بڑا حصہ ملتا تھا۔ اُنکی قیام گاہ یا محل اور مکانوں کے مقابلے میں زیادہ بلند، زیادہ وسیع زیادہ خوبصورت اور زیادہ آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے۔ اُنکے خزانے جواہرات اور زیورات سے مالا مال ہوتے تھے۔ اُنکے شاہی منصب کیلئے خارجی علامات بھی ہوتے تھے۔ مثلا یونانیوں کے ہاں عصائے شاہی اور جرمانیوں کے ہاں جریب شاہی اُنکے بیٹھنے کیلئے ایک بلند تخت ہوتا تھا جرمانی بادشاہوں کے آگے آگے جھنڈا بھی ہوتا تھا جس سے اُسکی جنگی طاقت کا اظہار مقصود تھا۔ یونانیوں کے ہاں بادشاہ کے برآمد ہونیکے وقت نقیب اعلان کرتے اور لوگوں کو خاموشی کا اشارہ کرتے تھے۔ فرانکی بادشاہ زیبائش کے طور پر کاکلیں رکھتے تھے۔ بادشاہ کا لباس ہمیشہ شاندار اور چمکدار ہوتا تھا۔ ہندوستان اور چین کے قدیم بادشاہ ہمیشہ لمبی زرتار قبائیں پہنکر نکلتے تھے اور ایک زرد رنگ کا چھتر اُنکے ساتھ ہوتا تھا۔
شاہی خاندانوں کی موجودگی اور اُنکے دیوتاؤں کے نسل سے ہونیکے خیال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم زمانے کی شاہی موروثی تھی، تاہم جانشینی کا کوئی معین قاعدہ نہیں تھا۔ یونانیوں میں شخصی ہمت و قابلیت کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ عورتیں اور بچے اس سلسلے سے تقریباً ہمیشہ خارج کر دئے جاتے تھے اور چونکہ امرا اور عوام کی منظوری کی شرط تھی اس لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ موروثی سلسلہ ترک کر دیا جاتا تھا۔ [۵]

---

[۵] یہاں ہم کو اوڈیڈلیس کا قصہ یاد آتا ہے۔ ہندوستانیوں میں بھی ہم (بہ سلسلہ خلف اکبر) حکمران کے اس قسم کے موروثی حق کو رائے اور انتخاب کے ساتھ ممزوج دیکھتے ہیں۔ دیکھو فون ہولتس من کی "ہندوستانی کہانیاں" (Indische sagen) جلد ۲۔ صفحہ ۱۸۴۔

جرمانیوں میں یہ طریقہ رائج تھا کہ امرا انتخاب کرتے اور عوام اُس پر منظوری دیتے تھے مگر جانشینی بالعموم موروثی ہوتی تھی اور یونان کے بہ نسبت وہاں بچے زیادہ کثرت سے وارث تاج و تخت ہو جاتے تھے لیکن کوئی ایسا قاعدہ نہیں تھا کہ اگر ایک آزاد قوم شاہی خاندان کے کسی بعیدی رکن کو حکمرانی کے زیادہ قابل سمجھ کر اُسے ترجیح دینا چاہے تو ایسا نہ کر سکے۔

ان بادشاہوں کی سیاسی طاقت بہت زیادہ تھی مگر اُس پر چند اہم قیود بھی عائد تھے۔

۱۔ بادشاہ، مجلس حکمراناں اور جمعیت قومی دونوں کا صدر ہوتا تھا اور دونوں کی کارروائی کی رہبری کرتا، لیکن بقول ٹاسی ٹش ان دونوں مجموعوں میں اُسکے اقتدار کا انحصار ترہیب سے زیادہ ترغیب پر ہوتا۔

۲۔ وہ انصاف کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا اور اگرچہ وہ خود فیصلہ نہیں کرتا تھا مگر وہ قانون کے قیام و دوام کی حمایت کرتا تھا۔ اُسکا اختیار بھی بالکل خود مختارانہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ عدالت کے فیصلے کے ماننے پر مجبور ہوتا تھا۔

۳۔ وہ فوجی تنظیم کا صدر ہوتا تھا اور بالعموم فوج کا پیشرو بھی وہی ہوا کرتا تھا۔ جنگ ہی سے اُسکی طاقت میں اضافہ ہوتا تھا لیکن چونکہ یونانیوں کی بہ نسبت جرمانی موروثی حق کا زیادہ خیال کرتے تھے اس لئے اگرچہ نابالغی کے زمانے میں فوج کا قائدِ اعظم بادشاہ ہی سمجھا جاتا تھا مگر اکثر بوجہ مجبوری عملی کام کیلئے کسی متولی کا تقرر ہو جاتا تھا۔

۴۔ یونانیوں اور جرمانیوں میں اگرچہ حکومت کے تخم بادشاہ کے مذکورۂ بالا اوصاف میں مضمر تھے مگر حقیقی حکومت کو اُن میں بہت کم ترقی ہوئی تھی۔

۵۔ دونوں قوموں (نسلوں) میں بادشاہ کا وجود اور اُسکے حقوق دیوتاؤں اور انسانوں کے حقوق سے گھرے ہوئے تھے۔ یونانی خصوصیت کے ساتھ اس امر پر زور دیتے تھے کہ اُنکے بادشاہ خدائی احکام اور قومی قوانین و مراسم کی پابندی کریں اور اُسی کو ایشیا کے مطلق العنان بادشاہوں کے مقابلے میں اپنے بادشاہوں کا بہ الامتیاز وصف سمجھتے تھے۔ بادشاہ عدالتی نظم کے اندر ہوتا تھا۔ اُس سے بالاتر نہیں تھا۔ وہ قوم کا صدر ضرور تھا مگر قوم سے خارج نہیں تھا۔ جرمانی بادشاہ سارے گروہِ احرار کے حقوق سے

اور بھی زیادہ گہرے ہوئے تھے۔

لیکن جرمانی بادشاہی کی ایک خصوصیت خاص تھی جس سے اُسکی قوت بہت بڑھ گئی تھی۔ جرمانی بادشاہوں کے جلو میں ایک گروہ ایسے چیدہ ممتاز اشخاص کا ہوتا تھا جو بادشاہ کی ذات سے وابستہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ بادشاہ کی ذات کے ساتھ وفاداری کی قسم کھاتے تھے اور انکا مستقل کام یہ ہوتا تھا کہ ہر ایک مخالف کے مقابلے میں بادشاہ کی عزت وطاقت کی حمایت کریں۔ بعد کو ازمنۂ وسطیٰ میں جو جاگیرداری تنظیم پیدا ہوئی اُس کا تخم یہی ہے اور اس جاگیرداری تنظیم نے قدیم نظام سلطنت کو اکثر توڑ دیا اور اس میں بہت کچھ دست اندازی کی اور ایک بڑی حد تک اُسے بدل دیا۔

نواں باب

(ب) قدیم روما کی قومی شاہی

بعض خصوصیات میں قدیم روما کی بادشاہی کو یونانیوں اور جرمانیوں کی بادشاہی سے بہت قریبی تعلق معلوم ہوتا ہے لیکن اور حالات کے اعتبار سے اُن میں اس قدر اہم تفاوت ہے کہ ہم اُسے بادشاہی کی ایک نئی اور زیادہ ترقی یافتہ صورت خیال کرنے پر مجبور ہیں۔ خود بادشاہوں کے تقرر میں دو خصوصیات اخلاقی طور پر قابل لحاظ ہیں ایک یہ کہ نامزدگی اور تقرر کے مقابلے میں موروثی جانشینی کم نمایاں نظر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ عام اعتقاد میں بادشاہ دیوتاؤں کی نسل سے نہیں سمجھے جاتے۔

یہ صحیح ہے کہ روما کے بانیوں کی نسبت یہ اعتقاد تھا کہ اُن کی رگوں میں دیوتاؤں کا خون دوڑ رہا ہے اور روموکس مرنے کے بعد دیوتاؤں میں شامل کر دیا گیا تھا لیکن اسکے بعد سے بادشاہوں کے انتخاب اور تمام دوسرے معاملات میں دیوتاؤں کا اثر شگون کے آثار، روح کی غیر مرئی تحریک اور قسمت کی اٹل قوت سے ظاہر ہوتا تھا۔ پس اگرچہ خدائی اثر کا خیال قائم رہا، مگر روما کی بادشاہی خالص انسانی بادشاہی تھی شخصی دوربینی اور مرضی کا خیال نسل و خاندان سے زیادہ کیا جاتا تھا[1]

روما کے بادشاہ کا انتخاب یا تو اُسکا پیشرو کر جاتا تھا یا سینات کی مدد اور خداؤں کی پسندیدگی سے متولی سلطنت اُسکا انتخاب کرتا تھا۔ یہ انتخاب صرف اُسکی زندگی بھر کیلئے ہوتا تھا اسلئے کوئی موروثی سلسلہ نہیں قائم ہوا اور اُنکا انحصار نسل کی بہ نسبت اشخاص کی ذاتی قابلیت پر زیادہ رہا۔ بادشاہ خود اپنا "قانون شاہی" تجویز کرتا تھا جسکے موافق اُسے شاہی اختیار اور شگون کی برکتیں دی جاتی تھیں[2]

---

[1] یہی حال رومیوں میں وراثت کا تھا۔ وراثت کا انحصار خاندانی تعلق پر اُسقدر نہیں ہوتا تھا جسقدر وصیت کرنیوالے کی شخصی مرضی پر تھا کیونکہ ہر شخص اپنا وارث مقرر کرنیکے معاملے میں آزاد تھا۔

[2] یہ وہی قانون شاہی (lex regia) ہے جسکی تجدید شہنشاہی کے زمانے میں ہوئی۔

یہ بالکل وہی صورت تھی جس طرح مابعد کی جمہوریت میں حکام (ناظموں) کو اختیار اعلیٰ (imperium) عطا ہوتا تھا۔ پس اس طرح رومی بادشاہی اول ہی سے ایک طرح کی شخصی نظامت تھی۔

شاہی کا یہ تصور صاف طور پر یونانیوں اور جرمانیوں کے خیال سے بالکل مغائر ہے علیٰ ہذا اختیار شاہی کی کیفیت میں بھی اہم تفاوت نظر آتا ہے۔ بعض امور میں دونوں میں مماثلت ہے۔ بادشاہ ہی وہ مذہبی مقتدیٰ ہوتا تھا جو قوم کی طرف سے نذریں چڑھاتا تھا وہی سینیات اور مجلس عام کو طلب کرتا اور اُنکی رہبری کرتا وہی انصاف کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا البتہ بعض صورتوں میں اسکے حکم کے خلاف قوم سے مرافعہ کیا جا سکتا تھا وہ فوجی قیادت کا حقدار اور فوج کا سپہ سالار ہوتا تھا۔ اراضی و آمدنی کے اعتبار سے وہ دولتمند ہوتا تھا۔

لیکن اسکے اختیارات یونانی بادشاہوں کی بہ نسبت زیادہ زور دار اور زیادہ مکمل ہوتے تھے اگرچہ یونانی بادشاہ موروثی بادشاہ اور دیوتاؤں کی اولاد ہوتے تھے؛ تاہم رومی اپنے حاکموں کو اس غرض سے کہ وہ بہبود عامہ کی حفاظت میں پرزور کارروائی کرسکیں جس قدر وسیع انتظامی اختیارات عطا کرتے تھے اُس سے اُنکی سیاسی معاملہ فہمی اول ہی سے نمایاں نظر آتی ہے اختیار اعلیٰ (imperium) کے طریقے کی ابتدا خالصتاً رومیوں سے ہوئی اور اُنکی بادشاہی اور سابق کی بادشاہیوں میں یہی امر مابہ الامتیاز ہے۔

رومی بادشاہوں کی خارجی علامات بھی ویسی ہی اثر افگن تھیں جیسی یونانی یا جرمانی بادشاہوں کی علامات تھیں، مگر انکی وسعت اختیار سے بھی اُن علامات کا اظہار ہوتا تھا۔ بارہ عصابرداروں کا کوڑے لئے ہوئے اُنکے آگے آگے چلنا محض علامات کے طور پر نہیں تھا بلکہ یہ فی الحقیقت نافرمانی کرنیوالوں کی تادیب کیلئے تھا۔ اختیار اعلیٰ اور عصابرداروں کے کوڑے عملاً و خیالاً رومیوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

اختیار اعلیٰ جو شگونوں کے ساتھ بادشاہ کی جانب منتقل کر دیا جاتا تھا، اُس سے بادشاہ کو فرمان نافذ کرنے اور قانون کے اُصول معین کرنے دونوں امور کا حق حاصل ہو جاتا تھا۔ لسے ہرگز بھولنا نہ چاہئے کہ روما کی سلطنت ایک بادشاہ نے قائم کی تھی اور روایتاً اُسی کے اختیارات اسکے جانشینوں کی طرف منتقل ہوتے رہتے تھے۔

مستقل قوانین کے لئے سینات کی منظوری کی ضرورت تھی۔ اور سروئیس ٹولیس کے وقت سے عوام کی رضامندی کا حاصل کرنا بھی ضروری ہوگیا تھا، مگر اُسکے ساتھ ہی بادشاہ کی مرضی بھی لازمی اور بالعموم قطعی ہوا کرتی تھی۔ صرف بادشاہ ہی قانون تجویز کرسکتا تھا اور جس قانون کے متعلق وہ چاہتا بحث کرنے اور رائے دینے کی ممانعت کرسکتا تھا۔ ان قوانین کے علاوہ بادشاہ اپنے فرمان میں بغیر کسی شورے یا منظوری کے اُن قانونی اصولوں کو معین کرسکتا تھا جن کی وہ متابعت کرنا چاہتا تھا۔ یہ فرمانی قوانین (Jus edicendi) بلا بحث وحجت بادشاہوں کے حقوق میں داخل تھے۔ اگرچہ اُن پر عملدرآمد کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔ یہ قاعدہ اول اول زمانہ مابعد کے حاکموں کے لئے وضع نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کے پیشروں سے دست بدست اُن تک پہنچا تھا۔

عدالتی اختیار

پس رومی بادشاہوں کا عدالتی اختیار جرمانی بادشاہوں کے اختیار سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ دونوں اولاً بذات خاص عدالتوں کی صدارت کرتے تھے مگر بادشاہ اپنے اسیسروں کی رائے کا پابند نہیں تھا وہ نہ صرف مقدمہ کی کارروائی کی ہدایت کرتا تھا بلکہ وہ خاص اصول معین کرتا تھا جسکے مطابق کسی مخصوص مقدمے میں کارروائی ہونا چاہیئے۔ ابتدائی زمانے میں وہ اکثر خود فیصلہ سناتا تھا۔ معاملات وجرائم کے قوانین کے تقریباً تمام انتظام کا دارومدار اسی پر ہوتا تھا۔

فوجی اختیار

رومی بادشاہوں کا فوجی اختیار بہت وسیع تھا۔ میدان جنگ میں بادشاہ کو افسروں اور سپاہیوں دونوں کی زندگی وموت کا کامل اختیار ہوتا تھا۔ ہم جمہوری زمانہ تک میں یہ دیکھتے ہیں کہ نہ صرف آمر مطلق جنکی طاقتیں بادشاہوں کے برابر ہوتی تھیں بلکہ قنصل بھی فوج کی التجا کے باوجود افسروں کو موت کی سزا دیتے تھے بلکہ پورے پورے فوجی دستے میں ہر دسویں آدمی کو قتل کردیتے تھے۔

عہدہ دار

بادشاہ تمام سیاسی اور مذہبی عہدوں کا سرچشمہ ہوتا تھا (tribunus celerum) وہی یعنی امیرالامرا والئی شہر یعنی نائب السلطنت کا تقرر کرتا تھا جو اسکی عدم موجودگی میں (praefectus urbi) شہر کا حکمران ہوتا تھا، اسی سے فال گو اور پیشوایان مذہبی اپنے ادائے فرائض کا اختیار اور اپنے مقدس قانون کا علم حاصل کرتے تھے۔

رومی بادشاہ کی اہم حیثیت

اختیار اعلیٰ (imperium) کا لب لباب یہ تھا کہ وہ ایک زبردست انتظامی قوت تھی،

جو سیاسی ضروریات اور ہنگامی حالات کے محل و موقع کے لحاظ سے حتمی و قطعی کارروائی کرسکتی اور بہبود عامہ کی کارروائیوں کو بزور رائج کرسکتی تھی۔ یونان کے بادشاہ اس قسم کے اختیار کا استعمال صرف ایک خفیف حد تک کرسکتے تھے اور جرمانی بادشاہوں میں تو اسکا مذکور تک نہیں تھا مگر رومی سلطنت میں اس اختیار نے اول ہی سے نہایت اہم حیثیت پیدا کرلی تھی۔ اہل روما جسطرح اپنے خاندان اور اپنی جائداد پر کامل حکمرانی چاہتے تھے اسیطرح وہ سیاسی اختیار اعلیٰ (imperium) کو بھی کامل و مکمل دیکھنا چاہتے تھے۔ انکے بادشاہ حالت امن میں صرف حاکم انصاف ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ مملکت کے حکمران یا والی بھی ہوتے تھے۔ "رکس" اور "ریگیرے" کے لفظوں ہی سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے۔

اسطرح یہ بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے کہ دور شاہی میں سلطنت روما کی تمام طرز عمل شاہی مرضی کے تابع تھی۔ تمام تنظیمات کا تعلق بادشاہ سے تھا اور ان میں ایسے ایسے کاموں کے شروع کرنے اور انھیں تکمیل کو پہنچانے کا اختیار تھا، جو اس زمانے میں بھی بہت عظیم الشان معلوم ہوتے ہیں۔ بادشاہ کو غذا کی فراہمی اور کاشت اراضی پر نظر رکھنا پڑتی تھی اہل شہر کے اخلاق کی نگرانی کرنا پڑتی تھی اور بہت وسیع احتسابی اختیارات کو عمل میں لانا ہوتا تھا، وہ تمام فرائض جو بعد میں قنصل، نائب قنصل، محتسب اور میرتعمیرات کے درمیان تقسیم ہوگئے تھے ابتداً صرف ایک بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ تاریخ میں روما ہی وہ پہلی سلطنت ہے، جس نے انسانی اور قومی شاہی کا شیوع کیا اور اُس شاہی میں کامل سیاسی اقتدار اور تقریباً علی الاطلاق انتظامی اختیار جمع کردیا۔

دسواں باب

(ج) رومی شہنشاہی

شہنشاہی محض جمہوری عہدوں کے مجموعے کا نام نہیں تھا

وہ رومی شہنشاہی جسکی بنا قیصر جولیس نے ڈالی، جسے آگسٹس نے استوار کیا اور جس نے بعد کے تمام سیاسی نشو ونما پر اس قدر قوی اثر ڈالا۔ وہ شہنشاہی (جیسا کہ بعض وقت خیال کیا جاتا ہے) محض جمہوری حکمرانوں کے اختیارات کو یکجا جمع کر لینے سے نہیں پیدا ہو گئی تھی بلکہ وہ درحقیقت زیادہ وسیع پیمانے پر قدیم شاہی اختیارات کی تجدید تھی جس میں درمیانی زمانے کے تغیرات مد نظر رکھے گئے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ شہنشاہوں نے بہت سے وہ فرائض اختیار کر لئے تھے، جو جمہوریت کے حاکموں سے متعلق تھے مثلاً صدارتی (تریبیونی) اقتدار کی بنا پر اُنکی ذات ہر طرح کے الزام سے بری تھی۔ اُنھیں قوانین کی نامنظوری کا حق حاصل تھا اور وہ ادنیٰ طبقوں کے حامی کی حیثیت اختیار کر سکتے تھے۔ احتسابی اختیار(ب) کی رو سے اُنھیں اخلاقیات کی نگرانی کا حق حاصل تھا اور وہ سینات کے ارکان اور امرا (یعنی جاگیرداروں) کی فہرست پر نظر ثانی کر سکتے تھے، مقتدائے اعظم (pontifex maximus) کے رتبے کے باعث وہ مذہبی قانون کے اہم مسائل کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ وقتاً فوقتاً وہ قنصل کے عہدے کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، مگر شہنشاہوں کے اختیار کا منبع ان عہدوں کے اجتماع پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ایک نئی مرکزی حکومت یعنی ایک حقیقی شاہی کے قائم ہو جانے پر

(ب) (آگسٹس کو احتساب کا اختیار اپنے قنصل ہونے کی حیثیت سے حاصل تھا مگر احتساب کا منصب ایک علٰحدہ عہدے کی حیثیت سے بدستور قائم رہا اور بعد کے شہنشاہوں نے بھی اُس منصب کو اختیار کیا جن میں کلاڈیس ویٹیلیس ویسپاسیان اور ٹیٹس داخل ہیں۔ ڈومیٹیان نے اُسے منسوخ کر دیا اور اُسکے فرائض کو شہنشاہ کے نامحدود اختیارات میں شامل کر دیا گیا۔ دیکھو موتزین کی تصنیف: "رومی قانونِ سلطنت"، جلد ۲، صفحہ ۳ - فقرہ ۶ - انگریزی مترجم)

مبنی ہے۔ ظاہرا جمہوری حیثیت کے باعث یہ تغیر ایک زمانے تک پوشیدہ رہا مگر ارباب فہم و ذکا کو آگسٹس ہی کے زمانے میں یہ تغیر صاف نظر آنے لگا تھا۔ ٹیبریس کی تخت نشینی کے وقت اسینیس گالس نے شاہی کے اصول کو صاف طور پر اپنے اس دعوے میں ظاہر کر دیا کہ "ناقابل تقسیم شئے کو تقسیم کرنا غیر ممکن ہے۔ سلطنت ایک جسم واحد ہے اور صرف ایک ہی شخص کا دماغ اس پر حکمرانی کر سکتا ہے"۔

شہنشاہی کیلئے انتخاب

شہنشاہوں نے صرف پرنسپ (princeps senatus) کا منکسرانہ لقب اختیار کیا تھا مگر اُنکے اختیارات اس قدر وسیع تھے کہ اُنکے بیجا استعمال کی طمع سے بہت کم شہنشاہ اپنے کو محفوظ رکھ سکتے تھے اور اکثر اُن میں سے ذہنی یا اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو گئے۔ شہنشاہی موروثی نہیں بلکہ انتخابی تھی۔ اول اول جو لوگ اس منصب پر فائز ہوئے اُنکا انتخاب دس برس کیلئے ہوتا تھا مگر حقیقتاً اُسے زندگی بھر کیلئے سمجھنا چاہیے۔ وہ خدائی نسل سے نہیں سمجھے جاتے تھے اور وہ قوم کی فوقیت کو تسلیم کرتے تھے۔ اُن کے اختیارات اُنھیں قوم کے ایک قانون کے موافق عطا ہوتے تھے لیکن اگرچہ شہنشاہ کے انتخاب میں نسل اور خاندانی تعلق کا لحاظ اصولاً نہیں کیا جاتا تھا مگر عام طور پر عملاً اسکا بہت بڑا اثر پڑتا تھا اور منتخب شدہ بادشاہ کو اپنی ذات سے وہ تمام وسیع اختیارات حاصل ہو جاتے تھے جو جمہوریت کے زمانہ میں تمام رومی قوم کو حاصل تھے۔ یہ اختیار جب ایک بار عطا ہو جاتا تھا تو پھر نہ اُس میں کمی ہو سکتی تھی اور نہ وہ واپس لیا جا سکتا تھا۔

شہنشاہی اختیارات

علاوہ اُن خاص ناظمانہ اختیارات کے جو بالعموم شہنشاہ کو حاصل ہوتے تھے شہنشاہی اختیارات کا تجزیہ حسب ذیل طور پر ہو سکتا ہے:۔

۱۔ سلطنت کی تمام فوجی طاقت اور شہر کی حفاظت کرنیوالی سپاہ کا نظم و نسق اور اعلیٰ اختیار۔ حدود سلطنت کی وسعت کے ساتھ مستقل فوج کا قیام بھی ضروری ہو گیا اس سے شہنشاہی کی بقا کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور بزور اطاعت حاصل ہونے لگی۔ اپنے اس فرض کی وجہ سے شہنشاہوں کا لقب امپراتور (imperatores) ہو گیا جس کے معنی اُس ابتدائی زمانے میں اس سے بہت مختلف تھے جو اب سمجھے جاتے ہیں۔

۲۔ نہایت ہی زرخیز اور اہم صوبوں کی حکومت علی الاطلاق جن سے شہنشاہوں کو بے اندازہ دولت و قوت حاصل ہوگئی بہ حیثیت مجموعی نظام سلطنت کے اس تغیر سے صوبے

بہت فائدے میں رہے۔ ان جمہوریوں کے ذی رتبہ اشخاص کو شہنشاہ، شہنشاہیت میں داخل کر لیتے اور ان کو اعلیٰ منصبوں پر قائم کرتے تھے۔ معہذا شہنشاہی عمال کی جبر و زیادتی اور استحصال، جمہوریت کے ہمیشہ بدلنے والے حکام اور سپہ سالاروں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ شہنشاہوں کے زیادہ مستقل اغراض کے ساتھ نظم و نسق میں نسبتاً زیادہ رحمدلی اور انتظام سے کام لیا جانے لگا۔

۳۔ تمام غیر ملکی معاملات کا فیصلہ، صلح و جنگ اور معاہدہ کرنیکا حق۔

۴۔ مجلس سنیات کے جمع کرنے، بحث طلب امور کے تجویز کرنے اور مجلس کے فیصلوں کو قانونی قوت عطا کرنیکا حق۔ یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ سنیات ان شہنشاہوں کی کسقدر خوشامد کرتی اور انکی کس درجہ مطیع تھی۔

۵۔ نظامت اور تمام اہم عہدوں کے تقررات کا آخری فیصلہ، مجلس عام (comitia) جو کچھ مدت تک بہ حسب ظاہر قائم رہی اور مجلس سنیات، دونوں از روئے قانون امیدواروں کی بابت شہنشاہ کی سفارش کا لحاظ کرنے پر مجبور تھیں۔

۶۔ سلطنت کی بہبود و عزت کیلئے ہر ایک کارروائی کا قطعی اختیار۔ درحقیقت یہی اختیار شہنشاہی قوت کی اصلی بنا تھا۔ اس اختیار کی بدولت نہ صرف اُسکے فرمان بلکہ فیصلے اور اسکی قانونی ہدایت تک کو قانون کی پوری قوت حاصل ہو جاتی تھی اور اس طرح وہ قانون سازی کی تمام وسعت پر حاوی تھا۔

مخالفانہ اعتراض و مقاومت کے روکنے کے لئے صاف طور پر یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ شہنشاہ کا قانون تمام دوسرے قوانین پر فائق ہے، خواہ وہ سنیات کا قانون ہو خواہ خواص کا ہو، خواہ عوام کا۔ نیز یہ کہ شہنشاہی قانون کی بجا آوری میں ان آخرالذکر قوانین کے توڑنے پر کوئی شخص جوابدہ نہیں ہو سکتا۔ شہنشاہ کی عدم ذمہ داری صرف اُسکی ذات تک محدود نہیں تھی بلکہ اُسکے تمام وزرا و عمال تک وسیع تھی یہ طریقہ موجودہ زمانے کے بالکل مغائر تھا۔

درحقیقت شہنشاہ کا اختیار بالکل مطلق العنان اور غیر محدود تھا۔ سلطنت میں اُسے وہی حیثیت حاصل تھی جو خانگی زندگی میں ملک ذاتی کی اور جو ایک خاندان میں اقتدار پدری (patria potesta) کی ہے، گویا روما کی عالمگیر سلطنت ایک فرد واحد کے ہاتھ میں مجتمع ہو گئی تھی۔ اسکا تخیل اصول بہبود عامہ تھا مگر یہ اصول خیال سے نکلکر عمل میں بہت کم آتا تھا

رومیوں کا یہ عظیم سیاسی اصول (کم از کم ازمنہ مابعد میں) سلطنت کے تمام معاملات میں شخصی حق سے زیادہ اہم ہو گیا تھا اگرچہ شخصی قانون کے حدود میں آخر الذکر کو بہت ترقی ہو گئی تھی۔

شہنشاہی روما کی تاریخ اگرچہ جز آ جز آ نہایت عظیم الشان معلوم ہوتی ہے مگر دنیا کو وہ یہ سبق دے گئی ہے کہ ایسا نا محدود اختیار نہ حکمران کیلئے مفید ہے اور نہ اسکی رعایا کے لئے۔

شہنشاہی کے اسباب

شہنشاہی کے عروج کی تعبیر یہ کیجاسکتی ہے کہ عام خرابی اور کمزوری کی وجہ سے اُسکا قیام ایک ناگوار ضرورت تھی۔ روما کے امرا میں وسیع سلطنت کے کام کو سر انجام دینے کی اہلیت و قابلیت نہیں رہی تھی۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے سابقہ اختیار و اثر کے حاصل کرنیکی کوششیں کیں مگر بالعموم حالات زمانہ کے سامنے انھیں خاموشی کے ساتھ سر جھکا دینا پڑا[1]۔ عوام کو حکومت کا کوئی دعویٰ نہیں رہا تھا۔ سپہگری کے بھی اب وہ دعوے نہیں رہے تھے بلکہ لوگ پر امن زمانے کے کاروبار اور خوشیوں میں غرق تھے۔ انھوں نے سنیات کی حکومت کے بجائے ایک شہنشاہ کی حکومت کو ترجیح دی اور امرا کی ذلت سے اپنی کمزوری کی تسلی کرلی۔ رومی قوم کا اخلاق اُنکے قابلیت کے بہ نسبت جلد تر خراب ہو گیا اور خود اُن کی غلامی اُس نہ سیر ہونیوالی حرص کا عوض تھی جو انھیں فتوحات کے پیچھے لئے پھرتی تھی۔

---

[1] کلاڈیس کی تخت نشینی کے وقت جو واقعات پیش آئے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ روما کے ادنیٰ طبقوں کو جمہوری نظام سلطنت سے زیادہ الفت نہیں رہی تھی۔

گیارھواں باب

(د) فرانکی شاہی

سلسلۂ شارلمین کی شاہی

جرمانیوں کے فرانکی قبیلے نے رومی سرزمین پر ایک بہت بڑی شہنشاہی قائم کرلی۔ انکی شاہی میں رومی اور ایتانوی دونوں عناصر شامل تھے اور اسی وقت سے قدیم دنیا کی تنظیم وترتیب ازمنۂ وسطیٰ کی تنظیم وترتیب کی طرف مبدل ہونا شروع ہوئی۔ فرانکی بادشاہ اپنے جرمانی پیشروں کے بہ نسبت بہت زیادہ صاحب اختیار تھا مگر رومی شہنشاہوں کے مقابلے میں اسکا اختیار مطلق کم تھا۔ کارل (چارلس) اعظم کے وقت میں جو شاہی قائم تھی اس میں جرمانیوں کی آزادی اور انکے قانون کے خیال کے ساتھ سلطنت کے قوت وغلبہ کے متعلق رومیوں کا تصور بھی ملا ہوا تھا۔

انکی قوت کے اسباب

کارولنگی (یعنی سلسلۂ شارلمین) کے بادشاہوں کی طاقت کے بڑھانے میں بہت سے اسباب مجتمع ہوگئے تھے، ازانجملہ قابل اور خوش اقبال بادشاہوں کی پیہم جانشینی اُن کی وسعت مملکت کی عاجلانہ ترقی، جس سے ایک پرزور اور حاوی حکومت کی ضرورت پیدا ہوگئی ایک ایسی مضبوط فوجی طاقت کی بھی حاجت پیش آئی جو ہمہ وقت آمادۂ پیکار ہو اور انکی جگہ پر اُس فوج نے فتوحات حاصل کیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ اُنکی رعایا کا بیشتر حصہ رومی شہنشاہی کے زیر اثر رہ چکا تھا اور اس وجہ سے وہ رومیوں کے خیالات اور انکی پرزور تنظیمات کا عادی تھا۔

موروثی جانشینی

ایک اعتبار سے فرانکون میں شاہی کا قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ملک شخصی کی تعیت میں موروثی اصول قائم ہوگیا اور قدیم انتخاب کا طریقہ بالکل بے معنی ہوگیا، یہی امر اس کا موجب ہوا کہ شہنشاہی مختلف بیٹوں میں تقسیم ہوگئی، جس سے سلطنت اور قوم دونوں کو سخت نقصان پہنچا۔ تخت کی جانشینی کا تعلق صحیح معنی میں سیاسیات اور قانون عامہ سے ہے اور اُنکا تقاضا یہ ہے کہ سلطنت میں اتحاد قائم رہے لیکن فرانکی طریق نے حکومت کے فرائض کے ساتھ بالکل شخصی یا خاندانی ملک کا سا معاملہ کیا اور اس اعتبار سے اُس خیال کی

موافقت کی جسے ہم اوپر آبائی اصول سے تعبیر کر چکے ہیں۔

فرانکون نے شاہی اختیار میں جو خاص تغیرات کئے وہ حسب ذیل ہیں:۔

فرانکون میں قانون سازی کا طریقہ

۱۔ منفرد جرمانی قبائل کے محدود حلقے میں قانون سازی کو جو درجہ حاصل تھا فرانکی شہنشاہی میں اسکی اہمیت بہت بڑھ گئی اور اسکے ساتھ قانون سازی پر بادشاہوں کا اثر سابق کے بہ نسبت زیادہ غالب آگیا، رومیوں کا یہ اصول کہ شہنشاہ کی مرضی قانون کے مثل ہے جرمانی الاصل قوم کے لئے بالطبع ناقابل قبول تھا لیکن فرانکون میں قانون کے تجویز کرنیکا حق بادشاہ اور اسکی مجلس کو حاصل ہوگیا تھا اور یہ حق علی العموم قطعی سمجھا جاتا تھا قانون کو جائز قرار دینے کے لئے بادشاہ کی منظوری کی شرط تھی اور اسی کے نام سے قانون کی اشاعت ہوتی تھی۔

لیکن یہ یاد رکھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ رواج اور قانون دونوں کی رو سے مذہبی اور ملکی رؤسا کی جماعت کا مشورہ اور اُنکی منظوری بھی ویسی ہی لازمی تھی جیسی بادشاہ کی منظوری، مگر رعایا کی منظوری کچھ ایسی اہم نہ تھی اور اُن معاملات کے سوا جن میں کلیسا یا سلطنت کے یا خود رعایا کے حقوق سے بحث ہوتی تھی دیگر معاملات میں اسکا لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔

امرا کی یہی شرکت طبقات کی اُس نیابت کا پہلا قدم تھی، جس نے بعد کی صدیوں میں اس قدر نشو و نما حاصل کیا اور جس سے نیابتی سلطنت کا ظہور ہوا۔

حکومت

۲۔ حکومت۔ سلطنت کی وسعت اور مسلسل سیاسی تغیرات کی اہمیت کے باعث ایک ایسی انتظامی قوت کی ضرورت پیش آئی، جس سے قدیم جرمانی ناآشنا تھے۔ اب صرف امن و قانون کے قائم رکھنے ہی کا سوال نہیں تھا بلکہ بہبود عامہ کا بھی کچھ لحاظ کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ رومیوں کے اختیار اعلیٰ (imperium) کا خیال فرانکون کے لئے بہت بعید از فہم تھا اس لئے اُنھوں نے اپنی نئی حکومت کے لئے ایک اپنا خاص اصول صیانت (mundium) قائم کیا، یہ صیانت شاہی، رومیوں کے اختیار اعلیٰ سے وہی نسبت رکھتی ہے جو جرمانی باپ یا شوہر کے اختیار کی روما کے بزرگ خاندان کے اختیار کے مقابلے میں تھی۔ یہ اختیار خود مختارانہ یا علی الاطلاق نہیں تھا، بلکہ اُسکے خاص فرائض رعایا کے حقوق کی حفاظت اور بہبود عامہ کی ترقی تھے۔ درحقیقت اس میں امتیاز کے ساتھ

ادائے فرائض کا خیال ناقابل انفکاک طور پر منتظم تھا۔ یہ جدت طرازی ہنوز پوری واضح نہیں ہوئی تھی مگر اسکے اندر ایسی مستور طاقت کا تخم موجود تھا جس میں حقیقی سیاسی ترقی کی قابلیت تھی۔

فوجی اختیار

شاہی کی اس صورت میں بادشاہ کو فوج کی سرکردگی کا اختیار تھا اور اس پر لازم تھا کہ وہ خود فوج کی سربراہی کرے۔ اسکے احکام بین (ban) کے نام سے نافذ ہوتے تھے، جو اپنی نوعیت میں عدالتی و فوجی دونوں ہوتے تھے۔ وہ اپنے فوجی حکم کی رو سے سلطنت کی تمام مسلح قوت کو جسطرح چاہتا کام میں لاسکتا تھا، اگرچہ بھی رسم ورواج اور عادات کے معینہ قواعد سے اسکے اختیارات محدود تھے لیکن طاقتور بادشاہوں اور خاصکر چارلس اعظم نے اپنی جارحانہ جنگوں کے لئے بھی اپنے جاگیرداروں کے علاوہ رعایا کے پورے پورے مسلح ڈویزن طلب کئے اور تعمیل حکم نہ کرنے والوں کو ساٹھ شلنگ جرمانے کی دھمکی دی۔

عدالتی اختیار

عدالتی حکم جو ملک کے انتظام کے لئے اس قدر اہم تھا، وہ بھی بادشاہ سے متعلق تھا، گر بالعموم اسکا نفاذ اضلاع کے کاؤنٹوں کے ذریعے سے ہوتا تھا جنھیں بادشاہ کی جانب سے اختیار حاصل ہوتا تھا۔ سلطنت کا نظم ونسق جب ترقی کرگیا تو تنازعات حقوق اور واقعات مجرمانہ میں ذاتی جنگ کے قدیم اختیار پر روک قائم ہوگئی اور تمام ملک میں انکا انتظام بادشاہ کی جانب سے ہوگیا اور قدیم قومی امن کا طریقہ جسے لوگ آسانی سے شکست کردیتے تھے منسوخ ہوگیا۔

بادشاہ کے صرف خاص اور خزانۂ عامہ کی آمدنی بہت بڑھ گئی تھی اور یہ کل آمدنی کلیتۃً بادشاہ کے اختیار میں تھی۔ رومی صوبوں کے فتح ہونے اور بادشاہیوں اور امارتوں کے معدوم ہونے سے شاہی جاگیروں میں بہت اضافہ ہوگیا تھا اور تمام ملک میں جابجا شاہی فرودگاہیں اور شاہی محلات بنے ہوئے تھے اور انکے اردگرد بہت بڑی بڑی جاگیریں تھیں۔ صوبوں کی اراضی اور اشخاص کے محصول بدستور قائم رکھے گئے تھے۔ مال واسباب پر جو محصول رومیوں کے وقت میں عاید ہوتا تھا وہ بڑھا دیا گیا تھا۔ مفتوح اقوام پر خراج لگایا جاتا تھا اور بطور تاوان جنگ کے ان سے بہت بڑی بڑی رقمیں وصول کیجاتی تھیں۔

انتظامی عمال

۴ - عمال کا ایک منتظم طریقہ قائم ہوگیا تھا، یہ تمام عمال بادشاہ کے تابع ہوتے تھے اور انھیں کے وسیلے سے بادشاہ کی قوت، انتظام کے ہر صیغے میں محسوس ہوتی تھی بزنطینی دربار کے طرز پر ان عمال میں سے اعلیٰ عمال بادشاہ کے قصر میں حاضر رہتے تھے ان میں حسب ذیل عہدہ دار شامل تھے ۔ جملدار و حاجب ۔ اعلیٰ حاکم انصاف و نائب السلطنت، بادشاہ کا پیش نماز جو دربار کے تمام پادریوں کا سرگروہ ہوتا تھا اور مذہبی معاملات کی اطلاع دہی اسی سے متعلق ہوتی تھی ۔ خزانہ دار جو خزانہ شاہی کا صدر ہوتا تھا اور دوسرے ممالک سے مراسلات کی خدمت بھی انجام دیتا تھا ۔ ناظر تشریفات جو دربار کی شان وشوکت اور سازوسامان کو درست رکھتا تھا، داروغہ محل جو ملازموں کا نگران اور خانگی معاملات کا منتظم ہوتا تھا ۔ داروغہ توشہ خانہ (میرسامان) جو اجناس وصول کرتا اور شاہی میز کے لئے شراب مہیا کرتا، داروغہ اصطبل ۔ میر سفر جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ سفر میں بادشاہ کی مناسب قیامگاہ کا انتظام رکھے ۔ چار میر شکار اور بازدار ۔

بادشاہ کے گشتی عہدہ دار سلطنت کے مختلف صوبوں کے معائنے کے لئے سال بسال روانہ کئے جاتے تھے ۔ انھیں کے توسط سے بادشاہ کو صحیح حالات معلوم ہوتے اور رعایا کی شکایات وخواہشات اس تک پہنچتی تھیں ۔ جہاں کہیں قانون کی اطاعت یا نظم عامہ کی حفاظت کی ضرورت ہوتی وہاں انھیں کے توسط سے یہ کام بھی انجام پاتا تھا ۔

ضلعوں کے کاؤنٹوں کو اعلیٰ عدالتی اختیارات حاصل ہوتے تھے اور حلقوں کے کاؤنٹوں کے اختیارات محدود ہوتے تھے چونکہ روئے زمین پر سب سے اعلےٰ حاکم انصاف بادشاہ ہوتا تھا، اس لئے ان دونوں قسموں کے کاؤنٹوں کو عدالتی اختیارات اسی سے حاصل ہوتے تھے ۔ اول الذکر کو براہ راست اور ثانی الذکر کو بالواسطہ ۔ انکے فوجی اختیارات کا سرچشمہ بھی بادشاہ ہی ہوتا تھا ۔ فرانکی شاہی کے ابتدائی زمانے میں کاؤنٹ کی حیثیت موروثی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ ایک ذاتی عہدہ تھا اور بادشاہ کو اس پر تقرر کا حق حاصل تھا لیکن چارلس اعظم کے تحت میں موروثی جانشینی کے طبعی میلان نے بہت جلد عہدے کی حیثیت کو پوشیدہ کردیا اور ہر منصب پر ایک موروثی حق پیدا ہوگیا ۔

بتدریج گشتی عہدہ دار قصۂ پارینہ ہوگئے ۔ امارتیں پھر قائم ہوگئیں اور بادشاہت کے عہدے خاندانی ملک بن گئے ۔ اس طرح اس رومی جرمانی شاہی کی طاقت فنا ہوگئی

اور اسکے بجائے شہزادوں اور امیروں کی اعیانی حکومت قائم ہوگئی ۔

شہنشاہی اور کلیسا کے قریبی تعلقات

۴ ۔ فرانکی شاہی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت مغربی شہنشاہی سے اُس کا گہرا تعلق ہے جسے چارلس اعظم نے قائم کیا تھا اور پھر عیسائیت اور کلیسا کی وسعت کے ساتھ ساتھ شاہی اور شہنشاہی دونوں کے تعلقات کا مد و جزر بھی قابل ذکر ہے ۔

سلطنت نے مذہب عیسوی قبول کر لیا تھا اور بادشاہ نے بھی ایک قسیس کے ہاتھ سے تبریک قبول کی تھی ۔ بادشاہ اپنے کو مامور سمجھتا تھا کہ وہ اپنی مملکت میں خالص مذہب عیسوی کو قائم رکھے اور اسے وسعت دے ۔ اسکے ساتھ ہی بہ حیثیت شہنشاہ کے اُسکا فرض تھا کہ جہاں تک اُسکا اختیار چل سکے وہ کفر و ارتداد کی بیخ کنی کرے ۔ چارلس اعظم نے اس فرض کو بہت وسیع پیمانے پر اور بہت سختی کے ساتھ پورا کیا ۔ تمام عالم عیسوی ایک جسم سمجھا جاتا تھا جسکے دو نظام تھے ایک قسیسی اور ایک شاہی یعنی کلیسا اور سلطنت ۔ بادشاہ اگرچہ سلطنت کا صدر تھا مگر اُس نے پادریوں میں بھی سلسلہ عیسوی انضباط و ترتیب کو بزور رائج کر دیا تھا ۔ وہ مجالس مذہبی کو طلب کرتا، اسافقہ اور صوامعہ کے طور و طریق پر نظر رکھتا، کلیسائی معاملات کے متعلق متعدد قوانین و احکام جاری کرتا رہتا تھا ۔ علیٰ ہذا، سیاسی تنظیمات اور ملکی نظم و نسق کے قانونی اصول پر حکومت مذہبی کا بھی نمایاں اثر پڑتا تھا ۔

بارھواں باب

(ھ) جاگیری شاہی اور شاہی محدود بہ حقوق طبقات

(۱) جاگیری شاہی۔

خاندان چارلس کی شاہی کا زوال

فرانکی شاہی میں ایک صحیح شاہی کے تمام لازمی شرائط موجود تھے اور اس لحاظ سے وہ جدید سلطنت کے لئے ایک نئی شاہراہ ترقی تھی مگر قوم میں مخالف قوت وجذبات اس قدر قوی تھے اور جرمانی امرا اور آزاد اشخاص کی روایات ایک مضبوط مرکزی انتظام کے اس قدر مخالف تھیں کہ صرف غیر معمولی ہی قوت کے حکمران اپنے شاہی اقتدار کو پوری طرح عمل میں لاسکتے اور سلطنت کی اصلی خصوصیت کو ظاہر کرسکتے تھے ورنہ کمزور بادشاہ بالکل بے بس تھے۔ انکے عہد میں یہ میلان صاف ظاہر ہوجاتا تھا کہ اتحاد سلطنت مٹا دیا جائے مرکزی قوت محدود اور بے اثر کردی جائے اور مقامی حکومتوں کو آزادی دیدی جائے۔

جاگیری شاہی

خاندان چارلس کے زوال وانقطاع سے شاہی اقتدار بالکل معدوم ہوگیا اور حاکمان ملک اور امرا نے علٰحدہ علٰحدہ قوموں اور حصوں کے انتظامات پر قبضہ کرلیا۔ رومی جرمانی عالمگیر شاہی کے بجائے جاگیری شاہی قائم ہوگئی۔ یہی طریقہ ازمنۂ وسطیٰ کی خاص سیاسی خصوصیت ہے۔

اسکی خصوصیات

جاگیری شاہی کی نہایت نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:-

اسکی بنا شخصی عہد ہے

۱۔ اس سے پہلے کی ہر ایک شاہی کی بنا یا تو قبیلے پر یا قوم پر یا متعدد نسل پر رہی اور اس لئے اُسے ایک قومی یا نسلی تنظیم کہہ سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے جاگیری شاہی اگرچہ بادشاہ کی ذات کی وجہ سے کسی خاص قوم سے متعلق رہی ہو مگر اسکی اصلی بنیاد اُس شخصی عہد وفاداری پر تھی جو بادشاہ اور اسکے تابعین کے درمیان ہوتا تھا۔ بادشاہ ملک کا مالک اعلیٰ ہوتا تھا اور تابعین کو اختیار منصب و جائداد سب اسی سے حاصل ہوتے تھے۔ عام رعایا چونکہ جاگیری زنجیر میں وابستہ نہیں ہوتی تھی اسلئے اسکی حیثیت کمتر

اور اُسکا تعلق بعید ہوتا تھا، پس اسطرح شاہی بجائے قوم کے گویا ایک خاص درجے یا طبقے کی تنظیم ہو جاتی تھی۔ اُسکا انحصار قوم پر اُس قدر نہیں ہوتا تھا جسقدر جاگیردار کا تابعین پر۔

وفاداری اور اطاعت

۲۔ شخصی وفاداری میں عزت کے خیال سے شرف اور زور پیدا ہو گیا تھا اور سیاسی نقطۂ خیال سے اب اُسکی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ تابعین جب اپنے آقا سے جاگیر حاصل کرتے تھے تو اسکی وفاداری اور اطاعت کا حلف اٹھاتے تھے۔ اس حلف اور جاگیرداری طریق کی تمام کیفیت انگلستان کی بادشاہت کے سکسونی نورمانی قانون میں بہت واضح اور نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ بادشاہ کے تابعین گھٹنوں کے بل جھک کر بادشاہ کی اطاعت کا حلف اٹھاتے تھے اور پھر کھڑے ہو کر انجیل پر ہاتھ رکھکر وفاداری کی قسم کھاتے تھے۔ اساقفہ اور رؤسائے خانقاہ اس سے مستثنیٰ تھے۔ اُنکے لئے صرف انجیل اٹھانا کافی تھا۔ اطاعت کے حلف کا تعلق خصوصیت کے ساتھ جاگیر کے قبضے سے ہوتا تھا۔ وفاداری کا حلف نسبتاً زیادہ عام تھا اور دوسرے افراد رعایا سے بھی جو جاگیرداری تعلق سے مربوط نہ ہوں، یہ حلف لیا جا سکتا تھا۔ اسکی مثالیں خاندان چارلس کے بادشاہوں کے وقت میں بھی ملتی ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ اسکا سبب یہی جاگیری خیال کا اثر تھا۔

وفاداری کی اس قسم کی پابندی دونوں جانب عاید ہوتی تھی۔ تابع کی طرح آقا بھی وفاشعاری کا پابند تھا مگر اطاعت کی پابندی صرف تابعین پر عاید ہوتی تھی۔

قبضہ اراضی

۳۔ جاگیری شاہی کی اس کوشش سے کہ تمام رعایا تابعین کے ضمن میں آجائے، قبضۂ اراضی پر بہت بڑا اثر پڑا۔ انگلستان کے نورمانی بادشاہوں نے یہ کوشش کی کہ وہ ملک کی تمام زمین کے مالکِ اعلیٰ سمجھے جائیں تاکہ صرف جاگیریں نہیں بلکہ وہ ریاستیں بھی جو حلف اطاعت سے قائم نہیں ہوئی تھیں، بادشاہ کی عطا کردہ سمجھی جانے لگیں۔ پس اسطرح آزادانہ جائداد کا حق قوی تابعانہ قبضے کے جاگیری حق میں بدل گیا۔[۵] یہ طریق جاگیرداری کی یہ عام خصوصیت ہے مگر انگلستان کی تاریخ قانون میں یہ خاص طور پر نمایاں ہے۔

---

[۵] دیکھو دوسرا مقالہ، دوسرا باب، تعلیق۔

بادشاہ سے حاصل شدہ اختیارات

۴۔ اس مطابقت سے بتدریج یہ بھی خیال کیا جانے لگا کہ تمام سیاسی اختیارات بادشاہ سے حاصل ہوئے ہیں اور بادشاہ کا اختیار خدا کا عطیہ ہے[1]۔ جس طرح سیاروں کو آفتاب سے روشنی حاصل ہوتی ہے، اسی طرح امرا کو حکمرانی کا حق آقائے بلند و برتر یعنی بادشاہ سے حاصل ہوتا تھا لیکن وہ محض سلطنت کے عہدہ دار یا عامل کے طور پر حکومت نہیں کرتے تھے بلکہ جس طرح وہ اپنی جائداد پر قابض ہوتے تھے اسی طرح وہ اپنے حق کی بناپر اور اپنے حسب دلخواہ حکومت کرتے تھے۔ سیاسی حکمرانی کے ساتھ شخصی آزادی کا یہ اجتماع اور بعض خاندانوں اور ریاستوں کے ساتھ مختلف مدارج کے اختیارات کا موروثی حق حاصل ہوتا تھا، انھیں اختیار عطا کرنے سے بادشاہ انکار نہیں کرسکتا تھا، نہ وہ اُنکے اختیار کے نفاذ میں مداخلت کرسکتا تھا، نہ اسکے لئے کوئی پابندی یا حد قائم کرسکتا تھا۔ نظم ونسق کا ہر ایک حصہ حقیقتاً ایک دوسرے سے ممیز و آزاد تھا۔

امرا کے اختیارات

پس سلطنت کا اتحاد محض ظاہری تھا۔ قوت رائے سے کام کرنیکی ہر ایک کوشش میں نہ حل ہوسکنے والی مشکلات کا سامنا ہوتا تھا۔ چھوٹے اور بڑے سب امرا مرکزی قوت کے کارکن کی طرح کام کرنیکے بجائے دقتیں حایل کرتے اور روک پیدا کرتے تھے۔ قومی زندگی مختلف انفرادی حصوں میں منتشر اور ایک ایک سلطنت متعدد شاہیوں میں منقسم ہوگئی تھی۔ افراد اور بالخصوص امرائے عظام کی مرضی اور خیال کے اظہار کے لئے وسیع مواقع حاصل تھے مگر مجموعۃً کوئی مشترک سیاسی کارروائی ممکن نہ تھی۔ صرف امرا کا طبقہ زور دار اور آزاد تھا۔ بادشاہ کی صرف توقیر تھی اُسے کوئی قوت نہیں حاصل تھی۔ رعایا اپنے قوتوں کے فطری نشوونما کے لئے ہر طرف سے راستے بند پاتی تھی۔ ادنی طبقے جسقدر مرکزی قوت یعنی بادشاہ سے دور تھے اُسی قدر اُن کے دیہاتی آقا یعنی امرا ان پر بے روک ٹوک ظلم کرتے تھے۔

---

[1] "سکسونی آئینہ" (Sachsenspiegel) جلد ا صفحہ ا کے بموجب خدا نے دنیاوی حکومت کی تلوار صرف شہنشاہ کو دی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ بادشاہوں کو اختیارات صرف شہنشاہ کے توسط سے حاصل ہوئے ہیں، گو یہ رائے عام طور پر قبول نہیں کیگئی اور بادشاہ اگرچہ شہنشاہ کے بلند رتبے کا احترام کرتے تھے مگر وہ یہ کہتے تھے کہ انھیں اختیارات براہ راست خدا سے حاصل ہوئے ہیں۔

جرمانی اقتدار شاہی کے دو خاص اجزا (یعنی فوجی اور عدالتی اختیارات اسی طرح پر بیشمار تابعین و امرائے درمیان تقسیم ہو گئے تھے۔ عاملانہ حکومت فرانکی بادشاہوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کمزور اور محدود تھی۔ شاہی اگرچہ زیبائش کے طور پر باقی تھی مگر تمام نظام سلطنت آئینی ہو گیا تھا۔ کیپٹنگی خاندان کے بادشاہوں کو امرائے عظام پر کچھ ایسا امتیاز نہیں حاصل تھا۔ جرمانی بادشاہ تک اکثر اندرونی معاملات میں والیانِ ملک کی کارروائی سے پریشان ہو جاتے تھے، صرف مستثنیٰ طور پر (جب کہ حالات خصوصیت سے موافق ہوں یا خطرات بالتخصیص خوف دلانیوالے ہوں) یہ ہوتا تھا کہ بادشاہ مضبوطی کے ساتھ اپنی مرکزی قوت کو کام میں لا سکتے تھے۔ نورمانی فتح کے بعد انگلستان میں اس حالت کے پیش آنیکی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ نورمانی امرا بادشاہ کے ساتھ متحد ہی رہنے میں اپنی حفاظت سمجھتے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ نئے خاندان کو تخت پر قائم رکھنے کے لئے ایک مضبوط حکومت کی ضرورت تھی۔

۵۔ گیزو نے اس سوال کو اٹھایا کہ کیوں جاگیرداری طریقہ ہمیشہ رعایا کو ناپسند رہا ہے۔ یہ نفرت صرف تنزل ہی کے زمانے کے متعلق نہیں تھی بلکہ جب یہ طریق اپنے معراج کمال کو پہنچا ہوا تھا اُس وقت بھی یہی کیفیت تھی اُس نے اسکی خاص وجہ یہ بیان کی ہے کہ جاگیرداری طریقہ چھوٹے چھوٹے بادشاہوں بلکہ مطلق العنانوں کا ایک اتحاد تھا۔ اُن میں باہم مساوات نہیں تھی، وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حقوق و فرائض کے پابند تھے مگر اپنے اپنے حدود میں انھیں اپنی اپنی رعایا پر کامل مطلق العنانی حاصل تھی ظالمانہ حکومتوں میں سب سے بدتر حکومت وہ ہے جو اس طرح اپنی رعایا کا شمار کر سکے اور اپنے مستقر سے اپنے حدود حکمرانی کو دیکھ سکے۔ یہاں انسانی خود رائی کے تلون کا اظہار ناقابل برداشت طریقوں سے اور ایسی شدت کے ساتھ ہوتا تھا کہ اُسکا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ وہ طریقہ تھا جس میں حالات کی نامساوات بہت بُری طرح نمایاں کیجاتی تھی۔ دولت، اختیار، آزادی ہر طرح کے منافع اور حقوق ایک طرف ہوتے تھے اور عین انھیں کے مقابلے میں افلاس، کمزوری اور غلامی کا منظر دوسری طرف نگاہوں کے سامنے ہوتا تھا۔ خود مختاری اس حد تک بڑھی ہوئی تھی جیسی کسی خالص بادشاہی میں ہونا چاہئے، امتیازات اُس حد تک ترقی کر چکے تھے جسقدر کسی منتظم امیرانی سلطنت میں

ہو سکتے ہیں اور ان دونوں کا اظہار نہایت ہی برے اور تکلیف دہ طریقے سے ہوتا تھا۔ تختگاہ کی دوری اور بلند پایگی کی وجہ سے مطلق العنانی میں جو کمی ہوجاتی ہے اُس کا یہاں وجود نہیں تھا۔ امتیازات پر کسی عظیم الشان مجلس کی عظمت کا نقاب نہیں ڈالا جاتا تھا۔ اُن دونوں کا تعلق ایک ایسے شخص سے ہوتا تھا جو بروقت موجود رہتا تھا۔ کوئی اسکا شریک کار نہیں تھا اور وہ ہمیشہ اپنی رعایا کے پاس ہی پاس ہوتا تھا۔

یہ طریقہ تمامتر باعث تکلیف ہی نہیں تھا۔

اس بیان میں کچھ سچائی ضرور ہے مگر اسکا کلی اطلاق صرف فرانس پر ہوسکتا ہے ازمنہ وسطیٰ کی سب سلطنتوں پر نہیں ہوسکتا۔ جاگیرداری طریق ہر جگہ نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور کسانوں تک کے امیروں سے رضامند ہونیکی مثالیں کم نہیں ہیں۔ اس طریقے کے لئے یہ بھی لازمی نہیں تھا کہ امرا کو اپنے تابعین پر کامل مطلق العنانی حاصل ہو۔ جہاں اس قسم کے اختیار پر عمل ہوتا تھا جیسے فرانس، اور اکثر دوسرے ممالک میں بھی، وہاں یہ اختیار اُس طریقے کے بالکل مخالف تھا، جس نے اوپر سے نیچے تک انتظامی حلقے قائم کردیے تھے جن میں اختیارات ایک دوسرے سے بالاتر آزاد قوت سے حاصل ہوتے تھے۔ نیم غلاموں تک کے موروثی حقوق معین تھے انکی ذمہ داریوں میں محض آقا کی مرضی سے اضافہ نہیں ہوسکتا تھا۔ نہ رسم ورواج کے خلاف آقا اُن کو بیچ سکتا تھا۔ ادنیٰ طبقے کے لئے، تعلقے کا قانون اُسی طرح معین ومروج تھا جس طرح اعلیٰ طبقے کے لئے جاگیرداری قانون رائج تھا۔

لیکن ان حالات سے قطع نظر بھی جہاں آقا اپنے حقوق سے تجاوز کرجاتے تھے اس میں شک نہیں ہوسکتا کہ حکومت کی یہ مختصر وسعت اور اس شخصی ظلم وجور سے بچنے کے مشکلات جو اس قدر قریب ہوتا تھا، جاگیرداری طریقے کی بدترین خصوصیات میں سے ہیں۔

سیاسی حقوق کی موجودگی۔

۶۔ جاگیری سلطنت سب سے مقدم ایک قانونی سلطنت تھی، اگرچہ مفاد عام کا اصول نظروں سے غائب تھا مگر مختلف سیاسی حقوق بہت صاف طور پر معین ومشخص تھے۔ ذاتی اور شخصی حقوق کی طرح یہ سیاسی حقوق بھی حسب خواہش فروخت، مبادلہ، ہبہ اور وراثت وغیرہ کے معمولی قانونی کارروائی کے ذریعے سے علحدہ کئے جاسکتے تھے۔ انکی حفاظت یا تو عدالتی طریق سے ہوتی تھی یا اسکے لئے شخصی جنگ کا حق تسلیم کیا جاتا تھا۔

ایک طرف ایک معینہ قانونی انتظام تھا جس سے افراد اور علیحدہ علیحدہ جماعات کی آزادی تو محفوظ تھی مگر عام قوم کی آزادی محفوظ نہ تھی۔ دوسری طرف اندرون ملک میں ہمیشہ جنگ وجدل کا بازار گرم رہتا تھا جس سے بدامنی کا ایک نامتناہی سلسلہ قائم ہوگیا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کی جاگیری سلطنت کے یہ دو متضاد رخ ہیں۔

(۲)۔ شاہی محدود بہ حقوق طبقات۔

شاہی اختیار کی تحدیدات

ازمنۂ وسطیٰ کے ختم ہونیکے قبل، بتدریج جاگیری شاہی کی جگہ، شاہی محدود بہ حقوق طبقات نے لے لی۔ یہی شاہی زمانۂ حال کی نیابتی بادشاہت کی پیشرو ہے، کم وبیش سنہ ۱۲۵۰ء سے یہی طریقہ یورپ کی اکثر سلطنتوں میں رائج ہوگیا اور تین صدیوں تک جاری رہنے کے بعد سولھویں صدی میں اُس نے مطلق العنان شاہی کی صورت اختیار کرلی۔

بادشاہ یا حکمران اب بھی اپنے اختیارات خدا سے یا اپنے سے اعلیٰ طاقت سے حاصل کرتا اور اُن اختیارات کو اپنی اور اپنے خاندان کی ملک سمجھتا تھا۔ اپنے حدودِ حکمرانی میں وہ اپنے کو بالکل مالک سمجھتا تھا اور اپنی مرضی کے خلاف کسی مخالفت کا متحمل نہیں ہوتا تھا لیکن یہ حدودِ حکمرانی اب ہر طرف سے محصور ہوگئے تھے۔ طبقات، جماعات اور افراد کے حقوق سے ہر جگہ مقابلہ پڑتا تھا وہ جسطرح اپنے حقوق کی عزت چاہتا تھا اُسی طرح وہ خود اُن حقوق کی حفاظت کرنے پر مجبور تھا۔ یہ صاحبانِ حقوق بشرط ضرورت بزورِ اسلحہ یا قانون کے پُرامن ہتیار کے ذریعے سے اپنے حقوق کی حفاظت کرنیکے لئے تیار رہتے تھے۔

وضع قانون

بادشاہ کو بذات خاص قانون سازی کا کوئی حق حاصل نہیں تھا: بادشاہ کے فرامین کے لئے قومی طبقات (مجلس شوریٰ) کے مشورے اور منظوری کی شرط تھی اور والیان صوبہ جات کیلئے صوبے کے طبقات کی منظوری درکار تھی۔

نظم ونسق

اُس وقت تک انتظامی قوت نے بہت کم ترقی کی تھی اور بہت محدود تھی۔ مرکزی حکومت کے منشا کی تعمیل کے لئے کوئی جماعت عمال کی نہیں تھی۔ جن روسائے عظام کو شاہی اختیارات تفویض ہوتے تھے، وہ اُن اختیارات کو اپنے حدود کے اندر مثل اپنے اختیار کے استعمال کرتے تھے۔ دربار کے عہدے اکثر موروثی تھے اور بادشاہ کے جو تابعین و وزرا اُن پر مامور ہوتے تھے وہ شدآمد قدیم کے مطابق اُس خدمت کو

انجام دیتے تھے جس میں اصلیت کے بہ نسبت نمائش زیادہ ہوتی تھی۔ رواج و آداب، مختلف طبقات کی روایات، خاندانی خیال، فرائض قانونی اور مفاد عامہ کے احساس سے زیادہ موثر ہوتے تھے۔ صوبے کی مجلس شوریٰ جس میں امرا کا غلبہ ہوتا تھا اکثر اپنی شکایات و تعرضات کی وجہ سے صوبے کی حکومت کے لئے پریشان کن ثابت ہوتی تھی، وہ اکثر والی صوبہ کے وزرا پر اعتراضات کرتی رہتی اور انکی موقوفی و سزادہی کا مطالبہ کرتی تھی۔ بسا اوقات وہ خود والی کی ذات کو اپنی نگرانی میں لے لینا چاہتی تھی، یا یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اسکے مقرر کردہ اشخاص حکومت میں شامل کئے جائیں۔

عدالتی اختیار

بادشاہ بدستور انصاف کا حاکم اعلیٰ سمجھا جاتا تھا اور کبھی کبھی دادرسی کے لئے بذات خاص اجلاس کرتا تھا لیکن فیصلے کا اعلان اسیسر کرتے تھے اور بادشاہ صرف اس فیصلے کو عمل میں لاتا تھا، وہ خود بھی قانون کا پابند ہوتا تھا اور اپنی غلطیوں کی اسے جوابدہی کرنا پڑتی تھی۔ یہ ایک پرانا جرمانی دستور تھا کہ جس امیر کو عدالتی اختیارات حاصل ہوں اس پر اگر کوئی الزام لگایا جائے تو اسکا مقدمہ اسی کے قائم مقام کے سامنے پیش ہونا چاہئے چنانچہ جرمانی بادشاہ باوجودیکہ وہ رومی شہنشاہ اور تمام عالم عیسوی کا دنیاوی سرگروہ ہوتا تھا، بعض صورتوں میں رائن کے پیلیٹائن کاؤنٹ (والی) کے روبرو طلب کیا جا سکتا اور ان والیوں کے فیصلے کے سامنے اُسے سر جھکانا پڑتا تھا۔ علیٰ ہذا والی کے مقدمہ کا فیصلہ اسکا کارکن مجسٹریٹ (حاکم) کر سکتا تھا۔

پولس کے انتظام نے ترقی نہیں کی تھی اور بالعموم منصفوں کے فرائض میں یہ کام بھی داخل کر دیا جاتا تھا۔ اُس وقت تک جنداریہ (سلحداروں) کا رواج نہیں ہوا تھا اور موجودہ مفہوم میں پولیس کا وجود نہیں تھا۔

فوجی اختیارات

حکمران کی فوجی طاقت بھی جاگیرداری قوانین اور رسم و رواج سے محدود تھی، تابعین پر صرف ایک معینہ اور بہت ہی محدود خدمت عائد ہوتی تھی اور اُسے وہ اپنی زمین کا معاوضہ سمجھتے تھے اور اُسے کسی پرزور طریقے پر کام میں لانے کو وہ روکنا چاہتے تھے۔

جرمانی بادشاہوں کو اکثر یہ تجربہ ہوتا رہتا تھا کہ بڑے بڑے نائبان سلطنت کی متمردانہ آزادی کو روکنا کس قدر دشوار کام ہے اور یہ کہ شہنشاہی کے حکمرانوں کی

وفاداری پر شہنشاہ کو کس قدر کم اعتماد کرنا چاہئے۔

بادشاہوں اور حکمرانوں کیلئے یہ امکان موجود تھا کہ وہ اُن لوگوں سے زیادہ مطیع اور کار آمد فوج اجرتی سپاہیوں کی تیار کرلیں اور اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا، لیکن اجرتی سپاہیوں کو تنخواہ دینی پڑتی تھی اور اگر مجلس شوری اس غرض کے لئے کوئی خاص محصول عاید کرنے سے انکار کردیتی تو بادشاہ کو خود اپنی جیب سے یہ رقم ادا کرنا پڑتی اور اس سے وہ اکثر قرضدار ہو جاتا اور مشکلوں میں پھنس جاتا تھا۔ علاوہ اسکے چونکہ یہ اجرتی سپاہی اکثر غیر ملک کے ہوتے تھے، اس لئے جس ملک پر وہ متعین کئے جاتے تھے اُسکے باشندوں کو بادشاہ کی طرف سے متنفر کردیتے تھے۔

اجرائے محصول

بادشاہ کو اُسوقت تک کسی قسم کے محصول کے وصول کرنیکا حق نہیں تھا، جب تک کہ پہلے مجلس شوری اُس محصول کی ضرورت کو تسلیم اور اسکے اجرا کو منظور نہ کرلے لیکن ایک اعیانی جماعت بآسانی اُس پر راضی نہیں ہوسکتی تھی۔ آہستہ آہستہ اکثر محصول جائداد غیر منقولہ پر عائد کردیے گئے۔ اُنکا بار زیادہ تر کاشتکاروں کی زمین پر پڑتا اور اسطرح وہ ایک معینہ اور ناقابل تنسیخ محصول بن گئے۔ اس سے اور بعض دوسرے معاملات سے بھی صاف ظاہر ہے کہ مجلس شوریٰ اور افراد دونوں میں سلطنت کے مشترکہ فرائض کے احساس میں کمی تھی۔

تیرھواں باب

(و) زمانۂ حال کی مطلق العنان شاہی

مطلق العنانی کی ترقی۔

ازمنہ وسطیٰ کی شاہی جو ذی امتیاز طبقات کے حقوق سے محدود تھی اس کے بعد ہی زمانۂ حال کی نیابتی شاہی نہیں قائم ہوئی بلکہ اُسکے بعد مطلق العنان شاہی قائم ہوئی جسے طبقات (مجلس شوریٰ) کے خلاف جد و جہد سے قوت حاصل ہوگئی تھی سلطنت کی موجودہ صورت حاصل کرنیکے قبل جرمانی رومی مخلوط قوموں اور خالص جرمانی قوموں دونوں کو اس درجے سے گزرنا پڑا۔

رومی ملکوں میں

مطلق العنانی کا ظہور سب سے زیادہ نمایاں طریقے پر اولاً فرانس اور ہسپانیا میں ہوا۔ جہاں جہاں قوم میں جرمانی عنصر غالب تھا وہاں بادشاہوں کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ قانونی مسلمات اور جرمانی روایات کے خلاف مطلق العنانی قائم کرلیں، لیکن رومی روایات جواب اصولاً اور عملاً دوبارہ زندہ کیجارہی تھیں شاہی کے حق میں مفید تھیں۔

بارھویں ہی صدی سے جب کہ جاگیرداری طریق اپنے اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا، فرانسیسی مقنن بالاتفاق یہ کوشش کر رہے تھے کہ شاہی کو روما کے شہنشاہی قانون کی قدیم بنیاد پر قائم کریں؛ انکے گروہ کا اصولِ مسلمہ یہ تھا کہ حکومت، واحد، ناقابل تقسیم اور علی الاطلاق ہونا چاہئے، اور ان صفات کو وہ مجموعۃً "اختیار شاہی" سے ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ اس نظر سے وہ جاگیردار امرا کے عدالتی اور حکومتی اختیارات کو دراز دستی اور خرابی قرار دیتے اور اسے بادشاہ اور رعایا کے اغراض کے مخالف بتاتے اور اسے بالکل نیست و نابود ورنہ جہاں تک ہو سکے محدود کر دینا چاہتے تھے۔ وہ فرانسیسی بادشاہوں کو رومی شہنشاہوں کے جانشین اور صرف رومی قانون کو صحیح قانون ظاہر کرتے تھے۔ وہ جاگیرداری طریق کے قانونی دستوروں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے ان نظریات کو خیال سے عمل میں لانیکے لئے صدیاں گزر گئیں جب کہیں امرا کی حکومت کا خاتمہ ہوا، لیکن اندرونی کشمکش اسوقت تک

ختم نہیں ہوئی جب تک کہ جاگیر داری طریق کی ہر ایک صورت فنا ہو کر اسکی جگہ پر مطلق العنان شاہی (جو یو نا نیو ں نا زور پکڑتی جاتی تھی) قائم نہ ہوگئی۔

رومی قانون کا یہ مقولہ کہ "جو بات بادشاہ کو پسند ہے، وہ قانون کا حکم رکھتی ہے" خمولِ قدامت سے نکال کر دوبارہ ایک لابدی اصول سلطنت بنایا گیا اور اُس نے فرانسیسی میں اس قانونی ضرب المثل کی صورت اختیار کی کہ: "جو بادشاہ کو چاہتا ہے وہ قانون کو چاہتا ہے"۔ جب قانون سازی کا غیر محدود اختیار بادشاہ کے ہاتھ میں آگیا تو پھر بہت آسانی کے ساتھ وہ تمام مشکلات رفع ہوگئیں جن کو جاگیر داری طریق اور حقوق طبقات (مجلس شوریٰ) نے مرکزی حکومت، قومی جوش اور بہبود عامہ کی ترقی میں حائل کر رکھا تھا۔ نئے علمائے قانون کے زیر ہدایت جو طرز عمل عدالتوں اور خاصکر (پیرس اور صوبہ جات کی) شاہی پارلیمنٹوں نے اختیار کیا تھا اُس نے اس میلان کو کامیاب بنانے میں بڑی مدد دی۔ عام رائے، خاصکر اُن شہروں کی رائے جہاں رومی تہذیب مدتوں سے جاگزیں تھی اور جو ایک حد تک جاگیر داری اثرات سے آزاد رہے تھے، اس نئے خیال کی موئد تھی۔ اہل شہر جس قدر بادشاہ سے خائف تھے اُس سے کہیں زیادہ وہ چھوٹے چھوٹے امرا سے متنفر تھے اور انھیں یہ امید تھی کہ ان جاگیر دار امرا کو نیچا دکھا کے اور انھیں کمزور کر کے وہ اپنی تجارت اور صنعت وحرفت کی ترقی کو محفوظ کر لیں گے۔ اپنے ستانے والوں پر بادشاہ کے قوت کے بڑھ جانے سے کسان بھی نقصان کے بجائے نفع میں رہنے کی امید کرتے تھے۔

فرانس میں شاہی کو جاگیر داری طریق پر لوئش یازدہم کے عہد (۱۴۶۱ تا ۱۴۸۳) میں فتح حاصل ہوئی اور ہسپانیا میں فلپ دوم کے دور (۱۵۵۶ تا ۱۵۹۸) میں فرانس میں وقتاً فوقتاً رجعت قہقری بھی ہوتی رہی مگر ہسپانیا میں مطلق العنانی بہت مضبوط طور پر قائم ہوگئی تھی اور فرانس کی بہ نسبت زیادہ ظالم اور جفا کار ثابت ہوئی۔ یہ خیال کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ فلپ دوم نے یہ جرأت دکھائی کہ نیدرلینڈز کی تمام آبادی کو مجرم قرار دیدیا حالانکہ اس ملک پر اُسے حکومت کے بہت محدود اختیارات حاصل ہوئے تھے۔ فرانس میں مطلق العنانی لوئش چہاردہم کے وقت میں اپنے منتہائے کمال کو پہنچی اور اُسکے بعد سے برابر تنزل کرتی گئی، یہاں تک کہ انقلاب نے اُس کا خاتمہ کر دیا۔

جرمانیا کے سب چھوٹے بڑے حکمران خاندان لوئش چہاردہم کی نقل پر آمادہ ہو گئے یہانتک کہ اٹھارویں صدی میں ایک عیسائی حکمران جوزف اول نے بویریا کی تمام قوم کے خلاف (جن پر اس نے غاصبانہ حکومت قائم کرلی تھی) موت کا حکم صادر کر دیا اور اپنے اس فعل کو اپنے اختیار منجانب خدا کی بناپر جائز ٹھہرایا۔

مطلق العنان بادشاہی کے اصول

اس نئی مطلق العنانی کے سیاسی اصول کو لوئش چہاردہم نے اپنے ایک مشہور فقرے میں حیرت انگیز سادگی کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ "میں ہی سلطنت ہوں" بادشاہ اب اپنے کو جماعتِ قومی کا سرگروہ یعنی سب سے برتر اور سب سے طاقتور رکن نہیں سمجھتا تھا بلکہ وہ اپنی ذات اور سلطنت کو بالکل ایک سمجھتا تھا، پس گویا اُسکے سوا سلطنت کے کسی رکن کو سیاسی حقوق نہیں حاصل تھے۔ اسکی شخصی بہبود سلطنت کی بہبود تھی اُسکے ذاتی حقوق سلطنت کے حقوق تھے۔ وہی سب کچھ تھا اور اسکے سوا کچھ نہ تھا۔

"شاہی" اور "سلطنت" کا اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہوجانا ہی سے بالکل جداگانہ امر ہے کہ بادشاہ سلطنت کے عظمت واقتدار کا مجسمہ سمجھا جائے۔ اس کارروائی کی اہمیت اور اسکا خطرہ اس وجہ سے اور بھی بڑھ گیا تھا کہ اُسی کے ساتھ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یہ نظریہ بھی ترقی پر تھا کہ سلطنت کو "اختیار مطلق حاصل ہے" ازمنۂ وسطیٰ میں سلطنت چند محدود وآزاد ٹکڑوں میں منقسم ہوگئی تھی اور اُن ٹکڑوں پر اُسے کوئی قطعی اختیار حاصل نہ تھا۔ اب دوسری جانب یہ نظریہ سرعت کے ساتھ عروج کو پہنچ گیا تھا اور کوئی سیاسی حیثیت ایسی نہ تھی جو سلطنت کی گرفت سے باہر خیال کیجاتی ہو۔ قانونی معاملات اور شخصی حقوق تک سلطنت کے پیدا کردہ اور اُس کی مرضی کے تابع سمجھے جاتے تھے۔

اصحاب نظریات اور پادریوں کا اثر

اس خیال سے جو نقصانات پیدا ہوئے اُنکی ذمہ داری ایک بڑی حد تک اُس زمانے کے سیاسی اور قانونی اصحاب نظریات پر عائد ہوتی ہے۔ اول الذکر اس فکر میں مستغرق تھے کہ شاہی درازدستیوں کے لئے کوئی لگتی ہوئی توجیہ پیدا کریں اور ثانی الذکر نے اُس مخالفت سے کلیتہً پہلوتہی کی جو بطور فرض کے اُن پر عائد ہوتی تھی۔ اُس زمانے کے درباری علمائے مذہب بھی (خواہ وہ یسوعی تھے یا ہائی چرچ والے یا لوتھر کے متشرع پیرو) اسکو آسانی سے نہ مان سکے۔ انھیں لوگوں نے توڑ مروڑ کے

یہ مذہبی عقیدہ لگا لاتھا کہ حکومت کی بنیاد ربانی ہے اور بادشاہ زمین پر خدا کا قائم مقام ہے۔ گویا وہ ایک طرح کے دنیاوی دیوتا ہے۔ چونکہ خدا اس دنیا کا احکم الحاکمین ہے جسنے اُس نے پیدا کیا اور اپنی روح سے اُسے منور کیا، اسلئے بادشاہ بھی (اگرچہ قوموں کے پیدا کرنیوالے اور انکے زندہ رکھنے والے نہیں ہیں تاہم وہ اُنکے) اعلیٰ حکمران ہیں۔ جسطرح رومی شہنشاہ دیوتاؤں کی ہیئت اختیار کرنیکے متمنی رہا کرتے تھے، اُسی طرح لوئس چہاردہم نے جوپیٹر کا سوانگ بھرا تھا مگر عہد عیسوی کے بجائے یہ سوانگ کچھ زمانہ کفر ہی کے لئے زیادہ موزوں تھا۔

مطلق العنانی کا زوال

عین اُسی زمانے میں جب کہ اس قسم کی "قدرت مطلق" بادشاہوں کی طرف منسوب کیجارہی تھی اور اکثر اس پر عمل بھی ہوتا تھا۔ ہمیں بادشاہوں کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو بالکل بے بس تھے اور اپنے بلند حوصلہ وزیروں یا اپنی حریص بیگموں کے اطاعت شعار غلام بن گئے تھے۔ اس نظام کار میں تمام باتوں کا انحصار بادشاہ کی شخصی طبیعت پر تھا نمایاں قابلیت اور طاقت کے بادشاہ بھی اگرچہ اس سرگردان بلندی پر مستحکم طور پر قائم نہیں رہ سکتے تھے، تاہم وہ کسی نہ کسی طرح اس "قدرت مطلق" کی ظاہری حالت سنبھالے ہوئے تھے، چنانچہ لوئس چہاردہم کی طاقت جب تک عیش پرستی اور پیرانہ سالی کے باعث زائل نہیں ہوگئی اسکی حالت ایک مثال تھی لیکن انگلستان کے چارلس دوم ہسپانیا کے فرڈینڈ ہفتم اور فرانس کے لوئس پانزدہم کے ایسے کمزور بادشاہوں نے وہ مطلق العنان اختیار جو خاص بادشاہ کے ساتھ مخصوص تھا، دوسروں کے قبضۂ قدرت میں دیدیا تھا۔ رعایا ہر جگہ ناقابل بیان مصیبت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ مہذب یورپ پر اس مطلق العنانی کا جو اثر پڑا اسکو جو شخص پوری طرح سمجھنے کا خواہشمند ہو اُسے چاہئے کہ ہسپانیا اور آسٹریا کی سنہ ۱۶۴۰ء سے سنہ ۱۷۳۰ء تک کی معاشرتی تاریخ کا مطالعہ کرے۔

خوش قسمتی سے بہت سی مختلف روایات و تنظیمات عہد قدیم سے ایسی چلی آرہی تھیں جنھوں نے اس سیاسی اصول کی کامل اور مستقل ترقی کو روک دیا جو ایشیائی قوموں کے لئے تو موزوں ہوتا مگر یورپ کی حالت کے بالکل مخالف تھا۔ انگلستان میں خاندان اسٹوارٹ کے بادشاہوں نے دوبارہ تخت نشین ہونیکے بعد لوئیس چہاردہم کی نقل کرنا چاہی اور جیمس دوم نے نہ صرف پارلیمنٹ کے قدیمی اور مسلمہ حقوق پر حملے کئے بلکہ

کلیسا کے جدید الترتیب نظام حکومت کو بھی نشانہ بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہت اُس کے خاندان سے نکل گئی اور زمانے کا سب سے بڑا مدبر اور حکمران ولیم (آرنج) تخت نشین کر دیا گیا۔ اسکی تخت نشینی سے زمانۂ حال کے نیابتی طریق کی بنیاد مضبوطی کے ساتھ قائم ہوگئی۔ انگلستان میں مطلق العنان شاہی کا دو مرتبہ خاتمہ ہونا اور اسکا قطعی طور پر مٹ جانا یورپ کے دوسرے ممالک میں اس تنظیم کیلئے فوراً ہی مہلک نہیں ثابت ہوا لیکن اُسکا اعتماد بالکل جاتا رہا اور تباہی کی طرف اُسکے قدم بڑھتے گئے۔ اٹھارھویں صدی کے وسیع الخیال فلسفے نے مطلق العنان شاہی کے اُصول کو مسترد کر دیا۔ فریڈرک ثانی کی ذات نے اس فلسفے کو ایک ترقی کن سلطنت کے تخت پر پہنچا دیا۔ اُس نے اپنی تخت گاہ سے اس اُصول کا اعلان کیا کہ بادشاہ نہ زمین کا مالک ہے نہ رعایا و سلطنت کا آقا ہے بلکہ "وہ سلطنت کا اولین خادم ہے"۔ مطلق العنان شاہی کا اصول انقلاب فرانس کے پہلے ہی بیجان ہو چکا تھا اور اُس طوفان کے مقابلے کی اُس میں طاقت نہیں رہی تھی۔ جب قوموں میں آزادی کا احساس پیدا ہوگیا تو یہ اصول مختلف رنگ اختیار کرنیکے بعد انجام کار میں بالکل فنا ہوگیا۔

دیگر ممالک میں

اب اس زمانے میں صرف روس میں مطلق العنان بادشاہی باقی رہگئی ہے[۱]۔ مشرق کا مذہبی احساس مغرب سے بالکل جداگانہ ہے۔ ملک بہت وسیع ہے اور تمدن کی ترقی نسبتاً کم ہے۔ ان اسباب سے وہاں ایک مضبوط مرکزی حکومت کی ضرورت ہے۔ نہایت اہم اصلاحات جیسے الگزنڈر دوم کا نیم غلاموں کو عطائے آزادی (۱۸۶۱ء) وغیرہ شہنشاہ کے قطعی حکم کے بغیر عمل میں نہیں آسکتی تھیں۔

روس

[۱] روسی قوانین زار کو ایک آزاد اور مطلق العنان بادشاہ قرار دیتے ہیں اور علانیہ طور پر اُسکے اقتدار کی بنا اس خدائی حکم پر رکھتے ہیں کہ خدا خود یہ حکم دیتا ہے کہ اسکے (بادشاہ کے) اعلیٰ اقتدار کے مطیع رہنا چاہیے۔ کسی سزا کے خوف سے نہیں بلکہ ایک مذہبی فرض کے طور پر۔ وضع قانون کا اختیار خالصتہً زار کو حاصل ہے اگرچہ وہ بالعموم اپنی مجلس شاہی سے اس معاملے میں مشورہ کرلیتا ہے (مگر اب اس واحد مطلق العنان بادشاہی کا اور اسکے ساتھ خود زار کا بھی خاتمہ ہوگیا ہے۔ ؎ سر شب سر قتل و تاراج داشت - سحر گہ نہ تن سر نہ سر تاج داشت
بیک گردش چرخ نیلوفری - نہ نادر بجا ماند و نے نادری۔ اردو مترجم)

طبقہ امراسے بہ مشکل یہ توقع کیجا سکتی تھی کہ وہ اسکا روادار ہوتا اور آزاد اور تعلیم یافتہ شہریوں کا تو بہ حیثیت ایک سیاسی اور معاشری قوت کے کہیں وجود ہی نہیں تھا۔ ادنیٰ طبقے کے لوگوں میں اتنی قابلیت تو ہے کہ وہ اپنے دیہاتوں اور اپنی کاروباری انجمنوں میں اپنے معاملات کا انتظام کرسکیں، مگر سیاسیات اور قانون سازی میں کسی قسم کا مہتم بالشان حصہ لینے کی اہلیت اُن میں نہیں ہے۔

چودھواں باب

(ز) آئینی شاہی

۱ ۔ آئینی شاہی کی ابتدا اور اُسکی اشاعت ۔

شاہی آئینی کا عروج

آئینی شاہی نئے زمانے کا ثمر ہے مگر بقول مانٹسکیو اسکا تخم قدیم جرمانیا کے جنگلوں میں بویا گیا تھا ۔ سلطنت کی جس شکل کو اب ہم آئینی کہتے ہیں اسکے پیدا کرنیکی (اگرچہ نامکمل مگر) پہلی اہم کارروائی اُسوقت ہوئی جب جرمانی حکمرانوں نے رومی ملکوں پر تسلط حاصل کیا اور رومی سیاسی خیالات کا ازدواج جرمانی حقوق سے ہوا ۔

اسکے بعد وہ دور آیا جب جاگیرداری شاہی کی بنا پڑی اور ایک پرزور طبقۂ اعیان نے شاہی طاقت کو محدود کر دیا ۔ سلطنت کا اتحاد جاتا رہا ۔ رعایا کی بہبود کی طرف سے غفلت برتی جانے لگی اور بادشاہ میں اُسکے مرتبے کے موافق قوت نہیں رہی ۔ بعدہٗ قومی اتحاد کے خیال نے پھر زور پکڑا اور جرمانیا کی سلطنت میں روما کے سیاسی اصول سے پھر تازگی اور قوت آ گئی ۔ قوموں میں بھی اسی زمانے میں تحرک پیدا ہوا مگر حکمرانوں نے سبقت کر کے مطلق العنانی کا گرز آہنی سنبھال لیا ۔ مختلف طبقات نے ایک دوسرے کے ساتھ اور آپسمیں کشاکش شروع کر دی ۔ از منۂ وسطیٰ کا دور جس قدر ختم کے قریب ہوتا گیا اُسی قدر حکومت کے نظام جدید کا زمانہ نظر کے سامنے آتا گیا ۔ اس دور کا ختم ہونا گویا ایک ہزار برس کی تاریخ کے دور کا ختم ہونا ہے ۔ رومی جرمانی سیاسی زندگی نے تکمیل حاصل کی اور یہی یورپ کی اصلی سیاسی تہذیب ہے ۔

۱ ۔ انگلستان میں

سلطنت کی اس شکل نے سب سے پہلے انگلستان میں نشوونما حاصل کی جہاں اس میں ایک مدت سے بتدریج پختگی پیدا ہو رہی تھی ۔ از منۂ وسطیٰ میں یورپ کے کسی ملک میں بادشاہ کو اتنی قوت نہیں حاصل رہی جتنی انگلستان میں تھی مگر اسکے ساتھ ہی کسی دوسری جگہ امرا اور عوام کے حقوق آزادی کی حفاظت بھی اس جرأت کے ساتھ نہیں کیگئی

اور نہ یہ آزادی حقوق کسی اور جگہ ایسی مستحکم بنیاد پر قائم ہوئی۔

انگلستان کے انقلابات

لیکن انقلاب کی آفت سے انگریز بھی محفوظ نہ رہے۔ دو بڑے انقلابوں نے عمارتِ سلطنت کی بنیاد تک ہلا دی۔ پہلا انقلاب تیرھویں صدی کے وسط کا وہ انقلاب تھا جب بیرنوں نے یہ کوشش کی تھی کہ حکومت کا کام بادشاہ کے ہاتھ سے نکالکر خود اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ ۱۲۵۸ء کے قوانین آکسفورڈ جنھیں سایمن ڈی مانتفرٹ نے بجبر ہنری سوم سے منظور کرایا تھا، انکا منشا یہی تھا۔ دوسرا انقلاب جو سترھویں صدی میں چارلس اور طویل العہد پارلیمنٹ کی مخاصمت سے پیدا ہوا، اس میں جمہوریت پسند پیوریٹنوں کا ایک گروہ بادشاہ وامرا دونوں کو سیل فنا میں بہا لے گیا۔

لیکن ان دونوں موقعوں پر اس مرض کا دورہ اتنی دیر تک نہیں رہا کہ جسم عامہ کو مستقلاً کمزور کر دیتا۔ ظاہری علامات اگرچہ خراب معلوم ہوتی تھیں مگر اندرونی طور پر اس نے اتنا زور نہیں پکڑا تھا کہ قومی زندگی کی روش کو پھیر دیتا۔ دونوں مرتبہ انگلستان اس صدمے سے بہت جلد پنپ گیا۔ گزشتہ زمانے سے تاریخی رابطہ ٹوٹنے نہیں پایا اور قومی نشو و نما کی حالت میں ترتیب و تعدیل قائم رہی۔ اول الذکر انقلاب کے وقت سے شہروں کے قائم مقاموں کو پارلیمنٹ میں بلانیکی، جو ابتدا ہوئی اُسی سے زمانہ مابعد کے دار العوام کی بنا پڑی۔ دوسرے انقلاب کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ ۱۶۸۹ء میں نئی آئینی شاہی قائم ہوگئی، اور اس وقت سے یہی آئینی طریقہ قومی تنظیم بن گیا ہے۔

آئینی شاہی کی خصوصیات

آئینی شاہی سلطنت کی تمام دوسری شکلوں کی جامع ہے۔ اس میں سب سے زیادہ تنوعات موجود ہیں اور اسکے ساتھ ہی مجموعے کے اتحاد و اتفاق کو نقصان نہیں پہنچا ہے۔ ایک طرف امرا کو اپنی قوت کے عمل میں لانیکا پورا موقع دیا گیا ہے، دوسری طرف رعایا کے جمہوری میلان پر بھی کوئی روک نہیں قائم کیگئی ہے۔ اس نظام میں قانون کا احترام گویا فوق انسانی حد تک پہنچا ہوا ہے لیکن بادشاہ کے ذریعے سے مختلف المقاصد جماعات اپنی اپنی حد پر قائم ہیں اور وہی تمام نظم سلطنت کا زندہ رئیس ہے۔

۱۶۸۸ء کے انقلاب کے نتائج

انگلستان میں آئینی شاہی نے ترقی کے مختلف مدارج طے کئے ہیں ان میں سے مدارج ذیل کا تعلق ولیم (آرنج) کے زمانے سے ہے:

۱۔ مطلق العنان شاہی، خلاف آئین قرار دیگئی اور اس لئے مسترد کر دیگئی۔ وہ ایک

ایسی چیز سمجھی گئی جسکی روا داری ممکن نہ تھی اور جسکا مقابلہ کرنا جائز تھا۔

۲۔ پرانے خیال کے علمائے مذہب، اپنے پُر اسرار خیالات کی وجہ سے حقوق شاہی کو ربانی وقعت دیتے تھے۔ اُنکے اس خیال کے خلاف یہ اعلان کر دیا گیا کہ یہ حقوق انسانی ہیں اور نظام سلطنت کے حدود کے اندر ہیں۔ ان حقوق کی وہی کیفیت ہے جو پارلیمنٹ میں امرا اور عوام کے قائم مقاموں کی ہے یا جو کیفیت ہر انگریز کی شخصی آزادی کی ہے۔

۳۔ اعلان حقوق (۱۶۸۹ء) نے باضابطہ طور پر پارلیمنٹ کے حقوق اور رعایا کی آزادیوں کو معین و مشخص کر کے اُنھیں محفوظ کر دیا۔ اس اعلان کو مسئلہ جانشینی کے ساتھ ملا دینے سے آئندہ بادشاہ کے لئے یہ غیر ممکن ہو گیا کہ وہ اُن حقوق اور آزادیوں کو علیحدہ کر سکے۔

۴۔ بادشاہ کی غیر ذمہ داری نظام سلطنت کا ایک اصول قرار دی گئی تھی مگر شاہان اسٹوارٹ کے اخراج سے صاف طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ جسوقت بادشاہ اور رعایا میں ناقابل اصلاح تصادم ہو جائے تو اس اصول میں استثنا بھی ممکن ہے۔

۵۔ وزرا پارلیمنٹ کے جوابدہ بنائے گئے، دارالعوام کو اُنکے خلاف استغاثہ کرنیکا اور دارالامرا کو فیصلہ کرنیکا حق دیا گیا۔

پارلیمنٹ کے اور حقوق بھی تسلیم کئے گئے مثلاً:

۶۔ قانون سازی میں شرکت۔

۷۔ محصولوں کا منظور کرنا اور بادشاہ کے صرف خاص کا انتظام کرنا،

۸۔ عاملانہ عہدہ داروں کی نگرانی کرنا،

۹۔ عدالتی انتظام، جسکی بنا رعایا کی منتخب کردہ حلفی جوری پر رکھی گئی تھی، بالکل آزاد کر دیا گیا اور اسکے اختیارات بڑھا دئے گئے۔

۱۰۔ اخباروں اور سیاسی جلسوں کی آزادی منظور کی گئی تاکہ عام رائے حکومت کے کاموں کی نکتہ چینی کر سکے اور اُس پر قابو رکھ سکے۔

خاندان ہنوور کے بادشاہوں کے لئے اُن اصول اور اُنکے نتائج کا کما حقہا سمجھنا مشکل تھا مگر صورت حالات ایسی تھی کہ اُن کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ آزاد نظام سلطنت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ خود ہمارے زمانے میں شہزادہ البرٹ نے خاندان شاہی پر

یہ اثر ڈالا کہ وہ ہمہ تن آئینی طریق کا پابند رہے۔ اسکا اثر یہ ہوا کہ شاہی کی عزت و قوت میں کوئی فرق نہیں آیا اور خاندانی روایات سے جو مخالف اثر پیدا ہوتے تھے وہ رفع ہو گئے اور شاہی نے پوری قومی ہیئت اختیار کر لی۔

انگلستان کے بادشاہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اُنکی ذات صرف اُنکی مرضی کی نہیں بلکہ سلطنت کی مرضی کی نمایندہ ہے۔ پس لا محالہ یہاں کے وزرا کا اثر امور مملکت میں برأعظم کے وزرا سے بہت بڑھا ہوا ہے اور چونکہ انگلستان کے وزرا کا برسر اقتدار رہنا پارلیمنٹ بلکہ دار العوام کے اعتماد پر مبنی ہے، اسلئے قوم کے قائم مقاموں کا اثر حکومت پر حاوی ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی بادشاہی کو پارلیمنٹی یا جمہوری کہہ سکتے ہیں مگر تاج کا احترام جیسا قومی انگلستان میں ہے، ویسا کسی اور جگہ نہیں ہے اور طبقۂ امرا اور پارلیمنٹ کی قوت کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو مگر پھر بھی انگلستان کا نظام سلطنت بدستور شاہی ہے۔[۵۸]

آئینی شاہی کے قائم کرنیکی دوسری عظیم الشان کوشش فرانسیسیوں نے کی۔ سنہ ۱۷۹۱ کے نظام سلطنت کے مرتب کرنیوالی جماعت کے اصول شاہی کے بجائے زیادہ تر جمہوری عمومیت کی طرف مائل تھے۔ اس جماعت پر انگریزی نظام حکومت کا اسقدر اثر نہیں تھا جس قدر روسو کے نظریئے کا اثر تھا کہ اقتدار شاہی رعایا اور دو طاقتوں کو حاصل ہے اور اسکے بعد اُن پر امریکہ کے جمہوری نظام کا اثر تھا جس میں تین طاقتیں تھیں اور ہر طاقت دوسرے سے آزاد تھی مگر قوم کے اقتدار اعلیٰ کے زیر اثر سب متحد تھیں۔ پس سنہ ۱۷۹۱ کا نظام سلطنت فی الحقیقت عمومی تھا۔ بادشاہی کا جزو اس میں بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ بادشاہی گویا گزشتہ زمانے کی ایک یادگار ہو گئی تھی جس کے تمام لوازم کو انقلاب نے کلیتہً درہم برہم کر دیا تھا۔

۲۔ فرانس کا ۱۷۹۱ کا نظام سلطنت

نپولین نے شاہی اقتدار کو از سر نو زندہ کیا اور قوم جس قعر مذلت میں گر گئی تھی

پہلی شہنشاہی

---

[۵۸] مصنف نے اس موقع پر شاہی کی قوت کے ثابت کرنیکے لئے برک اور رابرٹ پیل کے اقتباسات دیئے تھے مگر انگریزی مترجم نے اُنھیں ترک کر دیا۔ اور حاشیہ پر یہ لکھا ہے کہ اس کتاب کے انگریزی ترجمے کے پڑھنے والوں کیلئے یہ ظاہر کرنا کچھ ضرور نہیں ہے کہ انگلستان کا نظام سلطنت ظاہراً شاہی ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ تاج انگلستان کے اصلی فرائض بحث "نظام سلطنت انگلشیہ" سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

اُس سے اُسکو ابھارا۔ مرکزی اقتدار نے نپولین کے ہاتھ میں پہنچکر پھر ایک بار اجتماعی ہئیت اختیار کی۔ انقلاب کا اثر ابھی تازہ تھا اور یورپ کی جنگ میں قوم کی سربراہی کیلئے ایک زبردست آمر مطلق کی ضرورت تھی، لیکن نپولین کی قوتِ حکمرانی اسقدر قوی تھی کہ اسکے ہاتھ سے فرانس میں ایک نئی آئینی بادشاہی کا قائم ہونا مشکل تھا اور یہ زمانہ اس قسم کے تجربے کیلئے موزوں نہیں تھا۔ تاہم اُس نے بادشاہی کی کچھ ظاہری شکل پیدا کر دی تھی۔ اُس نے یہ تسلیم کیا کہ قوم ہی اُسکے اختیار کا سرچشمہ ہے اور تمام اہل فرانس کیلئے اُس نے عزت اور ترقی کی راہیں یکساں طور پر کھول دیں۔ اس نے سنیات میں ایک نیا طبقۂ امرا قائم کرنا چاہا، اُسکی نسبت اس نے یہ کہا تھا کہ جب تک کہ جمہور اقتدار شاہی کے رتبے کے حاصل کرنیکے قابل ہوں اُسوقت تک یہ طبقۂ امرا شاہی کی حفاظت کریگا[1]۔ اگر اُس کا خاندان کچھ مدت تک امن کے ساتھ قائم رہجاتا تو اُس نے جو بنیاد ڈالی تھی اُس پر ایک قومی اور آئینی بادشاہت قائم ہو جاتی مگر نپولین خود دوسری جماعتوں کے سیاسی حقوق کو اس وجہ سے ناپسند کرتا تھا کہ اُن سے اُسکے اختیار مطلق میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی، اسلئے اُسکے زوال کے ساتھ ہی اسکی تنظیمات بھی برباد ہوگئیں۔

سنہ ۱۸۱۴ء کا منشور

لوئیس ہیزدہم کا منشور (مورخہ ۴ جون سنہ ۱۸۱۴ء) فی الاصل ایک طرح کی مفاہمت تھی۔ قدیم شاہی خاندان جلا وطنی سے واپس آگیا تھا۔ رعایا انقلاب اور نپولین کی حکومت کا مشاہدہ کرچکی تھی پس یہ گویا قدیم شاہی اور جدید اصول حکمرانی کے دعووں یعنی حق موروثی اور انقلاب کے درمیان ایک مصالحت تھی۔ ظاہری حیثیت سے یہ بادشاہ کی ایک نوازش تھی اور کلیتہً اُسی کے اختیار پر مبنی تھی۔ اسکے سوا اس میں اور بھی متضاد باتیں جمع تھیں تاہم فرانس میں اس سے پہلے آئینی بادشاہت کے قیام کے لئے جو کوششیں ہوئی تھیں اُن سب سے یہ منشور بہتر تھا۔

اگرچہ ظاہرا انگریزی نظام سلطنت کی نقل کی گئی تھی مگر باطناً دونوں میں بڑا فرق تھا۔ انگلستان کے بادشاہ کے بہ نسبت فرانس کے بادشاہ کو زیادہ اختیارات دئے گئے تھے

[1] مقابلہ کرو مقالہ ۲۔ باب ۱۰۔ نپولین کی نوزجی سلطنت کا بہترین بیان "خیالات نپولینی" میں پایا جاتا ہے مگر یہ تخیل عملی صورت میں کبھی نہ آیا۔

یا یوں کہئے کہ چونکہ یہ منشور خاص بادشاہ کی طرف سے شائع ہوا تھا اس لئے اس میں بادشاہ کے اختیارات نسبتاً کم محدود تھے لیکن انگلستان کی بادشاہت کے بہ نسبت فرانس کی بادشاہت محفوظ بھی کم تھی۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ فرانس کی رعایا کے مزاج میں تغیر و تلون زیادہ تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ انقلاب نے طبقۂ امرا کو بالکل تباہ کر دیا تھا اور تمام قوم کو عمومی خیال و رائے کا عادی بنا دیا تھا۔

امرا جو بادشاہ کے ساتھ قانون سازی کے حق میں شریک کئے گئے تھے، اور سیاسی جرائم کے لئے وہ عدالتِ اعلےٰ قرار پائے تھے وہ صحیح معنی میں قومی جماعت سمجھے گئے تھے، جن سے گزشتہ کی یادگار اور آئندہ کے توقعات وابستہ تھے، گویا وہ قدیم و جدید دور کے جامع تھے، مگر فی الحقیقت نپولین کے وقت کے نئے امرا زیادہ تر نظر انداز کر دیئے گئے تھے اور قدیم امرا کے پریشان حال خاندانوں کے ساتھ بہت ہی فیاضانہ برتاؤ کیا گیا تھا۔ موروثی امرا انگلستان کے دار الامرا کے مقابلے میں بہت پست تھے اور وہ ہرگز مستقل اور صحیح معنوں میں قومی جماعت نہیں خیال کئے جا سکتے تھے۔ ایوان مبعوثین کا منشا یہ تھا کہ وہ قدیم زمانے کی "میدان ارس"[ع] پر منعقد ہونیوالی مجلسوں نیز اسٹیٹس جنرل کے طبقۂ سوم کا قائم مقام ہو لیکن فی الحقیقت یہ دولتمندوں کی ایک خالص حکومت تھی اور سرکاری عمال کے حسب منشا اُس سے کام لینا مقصود تھا۔ عام رعایا جن میں بکثرت متمول اور تعلیم یافتہ اشخاص موجود تھے اور جس نے دور انقلاب میں کارہائے نمایاں انجام دئے تھے اُسے نہ رائے دہی کا حق تھا اور نہ اُس کے افراد منتخب ہو سکتے تھے، انقلاب میں کسانوں کو آزادی ملکیت اور سیاسی حقوق تک حاصل ہو گئے تھے مگر وہ بھی حق انتخاب سے خارج رکھے گئے اور نیچے طبقے والوں کا تو بالکل خیال ہی نہیں کیا گیا۔ پس جمہور سے (جو اب فرانس میں ایک زبردست سیاسی طاقت بن گئے تھے) یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ایک ایسے نظام سلطنت کی تائید کریں گے جس میں انھیں نیابت کا مطلق حق نہ دیا گیا ہو۔

انقلاب سے دو متضاد میلانوں کو تقویت ہو گئی تھی۔ ایک طرف مرکزیت کی

[ع] پاریس (پیرس) میں ایک میدان (دشین دُ مارس" (Cham de Mars) (اردو مترجم)

خواہش تھی اور دوسری طرف عمومیت کی توسیع۔ اگر یہ دونوں میلان انتہا تک پہنچا ئے جاتے تو ایک کا انجام مطلق العنان بادشاہی پر ہوتا اور دوسرے کا انقلابی ابتری پر۔ منشور کا منشا یہ تھا کہ اول الذکر میلان کو تقویت دے اور اُسے قابو میں لائے اور اسطرح ثانی الذکر میلان کو روک دے۔[ل]

چارلس دہم کی مطلق العنانی اور انقلابی اخباروں کے باعث پہلی مرتبہ جو طوفان برپا ہوا اُسمیں یہ منشور بچ گیا۔ لوئس فلپ کے فریق اور جولائی کے انقلاب (۱۸۳۰ء) والوں نے یہ شور مچایا کہ منشور پر حقیقتاً عملدرآمد ہونا چاہئیے مگر فرق صرف اتنا ہوا کہ امرا کا منصب موروثی ہونیکے بجائے عین حیات کے لئے کر دیا گیا اور دارالمبعوثین میں اگرچہ دولتمندوں کا غلبہ رہا مگر اُسکے انتخاب کنندوں میں وسعت کر دی گئی۔ (الف)

۱۸۳۰ء کا انقلاب

اس کے بعد ایک دوسرا انقلاب پیش آیا اور کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ یہ انقلاب اس زور کا ہوگا۔

۱۸۴۸ء کا انقلاب

فروری ۱۸۴۸ء میں تمام نظام سلطنت ایک دن میں الٹ دیا گیا قلیل التعداد جماعت نے ایسی جانبازی دکھائی کہ کثیر التعداد جماعت مبہوت وحیران ہو کر رہ گئی اور

[ل] ڈ توک ول "عمومیت امریکہ میں" انگریزی ترجمہ از ریو، جلد ۱، صفحہ ۳ ۹): انقلاب فرانس دو مخالف جذبات ایک دوسرے کے خلاف روش پر چل رہے تھے، اور انھیں ہرگز خلط ملط نہ کرنا چاہئیے۔ ان میں سے ایک تو حریت کا طرفدار تھا اور دوسرا مطلق العنانی کا .... انقلاب نے خود کہ شاہی اور اس کے ساتھ ہی صوبجاتی تنظیمات کا دشمن ظاہر کیا۔ اس نے اپنی بلا امتیاز نفرت سے ان تمام چیزوں کو ایک ہی میں خلط ملط کر دیا جو اس سے قبل موجود تھیں۔ اس میں مطلق العنانی اختیار اور اسکی خرابیوں کی روک سب داخل تھے اور اس انقلاب کا میلان یہ تھا کہ وہ ایک ساتھ چیزوں کو تہ و بالا بھی کرنا چاہتا تھا اور مرکزیت بھی قائم کیا چاہتا تھا۔ فرانسیسی انقلاب کی دُہری نوعیت ایک واقعہ ہے جس سے محبان مطلق العنانی نے خوب ہی کام نکالا ہے۔

(الف) رائے دہی کی شرط کیلئے تین سو فرانک کے بجائے دو سو فرانک کی بلا واسطہ محصول کی ادائی کر دیگئی، اُسکے بعد بھی انتخاب کنندوں کی تعداد پانچ لاکھ سے کم رہی اور خاندان آرلینس کی ناکامی کے اسباب میں سے ایک نمایاں سبب محدود حق رائے دہی بھی تھا۔

اس سے کچھ بن نہ پڑا جو نظام سلطنت اس طرح اُلٹا گیا وہ اس سے بہتر تھا جو اُسکے بعد قائم ہوا اور اس میں ہر اعتبار سے ترقی کی گنجائش تھی یہ دوسرا موقع تھا کہ عوام نے فرانس میں حکومت کرنیکی کوشش کی۔

انقلاب اول کی نیابتی عمومیت پھر قائم کیگئی اور ایک شخص اس جمہوری سلطنت کا صدر (پریسیڈنٹ) مقرر کیا گیا لیکن رئیس کے اختیارات مجلس قومی کے ذریعے سے محصور و محدود کردئے گئے تھے مگر خود مجلس قومی میں سخت تفرقہ پڑا ہوا تھا اور وہ اپنی قوت کو بیکار مباحثات میں ضائع کر رہی تھی۔ عوام کا میلان طبعی پھر بادشاہت کی طرف ہوگیا اور ایک دوسرا نپولین اس سلطنت عمومی کا فاتح اور اسکا جانشین بن گیا۔ لوئس نپولین نے تمام نظم و نسق پر قبضہ کرلیا اور اہل فرانس کے حصہ کثیر نے اسکی اس کارروائی سے موافقت کرلی اور اس طرح یہ کارروائی جائز قرار پاگئی۔

دوسری شہنشاہی

نئی شہنشاہی کے، نظام سلطنت (۱۸۵۲ء[1]) نے انگریزی سلطنت کے بجائے رومی سلطنت کی یاد تازہ کردی۔ درحقیقت نپولین کے خیالات بالکل رومی طرز کے تھے اور اس وجہ سے فرانس کے رومی الخیال لوگوں نے اُسے پسند کیا[2]۔ تمام سیاسی طاقت کا منبع رعایا قرار دیدی گئی تھی اور اسی کی عظمت و جلال کی اطاعت کیجاتی تھی۔ نظام سلطنت اسکی رضامندی کے تابع تھا۔ جماعت واضع قانون کا انحصار اُسی کی منظوری پر تھا۔ یہانتک کہ شہنشاہی اختیار بھی اُسی کی مرضی سے مستخرج تھا اور شہنشاہ رائے عامہ کا جوابدہ تھا[3]۔ عمومی مساوات جسے عوام اس درجہ عزیز رکھتے تھے، وہ بلا استثنا ہر شخص کو رائے دہی کا اختیار دیکر بے بحث و تکرار تسلیم کرلیگئی تھی۔ اسی وسیع بنیاد پر شہنشاہی قوت و جلالت کی عمارت بلند کی گئی تھی۔ قانون کا پیش کرنا، سیاسیات، امور خارجہ، فوج اور عمال سب کی نگرانی شہنشاہ کے ہاتھ میں دیدیگئی تھی۔ یہانتک کہ مجلس سلطنت کے ارکان کو بھی وہ اپنی مرضی سے علحدہ کرسکتا تھا۔ نظام سلطنت میں صرف دو اہم طاقتیں تسلیم کیگئی تھیں۔ ایک رعایا کی کثرت رائے، دوسرے شہنشاہ

---

[1] ۱۸۵۲ء کا نظام سلطنت سال ہفتم (۱۸۰۰ء) کے نپولینی نظام سلطنت سے ظاہری مشابہت رکھتا تھا، مگر دونوں کے اختلافات واقعاً قابل لحاظ تھے۔

[2] نپولین سوم کا لقب "بعنایت خدا و رضائے قوم شہنشاہ فرانسیسیاں" تھا۔

ان دونوں کے درمیان جو کچھ تھا وہ آزادی کا محض ایک سایہ تھا۔ وزرا صرف شہنشاہ کے جوابدہ تھے مگر اُن میں سے بعض محض فصیح البیان مقرر تھے اور اُن کے تقرر سے غرض یہ تھی کہ وہ ایوان مبعوثین میں حکومت کی حمایت کریں۔ ان لوگوں کا اثر بعض وقت نہ صرف نمایندگان قوم کے لئے بلکہ خود شہنشاہ کیلئے خطرناک بن جاتا تھا۔ جماعت واضع قانون کی طاقت مثبت ہونیکے بجائے زیادہ تر منفی تھی۔ وہ کسی مفید یا واجب قانون کو درست نہیں کرسکتی تھی، البتہ اُسے نامنظور کرسکتی تھی۔ اُسے خود کسی قانون کے پیش کرنیکا اختیار نہیں تھا اور وہ اپنے مجوزہ تغیرات کی نسبت کمیشن کے ذریعے سے مجلس سلطنت سے مبادلہ خیالات کرسکتی تھی۔ سینات کی بڑی غرض یہ قرار دی گئی تھی کہ وہ عام آزادی کی حمایت کریگی، نظام سلطنت کو قائم رکھے گی اور مستثنیٰ حالتوں میں اپنی جانب سے اصلاحات تجویز کریگی، لیکن حقیقتاً یہ مجلس امرا کی ایک جماعت تھی اور اسکے ارکان بوجوہ مجبور تھے کہ شہنشاہ سے وابستہ رہیں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ شہنشاہی سے اُنھیں یہ اعزاز حاصل ہوا تھا اور کچھ فرانس کے معاشرتی اور فریقانہ تعلق کی وجہ سے۔ حکومت کا خاص مقصد یہ تھا کہ شہنشاہ اور عوام میں یکجہتی قائم رہے اور اس لئے مخالفین کو دارالمبعوثین و پیرس دونوں جگہ بہت ہی خفیف آزادی دی گئی تھی۔[۱۲]

اس خود مختارانہ نظام سلطنت سے عام آزادی کی نئی خواہش کو تسلی نہیں ہوئی۔ نپولین سوم کو مجبوراً ایسی مراعات کرنا پڑیں جس سے آئینی بادشاہت کی طرف قدم بڑھے۔[۱۳] سینات کے ایک فیصلے (ستمبر ۱۸۶۹ء) کے بموجب یہ حکم دیا گیا کہ ہر دو ایوانہائے مجلس کو اپنی طرف سے قانون پیش کرنیکا حق ہے۔ وزرا ان مجلسوں کے رکن ہوسکتے ہیں اور اُنھیں سینات کے سامنے جوابدہ ہونا پڑیگا۔ یہ تغیرات رعایا کے سامنے پیش کئے گئے اور ۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء کے فیصلۂ عام میں (۱۵۲۸۸۲۵) رایوں کے مقابلے میں (۳۵۰۱۴۲) رایوں سے منظور ہوگئے۔

---

[۱۲] لوئی نپولین نے "تفکرات سیاسیات" میں اپنے کچھ خیالات ۱۸۳۲ء سے قریب زمانے میں قلمبند کئے تھے اس میں اس نے فرانسیسی نظام سلطنت کا ایک خاکہ بھی کھینچا تھا۔ اس خاکہ کو ۱۸۵۲ء کے نظام سلطنت سے وہی نسبت ہے جو نوجوانی کے خیالات کو سن رشد کے پختہ خیالات کے ساتھ ہوتا ہے۔

[۱۳] ان رعایتوں کا آغاز ۱۹ جنوری و ۲ فروری اور ۱۴ اور ۲۳ مارچ ۱۸۶۷ء کے احکام سے ہوا۔

۱۸۷۰ء کا انقلاب

لیکن جرمانیا کی جنگ سے نپولین کی حکمت عملی اور فرانسیسی فوج کو جو شکست نصیب ہوئی اُنکی وجہ سے یہ مراعات اس نازک موقع پر نظام سلطنت کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

پیرس (۴ ستمبر ۱۸۷۰ء) کے ایک نئے انقلاب نے شہنشاہی کو منسوخ کر کے پھر جمہوریت کا تجربہ کرنیکی کوشش کی۔

۳۔ روسی ممالک

فرانس میں انقلاب کے دوران میں اور اُسکے بعد جن تغیرات کا تجربہ ہوا انکا نہایت اہم اثر دوسرے ممالک اور خاصکر ان ممالک پر پڑا جو روما کے اثر میں رہ چکے تھے۔ اطالیہ میں فرانسیسی فاتحوں کی تلوار نے اپنے ملک کے نمونے پر جمہوری سلطنتیں قائم کیں اور بعد میں نپولین اول نے اطالیہ اور ہسپانیہ دونوں ملکوں میں ماتحت سلطنتیں قائم کیں جو فرانسیسی شہنشاہی کی نقل تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا جدید یورپ کے نظام سلطنت کیلئے احکام پیرس سے صادر ہونگے مگر نپولین کے زوال کے ساتھ ہی اُنکی اُن قلیل الحیات سلطنتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

آئینی شاہی کے نشو و نما کے اعتبار سے سسلی اور ہسپانیہ کے وہ نظامہائے سلطنت زیادہ اہم تھے جو ۱۸۱۲ء میں شائع کئے گئے تھے مگر یہ نظام سلطنت بہت ہی تھوڑے زمانے تک رہے

(۱) سسلی

جزیرہ سسلی کا نظام سلطنت زیادہ تر لارڈ ولیم بنٹنک کا تیار کیا ہوا تھا اور اس لئے وہ بالطبع انگلستان کے نمونے پر بنا تھا مگر اسکے ساتھ ہی پورانی زمانے کی آئینی روایات کا بھی خیال رکھا گیا تھا اور تقسیم اختیارات کے جدید اصول انگلستان کے بہ نسبت زیادہ واضح طور پر تسلیم کئے گئے تھے۔ قانون سازی کا اختیار پارلیمنٹ کو دیا گیا تھا لیکن پارلیمنٹ کے صرف دو ایوان تھے۔ بادشاہ پارلیمنٹ میں شامل نہیں تھا۔ وہ پارلیمنٹ سے ایک جداگانہ اور خارجی طاقت کے طور پر قوانین کو منظور کرتا تھا۔ دارالامرا سسلی کے بیرنوں اور مقتدایان دین پر مشتمل تھا۔ دنیاوی امرا موروثی تھے مگر بادشاہ ایسے لوگوں میں سے نئے امیر بنا سکتا تھا جن کی خالص آمدنی چھ ہزار فرانک ہو۔ دارالعوام میں رعایا کے قائم مقام بھی تھے اور رائے دہی یا انتخاب کے لئے بہت قلیل آمدنی کافی سمجھی گئی تھی۔ انتظامی اختیارات بادشاہ کو حاصل تھے مگر اسکے وزرا اور مشیران خاص ان اختیارات کو عمل میں لانیکے لئے پارلیمنٹ کو جوابدہ تھے۔ تمام اہم معاملات میں بادشاہ اپنی مجلس خاص سے

مشورہ لینے کیلئے مجبور تھا اور بعض معاملات میں اُسے پارلیمنٹ کی منظوری بھی لینا پڑتی تھی، مثلاً سسلی کے اندر فوجوں کا لانا غیر ملکی عمال کا تقرر، حکام کے لئے عہدوں کا قیام یا سیاسی خدمات کے وظائف کا عطا کرنا۔

عدالتی اختیارات، بادشاہ کے نام سے عمل میں آتے تھے مگر انکے عمل میں لانیوالے وہ حکام ہوتے تھے جو ازروئے قانون مقرر کئے جاتے تھے ہر باشندہ سسلی کو یہ اختیار تھا کہ وہ خلاف قانون روک ٹوک کی مقاومت کرسکے۔ مذہبی تصانیف کے سوا اور تصانیف سے احتساب اُٹھا دیا گیا تھا، جاگیرداری حقوق دبادیئے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظام سلطنت انگریزی طریقوں کی نقل تھا۔ اُسی میں ۱۷۹۱ء کے فرانسیسی نظام سلطنت کے نظریات کے کچھ اجزا بھی شامل کر دئے گئے تھے۔ ان دونوں نظامہائے سلطنت میں جمہوریت کی شان غالب تھی مگر سسلی میں شاہی روایات کے مقابلے میں یہ شان زیادہ نمایاں اس وجہ سے نظر آتی تھی کہ بوربونی بادشاہوں کا مطلق العنان دربار ہر نظام سلطنت کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسکے ساتھ ہی پادریوں اور جیکوبین طریق والوں میں جنگ وجدل جنوبی طبائع کی پوری سرگرمی سے جاری تھی۔ نیپلز جب بادشاہ کو واپس ملگیا تو اُسے اتنی طاقت حاصل ہوگئی کہ حسب نظام سلطنت کے برقرار رکھنے کا اس نے حلف اٹھایا تھا اُسے منسوخ کرکے اُسکے بجائے مطلق العنان حکومت قائم کردی لیکن انگلستان کی سیاسی حیثیتوں کو فرانسیسی انقلاب کے اصول سے ملاکر جو ایک نیا نظام سلطنت قائم کیا گیا تھا وہ زمانہ آیندہ کی بہت سی اسی قسم کی کوششوں کے لئے نمونے کا کام دیتا رہا۔

(۲) ہسپانیہ — آئینی سلطنت اور تین قوتوں کی تقسیم کے متعلق اس قسم کے نظریات کے اثر سے وہ نہایت مکمل نظام حکومت تیار ہوا جسے ہسپانیہ کے متولیوں نے ۱۲ مارچ ۱۸۱۲ء کو شایع کیا تھا، جب کہ بادشاہ قید میں تھا اور ملک کے بہت بڑے حصے پر فرانسیسی متصرف تھے۔ اس نظام سلطنت میں ۱۷۹۱ء کا فرانسیسی نظام سلطنت پیش نظر رکھا گیا تھا اور یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اقتدار اعلیٰ رعایا کو حاصل ہے (دفعہ ۳) مگر اس کے ساتھ ہی بادشاہ کو بہت وسیع اختیارات دئے گئے تھے۔ وضع قوانین کے اختیارات، پارلیمنٹ اور بادشاہ کو اشتراکاً تفویض تھے (دفعہ ۱۵) اور بادشاہ انصاف کی نگرانی کا بھی ذمہ دار تھا (دفعہ ۱۷)، لیکن یہ بھی شرط تھی کہ اگر کوئی قانون دومرتبہ پارلیمنٹ میں

منظور ہو جائے تو بادشاہ پر اُسکی منظوری لازم ہو جائیگی۔ ہسپانیہ کا نظام سلطنت حقیقتاً انگریزی نظام سلطنت سے بہت مختلف تھا کیونکہ اُس میں دار الامرا کا وجود نہیں تھا اور براہ راست قومی قائم مقاموں کی مجلس سے واسطہ تھا جسے کورٹیس کہتے تھے۔ اس نظام سلطنت میں بہت سے نقائص تھے اور رعایا نے اُسے خوشی کے ساتھ قبول بھی نہیں کیا تھا مگر جب واپس شدہ بادشاہ فرڈیننڈ ہفتم نے اُسے محض اپنی رائے سے (۴۔ مئی ۱۸۱۴ء کو) رد کر دیا تو پھر وہ عام طور پر پسند کیا جانے لگا اور (۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۶ء میں) کئی مرتبہ اُسے بزور قائم کرنیکی کوششیں کی گئیں۔

۱۸۳۴ء کا ایسٹاٹوٹو ریے آل (شاہی نظام سلطنت) جس نے ہسپانیہ میں نیابتی حکومت قائم کی، رعایا کو مطمئن کرنیکے لئے ناکافی ثابت ہوا۔ ۱۸۳۶ء میں متولیہ ملکہ کرسٹینا مجبور کی گئی کہ وہ ۱۸۱۲ء کے نظام سلطنت کو تسلیم کرے اور دوسرے سال ترقی پسند فریق کے دباؤ سے ایک نئے نظام سلطنت کی باقاعدہ منظوری حاصل کی گئی جسکی بنیاد ۱۸۱۲ء کے نظام سلطنت پر رکھی گئی تھی اور ایسٹاٹوٹو ریے آل کے مطابق اُس میں کسی قدر ترمیم کر دی گئی تھی۔ اس میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ بادشاہ قانون کے منظور کرنیکے متعلق بلاحصر اختیار حاصل ہے۔ دو ایوان قائم کئے گئے ایک ایوان امرا اور دوسرا ایوان مبعوثین۔ اعتدال پسند فریق نے ۱۸۴۵ء میں اس پر نظر ثانی کی اور اُسے ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی منشور سے زیادہ قریب کر دیا۔

لیکن اس سے بھی آئینی کشمکش کا خاتمہ نہیں ہوا اور ملک میں سیاسی مدوجزر جاری رہا کبھی مذہبی فریق کو غلبہ ہو جاتا، کبھی انتہا پسند، طوائف الملوکی برپا کر دیتے، کبھی درباری، سازشوں میں سرگرم ہوتے اور کبھی فوج کو تسلط کامل حاصل ہو جاتا۔ متعصب ملکہ ایزابیلا کی بدنظمی کے باعث ۱۸۶۸ء میں ایک نیا انقلاب پیش آیا جس میں بوربونی خاندان اور یسوعی فرقے والے دونوں نکال دیے گئے۔ ایک مدت تک شاہی پسند فریق لاحاصل طور پر کسی بادشاہ کی جستجو میں سرگرداں رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۰ء میں اطالوی بادشاہ وکٹر امانوئل کے دوسرے بیٹے ڈیوک اوسٹا نے اماڈیو اول کے لقب سے تاج قبول کر لیا۔ ایک زمانے تک حالات آئینی حکومت کے موافق معلوم ہوتے تھے مگر زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ مسلسل سازشوں کے باعث بادشاہ کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ اور وہ

خود ہی (۱۱ر فروری ۱۸۷۳ء کو) تخت سے دست بردار ہوگیا۔ اب ضرورت سے مجبور ہوکر لوگوں نے جمہوریہ کا اعلان کردیا مگر اُسکے بعد ہی فوجی فریق نے حکومت پر قبضہ کرلیا اور آئینی بادشاہت کو دوبارہ قائم کرنیکے لئے راستہ صاف کردیا اور یکم جنوری ۱۸۷۵ء کو نوعمر الفانسو دوازدہم بادشاہ مشتہر کیا گیا۔ اس دوران میں خاندان بوربون کا دعویدار ڈون کارلوس پادریوں اور حق موروثی کے طرف داروں کی مدد سے شمالی ہسپانیہ اور خاصکر باسک کے پہاڑی خطّے میں اپنے خاندانی حقوق کے ثابت کرنیکے لئے کوشش کرتا رہا مگر نتیجہ اسکے سوا کچھ نہ ہوا کہ رعایا کی مصیبت اور پریشانی میں اضافہ ہوگیا۔ ۱۸۷۶ء میں ایک نئے نظام سلطنت کے تیار کرنیکے لئے ایک کورٹیس طلب کی گئی اور شاہ الفانسو نے اس نظام سلطنت کے متعلق ۳۰ر جون کو اپنی منظوری صادر کردی۔ اس نظام سلطنت کی رو سے قوم کی نیابت کے لئے (قانون انتخاب مصدرہ ۸ر فروری ۱۸۷۷ء کے موافق) ایک دار الامرا کی اور (قانون انتخاب مصدرہ ۸ر فروری ۱۸۷۸ء کے موافق) ایک دار المبعوثین کی بنا پڑی۔ دار الامرا کے کچھ ارکان تو استحقاقاً مقرر ہوئے تھے، کچھ بادشاہ کے نامزد کئے ہوئے تھے اور کچھ منتخب شدہ۔

(۳) پرتگال

اسپین کے ۱۸۱۲ء کے نظام سلطنت کی نقل پر پرتگال کے ۱۸۲۲ء والے نظام سلطنت میں کیگئی، مگر یہ نظام سلطنت کبھی پوری طرح مسلم نہیں ہوا۔ ۱۸۲۶ء میں ڈون پیڈرو نے اپنی بیٹی ڈونا ماریا ڈگلوریا کے حق کو مستحکم کرنیکے لئے ایک نیا نظام سلطنت تیار کیا۔ اس میں شاہی اصول کی زیادہ خوبی کے ساتھ حفاظت کی گئی تھی۔ نیز انگلستان اور منشور فرانس کی تقلید میں دار المبعوثین کے ساتھ موروثی اور تا وامِ الحیات امرا کا بھی ایک ایوان قائم کردیا گیا تھا۔ اس نظام سلطنت میں چار قوتیں تسلیم کی گئی تھیں۔ (۱) قانون سازی۔ اسکا تعلق بہ منظوری بادشاہ پارلیمنٹ سے تھا (۲) قیام توازن۔ قوم کے سرپرست اعلیٰ ہونیکے لحاظ سے یہ قوت بادشاہ کو حاصل تھی کہ وہ تمام سیاسی طاقتوں میں توازن اور یکجہتی قائم رکھے (۳) اختیارات عاملانہ۔ اسکا تعلق بادشاہ و وزرا سے تھا (۴) اختیار عدالتی۔ یہ اختیار آزاد عدالتوں کو تفویض کیا گیا تھا۔

ڈون میگل اور مطلق العنانوں کی فتح کے بعد بھی (جو کسی نظام سلطنت سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے) دو فریق مختلف کامیابیوں کے ساتھ اپنی جدوجہد میں سرگرم رہے۔

ایک عمومیت پسندوں کا فریق تھا جو ۱۸۲۲ء کے نظام سلطنت کا خواہاں تھا اور دوسرا "منشوری" تھا جو ۱۸۲۶ء کے منشور کا طالب تھا۔ ۱۸۳۶ء میں اسی آخر الذکر نظام سلطنت پر نظر ثانی کی گئی اور موروثی امارت اور مجلس سلطنت منسوخ کر دی گئیں۔ عام رعایا نے ان تغیرات میں بہت کم حصہ لیا۔ تاہم موجودہ خاندان کو برگ کے تحت میں ہسپانیہ کے بہ نسبت پرتگال میں سیاسی حالت نے زیادہ کامیابی اور امن و امان کے ساتھ ترقی حاصل کی ہے۔

(۴) برازیل

آئینی شاہی پرتگال سے برازیل پہنچی جو ۱۸۲۲ء میں اپنے وطن مادری (یعنی امریکہ) سے آزاد ہو گیا تھا اور وہاں پہنچکر اُسے اس قسم کی جدوجہد اور ایسے ہی نشیب و فراز کا سامنا ہوا اگر یورپ ہی کے مانند اُسے ترقی بھی ہوتی گئی (۱۸۸۹ء میں شاہی کا خاتمہ ہو گیا)

(۵) اطالیہ

اطالیہ کو مطلق العنان حکومت کی ذلت سے نکالنے کے لئے لگاتار جدوجہد کی ضرورت ہوئی۔ اگرچہ نپولین کی قائم کردہ اٹلی اور نیلپز کی بادشاہتیں محدود شخصی سلطنتوں سے زیادہ نہیں تھیں مگر بوربونی اور ہابس برگی شہزادے جب دوبارہ تخت نشین ہوئے تو انکی مطلق العنانی رعایا کی طاقت برداشت سے باہر ہو گئی۔ اس بازگشت ظلم کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ بغاوتیں ہونے لگیں اور انکا انسداد صرف غیر ملکی فوجوں کے ذریعے سے ہوا۔ جب ۱۸۲۰ء میں شاہ نیلپز اس امر پر راضی ہوا کہ وہ ہسپانیہ کا ۱۸۱۲ء والا نظام سلطنت اپنے ملک میں نافذ کریگا تو فوراً ہی آسٹروی فوجوں نے دخل دیکر پرانی مطلق العنانی کو پھر قائم کر دیا۔ ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیانی زمانے کی تحریکیں بھی بیکار ثابت ہوئیں کیونکہ آئینی حکومت قائم کرنیکی جب کوئی کوشش کیجاتی تھی تو آسٹریا کی زبردست قوت اسکے دبانے کو تیار رہتی تھی اور آسٹریا ہی کی قوت پر سب حکمران خاندان استمداد کے لئے نظر ڈالتے تھے۔

۱۸۴۰ء کے بعد یہ ہوا کہ اصلاح کے جوش کے ساتھ غیر ملکی حکومت سے آزاد ہو جانیکی خواہش بھی شامل ہو گئی اور اس طرح اس تحریک کو بہت تقویت حاصل ہو گئی۔ ۱۸۴۷ء میں تمام اٹلی میں جوش برپا ہو گیا اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس تحریک کو نئے پوپ پائس نہم کی تائید بھی حاصل ہو گئی ہے۔ پیرس میں انقلاب کے شیوع کے قبل ہی نیلپز میں فرڈیننڈ دوم اور پیڈمونٹ میں چارلس البرٹ آئینی سلطنت قائم کرنے پر مجبور کئے گئے،

لیکن فرڈینڈ نے مناسب موقع حاصل ہوتے ہی اس کام کو پلٹ دیا۔ حالانکہ اُس کے برقرار رکھنے کے لئے وہ تثلیث مقدس کے نام سے حلف اُٹھا چکا تھا۔ اس متواتر وعدہ خلافی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اسکے بیٹے فرانسس ثانی کو ۱۸۶۰ء میں ضرورت نے مجبور کیا کہ وہ آئینی سلطنت دوبارہ قائم کرے تو رعایا نے اُس پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا اور اس خاندان ہی کو ملک سے نکال باہر کیا۔

پیڈمونٹ میں صورت معاملات اس سے مختلف رہی۔ خاندان سوائے غیر معمولی استقلال کے ساتھ ۴ مارچ ۱۸۴۸ء کے نظام سلطنت پر قائم رہا جسے چارلس البرٹ نے ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی منشور کے موافق منظور کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ چارلس البرٹ کو اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی کہ کل اٹلی کو اپنے زیر نگیں ایک سلطنت بنا لیتا کیونکہ رادتسکی کی فتوحات نے اسکی اس حوصلہ مندی کو روک دیا اور غالباً اس جزیرہ نما کو قبل از وقت عمومیت کے طوفان سے بھی بچا لیا۔ لیکن اس بازگشت کے زمانے میں بھی وکٹر امانول اپنے باپ کے وعدے پر ثابت قدم رہا۔ اسکی ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۰ء کی حیرت انگیز کامیابیوں کی بڑی وجہ یہی تھی کہ رعایا کو اس پر یہ بھروسا تھا کہ وہ صدق دل سے نظام سلطنت اور قوم کا ہی خواہ ہے، دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے ایک بہت بڑے مدبر کاؤور کو اپنے کاموں کا انصرام سپرد کر دیا تھا۔ فرانسیسیوں کی مدد سے اہل آسٹریا لمبارڈی سے خارج کر دئے گئے اور اس نئی قومی بادشاہت نے وسط اطالیہ کی امارت کو اپنے اندر لے لیا اور گاربالڈی کی دلیرانہ مہم نے اس میں نیپلز اور سسلی کا بھی اضافہ کر دیا۔ پروشیا کی مدد سے ۱۸۶۶ء میں وینس کا الحاق کر لیا گیا اور ۱۸۷۰ء کی جنگ فرانس و جرمانیا نے فرانسیسی فوجوں کو روما کے خالی کر دینے پر مجبور کیا تو اہل اطالیہ کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے قدیم دار السلطنت پر قابض ہو جائیں۔ جرمانیا کی فتوحات نے یورپ کی آخری مذہبی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ نئی اطالوی شاہی برابر آئینی اصول پر قائم رہی اور جمہوری فریق تک نے گاربالڈی کی تقلید میں یہ تسلیم کر لیا کہ حالات موجودہ کے اعتبار سے حکومت کی یہی سب سے بہتر صورت ہے۔

(۲) بلجیم

بلجیم کی سلطنت نے رومانی طرز کو چھوڑ کر جرمانی طرز اختیار کر لیا۔ ۱۸۳۱ء کا بلجیمی نظام حکومت ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی منشور سے اخذ کیا گیا ہے مگر اس میں عمومیت پسند رعایا کے ساتھ مراعات زیادہ کی گئی ہے۔ چنانچہ دفعہ (۲۵) میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ

"کل اختیارات کا منبع و ماخذ رعایا ہے"۔ (یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بلجیم میں کوئی ملکی حکمران خاندان نہیں تھا۔ اور اُسے بہ مجبوری دوسرے ملک سے بادشاہ کا انتخاب کرنا پڑا تھا) (دفعہ ۶) کی رو سے تمام طبقاتی اختیارات خارج کئے گئے ہیں اور حقِ انتخاب وسیع طور پر قائم کیا گیا ہے اور انتخاب کنندے وہی ہوتے ہیں جو دار المبعوثین کے ہیں، صرف فرق یہ ہے کہ ارکانِ دار الامرا کے لئے عمر اور جائداد کی حد بڑھی ہوئی ہے (ابتدائی تجویز یہ تھی کہ ارکان دار الامرا کی نامزدگی کا اختیار بادشاہ کو دیدیا جائے)۔ لیوپولڈ (کوبرگ) کی عاقلانہ اور مدبرانہ حکومت میں بلجیم پر ۱۸۴۸ء کے نازک زمانے کا اثر بہت ہی کم پڑا اور پوپ کے اختیار مطلق کے ماننے والوں اور آزاد (لبرل) فریق کے پُرجوش مقابلوں سے باوجود ملک کی خوشحالی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ اسکانڈ ناویا میں نظامِ سلطنت کے رواج کی ایک عجیب تاریخ ہے۔ سویڈن میں سولھویں صدی سے ڈائٹ کے چار طبقے تھے اور ہر ایک کا انتخاب جدا جدا ہوتا تھا یہ چار طبقے امرا اور نائٹ، پادری، اہل شہر، اور کاشتکار تھے۔ بادشاہ کو اکثر امرا کی بڑھی ہوئی طاقت کے مقابلے میں نیچے کے دو طبقوں سے تائید حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ امرا کا اثر بالعموم پارلیمنٹ سے باہر مجلس شاہی میں نمایاں ہوتا تھا جس میں وزرا بھی شامل ہوتے تھے اور یہ سب کے سب امرا کے گروہ میں سے ہوتے تھے۔ سب سے پہلے گستاوس سوم نے امرا کے اُس غلبے کو، جس سے بادشاہ کی ہستی اور ملک کی حفاظت دونوں خطرے میں آگئی تھی، اسطرح توڑا کہ ۱۷۸۹ء میں سلطنت اور دربار کے اعلیٰ ترین عہدوں کے سوا تمام سیاسی عہدوں کے دروازے غیر امرا کیلئے بھی کھول دئے۔

۴۔ جرمانیا کے علاوہ دوسرے یورپین ممالک
(۱) سویڈن

سویڈن کا ۶ جون ۱۸۰۹ء کا نظام سلطنت اُس سے قبل کے ۱۷۷۲ء والے نظام سلطنت کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس نظام سلطنت میں مجلس سلطنت اور چاروں وزیروں کے فرائض جس احتیاط اور صحت کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں اسکی نظیر زمانۂ موجودہ کے دوسرے نظامہائے سلطنت میں نہیں ملتی۔ امرا کا یہ مخصوص ادعا بھی روکا گیا تھا کہ وہی تمام عہدوں کے اہل ہیں۔ حال کے زمانے تک مذکورۂ بالا چاروں طبقے قائم رہے اور انکی منظوری کے بغیر بادشاہ نہ تو نظام سلطنت میں کوئی تغیر کر سکتا تھا نہ کوئی قانون نافذ کر سکتا تھا اور نہ نئے محصول لگا سکتا تھا بالعموم تین طبقات ایک رائے پر متفق ہو جاتے تھے اور چوتھے کو مجبور ہونا پڑتا تھا مگر آئینی قوانین کے معاملے میں بادشاہ اور چاروں طبقوں کا متفق ہونا لازمی تھا۔

بہت سے اعتبارات سے یہ نظام سلطنت جرمانیا کے ازمنۂ وسطیٰ کے نظم و ترتیب کے مثل تھا۔ یہ نظام سلطنت اگرچہ بہت سے فوائد پر حاوی تھا اگر سویڈن سے باہر اس پر بہت کم توجہ کیگئی اور کسی نے اسکی نقل نہیں کی۔ جسکا خاص باعث یہ تھا کہ طبقات کی تقسیم کی وجہ سے قومی مرضی کی قطعی حقیقت کا پتہ چلانا مشکل ہوگیا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں دو ایوانوں کے معمولی طریقے نے ان چار طبقوں کے طریقے کو مٹا دیا۔

(۲) ناروے — ناروے کا ۴ نومبر ۱۸۱۴ء کا نظام سلطنت اس سے بدرجہا زیادہ عمومیت کو لیے ہوئے ہے۔ سویڈن کا بادشاہ (چارلس سیزدہم) صلح کے ذریعے سے ناروے کا بھی بادشاہ ہوگیا، اُسے حالات نے مجبور کردیا کہ وہ اُس نظام سلطنت کو قبول کرے جسے ۱۸۱۴ء کے موسم بہار میں خود اہل ناروے نے اپنی شخصی حریت اور ملکی آزادی کے تحفظ کے خیال سے تیار کیا تھا۔ وضع قانون رعایا کا کام قرار دیا گیا تھا اور اسکی انجام دہی اسٹورتھنگ (پارلیمنٹ) سے متعلق ہوئی۔ بادشاہ کو منظوری کا اختیار تھا لیکن جس قانون کو مجلس تین مرتبہ منظور کردے، اُسے بادشاہ مسترد نہیں کرسکتا تھا۔ اسٹورتھنگ کا انتخاب رعایا اور زیادہ تر زمیندار کرتے تھے اور پھر وہ خود اپنے کو دو ایوانوں میں تقسیم کردیتی تھی۔ عاملانہ اختیارات بادشاہ سے متعلق تھے اور اسکے وزرا ذمہ دار ہوتے تھے۔ بعد میں شاہی طاقت کے بڑھانے اور امرا کا ایک سیاسی طبقہ پیدا کرنیکے لیے کوششیں ہوئیں۔ مگر سب ناکام رہیں۔ ناروے نے جس غلو کے ساتھ خود کو سویڈن سے آزاد رکھا ہے وہی اسکا باعث تھا کہ ان دونوں تغیرات کی کاشتکاروں اور شہریوں نے زیادہ زور کے ساتھ مخالفت کی۔

(۳) ڈنمارک — ڈنمارک میں ۱۶۶۰ء کے انقلاب کی زد امرا پر تھی اور عام باشندوں کی مدد سے بادشاہت نے مطلق العنانی حاصل کرلی اور موجودہ صدی تک آئینی حکومت کا اجرا نہیں ہوسکا۔ اولاً اُسکا ظہور ۲۸ مئی ۱۸۳۱ء کے قانون کی رو سے ناکمل طور پر صوبوں کی مجلسوں میں ہوا۔ اُسکے بعد ۵ جون ۱۸۴۹ء کے قانون اساسی نے سلطنت کو زیادہ عمومی بنادیا۔ ڈینوں اور جرمانیوں کی مخاصمت نظام سلطنت کے اختلاف کے باعث نہیں بلکہ قومیت کے اختلاف کے باعث ہوئی۔ ۱۸۶۶ء میں اس نظام حکومت پر بھی نظر ثانی کی نوبت آئی اور جو ترمیم ہوئی وہ بادشاہ اور رکس داگ دونوں کی رضامندی سے عمل میں آئی۔

رگس واگ یعنی پارلیمنٹ میں دو ایوان تھے ایک ایوان اعلیٰ دوسرا ایوان عام۔ (نظام سلطنت مورخہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۶ء)۔

(۴) ہالینڈ

ینڈرلینڈس کی زمانۂ حال کی سلطنت میں (جو صوبہ جات متحدہ کی قدیم جمہوریت اور بعد کی ٹیوٹونی بادشاہت ہالینڈ کے بجائے قائم ہوئی تھی) آئینی شاہی فوراً جاری ہوگئی۔ اُسکا اجرا ۲۸ مارچ ۱۸۱۲ء کو ہوا اور بلجیم کے متحد ہوجانیکے بعد ۲۴ اگسٹ ۱۸۱۵ء کو ایک نئے قانون کی رو سے اسکی تجدید ہوئی) ۱۴ اکتوبر ۱۸۴۸ء کا نیا نظام سلطنت اسی کی ترقی مزید تھی اور حال میں آئینی خیال ہالینڈ میں بہت بڑھ گیا ہے۔

(۵) جرمانی سلطنتیں (۱) جرمانیوں کی رومی شہنشاہی

اپنی برائے نام ہستی کی آخری صدی میں جرمانی قوم کی قدیم رومی شہنشاہی ایک خالی اعزاز رہ گئی تھی۔ تمام حقیقی اختیار حکمرانوں کے ہاتھ میں تھا۔ انھیں حکمرانوں میں شہنشاہ بھی تھا اسکی باا ثر حیثیت صرف اسی بنا پر تھی کہ وہ آسٹریا کا آرچ ڈیوک اور ہنگری اور بوہیمیا کا بادشاہ تھا۔

لیکن خود اپنی اپنی مملکتوں کے اندر بیشتر حکمرانوں نے پارلیمنٹوں کی عائد کردہ قید و بند کو توڑ کر مطلق العنان حکومتیں قائم کرلی تھیں۔ انھیں اولاً شاہی عہدہ داروں کی حیثیت سے اختیارات حاصل ہوئے تھے، مگر پھر وہی اختیارات موروثی بن گئے۔ اور ازمنہ وسطیٰ کے عام رنگ کے موافق اُن اختیارات نے کچھ مذہبی اور کچھ پدر سری کیفیت پیدا کرلی تھی۔ اقتدار شاہی کے رومامی خیال کے موافق ان اختیارات کو وسعت دیگئی تھی اور اس کے سوا کوئی اور بندش نہیں تھی کہ شہنشاہی کی اطاعت کی ایک ہلکی سی ذمہ داری عائد ہوتی تھی اور شہنشاہ کے دربار اور اسکے دیوان خاص میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔

(۲) پروشیا کا عروج

سب سے اول جس سلطنت نے یہ آزادانہ مطلق العنانی قائم کی وہ پروشیا تھی ایک طرف آسٹریا ترقی کرکے یورپ میں ایک بڑی سلطنت اور فرانس کی مدمقابل بن گئی تھی اور کم و بیش شہنشاہی کے دائرہ اثر سے باہر ہوگئی تھی۔ دوسری طرف شمال میں ایک نئی سلطنت پیدا ہوگئی تھی جس نے ازمنہ وسطیٰ کی شہنشاہی سے جنگ و جدل کرکے بہت جلد ترقی کرلی تھی اور اس جنگ پر جرمانیا کا قومی رنگ چڑھا دیا تھا۔ ہابس برگ اور لورین کے آسٹروی اور کتھولک خاندان کی تائید کا انحصار انکی شہنشاہی عظمت، روایتی حقوق، امراء طبقۂ مذہبی اور ایک مختلف النسل فوج کے اوپر تھا۔ برعکس اس کے

ہونتسولرن کا پروٹسٹنٹ خاندان جرمانیا کی قومی آزادی اور قومی روح کا نمایندہ اور حامی بن گیا تھا۔

فریڈرک اعظم (سنہ۱۷۴۰ء - سنہ۱۷۸۶ء) براعظم کی آئینی بادشاہت کے بانی ہونیکی عزت و منزلت کا سزاوار ہے۔ اگر رعایا نے اسکے مقصود کو زیادہ بہتر طور سے سمجھا ہوتا اور حکمرانوں نے اسکی تقلید میں زیادہ کوشش کی ہوتی تو سلطنت کے مطلق العنان حالت سے نکل کر آئینی صورت اختیار کرنے میں زیادہ آسانی ہوگئی ہوتی۔ کسی شخص نے اس سے زیادہ زور کے ساتھ اس اصول کی مخالفت نہیں کی ہے کہ بادشاہ، سلطنت کا آقا و مالک ہے۔ اس سے زیادہ کسی نے اس امر کو قطعی طور پر ثابت نہیں کیا ہے کہ شاہی ایک عہدہ ہے اور بادشاہ سلطنت کا خاص الخاص خادم ہے اسنے ازمنہ وسطی کے ربانی حقوق اور ملکانہ حکمرانی کے تمام اصول کو بلا تذبذب باطل کر دیا مگر اُس نے نہ طبقات (پارلیمنٹ) کے قدیم نظام سلطنت کو از سر نو رائج کیا اور نہ جدید نیابتی انتظام قائم کیا۔ اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ اسکے خیالات اپنے زمانے سے بہت آگے بڑھے ہوئے تھے اور رعایا میں ابھی یہ قابلیت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ وہ حکومت میں حصہ لے سکے۔ لیکن بہ طرق ذیل اُس نے آئینی بادشاہت کے لئے راستہ صاف کر دیا: (۱) اُس نے یہ اصول قائم کیا کہ شاہی حقوق، درحقیقت سلطنت کے فرائض ہیں (۲) قوانین اسی قسم کے نافذ کئے اور (۳) تمام عہدہ داروں کو مجبور کیا کہ اپنے سیاسی فرائض کو ذوق شوق اور دیانت کے ساتھ انجام دیں۔

فرانسیسی انقلاب نے جرمانیا کو فریڈرک کی تیار کردہ شاہراہ سے ہٹا دیا کیونکہ اس انقلاب سے حکمران خوفزدہ اور رعایا انتہا پسند ہو گئی۔

(۳) رائن کی متفقیت

نپولین کے اثر سے رائن کی متفقہ سلطنتوں میں جو نظامہائے سلطنت قائم ہوئے وہ ایک حد تک آئینی بادشاہت کی طرف قدم بڑھانے کا باعث ہوئے۔ ان نظامہائے سلطنت نے قدیم طبقات کی نیابت کی آخری یادگار کو بھی مٹا دیا۔ اساسی قوانین کو جمع کر کے یکجا مرتب کیا اور اصحاب جائداد اہل حرفہ و صاحبان علم کو ایک حد تک نیابت کا حق عطا کیا، گو کہ یہ نیابت نہایت حقیر اور بے اثر تھی۔

(۴) سنہ۱۸۱۵ء کی متفقیت

"جنگ آزادی" کی جانبازانہ کوشش نے جرمانیا کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کر دیا اور زمانہ جدید کے نظم و ترتیب کے قیام کے لئے آزادانہ قومی انداز پر ایک عمدہ موقع مہیا کر دیا۔

ملک میں اُس وقت جو معدودے چند اعلیٰ درجے کے مدبر تھے مثلاً اشٹائن۔ ہمبولٹ اور اُن سے قبل ہارڈنبرگ، سب اس تغیر کے خواہاں تھے اور فریڈرک ولہلم ثالث علانیہ طور پر اپنا خیال اسکی تائید میں ظاہر کرچکا تھا مگر جرمانیا کے حکمران خاندانوں، امیروں اور عہدہ داروں کے خیالات مطلق العنانی کی جانب شدت سے مائل تھے۔ انقلاب نے تمام جدید خیالات کی طرف سے سخت بداطمینانی پیدا کردی تھی اور رعایا کی سیاسی قابلیت ابھی بہت پست درجے پر تھی۔ جرمانیا کی سلطنت متفقہ اور اسکی منفرد سلطنتوں نے مطلق العنان طرز حکومت کو برقرار رکھا۔ صرف صوبوں کی مجلس شوریٰ کے باعث ایک خفیف سی پابندی عائد کردی تھی۔ جس قانون کے موافق متفقیت قائم ہوئی تھی اسکی تیرھویں دفعہ میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اس متفقیت کی تمام سلطنتوں میں مقامی مجلس شوریٰ قائم کیجائیگی۔ لیکن آسٹروی مدبروں نے صاف طور پر یہ شرط لگادی تھی کہ اُس سے کسی طرح بر بنا تی یا آئینی بادشاہت مراد نہیں لیجائے گی۔

۱۸۱۵ء کے بعد کے نظام ہائے سلطنت

چند سلطنتوں نے مستثنیٰ طور پر فرانسیسی بادشاہت کی نقل میں اپنے وہاں آئینی بادشاہت قائم کی مگر صوبجات کی قدیم مجلس شوریٰ کے اثرات باقیات نے اُن میں بھی فرق پیدا کردیا۔ امارت نساؤ نے اس میں سب سے سبقت کی (۲ ستمبر ۱۸۱۴ء) مگر یہ نظام سلطنت بہت ہی تھوڑے دنوں قائم رہا۔ اُسکے بعد لکسمبرگ کا درجہ ہے (۲۴ اگست ۱۸۱۵ء) اور سکسن، وائمار، آئزیناخ کی امارت عظمیٰ (۵ مئی ۱۸۱۶ء) کو خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ وہاں کا حکمران کارل آوگسٹ بذات خاص آزادانہ انتظامات کی جانب راغب تھا۔

جنوبی جرمانی سلطنتوں کی کارروائی، جن میں بویریا کی شاہی (۲۶ مئی ۱۸۱۸ء) بادن (بیڈن) کی امارت عظمیٰ (۲۲ اگست ۱۸۱۸ء) اور ویورٹیم برگ (۲۵ ستمبر ۱۸۱۹ء) داخل ہیں، زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ویورٹیم برگ کی پیش بیں حکومت ہی اولاً پرانے طبقات کی مخالفتوں کو فنا کرنے میں کامیاب ہوسکتی تھی۔ ان سلطنتوں نے مفاد عامہ کے خیال سے آئینی حکومت رائج کی تاکہ اُن بڑی سلطنتوں کے مقابلے میں انھیں قوت حاصل ہوجائے جن میں مطلق العنان حکومتیں قائم تھیں۔

ہنوور کی شاہی (۷ ستمبر ۱۸۱۹ء) کی امارت عظمیٰ (۱۷ ستمبر ۱۸۲۰ء) اور سکسن مائننگن (۲۳ اگست ۱۸۲۰ء) نے بھی مذکورۂ بالا سلطنتوں کی تقلید کی۔

ان تمام نظامہائے سلطنت میں بادشاہ کو بہت وسیع اختیارات اور حقوق دیئے گئے تھے ۔ درحقیقت فرانس کی بہ نسبت قدامت پسند جرمانیوں میں بادشاہی کی حالت زیادہ محفوظ تھی اور شاہی جب تک آزادانہ خیالات کو سمجھتی اور اسکی پیشروی کرتی رہی معاملات عامہ کے نظم ونسق میں اس پر اس قدر اعتماد کیا جاتا رہا کہ کسی دوسری جگہ یہ بات نہیں ہوئی ۔

ایوانہائے شوریٰ کی ترتیب میں انگریزی اور فرانسیسی نمونے پیش نظر رکھے گئے تھے لیکن دارالامرا بیشتر اصحاب جائداد پر مشتمل تھا، جن کے دعوے اور خیالات زمانہ ماضیہ پر مبنی تھے ۔ ان میں کچھ درباری عہدہ دار بھی شامل کرلئے گئے تھے، اس وجہ سے اس ایوان کو کبھی کافی وقعت اور اقتدار نہیں حاصل ہوا ۔ دارالعوام میں اہل دولت کا اثر فرانس کی بہ نسبت کم تھا مگر چونکہ وہ طبقات کے قدیم طرز پر قائم ہوا تھا اس وجہ سے اس تنظیم کو اکثر نیابتی کے بجائے "طبقاتی" کہتے تھے ۔ لیکن واقع میں یہ بجا نہیں تھا ۔ ازمنہ وسطی کے طبقاتی انتظام اور زمانۂ حال کی نیابتی حکومت میں یہ فرق نہیں ہے کہ موخرالذکر رعایا میں اختلاف طبقات کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ فرق یہ ہے کہ وہ نیابتی حکومت ہے اور وہ قوم کے مشمولہ مدارج کے مفاد خاص پر اُس قدر زور نہیں دیتی جسقدر قوم اور سلطنت کی وحدت (اتحاد) پر زور دیتی ہے ۔ مثلاً بویریا کے جدید نظام سلطنت کو دیکھئے تو جدید اصول کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے ۔ اس نظام سلطنت میں تمام مبعوثین سے یہ قسم لیجاتی ہے کہ وہ ملک کی عام بہبود پر نظر رکھیں گے اور جداگانہ طبقات و مدارج کا کچھ خیال نہ کریں گے ۔

جرمانیا کی دو بڑی سلطنتوں کی بے اعتمادی اور عناد کے باعث آئینی شاہی کا نشو ونما بیسیوں برس رکا رہا ۔ پروشیا میں اصلاح کی تمام کوششیں ناکام رہیں اور قوم کی موعودہ نیابت کے بجائے صرف صوبجات کی مجالس شوریٰ منظور کی گئیں ۔ آسٹریا کی حکومت کو یہ یقین تھا کہ اُسکے مختلف صوبجات میں اتحاد قائم رہنے کا صرف یہی ذریعہ تھا کہ مطلق العنان حکومت قائم رہے ۔ جرمانی ستفقیت نے اپنی تمام کوششیں اس امر پر صرف کردیں کہ شاہی اصول بحال خود برقرار رہے اور رعایا پر احتسابی نگرانی قائم کردی جائے ۔

۱۸۳۰ء کے بعد جدید تحریکات

۱۸۳۰ء کے فرانسیسی انقلاب نے جرمانیا میں نئی تحریکات پیدا کردیں اور

بہت سی سلطنتوں کو آئینی طریق قائم کرنے پر راغب کر دیا۔ ولایت ہیسّے میں ۵ جنوری ۱۸۳۱ء کو آئینی حکومت قائم ہوگئی، جسکا منشا یہ تھا کہ حکمران کی خود مختاری کے مقابلے میں عوام کی آزادی محفوظ رکھی جائے۔ سکسونیا کی شاہی کا نظام سلطنت بویریا کے طرز پر ڈھالا گیا (۴ ستمبر ۱۸۳۱ء) ہنوور کی شاہی میں ایک جدید اساسی قانون جاری ہوا (۲۶ ستمبر ۱۸۳۳ء) مگر دوسرے بادشاہ ارنسٹ آوگسٹ نے اُسے خارج کر دیا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۸۴۰ء میں وہ قانون پھر کسی قدر ترمیم شدہ صورت میں بحال کیا گیا۔

پس اسطرح مذکورۂ بالا دو بڑی سلطنتوں کی مخالفت کے باوجود آئینی حکومت جرمانیا میں برابر ترقی کرتی گئی۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں اکثر ظاہرداری زیادہ اور اصلیت کم تھی۔ عہدہ داروں کی انشاپردازیوں سے اور مختلف فریقوں کے تصادم باہمی سے مجالس قومی کے اندر اور باہر دونوں جگہ اُسے نقصان پہنچتا رہا۔

۱۸۴۷ء پروشیا

آخر الامر ۳ فروری ۱۸۴۷ء کو فریڈرک ولہلم چہارم نے ایک فرمان شاہی جاری کیا اور صوبجات کی قدیم مجالس کی بنیاد پر تمام ملک پروشیا کیلئے ایک مشترک لندتاغ (پارلیمنٹ) قائم کیا۔ اس مجلس کو قانون سازی کے متعلق صلاح دینے، نئے محاصل کی منظوری دینے اور اندرونی معاملات کے متعلق درخواست دینے کا حق دیا گیا۔ اسطرح پروشیا مطلق العنان حکومت کی حد سے نکل کر محدود شاہی کے زمرے میں آگئی اور جرمانیا کی نیابتی سلطنتوں سے قریب ہو چلی۔ طریق جدید کے اجرا کو حرکت دیدی گئی تھی اور وہاں کا نظام سلطنت فی نفسہ اس قدر قوی تھا کہ وہ محض آئینی حکومت کی سرسری نقل کرنیکے بجائے موجودہ تعلقات وحالات کو برقرار رکھ سکے، اگرچہ پارلیمنٹ کے اختیارات بہت ہی ناکافی تھے مگر ترقی کی ایک صورت نکل آئی تھی اور اس امر کا امکان پیدا ہوگیا تھا کہ رعایا کی سیاسی تربیت کے ساتھ ساتھ نظامِ سلطنت کے نقائص دور ہوتے جائینگے۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ حکومت پارلیمنٹ کی جائز خواہشوں تک سے اس قدر مخالف تھی کہ اُس نے اعتدال پسند فریق کا اعتماد بھی کھو دیا۔ جب ۱۸۴۸ء کے سیاسی زلزلے نے یورپ کی ساری سرزمین کو ہلا دیا تو یہ نئی عمارت بھی منہدم ہوگئی۔ ۵ دسمبر ۱۸۴۸ء کو ایک نیا نظامِ سلطنت مرتب کیا گیا، جسے زیادہ تر جمہوری اور انقلابی فریق نے مرتب کیا تھا۔ چھ مہینے بعد (۳۰ مئی ۱۸۴۹ء کو) بادشاہ نے ایک انتخابی قانون شائع کیا اور اسکے بموجب

۳۱ر جنوری ۱۸۵۰ء کا نظر ثانی کیا ہوا نظام سلطنت تیار کیا گیا، اسکے بعد بعض اہم تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ خاصکر مرکزی اقتدار کی تقویت کے لئے قدم آگے بڑھتا رہا ہے۔ اگرچہ اس نظام سلطنت میں بہت سے شدید نقائص تھے مگر اُس سے پروشیا میں سیاسی زندگی کی ایک قانونی بنیاد قائم ہوگئی۔

آئندہ چند برس کے تجربات نے ثابت کردیا کہ آئینی حکومت کی ظاہری شکل تو قبول کرلیگئی، مگر اُسکے منشا کی کماحقہٗ تعمیل نہیں ہوئی۔ ایوان اعلیٰ جو مطلق العنانی اور ازمنہ وسطیٰ کی سپہگری کا نمایندہ تھا وہ بددلی کا اظہار کررہا تھا۔ بادشاہ اپنے اختیارات میں روک ٹوک کے عادی نہیں تھے اور اس نئی حالت کا قبول کرنا اُنھیں شاق معلوم ہوا۔ عوام کے نمایندوں کو آہستہ آہستہ یہ معلوم ہوگیا کہ اُنکے اختیارات کس قدر محدود ہیں اور پروسی حکومت اور انگلستان کے پارلیمنٹی طریق میں کس قدر فرق ہے مگر اصلاح و رجعت کی اس شدید و صعب کشاکش میں آئینی حکومت کی بنیاد برابر مضبوط ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ مخالفت کے بجائے سلطنت کے لئے ادائے فرض کا خیال پیدا ہوگیا۔ ۱۸۶۶ء میں آسٹریا کے شعلۂ جنگ میں مخالفت کے تمام اجزا پگھل گئے اور سب متحد ہوگئے۔

(۷) آسٹریا

آسٹریا بھی بےخبری کے عالم میں ۱۸۴۸ء کے انقلاب میں پھنس گئی، وہ مختلف قومیں جو ابتک خاندان ہابس برگ کے تحت میں مربوط تھیں اب علیحدہ ہونے کی کوشش کرنے لگیں۔ اور کچھ دن تک وائینا ناتجربہ کار اور پرجوش نوجوانوں کے ہاتھ میں آگیا۔ فوج کے سوا اور کہیں بھی اتفاق باقی نہیں رہا۔ فوج ہی پر بادشاہ کا آخری بھروسا تھا۔ فوج کی فتوحات نے آسٹری مدبرین کو اس قابل بنادیا کہ وہ پھر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اندرونی اور بیرونی خطرات سے مرعوب ہوکر اُنھوں نے یہ کوشش کی کہ سلطنت کو ازسرنو زیادہ متحدہ بنیاد پر قائم کریں۔ ۴ر مارچ ۱۸۴۹ء کو جو نظام سلطنت عطا کیا گیا وہ آسٹروی شہنشاہی کو آئینی بادشاہت کے اصول پر ترتیب دینے کی ایک کوشش تھی مگر اسکا عملی تجربہ کرکے نہیں دیکھا گیا۔ ایک مجلس میں اُن تمام قوموں کو جمع کرنا غیر ممکن معلوم ہوا جو ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور تہذیب کے اعتبار سے بھی مختلف مدارج پر تھیں۔ ہنگری کی بغاوت کی وجہ سے یہ اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا کہ ایک مطلق الاختیار اور متحدہ حکومت قائم رکھی جائے کیونکہ حکمران خاندان ہمیشہ

آسٹریا کے مختلف صوبوں کے درمیان ذریعۂ اتحاد رہا تھا اس لئے ہر طور پر یہی مناسب معلوم ہوا کہ سلطنت کے تمام اختیارات شہنشاہ کے ہاتھ میں مجتمع رہیں۔ ۲۰ اگست ۱۸۵۱ء کے شاہی فرمان نے یہ اعلان کر دیا کہ وزرا صرف بادشاہ کو جوابدہ ہیں۔ اسی تاریخ کی مجلس وزرا کے فیصلے کے بموجب ملکی مجلس شوریٰ شاہی مجلس شوریٰ میں بدل دیگئی اور ۳۱ دسمبر ۱۸۵۱ء کے ایک حکم شہنشاہی کے ذریعے سے ۱۸۴۹ء کا نظام سلطنت اٹھا دیا گیا۔ اسی تاریخ کو مجلس وزرا نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ صرف خاص کے علاقوں میں رائے دہی کی مجلسیں قائم کیجائیں گی جن میں امرا چھوٹے زمیندار، تجارتی طبقات سب شامل کئے جائیں گے مگر اصلیت یہ تھی کہ مطلق العنان بادشاہی قائم کر دیگئی تھی اسکی مرضی کو عمل میں لانیکے لئے عہدہ داروں کی ایک جماعت کل کی طرح کام کر رہی تھی۔ کیتھولک پادریوں سے اُسے اخلاقی تائید حاصل تھی اور ایک زبردست فوج اسکی مادی حمایت کے لئے موجود تھی۔

۱۸۵۸ء کے بعد پروسیا، بویریا، بیڈن، ویورٹمبرگ ولایات ہسے وغیرہ میں مطلق العنانی کو پیہم شکستیں نصیب ہوئیں اور ۱۸۵۹ء کی اطالوی جنگ میں آسٹریا کو یہ معلوم ہوگیا کہ اس کے تینوں ستون (عمال، فوج، و پادری) کس قدر کمزور ہیں۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ شہنشاہی حکومت کو مالی اور سیاسی مشکلات سے کوئی مفر اسکے سوا نظر نہ آیا کہ نیابتی نظام سلطنت پھر عطا کیا جائے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۶۰ء کے شاہی فرمان میں اس ارادے کے پورے کرنیکا عزم ظاہر کیا گیا اور ۲۶ فروری ۱۸۶۱ء کے قانون اساسی کی رو سے اس کے پورے کرنیکی کوشش کی گئی۔

اس فرمان میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ مختلف سلطنتوں اور صوبوں میں تاریخی حقوق کا جو احساس پیدا ہوگیا ہے اسکے بموجب شاہی اختیارات قائم کئے جائیں گے۔ ہر قوم کے لئے ایک لنڈ تاغ (مجلس ملکی) ہوگی جسے ایک حد تک بجائے خود آزادی حاصل ہوگی اور اسکے ساتھ ہی عام رائشس تاغ کی وضع قوانین اور شہنشاہی حکومت کی نگرانی میں یہ سب قومیں برابر کی شریک ہونگی۔ رائشس تاغ بھی دو قرار پائیں ایک سلطنت کے لئے اور دوسری مغربی صوبہ جات کیلئے، لیکن اس نظام سلطنت کو استقلال نہیں ہوا کیونکہ اہل ہنگری نے رائشس تاغ میں اپنے مبعوثین کے بھیجنے سے انکار کر دیا۔

۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء کے شہنشاہی اعلان نے رائشس تاغ کو معطل کر دیا اور حکومت کو پھر اسکی نگرانی سے آزاد کر دیا لیکن ۱۸۶۶ء کی تباہ کن شکست نے ایک نیا تغیر پیدا کر دیا۔ سیڈوا کی شکست اور پروشیا سے پراگ کا عہد نامہ ہو جانیکے بعد ہنگری کے ساتھ صدق دل سے گفت وشنود شروع ہوئی۔ ہنگری اس امر پر مصر تھی کہ نہ وہ اپنے قدیمی حقوق ترک کرنا چاہتی اور نہ وہ انھیں ایک ایسے نظام سلطنت سے بدلنا چاہتی ہے، جو محض شہنشاہ کا عطیہ ہو۔ آخر اہل ہنگری اس شرط سے مصالحت پر راضی ہوئے کہ یہ تسلیم کیا جائے کہ ہنگری کا نظام سلطنت از روئے قانون بحال ہے اور ۱۸۴۸ء کے قوانین اور ملک کی آزادی قائم رہے گی، اور اس میں جس قدر مداخلت کی گئی ہے سب کالعدم قرار دیدیجائے۔ حقیقت میں یہ دوگانہ حکومت کا بحال کرنا تھا۔ اس زمانے سے ایک رائشس تاغ اور وزارت ہنگری کے لئے ہے اور دوسری رائشس تاغ اور وزارت دریائے لائتا کی دوسری جانب کے صوبجات کیلئے ہے۔ ۱۸۶۷ء کے بعد مسلسل قوانین ایسے جاری ہوئے جن سے وزرا کی ذمہ داری، نیابت کا طریقہ، عدالتی اور ملکی انتظامات، مرتب و معین ہوئے۔ معین شدہ نظام سلطنت جہانتک قابل عملدرآمد تھا ازسرنو جاری کیا گیا۔ دونوں ڈائٹ (پارلیمنٹ) نے ایک متفقہ مجلس قائم کی جسکا منشا یہ تھا کہ وہ تمام شہنشاہی کیلئے ایک عام طرز عمل ترتیب دینے کے لئے تین مشترک وزرا، یعنی وزیر خزانہ، وزیر جنگ، اور وزیر خارجہ کے ساتھ ملکر کام کرے۔ یہ امر مشکوک ہے کہ آیا یہ مسالمت مستقلاً قائم رہے گی یا نہیں مگر یہ یقینی ہے کہ آسٹریا، ہنگری اور بوہیمیا تینوں میں سے کوئی بھی اسکی روادار نہ ہوگی کہ مطلق العنانی پھر قائم ہو جائے اور اگرچہ اس کی ظاہری صورت کے متعلق ان میں باہم اختلاف ہو مگر اس خواہش میں سب متفق ہیں کہ آئینی بادشاہی برقرار رہے جس پر قومی نمایندوں کا اثر اور انکی نگرانی غالب ہو۔

(۸) ۱۸۴۹ء کا مجوزہ جرمانی نظام سلطنت

منفرد سلطنتوں سے گزر کر جرمانی متفقیت کو مجموعۂ آئینی حکومت کی شکل میں لانیکی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۸ مارچ ۱۸۴۹ء کو ایک نظام سلطنت تیار کیا گیا جو آسٹریا کے سوا تمام جرمانی ریاستوں پر محتوی تھا۔ شاہان پروشیا موروثی شہنشاہ قرار پائے۔ ایک متفقہ سینات میں ہر سلطنت کی نیابت کا انتظام کیا گیا تھا، اور جرمانی رعایا کے مبعوثین کی ایک قومی مجلس قرار پائی مگر اس تجویز نے عملی شکل نہیں اختیار کی۔ جرمانیا کے مسائل کو

اسطرح حل ہوتے دیکھنے کے بجائے آسٹریا جنگ کے لئے تیار ہوگئی۔ شاہ پروشیا اس پر رضامند نہیں ہوا کہ وہ قومی مجلس کے ہاتھ سے شہنشاہی تاج قبول کرے۔ بویریا نے اُس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور خود قوم بھی کوئی قطعی فیصلہ نہ کرسکی۔ خاندان اور تفرد پسندی کے اثرات قومی اتحاد کے اثرات سے زیادہ قوی تھے اسکے بعد بھی جو کوششیں، خصوصاً پروشیا کی طرف سے، جرمانیا کو ایک آئینی شاہی کے تحت میں متحد کرنیکی ہوئیں وہ سب کی سب انھیں اثرات کے مقابلے میں ناکام رہیں یہانتک کہ آسٹریا اور حکمران خاندانوں کی طرف سے جو دقتیں ڈالی جارہی تھیں اُن کا خاتمہ ۱۸۶۶ء کی جرمانی جنگ نے کیا۔

شمالی جرمانیا کی متفقیت ۱۸۶۷ء

۱۶ اپریل ۱۸۶۷ء کو شمالی جرمانیا کی جو متفقیت قائم ہوئی، اُسے آئینی بادشاہت کہنے میں بہت سے شرائط و قیود لازم آتے ہیں۔ شاہ پروشیا اس متفقیت کا موروثی صدر و سپہ سالار قرار دیا گیا تھا اور عام کارروائی کی نگرانی اُسے تفویض ہوئی تھی۔ اسکی معاونت کے لئے تمام سلطنتوں کا ایک متفقی چانسلر (صاحب الدیوان) تھا، شاہ پروشیا چانسلر کو نامزد کرتا تھا مگر وہ پارلیمنٹ کا ذمہ دار ہوتا تھا اور انتظام ملک کے انصرام کے لئے وہی سر دیوان سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے عاملانہ اختیار آئینی بادشاہت کے اختیار عاملانہ کے مشابہ تھا۔ اسکے ساتھ ہی صدر کی کارروائیوں کی روک تمام نہ صرف رائشس تاغ سے ہوتی تھی، جس میں جرمانی قوم کے نمایندے شامل تھے بلکہ مجلس متفقہ بھی اسکی نگران تھی۔ جس میں تمام متفقہ سلطنتوں کی شرکت اور رائے شامل تھی۔ یہی دونوں جماعتیں قانون وضع کرنے میں متفقہ انتظامات کی نگرانی کرتی تھیں۔

۱۶ اپریل ۱۸۷۱ء کے جرمانی شہنشاہی کے نظام سلطنت نے بادشاہ کو شہنشاہی کا خطاب دیکر اُس کی قوت کو بڑھا دیا لیکن آج بھی بعض فوجی اور مالی معاملات میں شہنشاہ کو نامنظوری کا بہت ہی محدود حق حاصل ہے۔ وضع قانون میں اُسے کوئی آزادانہ و براہ راست اختیار حاصل نہیں ہے اور مجلس متفقی صرف وضع قانون کی مجلس نہیں ہے بلکہ شہنشاہی کی حکومت میں شریک ہے۔ پس ایک حد تک مختلف شہریاروں اور مقامی حکمرانوں کی ایک مجموعی حکومت قائم ہے جو شاہی کے بجائے اعیانی حکومت سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ شہنشاہی میں جن اصولوں کی آمیزش کو پفنڈورف نے دو صدی قبل

نہایت ہولناک بتایا ہے وہ ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوئے ہیں لیکن اپنے خصوصیات اور اجتماعی ضدات کے باوجود جرمانی نظام سلطنت نے یہ ظاہر کردیا ہے کہ وہ ایک زوردار اور جاندار شئے ہے، اور اگر آئینی بادشاہت کا جزو اعظم یہ تسلیم کیا جائے کہ شاہی قوت اور وحدت عمل کے ساتھ رعایا کے حقوق اور آزادی کا اجتماع ہو جائے تو جرمانیا کی شہنشاہی بالیقین اس صنف میں داخل ہے ۔

خلاصہ

اس تمام بحث پر نظر ثانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیابتی یا آئینی بادشاہی کے طریقے کو مغربی یورپ میں نہایت قطعی غلبہ حاصل ہوگیا ہے ۔ یورپ کی تقریباً ہر ایک مہذب سلطنت نے رعایا اور اُسکے مشمولہ طبقات کے نہ صرف شخصی بلکہ سیاسی حقوق کو بھی تسلیم کرلیا ہے ۔ اب شاہی، مطلق العنان اور غیر محدود نہیں رہی ہے بلکہ وہ ایک اعلیٰ قانونی طاقت بنگئی ہے اور رعایا کے حقوق نے اُسے محدود کردیا ہے ۔

لیکن دوسرے اعتبارات سے مختلف ممالک کی آئینی شکلوں میں بہت فرق ہے ۔ انگلستان میں شاہی، امرا کے ایک زبردست طبقے سے گھری ہوئی ہے اور عملی کاموں کا انحصار بادشاہ کی شخصی مرضی کے بجائے پارلیمنٹ کے فریق غالب اور وزرا کے اوپر ہے جو پارلیمنٹ کو جوابدہ ہیں ۔ براعظم پر کہیں بھی طبقہ امرا کو یہ اقتدار و اعزاز حاصل نہیں ہے ۔ وہاں شاہی کے بعد عمومی حصہ سب سے زیادہ نمایاں ہے ۔ طبقہ امرا کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ وہ اعتدال قائم رکھتا اور اول الذکر دونوں حصوں کے درمیان ایک واسطے کا کام دیتا ہے ۔ براعظم میں آئینی جد و جہد شاہی اور جمہوریت کے درمیان ہے، اور ان میں سے ہر ایک اس کوشش میں سرگرم ہے کہ وہ دوسرے کے مقابلے میں اور نیز تمام سلطنت کے اندر اپنے محل مناسب پر قائم رہے ۔ ہر ایک اپنی تنہا حکومت اور اپنے حریف کو دبانیکی فکر میں ہے مگر دونوں سے کسی ایک کو جب عارضی طور پر شکست ہوجاتی ہے، تو اُس کے بعد پھر یک بیک اسکی قوت بحال ہوجاتی ہے براعظم میں آئینی بادشاہت کی علانیہ کوشش یہ ہے کہ اُسے ایک زندہ حیثیت حاصل ہوجائے جس سے اس جسم سیاسی کے ہر حصے کو اسکا موزوں حق ملجائے، بادشاہ کو کامل اقتدار و عظمت، طبقہ امرا کو وقعت و اثر، عوام کو امن و آزادی نصیب ہو۔

براعظم میں بالعموم اور فرانس[۵] اور جرمانیا میں بالخصوص بادشاہ سلطنت کا

---

[۵] یعنی سنہ۱۸۷۰ء سے قبل ۔

صدر کار کن ہوتا ہے، صرف لفظاً نہیں بلکہ عملاً بھی۔ جب قومی حسیات اور رفتار زمانہ سے اُسکا تصادم ہو جاتا ہے صرف اُسوقت نا محدود رائے عامہ کی قوت سے اُسکی روک ہوتی ہے مگر یہ رائے عامہ بالعموم انفصالی اور جامد ہوتی ہے۔ اس حالت کے سوا بادشاہ کی قوت طبقہ امرا کی بہ نسبت بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ جرمانیا میں یہ طبقہ اپنے ذاتی مفاد کے خیال سے بادشاہ کا خدمت گزار بنا رہتا ہے اور فرانس میں وہ اپنی بے بسی کی شکوہ سنجی کیا کرتا ہے۔ فرانس میں بوربوں خاندان کے بادشاہ، زیادہ دولتمند اہل شہر پر بھروسا کرتے تھے اور نپولین سوم ادنےٰ طبقات کو اپنا پشت پناہ سمجھتا تھا۔ جرمانیا کی منفرد سلطنتوں میں بادشاہ اپنی تائید کے لئے کچھ تو فوج پر بھروسا رکھتے ہیں اور کچھ حکام پر۔ حکام اپنی جگہ پر بادشاہ کے لئے خاص روک تھام کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ شہنشاہی میں شہنشاہ کا اعتماد عوام پر اور مختلف سلطنتوں کی حکومتوں پر ہوتا ہے۔ بے انتہا کوششوں کے باوجود کہیں بھی کوئی ایسا انتظام نہیں ہوا ہے، جس سے عوام کے دعاوے کو تسکین ہوگئی ہو، جب یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو جائے گا، حکمران خاندان اپنے ازمنہ وسطی کے تعصبات کو برطرف کردیں گے، اور زمانۂ حال کے خیالات سے متفق ہو جائیں گے تو یہ مدت دراز کی کشمکش ختم ہو جائے گی اور محدود شاہی کی بقا کا پورا اطمینان ہو جائے گا، جس سے یہ توقع وابستہ ہے کہ وہ اتحاد عام کے ساتھ اجزا کی آزادی کو جمع کردے گی اور رومی سیاسی مذاق کو جرمانی احساس آزادی کا ہم آہنگ بنادے گی۔

تعلیق گستاو فسمرمن نے اس بحث پر ایک رسالہ لکھا ہے اور جب (۱۸۵۲ء میں ہنوور سے) یہ رسالہ شائع ہوا تو سوسائٹی کے اعلیٰ حلقوں میں بہت پسند کیا گیا مگر تعلیم یافتہ متوسط طبقے نے اُسے عموماً ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اس رسالہ کا نام یہ ہے: "انگلستان کے لئے آئینی شاہی کا مناسب ہونا اور براعظم یورپ کیلئے آئینی شاہی کا بے کار محض ہونا" اور اُسکے مصنف نے اُسوقت سے ہنوور میں ایک ایسا دائرۂ عمل اختیار کیا ہے جو حکمران اور قوم دونوں کیلئے محل شکایت ہے۔ اس مضمون پر آزاد خیالوں نے جو بیشمار تصانیف شائع کئے ہیں، یہ رسالہ مطلق العنانی کے طرف سے اُنکا جواب ہے، اپنے اکثر مخالفوں کی طرح فسمرمن نے بھی آئینی بادشاہت کا خیال تمامتر انگلستان کے نظام سلطنت کے ظاہری اشکال واصول سے اخذ کیا ہے اُسکا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انگلستان کا طریقہ براعظم میں قابل عملدرآمد نہیں ہے کیونکہ انگلستان میں

نقائص و اضداد کی اصلاح و درستی روایات قدیمہ اور حکمران طبقۂ اعیان کے اغراض سے ہو جاتی ہے لیکن اس نظام سلطنت پر اگر بالکل عمومی انداز سے عملدرآمد کیا جائے تو نہایت ابتر نتائج پیدا ہونگے مگر انگلستان کا دستور اور آئینی بادشاہت دونوں ایک ہی شئے نہیں ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کوشش کی عملی صورت کے لحاظ سے اس دستور کو باوجود اسکی اصولی غلطیوں کے سب سے بہتم بالشان اور سب سے بڑی کامیابی قرار دیجئے، مگر یہ کہنا بجا نہیں ہے کہ اصول کی یہی ایک اتم واکمل عملی صورت ہے۔ یہ کہنا کہ براعظم کے حالات انگریزی طریقے کے ناموافق ہیں، یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ حالات آئینی بادشاہت کے بھی مخالف ہیں۔ آئینی بادشاہت سے مراد ایسی بادشاہت ہے جو یہ تسلیم کرتی ہو کہ طبقات رعایا کے حقوق کی طرح اُسکے حقوق بھی نظام سلطنت کی رو سے مشخص و معین ہیں اور یہ کہ بالتخصیص قانون سازی کے لئے جسم سیاسی کے جملہ اعضا کو متفقاً کام کرنا چاہئے۔ ایک زندہ بادشاہت لازماً آئینی بادشاہت ہوگی کیونکہ زندگی خود نظام ہی کا نام ہے۔ تسمرمن کا ہر جگہ یہ لکھنا کہ "اقتدار خاص" حکمران کی "ملک" ہے، صاف یہ ظاہر کرتا ہے کہ جزئیات پر اسقدر غایر نظر رکھنے کے باوجود اُس نے سلطنت کے متعلق زمانۂ حال کے خیال کو پوری طرح نہیں سمجھا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کے اس استدلال کو اختیار کر لینے سے وہ زمانۂ حال کے خیالات سے کلیۃً متصادم ہوگیا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک وقت تک وہ پشتہ بندی سے اس سیلاب کو روکے مگر جب موجیں بلند ہونگی تو اس کمزور عمارت کو یک لخت بہا لیجائینگی۔ (یہ جملہ جسطرح ۱۸۵۱ء میں لکھا گیا تھا میں اُسکو اُسی طرح چھوڑے دیتا ہوں۔ ۱۸۶۶ء میں اس کی صداقت ثابت ہوگئی)۔ زمانہ موجودہ نے اگر کسی ایک اصول کو صاف طور پر مضبوط پکڑ لیا ہے تو وہ یہ ہے کہ سیاسی اقتدار جسطرح ایک عام حق ہے اُسی طرح ایک عام فرض بھی ہے۔ اسکا تعلق تمام قوم کی سیاسی ہستی و زندگی سے ہے اور وہ کسی شخص واحد کی ملک یا حق شخصی ہرگز نہیں قرار دیا جا سکتا۔

پندرھواں باب

۲۔ آئینی شاہی کے غلط تصورات

یورپ کی تقریباً تمام مہذب سلطنتوں نے آئینی بادشاہت کا طریقہ اختیار کرلیا ہے۔ انھیں توقع یہ ہے کہ اس ذریعے سے نہ صرف اُس باہمی تخالف میں جو مطلق العنان حکمرانی اور کمزور منقسم سلطنت کے درمیان زمانۂ وسطی کی وراثت کے طور پر چلا آرہا ہے آشتی وصلح پیدا ہوجائے گی بلکہ زمانۂ حال کے مختلف سیاسی خیالات اور خاصکر شاہی اور جمہوریت کے متخاصم خیالوں میں بھی مسالمت کی صورت نکل آئیگی۔ اس لئے اس طریق کے اساس پر بحث کرنا خاص عملی اہمیت رکھتا ہے لیکن بحث سے پہلے بعض اغلاط و تسامحات صاف کرلینا ضروری ہے۔

فرانسیسی انقلاب نے اپنے ابتدائی برسوں میں روسو کے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی کہ سلطنت دو قوتوں پر مشتمل ہے۔ ایک قوت ارادی یعنی قوت قانونی دوسری قوت عملی یعنی اختیار عاملانہ۔ فرانس میں آئینی بادشاہت کا اصل اصول یہ سمجھا جاتا تھا کہ رعایا رائے قائم کرتی ہے، بادشاہ اُسے عمل میں لاتا ہے۔

یہ خیال کرنا رعایا کو بادشاہ کا حریف مقابل بنادینا بلکہ درحقیقت خود شاہی کا خاتمہ کردینا ہے کیونکہ اس سے بادشاہ عوام کی مرضی کا خادم محض ہوجاتا ہے اور "عوام کی مرضی" بادشاہ سے ایک خارج شئے ہوجاتی ہے جسکے قیام میں اُسے کچھ دخل نہیں ہوتا۔ لوئس شانز دہم کا زوال اور انتہا پسندوں کا اعلان جمہوریت بے شک وشبہ تاریخی واقعات کے نتائج تھے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ نظام سلطنت کے اس اصول کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا تھا۔

اسکے برعکس اگر بادشاہ کو قانونی طاقت کے تابع سمجھکر اس سے خارج کرنیکے بجائے اسکا اہم پارہ سمجھ لیجے تو سلطنت کے لئے جس توحد عمل کی ضرورت ہے وہ ضائع ہوجاتا ہے اور ایک ناممکن العمل دوعملی قائم ہوجاتی ہے[1] گویا ایک دوسروں والا بھوت پیدا ہوجاتا ہے

[1] اس دوعملی سے جو ابتری پیدا ہوتی ہے اُسے فرانس کا عمومی وجمہوری فریق اچھی طرح سمجھتا تھا اور

اُس سے یا تو سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے یا یہ ہوگا کہ شاہی اور جمہوریت میں سے کوئی ایک اصول جلد تر دوسرے سے مغلوب ہو جائیگا۔

(۲) بادشاہ بالکل بے اختیار ہے

اس محال کو رفع کرنیکے لئے سیئے نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سرتاج سلطنت بالکل بے اختیار ہونا چاہئے اور اسی کو اُس نے آئینی طریقے کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اگر کسی شخص کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ماں کے پیٹ سے بادشاہ پیدا ہوا تھا تو وہ شخص نپولین ہے۔ اُس نے اس تجویز کا ایسا حقارت آمیز جواب دیا ہے کہ وہ کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس نے کہا کہ "تم کسی شخص سے جو تھوڑی سی بھی سمجھ رکھتا ہے اور جسے کچھ بھی عزت کا خیال ہے یہ توقع کیونکر کرسکتے ہو کہ وہ سُور کی طرح پڑا رہیگا اور بیس لاکھ سالانہ کھا کر موٹا ہو کر رہیگا"۔

(۳) شاہی اختیارات کو وزرا عمل میں لاتے ہیں

ایک زیادہ عام خیال یہ ہے کہ "بادشاہ کو حکمرانی کا حق حاصل ہے مگر اُس حق کا عمل میں لانا اُس سے نہیں بلکہ اُسکے وزرا سے متعلق ہے"۔ یہ طریقہ مختلف وقتوں میں متعدد ممالک میں عملاً رائج رہا ہے اور ممکن ہے کہ اب بھی رائج ہو لیکن اگر اسے ایک مستقل سیاسی اصول کے طور پر تسلیم کرلیجے تو اُس سے یہ لازم آئیگا کہ بادشاہی بالکل ترک کردی جائے اور جمہوریت کا رواج ہو جائے کیونکہ اگر کسی شخص کو کوئی حق حاصل ہو اور وہ دائمی طور پر اسکے استعمال سے محروم کردیا جائے تو اُس حق کی نوعیت اصلی اس سے زائل ہو جاتی ہے اور تھوڑا ہی زمانہ گزرنے پر بالیقین یہ بے معنی خطاب بھی اُس سے نکال کر اُس شخص کو دیدیا جاتا ہے جو واقعتاً اس حق کو کام میں لاتا ہو۔ ازمنہ وسطی میں ماتحت زمیندار اور مستاجر اولاً زمین پر مالکانہ حقوق استعمال کرنے لگے، پھر اُنھیں زمین کا قبض و دخل بھی مل گیا اور اُنھوں نے سابق مالکوں سے باضابطہ اور مکمل ملکیت بھی بزور حاصل کرلی۔ کارولنگی خاندان کے حاجبان محل نے جب میروونگی خاندان کے شاہی اختیارات غصب کرلئے تو پھر زیادہ زمانہ نہیں گزرنے پایا کہ اُنھوں نے شاہی خطاب پر بھی قبضہ کرلیا۔ جب ایک بار حکومت کا اصلی اختیار بادشاہ سے نکل کر وزرا کو حاصل ہوگیا تو پھر وزرا کے اختیار جمہوریت کے رنگ میں آجاتے ہیں اور شاہی ایک خیالی شئے رہ جاتی ہے[۱] سلطنت کا سرتاج ہونیکے لئے ایک کارکن شخص کے بجائے

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ اُنھوں نے اس سے یہ کام نکالا کہ بادشاہی سے پورے طور پر کھو خلاصی ہو جائے۔

[۱] ۱۸۴۸ء کی فرانک فرٹ کی پارلیمنٹ کے انتہا پسند جمہوری فریق کا یہ کہنا بالکل بیجا نہیں تھا کہ آئینی بادشاہت

ایک نمائشی علامت مقرر کرلینا تخیل پرستی ہے بادشاہت نہیں ہے۔

۴۔ بادشاہ کا شخصی اخلاق کوئی اہمیت نہیں رکھتا

ان وجوہ سے یہ دعوے بھی ناممکن ہے کہ آئینی بادشاہت میں بادشاہ کے شخصی عادات واطوار سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یعنی اسکا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ وہ ایک ممتاز شخص ہے یا ایک وجود معطل۔ ذہین ہے یا بلید اس کے اخلاق شریفانہ ہیں یا اوباشانہ آئینی بادشاہت کا منشا یہ ہے کہ بادشاہ ایسا ہونا چاہئے کہ جہانتک ممکن ہو اُسے آزار پہنچانیکی قوت نہ ہو مگر اسکے ساتھ تاحد امکان اُس میں نفع رسانی کی قابلیت ہو۔ اُسکے امتیاز کا محدود ہونا صرف اسی مفہوم میں ہوسکتا ہے وہ اپنے وزرا کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ تو نہایت ہی لغو ومہمل ہوگا کہ سلطنت میں سب سے بڑی منزلت کا شخص مردانہ وار عظمت وصفات سے معرا سمجھا جائے اور جس شخص کو سب سے زیادہ سیاسی حقوق حاصل ہوں اسی کو سب سے کم سیاسی آزادی حاصل ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ لوگ بادشاہ سے وفاداری اور محبت کا اظہار کریں حالانکہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ اُسکا ان امور کا اہل ہونا اور نہ ہونا برابر ہے بلکہ یہ بھی نہ معلوم ہو کہ وہ ان خیالات کو سمجھنے اور اُنکا بدل کرنیکی قابلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ اس اصول کا منطقی نتیجہ تو یہی نکلیگا کہ آئینی بادشاہت کے لئے سب سے موزوں وہ حکمران ہے جو سب سے زیادہ کمزور ہو اور جس میں دوربینی اور اصابت رائے کا مادہ بالکل نہ ہو۔[1] کیا یہ ممکن ہے کہ اس قسم کی سلطنت سے قوم کی یہ تمنا پوری ہو سکے کہ سلطنت کے ہر جزو میں ایک توازن اور اسکے انتظام میں جان ہونا چاہئے۔

اس خیال کی تائید بالعموم انگلستان کے نظام سلطنت سے کیجاتی ہے مگر انگلستان

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ ایک منصب ہے بلا اختیار کے اور ایک ٹوپی ہے بغیر سر کے۔ اسکے سوا اُسکا کوئی کام نہیں ہے کہ ایک وزیر اعظم مقرر کردے (جو بالعموم اُسکے مخالف ہوتا ہے) اور اپنے ایک جانشین کی پرورش کرے۔

[1] ہیگل نے اپنی کتاب "فلسفۂ حقوق" (ف ۲۸۰) میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ بادشاہ کا کام اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ "ہاں" کہدے اور دستخط کردے لیکن یہ خیال حد سے متجاوز ہے اُسے جسطرح "ہاں" کہنا پڑتا ہے اُسی طرح نہیں بھی کہنا پڑتا ہے اور اسے صرف ضابطہ کا حکم ہی نہیں دینا پڑتا بلکہ اسکے الفاظ فی الواقع حقیقی حکم ہیں فیصلہ کے سوا وقت ضرورت اُسے خود اپنی طرف سے بھی بزور راستہ قائم کرنی چاہئے ایسی حالت میں ی۔ ہ فشتے کا یہ قول صحیح ہوگا کہ "سب سے زیادہ بے مغز متولی اس کام کیلئے سب سے بہتر شخص ثابت ہوگا۔"

میں بادشاہ کی شخصیت کی طرف سے لاپروائی نہیں برتی جاتی بلکہ صورتِ معاملات بالکل اسکے برعکس ہے [۱]

۵۔ بادشاہ صاحب تخت و تاج ہے مگر کار فرما نہیں ہے۔

اسی طرح تیرس کا یہ اصول موضوعہ بہت مشہور ہے کہ "بادشاہ صاحب تخت و تاج ہے مگر کار فرما نہیں ہے" مگر اسسے بھی ہم آئینی شاہی کے اصول کی صحیح تعریف نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صاحب دانش وزیر خود ہی اس اصول کو عمل میں لانے سے قاصر رہا۔ یہ قطعی ہے کہ لوئس فلپ کے زوال کا باعث یہ نہیں تھا کہ وہ صاحبِ تاج ہونیکے ساتھ کار فرما بھی ہونا چاہتا تھا۔ اور اسکے جانشین نپولین سوم کی عوام میں ہردلعزیزی کی اصل وجہ یہی تھی کہ اُس نے کار فرمائی کو اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا۔

صاحب تاج و تخت ہونیکے معنی یہ ہیں کہ شاہی جلالت و عظمت کے حقوق باضابطہ حاصل ہیں اور کار فرمائی کا مفہوم یہ ہے کہ سلطنت کی روش کا عملاً انصرام کیا جائے۔ یہ دونوں حقوق یکساں طور پر سلطنت کے سرتاج سے تعلق رکھتے ہیں اور اسکے لئے موخر الذکر کا انکار کرنا یعنی بالفاظ دیگر اُسے ظاہریت کا عطا کرنا اور اصلیت کا اُس سے سلب کر لینا شاہی اقتدار کو فنا کر دینا ہے۔

کار فرمائی (حکومت) اور نظم و نسق (Administration) میں خلط نہ کرنا چاہئے بادشاہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ہمہ تن نظم و نسق کے معمولی جزئیات میں غرق ہو جائے اور اُسکا ایسا کرنا سلطنت کے لئے مفید بھی نہیں ہے۔

۶۔ یہ کہ بادشاہ کو کثرت رائے کا تابع ہونا چاہئے۔

جن لوگوں نے رعایا کے اقتدار اعلےٰ کے اصول کو پیش نظر رکھا ہے انکا دعوےٰ یہ ہے کہ "آئینی بادشاہت میں" بادشاہ پر لازم ہے کہ رعایا کی کثرت رائے اور اُسکی مرضی کے موافق حکومت کرے"۔ یہ اصول بادشاہت کو عمومیت پر نثار کر دیتا ہے۔ کثرت رائے کی حکومت بھی

[۱] ہیروسیم کی تصنیف "مدبران عہد جارج سوم" کے پڑھنے سے ہر شخص کو یہ یقین ہو جائیگا کہ بادشاہ کی شخصیت کا کس قدر زبردست اثر وزرا پر پڑتا ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ بادشاہ کی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں ہے (بلنٹشلی نے اس امر کو فراموش کر دیا ہے کہ جارج سوم کا دور حکومت انگلستان کی تاریخ میں ایک مستثنیٰ زمانہ ہے جس میں بادشاہ نے یہ کوشش کی اور ایک مدت تک اُسے کامیابی بھی ہوئی کہ وہ اپنے پیشروؤں کی بہ نسبت حکمرانی میں زیادہ دخیل ہو جائے۔ انگریزی مترجم)

عمومیت ہے لیکن درحقیقت بادشاہت کی اعلےٰ خوبیوں میں سے ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ قلیل التعداد فریق کو کثیر التعداد فریق کی درازدستی سے محفوظ رکھے۔ اگر بادشاہ محض کثرت رائے کا نمایندہ و خادم ہو جائے اور فی الحقیقت سلطنت کثرت رائے کے زیر فرمان آجائے تو بادشاہی کا خاتمہ ہے۔ اسطرح پر جو عمومیت پیدا ہو جائیگی، ممکن ہے کہ وہ بادشاہ کو نمائش کے طور پر اُسکے منصب اعلیٰ پر قائم رکھے مگر اُسکا اس منصب پر قائم رہنا اُسی وقت تک ہوگا جب تک اُسکے آقاؤں کو اپنی اصلی طاقت کے پوشیدہ رکھنے کی حاجت ہوگی[1]۔

---

[1] ۱۷۸۹ء میں فرانس کی قومی مجلس نے ٹھیک یہی کرنا چاہا تھا۔ تیرس نے اس مجلس کے متعلق اپنی تصنیف "فرانسیسی انقلاب" (Revolution franeaise) جلد ۲ صفحہ ۱۹۸ میں بہت صحیح کہا تھا کہ "اسکے خیالات جمہوری ہیں اور اس کے محسوسات شاہی ہیں" تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ اس حالت کا قائم رہنا ناممکن ہے۔ فرانس میں بے اختیار بادشاہت کو مختار مطلق جمہوریت نے تباہ کر دیا (۱۷۹۲ء)

سولھواں باب

۴۔ شاہی کا اصول اور آئینی شاہی کا نصبؔ

آئینی شاہی کا تصوریہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سچی شاہی ہو نہ یہ کہ محض ایک وہمی شاہی ہو۔

شاہی کی حقیقی خصوصیات

شاہی کا اصل اصول یہ ہے کہ سلطنت کا اقتدار اعلیٰ اور اسکی عظمت ایک متنفس میں مجسم ہوکر ظاہر ہو۔ اُس میں اور مذہبی شاہی میں فرق یہ ہے کہ شاہی طریق میں حکمرانی کا حق خود بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے اور مذہبی حکومت میں اصلی حکمران خدا ہوتا ہے اور بادشاہ صرف اُسکا مظہر ہوتا ہے۔ جمہوریت میں اور اُس میں فرق یہ ہے کہ جمہوریت میں ایک صدر یا رئیس ہوتا ہے جو خود کو قلیل التعداد طبقۂ اعیان یا کثیر التعداد عوام کا خادم یا نائب سمجھتا ہے۔ برعکس اسکے بادشاہ کسی کا تابع نہیں ہوتا بلکہ وہ حکومت پر آزادانہ قبضہ رکھتا ہے۔ جمہوریت میں سیاسی اقتدار کا اظہار مجموعی حیثیت سے ہوتا ہے اور شاہی میں انفرادی حیثیت سے بلند نظر سے دیکھا جائے تو بادشاہ گویا سلطنت کا مجسمہ ہوتا ہے۔

اس خیال کے دو پہلو ہیں اور اگر بادشاہی کا نام قائم رکھنا ہے تو دونوں کا وجود برقرار رہنا چاہیئے۔

۱۔ سلطنت کے سرتاج کو اقتدار اعلیٰ کے اکیلے قائم مقام اور نمایندہ ہونیکی حیثیت سے شخصی علوئے مرتبت حاصل ہونا چاہیئے۔

۲۔ بادشاہ کی ذات میں سلطنت کی اعلیٰ ترین عظمت و قوت حقیقتاً مجتمع ہونا چاہیئے۔

ہیئت وضع قانون کی نگرانی اور وزرا کی شرکت لابدی ہے

بادشاہ کے دائرۂ عمل کے دو مرکز ہیں: ایک بادشاہ کا خود مبدائے عمل ہونا دوسرے اوروں کے کام کو منظوری بخشنا۔

۱۔ پہلے اصول میں امور ذیل داخل ہو سکتے ہیں:۔

(۱) قوم کے دیگر اجزا کے قائم مقاموں کے ذریعے سے وضع قانون میں بادشاہ کے افعال کی روک تھام اور

(۲) بادشاہ کی یہ ذمہ داری کہ وہ اپنے حقوق و فرائض کے عملدرآمد میں وزرا کو شریک رکھیگا، اسلئے کہ جماعت عامہ کے دوسرے ارکان کی حیثیت کتنی ہی اعلےٰ وارفع کیوں نہ ہو

بادشاہ کی حیثیت ہر حال میں اس سے بالاتر ہوگی اور اس طریق کے اجرا سے کہ بادشاہ کی مرضی اسکی ذاتی مرضی نہیں ہوگی بلکہ سلطنت کی مرضی ہوگی، نظام سلطنت درحقیقت بادشاہ کے بوجھ کو ہلکا کر دیتا ہے اور اسکے اقتدار کو غلط فہمی اور بربادی سے محفوظ رکھتا ہے مگر یہ اصول اس خیال سے موافقت نہیں رکھتا کہ

(۱) بادشاہ کوئی ذی روح شخص نہیں ہے بلکہ وہ محض ایک مورت ہے

(۲) بادشاہ قوم کے قائم مقاموں یا اپنے وزیروں کے تابع ہے اور وہ اُسے مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی کے مخالف خیال ظاہر کرے یا اپنی مرضی کے خلاف عمل کرے۔

لیکن بادشاہ کو باضابطہ اس کا پابند اور تابع بنانا ممکن نہیں۔

بادشاہ کے لئے کس قدر آزادی لازمی ہے۔

چونکہ اعلیٰ اقتدار کا تعلق بادشاہ کی ذات سے ہے، اسلئے لازم ہے کہ اُسکی ذات کی آزادی اور اُسکے حقوق قائم رہیں[1] اسکی ذات ہر اعتبار سے اور کلیۃً سلطنت سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ یہ تعلق ایک خاص حد تک ہوتا ہے، البتہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ وہ شوہر بھی ہے، باپ بھی اور کسی کلیسا کا رکن بھی یا یہ بھی ممکن ہے کہ عالم یا شاعر ہو، لیکن تمام معاملات عامہ میں سلطنت کی رائے کا اظہار اُسی کی ذاتی رائے سے ہونا چاہئے۔ شاہی سلطنت میں یہ بات نہایت اہم اور ضروری سمجھی جاتی ہے کہ بادشاہ سلطنت کے اموریں اپنی ذاتی فکر مندی اور ذاتی مستعدی کو کام میں لائے۔ اُسے سب سے برتر حقوق دینا اور پھر اسی بنا پر اسے دوسروں کی نگرانی میں رکھنا سراسر لغو فعل معلوم ہوتا ہے۔ ایوانہائے مبعوثین سے قانون نہیں پیدا ہوتا بلکہ قانون کی قوت اُسی وقت ہوتی ہے جب اُسے بادشاہ کی آزادانہ مرضی حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کے احکام کا اقتدار وزرا سے نہیں ہوتا بلکہ وزرا خود اپنے اقتدار کے لئے بادشاہ کے دست نگر ہوتے ہیں اور اگرچہ وہ اسکی مرضی کے اظہار کے لئے لابدی آلہ ہوتے ہیں مگر پھر بھی آلہ ہی ہوتے ہیں نظام سلطنت کی

---

[1] گیزو، تصانیف (Memoires) جلد ۲ صفحہ ۲۳: "صرف خدا ہی حکمران ہے اور اس عالم خاکی کا کوئی شخص خدا نہیں ہے خواہ وہ عوام میں سے ہو یا بادشاہوں میں سے۔ عوام کا ارادہ کسی کو بادشاہ بنا دینے کیلئے کافی نہیں؛ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو شخص بادشاہ بنے وہ اپنے میں بعض فطری اور ذاتی شاہانہ خصوصیتیں رکھتا ہو اور یہ خصوصیتیں اُس نے اُس ملک کو گویا جہیز میں دیدی ہوں جسکے ساتھ اُس نے اپنی ذات کو وابستہ کیا ہے۔"

رو سے بادشاہ جس حد تک دوسرے اعضائے سلطنت کی منظوری و امداد کا پابند نہیں ہوتا اُسی حد تک اُسے کامل آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی شخصی مرضی کا اظہار کرے یا اُس کے موافق عمل پیرا ہو۔

مجلس وضع قوانین اور وزراء سے اسکا تعلق

شاہی کے دوسرے اقسام کے مقابلے میں آئینی بادشاہت کی خصوصیت یہ ہے کہ بادشاہ نہ تو بطور خود قانون نافذ کرسکتا ہے اور نہ بالعموم وہ تن تنہا حکومت کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ وضع قوانین کے لئے ایوانہائے مبعوثین کی منظوری ضروری ہے اور حکومت کے کاموں کے لئے وزرا کی شرکت لازمی، لیکن آئینی بادشاہت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ کل حکومت ایوانہائے مبعوثین یا وزرا کی طرف منتقل ہو جائے۔

جس طریق حکومت میں ایوانہائے پارلیمنٹ اور وزرا کی کثرت رائے باضابطہ اور لازمی طور پر بادشاہ کے افعال کو معین کردے وہ حکومت بلاشبہ شاہی اصول کے مخالف ہے۔ اُسے درحقیقت پارلیمنٹ اور وزرا کی حکومت کہنا چاہئے[1] اس میں شک نہیں کہ عملاً ایک آئینی بادشاہ اکثر ایوانہائے مبعوثین کے فیصلے اور وزرا کے مشورے کو منظور کریگا کیونکہ وہ انھیں سلطنت کی مرضی عام کا اظہار سمجھتا ہے لیکن اگر وہ بہ حیثیت بادشاہ کے اپنے فرائض کے ادا کرنیکا خواہاں ہو تو اُسے لازم ہے کہ وہ اپنے اس آزادانہ حق کو محفوظ رکھے کہ وہ بطور خود ان معاملات کی جانچ قومی بہبودی کے نقطۂ نظر سے کرے گا۔ ان حدود کے اندر ایک آئینی بادشاہ پوری آزادی کے ساتھ کارروائی کرسکتا ہے۔

یہ خیال بالکل لچر ہے کہ بادشاہ کو خاص اپنی رائے کے اظہار سے روکنا چاہئے۔ ہر ایک ذی فہم شخص کو اپنے اصلی خیالات کا اظہار کرنا ضروریات زندگی میں سے ہے۔ اور اگرچہ سیاسی ضروریات اکثر بادشاہ کو اُسکے خیالات کے اظہار سے روک دیتی ہیں، مگر کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اُسکی آزادی تقریر سے انکار کرے یا اُسے دروغ بیانی پر مجبور کرے۔[2]

بادشاہ پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ ملک کی حالت کو خود اپنی آنکھ سے دیکھے اور اپنے کان سے سنے۔ اُسے چاہئے کہ رعایا کی ضروریات سے باخبر رہے۔ معاملات عامہ کی تمام کیفیات پر نگاہ رکھے اور جب عام اغراض اور بہبود عام کا اقتضا ہو تو وہ اپنی جانب سے

[1] اس قسم کی حکومت کا ذکر تفصیل کے ساتھ آگے ساتویں مقالے میں آتا ہے۔

[2] دیکھو اشٹال کی تصنیف ”شاہی کا اصول“ (صفحہ ۹) جس میں اس مبحث پر قابل توجہ خیالات کا

ضروری قوانین اور کارروائیوں کے اجرا و امضا میں تاخیر نہ کرے۔ یہی روش ہے جس پر چلکر سلطنت کے بڑے بڑے بادشاہوں نے ناموری حاصل کی ہے۔ آئینی بادشاہی اس قسم کے معاملات میں قابل بادشاہوں کے لئے میدان ترقی مہیا کر دیتی ہے۔ اُسے چاہئے کہ اس میدان کی راہوں کو بند نہ کرے۔

آئینی بادشاہ کے حقوق اور اختیارات

۲۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ سلطنت میں بادشاہ کو سب سے بلند رتبہ اور کامل اختیار حاصل ہونا چاہئے۔ انگریزی نظام سلطنت نے بھی اس اصول کو قبول کرلیا ہے حالانکہ اس نظام سلطنت میں شاہی حقوق پر اس قدر قیود عائد ہیں کہ براعظم کے اکثر بادشاہ اسے ناقابل برداشت سمجھیں گے۔ اس اصول سے نتائج ذیل پیدا ہوتے ہیں:۔

۱۔ آئینی بادشاہی منفرد شاہی اقتدارات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ جملہ اقتدارات شاہی پر تمام وکمال حاوی ہے۔ مطلق العنان بادشاہی اس اعتبار سے اُس سے متجاوز ہے کہ وہ دوسری سیاسی جماعات کو نہ تو آزادانہ حقوق دیتی ہے نہ شاہی حقوق کے عملدرآمد میں انھیں لازمی طور پر شریک کرتی ہے، وہ خود تمام حقوق کی دعویدار ہوتی ہے اور دوسروں کو صرف اپنی مرحمت کا امیدوار رکھتی ہے۔ برخلاف اسکے آئینی بادشاہی اسکی پابند ہے کہ وہ دوسری جماعات کے حقوق اور رعایا کی آزادی کو تسلیم کرتی ہے۔

۲۔ وضع قوانین میں بادشاہ کا حصہ ہوتا ہے اور نفس قانون کے اعتبار سے یہ حصہ علی العموم قطعی ہوتا ہے اور شکل قانون کے اعتبار سے ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ اسے تمام قوانین کے متعلق ہدایت اور منظوری کا حق ہوتا ہے اور یہ قوانین اسی کے نام سے شایع ہوتے ہیں۔ اگر اس اساسی قاعدے سے انکار کیا جائے تو شاہی اصول میں جمہوری اثرات دخیل ہوجاتے ہیں۔ اعلیٰ اقتدار ایوانوں کو ملجاتا ہے اور جہانتک توضیع قوانین کا تعلق ہے بادشاہ ان ایوانوں کے تابع ہوجاتا ہے۔ شاہی میں ایوانوں کے حقوق متوازی ہوسکتے ہیں، کلی نہیں ہوسکتے۔

بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ اظہار کیا گیا ہے۔ لوتھر اپنی (Tischreden Table Talk) میں کہتا ہے کہ "کسی بادشاہ میں اس سے زیادہ تلطف آمیز اور قابل وصف کوئی فعل نہیں ہوسکتا کہ وہ آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرے اور جو کچھ اُسکے دل میں ہو اُسے قولاً و فعلاً کر دکھائے۔" وہ دوسروں کی آزادی تقریر کی کیونکر وقعت کریگا جب کہ خود اسکی آزادی پر قیود عاید ہوں!

۳۔ تمام حکومت بادشاہ کی ذات میں مجتمع ہوتی ہے یعنی حکمرانی اسکا آزادانہ حق ہوتا ہے اور حکومت کی تمام کارروائیاں اُسی کے نام سے عمل میں آتی ہیں۔

آئینی بادشاہت میں وزرا یا عمال اپنے نام سے حکومت نہیں کرسکتے لیکن اسکے ساتھ ہی بادشاہ بھی اُنکے اتفاق و امداد کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ اُنکے تمام حقوق و فرائض شاہی اختیار سے ماخوذ ہوتے ہیں اور ازمنہ وسطی کی جاگیری بادشاہت کی طرح وہ اپنے مقصد کے لئے اُن حقوق کو کام میں نہیں لاسکتے بلکہ صرف سلطنت کے لئے انھیں استعمال کرسکتے ہیں اور وہ بھی اس طرح پر کہ سلطنت کا عملی اتحاد قائم رہے جس طرح قانون سازی کے معاملے میں اسی طرح وزرا کے متعلق بھی بادشاہ کو ہدایت عمل اور منظوری کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ ہدایت کے حقوق کو وزرا بھی کام میں لاسکتے ہیں مگر منظوری کا حق بادشاہ کی ذات واحد سے مخصوص ہے اور وزرا کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ وہ شاہی احکام سے اتفاق کرنے نہ کرنے میں آزاد ہیں[۵ھ]

آئینی بادشاہت ازمنہ وسطی کے اس اصول کو تسلیم کرتی ہے کہ تمام اقتدار، اعلیٰ سے شروع ہوکر اسفل کی طرف آتا ہے، اور حکومت مرکز سے دائرے کی جانب پھیلتی ہے، نہ اسکے برعکس، لیکن اب اس سے بچنے کی کوشش کیجاتی ہے کہ ازمنہ وسطی کی طرح حکومت مختلف حقوق میں متفرق کردیجائے۔

۴۔ سلطنت کے تمام اعضا فرداً فرداً بادشاہ کے تابع ہوتے ہیں۔ اُس میں صرف وہی اعضا داخل نہیں ہیں جن کے افعال کلیتہً اسکی مرضی کے تحت میں ہوں بلکہ وہ وزرا بھی اس میں شامل ہیں جن کا اتفاق رائے بادشاہ کے لئے سلطنت کی مرضی کے اظہار کے قبل ضروری ہے۔ وہ جج بھی اُس میں داخل ہیں جن کے کام اُسکے حیطۂ اثر سے بالکل آزاد ہیں، یہاں تک کہ وہ ایوانہائے معوثین بھی اُسکی ماتحتی سے خارج نہیں ہیں جن کی قانون سازی کے

۵ھ لورنتس فون اشٹائن ("اصول نظم و نسق"، جلد ۱، صفحہ ۶۸ اور آگے کے صفحوں میں) کارروائیوں کے جاری کرنیکے شخصی حق کو حکومت کے اختیار سے ممیز کرتا ہے اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اول الذکر کو قومی نمایندوں اور وزیروں دونوں کے اثر سے آزاد ہونا چاہئے۔ یہ نظریہ بادشاہوں کی مطلق العنانی کیلئے بہت عمدہ چور دروازہ بنادیتا ہے مگر آئینی نظم کیلئے مہلک ہے (دوسری اشاعت میں فون اشٹائن نے اس مسئلہ پر اپنے خیالات کو بالکل بدلدیا ہے)

اختیارات سلطنت میں خود آزادانہ قوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس جس طرح سر جسم کے تمام اعضا پر فوقیت رکھتا ہے اُسی طرح بادشاہ جسمِ سیاسی میں سب سے بلند حیثیت پر فائز ہوتا ہے۔

آئینی بادشاہی ایک اضافی شئے ہے، کوئی مجرد شئے نہیں ہے۔ وہ مختلف تعلقات و ضروریات کے موافق رنگ اختیار کرتی اور قومی خصوصیت اور تاریخ کے مطابق ہئیت بدلتی رہتی ہے، اس لئے صرف انگریزی سلطنت سے اسکا تصور ذہنی قائم کرنا درست نہیں۔

آئینی بادشاہی کی مشترک خصوصیات

خصوصیات ذیل آئینی بادشاہی کی ہر صورت میں مشترک ہیں:۔

(۱) بادشاہ کے رتبۂ اقتدار کی تحدید نظام سلطنت کی رو سے ہوتی ہے۔ آئینی فرمانروا نظام سلطنت سے خارج یا اس سے بالاتر نہیں ہے بلکہ اسی کے اندر داخل ہے۔ اس طرز حکومت کو آئینی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں نظام سلطنت کے معین کردہ قانون انتظام کی توقیر مدنظر رہتی ہے اور بادشاہ اُسکا پابند ہوتا ہے۔ نظام سلطنت کا تحریری ہونا یا نہ ہونا اندازِ ذکر کی شئے نہیں ہے مگر اسکا تحریری ہونا لابدی نہیں ہے۔

انگلستان جو تمام آئینی بادشاہیوں کا مورث اعلیٰ سمجھا جاتا ہے، وہاں فرداً فرداً آئینی قوانین اور قومی آزادی کے تحریری اعلان موجود ہیں مگر تمام سیاسی انتظام کا کوئی مکمل اور باترتیب ضابطہ اُس قسم کا نہیں ہے جسے موجودہ زمانے میں پسند کیا جاتا اور بالعموم نظام سلطنت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انگریزی قوانین، سیاسی جد و جہد کے نتائج اور قومی تاریخ کے مختلف دوروں کی مخصوص ضروریات سے بتدریج پیدا ہوئے ہیں برعکس اسکے، زمانہ حال کے نظامہائے سلطنت بیشتر ایسے ہیں جو ایک ہی مرتبہ مکمل و منتظم قانونی نوعیت کے ساتھ کسی عام اصول سلطنت کے زیر اثر مرتب ہوئے ہیں۔

آئینی بادشاہی، دونوں صورتوں میں ممکن ہے، لیکن غیر تحریری قانون کی اہمیت پر اعتراض کئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریری منشور اور حقوق سیاسی کے تحریری اقرار ہمیشہ بہت ہی بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے تھے۔ یہ امر زمانۂ موجودہ کے حالات کے بالکل موافق ہے۔ یعنی زمانہ مابعد میں حق کا احساس محض رسم و رواج کے تعلق سے نہیں پیدا ہوا ہے اور اُسکے لئے جس حفاظت و وضوح کی ضرورت ہے وہ صرف تحریری دستاویزوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔[۱]

[۱] البتہ بعض نظامہائے سلطنت محض کاغذ کے پرزے تھے چنانچہ فریڈرک ولیم چہارم نے اپنی ایک شاہی تقریر میں بعض تحریری نظامہائے سلطنت کو "کاغذی نظام سلطنت" کہا تھا۔ اس لئے کہ یہ نظامہائے سلطنت کی نظریے

(۲) آئینی بادشاہ اس امر کا پابند ہے کہ وہ نہ صرف نظام سلطنت کے ایک ایک حرف کی وقعت کرے بلکہ سلطنت کے قوانین کو بھی موقر سمجھے۔ وہ صرف اُسی قدر اطاعت کی توقع اور خواہش کرسکتا ہے جو از روئے قوانین و نظام سلطنت معین ہو۔

(۳) قانون سازی کا اختیار بادشاہ کو صرف بہ شمول مجلس نائبین حاصل ہوتا ہے۔ قانون کی اشاعت کے لئے اسے مجلس کے مشورے کی طرح اُسکی منظوری بھی لینا ہوتی ہے۔

(۴) مالی انتظامات اور محاصل کی منظوری کا انحصار مجلس نائبین کے اتحادِ عمل اور اتفاق رائے پر ہوتا ہے۔

(۵) حکومت اور انتظام میں وزرا کی شرکت لازمی ہوتی ہے، بادشاہ کے فرامین، فیصلے اور احکام کسی تیسرے شخص پر اُس وقت تک واجب التعمیل نہیں ہوتے جب تک کہ بادشاہ کے دستخط کے ساتھ ایک وزیر کے دستخط بھی اُس پر نہ ہو جائیں۔

(۶) وزرا اور تمام دیگر عہدہ داروں کی ذمہ داری لابد و لازمی ہوتی ہے۔

(۷) عدالتی اختیارات کی آزادی اور وزرا کی عدالتی فرائض کی انجام دہی سے علٰحدگی، حکومت پر ایک مناسب روک اور رعایا کے حقوق کی ایک اہم حفاظت کا کام دیتی ہیں۔

(۸) طبقات اور افراد کے شخصی اور ذاتی حقوق کے علاوہ عام حقوق بھی تسلیم کئے جاتے ہیں اور یہ حقوق مداخلت بیجا سے اُسی قدر محفوظ ہیں جس قدر خود بادشاہ کے حقوق۔

آئینی بادشاہی کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ایک آزاد قوم کی قومی بادشاہی ہے۔

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ یا اصول کی بنا پر بنا لیئے جاتے ہیں اور قوم میں اُنکی بنیاد مستحکم نہیں ہوتی اسی وجہ سے اُن میں سے اکثر بہت آسانی سے تباہ ہو جاتے ہیں مگر کسی نظام سلطنت کو محض اُسکے تحریری ہونیکی وجہ سے ”کاغذی نظام سلطنت“ نہیں کہنا چاہئے بلکہ برعکس اسکے اس سے اُسکے قواعد کو مزید تقویت و طمانینت حاصل ہو جاتی ہے۔

سترھواں باب

اعیانی حکومت

(الف) یونانی شکل سلطنت۔ اسپارٹا

جس طرح ایتھنز سے قدیم عمومیت کی اعلیٰ ترین ہیئت کا اظہار ہوتا تھا، اسی طرح یونانیوں میں اسپارٹا اعیانی حکومت کا سب سے زیادہ نمایاں نمونہ تھا۔ یونانیوں کے طبایع عام طور پر اعیانی سلطنت کے بجائے عمومی سلطنت کی طرف مائل تھے اور صرف غیر ملکی وحشیوں کے مقابلے میں وہ اپنے کو ایک خلقی طبقۂ اعیان کہنا پسند کرتے تھے لیکن ڈورس کی نسل کے لوگ جن میں اہل اسپارٹا بھی داخل تھے اپنے اندرونی انتظامات میں بھی اعیانی ہیئت وخیالات کو مرجح سمجھتے تھے۔

اہل اسپارٹا کے طبقۂ اعیانی کی ابتدا۔ اعیانی حکومت کا برترین اصول یہ ہے کہ قوم کے زیادہ معزز عناصر کمتر درجے کے عوام پر حکمراں ہوں، ان معزز عناصر کی قدر ومنزلت کے طریقے مختلف سلطنتوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ لکونیا میں اہل اسپارٹا حکمراں قوم سے تھے جنہوں نے اس ملک کو بزور شمشیر فتح کیا تھا اور قدیم باشندوں یعنی پیریونکی اور لکے دیمونی قوموں کو اپنا مطیع بنا لیا تھا۔ راعی ورعیت نسلاً ایک دوسرے سے الگ تھے۔ فاتحین اولین نے حکومت کا نظم ونسق ایسا رکھا تھا کہ وہ اُنکے اخلاف میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا جائے۔ پس اس طرح حاصل شدہ طاقت کے برقرار رکھنے کی کوشش میں تمام قدیم اعیانی حکومتوں کی مختص خصوصیت یعنی موروثی حقوق سیاسی، ازخود پیدا ہو گئے اور یہی تمام سلطنت کا بنیادی اصول قرار دیا گیا۔

اُنکی تفرد پسندی۔ اہل اسپارٹا کی اس موروثی حکومت میں نسلوں کی آمیزش نے کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا کیا تھا۔ اہل اسپارٹا اور غیر ملکیوں کے درمیان امتیاز ایسے سخت اور قطعی طور پر قائم رکھا گیا جیسے ذاتوں کا فرق قائم رکھا جاتا ہے، اور اُن میں باہمی مناکحت کی ممانعت کر دی گئی۔ بہت شاذ ونادر ایسا ہوتا تھا کہ غیر ملکی کو پورے ملکی حقوق دیئے جاتے ہوں۔ حکمراں نسل کو

نئے خاندان کی شمولیت سے کبھی تقویت نہیں دی جاتی تھی نہ رعایا کو اس امید سے تسلی حاصل ہوتی تھی کہ اُس کے بہترین اخلاف کبھی اپنی ذاتی قابلیت سے سلطنت میں بلند مرتبہ حاصل کر سکیں گے۔ یہ تفرد پسندی اس وجہ سے اور بھی زیادہ عجیب اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل اسپارٹا دیگر اعتبارات سے اپنی نسل کے خالص رکھنے کی چنداں پروا نہیں کرتے تھے۔ اسپارٹا کی وہ عورتیں جن کے شوہر جنگ میں کام آجاتے تھے نیم غلاموں سے ہمبستر ہوتی تھیں تاکہ ان سے جو بچے ہوں وہ اسپارٹا کی قوم میں شامل کر لئے جائیں۔

تعلیم

لیکن تعلیم کا انتظام زیادہ غور و فکر کے ساتھ کیا گیا تھا اور اسی سے نسل کی فوقیت کی تکمیل کی گئی تھی۔ منشا یہ تھا کہ دونوں باتیں بلکہ اہل اسپارٹا کے امتیاز کو محفوظ رکھیں۔ سلطنت کو اپنے نوجوانوں کو سپاہی اور فوجی تعلیم دینے کا اس قدر خیال تھا کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے خاندان کے اتحاد و آزادی کو قربان کر دینے میں بھی دریغ نہیں کرتی تھی۔ اسپارٹا سے زیادہ کسی جگہ انفرادی زندگی اس درجہ سلطنتی زندگی کے تابع نہیں تھی۔ نہ کہیں سلطنت کا اختیار مطلق اس حد تک بڑھا ہوا تھا۔ وہاں انسان کا وجود صرف سلطنت کے لئے سمجھا جاتا تھا۔

داخلی مساوات

خود اپنے حلقے میں تمام اہل اسپارٹا کے حقوق یکساں تھے اور اس اعیانی حکومت میں جمہوری مساوات کو اس درجہ وسعت دی گئی تھی کہ لیکرگس نے اسے اپنے انتظام سلطنت کی بنیاد قرار دیا کہ تمام خاندانوں کی جائدادیں برابر ہو جائیں۔ زمین کی تقسیم کے وقت ہر خاندان کو برابر حصہ دیا گیا تھا اور اس سے علیحدہ ہونے کی ممانعت ہو گئی تھی۔ اس خیال سے کہ لوگ شخصی ملکیت جمع کر کے امیر و غریب کا فرق نہ پیدا کر دیں سونے اور چاندی کا استعمال ممنوع قرار پا گیا تھا۔ وہ نیم غلام جو اہل اسپارٹا کی زمینوں کی کاشت کرتے تھے اشخاص کی ملک نہیں ہوتے تھے بلکہ خود زمین کی طرح سلطنت کی ملک ہوتے تھے اور انہیں جنس کی قسم سے جو معاوضہ ملتا تھا وہ از روئے قانون سب میں برابر تقسیم ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عام کھانا جس میں اہل ملک مختلف دستر خوانوں پر منقسم ہو جاتے تھے وہ سب کے لئے عام اور یکساں ہوتا تھا۔ پس اسطرح اسپارٹا کی اعیانی حکومت والوں میں اہل ایتھنز کی جمہوری حکومت کے مقابلے میں مساوات زیادہ مکمل اور مستحکم تھی۔

تنظیمات ملکی

لیکن حکومت اسپارٹا کا عملدرآمد کسی نوع سے جمہوری نہیں تھا کیونکہ سلطنت

اور قوم دونوں کی افتادِ طبیعت حقیقتاً اُسکے خلاف تھی۔ اسپارٹا میں اِکلیسیا (مجلسِ عام) ضرور موجود تھی مگر اصلی اختیارات سینات کے ہاتھ میں تھے اور بالعموم یہی مجلس تمام امورِ عامہ کا فیصلہ کرتی تھی[1] اہم معاملات میں اسکے فیصلے مجلسِ عام میں پیش ہوتے تھے مگر انکی نسبت صرف منظوری یا نامنظوری کا اظہار ہو سکتا تھا۔ اس آخرالذکر مجلس میں بادشاہ، حکام اور سیناتیوں کے سوا اور کوئی تقریر نہیں کر سکتا تھا اور تیس برس سے کم عمر کا کوئی شخص رائے نہیں دے سکتا تھا۔

سینات

سلطنت کی ترتیب و ترکیب اعلیائی خیال کے موافق منضبط تھی۔ اسپارٹا کے خاندانوں کے نو ہزار سرگروہ تیس حلقوں میں منقسم تھے جنھیں رومی کوریوں[2] سے تشبیہ دے سکتے ہیں، دو شاہی حلقے دو بادشاہوں کو اور باقی اٹھائیس حلقے ایک ایک رکن سینات کو نامزد کرتے تھے۔ یہ سیناتی ایک حد تک بادشاہ کے ہمسر ہوتے تھے۔ پس اسطرح سینات تیس ارکان پر مشتمل تھی اور اس انتظام سے کسی ایک خاندان کی خاص فوقیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی، لیکن اسکے ساتھ ہی تمام خاندان کے مجموعی حقوق اور انکی وقعت قائم رہتی تھی۔ اہلِ اسپارٹا عقل و دانش کی انتہا دلیلِ پیرانہ سری کو سمجھتے تھے اور اُسکا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ بادشاہ کے سوا تمام سیناتیوں کے لئے لازمی تھا کہ انکی عمر ساٹھ برس سے کم نہ ہو۔ عمر کے متعلق حد سے بڑھا ہوا لحاظ نظامِ سلطنت پر ایک دھبا معلوم ہوتا ہے۔ سالخوردگی سے عقل کے ساتھ کمزوری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ سلطنت کے کام چلانیکے لئے صرف بڈھوں کے تجربے ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ جوانوں کی قوتِ کار و جوش کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ انتخاب مجلسِ عام کی رائے سے ہوتا تھا مگر امیدوار اُس مجلس کو پہلے سے اپنا ہم رائے بنا لیتے تھے۔ اس بلند رتبے کے حصول رائے کیلئے بڈھے اشخاص اپنا یہ اعتماد ظاہر کرتے تھے کہ ان میں ابتک اتنی قوت ہے کہ وہ سلطنت کی خدمت عمدگی سے انجام دے سکیں۔ اور وہ اپنی بقیہ زندگی سلطنت کی خدمت کے لئے وقف کرنے پر آمادہ ہیں۔ مجلس کی منظوری

---

[1] اہلِ اسپارٹا کی اکلیسیا وہی اختیار اور اہمیت رکھتی تھی جو ہومر کے زمانے میں قدیم یونان کی قومی جمعیتوں کو حاصل تھے۔

[2] (لاطینی: کوریا (Kuria) جمع کورے (Kuriae) اردو مترجم)

گویا قوم کے عام اعتماد کا اظہار تھی۔ یہ عہدہ عمر بھر کے لئے ہوتا تھا اور اس سے یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ عام لوگ خود غرضانہ جوش میں تغیر و تبدل نہ کرسکیں گے مگر اسکے ساتھ ہی اس میں یہ نقصان بھی تھا کہ باوجود کمزور اور کام سے ناقابل ہوجانیکے لوگ عہدے سے دستکش نہیں ہوتے تھے۔

بادشاہ اور حکام

اسپارٹا کی اعیانی حکومت دو طریقوں پر محدود تھی، ایک طرف سے بادشاہی نے (جس سے سلطنت کی وحدت و عظمت کا اظہار زیادہ شاندار طور پر ہوتا تھا) اُسے محدود کر رکھا تھا دوسری طرف سے تقرر حکام کے جمہوری انتظام نے اُسے محصور کر دیا تھا۔ حکام کا تغیر و تبدل خود رعایا کی طرف سے عمل میں آتا تھا اور بادشاہ اور سینات دونوں کے فرائض کی انجام دہی انھیں کے اختیار میں ہوتی تھی اور معاملات سلطنت میں انھیں وسیع عدالتی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے۔

نظام سلطنت کی حقیقت مصنوعی تھی

اسپارٹا کے اس نظام سلطنت کا اثر دل پر ایک مصنوعی شئے کا سا ہوتا ہے۔ افلاطون کی "ریپلک" کی طرح اسکی ظاہری خوبی اور ہمرنگی سے حسن و جمال کے احساس کو فرحت حاصل ہوتی ہے لیکن باطناً اسکی حالت اس قدر غیر طبعی ہے کہ بحیثیت مجموعی اس سے رغبت کے بجائے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اس عمارت کے نقش و نگار سے طبیعت خوش ہوسکتی ہے مگر اس میں رہنے کی خواہش نہیں پیدا ہوسکتی۔ اگر اہل اتھنز اس الزام کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک منتظم سلطنت کے بجائے ہنگامہ آرا حکومت کو ترجیح دی تو اہل اسپارٹا پر بھی یہ الزام عاید ہوسکتا ہے کہ انھوں سیاسی تنظیم پر انسانی آزادی کو قربان کر دیا۔

اہل اتھنز کے مقابلے میں ان کا طریق زیادہ ممتاز ہے مگر وہ اُس قدر مسرت انگیز اور آرام دہ نہیں ہے۔ ایک میں قابلیت سیاسی کا یکساں توازن قائم کیا گیا ہے، دوسرے میں روشنی اور تاریکی دونوں اپنی اپنی جگہ پر بڑھی ہوئی ہیں۔ ایک ضرورت سے زیادہ ساکن ہے اور دوسرا ضرورت سے زیادہ متحرک۔

اسکا قیام و بقا

قیام کی بقا کے اعتبار سے اسپارٹا کے نظام سلطنت کو بہت فوائد حاصل تھے۔ سولن نے نسل اور دولت کے اعیانی عناصر کے امتزاج سے، جو عمومیت قائم کی تھی اس پر اس مطلق العنانی کو غالب آتے ہوئے دیکھتا رہا اور اس کی روک نہ کرسکا۔

ان مطلق العنانوں کے زوال کے بعد ایتھنز میں خالص عمومیت قائم کی گئی مگر سو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ اُسکی حالت ایسی ابتر ہوگئی کہ کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اس کے برخلاف لکرگس کے نظام سلطنت نے پانچسو برس تک اسپارٹا کی عظمت کو قائم رکھا اور جب اسپارٹا کو زوال ہوا تو اس وجہ سے ہوا کہ نظام سلطنت کے خلاف کیا گیا۔ لوگوں نے دولت جمع کرلی اور دولت سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ اُن میں پیدا ہوگئیں اور حکام نے عوام سے ملکر فریقانہ سازشیں شروع کردیں[1] اس نظام سلطنت کا اتنے دنوں تک قائم رہنا اس وجہ سے اور بھی تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم اسکے ضوابط کو دیکھتے ہیں تو وہ فطرت انسانی اور واقعات حاضرہ دونوں کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن ایک حد تک اس دیرپائی کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُس کے بانی کی نسبت قوم کا یہ خیال تھا کہ وہ زیرے اُس کا مورد عنایت اور خود ایک دیوتا ہے اور اس وجہ سے وہ اس نظام سلطنت کو ربانی قانون کہتے تھے۔

کریٹ کا نظام سلطنت بھی ایسا ہی تھا اور کارتھیج میں اسی طرح اعیانی نظام سلطنت رائج تھا، اور یہ دونوں اپنی مدت قیام کے متعلق فخر کرسکتے ہیں(ب) درحقیقت تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعیانی حکومتیں چونکہ اپنے انتظام میں بقائے سلطنت کو اصل اصول قرار دیتی ہیں، اس وجہ سے وہ اپنے کو اور اپنی سلطنت کو اُس سے زیادہ مدت تک قائم رکھ سکتی ہیں جتنے زمانے تک کہ عمومیات اپنی حکومت کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔

---

[1] لورنٹ اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ اس نظام سلطنت کی یہ عدم تغیر بھی اسپارٹا کی ویرانی کا ایک باعث ہوئی۔

(ب) ارسطو نے "سیاسیات" میں اسپارٹا، کریٹ اور کارتھیج تینوں کے نظامہائے سلطنت پر تنقید کی ہے۔

اٹھارھواں باب

(ب) روما کی اعیانی حکومت

اسپارٹا اور روما کے نظامہائے سلطنت کا مقابلہ

حقیقی اعتبار سے روما کی جمہوری سلطنت بالکل ویسی ہی اعیانی حکومت تھی جیسی اسپارٹا کی حکومت تھی۔ فرق تھا تو یہ کہ روما کی حکومت کا درجہ بلند تھا۔ اہل روما نے سلطنت کے حقوق عام اور افراد و قبایل کی آزادی میں قطعی اور بدیہی امتیاز قائم کر دیا تھا۔ سلطنت کے اقتدار و عظمت کا ایک نمایاں خیال اُنکے دلوں میں مرکوز تھا اور وہ اُسے ترقی دینے کے نہایت درجہ شائق تھے، مگر اُنھوں نے انفرادی زندگی کو سلطنت کے سانچے میں ڈھالنے کے حق کا دعوے کبھی نہیں کیا۔ چنانچہ اُنھوں نے اس مصنوعی تنگ خیالی کو ترک کر دیا تھا کہ کسی قسم کا غیر ملکی جُز اپنے میں داخل نہ ہونے دیں۔ اس تنگ خیالی سے اسپارٹا کی قومی خوبی کا اپنی اصلی حالت پر قائم رہ جانا تو ممکن ہوا مگر اُس نے اُنکو بیرونی دنیا میں اس اہم حیثیت کے قائم رکھنے کے ناقابل بنا دیا جو قسمت سے اُنھیں حاصل ہو گئی تھی۔ اہل روما ابتدا ہی سے اسپارٹا کے ایسے طبقاتی امتیاز کی قید سے آزاد تھے۔ روما میں مختلف طبقات اسطرح سے بےحس و حرکت ایک دوسرے کے آمنے سامنے جمے کھڑے نہیں تھے کہ وہ ایک دوسرے کے کام کو معطل کر دیتے بلکہ وہ اپنی آپس کی کشمکش اور اپنے نوع بہ نوع اثرات سے سیاسی زندگی کے اعلیٰ نشو و نما کا باعث ہوئے۔ اسپارٹا کے مانند روما کا نظام سلطنت بھی انسان ہی کے دست صنعت کا نتیجہ ہے مگر ایک طرف تو وہ انسانی فطرت اور دنیا کی عام حالت سے زیادہ موافقت رکھتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنے اشکال ظاہری کی زیبائش اور اپنے تعلقات باہمی کی عظمت کے لحاظ سے زیادہ ممتاز ہے۔ رومی سلطنت سے پر زور طور پر دل پر اثر پڑتا ہے کہ وہ ایک زندہ شئے ہے۔

رومی سلطنت کی اعیانی خصوصیت امور ذیل سے ظاہر ہوتی ہے

اگر ہم رومی جمہوریہ کی اہم خصوصیتوں پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اُس میں شاہی اور عمومی تنظیمات سے گونہ اعتدال پیدا ہو گیا ہے مگر اُس میں اعیانی خصوصیات ہر قدم پر غالب ہیں۔ یہ خصوصیت امور ذیل سے واضح ہوتی ہے: (۱) طبقات کے

باہمی تعلقات (۲) مجالس قومی (۳) سینات (۴) حکام کے عہدے۔

(۱) طبقات کے باہمی تعلقات

روما کے پٹریسی (اشراف) اہل اسپارٹا کی طرح ایک ہی نسل سے نہیں تھے، بلکہ وہ لاطینی سبینی اور کسی قدر ایٹرسکی نسلوں سے تھے۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے انگریزی امرا میں سکسونی اور نورمانی خون ملا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل تھا جس نے اول ہی سے طبقۂ امرا کی سختی اور مطلق العنانی کو روک دیا ہوگا۔ بعد کو اگرچہ سیاسی طاقت مدت تک انھیں کے ہاتھوں میں رہی مگر عوام کی تنظیم سے اس میں اعتدال پیدا ہوگیا تھا کیونکہ عوام خود ہی اپنے حکام مقرر کرتے تھے۔ ماسوا اسکے اسکا بھی اثر پڑا ہوگا کہ عوام میں سے جن لوگوں نے نیا نیا امارت کا درجہ حاصل کرلیا تھا حکومت میں اُن کی شرکت بڑھتی جاتی تھی۔ انجام کار نئے اور پرانے امرا کے اتحاد سے ایک طبقہ ممتاز اشخاص Optimates کا پیدا ہوگیا، یہ طبقہ کبھی محدود نہیں تھا مگر رومی سلطنت میں اسے سب سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔

جب تک جمہوریت قائم رہی، طبقۂ امرا نے حکومت کی روایات اور معاملات عامہ سے اپنا گہرا تعلق قائم رکھا۔ شرافت نسب، تعلیم، دولت، حکومت، مذہبی اور سیاسی معلومات تمام باتوں میں اس طبقے کو امتیاز حاصل تھا۔ اسکے ساتھ ہی وہ عوام میں سے چیدہ اشخاص کو اپنے میں شامل کرکے نئی طاقت حاصل کرنے سے بھی کبھی نہیں رکا۔ اگرچہ اس طبقے کو اعلیٰ ترین اقتدار حاصل ہوگیا اور وہ اولاً بادشاہوں کا ہمسر اور بعد کو اُن سے فائق ہوگیا مگر جس قوم سے وہ پیدا ہوا تھا اُسکے ساتھ اُس نے ہمیشہ پوری موافقت قائم رکھی۔

سیاسی تعلیم کے متعلق رومیوں کو بھی ویسا ہی خیال تھا جیسا اہل اسپارٹا کو تھا مگر وہ اُسے خاندان کا کام سمجھتے تھے، سلطنت کا کام نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ روما کے سیاسی خیالات میں خاندانی خصوصیات اور مختلف رجحانات پائے جاتے تھے۔ برخلاف اسکے اسپارٹا کی اعیانی حکومت کے اندر ہر شئے یکساں تھی۔ روما کے بیشتر خاندان قدامت پرست (یا مستحفظ) تھے وہ اُسی روش پر قائم رہے مگر اُن میں سے بعضے خاندان آزادانہ اصول کی طرف بھی مائل تھے۔ اس صنف میں امرا کے اندر ویلیری خاندان اور عوام میں ہیلیلی اور سیسنی خاندانوں کے نام لئے جاسکتے ہیں (شاذ مستثنیات کو چھوڑ کر) خاندان کلاڈی کو انگلستان کے فرقہ ٹوری کے مثل سمجھنا چاہئے۔

(۲) قومی مجالس
مجلس قبائلی

روما کی تینوں مجلسوں میں سے سب سے کم عمر مجلس یعنی مجلسِ قبائلی کا انتظام جمہوری تھا، ابتداً ان کا منشا یہ نہیں تھا کہ وہ حکومت میں کسی قسم کا حصہ لیں بلکہ اُنکی غرض صرف یہ تھی کہ عوام کی خواہشوں اور خیالوں کو ظاہر کردیں اور امرا کے زائد از ضرورت اقتدار پر ایک طرح کی روک کا کام دیں، لیکن بعد کو وہ نہ صرف قانون سازی میں شریک ہوگئے بلکہ قانون سازی کے تمام اختیارات کو اُنھوں نے غصب کرلیا، مگر جمہوریت کے آخری زمانے تک میں جب کہ اعیانی حکومت بہت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہی تھی اور بادشاہی کے قائم ہونے کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا اسوقت بھی بہت مستثنیٰ صورتوں میں اور کسی بلند حوصلہ ٹریبون (Tribune) کے اثر سے یہ ہوتا کہ یہ مجلس قبائلی فی الواقع قطعی اختیارات کو عمل میں لاتی ہو۔ عام طور پر عمومیت کی دخل دہی کے رُکے رہنے کا باعث کچھ تو یہ تھا کہ سینات کے وسیع اختیارات کا بہت لحاظ کیا جاتا تھا اور کچھ یہ کہ خود ٹریبون اُس میں روک پیدا کرتے تھے کیونکہ تجاویز کا پیش کرنا ٹریبون ہی کا کام تھا۔ اور دونوں ٹریبونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے کام کو روک سکتا اور اُس میں دقت ڈال سکتا تھا[ب]۔ مجلس قبائلی کا معمولی کام یہ تھا کہ وہ طبقۂ اعیان کی خودسری اور اُنکے ضرورت سے بڑھے ہوئے اختیارات کو روکے۔

مجلس خاندانی
(عشائری)

مجلس خاندانی تمامتر اعیانی حیثیت رکھتی تھی مگر جمہوریت کے آخری زمانے میں اُسکی اصلی اہمیت بالکل زائل ہوگئی تھی اور وہ محض برائے نام قائم تھی۔ وہ درحقیقت قدیم خاندانی امرا کی مجلس تھی اور اسکی ترتیب خاندان پر رکھی گئی تھی اور سینات ابتداً اُنھیں خاندانوں کے سرگروہوں کی ایک کمیٹی (مجلس) تھی۔ عوام میں سے اگر کبھی کوئی شخص اس مجلس خاندانی میں شامل کیا جاتا تھا تو وہ پست تر حیثیت سے داخل ہوتا تھا۔

مجلس صدہ
(سنتوریہ)

ان مجلسوں میں سب سے زیادہ اہم مجلس عام صدہ (سنتوریہ) تھی جس میں تمام قوم یکجا ہوتی تھی لیکن اسکی ترتیب ایسی رکھی گئی تھی کہ اعلیٰ طبقوں کو اس میں قطعی فوقیت حاصل رہتی تھی۔

(ب) (ٹریبون جو ابتداً محض انجمن عوام کا رکن ہوتا تھا، وہ اسطرح پر عملاً سیناتی حکومت کا آلہ کار ہوگیا تاآنکہ گریکون نے اسے اور دوسرے کاموں میں لگا دیا۔ انگریزی مترجم)

(الف) ملکیت کو بہت اہمیت دیجاتی تھی، صرف طبقۂ اول کے (جنمیں سب سے زیادہ محصول دینے والے شامل تھے) اسّی^(۸۰) حلقے ہوتے تھے اور اگر ناٹوں کے اٹھارہ حلقے بھی اُنکے ساتھ شامل ہو جاتے، تو اُنھیں کامل کثرت رائے حاصل ہو جاتی تھی۔ ملکیت کے اعتبار سے رائے دہی کی یہی نسبت باقی چار طبقوں میں بھی تھی، دوسرے طبقے کے چار آدمی تیسرے طبقے کے چھ، چوتھے طبقے کے بارہ اور پانچویں طبقے کے چوبیس آدمیوں کے برابر ہوتے تھے۔ وہ بے شمار اشخاص جو صاحب املاک نہیں تھے اور اُن سے بھی زیادہ تعداد کے (Capitecensi عسہ) ایک سو ترانوے حلقوں میں سے ایک ہی حلقے کے اندر سب شامل کر دیے گئے اور اسطرح انھیں اس مجلس میں بہت کم اثر حاصل تھا جس میں صاحب دولت امرا کا اس قدر غلبہ تھا۔

(ب) شرافت نسب، اور پیشے کے اعزاز کا بھی لحاظ کیا جاتا تھا، چنانچہ ناٹوں کے اٹھارہ حلقے انھیں اصولوں پر قائم ہوئے تھے اور وہ سب سے اعلیٰ واشرف قرار پاکر مجلس میں سب سے اول رکھے گئے تھے۔

(ج) جوانوں کے بہ نسبت بوڑھوں کو رائے دہی کا حق زیادہ حاصل تھا کیونکہ "بزرگوں" کے حلقے میں موت کے طبعی قانون کے باعث "خردوں" کے حلقے کے بہ نسبت نصف تعداد رہ جاتی تھی حالانکہ رائے دینے میں دونوں حلقے برابر تھے۔

(د) اگر ہم طبقات کو نظر انداز کر دیں تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس کی تمام ظاہری حالت عمومیت کے مخالف تھی۔ شگون کا لیا جانا، تمام جماعت کی معینہ فوجی ترتیب، عالی مرتبت حکام کی صدارت، از روئے قاعدہ صرف حکام کو عوام کے مخاطب کرنے اور اُن سے معاملت کرنیکا اختیار، یہ سب ایسے امور تھے جن سے اس مجلس میں ایک شکوہ اور اعتدال پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ کوئی غیر طبعی امر نہیں تھا کہ روما کے باشندے یونان کی مجلس عامہ کی بے ترتیبی اور شور و شغب کو گونہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

۱۳ اسنیات قوم کی اس اعیانی تنظیم کو حقیقی قوانین کے بنانے اور اعلیٰ حکام کے انتخاب کا کام

عسہ "کاپٹے کینسی" کا لفظی ترجمہ ہوگا "سرہائے شمار کردہ"۔ اصطلاح میں روما کے ایسے شہریوں کو کہتے تھے جن میں کوئی خصوصیت نہ تھی اور جنکا محض سرداری شمار کر لیا جایا کرتا تھا ہم انکو "نفر" کہہ سکتے ہیں۔ اردو مترجم)

۳۔ سینات

تفویض تھا۔ سینات اپنی نوعیت اور فرائض کے اعتبار سے روما کی سلطنت میں ایک بہت ہی اہم تنظیم تھی۔ ابتداً اُس میں امیروں کے خاندان کے سرگروہ یعنی رؤسائے ملک شامل تھے اور سینات زیادہ تر خاندانی امرا کی نمایندگی کرتا تھا لیکن بعد میں یہ اُن مدبرین کی مجلس بن گیا جنھوں نے اعلیٰ عہدوں پر اپنی قابلیت کا ثبوت دیا تھا۔ سینات کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ شگون یعنی مقدس روایات کے محفوظ رکھنے کے کام خاندانی امرا ہی کے ہاتھ میں رہے اور اس اعتبار سے اُنکی وقعت بھی قائم رہی مگر زمانۂ مابعد میں اُنکے بجائے عہدہ داروں کا ایک امیرانہ طبقہ قائم ہوگیا۔ روما کے بڑے بڑے حکام کو بادشاہ کا ہمرتبہ سمجھنا بیجا نہ ہوگا اور قدیم زمانے کے لوگ خود اس سینات کو جس میں وہ لوگ شامل ہوتے تھے جنھوں نے اس عہدے کے کام انجام دیے تھے، بادشاہوں کی مجلس کہتے تھے۔ اس سے واضح ہے کہ اس سیاسی طبقۂ اعیان کی وقعت کس درجے پر تھی۔ سابق حکام میں سے ارکان سینات کی فہرست مرتب کرنے اور نا اہل لوگوں کے نام اس فہرست سے خارج کرنیکا معزز کام اخلاق کے نگراں ہونیکی حیثیت سے محتسبوں کے سپرد ہوتا تھا۔ سینات کے ارکان جن عہدوں پر فائز رہ چکے ہوتے تھے انھیں عہدوں کے اعتبار سے اُنکی نشست ہوتی تھی اور اسی اعتبار سے وہ رائے دیتے تھے، چنانچہ قنصل، محتسب، امیر جیش (Practer) میر تعمیر (aedile) خزانہ دار (Quaestor) اپنے اپنے سابق عہدوں کی ترتیب سے مجلس میں بیٹھتے تھے۔ اُنکی کارروائی اُن سخت قیود و ضوابط کے ساتھ عمل میں آتی تھی جو رومی حکومت کی مخصوص صفت تھی۔ مجلس کا افتتاح دعا اور قربانی سے ہوتا تھا، حکام وقت اُسکی کارروائی کے نگراں ہوتے تھے اور وہی تجاویز پیش کرتے اور رائے لیتے تھے اور بحث میں ٹریبون (Tribune) یا حکام دراندازی یا مداخلت نہیں کرسکتے تھے۔

سلطنت کے تمام اہم کام سینات میں یا تو ترتیب دئے جاتے یا فیصل ہوتے تھے۔ دیوتاؤں کی پرستش اور اُنکے لئے قربانیوں اور تہواروں کے مناسک کے قواعد بھی مجلس مرتب کرتی تھی۔ دوسری سلطنتوں اور غیر ملک کے سفیروں سے گفت و شنود کا کام بھی یہی مجلس انجام دیتی اور روما کے تمام اہم سیاسی معاملات کا انتظام کرتی تھی۔ قوانین کے متعلق

اُسکا محاکمہ اور اسکی منظوری بالعموم قطعی ہوتی تھی، انتظامی حد کے اندر خود اُس کے فیصلے قانون کے بجائے سمجھے جاتے تھے۔ وہی تمام مالیات کا انتظام کرتی، محاصل کی منظوری دیتی، اور اخراجات کی نوعیت اور مقدار کا تعین کرتی تھی۔ فوجوں کا اجتماع اور انکی ترتیب اسی کے ہاتھ میں تھی۔ اسی طرح نائب قنصل اور نائب امپریٹر کو (جو صوبوں پر متعین کئے جاتے تھے اور جنھیں صوبے کے کل نظم و نسق کا اختیار دیا جاتا تھا) اختیارات اور ہدایات کا عطا کرنا بھی اسی مجلس کا کام تھا۔ سخت نازک موقعوں پر جمہوریت کو خطرے سے بچانے کے لئے جس قسم کے غیر محدود اختیارات کی ضرورت ہو، سینات وہ اختیارات قنصلوں کو دے سکتا تھا۔

(۴) حکام

اس امر میں بحث کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ روما کے حکام کے عہدے شاہی حیثیت رکھتے تھے یا اعیانی، مگر اس قدر یقینی ہے کہ انکی حیثیت عمومی نہیں تھی وہ جن خارجی رسوم و آداب میں گھرے ہوئے تھے، انھیں سے اُنکی حقیقت عیاں تھی۔ اُنکے چغے کا سرخ کنارہ، اُنکی ہاتھی دانت جڑی ہوئی کرسی، انکے اسیسروں اور دوستوں کا رہنما کارانہ دستہ، اُنکے جلو میں عصابرداروں کا چلنا، دیوتاؤں کے ساتھ انکا تعلق (جن سے اُنکے متعلق تقرر کے وقت شگون بھی لیا جاتا اور بعد میں برابر صلاح ہوتی رہتی تھی) یہ سب باتیں ان کی شاہی اور اعیانی حیثیت کو ظاہر کرتی تھیں۔ حکام کا وسیع اور بجائے خود مطلق العنانی اقتدار قطعی طور پر شاہی حیثیت رکھتا تھا۔ جمہوری حیثیت صرف انکے عہدے کی مختصر میعاد اور انکے اختیار کے دو یا زائد ہم رتبہ حکام میں تقسیم ہونے سے ظاہر ہوتی تھی۔ ایک امیانی اصول جو روما کے نظام سلطنت میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ ہر حاکم کو یہ اختیار ہوتا تھا کہ اپنی نامنظوری کے ذریعے سے اپنے سے برابر یا اپنے سے کمتر درجے کے کسی حاکم کے فعل کو روک دے۔ اس اصول نے اُنکے غیر محدود اختیار کو معتدل کردیا تھا مگر جب سلطنت کے نفع و ضرر کے لئے کسی اختیار پر عمل کرنے کی حاجت ہوتی تو اس قاعدے سے اس عمل میں کوئی کمزوری نہیں واقع ہوتی تھی۔

حکام کا انتخاب تمام قوم کی طرف سے ہوتا تھا، مگر زیادہ اعلےٰ عہدوں کے انتخاب مجلس عمدہ (سنتوریہ) کے لئے محفوظ تھے اور اُس مجلس میں صاحب دولت امرا کا غلبہ تھا۔ اسکا انتظام حکام کے ہاتھ میں تھا اور شگونوں نے اُسے محدود کردیا تھا۔

علاوہ اسکے اُس انتخاب میں صرف وہی لوگ لئے جاتے تھے جنکا تعلق قومی طبقۂ اعیانی سے ہوتا تھا اور اُسکی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ کسی ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس سے انھیں شہرت عام، طرفداروں کا وسیع گروہ، اور عام مرجوعہ حاصل ہوجاتا تھا! یہ وجہ تھی کہ انکی دولت بہت زیادہ تھی جس سے یہ لوگ اپنے صرف سے عام کھیل تماشے قائم کرکے عوام میں اثر پیدا کرلیتے تھے یا اسکی وجہ یہ ہوتی تھی کہ کامیاب سپہ سالار یا فصیح البیان مقرر ہونیکی حیثیت سے اُنکو شہرت وعزت حاصل ہوجاتی تھی۔ جب اعلیٰ حکام کے عہدوں کے دروازے عوام کے لئے بھی کھل گئے تو پھر اس میں اعلیٰ خاندان امرا کی کوئی قید نہیں رہی لیکن شاذونادر مستثنیات کے سوا عملاً یہ عہدے اس وسیع سیاسی و معاشری طبقۂ اعیان ہی میں محدود رہتے تھے جس نے اب خاندانی طبقۂ اعیان کی جگہ لیلی تھی۔ ماسوا اسکے سنیات بھی اُنھیں لوگوں سے مرتب ہوتی تھی جو اس عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔

اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اپنے شاہی اور عمومی اجزا کے باوجود روما کی جمہوریت حقیقتاً اعیانی حکومت تھی اور ازمنۂ وسطیٰ کی طرح سے یہ کسی خاص خاندان یا کسی خاص طبقے کی حکومت نہیں تھی بلکہ ایک قومی اعیانی حکومت تھی جسکی عظمت وقوت کا مثل دنیا میں نہیں ہوا ہے۔

انیسواں باب

(ج) اعیانی حکومت پر بعض خیالات

حکومت اعیانی کا اصل الاصول

مونٹسکیو(الف) نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اعیانی حکومت کا اصول اعتدال ہے اور یہ صحیح ہے کہ اُسکی پائداری کے لئے اعتدال کی ضرورت ہے کیونکہ غور کرنے سے عیاں ہوجاتا ہے کہ رعایا کا گروہِ کثیر اپنی تعداد اور جسمانی قوت میں حکمراں جماعت سے بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ عمومی حکومت میں یہ خیال ہوتا ہے کہ اُسکے اختیار پر کوئی خارجی روک نہیں ہے اور اس وجہ سے اُس میں اپنے اختیار کے غیر معتدل استعمال کی تحریک پیدا ہوجاتی ہے لیکن اعیانی حکومت کے لئے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ مخالفت اور انحراف کے خطرے سے آزاد ہوجائے اور اس لئے بالعموم اُسے یہ علم رہتا ہے کہ اعتدال کے بغیر اسکی حالت غیر محفوظ رہیگی لہذا اسکی حکمت علی علی العموم مستعففانہ ہوتی ہے۔

لیکن اس سے اعیانی حکومت کا اصل اصول نہیں ظاہر ہوتا، درحقیقت اعتدال کے بجائے اسکا اصل الاصول حکمراں طبقے کی اخلاقی اور ذہنی قوت کی فوقیت ہے۔ صحیح معنی میں وہ حکومت، اعیانی حکومت نہیں ہے جس میں واقعی بہترین افراد حکمراں نہ ہوں[1]۔ جب حکمراں جماعت کے وہ اوصاف جن کے باعث انھیں یہ اقتدار حاصل ہوا تھا، متبدل ہوجاتے ہیں ان کے اخلاق پست ہوجاتے ہیں اور ان میں کمزوری اور رکاکت آجاتی ہے تو اعیانی حکومت کی اصلی طاقت زایل ہوجاتی ہے۔ اُس صورت میں بھی اُسے زوال ہوجاتا ہے جب اُن حکمرانوں کے اعلی طبقات تو علی حالہا باقی رہیں مگر نیچے کے طبقات بھی ویسا ہی امتیاز حاصل کرلیں اور قدیم

(الف) "روح القوانین" (De L'Esprit des Lois) جلد سوم باب چہارم۔

[1] مونٹسکیو کا یہ دعویٰ کہ نیکوکاری عمومیت کا اصول ہے (تصنیف مذکورۂ بالا جلد ۳ باب ۳) اُتنا قرین صحت نہیں ہے جتنا کہ ارسطو کا یہ مقولہ کہ "اعیانیت کا اصول نیکوکاری ہے اور عمومیت کا اصول آزادی" ("سیاسیات" ۴ : ۸ ف ۷)؛ مگر تاریخی حقائق اور فلسفیوں کے تخیلات میں وجہ اشتراک بہت کم ہوا کرتی ہے۔

طبقۂ اعیان اپنی غفلت یا نخوت کے باعث نیچے طبقے کے لوگوں کو اپنے میں شامل کر کے اپنی قوت کو مکمل و مضبوط نہ کرے۔ روما کے طبقۂ اعیان کے حصول عظمت اور انگلستان کے طبقۂ اعیان کے اثر و رفعت کی بقا کا باعث یہی ہے کہ یہ دونوں طبقے قومی زندگی کے دوش بدوش چلتے رہے اور نیچے طبقے کے لوگوں کو اپنے میں شامل کر کے نئی قوت حاصل کرتے رہے۔

اسکی تفرد پسندی اکثر مہلک ثابت ہوتی ہے

ہر ایک اعیانی حکومت کی سخت ترین غلطی اُسکی تفرد پسندی ہے، حکمراں طبقے کے امتیازات کی بنا اُسکے اوصاف پر ہوتی ہے مگر حصول حکومت کیلئے موروثی جانشینی کی حمایت میں وہ اکثر ذاتی اوصاف کو بالکل نظر انداز کر جاتا ہے، اس قسم کی محدود اعیانی حکومت ایک چھوٹے سے طبقے کے اندر قائم رہ سکتی ہے مگر جب اُس کے تعلقات میں وسعت ہوتی ہے تو وہ اپنے کام کی انجام دہی کے ناقابل ہو جاتی ہے۔ اسپارٹا اور وینس نے جب اپنی فتوحات کو پھیلا دیا تو وہ کمزور ہو گئے۔ اسپارٹا کے خاص باشندوں اور وینس کے امرا دونوں میں سے کسی کی تعداد اور قوت اس درجے پر نہیں تھی کہ وہ وسیع ممالک پر حکومت کر سکیں اور باقی لوگ چونکہ سیاسی زندگی سے خارج تھے اور انکا کوئی اثر نہیں تھا اس لئے اُنکی جانب سے امداد بہت کمزور ہوتی تھی اسیطرح برن کی اعیانی حکومت بھی تباہ ہوئی۔ اسکے امرا کی حالت میں فی نفسہ کوئی ایسا تنزل نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ اُس کی بربادی کی وجہ یہ ہوئی کہ اُس نے شہر اور ملک کے ممتاز افراد کو اپنے میں شامل نہیں کیا۔

اعیانی حکومت کی مختلف صورتیں

ہر ایک اعیانی حکومت کی بنا امتیازی صفات پر ہوتی ہے مگر کسی مخصوص صفت کا انتخاب قوم کی محض طبیعت اور حالت سے تعلق رکھتا ہے، اگر اُسکا انحصار نسب پر ہے تو اُس سے ایک خاندانی طبقۂ اعیان پیدا ہو جاتا ہے اور اس میں نظام سلطنت پر خاندانوں یا طبقوں کے حقوق کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ از منۂ وسطیٰ میں ایسا بہت ہوتا تھا۔ تربیت و تعلیم کو مرجح رکھنے سے قسیسوں یا عالموں کی حکومت اعیانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر حکمران کیلئے عمر کی شرط ہوتی ہے تو اُس سے معمرین یا شیوخ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے، اگر فوجی امتیاز کا لحاظ ہوتا ہے تو سپہگروں کی حکومت برپا ہو جاتی ہے، اگر جائداد منقولہ یا غیر منقولہ کا خیال کیا جاتا ہے تو زمینداروں یا سرمایہ داروں کی حکومت ہویدا ہو جاتی ہے جسے اہل ثروت

کی حکومت کہنا چاہئے اور جیسے سیسرو حکومت کی تمام صورتوں میں سب سے زیادہ
قابلِ نفرت قرار دیتا ہے۔ ممتاز اشخاص (Optimate) کی حکومت ایک نمایاں حیثیت
رکھتی ہے کیونکہ اس میں متعدد خاندان اور اشخاص شامل ہوتے ہیں۔ سیاسی لیاقت کی
بنا پر عہدہ داروں کی حکومتِ اعیانی ہی قائم ہو سکتی ہے مگر جیسا کہ ازمنۂ سلف میں ہوا
اُس حالت کو زیادہ بقا نہیں ہوتی۔ یہ رفتہ رفتہ موروثی بن جاتی ہے اور بتدریج خاندانی حیثیت
اختیار کر لیتی ہے۔ ایسا بھی اکثر ہوتا ہے کہ اس حکومتِ اعیانی کے لئے مختلف صفات کی
ضرورت سمجھی جاتی ہے اور یہ اُس حکومت کے مقابلے میں زیادہ قوی ہوتی ہے جس میں
صرف ایک صفت کی حاجت ہوتی ہے کیونکہ آخر الذکر کو اُن تمام جماعات و اشخاص
کی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جن میں اعیانی حیثیت کے لئے کوئی نہ کوئی فطری
استحقاق موجود ہوتا ہے۔

نظام حکومت اعیانی ظاہری شان و شوکت

اعیانی حکومت کو یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ اپنے فوائد کو نمایاں کرے اس لئے
وہ سلطنت کی ظاہری شان و شوکت اور علوئے مرتبت کے اظہار کی خواہاں رہتی ہے
یہ ممکن ہے کہ وہ رعایا کی طرف سے دلی محبت کا خیال ترک کر دے تاہم اپنی وقعت کے
ترک کئے جانے کی روادار نہیں ہو سکتی، پس وہ ظاہری شان و شوکت کے اظہار سے
یہ اثر پیدا کرنا چاہتی ہے کہ اُسکے سیاسی اشکال کو امتیاز حاصل ہو جائے اور اسکا
اقتدار قوی ہو جائے۔ عمومیت کے مقابلے میں اعیانی حکومت کی یہ ایک نمایاں فوقیت
ہے، کیونکہ عمومیت میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ حکام اور سلطنت دونوں پست ہو کر عام سطح پر آجاتے ہیں۔

حکمراں کی سختی

لیکن اس فائدے کے ساتھ ہی یہ خطرہ بھی لگا ہوا ہے کہ مبادا حکمراں طبقات
اپنی منزلت کا اندازہ کرنے میں حد اعتدال سے بڑھ جائیں اور رعایا کے سود و بہبود کی طرف
بہ قدرِ ضرورت توجہ نہ کریں۔ اعیانی حکومت نے اکثر نیچے طبقے والوں کے ساتھ
درشت اور ظالمانہ برتاؤ کیا ہے اور یہ برتاؤ اس وجہ سے اور بھی ناقابلِ برداشت
ہو جاتا ہے کہ اُس میں ظلم و ستم کے ساتھ تحقیر بھی شامل ہوتی ہے۔ اہل اسپارٹا نے
اپنے نیم غلاموں کے ساتھ جو برتاؤ کیا اور روما کے امرا نے جتنے عوام کے قرضداروں پر
جو مظالم کئے۔ انگریز زمینداروں نے آئرلینڈ کے کاشتکاروں پر جو ستم توڑے اور
انگریزی حکام نے ہندوستان کے باشندوں اور جمیکا کے حبشیوں پر جیسی بے رحمانہ جباری

وثیقہ داری سے حکمرانی کی وہ سب اس بیان کے شاہد عادل ہیں۔

(۳) حد سے زیادہ سختی

جس طرح عمومیت بالعموم زاید از ضرورت متلون اور تغیر پذیر ہوتی ہے، اسی طرح اعیانی حکومت احد سے زیادہ اٹل اور لکیر کی فقیر ہوتی ہے۔ عمومیت یہ سمجھکر کہ اسکی طاقت کی کوئی حد نہیں ہے اکثر اپنے قیام و دوام کے ضروری شرائط کو فراموش کردیتی ہے، اعیانی حکومت چونکہ اپنے قیام کی فکر سے غافل نہیں ہوتی اس لئے وہ اکثر اس غلط خیال میں پڑ جاتی ہے کہ اسکا بہترین وسیلہ قدیم طریقوں پر مضبوطی سے جما رہنا اور ہر قسم کے تغیر کو سختی کے ساتھ خارج کرتے رہنا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عمومیت کی بہ نسبت اعیانی حکومت نے طریق استحفاظ کی قابلیت کا زیادہ اظہار کیا ہے اور اسکی مدت قیام نسبتاً زیادہ رہی ہے۔ وہ بیباکانہ سیاسی تجربوں سے بچتی رہتی، پھونک پھونک کر احتیاط سے قدم رکھتی اور جب اسکو کوئی واقعی خطرہ پیش آتا ہے اسی وقت یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قطعی قوت کا اظہار کرتی اور کچھ دیر کیلئے شاہی کی خصوصیات اختیار کرلیتی ہے۔ اگر حد کے اندر رہے تو یہ ایک عمدہ صفت ہے اور نتیجہ ہے حفاظت ذاتی کے طبعی احساس کا لیکن یہی صفت جب تجاوز کرجائے تو وہ ایک غلطی بنجاتی ہے۔

(۴) موروثیت سے بے انتہا وابستگی

اس استحفاظی خیال کا اظہار اس طرح بھی ہوتا ہے کہ حکومت کی تمام تنظیمات میں موروثیت کو اصل الاصول بنا دینے کا طبعی میلان پیدا ہو جاتا ہے، ازمنۂ وسطیٰ میں، جب کہ تمام یورپ پر اعیانی رنگ چڑھا ہوا تھا، یہ میلان خصوصیت کے ساتھ نمایاں نظر آتا ہے۔ خاندان ہوہن اشٹاوفن کے زوال کے بعد جرمانی شہنشاہی تک حقیقتاً اس اعیانی رنگ میں آگئی حالانکہ ابتداءً اسکی بنیاد شاہی کے خیال پر ہوئی تھی[1] خود منصب شہنشاہی تو

---

[1] یہ امر فرانسیسی مصنف بودین کو اچھی طرح معلوم تھا اور اُس نے اسکی تشریح بھی کی ہے مگر اسکے بعد سے جرمانی مورخین نے یہی بہتر سمجھا کہ اُسے فراموش کردیں۔ (دیکھو مصنف مذکور کی تصنیف "جمہوریہ"، جلد ۲ باب ۶) فلپ کیم نتس نے اپنے تجاویز اصلاح کی بنا اس خیال پر رکھی ہے کہ جرمانیا ایک اعیانی سلطنت ہے۔ پفندورف نے شہنشاہی کو بادشاہی اور اعیانی طریقوں سے مخلوط قرار دیا ہے مگر اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ اعیانی حکومت کا میلان غالب ہے (اب کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کرتا کہ خاندان ہوہن اشٹاوفن کے زوال کے بعد سے شہنشاہی نے اعیانی حیثیت اختیار کرلی تھی اور بادشاہ محض نمائش کے لئے تھا۔ انھیں دلائل سے بلنچلی کو یہ بھی یقین کرلینا چاہئے تھا کہ انگلستان کی بادشاہت بھی محض نمایشی ہے۔ انگریزی مترجم۔)

موروثی نہیں ہوا مگر اُسکا انتخاب موروثی انتخاب کنندوں کے ذریعے سے ہونے لگا۔ شہنشاہ کا رتبہ اگرچہ نہایت بلند تھا مگر اُسے اختیار برائے نام ہی تھا۔ کسی اہم امر کا فیصلہ کرنیکے قبل اُسے ڈائٹ سے مشورہ لینا ضروری تھا۔ انتخابی حلقے تمام قوانین تیار کرتے تھے اور سب سے اول ڈائٹ میں وہی رائے دیتے تھے۔ دوسرے درجے میں رائے دہی کا حق اُن حکمرانوں کو حاصل تھا جو ابتدائے سلطنت کے عہدہ دار تھے مگر کسی نہ کسی طرح سے اُنھوں نے اپنے کو موروثی رئیس بنا لیا تھا۔ حکمرانوں کے بعد شہنشاہی شہروں کا درجہ تھا مگر ان شہروں کی حکومت بالعموم چند قابو یافتہ امیروں کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور اس طرح ان شہروں کی نیابت درحقیقت اعیانی نوعیت کی تھی۔ حکومت کا کام شہنشاہ اور ڈائٹ ملکر انجام دیتے تھے۔ صاحب جائداد امرا کی جاگیری خود مختاری سے مرکزی حکومت کو دقت اور پریشانی کا سامنا رہتا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے تمام سیاسی اور مذہبی تعلقات میں موروثی جانشینی کی جانب اعیانی میلان ظاہر و باہر ہے۔ ہر شئے اُسی کے اثر میں تھی۔ جاگیر، شہنشاہی عہدے اور اعزاز، تمام عدالتی اختیارات (جس میں کاونٹ، بیلف تحصل شاہی، صاحب جائداد امرا اور مقامی اسٹیٹ داخل تھے)۔ سپہگری اور درباری خدمات شہروں اور دیہاتوں کے ادنیٰ و اعلیٰ ملازمین اور کاشتکاروں کے جاگیردارانہ قبضے سب کے سب اسی موروثیت کے زیر اثر تھے۔

برخلاف اسکے زمانۂ جدید میں موروثیت سے بحیثیت سیاسی اصول کے قطعی نفرت پائی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے مگر اُن کا انتہا تک پہنچانا بھی غلطی ہے ہمارے اس زمانے میں جدید ترقی اور نئی ضروریات کی تکمیل میں موروثیت کے سخت اصول سے جو رکاوٹیں پیش آئی ہیں، اُنکے خلاف کوشش کرنا بالکل بجا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ شخصی قابلیت کے بے روک ٹوک تسلیم کیے جانیکا وعدہ کیا جائے اور اس امر پر زور دیا جائے کہ جن سیاسی عہدوں کیلئے شخصی قابلیت اور اطاعت تام درکار ہے وہ موروثی قواعد کے تابع نہ کئے جائیں۔ نہ انھیں خاص خاص خاندانوں کی ملک سمجھنا چاہیے لیکن یہ ایک غلطی ہے کہ موروثی جانشینی سے ماضی و حال میں جو تعلق قائم ہے وہ توڑ دیا جائے۔ یہ بھی غلطی ہے کہ جہاں مستحکم روایات کے برقرار رکھنے کی ضرورت ہوا وہاں لاحاصل اور بکثرت تغیر و تبدل کیا جائے یا بے ضرورت وہ حالات بدل دئے جائیں جو سلطنت کے لئے مضبوط ستونوں کا کام دیتے ہیں اور جو زبردست اخلاقی مقاصد اور طاقتوں کو مستقبل کی طرف

منتقل کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا درحقیقت ریت پر عمارت بنانا ہے۔ یہ قوم و سلطنت دونوں کی زندگی کو تباہ کرنا ہے کیونکہ انکی زندگی ہر نسل کے ساتھ بدلتی نہیں رہتی بلکہ صدیوں تک مسلسل چلی جاتی ہے[1]

---

[1] احیائیت پسند انگلستان میں ابتک سیاسی موروثیت کی اہمیت پوری طرح مسلم ہے۔ برک کے "خیالات در بارۂ انقلاب فرانس" **Refiection on the Reus lutim in franee** میں اُسکی رائے دیکھنا چاہئے۔ وہ لکھتا ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ "منشور اعظم" کے وقت سے "اعلان حقوق" کے وقت تک ہمارے نظام سلطنت کی یکساں روش یہ رہی ہے کہ ہماری آزادی کے حق اور دعوے کو اس اصول پر پیش کرے کہ وہ ہمارے آبا و اجداد سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں اور ہم اپنے اخلاف کے لئے انھیں چھوڑ جائیں گے گویا یہ آزادی اس سلطنت کے باشندوں کا خاص حق ہے اور اسے دوسرے زیادہ عام یا سابقہ حق سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ہمارے وہاں بادشاہت موروثی ہے، امارت موروثی ہے، دارالعوام اور قوم کے امتیازات حقوق رائے وہی سب مدت ہائے دراز سے بزرگوں سے وراثتاً چلے آرہے ہیں۔ اس میں جدت وہی لوگ نکالتے ہیں جن کی کوئی ذاتی غرض ہوتی ہے یا وہ تنگ خیال ہوتے ہیں۔ جو لوگ پیچھے مڑ کر اسلاف پر نظر نہیں کرتے وہ اپنے اخلاف کا بھی خیال نہ کریں گے۔ علاوہ اسکے انگلستان کے لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ موروثیت کے خیال میں استحفاظ و انتقال دونوں مضمر ہیں اور اسکے ساتھ ہی ارتقا کا اصول اس سے خارج نہیں ہے۔ اس میں نئی چیزوں کے حاصل کرنیکی کامل آزادی ہے گر جو کچھ حاصل ہو جائے اُسے وہ محفوظ کر لیتا ہے۔ ہمارا سیاسی نظام دنیا کی ترتیب اور بقائے عالم کے طریق سے بالکل متحد و متفق ہے اور وہ ایک دائمی شئے ہے جسکے اجزائے متفرقہ بدلتے رہتے ہیں مگر اسکی ہیئت مجموعی بحال رہتی ہے۔ اُس میں نہایت دانائی کے ساتھ نسل انسانی کے پُراسرار اصول قائم کر دیئے گئے ہیں جس سے وہ بحیثیت مجموعی کسی ایک وقت میں نہ بڈھا ہوتا ہے نہ ادھیڑ نہ جوان، مگر اس میں انحطاط، زوال، تجدید اور ترقی کا ایک دائمی سلسلہ جاری رہتا ہے پس اس طرح سلطنت میں فطرت کے اصول کو قائم رکھنے سے ہم جس امر کو ترقی دیتے ہیں وہ بالکل نیا نہیں ہوتا اور جس چیز کو قائم رکھتے ہیں وہ بالکل از کار رفتہ نہیں ہو سکتی۔ موروثی طریق کے پسند کرنیکے باعث ہم نے اپنے نظام سلطنت میں خون کا سا تعلق پیدا کر دیا اور اپنے ملک کے نظام سلطنت کو اپنے عزیز ترین خانگی روابط سے وابستہ کر دیا ہے اپنے سیاسی قوانین سے ہمیں اپنے اہل خاندان کی سی محبت ہوگئی ہے ہم اپنی سلطنت، اپنے گھر، اپنے مقبرے اور اپنی عبادتگاہ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھتے یکساں جوش دل کے ساتھ سب پر نظر کرتے ہیں اور ایک کی خوبیوں کا عکس دوسرے پر پڑتا ہے۔"

(۵) قانون کا احترام

اعیانی حکومت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے قیام کی حفاظت کے خیال سے خارجی نظم و ترتیب کو برقرار رکھے۔ اس خیال سے وہ قانون کی محافظت اور قانونی صورتوں کو ٹھیک ٹھیک قائم رکھنے کی بھی کوشش کرتی ہے۔ جب تک کہ اپنی ہستی کے معرض خطر میں ہونے سے اُسے کوئی اشتعال نہ ہو جائے، اُس وقت تک اعیانی حکومت بجا طور پر یہ فخر کرسکتی ہے کہ اُس نے روایا اور خود اپنے ارکان دونوں کے معاملے میں عمومی حکومت کی بہ نسبت زیادہ معدلت گستری سے کام لیا ہے۔ اسے محض اتفاقی امر نہیں کہہ سکتے کہ علم قانون کا نشو و نما سب سے زیادہ ایک ایسی قوم کے ہاتھ سے ہوا جو اعیانی حکومت کی اس قدر دلدادہ تھی، یعنی رومیوں کے ہاتھ سے۔ قانون کی ترقی کے لئے اہل وینس نے جو سخت گر غیر جانبدارانہ طریقہ اختیار کیا وہ بھی تعریف کے قابل ہے۔ یہی حال برن کے قانون کا تھا اور انگریزوں میں پاس قانون کا جیسا زبردست احساس موجود ہے وہ ظاہر ہے اور یہ قوم بھی اعیانی حکومت کی پسند کرنیوالی ہے، ازمنۂ وسطیٰ میں خود سلطنت کی حکمت عملی تک کو قانونی فیصلے اور اسکی تعمیل کی ظاہری حیثیت دیجاتی تھی۔

اعیانی حکومت کا زوال

زمانۂ حال کے خیالات، سلطنت کے اعیانی حیثیت کے اس قدر خلاف ہیں کہ انیسویں صدی، کے وسط سے پہلے ہی اعیانی سلطنت کی کوئی مثال باقی نہیں رہ سکی۔ قدیم روما کی اعیانی حکومت اولاً عمومیت کے عروج سے شکست ہوئی اور اُسکے بعد جاکر شہنشاہی نے اُسے پامال کیا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں اٹالیا اور جرمانیا کی اعیانی حکومتیں والیان ملک کی ترقی پذیر طاقتوں کے سامنے پست ہوئیں اور آخرالامر اہل شہر کی مخالفت نے انہیں غارت کردیا۔ اسلئے اب اس زمانے میں اعیانی طبقات کو قوم کے ایک ممیز فرد کی حیثیت سے درمیانی درجہ حاصل ہے، شاہی اقتدار نہیں حاصل ہے۔ ہر جگہ یہ طبقات شاہی یا عمومیت کے تابع ہیں اور اگرچہ طبقات شاہی میں اعتدال اور عمومیت میں رفعت و خودداری پیدا کرسکتے ہیں مگر وہ سلطنت میں خود حکومت کا دعوےٰ نہیں کرسکتے۔

بیسواں باب

سلطنت کی عمومی صورتیں

(الف) عمومیت بلا واسطہ (قدیمی عمومیت)

تدنیہ و جدیدہ عمومیت کا فرق

عمومیت کی نسبت زمانۂ قدیم اور زمانۂ حال کے خیالات میں بہت بڑا فرق ہے، زمانۂ قدیم میں اسکے معنی عوام یا آزاد اور مساوی الحقوق باشندگان شہر کی حکمرانی کے تھے۔ قدما میں لوگ دنیاوی امور کی ابتدا سلطنت سے کرتے تھے اور سیاسی حکمرانی کو سب میں برابر تقسیم کرکے آزادی کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ اب اس زمانے کے لوگ شخصی آزادی سے ابتدا کرنے کی کوشش یہ کرتے ہیں کہ حتی الوسع اپنی ذاتی آزادی سلطنت کے حوالے نہ کریں، تا حد امکان سلطنت کی اطاعت کم کریں۔ قدیم عمومیت خواہ قطعی ہو یا اسکی حالت میں کچھ اعتدال پیدا کردیا گیا ہو مگر ہر حال میں وہ بلا واسطہ ہوتی تھی۔ موجودہ زمانے کی عمومیت بالعموم نیابتی ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اول الذکر کا قیام صرف ایک چھوٹی سی سلطنت میں ممکن ہے، برخلاف اسکے ثانی الذکر ایک بڑی قوم اور اُسکے وسیع ممالک میں بھی رائج ہو سکتی ہے۔

یونان کی عمومیت

اہل یونان چونکہ متعدد چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں منقسم تھے، اس لئے انھوں نے اپنے سیاسی ذوق کا اطمینان اسی میں دیکھا کہ اپنے وہاں عمومیت قائم کریں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یونان کی قدیم بادشاہتوں اور نام نہاد اعیانی حکومتوں میں بھی کچھ نہ کچھ عمومیت کا اثر پایا جاتا ہے اور موجودہ زمانے کی شاہی اور روما کی اعیانی حکومت کے مقابلے میں اُنکا مابہ الامتیاز یہی تھا۔ اور یہ بھی خیال رکھنے کی بات ہے کہ یونان کے بڑے بڑے فلسفی ایتھنز کی قطعی عمومیت کو ناپسند کرتے تھے[1] مگر وہ سلطنت کی بہترین صورت معتدل عمومیت ہی کو سمجھتے تھے اور اُسے آئینی حکومت کہتے تھے۔

---

[1] اس رائے میں زنوفون، افلاطون، اور ارسطو سب متفق ہیں۔

ایتھنز کا نظام سلطنت

عمومیت کے انتہائی رنگ کا جلوہ ایتھنز میں نظر آیا اور ایتھنز کے نظام سلطنت سے بہتر اسکی حقیقت کا پتہ کہیں اور نہیں چل سکتا۔ کسی اور سلطنت میں قوم کی حکومت کو یہ وسعت نہیں حاصل تھی۔ قریب قریب تمام اہم معاملات اکلیسیا (مجلس عام) کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اُسکے اجلاس بہت کثرت سے ہوتے تھے۔ اکثر ہفتے میں ایک مرتبہ اُسکا انعقاد ہوا کرتا تھا اگر ہم یہ خیال نہ رکھیں کہ معمولی کاروبار اور پیشے کے کام آزاد اہل شہر نہیں انجام دیتے تھے بلکہ بیشمار غلاموں سے کام لئے جاتے تھے تو بادی النظر میں یہ ناممکن معلوم ہوگا کہ مجلس عام کے اجلاس اس کثرت سے ہوتے ہوں۔

اکلیسیا (مجلس عام)

مختلف النوع عوام کی ظاہری نمایندگی اکلیسیا (مجلس عام) میں ہوتی تھی اُس میں بیس برس سے زائد عمر کے تمام شہری شریک ہوتے تھے۔ صرف وہ لوگ اُس سے خارج تھے جو کسی وجہ سے اپنے ملکی حقوق کھو بیٹھتے تھے۔ اس مجلس میں اہل ایتھنز اپنے کو سلطنت کا مالک سمجھتے تھے۔ ہر فرد مجموعی اقتدار اعلیٰ کا ایک جزو ہوتا تھا۔ عمومیت کی اس مخصوص علامت نے کہ کثرت رائے فرمانروائی کرے اور ہر شہری کا حصہ اقتدار اعلیٰ میں ہو یہاں پوری ترقی حاصل کرلی تھی۔ ہر شخص کو تقریر کرنیکا آزادانہ حق حاصل تھا، اور سولون کے وقت میں کسی کے جو امتیازات قائم کئے گئے تھے وہ بھی دوسرے قیود کے مانند بار سمجھکر خارج کردئے گئے تھے۔ مقرروں کو اپنا زور فصاحت دکھانیکے لئے پورا موقع حاصل تھا اور اکثر اس سے سحر کا سا اثر پیدا ہوجاتا تھا۔ یہ بڑی ہی خوش قسمتی تھی کہ پیری کلیس کے سے جلیل القدر مدبر اہل رائے ہونیکے ساتھ زباں آور بھی تھے۔ زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ چالاک اور حریص لفاظ، عوام کے جذبات کو بھڑکاکر اُن پر قابو حاصل کرلیتے تھے۔ زمانۂ موجودہ کی سلطنتوں میں فصاحت کا وہ اثر نہیں ہے جو اُس زمانے میں تھا۔ اُس وقت سامعین سب ایک جگہ جمع ہوتے تھے اور اُن پر جس زور کا اثر پڑسکتا تھا وہ اخباروں کے ذریعہ سے منتشر پڑھنے والوں پر نہیں پڑتا۔ مقرر کی آواز اور اسکے انداز بیان سے بھی اُسکے لفظوں میں خاص مفہوم اور زور آجاتا تھا اور سامعین کی تحسین و آفرین سے مباحثے میں ایک زبردست حرکت پیدا ہوجاتی تھی۔ ہمارے زمانے میں پارلیمنٹ کی تقریروں کا یہ اثر نہیں ہوتا جسکی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ مجلس نسبتاً چھوٹی اور منتخب ہوتی ہیں اور کچھ یہ کہ اُنکے اختیار زیادہ محدود ہیں۔

اسکے اختیارات

"اکلیسیا" کے اختیارات سلطنت پر از سرتا پا محیط تھے۔ سولون نے ان اختیارات کو

حکام کے انتخاب، حکومت کی نگرانی اور قوانین کے متعلق مشورہ دینے تک محدود رکھا تھا
مگر مقرروں کے اثر میں آکر عوام بہت جلد ان حدود سے تجاوز کر گئے۔ عام قوم کے فیصلے
ایک مطلق العنان بادشاہ کے فیصلے کی طرح قطعی ہوتے تھے۔ خودمختار بادشاہ کی طرح عوام بھی
جو چاہتے تھے حکم دیدیتے تھے، چاہے وہ قانون کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ قانون کا
بنانا درحقیقت مجلس مقننین سے تعلق رکھتا تھا مگر عملاً قوانین کا آخری تصفیہ اکلیسیا ہی کے
مباحثوں اور رایوں سے ہوتا تھا۔ حقیقت میں مجلس مقننین اُن بے شمار مجلسوں میں سے ایک
مجلس تھی جو ہر خاص موقع کے لئے منتخب ہو جایا کرتی تھی۔ مجلس عام خود ہی حکومت کے تمام
اہم معاملات کا فیصلہ کرتی تھی۔ وہی سفرا کا تقرر کرتی اور انھیں ہدایات دیتی تھی۔ وہی غیرملک
کے ایلچیوں کے بیانات سنتی اور جنگ و صلح کا تصفیہ کرتی۔ وہی سپہ سالاروں کا انتخاب
کرتی اور سپاہیوں کی تنخواہوں کا تعین کرتی حتیٰ کہ یہ بھی پہلے سے قرار دیدیا کرتی تھی کہ جنگ کا
کیا اسلوب اختیار کیا جاوے۔ مفتوح شہروں اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ اُسی کے ہاتھ میں
ہوتا تھا۔ نئے دیوتاؤں کا قبول کرنا مذہبی تہواروں اور نئے کاہنوں کا انتظام کرنا شہریت کے
حقوق و امتیازات کا عطا کرنا سب اُسی کے ہاتھ میں تھا، ہر پینتیسویں[۳۵] یا چھتیسویں[۳۶] روز سلطنت کے
داخلی و خارجی کیفیت اُسکے سامنے پیش ہوتی تھی، وہ محصول لگاتی، غیرملکیوں کے لئے
محصول کی رقم کا تعین کرتی، دارالضرب کا انتظام کرتی اور لوگوں سے آزادانہ امداد کا
مطالبہ کرتی تھی، مندروں اور عام عمارتوں، سڑکوں، دیواروں اور جہازوں کے بنانیکے لئے
اسکی منظوری لازمی تھی۔ وہ یہاں تک کر سکتی تھی کہ سرکاری آمدنی سے بخ کے طور پر لوگوں کو
تماشوں میں جانیکے لئے رقوم دیدے۔ اُسکے اختیارات معمولی عدالتی کارروائیوں پر حاوی
نہیں تھے مگر مستثنیٰ حالات میں جب جرم قانون کے تحت میں نہیں آتا تھا یا جب اہم
حالات کے اعتبار سے غیرمعمولی کارروائیوں کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ مجرمانہ الزامات پر
بحث کرتی، تاوان کا تعین کرتی اور ملزم کے جرم کا بھی تصفیہ کرتی تھی۔ جو خرابیاں اُس میں
جمہوریت کے دور عروج کے بعد بہت ہی جلد پیدا ہو گئیں اُن سے ناجائز عدالتی کارروائیوں کو
اور بھی ترقی ہوگئی۔

لہ دیکھو ارسطو کی "السیاسیات" ۴ : ۴ اور ۶ ۔

اسکی خصوصیت

مجلس کے اندر جو اہل شہر موجود ہوتے تھے اُنھیں کی کثرتِ رائے قطعی ہوتی تھی۔ قوم کے ادنیٰ طبقوں تک کی ذہنی قوت میں ایسی ترقی ہوگئی تھی کہ قدیم یا جدید کسی سلطنت میں اُس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ ایس کلوس اور سوفوکلیس کے افسانہائے غم کو بخوبی سمجھ سکتے تھے۔ دے موس تھنیس کی تقریروں کو سنتے تھے، تجارت اور شہنشاہی اور ہر قسم کے کاروبار کے منافع کثیر نے انھیں دولتمند بنا دیا تھا لیکن اس قابلیت کے لوگوں میں بھی زیادہ حصہ ایسا تھا کہ وہ زبان آوروں کی پرفن ترغیبات کو روک نہیں سکتا تھا اور اپنے اختیار کو دانائی اور انصاف سے عمل میں لانے سے گریز کر جاتا تھا۔ زیادہ معزز اور دولتمند شہری جو تعداد میں قلیل تھے اُنکے ساتھ زیادتی اور بدسلوکی ہوتی تھی، چنانچہ زینوفون اپنے وطن کے متعلق لکھتا ہے کہ عمومیت کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ بدکردار اچھے رہیں اور نیکوکار پریشان ہوں [1]

سینات

سولون کے نظام حکومت کا منشا یہ تھا کہ اکلیسیا کے اختیارات ایک حد تک "بولے" (یعنی مجلس شیوخ) کے تابع ہوں۔ سولون نے اس آخر الذکر مجلس کی بنا قوم کے چار قبائل کے ابتدائی انتظام کے موافق رکھی تھی۔ قبائل کے ارکان چار طبقوں میں تقسیم کئے گئے تھے۔ اور اُن میں سے اعلیٰ اور دولتمند طبقے کے حقوق و فرائض زیادہ قرار دئے گئے تھے تاکہ سینات میں دولت اور تعلیم کو غلبہ حاصل رہے لیکن کلائیس تھنیس کے وقت (۵۱۰ ق م) سے یہ مجلس روز بروز عوام کے اثر میں زیادہ آتی گئی۔ پانچسو ارکان کی سینات عوام الناس کی ایک چھوٹی سی مجلس بن گئی جسکے ارکان کے تقرر میں دولت و تعلیم کا مطلق لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔

[1] زینوفون نے اپنی کتاب "جمہوریت ایتھنز" میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اہل ایتھنز اچھے اور بُرے لوگوں میں تمیز کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں مگر وہ بروں کو ترجیح دیتے اور اچھوں سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ یقین یہ کیا جاتا ہے کہ شخص واحد کی خوبی عوام کے لئے مفید نہیں بلکہ مضر ہوتی ہے اور یہاں مقصود سلطنت کا عمدہ انتظام نہیں ہے بلکہ عوام کی آزادی اور اقتدار سے غرض ہے (لیکن یاد رہے کہ اب یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ یہ کتاب زینوفون کی طرف منسوب کر دی گئی ہے جو حقیقت میں اسکی تصنیف نہیں ہے اور عمومیت کی مخالفت میں ہے پس اُسے ایک موقر استدلال کی طور پر نقل کرنا مناسب نہیں یہ کتاب ۴۲۴ ق م کے کچھ قبل یا بعد لکھی گئی تھی یعنی زینوفون کے مرنے سے ۶۹ برس پہلے)

ارکان کا انتخاب تک نہیں ہوتا تھا بلکہ قرعہ اندازی سے لوگ لیلیئے جاتے اور اُسکے بعد پھر پچاس پچاس کے دس حصوں میں تقسیم کئے جاتے تھے اور ہر ایک حصہ باری باری چھتیسویں روز کاموں کا انصرام اپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ اس قسم کی جماعت عوام پر کوئی آزادانہ اختیار عمل میں نہیں لا سکتی تھی کیونکہ عوام ہی اُسے کبھی آسمان پر چڑھاتے تھے اور کبھی زمین پر گرا دیتے تھے۔ اُنکا کام صرف اتنا تھا کہ مجلس عام میں پیش کرنیکے لئے کام تجویز کرے اور عوام الناس کو حکومت خود اختیاری کے کام میں مدد دے۔

آرخون

"آرخون" اولاً اُن اعلیٰ حکام کو کہتے تھے جو ایوپریدوں میں سے ہوتے تھے اور سولون کے نظام سلطنت کے موافق اُنکا انتخاب سب سے دولتمند طبقے سے ہوتا تھا مگر جب عمومیت کو ترقی ہوئی تو نسب و دولت کی جگہ گروہ بندی نے لیلی اور آرخون عوام کے خادم اور بیشمار عدالتوں کے بے اختیار صدر رہ گئے۔

عدالتیں

عدالتوں کا انتظام بھی عمومی طریق پر ہوتا تھا اور وہ بھی ایک طرح کی عام مجلسیں ہوگئی تھیں۔ جن میں چھ ہزار سے کم اہل رائے شریک نہیں ہوتے تھے۔ ہر معاملے کا فیصلہ اُسکی اہمیت کے اعتبار سے ہوتا تھا۔ کسی میں سو اہل رائے ہوتے تھے اور کسی میں ہزار۔ عدالت کے منافع اور اثر سے فائدہ اُٹھانے کا خیال ایک مرض مُزمن کی طرح تمام اہل ایتھنز میں سرایت کر گیا تھا۔ اُس سے ایک نہایت مذموم پیشہ مفت خوری کا نکل آیا تھا۔ ارسٹوفانیس نے ویسپس میں اسکی ہجو خوب لکھی ہے۔ عوام کے منتخب کردہ حکام اپنے کو عوام کی حکومت کا حامی اور ترقی دینے والا خیال کرتے تھے اور بے غرضانہ انصاف کرنیکے بجائے وہ فریقانہ مناقشات و اغراض میں پھنس جاتے تھے، اور عدالتیں خانگی اور سرکاری معرکہ آرائی کا دنگل بنجاتی تھیں۔ ان مفت خوروں اور ججوں کی رشوت ستانی اور تباہ کاری بہت جلد ترقی کر گئی اور عوام کی آزادانہ خود داری نے انصاف کو بالکل غارت کر دیا۔

اکیسواں باب

(ب) بلا واسطہ عمومیت پر تنقید

بلا واسطہ عمومیت کے خصوصیات

بلا واسطہ عمومیت کی کیفیت مع اُسکے عیب و صواب کے ذہین و فطین اہل ایتھنز کی تاریخ میں روشن حرفوں میں لکھی ہوئی ہمیشہ کے لئے موجود ہے۔

عمومیت اقتدار کے مقابلے میں آزادی کو ترجیح دیتی ہے۔ اہل ایتھنز کی حریت پسندی اُنکے فنون لطیفہ کے کمال کا باعث تھی جسکی داد آج تک دیجا رہی ہے لیکن عمومیت جس طرح سب کو آزادی دیتی ہے، اُسی طرح حکومت میں بھی سب کو شامل کرتی ہے۔ اہل ملک کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ بذات خاص حکومت کریں، یعنی حکومت کیلئے بہت وسیع قومی مجلسیں قائم کریں۔ لیکن یہ صرف چھوٹی سلطنتوں اور ایسی قوموں میں ممکن ہے جنھیں سلطنت کے باقاعدہ کاروبار میں وقت صرف کرنیکے لئے کافی فرصت ہو اور پھر اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یا تو طرز معاشرت اور کاروبار میں نہایت سادگی ہو جیساکہ کوہستان کی چھوٹی چھوٹی قوموں میں ہوتا ہے یا ایک ایسا مزدوری پیشہ گروہ موجود ہو جسے شہریت کے حقوق میں دخل نہ ہو متمدن قوم میں بلا واسطہ عمومیت ہمیشہ بے اصل ہوتی ہے، کیونکہ جب تک آبادی میں غلاموں کا ایک طبقہ نہ ہو اس قسم کی عمومیت قائم نہیں رہ سکتی۔

عوام کے جذبات اور حرص و طمع کا خطرہ

ان وسیع مجالس عامہ میں بہت آسانی سے اپنے غیر محدود اختیار کا خیال پیدا ہو جاتا ہے، جس سے ہر طرح کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور اکثر مطلق العنانانہ حرص و طمع کو قانون وحق کی جگہ ملجاتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً اپنی جگہ پر ایماندار اور دور اندیش ہو مگر مجلس میں جاکر عام جوش میں سب بہہ جاتے ہیں اور جس تجویز کو ذرا دیر پہلے وہ بلاپس و پیش مسترد کر دیتے اس دفور جوش میں وہ اُسی کو منظور کر لیتے ہیں۔ مقررین صرف عوام کے جوش کو اُبھار کر اپنا اثر پیدا کرتے ہیں اور جب ایک مرتبہ یہ طوفان برپا ہو جاتا ہے تو پھر اُسکی زیادتی کو روکنے کے لئے کسی قسم کی شرم و حیا بھی کام نہیں دیتی[1]۔

---

[1] برک نے اس خیال کو نہایت خوبی سے اپنے "خیالات دربارۂ انقلاب فرانس" میں ظاہر کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ

قومی اخلاق کی اہمیت

پس اگر عمومیت کا ایک عمدہ نظامِ سلطنت بنانا ہو تو اسکے لئے ضروری ہے کہ ملک کے حصۂ غالب میں سیاسی اہمیت و قابلیت موجود ہو۔ انھیں اخلاق اور تعلیم دونوں میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنا چاہئے۔ لیکن ایتھنز کی تاریخ اس تجربے کے خلاف متنبہ کر رہی ہے۔ ایک ایسی قوم میں جس نے اس قدر نمایاں ذہنی ترقی حاصل کر لی تھی، جس نے مصیبت اور خطرے کے وقتوں میں اپنے اخلاق کا سکہ جما دیا تھا، اُس میں بھی خالص جمہوریت بہت تھوڑی ہی مدت تک ابتذال اور تباہی سے محفوظ رہ سکی۔ جب ایتھنز کی قوت و ثروت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا ہوا تھا اُسوقت بھی اُسکی اس عظمت کا باعث قوم کی حکومت نہیں تھی بلکہ عملاً اُس حکومت کا ترک کر دینا اور اسے ایک شخصِ واحد کو تفویض کر دینا اسکا سبب تھا۔ پیری کلیس کے زمانے کے متعلق تھیوکیدی دیس لکھتا ہے کہ[1] ایتھنز میں عمومیت محض نام کو تھی ورنہ دراصل وہاں ایک شخص کی حکومت تھی جو شہریوں میں سب سے برتر تھا۔

عوام جب ایک مرتبہ مئے اقتدار سے سرمست ہو گئے تو پھر وہ اپنی خوبیوں کو برقرار نہ رکھ سکے۔ جب تک لوگوں کو خدا کی گرفت کا خوف، رسم و رواج کے قیود کا لحاظ اور بہترین اشخاص کے اقتدار کی وقعت کا خیال رہتا ہے اُسی وقت تک سلطنت کی عمومی صورتیں قائم رہ سکتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ عمومی سلطنت میں معاملات ملکی میں دخل رکھنے سے عوام کی سطح بلند ہو جاتی ہے اور دوسری سلطنتوں کے باشندوں کے مقابلے میں انھیں اپنے قوے کے نشو و نما کا زیادہ احساس ہوتا ہے اور اس اعتبار سے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) جہاں عوام کو مطلق اور بے قید اختیار حاصل ہوتا ہے وہاں لوگوں کو اپنی قوت پر بہت زیادہ اعتماد ہوتا ہے کیونکہ اُنکے اعتماد کی بنا قوی ہوتی ہے۔ زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ وہ خود ہی اپنے آلۂ کار ہوتے ہیں وہ اپنے مقصودِ اصلی سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے وہ دنیا کی سب سے بڑی قوت یعنی عزت و وقعت کے احساس کی ذمہ داری کو کم محسوس کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے عام کاموں میں ہر شخص پر فرداً فرداً بدنامی کا جو بار پڑیگا وہ بہت کم ہوگا۔ اختیار کے غلط استعمال کرنیوالوں کی تعداد جسقدر زیادہ ہوگی اُسی قدر رائے عامہ کا اثر کم ہوگا۔ اُنکا خود اپنے فعل کو پسند کرنا اُنکی نظر میں پسندیدگیٔ عام کا حکم رکھتا ہے اسلئے ایک کامل عمومیت دنیا میں سب سے زیادہ بے شرم شئے ہے، اور جسطرح یہ سب سے زیادہ بے شرم ہے اسیطرح سب سے زیادہ نڈر بھی ہے۔

[1] تھیوکیدی دیس، جلد ۲ صفحہ ۶۹۔

وہ دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اُن میں ہر فرد مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیشے کی زندگی تک محدود نہ رہے بلکہ کچھ زیادہ وسیع النظری اختیار کرے اور تاریخ کے اہم قوانین اور قوم کی مجموعی زندگی سے آشنا ہو جائے، لیکن جب غیر محدود طاقت کا خیال غالب آجاتا ہے تو ہیبت و وقعت کا احساس بہت جلد غائب ہو جاتا ہے اور چونکہ سلطنتوں کی دوسری قسموں کے مانند عمومیت میں حاکم و محکوم کا امتیاز نہیں ہوتا اس لئے اختیارات بہت آسانی سے خراب کر دیئے جاتے ہیں۔ عوام بُری خواہشات کے تابع ہو جاتے ہیں، اپنے سے معزز و برتر قلیل التعداد جماعت سے اُنھیں حسد ہو جاتا ہے اور وہ اُسے پریشان کرنے لگتے ہیں کیونکہ اُس جماعت کا وجود بجائے خود عامۃ الناس کے لئے ایک دائمی ملامت ولعنت کا باعث ہوتا ہے۔ عوام الناس کی بدترین صفات اپنا اثر دکھانے لگتی ہیں۔ غرور، حرص و ہوا کے آزادانہ اظہار، کثیر التعداد و بیکار تغیرات کی خواہش و قساوتِ قلبی کا زور ہو جاتا ہے۔ جمہور جس قدر خود اپنے اوپر حکمرانی کو سہل کرتے جاتے ہیں اُسی قدر دوسروں پر اُنکی حکمرانی زیادہ تکلیف دہ ہوتی جاتی ہے۔ فرقہ بندیاں قائم ہو جاتی ہیں اور آپس کی منافرت حب الوطنی سے زیادہ ہو جاتی ہے اور انکی مہلک جنگ و جدل میں ملک تباہ و برباد ہو جاتا ہے مسلسل تغیرات سے سلطنت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور کسی ایک حالت پر استقلال نہ ہونیکے باعث تباہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سلطنت ایتھنز کی عظمت اگرچہ بہت ہی تابناک تھی مگر یہ عظمت و شوکت بہت ہی تھوڑے دنوں تک قائم رہی اور اسکے بعد ایک ایسے طویل انحطاط کا زمانہ آیا جس سے ایتھنز پھر سنبھل نہ سکا[1]

حُبِ مساوات

ہر عمومی سلطنت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں مساوات کی محبت پائی جاتی ہے۔ ایتھنز میں یہ اصول جس انتہائی حد تک بلاخیال کسی اور امر کے ترقی کر گیا تھا اسکی مثال زمانۂ مابعد کی کسی عمومی سلطنت میں نہیں ملتی جہاں تک ممکن تھا اہل شہر خود ہی براہِ راست سلطنت کے کام انجام دیتے تھے کیونکہ نیابت کے طریقے میں منتخب شدہ نمایندوں کو

[1] ایتھنز کی تاریخ کا عظیم الشان دور کلائس تھینیس (سنہ ۵۰۸ ق۔م) کے وقت سے شروع ہوا۔ جس نے خالص عمومیت قائم کی تھی اور پیری کلیس (سنہ ۴۲۹ ق۔م) کے انتقال پر ختم ہوا۔ اس طرح یہ دور صرف ۸۲ برس رہا۔

کچھ نہ کچھ سبقت و فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ جب کسی عہدے پر یا سینات میں چند اشخاص کے مقرر کرنیکی ضرورت ہوتی تھی تو اہل ایتھنز انتخاب کے بجائے قرعہ اندازی کے مجہول طریقے کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ انتخاب کی حالت میں ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کا خیال کرنا پڑتا تھا۔ حکام میں جلد جلد تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا تاکہ مدت اختیار کی طوالت کے باعث انھیں عوام پر برتری نہ حاصل ہو جائے[15] حکام کے وجود سے اطاعت لازم آتی تھی اور یہ امر فی نفسہ عمومی اصول مساوات کے خلاف تھا۔ پس اگر اس عدم مساوات سے چارہ نہیں تھا تو یہ ضروری تھا کہ جہاں تک ہو سکے قرعہ اندازی اور کثرت تغیرات کے ذریعے سے وہ اثر گھٹا دیا جائے۔ عمومیت جس مساوات کو پسند کرتی ہے وہ تعداد کی مساوات ہے، اُسکا اصول موضوعہ یہ نہیں ہے کہ ہر شخص کی حیثیت اُسکے حسب لیاقت ہو بلکہ "جیسا ایک ویسا دوسرا"[16]

نفی بلد

عمومی مساوات کا دوسرا نتیجہ نفی بلد ہے۔ یونانیوں میں اسکی کارروائی علانیہ ہوتی تھی اور اسے لوگ قریب قریب عزت کے مرادف سمجھتے تھے مگر موجودہ سلطنتوں میں اگرچہ عملاً یہ طریقہ رائج ہے مگر باضابطہ تسلیم نہیں کیا جاتا اور علی العموم ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جس نظام سلطنت کو اپنی بقا کی خواہش ہو اُسکے لئے لازمی ہے کہ اُسے یہ اختیار حاصل ہو کہ جن اشخاص کو وہ اپنے وجود کے منافی سمجھے اُنھیں خارج کر دے۔ عمومیت پر یہ الزام نہ لگانا چاہئے کہ وہ اپنے ایسے شہریوں کو جلاوطن کر دیتی ہے جنکی شخصی فوقیت عام مساوات کیلئے خطرناک ہوتی ہے جیساکہ ایتھنز میں ہوا کرتا تھا مگر عمومیت کے فوائد میں یہ امر ضرور بحث طلب ہے کہ وہ عوام الناس کی ذلت پسندیوں کو تو برداشت کر لیتی ہے مگر مخصوص افراد کی بلندی و برتری کی تاب نہیں لا سکتی۔

بلاواسطہ عمومیت صرف چھوٹی اور غیر ترقی یافتہ سلطنت میں قائم رہ سکتی ہے

خلاصہ یہ کہ جس قسم کی بلاواسطہ جمہوریت یونان میں قائم تھی وہ صرف چھوٹی سلطنتوں خاصکر زراعت پیشہ اور گلہ بان قوم کے لئے موزوں ہے[17] کیونکہ اُن کے طرز زندگی میں

---

[15] ارسطو "سیاسیات" جلد ۶: ۱، ۸ ۔

[16] " " جلد ۵: ۱، ۷ اور جلد ۶: ۱، ۶ ۔

[17] ارسطو نے اس رائے کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے ("سیاسیات" جلد ۶: ۴، اور آگے)

قدیم رسم و رواج کی سادگی باقی رہتی ہے۔ ایک اعلیٰ تمدن اور وسیع تعلقات کی قوم میں اُس سے ایک فوری جوش پیدا ہوجاتا ہے مگر وہ بہت جلد ناکافی اور مضر ثابت ہوجاتا ہے۔ ایک صورت میں عمومیت فطرت کے موافق اور بااعتدال معلوم ہوتی ہے، دوسری صورت میں وہ اوباشی وزیاں کاری کی طرف مائل ہوجاتی ہے۔ اس صورت میں وہ جب آزادی کی توقع دلاتی ہے وہ تمام اعلیٰ صفات پر ایک ناروا زیادتی اور عوام الناس کی بے قید وحشیانہ حرص و ہوس کا آلہ بن جاتی ہے۔ ترقی پذیر تمدن جب ایک مرتبہ اپنے اختلافات اور متبائن حالات کو قائم کردیتا ہے تو پھر مساوات کے تمام دعوے محض دروغ بافی اور فساد معلوم ہوتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) یونان کے تجربے سے اس کی تصدیق ہوچکی تھی، اور زمانۂ مابعد میں سوئٹزرلینڈ میں بھی اس خیال کی صحت ثابت ہوگئی۔

بائیسواں باب

(ج) نیابتی عمومیت اور موجودہ زمانہ کی جمہوریت

بلا واسطہ حکومت عامہ کے بجائے نیابتی حکومت کا قائم ہونا

اس زمانے میں بلا واسطہ عمومیت صرف نہایت ہی مستثنیٰ اور بہت ہی مفید صورت حالات میں قائم رہ سکی ہے اور اس پر بھی ایتھنز کی بہ نسبت اسکی حالت میں بہت زیادہ اعتدال رہا ہے۔ سوئزرلینڈ کے بعض کوہستانی صوبوں میں ابتک اسکا وجود پایا جاتا ہے۔ مجلس عامہ سال میں ایک مرتبہ جمع ہوتی ہے اور اس چھوٹی سی جمہوریہ کے عہدوں اور اعزازوں کی تقسیم ہاتھوں کے شمار سے ہوتی ہے، بالعموم یہ اعزاز سب سے زیادہ معزز خاندانوں کو دیے جاتے ہیں۔ یہ مجلس عام اُن قوانین کو بھی منظور کرتی ہے جنھیں کونسلیں (مجالس خاص) تیار کرتی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی عمومیات جن پر یورپی زندگی کی عام رفتار کا اثر بہت ہی کم پڑا ہے وہ اس اعتبار سے عزت و توقیر کی مستحق ہیں کہ اُنکی پانسو برس کی تاریخ بہت ہی مردانہ واقعات سے بھری ہوئی ہے اور ظلم و زیادتی کا دھبا اُن پر کم لگا ہے۔ نیز اُن کے رسم و رواج کی سادگی اور باشندوں کا امن اور فراغبالی سے زندگی بسر کرنا بھی سزاوار وقعت ہے، لیکن ادھر قریب زمانے میں اُن میں یہ میلان پیدا ہوگیا ہے کہ جس قسم کی نیابتی صورت حکومت، سوئزرلینڈ کے دوسرے صوبوں اور ممالک متحدہ امریکہ میں رائج ہے ویسی ہی حکومت اپنے یہاں بھی رائج کریں۔ چنانچہ ۱۷۹۳ء اور ۱۸۴۸ء کی فرانسیسی تحریکات نے نیابتی نظام سلطنت کے قائم کرنیکی کوشش کی تھی اور موجودہ زمانے میں عمومیت کی حامی جماعتوں میں ہر جگہ یہی خیال غالب ہے۔ پس موجودہ زمانے کی عمومیت کو نیابتی عمومیت، کہنا بالکل بجا ہے۔

۱۔ نیابتی عمومیت کی یا بالفاظ اہل امریکہ جمہوریت کی ابتدا امریکہ سے ہوئی

جس طرح آئینی بادشاہی کی ابتدا انگلستان سے ہوئی، اسی طرح نیابتی عمومیت یا بالفاظ اہل امریکہ جمہوریت کی موجودہ صورت کا نشو و نما شمالی امریکہ میں ہوا۔ یہ امر خیال کرنیکا ہے کہ موجودہ زمانے کی سلطنت کی یہ دونوں خاص صورتیں اینگلو سیکسن ہی

قوم ہی کی سیاسی طبائع کا نتیجہ ہیں۔

اسکے پیدا ہونیکے اسباب

ایک جدید عمومی نظامِ سلطنت کی ابتدا اور اُسکے نشو و نما کیلئے متعدد اسباب جمع ہوگئے تھے۔ ایک حد تک اس ملک کی وسعت بھی اسکا سبب تھی، جہاں زمین کو قابل کاشت بنانے کے قبل سخت محنت کی ضرورت تھی۔ ابتدائی تاریخ سے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ وسیع ممالک عمومیت کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ بالعموم بڑے بڑے بادشاہوں کی جانب سے اُن ملکوں میں نئی آبادیاں قائم کی گئی تھیں اور آباد کار سختی کے ساتھ بادشاہت کے تابع رکھے گئے تھے۔ جنوبی امریکہ میں بھی نئی آبادکاریاں قائم ہوئی تھیں اور زمین کے وسیع قطعات پر کم تعداد آبادی کو پھیلا کر انھیں قابل پیداوار بنا دیا تھا مگر باوجود اس کے وہاں ایک مدت دراز تک کوئی عمومیہ قائم نہیں ہوئی۔ اُنکی راہ میں زمین کی وسعت نہیں بلکہ باشندوں کی خصلت حائل تھی؛ مگر پھر بھی وہ ملک کی وسیع زمین پر پوری آزادی کے ساتھ آسانی سے اپنے تئیں پھیلا سکے اور اُنھیں جو سخت مقابلہ فطرت کے ساتھ کرنا پڑا اُس نے اُنکی قوتِ عمل اور اُنکے ارادے کی پختگی کو برانگیختہ کر دیا۔

نیو انگلینڈ (نیا انگلستان)

انگریز آباد کار اپنے قدیم وطن سے خود اختیاری حکومت کی قدرشناسی، آزادی کا احساس اور قانون کی الفت اپنے ساتھ لائے تھے۔ نئی دنیا میں اُنہیں جاگیرداروں اور امیروں کے انتظامات کے ظلم وجور سے بھی نجات حاصل ہوگئی۔ ان آبادکاروں میں اول روز سے کامل مساوات کا عملدرآمد جاری ہوگیا تھا۔ پیورٹین جو نیو انگلینڈ میں آکر آباد ہوئے تھے وہ انگلستان کے طبقۂ متوسط سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنکا مذہبی عقیدہ ہر قسم کی کلیسائی حکومت کے خلاف تھا۔ اُنکی خواہش یہ تھی کہ وہ عیسائیوں کی ایک عالمگیر قسیسیت میں شریک ہوں، وہ ایک دوسرے کو آپس میں بھائی بھائی سمجھتے تھے۔ وہ بحر اطلس کے دوسری طرف اس غرض سے گئے تھے کہ وہ سقفی کلیسا اور اُس کی حمایتی سلطنت کے ظلم وستم سے نجات پا جائیں اور اپنی مذہبی اور اپنی سیاسی آزادی کو برقرار رکھیں۔ اُنکے خیالات عمومیت کے ساتھ ہی مذہبی حکومت کی طرف بھی مائل تھے۔ وہ انگلستان کی شاہی اور پارلیمنٹی حکومت سے منحرف نہیں تھے مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ حکومت کی براہ راست تعدی سے آزاد ہو جائیں۔ "آبائے زائرین" نے پلائی متھ میں اتر کر جس پہلے معاہدۂ باہمی مورخہ ۱۱ر نومبر ۱۶۲۰ء پر دستخط کئے تھے اُس سے شمالی امریکہ کی

عمومیت کے بدو و آغاز پر روشنی پڑتی ہے۔ اُنکے الفاظ یہ تھے: "بسم اللہ آمین۔ ہم جنکے نام نیچے لکھے ہوئے ہیں اور جو بادشاہ جلالتماب شاہ جیمس کی وفادار رعایا ہیں، ہم خدا کی عظمت، عیسوی مذہب کی ترقی اور اپنے بادشاہ اور ملک کی عزت کے خیال سے یہ سفر اختیار کر کے ورجینیا کے شمالی حصوں میں یہ پہلی نوآبادی قائم کرنے آئے ہیں۔ ہم اپنی اس تحریر کے ذریعے سے خدائے عزوجل اور ایک دوسرے کے روبرو باہدگر مستحکم عہد کرتے اور خود کو ایک ملکی جماعت قرار دیتے ہیں تاکہ ہم اپنا نظم و نسق، اپنی بقا کا انتظام بہتر طریق سے کر سکیں۔ اور اپنے مذکورۂ بالا مقاصد کو پورا کر سکیں اور اسی عہد کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً اس قسم کے منصفانہ اور مساویانہ قوانین و ضوابط وضع کریں نظام سلطنت بنائیں اور عہدے قائم کریں جو اس نوآبادی کی عام جماعت کی بہبود کیلئے سب سے زیادہ موزوں و مناسب معلوم ہوں۔ اور ہم ان قوانین و ضوابط وغیرہ کی ہر طرح کی مناسب فرمانبرداری و اطاعت کا وعدہ کرتے ہیں" روڈ آئیلینڈ، نیوہیون، کونکٹیکٹ اور پراوڈنس میں جو لوگ اول اول ترک وطن کر کے آئے اُنھوں نے بھی اسی قسم کی کارروائی اختیار کی۔ پس اس طرح اُن جماعتوں نے جو نیو انگلینڈ کے حلقۂ نوآبادی پر مشتمل ہیں اور جنمیں سب کا سرگروہ میساچوسٹ تھا، اُنھوں نے حکومت کی ایک ایسی صورت اختیار کی جو آزاد اشخاص کا مشترکہ کام معلوم ہوتی تھی۔

ورجینیا

جنوبی حلقے کے حالات اس سے بالکل مختلف تھے۔ اسی حلقے کو اولاً ورجینیا کہتے تھے مگر بعد کو ورجینیا کا لفظ اس حلقے کی سب سے زیادہ اہم نوآبادی کے لئے مختص ہو گیا تھا۔ وہاں اسقفی کلیسا اور اسکا اعیانی نظام معاً تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ آبادکار زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے مگر اُس آبادکاری کے انتظام میں مذہبی اغراض کے بجائے اقتصادی اغراض زیادہ غالب تھے۔ علاوہ اسکے جماعت اعیان کے بہت سے ارکان ایسے تھے جو وہاں بڑی بڑی جائدادوں کے مالک تھے۔ بعد کو طلب معاش میں بہت سے بفکروں نے یہاں آکر آبادی کو بڑھا دیا اور لنڈن کی پولس نے مجرموں اور اوباشوں کو بھی وہاں منتقل کرنا شروع کر دیا۔

کیرولینا

تاہم ورجینیا تک میں بھی یہ نہو سکا کہ انگلستان کے مانند اعیانی نظام سلطنت قائم ہو جاتا اور شیفٹسبری کی خواہش پر لاک نے ۱۶۶۹ء میں کیرولینا کے لئے

اس قسم کا نظام سلطنت تیار کرنیکی جو یادگار کوشش کی وہ بالکل ہی ناکام رہی آباد کار اسے گوارا نہیں کرتے تھے کہ جس صورت میں وہ کہیں نہ کہیں خود آزادانہ زمین کے مالک ہوسکتے تھے اُس حالت میں وہ رئیسوں اور زمینداروں کی مستاجری قبول کریں چنانچہ ۱۶۹۳ء میں لاک کا نظام سلطنت منسوخ کردیا گیا۔ شمالی اور جنوبی دونوں نوآبادیوں میں چونکہ آبادکار بوجہ بُعدِ مسافت کے بذات خاص مجتمع نہیں ہوسکتے تھے اس لئے انھوں نے نیابتی مجلسیں قائم کردیں، جنکے قائم مقاموں کا انتخاب آزادانہ ہوتا تھا اور یہی مجلسیں نوآبادی کی خود مختاری کو قائم رکھتیں اور اسکے نظم ونسق کی نگرانی کرتی تھیں۔ اس انتظام کی ابتدا کا سراغ گزشتہ زمانے میں ۱۶۱۹ء تک ملتا ہے اور بہت جلد یہی طریقہ تمام نوآبادیوں میں رائج ہوگیا۔

نیو یارک اور پنسلوینیا

وسطی حلقے میں غیر ملکی عناصر بہت کثرت کے ساتھ مل گئے تھے نیویارک (جو پہلا نیو ایمسٹرڈم کہلاتا تھا) اور پنسلوینیا میں اُسکا زیادہ غلبہ تھا مگر وہاں بھی انگریزی قوم کے اثر سے اصولاً وہی نظام سلطنت اختیار کیا گیا جو اور جگہ اختیار کیا گیا تھا۔ جن امور میں سب نوآبادیاں یکساں تھیں وہ حسب ذیل ہیں :۔

نوآبادیوں کے نظامہائے سلطنت کے مشترک عناصر

(الف) انگریزی قانون جس میں زمیندارانہ اور جاگیردارانہ مستاجری کا دخل نہ ہو اقتصادی اصول کی بنیاد زمین کی آزاد ملکیت پر ہو۔

(ب) مرتبے اور حقوق میں کامل مساوات ہو اور انگلستان میں جس قسم کی اعیانی حکومت اُسوقت تک قائم تھی اُسکا کوئی اثر نہ ہو، لیکن نسل کے نمایاں فرق سے اس مساوات میں خلل آگیا تھا "رڈ انڈین" یعنی ملک کے اصلی باشندے سفید رنگ لوگوں کے ہم پایہ نہیں قرار دیئے گئے تھے نہ انھیں حکومت میں کچھ حصہ دیا گیا۔ حبشیوں کی حالت اس سے بہت گری ہوئی تھی۔ یہ حبشی افریقہ سے لائے ہوئے غلاموں کی اولاد تھے۔ بالعموم وہ سفید رنگ آبادکاروں کی ملک تھے اور اگر شاذونادر وہ آزادی بھی حاصل کرلیتے تھے تو بھی شہریت کے سیاسی حقوق انھیں ہرگز ہرگز نہیں ملتے تھے۔

(ج) سلطنت کی مدد کے بجائے خود اپنے زور بازو پر اعتماد کرنیکی مستقل عادت۔ اس کی کیفیت ابتدائی آبادکاری میں خوب واضح نظر آتی ہے جب کہ ہمسائے لکڑیوں کے مکان بنانے میں ایک دوسری کی مدد کرتے تھے۔

(د) قومی مدرسوں کے ذریعے قوم کی عام تعلیم۔ اس قسم کے مدرسے بہت ہی ابتدائی زمانے میں دیہاتیوں نے اپنے بچوں کے لئے قائم کرلیے تھے اور بہت سی نوآبادیوں میں اُنکی حاضری لازمی قرار پاگئی تھی۔

(ھ) دیہات کا آزادانہ انتظام اور صوبوں کا خودمختارانہ نظم و نسق۔

(و) عہدہ داروں کی مختصر تعداد۔ اُن میں سب سے زیادہ اہم عہدہ کل نوآبادیوں کے گورنر (والی) کا ہوتا تھا۔ یہ والی اجازت یافتہ (chartered) نوآبادیوں میں آبادکاروں کی طرف سے منتخب ہوتے تھے اور زمیندارانہ نوآبادیوں میں زمینداروں کی طرف سے نامزد ہوتے تھے اور شاہی نوآبادیوں میں انگریزی حکومت کی طرف سے اُنکا تقرر ہوتا تھا۔ اسکے بعد دوسرا درجہ ججوں کے صدر کا ہوتا تھا۔ ان دونوں عہدہ داروں کو اہل ملک کے نمایندوں کے ساتھ ملکر کام کرنا ہوتا تھا۔ والی کے ساتھ اہل کاؤنسل ہوتے تھے اور ججوں کے ساتھ پنچ (juror) ناظمان امن کو انگلستان میں بادشاہ معززین میں سے نامزد کرتا تھا مگر امریکہ میں ہمیشہ زمین کے آزادانہ کاشتکار ہی ناظم امن ہوتے تھے۔

(ز) مستقل فوج شاید ہی کہیں ہوتی ہو۔ اُسکے بجائے ملیشیا (محافظ ملک فوج) ہوا کرتی تھی۔

(ح) ایک دارالمبعوثین کا وجود جسے ہر نوآبادی میں آزاد اشخاص منتخب کرتے تھے۔ یہ دارالمبعوثین قوانین کے بنانے میں سینیٹ کے ساتھ ملکر کام کرتا تھا مگر محاصل کی منظوری اور نظم و نسق کی نگرانی میں وہ تنہا کارروائی کرتا تھا۔

(ط) عہدوں کے لئے مختصر مدت کا رواج تاکہ کثرت کے ساتھ تغیر کا موقع مل سکے۔

(ی) سب سے آخر میں اخباروں کی آزادی کا تدریجی نشو و نما اور اتحاد عمل کی آزادی تھی۔

انھیں بنیادوں پر ہر ایک نوآبادی میں انگلستان سے تفریق ہونے سے بہت قبل ایک خودمختارانہ نیابتی نظامِ حکومت قائم ہوگیا تھا اور وا و لاً خود تاج برطانیہ کی طرف سے اُسکی ہمت افزائی ہوئی تھی۔ پس جب ۱۷۷۶ء میں اعلان آزادی نے انگلستان کے بادشاہ اور پارلیمنٹ سے تعلقات منقطع کردیئے تو نئی جمہوریتیں فوراً مکمل حالت میں قائم ہوگئیں۔

اتحاد

۱۷۸۷ء میں اتحاد کا متحدہ نظام سلطنت، صرف اتناہی تھا کہ یہی صوبہ وار حکومتوں کا طریقہ وسیع پیمانے پر اُس مجموعی سلطنت پر عائد کردیا جائے جو اُسوقت قائم ہوگئی تھی۔

۲۔ فرانس

فرانسیسیوں نے ۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۵ء میں اور پھر ۱۸۴۸ء اور ۱۸۷۰ء میں سلطنت کی

اس نئی صورت کی نقل کی مگر انھیں مستقل کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔ فرانسیسیوں نے دیوانہ وار جوش کے ساتھ آزادی، مساوات و اخوت کے سیاسی خیالات کو قبول کیا مگر ان کے روایات شاہانہ تھے اور انکے رسم و رواج میں جمہوریت کا اثر بہت ہی خفیف تھا۔ انکا میلان ہمیشہ سے یہ رہا کہ خود اپنی مدد کرسکنے کے بجائے سلطنت سے مدد کے خواہاں ہوں۔ سلطنت کی شان وشوکت اور اسکے اقتدار کو آئینی زندگی کی پابندی قانون اور بے نمائش محنت پر ترجیح دیں۔ فرانسیسیوں کا مرکزیت کا رجحان جمہوریت کے بجائے ہمیشہ شاہی طرف زیادہ رہا ہے (الف)

۲- سوئزرلینڈ

فرانس کے برخلاف امریکہ کی نیابتی حکومت سوئزرلینڈ کو راس آگئی، حالانکہ فرانسیسیوں ہی کے توسط سے یہ طریق حکومت وہاں پہنچا تھا۔

سوئزرلینڈ میں بڑے بڑے صوبوں میں اعیانی طریق پر حکمرانی ہوتی تھی۔ برن، فرائیبرگ، سولیر اور لیوزرن وغیرہ میں امرا کا ایک موروثی طبقہ تھا اور زیورچ، بازل، شف ہاوزن وغیرہ میں اہل شہر کی مجلسیں تھیں جو اپنے میں کسی اور کو داخل نہیں کرتی تھیں لیکن عوام کی آزادی قائم تھی اور اسی پر صوبجاتی انتظام کی بنیاد رکھی گئی تھی اور جمہوریت ہی قوم کا سیاسی منتہائے خیال تھی اور اسکا اثر عوام کے عادات و اخلاق میں راسخ ہوگیا تھا۔ نہ کوئی مستقل فوج تھی اور نہ دائمی عہدہ دار تھے۔ سوئزرلینڈ کی خودمختاری حکمرانوں اور امیروں سے کشمکش کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ پس جدید خیالات کے موافق ملکی آزادی کو تمام طبقات اور کل ملک پر وسعت دیدی گئی اور امرا اور ذی اثر اہل شہر کے امتیازات منسوخ کردیے گئے تو اس سے غیر متوقع امر ظہور میں نہیں آیا۔ اس تغیر سے صرف یہ ہوا کہ اعیانی جمہوریت کے بجائے نیابتی جمہوریت مکمل ہوگئی[1]

(الف) ۱۸۷۰ء سے فرانس میں جمہوریت قائم ہوگئی ہے اور اب شاہی کی بازگشت کی کچھ امید باقی نہیں رہی ہے۔ انگریزی مترجم)

[1] دیکھو ۱۸۰۳ء کا "ایکٹ آف میڈیئیشن"، ۲، ۳ اور بلنچلی کا سوئزرلینڈ کی متفقیت کا قانون"، جلد ۱ صفحہ ۴۴۴ ۱۸۴۸ء و ۱۸۷۴ء کے اتحادی نظام سلطنت کی دفعہ (۴) حسب ذیل ہے۔ سوئزرلینڈ میں نہ کوئی رعایا ہے اور نہ عہدے، نہ نسب نہ خاندان یا شخصیت کا کوئی امتیازی حق ہے"

تمام سوئٹزرلینڈ کو ایک نیابتی عمومیت میں متحد کرنیکی کوشش میں جو نظام سلطنت ۱۷۹۸ء میں نافذ کیا گیا اُسے بھی استقلال نہیں حاصل ہوا۔ قدیم صوبوں کی آزادی کی روایات اور اندرونی مخالفت کے عناصر اس قدر قوی تھے کہ اُنکا ہلویشیا کی جمہوریت کے تابع ہونا ممکن نہ تھا اور یہ جمہوریت بہت جلد منسوخ کر دیگئی، لیکن اکثر صوبوں اور خاصکر شہروں اور نئے صوبوں میں ۱۸۱۴ء کے بعد اعیانی حقوق کی گونہ رجعت کے باوجود نیابتی طریقے قائم رہے۔ ۱۸۳۰ء کے بعد کی اصلاحی تحریکات نے نیابتی صورت کو زیادہ آزادانہ طور پر ظاہر ہونیکا موقع دیا اور ۱۸۴۸ء میں متفقیت پر بھی اُسکا عملدرآمد ہوگیا۔

۴۔ قدیم وجدید عمومیت کے فرق

زمانۂ حال کی عمومیت قدیم یونانی صورت سے اصلاً مختلف ہے۔ فارس کے رہنے والے ہتانہ[۵] نے (ہیرودوتوس، مقالہ ۳، فصل ۸۲) قدیم عمومیت کی یہ پانچ خصوصیتیں گنائی ہیں (۱) تمام حقوق کی مساوات (۲) مشرقی مطلق العنانوں سے خودمختارانہ اختیار کا اخراج (۳) قرعہ اندازی سے عہدہ داروں کا تقرر۔ (۴) عہدہ داروں کی ذمہ داری (۵) مجلس عامہ میں عام مباحثہ اور فیصلہ۔ ان میں سے تین خصوصیتیں موجودہ سلطنت میں بھی مسلم ہیں خواہ وہ سلطنت آئینی بادشاہی ہو یا جمہوریت۔ مگر دوسری دو خصوصیتیں (یعنی قرعہ اندازی سے عہدہ داروں کا تقرر اور مجلس عامہ) اب متروک ہوگئی ہیں۔

قدیم عمومیت تمام اہل ملک کو یکساں طور پر حکومت میں شریک کرتی تھی۔ زمانۂ حال کی عمومیت بہترین اشخاص کو قائم مقام منتخب کرنے میں گویا اعیانی امتیاز پر کاربند ہوتی ہے اور اس اعتبار سے وہ عمومیت کی زیادہ اعلیٰ واشرف صورت ہے۔ اقتدار اعلیٰ کا حق مجموعۃً تمام اہل ملک یعنی قوم کو دیا گیا ہے مگر اس حق کا عملدرآمد سب سے قابل لوگوں کو تفویض ہوتا ہے جو تمام قوم کے نمایندے ہوتے ہیں۔

اہل ملک ملکی معاملات میں بطریق ذیل اب بھی براہ راست دخل رکھتے ہیں:۔

(الف) آئینی قوانین پر رائے دیتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں ۱۸۳۰ء سے عام طور پر یہ اصول مسلم ہوگیا ہے کہ آئینی قوانین کے لئے تمام اہل ملک کی کثرت رائے ضروری ہے۔

[۵] (قدیم فارسی میں اس نام کا تلفظ ہتانَ تھا) گو کہ کتابت "اُتانَ" ہوتی تھی۔ یونانیوں نے اُسے اوتانیس (otanes) بنالیا تھا۔ یہ فرناسپ کا بیٹا تھا۔ اردو مترجم)

اس میں ان لوگوں کا شمار نہیں ہے، جو رائے دینے سے گریز کریں[۱]۔ برخلاف اسکے ممالک متحدہ امریکہ میں رائے دہی کا کام تمام قوم کو تفویض نہیں کیا گیا ہے بلکہ قائم مقاموں کی اُن متعدد مجلسوں کو دیا گیا ہے جو خاص اسی غرض سے منتخب ہوں (اسکو کانفرانس یا مجلس عارضی کہتے ہیں)

(ب) بعض اوقات دوسرے قوانین پر بھی رائے دینے میں اس صورت میں عام فیصلے کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک اثباتی یعنی اہل ملک کا کسی فیصلے کو منظور کرلینا جس سے قانون کو جواز حاصل ہوجائے (یہ مراجعہ کہلاتا ہے)۔ دوسری صورت منفی یعنی ایوانہائے مبعوثین کے منظور کرلینے کے بعد قوم کو اُس قانون کے نامنظور کردینے کا موقع دیا جائے۔ ثانی الذکر صورت میں جو لوگ قانون کے خلاف رائے دیں اُنکی تعداد تمام اہل ملک کی تعداد کے نصف سے زائد ہونا چاہئے برخلاف اس کے اول الذکر صورت میں رائے دینے والوں کی معمولی کثرتِ رائے ہی سے فیصلہ ہوجاتا ہے۔ یہ دونوں طریقے خالص عمومیت سے ماخوذ ہیں اور چونکہ ان سے عوام الناس میں بہت آسانی سے اشتعال پیدا ہوجانے کا احتمال رہتا ہے اس لئے وہ علم و تہذیب کے لئے خطرے سے خالی نہیں ہیں۔ اولاً ان قواعد کو سوئٹزرلینڈ کے چند منفرد صوبوں نے جاری کیا اُس کے بعد ۱۸۷۴ء میں کل اتحاد کے لئے وہ منظور کرلئے گئے[۲]۔

---

[۱] نظام سلطنت زیورچ بابت ۱۸۳۱ء دفعہ ۹۲۔ "آئینی تغیر کی کوئی تجویز جس پر مجلس عظمیٰ میں دوبار بحث ہوچکی ہو اگر منظور ہوجائے تو تمام اہل ملک کے سامنے منظوری یا نامنظوری کیلئے پیش کیجائے"۔ سوئس متفقیت کا ۱۸۴۸ء اور ۱۸۷۴ء کا اتحادی نظام سلطنت دفعہ (۶)، "اتحاد، صوبجاتی نظامہائے سلطنت کی حفاظت کی ذمہ داری کرتا ہے، بشرطیکہ اُسے قوم نے قبول کرلیا ہو اور اہل ملک کی ادنیٰ اکثرت رائے بھی جس وقت اسکی نظر ثانی کی خواہش کرے اُس پر نظر ثانی کیجائے"۔

[۲] ۱۸۷۴ء کے اتحادی نظام سلطنت کی دفعہ ۸۹ حسب ذیل ہے:

"وہ اتحادی قوانین یا فیصلے جو تمام مشترکیت پر عاید ہوتے ہیں اور زیادہ فوری اہمیت کے نہیں ہوتے وہ قوم کی منظوری یا نامنظوری کے لئے پیش کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ تیس ہزار حق رائے دہی رکھنے والے باشندگان سوئٹزرلینڈ یا آٹھ صوبہ جات اُسکا مطالبہ کریں"۔

(ج) مجلس واضع قوانین کے ارکان کے انتخاب میں۔ یہ انتخابات بالعموم برابر کے انتخابی حلقے اور سر شماری کے حسابی طریق پر مبنی ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی اُنکی بنا تنظیمی تقسیم یعنی کمیون پر بھی ہوتی ہے۔ پس عام طور پر نیابت نامکمل رہتی ہے اور اکثر اُسکا فیصلہ فریقانہ خیالات سے ہوتا ہے۔ یہ خرابی نیابتی حکومت کا لازمی خاصہ یا اُسی تک محدود نہیں ہے بلکہ آئینی بادشاہت میں بھی اسی طرح عیاں ہے۔

۵۔ نیابتی جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ

اعلیٰ اقتدار کا باقاعدہ عملدرآمد علی العموم بہت وسیع مجلسوں کو سپرد ہوتا ہے جو با اقتدار قوم کی نہایت ہی اتم و اکمل نیابت کی حیثیت سے منتخب ہوتی ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں سوئٹزرلینڈ میں شہروں کی مجالس عظمیٰ اور زرعی صوبوں کی "مجالس ملکی" درحقیقت اصلی مجالس کی وسعت دادہ صورتیں تھیں۔ جنھوں نے اختیارات کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور انھیں مجلسوں میں اہم معاملات کے لئے (اور شہروں میں قانون سازی کی ضرورت سے بھی) صوبے کے دوسرے ارکان کی کمیٹیوں کا اضافہ کر لیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں مجالس عظمیٰ حکومت سے علٰحدہ ہیں اور اُنھیں باضابطہ اقتدار اعلیٰ حاصل ہونیکے باعث اُنکا مرتبہ بھی بلند ہو گیا ہے[1] متفقی مجلس کو، جس میں دو ایوان ہوتے ہیں متفقی حکومت کے مقابلے میں یہی درجہ حاصل ہوتا ہے[2]

شمالی امریکہ میں قومی موتمر اور ہر ریاست کی جماعتہائے واضع قانون دو دو ایوانوں پر مشتمل ہیں اور حکومت سے جدا حیثیت رکھنے میں، سوئٹزرلینڈ سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔

---

[1] ۱۸۳۱ء کے زیورچ کے نظام سلطنت کی دفعہ ۳۸ حسب ذیل ہے:-
"نظام سلطنت کے بموجب اعلیٰ اختیار کا عملدرآمد مجلس عظمیٰ کو سپرد کیا گیا ہے۔ قانون کا بنانا اور مقامی نظم ونسق کی نگرانی کرنا اسی مجلس سے متعلق ہے اور صوبے کے خارجی تعلقات میں بھی مجلس اُنکی نمایندگی کرتی ہے۔"

[2] ۱۸۴۸ء کے اتحادی نظام سلطنت کی دفعہ (۶۰) حسب ذیل ہے:-
"مشترکیت کے اختیارات اعلیٰ کا عملدرآمد اتحادی مجلس کے سپرد ہے۔ جسکے دو حصے ہیں ایک نیشنل کاؤنسل (مجلس قومی) اور دوسری کاؤنسل آف اسٹیٹس (مجلس طبقات)" ۱۸۷۴ء کے اتحادی نظام سلطنت کی دفعہ (۱۷) حسب ذیل ہے:- قوم اور صوبہ جات کے حقوق کو محفوظ رکھتے ہوئے مشترکیت کے اعلیٰ اختیارات کا نفاذ اتحادی مجلس کے ذریعے سے ہوگا۔"

(۲) انتظامی اختیار

اب حکومت میں رعایا کا براہ راست کوئی دخل نہیں رہا ہے۔ جن سلطنتوں نے اغراضِ قانون سازی میں خالص عمومیت کو قائم رکھا ہے، وہاں بھی یہی حال ہے ہر جگہ حکومت کا کام رعایا کے با اختیار نائبوں کو سپرد ہے، جو رعایا کے نام سے اُسے عمل میں لاتے ہیں۔ بعض سلطنتوں میں حاکمِ اعلےٰ کا انتخاب رعایا براہ راست کرتی ہے مثلاً اکثر ریاستہائے امریکہ کے گورنر (والی) اور جینوا کے حکام شہر کا انتخاب تمام اہل ملک کرتے ہیں [۱] ممالک متحدہ امریکہ کے رئیس جمہوریہ کا انتخاب وہ رائے دہندگاں کرتے ہیں جو خود ابتدائی انتخاب کنندوں کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں۔ برعکس اسکے بعض دوسری سلطنتوں میں اس انتخاب کا اختیار مجلسِ واضع قانون کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس طرح خاص عہدوں کے تقرر میں وہ گویا رعایا کی نمایندگی کرتی ہے۔ یہ آخر الذکر طریقہ سوئزرلینڈ کی بیشتر جمہوریتوں میں رائج ہے۔ جہاں مجلس عظمٰی اربابِ حکومت اور اعلےٰ ججوں کا تقرر کرتی ہے۔ یہی کیفیت فرانس اور امریکہ کی بعض ریاستوں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ مقدم الذکر صورت میں حکومت کو زیادہ آزادی اور قوت حاصل ہوتی ہے خاصکر ایوانہائے مبعوثین کے مقابلے میں کیونکہ اُسے یہ دعوےٰ ہوتا ہے کہ ان ایوانوں کی طرح وہ بھی رعایا کی نمایندہ ہے اور نسبتاً اُسے عوام کا زیادہ اعتماد حاصل ہونے کا دعوےٰ ہوتا ہے۔ موخر الذکر صورت میں حکومت کا مدار مجلس قانون سازی پر زیادہ ہوتا ہے کیونکہ وہی اُسے وجود میں لاتی ہے اور اس لئے اسکا امکان کم ہوتا ہے کہ ایک قوت دوسری کو اُس کی حد کے اندر محدود کریگی اور اس پر روک قائم رکھے گی (ج)

---

[۱] فرانسیسی نظام سلطنت ۱۸۴۸ء کی دفعہ ۴۳ کی رو سے بھی ایسا ہی تھا: "فرانسیسی قوم، عاملانہ اختیار ایک شہری کو عطا کردیتی ہے۔ جو صدرِ جمہوریہ کا لقب پاتا ہے۔" دیکھو توک ول کی کتاب "جمہوریت امریکہ میں" جلد ۱۔ (معلوم ہوتا ہے کہ بلنچلی اس مقام پر دفعہ ۴۶ کا حوالہ دینا چاہتا تھا جو حسب ذیل ہے: "صدر کا انتخاب خفیہ رائے دہی کے ذریعے سے رایوں کے قطعی غلبے پر ہوتا ہے اور اس انتخاب میں فرانس اور الجیریا کے تمام اضلاع کے انتخاب کنندے شامل ہوتے ہیں" دیکھو لافیر اور ربات بی کی کتاب کا مقدمہ صفحہ ۱۴۸۔ انگریزی مترجم)

(ج) (عاملانہ حکومت کے سرگروہ کے انتخاب کے ان دونوں طریقوں کا اہم فرق، فرانس کے ۱۸۴۸ء کے

۷۔ عدالتی اختیار

عدالتی اختیارات بھی قوم کے نام سے نافذ ہوتے ہیں لیکن جج جنھیں خاص قابلیت یا تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے بالعموم یا تو حکومت کی طرف سے نامزد کیے جاتے ہیں جیسا کہ ممالک متحدہ امریکہ اور جمہوریۂ فرانس میں ہوتا ہے، یا مجلس قانون سازی کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں، جیسا کہ سوئزرلینڈ میں ہوتا ہے۔ مگر جوری (پنچایت) کے ذریعے سے رعایا کو براہ راست حصہ بھی ملتا ہے کیونکہ جور (پنچ) بذریعۂ قرعہ اندازی تمام جماعت رعایا میں سے منتخب ہوتے ہیں۔

۸۔ مقامی انتظامات

ہر ایک نیابتی عمومیت میں کیمیون کا نظام حکومت خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ نظم و ترتیب کی بنیاد مستحکم وہی ہوتا ہے۔ کیمیون میں اہل شہر کو معاملاتِ عامہ اور حکومت خود اختیاری میں حصہ لینے کی اور مدنی آزادی کی تعلیم حاصل ہوتی ہے۔ انھیں مقامی انتظامات، بالخصوص انکے چھوٹے اور دیہاتی حلقوں میں ابتک یہ ممکن ہے کہ کل باشندے مقامی مجلس میں یکجا ہوسکیں۔ البتہ شہروں میں نیابت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوئزرلینڈ اور شمالی امریکہ کی جمہوریتیں، تاریخی طور پر جب انکی بنا کا سراغ لگائیں گی تو یہی معلوم ہوگا کہ انکی ابتدا آزادانہ مقامی نظام حکومت سے ہوئی ہے۔ فرانس کے بارے میں اگر یہ کلیہ صادق نہیں آتا تو اس سے صرف اس امر کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ فرانسیسیوں کا طبعی میلان جمہوری حکومت کی طرف نہیں ہے۔

قوم کو خود اپنے اقتدار اعلیٰ کے براہ راست استعمال میں جو نہایت خفیف حصہ حاصل ہے اُس سے قطع نظر کرکے جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نیابتی عمومیت میں قاعدہ یہ ہے کہ قوم اپنے حکام کے ذریعے سے حکمرانی کرتی ہے اور اپنے نائبوں کے ذریعے سے قانون بناتی اور نظم و نسق کی نگرانی کرتی ہے۔ اس امر میں موجودہ نظام سلطنت کو ان سلطنتوں سے خاص مشابہت حاصل ہے جو حاکم و محکوم کے درمیان فرق کرتی ہیں۔

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ نظام سلطنت سے بہت صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ موسیو گریوی نے یہ تحریک کی تھی کہ رئیس جمہوریہ کو مجلس قومی منتخب کرے، مگر فیصلہ یہ ہوا کہ عام رائے سے اسکا انتخاب ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو برابر کی طاقتیں قائم ہوگئیں۔ ایک رئیس جمہوریہ، دوسری مجلس قومی اور ان دونوں کے درمیان اختلافات کے طے کرنیکا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اسی صورتِ معاملات سے نپولین سوم کو موقع ملگیا کہ اُس نے دوبارہ شہنشاہی قائم کردی۔ انگریزی مترجم۔)

تیئیسواں باب

(د) نیابتی حکومت عوام پر بحث

مونٹسکیو نے عمومیت کا اصول نیک کرداری کو قرار دیا ہے۔ مگر نیک کرداری کا سب سے پہلا سیاسی اصول یہ ہے کہ حکمرانوں کی اخلاقی خوبیوں کی قدر و وقعت کیجائے نہ یہ کہ سب لوگوں کے درمیان مساوات قائم ہو۔ اور خالص عمومیت میں حکمرانوں کی اخلاقی خوبیوں کی قدرشناسی کا وجود کسی طرح پایا نہیں جاتا۔ ہاں صرف اتنا سچ ہے کہ ایک اچھی حکومت کی عملی ضروریات کے لئے ایک حد تک نیکو کرداری لابدی ہے اور اسکے فقدان سے بہت جلد سلطنت کا تباہ ہوجانا لازم ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ نیکوکرداری نیابتی عمومیت کا سیاسی اصول بن گئی ہے۔ یہ نیابتی حکومت صرف یہی نہیں کہ نسبتاً معتدل ہے بلکہ معنزز تر بھی ہے کیونکہ انتخاب کے طریقے سے اسے اعیانی حکومت کے فواید کا کچھ حصہ حاصل ہوجاتا ہے۔

بہترین قائم مقاموں کے حاصل کرنیکی دشواری

اسکا اصول یہ ہے کہ قوم کے بہترین افراد قوم کے نام اور اسکے حکم سے حکومت کرتے ہیں مگر بڑی مشکل یہ ہے کہ انتخاب کا انتظام کیونکر کیا جائے کہ بہترین قابلیت اور بہترین اخلاق کے لوگ منتخب ہوسکیں۔

موجودہ زمانے میں عمومیت کا میلان یہ ہے کہ صرف انتخاب کنندوں کی تعداد پر انتخاب کا انتظام رکھا جائے، چونکہ عمومیت مساوات پر زیادہ زور دیتی ہے اس لئے وہ بہت آسانی سے اپنی تنظیمات کے لئے حسابی قواعد مقرر کرلیتی ہے۔ وہ اہل ملک کا شمار کرلیتی اور برابر تعداد کو برابر حق دیدیتی ہے۔

اوصاف کے مقابلے میں تعداد پر زیادہ لحاظ کرنیکا خطرہ

لیکن یہ طریقہ بلا واسطہ عمومیت کے لئے زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہ تمام اہل ملک کو اختیارات کے استعمال کا یکساں حق دیتی ہے۔ نیابتی عمومیت کے لئے یہ اصول اسقدر موزوں نہیں ہے کیونکہ اس میں اہل ملک کی قابلیت اور اہلیت کے اعتبار سے فرق کیا جاتا اور معاملاتِ عامہ کا نظم و نسق صرف بہتر لوگوں کو سپرد ہوتا ہے۔ پس آخر الذکر صورت میں منتخب شدہ لوگوں کے اوصاف کا خیال کیا جاتا ہے اور اس حالت میں یہ بالکل خلاف قیاس

معلوم ہوتا ہے کہ اسکی انتخابی تقسیم صرف تعداد کی بنا پر ہو۔ علاوہ اسکے اس طریقے کے نقائص نیابتی سلطنت میں زیادہ نقصان رساں ہیں۔ بلا واسطہ عمومیت کی جمعیت عامہ محض مساوی الحقوق عوام کا مجمع نہیں ہوتی بلکہ اس پر حکام اعلے مقررین اور معززین کا اثر پڑتا ہے اور اس لئے باغلب وجوہ کثرت رائے کا فیصلہ تمام باشندوں کے صحیح خیالات کا ترجمان ہوتا ہے مگر نیابتی عمومیت میں قوم اس طرح مجتمع نہیں ہوتی بلکہ مختلف حلقوں میں منقسم ہوتی ہے جن کا تعداد کے اعتبار سے مساوی ہونا تو ممکن ہے مگر اوصاف کے اعتبار سے مجموعی قوم سے انکا تناسب ایک دوسرے سے بہت مغایر ہوتا ہے اور اس لئے یہ حلقے قوم کے نہایت غیر مساوی ٹکڑے ہوتے ہیں۔

کیا یہ دعوے کرنا ممکن ہے کہ برٹنی کے زرعی اضلاع یا لیون کے صنعتی اضلاع پیرس کے انتخابی حلقوں سے تمامتر مشابہ ہیں، جہاں ہر شخص کو یہ نظر آسکتا ہے کہ حقیقی اتحاد کے بغیر قوم کے نہایت ہی متمول اور نہایت ہی تعلیم یافتہ ارکان، بیشمار مختلف درجوں کے معمولی شہری اور صناع اور ادنے درجے کے انبوہ (جنکا مثل فرانس میں کہیں اور نہیں مل سکتا) سب ایک ہی میں خلط ملط ہیں۔ انتخابی حلقوں کے اس فرق کا عقلی اقتضا یہ ہے کہ انکی رایوں کی مختلف قیمت مقرر ہونا چاہئے، صحیح نیابت اس طور پر حاصل ہوسکتی ہے کہ انتخابات کا انتظام یوں کیا جائے کہ قوم کے ہر ایک عنصر اور ہر ایک مقصد کی نیابت اس تعلق کے تناسب کے ساتھ ہو جو مجموعے کے ساتھ اسے حاصل ہے۔ تعداد کی ایک قدر و قیمت ضرور ہے مگر وہ فی نفسہ کافی نہیں ہے۔ جائداد، تعلیم، پیشے اور طرز زندگی وغیرہ کے مانند دوسرے اوصاف پر بھی خیال کرنا ضروری ہے اور انسب یہ ہے کہ اسے قوم کی محض فرضی زیر تقسیموں پر نافذ کرنیکے بجائے، قوم کے ذی حیات اجزا پر اسکا نفاذ کیا جائے۔

عملی قواعد

پس نیابتی جمہوریت کے لئے دو بنیادی اصول قرار دیے جاسکتے ہیں:۔

(۱) جب تمام اہل ملک مجموعتاً یکجا کارروائی کریں یا جب کل قوم کی رائے لیجائے تو اس وقت صرف رایوں کی تعداد کا شمار کرلینا کافی ہے جیسا کہ بلا واسطہ عمومیت میں ہوتا ہے۔

(۲) برخلاف اسکے جب قوم کے مختلف اجزا کل قوم کے لئے نائب منتخب کرتے ہوں اسوقت صرف رایوں کا شمار کرنا کافی نہیں ہے۔ اجزا کی ترتیب انکے اوصاف کے اعتبار سے

ہونا چاہیئے تاکہ بہترین آدمیوں کے انتخاب کا تیقن ہوسکے اور قوم کے علمی، اخلاقی اور مادی (مالی) عناصر سب کو مناسب حصہ مل سکے۔

نیابتی عمومیت کے مضار و مفاد

نیابتی عمومیت کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اقتدار اعلیٰ کا حق کثیر کو عطا کرتی ہے مگر اس اقتدار کا عملدرآمد ایک قلیل جماعت کو تفویض کرتی ہے۔ اس اطمینان کی غرض سے کہ یہ قلیل جماعت حصۂ کثیر کی مرضی کے موافق عمل کریگی حصۂ کثیر اُن لوگوں کے انتخاب کو اپنے اختیار میں رکھتا ہے جو اُسکے نام سے حکومت کرتے ہیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نئے انتخابات ہوتے رہتے ہیں۔

یہ نظام سلطنت اسے تسلیم کرتا ہے کہ حصۂ کثیر جس حکومت خود اختیاری کا اپنے فطری حق کے طور پر دعوےٰ کرتا ہے، اُسے واقعی عملی طور پر انجام دینے کی نہ اُسے قابلیت ہے نہ فرصت، مگر وہ حصۂ کثیر کو اس قابل سمجھتا ہے کہ اُسے سلطنت کے معاملات کی اتنی سمجھ اور اُن سے اتنی دلچسپی ہے کہ وہ انتخابات میں حصہ لے سکے اور اپنی نیابت کے لئے بہترین آدمیوں کو منتخب کر سکے۔

بلا واسطہ عمومیت کے مقابلے میں یہ نیابتی حکومت عام اہل ملک سے کمتر اظہار قابلیت کی خواہاں ہوتی ہے مگر نمایندوں سے نسبتاً زیادہ اظہار قابلیت چاہتی ہے۔ وہ آزاد و مساوی الدرجہ اہل ملک کی خود اعتمادی پر بھروسا کرتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنے بہترین آدمیوں کے انتخاب میں اعتدال سے کام لیں گے اور جب تک اُنکے نمایندوں کو حصۂ کثیر کا اعتماد حاصل رہے اُسوقت تک وہ بطیب خاطر اُنکی حکومت کے مطیع رہیں گے۔

اقتدار کی کمزوری

متواتر انتخابات حکمرانوں کو محکوموں کی مرضی کے تابع بنا دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی درمیانی وقفے میں اُن محکوموں کو بھی اطاعت کرنا پڑتی ہے۔ رعایا کی آزادی حکومت کے اقتدار کی بہ نسبت زیادہ مستحکم بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ حکام اعلیٰ جمہوریت کے سرگروہ ہونیکے بجائے اُسکے خادم خیال کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ بقول گینرو حکومت صرف اوپر سے ہوسکتی ہے نیچے سے نہیں ہوسکتی مگر نیابتی عمومیت یہ کوشش کرتی ہے کہ جہانتک ہوسکے نیچے سے حکومت کرنیکی صورت قائم رہے۔ پس اس طرح حکومت محض ایک انتظام کے مشابہ ہو جاتی ہے اور سلطنت وسیع پیمانے پر ایک کمپنی یا ایک بڑی اقتصادی

تنقیم بن جاتی ہے۔

واضع قوانین جماعتوں میں اقتدار کی کمزوری بہت ہی کم ظاہر ہوتی ہے بلکہ وہاں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ نائبین اپنے کو قوم کے مرادف سمجھکر اقتدار علی الاطلاق کے مغالطے میں پڑ جائیں گے، برخلاف اسکے، حکومت کو اپنے اختیار کے حقیقتاً مضبوط اور زور دار کرنیکے لئے بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ انتخابات کے کثرت سے ہونے سے حکومت کی حالت غیر مطمئن ہو جاتی ہے اور اُسے قوم کی تغیر پذیر رائے کے تابع بنا دیتی ہے۔ جب تک حصۂ کثیر اُسکی تائید کرتا رہتا ہے اُسی وقت تک اُسے تقویت رہتی ہے اور وہ وسیع اور دوررس تجاویز کو اُسی وقت عمل میں لاسکتی ہے جب یہ تجاویز قوم کے مزاج اور روایات کے موافق ہوں اور اس طرح انکی بقا کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔

شان و شوکت اور اجتماعی قوت کی کمی

حکومت کے ارکان میں نمایش نہیں ہوتی۔ اُنکی حیثیت معمولی افراد قوم کی سی ہوتی ہے۔ شاہی اور اعیانی حکومتیں جس قسم کی شان و شوکت میں گھری ہوتی ہیں اُن کا یہاں کہیں نام و نشان نہیں ہوتا۔ فطری حالت اس قدر مد نظر ہوتی ہے کہ درباری سفارتوں کے مصنوعی طمطراق کی گنجایش یہاں نہیں ہوتی عمومیت اسے زیادہ پسند کرتی ہے کہ اُس کی نمایندگی محض وکیل یا قنصل کے ذریعے سے ہو۔ بہت بڑی مستقل فوج اس کی طمانیت اور آزادی کے لئے ایک مستقل خطرہ ہوگی اور اُسے بڑے پیمانے پر محافظ قوم اور محافظ ملک فوج قائم رکھنا پڑتی ہے۔ ہر جز کی خود مختارانہ کارروائی اور آزادانہ عمل کے مقابلے میں تمام طاقتوں کی اجتماعی حالت کو کم نشو و نما حاصل ہوتا ہے۔

عام تنظیمات کی خوبی

خدمت عامہ کے انتظامات بالعموم اچھے اور بعض اوقات نہایت ہی افضل ہوتے ہیں۔ عمومیت میں ہر شخص اس امر کا متوقع ہوتا ہے کہ وہاں مفید عام اور کار خیر کے بیشمار انتظامات ہوں گے۔ عمدہ سڑکیں ہوں گی، آمد و رفت اور رسل و رسایل کے ذرائع اچھے ہوں گے، بکثرت قومی مدرسے ہوں گے، دلچسپ تہوار اور دعوتیں وغیرہ ہوتی ہوں گی اور اس سے بڑھکر یہ کہ دفتر دار حکام اور انکی صبر آزما کارروائیوں سے نجات ہوگی۔

ترقی علوم کی طرف سے غفلت

دوسری طرف نظام سلطنت میں علوم و فنون کے اعلےٰ و افضل مقاصد کی طرف سلطنت کو متوجہ کرنے میں دوسرے نظامہائے سلطنت کی بہ نسبت زیادہ دشواری پیش آتی ہے جس قوم میں عمومیت کا رواج ہو وہ جب ایسی صورتوں کو پورا کرنا چاہے جنکے مفاد قومی کی

قدر و منزلت کا اندازہ کرنا عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہو تو اُس قوم کیلئے ضروری ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کے بہت اعلٰے درجے پر پہنچ گئی ہو۔

عوام کے اخلاق کا بلند ہونا

اس نظامِ سلطنت سے آزادی کے جس مردانہ احساس کا اظہار ہوتا ہے اور جس پر اسکی بنیاد قائم ہوتی ہے وہ احساس متوسط طبقے کے لوگوں کے خیالات کو بلند کر دیتا ہے، اور یہی متوسط طبقہ سلطنت کا خاص پشت پناہ ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے معاملات عامہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق کے باعث تمام اہل ملک کی ذہنی قابلیت کو نشو و نما حاصل ہوتی ہے اور اُنکے اخلاق میں مضبوطی آجاتی ہے، جب وطن سے کام لینے کے لئے پوری وسعت اور آزادی حاصل ہوتی ہے اور نازک موقعوں پر اہل ملک وطن کے لئے بہت بڑی بڑی قربانیاں کرنیکے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس نظام سلطنت میں اعیانی خیالات کی ترقی کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں اور قوم اس قسم کے خیالات کو بدگمانی اور مخالفت کی نظر سے دیکھتی ہے، لیکن اس خیال کے لوگ اگر اپنے پرنخوت دعووں سے مساوات کے احساس کو صدمہ نہ پہنچائیں اور بہبود عامہ کے لئے وہی جوش وانہماک ظاہر کریں جو بہترین عمومیت پسندوں سے ظاہر ہوتے ہیں تو اس خیال کے لوگوں کی بھی وقعت ہو سکتی ہے۔

تعلیق ۔ روبرٹ فون مول نے (انسائکلوپیڈیا صفحہ ۲۶۴ میں) مذکورۂ بالا دعوی کی مخالفت کی ہے کہ نیابتی عمومیت میں تعداد کے اصول کو قطعی فیصلہ کن نہ قرار دینا چاہئے وہ کہتا ہے کہ "یہ کہنا کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو کہ انتخاب میں حصہ لینے کو افراد کا شخصی حق نہ سمجھنا چاہئے بلکہ اُسے ایک مفوضہ فرض یا عہدہ تصور کرنا چاہئے تاہم اس امر پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ قوم ہی اپنے اقتدار اعلیٰ کو نیابت کے ذریعے سے عمل میں لاتی ہے۔ قوم کے اقتدار اعلیٰ کی بنیاد اس پر ہے کہ ہر شخص کو حکمرانی میں حصہ لینے کا خلقی حق حاصل ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ حکومت کے موجودہ نظریے میں یہی خیال پیش نظر ہے خاصکر روسو نے اپنے نظریے کی بنا اسی پر رکھی ہے مگر نتیجہ یہ ہے کہ یہ خیال شخصی اور جمہوری حقوق کی پیچیدگیوں میں اُلجھکر رہ گیا، اس سے صاف ہو کر کبھی نہیں نکلا۔ اس نظریے میں جسے معاشرتی سلطنت کہتے ہیں اسکی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ موروثی سلطنت کو الٹ دیا ہے جس شخص نے قوم کی وحدت اور اہل ملک کی مجموعی ہیئت کا فرق سمجھ لیا ہے، اس پر یہ غلطی صاف عیاں ہے۔ انتخاب کنندہ رائے دہی کا حق فطرت سے نہیں بلکہ سلطنت سے حاصل کرتا ہے۔ انتخاب کا کوئی سا طریقہ ہو وہ بہبود عامہ کیلئے سلطنت کا ایک انتظام ہے۔ اس باب کے مباحث کیلئے مل کی کتاب "نیابتی حکومت" Representative Government دیکھنا چاہئے۔)

انگریزی مترجم

چوبیسواں باب

سلطنت کی مرکب صورتیں

مرکب سلطنتوں کی مختلف صورتیں

اس وقت تک ہم صرف مفرد سلطنت کے متعلق بحث کرتے رہے ہیں لیکن بعض سلطنتیں مرکب بھی ہوتی ہیں جس سلطنت کے اجزا بجائے خود سلطنت ہوں یا اُن اجزا کی تنظیم و ترتیب سلطنتوں کے مثل ہو اُسے مرکب سلطنت کہتے ہیں۔ ان مخلوط سلطنتوں کے تمام داخلی اجزا ایک نہ ایک مفرد سلطنت کی ہئیت رکھتے ہیں اور محض اس لحاظ سے مخلوط سلطنتوں میں کوئی خاص بات بیان کے قابل نہیں ہے مثلاً ممکن ہے کہ اجتماعی سلطنت اور اس کے منفرد اجزا کی یا سلطنت اعلےٰ اور اسکے توابع کی تنظیم شاہی طریق پر یا نیابتی عمومیت کے اصول کے مطابق ہو۔

لیکن ہمیشہ یہ نہیں ہوتا کہ اجتماعی سلطنت اور اُسکی منفرد سلطنتوں کے نظام سلطنت ایک ہی سے ہوں۔ ۱۸۱۵ء کی جرمانی مشترکیت با اقتدار حکمرانوں کی ایک عدیدیت تھی اور عوام کو اُس میں نیابت کا کوئی حق نہیں تھا درآنحالیکہ اسکی منفرد سلطنتوں میں رفتہ رفتہ آئینی بادشاہی رواج پاتی جارہی تھی۔ انگلستان میں آئینی بادشاہت ہے مگر اُس کے ایشیائی مقبوضات میں خود مختارانہ حکومت ہوتی ہے اور اسکی بعض بعض نوآبادیوں میں برطانوی سیادت و صیانت کے زیر اثر نیم آزاد جمہوریت قائم ہے۔

جہاں قومیت، تمدن اور تاریخی حالات میں بہت زیادہ فرق ہو، وہاں نظام سلطنت کا اختلاف فطرت کے موافق اور نظر بحالات جایز ہے لیکن جہاں حالات یکساں ہوں (جیسا کہ جرمانیا کی مشترکیت میں ہے) وہاں اس قسم کا فرق فطرت اور ہم آہنگی دونوں کے خلاف ہے۔

تمام مرکب سلطنتوں میں ہمیں ایک نئے فرق مراتب سے سابقہ پڑتا ہے یعنی مجمعہ یا اعلےٰ سلطنت کے اقتدار اور جداگانہ سلطنتوں یا توابع کا تعلق فیمابین کیا ہو۔

(۱) تابعیہ دیگر سلطنتوں پر ایک سلطنت کی متعلقانہ حکمرانی

اس فرق مراتب کو پیش نظر رکھ کر حسب ذیل تقسیمیں قرار دیجاسکتی ہیں:-

۱۔ اعلےٰ سلطنت اپنے ماتحت توابع پر خود مختارانہ حکومت کرتی ہو۔ اس صنف میں یورپی طاقتوں کے متعدد، خاصکر ایشیائی اور افریقی مقبوضات داخل ہیں صرف اعلیٰ سلطنت میں آزادانہ نظام عمل ہوتا ہے، توابع غیر آزاد اور غیر ملکی حکومت کے ماتحت ہیں۔ اعلیٰ سلطنت اور ماتحت سلطنتوں کے درمیان تخالف بہت ہی نمایاں ہوتا ہے اور تصادم سے بچنے کیلئے حکمراں سلطنت کو اپنی پوری قوت صرف کردینا پڑتی ہے۔

بقیہ دیگر سلطنتوں کی سیادت یا صیانت۔

۲۔ ماتحت سلطنتوں پر ایک اعلےٰ طاقت کی سیادت قائم ہو، یا ایک زبردست سلطنت اپنے سے کمزور سلطنتوں کی صیانت کرتی ہو۔ اس صورت میں ماتحت یا محروسہ سلطنتوں کے لئے ایک حد تک آزادی ممکن ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں مقدس رومی شہنشاہی اور اس زمانے میں ترکی شہنشاہی اس امر کی مثالیں ہیں کہ ماتحت سلطنتوں سے ملکر ایک مجموعی سلطنت بن گئی۔ موجودہ زمانے میں سیادت کے مقابلے میں محمیت کو ترجیح دیجاتی ہے اور حقیقت میں جب تک دونوں سلطنتوں کی طاقت میں بہت بڑا فرق نہ ہو اُسوقت تک سیادت محض بے معنی ہے، اور ایک آزاد قوم کبھی اُسے پسند نہیں کرسکتی۔ نپولین نے رائن کی دیسی سلطنتہائے متفقہ پر یا انگریزوں نے جزایر یونان[الف] پر یا یورپی طاقتوں نے مولڈیویہ اور ولاخیا پر جس قسم کی سیادتیں قائم کیں وہ اسکی مثالیں ہیں۔

۳۔ نوآبادیوں پر ملک آبائی کی حکومت

۳۔ ملک آبائی اور اُسکی وہ نوآبادیاں جو ابھی تک آزاد نہیں ہوئی ہیں مگر اُنھوں نے کم وبیش ایک مکمل سلطنت کی حیثیت پیدا کرلی ہے ان میں اسی قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ البتہ فرزندانہ اطاعت سے اُس میں گونہ ترمیم ہوجاتی ہے اور وہ زیادہ اعلےٰ وارفع نظر آتے ہیں۔ نوآبادی کے اندرونی انتظام میں جب معقول حد تک آزادی حاصل ہوجاتی ہے،

(الف)۔ ڈینمارک کے شہزادے جارج کو یونان کے تخت پر بہ لقب جارج اول متمکن کرنیکے بعد انگریزوں نے ازخود اس محمیت کو ترک کردیا۔ (انگریزی مترجم)

(ب)۔ (یہ محمیت ۱۸۵۶ء کے معاہدۂ پیرس کی رو سے قائم ہوئی تھی۔ ۱۸۵۸ء میں چھ طاقتوں نے بابعالی سے ان دونوں صوبوں کی حکومت کے انتظام کیلئے ایک قرارداد کی۔ دوسرے سال یہ دونوں صوبے ایک ہی شہزادے کو اپنا والی منتخب کرکے متحد ہوگئے اور اُسوقت سے سلطنت رومانیا کے نام سے مشہور رہیں۔ انگریزی مترجم)

اُسوقت بھی اُسے اپنے بیرونی تعلقات کے معاملے میں ملک آبائی کی صیانت کی ضرورت باقی رہتی ہے اور اس لئے نوآبادی اپنے ملک آبائی کے تفوق کے تسلیم کرنے پر رضامند رہتی ہے۔ اسکی بہی مثال کناڈا اور انگلستان کے تعلقات سے ظاہر ہوگی۔

۴۔ مشترکیت یا ذاتی اتحاد۔

۴۔ مشترکیت یا ذاتی اتحاد میں متعلقہ سلطنتوں کو بالعموم اپنی پوری وقعت اور آزادی حاصل رہتی ہے اگوکہ مخصوص حالات میں عام اغراض کی ضرورت سے قیود بھی عاید ہوسکتے ہیں۔ ہر ایک سلطنت کا انتظام بجائے خود مکمل ہوتا ہے مگر مجموعی سلطنت کو ترقی نہیں ہوتی اور خاص حالات اور زیادہ بیرونی تعلقات کے علاوہ اسکی کوئی شخصیت نہیں ہوتی چونکہ سلطنت کے اجزائے ضروریہ یعنی قانون سازی، حکومت اور اختیار عدالتی اُس میں نہیں ہوتے، اس لئے واقعی سلطنت ہونیکے بجائے وہ سلطنت کا ایک ہیولی ہوتا ہے۔ اسکی حالت ایک داخلی بین الاقوام محالفے اور ایک باقاعدہ سلطنت کے بین بین ہوتی ہے اور اسلئے ناکمل اور تغیر پذیر رہتی ہے۔
سلطنت کی اس صورت میں کل آبادی ایک نسل کی ہوسکتی ہے مگر اُن میں حقیقی متحدہ قومیت نہیں ہوتی اور متفقہ معاشرت و طاقت کی ترقی بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔ جس اتحاد ذاتی میں کم از کم ایک بادشاہ سب کا سرتاج ہوتا ہے اُس میں یہ نقص اُس مشترکیت کی بہ نسبت کم نظر آتا ہے جس میں کوئی متحدہ کارکن مطلقاً نہیں ہوتا مگر یہ دونوں صورتیں عملی ضروریات کیلئے بالکل ناموزوں ہیں۔ موجودہ زمانے میں ۱۸۱۵ء کی جرمانی مشترکیت اس کی بہترین مثال اور اسکے نقائص کی واضح ترین شہادت ہے۔

۵۔ متفقیت شہنشاہی متفقہ اور اتحاد حقیقی۔

۵۔ متفقیت، شہنشاہی متفقہ یا اتحاد حقیقی ان سب کی قدر مشترک یہ ہے کہ متفقہ اور منفردہ دونوں سلطنتوں کا انتظام بجائے خود مکمل ہوتا ہے۔ متفقیت میں منفردہ سلطنتوں کو نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے کیونکہ ہر ایک کی حکومت کلیتاً اُسی سے متعلق ہوتی ہے۔ برخلاف اسکے اتحاد حقیقی میں متفقہ سلطنت کا سرگروہ اپنی خاص مملکت کا حکمران بھی ہوتا ہے اور اس لئے اقتدار اعلی نسبتاً کم حاصل ہوتا ہے۔ (ج)
متفقیت اور متفقہ شہنشاہی میں ایک منتظم قوم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی

(ج) معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بلنچلی خلط بحث میں پڑ گیا۔ اس نے مجموعی سلطنت کے سرگروہ کی آزادی کو خود مجموعی سلطنت کی آزادی سے خلط ملط کر دیا ہے۔ انگریزی مترجم)

انکی ہر منفرد سلطنت کی قوم الگ منتظم ہوتی ہے ۔ چنانچہ ہم اہل امریکہ کا نام لیتے ہیں اور اہل پنسلوینیا اور اہل ورجنیا بھی کہتے ہیں ۔ سوئس قوم کا لفظ بھی بولتے ہیں اور اہل برن اور اہل جنیوا بھی کہتے ہیں ۔ لفظ جرمانی کا بھی استعمال کرتے ہیں اور اس کے ساتھ پروشی، سکسونی اور بویری کے الفاظ بھی بولتے ہیں ۔ لیکن جداگانہ سلطنتیں کسی نوع سے توابع نہیں ہیں ۔ اپنے حدود کے اندر وہ ایک منفرد سلطنت کے مانند آزاد ہیں[1]

تحلوط سلطنت کے شرائط لازمی ۔

ان دونوں قسم کی سلطنتوں کا ایک ہی خطے پر ایک ساتھ قائم رہنا صرف اس طرح ممکن ہے کہ (۱) ہر ایک کے اختیارات کا فرق قطعی طور پر معین کر دیا جائے اور اختلافات کو صلح و آشتی کے ساتھ طے کر لینے کے قواعد مقرر ہو جائیں اور (۲) حکمراں اور بنائی جائیں جہانتک ممکن ہو ایک دوسرے سے آزاد اور علحدہ رکھی جائیں ۔ شخصی فرائض کی علحدگی سلطنتہائے متحدہ امریکہ میں سب سے زیادہ مکمل ہے ۔ اختیارات کا امتیاز سوئزرلینڈ کے نظام سلطنت میں بہت وضوح کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے[2] جرمانیا کی شہنشاہی میں

---

[1] گ ۔ واٹسن نے لکھا ہے کہ '' مشترکیت اور سلطنتہائے منفردہ دونوں کی قوت کو اپنی حد کے اندر خود مختار ہونا چاہئے ۔ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کی جانب سے اختیار تفویض نہیں ہونا چاہئے '' '' سیاسیات کی اصولی خصوصیات '' صفحہ ۴۴) ۔ (بلنچلی کی کتاب کی چھٹی اشاعت کا مدیر کہتا ہے : ۱۸۷۱ء سے ابتک متفقیت کی عام حالت اور خاصکر جرمانی شہنشاہی کے قانونی نظام کے متعلق متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں مگر ابھی تک اس مشکل مسئلے کا کوئی تشفی بخش حل نہیں ہوا ہے ۔

اصل کتاب میں جو خیال ظاہر کیا گیا ہے اسے اولاً توک ول نے پیدا کیا اور واٹسن نے اسے مدوّن کیا ۔ مگر یہ خیال اس اقتدار اعلےٰ کی اصلیت کے منافی ہے جو سلطنت میں سب سے بڑی طاقت ہوتا ہے اور اس لئے اپنے حدود اور اپنے اغراض دونوں کے اعتبار سے وہ ناقابل تقسیم ہے ۔

[2] اس بحث پر کہ سوئسی متفقیت کو قوانین متفقیت کے نافذ کرنے کیلئے کیا ذرائع حاصل ہیں دیکھو ریوٹی من کی کتاب : '' شمال امریکی قانون متفقیت کا مقابلہ سوئسی تنظیمات سیاسی کے ساتھ '' دو حصے ۔ مطبوعۂ زیوریچ ۔

اگرچہ شاہ پروشیا بہ حیثیت شہنشاہ کے تمام متفقیت کا واحد سرگروہ سمجھا جاتا ہے اور منفرد سلطنتوں کے ایوانوں سے ڈائٹ پوری طرح پر ممیز اور علحدہ ہے تاہم متفقہ حکومت اور منفردہ سلطنتوں کے کارکنوں میں بہت قریبی تعلقات ہوتے ہیں۔ متفقیت اور اسکے ارکان کے جداگانہ اختیارات مطلقاً واضح نہیں کئے گئے ہیں بلکہ درحقیقت قصداً غیر معین چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ لیکن ان قواعد کی وجہ سے کہ شہنشاہی قانون ہمیشہ صوبجاتی قانون پر فائق ہوتا ہے اور ہر ایک شہنشاہی قانون کے لئے مجلس متفقہ کی منظوری ضروری ہے۔ متفقہ سلطنتوں کی حفاظت اور خود مختاری کا کافی سامان کردیا گیا ہے اور انھیں قواعد سے اولاً تو اختلافات کی روک ہوجاتی ہے اور اگر احیاناً اختلافات پیدا بھی ہوں تو بہت جلد طے ہوجاتے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مجتمعہ سلطنت معمولاً غیر ملکی معاملات سے تعلق رکھتی ہے اور مستثنیٰ طور پر ایسے اندرونی معاملات میں دخل دیتی ہے جنکی اہمیت عام ہوتی ہے معہذا منفرد سلطنتوں کی خود مختاری سے اندرونی نظم ونسق کا کام لیا جاتا ہے اور شاذ ونادر ہی بیرونی معاملات میں اُن کا دخل ہوتا ہے۔

ساتواں مقالہ

اقتدارِ اعلیٰ اور اُسکے کارکن اعضا

سلطنت کے عمال اور عہدے

پہلا باب

اقتدارِ اعلیٰ کا تصور

اقتدارِ اعلیٰ کی اصطلاح

سلطنت، طاقتِ قومی کا مجسمہ اور اُسکی شخصیت ہے۔ اسی طاقت کو اسکی اعلیٰ ترین منزلت اور وسیع ترین قوت کی حالت میں "اقتدارِ اعلیٰ" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اقتدارِ اعلیٰ کی اصطلاح پہلے پہل فرانس میں پیدا ہوئی اور فرانسیسی ہی علوم میں ابتداءً اِسے نشو و نما حاصل ہوئی۔ بودین نے اُسے قانونِ عامہ کا بنیادی تصور بنا دیا۔ اُسوقت سے اس لفظ اور اس خیال نے جدید نظامہائے سلطنت کے نشو و نما اور زمانۂ جدید کی تمام سیاسیات پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔

از منۂ وسطیٰ میں اقتدارِ شاہانہ یا اقتدارِ اعلیٰ کا لفظ اور بھی زیادہ وسیع معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ ہر ذی اختیار جسکا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا تھا اور جسکا مرافعہ کسی بالا دست کے روبرو نہیں ہو سکتا تھا اسے "صاحب اقتدارِ اعلیٰ" کہتے تھے۔ اعلیٰ ترین عدالتوں کو عدالتِ ذی اقتدار کہتے تھے پس اس طرح سلطنت کے اندر بہت سے ذی اقتدار عہدے اور جماعتیں ہوا کرتی تھیں لیکن بتدریج یہ لفظ خالص انتظامی شاخوں کیلئے متروک ہوتا گیا اور سلطنت کی سب سے اعلیٰ حکمران طاقت کے لئے محدود ہو گیا اور اس لفظ کے تصور کا اطلاق صرف سلطنت کی مجموعی طاقت پر ہونے لگا۔

فرانس میں اقتدارِ اعلیٰ کا تصور۔ اقتدارِ اعلیٰ بحیثیت اختیارِ مطلق

سولھویں صدی کے بعد سے فرانسیسی سیاسیات کے مرکزی میلانات اور فرانسیسی بادشاہوں کے

اختیار مطلق حاصل کرنیکی کوششیں اس خیال پر کلیتہ حاوی ہوگئیں تھیں۔ بودین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اقتدار اعلیٰ سلطنت کی دائمی اور علی الاطلاق طاقت کا نام ہے اور اس لفظ کا یہی مفہوم رائج ہوگیا۔ لوئیس چہاردہم اور ۱۷۹۳ء کی مجلس ملکی کے انقلابی، دونوں یکساں طور پر خود کو مقتدر علی الاطلاق سمجھتے تھے[1] مگر دونوں غلطی میں مبتلا تھے۔ جدید دنیا کی حکومت میں اختیار مطلق کا کہیں پتہ بھی نہیں ہے، اور نہ دنیا میں آزادی مطلق کا کہیں وجود ہے۔ اس لامحدود اقتدار اعلیٰ سے نہ تو سیاسی آزادی کو موافقت ہوسکی اور نہ سلطنت کے دوسرے اجزاء و عناصر کا حق اس سے مطابقت رکھ سکتا ہے اور جہاں کہیں لوگوں نے اسکے عمل میں لانیکی کوشش کی ہے، تاریخ نے اُنکے ادعا کا بطلان ثابت کردیا ہے۔ خود بحیثیت سلطنت ملک کو اقتدار مطلق نہیں حاصل ہے کیونکہ خارجی طور پر وہ دوسری سلطنتوں کے حقوق سے محدود ہے اور داخلی طور پر خود اپنی نوعیت اور اپنے منفرد ارکان کے حقوق کی پابند ہے[2]۔

اقتدار اعلیٰ کے لئے جرمانی زبان کی اصطلاحات

جرمانی زبان میں اس خیال کے کامل طور پر ظاہر کرنیکے لئے کوئی مناسب لفظ نہیں ہے لفظ "اوبرگوالت" Obergewalt یعنی طاقت اعلیٰ یا سوئٹزرلینڈ والوں کا قدیم فقرہ جسکے معنی ہیں: "برترین اور وسیع ترین اقتدار" اس سے صرف اندرونی اقتدار کا خیال پیدا ہوتا ہے، بیرونی آزادی کا تصور نہیں قائم ہوتا۔ لفظ "اسٹاٹس ہوہائت" Staatsheheit سے سلطنت کے اختیار کے بجائے زیادہ تر اس کی عظمت و جلال کا اظہار ہوتا ہے اور "اسٹاٹس گیوالت" Staatsgewalt میں عظمت سے زیادہ طاقت کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ اسلئے اہل جرمانیا

[1] تیرس اپنی "تاریخ انقلاب فرانس" میں لکھتا ہے کہ انقلابیوں کی رائے میں قوم اپنے اس اختیار کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کرسکتی کہ وہ اپنے حسب خواہش جسوقت جو چاہے کرے اور جو چاہے حکم دے۔ یہی اقتدار انکے اقتدار مطلق کی بنا ہے اور یہ اقتدار اُس سے علٰحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ پس قوم یہ نہیں کرسکتی کہ وہ خود کو لوئیس چہاردہم کی فرمانبرداری کا پابند کردے" سئیے نے اس نظریئے کی غلطی کو تسلیم کیا ہے۔

[2] ہنوور کے اعلان مشتہرہ ۱۸۱۴ء میں مرقوم ہے کہ "اقتدار شاہانہ کے حقوق میں مطلق العنانی کا کوئی خیال شامل نہیں ہے۔ برطانیۂ عظمیٰ کا بادشاہ اپنے اقتدار شاہانہ کے اعتبار سے یورپ کے کسی حکمراں سے کم نہیں ہے اور اسکی رعایا کی آزادی اُسکے تخت کے الٹ دینے کے بجائے اسکے استحکام کا باعث ہے۔

اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات

مجبور ہیں کہ اقتدار اعلیٰ کے مفہوم کے ادا کرنیکے لئے دونوں لفظ استعمال کریں یعنی Statshoheitumd Statagewalt لیکن اسکے ساتھ ہی ان جرمانی الفاظ میں ایک خاص فائدہ بھی ہے کہ فرانسیسی اصطلاح کی بہ نسبت اُن سے مغالطہ ہونیکا اندیشہ کم ہے۔ ان میں اختیار مطلق کے مفہوم کے پیدا ہونیکا احتمال نہیں رہتا۔

اقتدار اعلیٰ کے مفہوم میں امور ذیل داخل ہیں :-

۱۔ اقتدار سلطنت کا کسی دوسری سلطنت کی ماتحتی سے آزاد ہونا۔ تاہم اس آزادی کو بھی مطلق آزادی نہیں بلکہ ایک نسبتی آزادی سمجھنا چاہئے۔ قانون اقوام جو تمام سلطنتوں کو ایک باہمی تنظیم قانونی میں منضبط کرتا ہے وہ سلطنتوں کے اقتدار اعلیٰ کے لئے اُس آئینی قانون سے زیادہ منافی نہیں ہے جو سلطنت کے حدود کے اندر اُن کے اختیار عامہ کے عملدرآمد کو محدود کرتا ہے۔ ایک مرکب سلطنت کے اندر منفرد سلطنتیں بھی اقتدار شاہانہ رکھ سکتی ہیں۔ گو کہ غیر ملکی حکمت عملی اور فوج کی نگرانی وغیرہ کے سے اہم معاملات میں وہ سلطنت اعلیٰ کے تابع ہوتی ہیں۔

۲۔ اعلیٰ منزلت عامہ جسے اہل روما Majestas (جلالت) کہتے تھے۔

۳۔ اختیارات عامہ کا مخصوص نہ ہونا بلکہ مکمل اور وافر ہونا۔ اقتدار اعلیٰ چند منفرد اور مخصوص حقوق کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک عام اور وسیع حق ہے۔ یہ مرکزی تصور کی حیثیت رکھتا ہے اور قانون عامہ میں اسکی اہمیت ویسی ہی ہے جیسے قانون ذاتی میں ملک کی اہمیت ہے۔

۴۔ علاوہ اسکے یہ اقتدار اعلیٰ سلطنت میں سب سے بلند شئے ہے۔ پس کوئی سیاسی طاقت اس سے بالاتر نہیں ہوسکتی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے فرانسیسی امرا جب اہم معاملات میں بہ حیثیت آقائے اعلیٰ کے بادشاہ کی اطاعت پر مجبور ہوئے تو پھر وہ خود بااقتدار نہیں رہے۔ جرمانیا کے الیکٹر (حکمرانان ولایات) چودھویں صدی سے اپنی اپنی مملکت کے اندر اپنے اقتدار اعلیٰ کو قائم کئے ہوئے تھے[الف] کیونکہ وہ اختیار اعلیٰ کو

(الف) جرمانیا کے دوسرے حکمرانوں کے مقابلے میں الیکٹروں (حکمرانان انتخاب کنندہ) کے اقتدار اعلیٰ کی بنا اُس مدین فرمان پر ہے جو ۱۳۵۶ء میں چارلس چہارم نے شائع کیا تھا۔ انگریزی مترجم)

اپنے حق خاص کے طور پر اُن مملکتوں میں کام میں لاتے رہے تھے۔

۵۔ چونکہ سلطنت ایک عضوی جسم ہے اس لئے اُسکی خوشحالی کے لئے وحدتِ اقتدار کا ہونا ایک لازمی شرط ہے[۱] اقتدارِ اعلیٰ کے منقسم ہو جانے سے سلطنت معطل اور زوال پذیر ہو جاتی ہے اور اس لئے سلطنت کے تنومند رہنے کیلئے وحدتِ عمل لابدی ہے۔

[۱] ایمانوئیل ہیرمن فشتے کا یہ کہنا کہ سلطنت کا "وحدتِ عمل" ہی اقتدارِ اعلیٰ ہے۔ حد سے بڑھ جانا ہے۔ کامل اختیار و جلالت اقتدارِ اعلیٰ کے اصل الاصل ہیں۔

تعلیقات

(۱) روسو، جسکے نظریات کو فرانسیسی انقلاب نے واقعہ کی صورت میں بدل دیا تھا۔ وہ اقتدارِ اعلیٰ کو "مرضی عامہ" پر مبنی کرتا ہے۔ اور اس طرح اس نے یہ غلطی کی ہے کہ "مرضی اعلیٰ" کو "اقتدارِ اعلیٰ" کے بجائے رکھ دیا اسکے بعد وہ یہ دلیل لایا ہے کہ چونکہ اختیار منتقل ہو سکتا ہے مگر مرضی منتقل نہیں ہو سکتی (معاہدہ معاشری ۲، ۱) اس لئے اقتدارِ اعلیٰ ناقابل انفکاک ہے۔ وہ قانون کو یہ سمجھا ہے کہ قانون بنفسہٖ مرضی کی پیداوار ہے، اسکی تحدید نہیں ہے۔ "مرضی" میں وہ "چاہئے" کو بھول جاتا ہے، اور ابتدائی غلطی متعدد دوسری غلطیوں کا منبع ہے۔ مرضی انسانی جذبہ کا ظہور و بیان ہے مگر اقتدارِ اعلیٰ کسی طرح کی سلطنت کا قانونی ادارہ نہیں ہے۔ مرضی قانون کے عمل میں آنے کی محرک اور اس کے تغیرات کی موجب ہو سکتی ہے، مگر موزنی نفسہٖ قانون نہیں ہے۔ فرمانروا کی مرضی کے لئے اقتدارِ اعلیٰ شرط مقدم ہے مگر اُسکا عکس نہیں ہے۔

(۲) یہ امر طریق استدلال کے خلاف ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ، سلطنت و قانون کا منبع سمجھا جائے اور صاحب اقتدار سلطنت سے بالاتر قرار دیا جائے۔ سلطنت کا اقتدار اور جاہ و جلال سلطنتوں کے وجود کو پہلے ہی تسلیم کر لیتا ہے۔ پس اقتدارِ اعلیٰ قانون عامہ کے اندر داخل ہے۔ اُس سے بالاتر نہیں ہے۔

(۳) کونسٹانس فرانتس کا دعوےٰ یہ ہے کہ اختیار کے بعد سلطنت کا "حس ارادی" اقتدارِ اعلیٰ کی خاص صفت ہے۔ مگر حس اگرچہ حق کے عمل میں لانے اور قانون کے نافذ کرنیکے لئے ضروری ہے مگر خود حق یا قانون کی لازمی شرط نہیں ہے۔

دوسرا باب

قوم یا سلطنت کا اقتدار اعلیٰ اور حکمران کا اقتدار اعلیٰ

اقتدار اعلیٰ کا تعلق کس سے ہے؟ سیاسی جماعتیں اس سوال کے جواب میں مختلف الرائے ہیں بلکہ جو شخص علمی حیثیت سے اسکا مطالعہ کر رہا ہو اُسے بھی بہت سی مشکلات اور تعصبات پر غالب آنا پڑتا ہے۔

۱۔ قوم کا اقتدار اعلیٰ اس طور پر کہ قوم افراد کا مجموعہ سمجھی جائے۔ یہ طوائف الملوکی ہے

ایک رائے یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ قوم کو حاصل ہوتا ہے۔ روسو کے زمانے اور انقلاب فرانس کے وقت سے اس رائے کی اشاعت بہت وسعت سے ہوئی ہے۔ یہ رائے اگر صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ قوم کیا ہے؟ بعضوں کے نزدیک ''قوم'' افراد کے اُس مجموعے کا نام ہے جو سلطنت کے اندر متحد ہو گئے ہوں یعنی سلطنت کو ریزہ ریزہ کر کے ''اعلیٰ اقتدار'' اس بے نظم و ترتیب مجموعے کو یا ان افراد کے حصۂ کثیر کو عطا کر دیا گیا ہے۔ یہ انتہائی بیجکن رائے خود سلطنت کے وجود کے منافی ہے۔ حالانکہ سلطنت ہی اقتدار اعلیٰ کی بنیاد ہے۔ یہ رائے کسی نظام سلطنت سے مطابقت نہیں پیدا کر سکتی کیونکہ وہاں بھی سلطنت کے اختیارات کا عملدرآمد ایک باترتیب قومی مجلس کے ہاتھ میں ہوتا ہے، بے ترتیب مجموعوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔

۲۔ قوم کا اقتدار اعلیٰ اس طور پر کہ اس سے مقصود اہل ملک کی مجلسیں ہوں۔ یہ صورت بلا واسطہ جمہوریت میں ممکن ہے

بعض دوسرے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ سب اہل ملک برابر حیثیت سے ایک یا زاید مجلسوں میں مجموعی طور پر رائے دیں، یعنی یہ لوگ حکومت عوام میں عوام کے اقتدار اعلیٰ کو زیر نظر رکھیں۔ قوم کے اقتدار اعلیٰ کے اصول سے اگر یہی مفہوم ہو اور حکومت اسی صورت تک محدود رہے تو اُسکے بھی ایک معنی ہو سکتے ہیں اور اُسے ہم صحیح سمجھ سکتے ہیں مگر نیابتی عمومیت میں اس اصول کا پوری طرح استعمال نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس طرز حکومت میں بالعموم اقتدار اعلیٰ کا استعمال اہل ملک براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ اپنے نائبوں کے ذریعے سے کرتے ہیں۔ اسکے سوا اور کسی قسم کی حکومت سے یہ اصول مطابقت نہیں پیدا کر سکتا کیونکہ اس میں یہ لازم آتا ہے کہ سلطنت کا سرتاج کمترین باشندۂ ملک کے برابر ہو

اور حکمران چونکہ تعداد میں قلیل ہوتے ہیں لہذا اسلئے وہ اپنی رعایا کے حصۂ کثیر کے تابع ہوجائینگے۔ پس اسکے معنی یہ ہیں کہ جسم سلطنت میں پاؤں کو وہ مرتبہ ملے جو سر کا ہے اور سر پاؤں کی جگہ لے لے۔

بعض وقت مذکورۂ بالا دونوں رائیں ایک دوسرے میں خلط ملط کر دیجاتی ہیں۔ پہلی رائے طوائف الملوکی کی طرف لیجاتی ہے اور دوسری خالص عمومیت کی طرف اور باایں ہمہ اُنکے مؤید عام طور پر یہ دعوے کرتے ہیں کہ وہ تمام و کمال صحیح ہیں لیکن یہی وہ امر ہے جو نظریات میں خطرناک ہے۔ انکا مفہوم اور انکا اقتضا یہ ہے کہ بلا واسطہ عمومیت کے علاوہ اور تمام نظامہائے سلطنت برباد کردیے جائیں۔

ان رایوں کی تائید ایسے فریقوں نے کی ہے جو ایک دوسرے کے بالکل مخالف تھے[1] مگر یہ تمام فریق ہمیشہ وہی رہے ہیں جو موجودہ نظام سلطنت یا حکومت سے شاکی تھے اور اُسے

باایں ہمہ یہ رائیں اسطرح پیش کیگئیں کہ گویا وہ تمام دنیا کی مسلمہ رائیں ہیں۔

---

[1] یہاں ہمارا اشارہ فرقۂ یسوعیون Jesuits کے قاید لائینس کے اور اُسی فرقے کے دو اور شخصوں بیلدرمن اور ماریانا کے نظریوں کی طرف ہے جنھوں نے قوم کے اقتدار اعلےٰ کو اس غرض سے اپنی حمایت میں لے لیا تھا کہ وہ سلطنت کے اوپر کلیسا کے اور بادشاہوں کے اوپر پوپ کے تفوق کو قائم کریں۔ بادشاہوں کو اختیار قوم سے حاصل ہوتا ہے اور صرف پوپ کو خدا کی طرف سے اختیار حاصل ہوتا ہے (سولھویں اور سترھویں صدی میں قوم کے اقتدار اعلیٰ کا اصول جس طرح پیدا ہوا اور ایک طرف فرقۂ یسوعی اور دوسری طرف فلسفی مقننوں نے اُسے جسطرح ترقی دی اسکے لئے گیرکی تصانیف دیکھنا چاہئیں) لیکن اس اصول کی اشاعت میں روسو کا اثر سب سے بڑھا ہوا تھا۔ اُسکے خیال کے موافق افراد کا مجموعہ جو اپنے معاشرتی معاہدے کی رو سے متحد ہو، وہی صاحب اقتدار اعلیٰ ہے یعنی ہر شخص ایک ہی وقت میں صاحب اقتدار بھی ہے اور ماتحت بھی ہے۔ اقتدار اعلیٰ عام مرضی کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو ناقابل انفکاک ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حصۂ کثیر اگر چاہے تو حکام کی اطاعت سے انکار کردے اور نظام سلطنت کو بدل دے۔ ایسا کرنے میں وہ صرف اپنے اقتدار اعلیٰ پر عمل کرتا ہے اور اُسکی مرضی کے مقابلے میں خود نیابتی جماعت کا حاصل کردہ اختیار کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ آخر الکلام یہ کہ روسو کی رائے کے موافق قوم کی جماعت کے لئے کوئی بنیادی قانون نہیں ہوسکتا۔ تمام قوانین صرف قوم کی مرضی کا ظہور ہیں اور جب اُنکی رائے بدل جائے تو قوانین کا اثر زائل ہوجاتا ہے۔

اُلٹ دینا چاہتے تھے۔ فرانسیسی انقلاب کے وقت قوم کا اقتدار اعلیٰ تباہی و بربادی کا ایک مہلک آلہ بن گیا تھا۔ مجلس قومی نے اپنے ۲۰ اپریل ۱۷۹۲ء کے اعلان جنگ میں روسو کے نظریے کو باضابطہ شائع کیا اور لکھا "کہ اس میں مطلق شک نہیں کہ فرانسیسی قوم نے صاف طور پر یہ اعلان کر دیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کا تعلق صرف قوم سے ہے اور وہ اس ناقابل انتقال اختیار کو کسی دوسرے کو تفویض نہیں کر سکتی، اُنکی اعلیٰ مرضی کے عملدرآمد پر اگر کوئی قید عائد ہو سکتی ہے تو وہ آئندہ نسلوں کے حقوق ہیں۔ قوم نے اس امر کو تسلیم کر لیا ہے کہ کوئی رواج کوئی معاہدہ انسان کی سوسائٹی (نظم معاشرت) کو کسی ایسے اقتدار کے تابع نہیں کر سکتا جس کے واپس لینے کا انھیں حق نہ ہو۔ ہر قوم کو خود ہی اپنے لئے قوانین بنانیکا اختیار ہے اور اُنکے بدلنے کا ناقابل انتقال اختیار بھی اُسی کو حاصل ہے۔ یہ کسی ایک شخص کا حق نہیں ہے بلکہ سب کا حق ہے"۔ بادشاہی کے برباد ہو جانیکے بعد جو مجلس عام برپا ہوئی اُس نے اس اصول کے مزید نتائج ظاہر کئے۔

لیکن ہم نے اپنے زمانہ میں بھی اس اصول کا پیرس کے اوتیل دویل (ٹاؤن ہال) میں دوبارہ اعلان ہوتے سنا ہے۔ اس قسم کے اقتدار اعلیٰ کے عمل سے سرکش اہل پیرس نے فروری ۱۸۴۸ء میں آئینی بادشاہی کو منسوخ کر دیا، جمہوریت کا اعلان کیا اور امارت مطلق کو ایک عارضی حکومت کے سپرد کر دیا۔ لامارتین کے ایک سرکاری اعلان میں یہ الفاظ درج ہیں کہ "ہر فرانسیسی جو سن بلوغ کو پہنچ گیا ہو اُسکا شمار ملک کے شہریوں میں ہے اور ملک کا ہر شہری رائے دہندہ ہے اور ہر رائے دہندہ ذی اقتدار ہے یہ حق سب کو یکساں اور کامل طور پر حاصل ہے۔ کوئی باشندۂ ملک دوسرے سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا اقتدار اعلیٰ تجھ سے زیادہ ہے، اپنی طاقت پر غور کرو۔ اسکو کام میں لانیکے لئے تیار ہو جاؤ اور خود کو اپنے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہونیکا اہل ثابت کرو"۔

حق عقل یا انصاف کا اقتدار اعلیٰ۔

بعض فرانسیسی مدبروں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس قومی اقتدار اعلیٰ کے تباہ کن خیال کے مقابلے میں عقل یا انصاف کے اقتدار اعلیٰ کا ایک دوسرا خیال قائم کریں[1]۔ اُنکی یہ کوششیں

---

[1] مثلاً رایر کولرڈ نے اپنی ۲۷ مئی ۱۸۲۰ء کی تقریر میں کہا تھا کہ "سوسائٹی کے دو عنصر ہیں ایک مادی یعنی افراد اور اُنکی قوت و مرضی، دوسرا اخلاقی یعنی قانون، جو اغراض جائز کا نتیجہ ہے۔ کیا تم سوسائٹی کو مادی عنصر سے پیدا کرنا پسند کرتے ہو؟ اس صورت میں افراد یا اُنکی رایوں کے حصۂ کثیر کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا۔

نیک ارادے سے ہوئیں مگر اُن میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اُن لوگوں نے اس طریقے سے قوم کے اقتدار اعلیٰ کے بڑے مصرفوں کے روکنے کی کوشش کی مگر وہ اس امر کو بھول گئے کہ کسی حق کا تعلق "شخص" ہی سے ہوسکتا ہے اور سیاسی تفوق کسی سیاسی شخصیت ہی کی طرف منسوب ہوسکتا ہے۔ ایک غلطی تو یہ ہے کہ سلطنت کی اصولی ہیئت صرف کامل عمومیت ہی تسلیم کیجاتی ہے۔ اب دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اسکے مقابلے میں تخیل پرستی (یا حکومت مذہبی) قائم کی گئی۔ مقصود یہ ہے کہ قوم کا حصۂ کثیر خیالات کے تابع ہوکر کام کرے مگر شخصیت ہمیشہ خیال کی بہ نسبت زیادہ قوی رہتی ہے۔

۵۔ قوم کا اقتدار اعلیٰ باعتبار حیثیت ۔۔۔ کے قوم ایک شخص واحد ہے

ایک دوسری رائے یہ ہے کہ قوم کو ایک شخص واحد سمجھے جو اگرچہ کافی طور پر منظم نہ ہوگئی ہو تاہم اُس میں انتظام کے قبول کرنیکی قابلیت موجود ہو اور اس واحد حیثیت سے اُسکا اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا جائے جسکا مفہوم یہ ہے کہ قوم اپنی زبان، اپنے حسیات، اور اپنے معاشری امتیازات کے ساتھ اپنے حسب مرضی سلطنت میں بھی تغیر کرنیکا حق رکھتی ہے۔

ہم اس سے پہلے (مقالہ ۲، باب ۲ میں) یہ تسلیم کرچکے ہیں کہ ملت People میں قوم nation بننے کا مادہ موجود ہوتا ہے، اور اس لئے ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ اقتدار اعلیٰ کی بنا پڑنے کیلئے یہ ایک فطری شرط ہے مگر یہ صرف امکان ہے اُسکا حصول نہیں ہے۔ اس مفہوم میں قوم کا اقتدار اعلیٰ ایک غیر ترقی یافتہ اور خام شئے ہے جسے سلطنت کا پیشرو کہنا چاہئے۔

۶۔ قوم پرسلطنت کا اقتدار اعلیٰ

یہ ممکن ہے اور یہی ہونا چاہئے کہ ہم nation یا People کو سیاسی مفہوم میں

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ ۔ اسی کو قوم کا اقتدار اعلیٰ کہتے ہیں۔ اگر یہ کورانہ وظالمانہ اقتدار اعلیٰ طوعاً یا کرہاً اپنی حالت کو بدلے بغیر ایک یا چند افراد کے ہاتھ میں منتقل ہوجائے تو یہ نسبتاً ایک زیادہ عاقلانہ اور معتدلانہ قوت بن جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ قوت ہی رہتا ہے۔ یہی مطلق العنانانہ قوت اور امتیاز خاص کا مبدا بن جاتا ہے کیا اسکے برخلاف تم سوسائٹی کو اخلاقی عنصر یعنی "حق" سے پیدا کرنا پسند کرتے ہو؟ ایسی صورت میں انصاف کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ حق کا اصول انصاف ہے۔ آزاد نظامہائے سلطنت کا مقصد یہ ہے کہ قوت کو معزول کرکے انصاف کو حکمران بنادے (اس پر بلنچلی کا اعتراض یہ ہے کہ قوم مادی عنصر نہیں ہے، اور اس خیال میں بھی قانون عامہ کو افراد کی مرضی سے اخذ کرنیکی پرانی غلطی ہے۔ اردو مترجم) دیکھو ارسطو "سیاسیات" مقالہ ۳، فصل ۱۱ ف ۱۹۔ انگریزی مترجم)

ایک زندہ مجسمہ سمجھیں جسکے سر اور اعضا ہوتے ہیں گویا وہ سلطنت کی ذی حیات (یا عضوی) شخصیت ہے۔
جب تک سلطنت ایک شخص کی حیثیت رکھتی ہے اُسوقت تک اسکے لئے خودمختاری، عزت، طاقت، اعلیٰ اختیار اور وحدتِ عمل کا ہونا لازمی ہے۔ اسے ایک لفظ میں یوں کہئے کہ اُسکے لئے "اقتدار اعلیٰ" ضروری ہے۔ سلطنت بحیثیت ایک شخص کے صاحب اقتدار اعلیٰ ہے اور اسی لئے ہم سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ سلطنت سے مقدم، سلطنت سے خارج یا سلطنت سے بالاتر کوئی شئے نہیں ہے۔ یہ خود سلطنت ہی کی قوت اور اُسی کی عظمت و شوکت ہے۔ یہ تمام مجموعے کا حق ہے اور جس طرح کل اپنے کسی جُز سے بالیقین قوی ہوتا ہے اُسی طرح کل سلطنت کا اقتدار اعلیٰ بھی سلطنت کے کسی جُز کے اقتدار اعلیٰ سے یقیناً بالاتر ہے۔
اگر فریقانہ مناقشات نے ابتری نہ برپا کردی ہوتی، تو سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کو قوم کا اقتدار اعلیٰ کہنا بالکل درست ہوتا بشرطیکہ قوم سے ہم صرف منفرد اشخاص کا انبوہ نہ سمجھیں بلکہ اُسے ایک منتظم سیاسی مجموعہ سمجھیں، جس میں سر کو سب سے بلند درجہ حاصل ہو اور ہر عضو اپنی مناسب جگہ پر ہو۔ اس مفہوم میں فرانسیسی مصنفین نے فرانسیسی محاورے کے موافق nation کے اقتدار اعلیٰ سے بحث کی ہے[۳] جو جرمانی زبان کے خلاف ہے جیسا کہ مقالہ ۲ باب ۲ میں مفصلاً بیان ہوچکا ہے۔ غلط فہمیوں سے بچنے کیلئے ہم نے مبہم فقرہ "سلطنت کا اقتدار اعلیٰ" استعمال کیا ہے۔
سلطنت کے اس اقتدار اعلیٰ پر داخلی اور خارجی دونوں طریق پر نظر کیجا سکتی ہے۔

---

[۳] اسٹیٹو نے اپنے رسالے بابت ۱۸۴۳ء میں کہا ہے: کوئی شخص قوم nation کے اقتدار اعلیٰ سے انکار نہیں کرسکتا بشرطیکہ قوم سے آئینی حیثیت سے تمام قوم مراد ہو جس میں بادشاہ اور رعایا دونوں داخل ہوں، اگر قوم کا کوئی جُز صرف اپنے لئے اقتدار اعلیٰ کا دعوےٰ کرے اور کہے کہ "میں سلطنت ہوں" تو اس سے کچھ بحث نہیں کہ وہ جُز بادشاہ ہے، پارلیمنٹ ہے یا گروہ عوام ہے۔ یہ اصول غلط ہے اور غلط اصول کے نتیجے ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں" سسمونڈی نے بھی People کے اقتدار اعلیٰ اور nation کے اقتدار اعلیٰ میں ایسا ہی سخت فرق کیا ہے اور اول الذکر کو مسترد اور ثانی الذکر کو قبول کیا ہے (دیکھو سسمونڈی کی تصنیفات جلد ۱ صفحہ ۸۸)

خارجی حیثیت سے یہ کہ کوئی خاص سلطنت دوسری سلطنتوں کے تعلقات کے اعتبار سے کس حد تک خودمختار ہے۔ کلیسا کے تعلق کو اسی ضمن میں سمجھنا چاہئے۔ داخلی حیثیت سے یہ کہ جماعتِ عامہ کو قانون سازی کا حق کس حد تک حاصل ہے۔

انگلستان میں اس مفہوم میں اقتدارِ اعلیٰ پارلیمنٹ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے[الف] جو کُل قوم کی نیابت کرتی ہے اور جسکا سرگروہ بادشاہ ہوتا ہے[ب]۔ یہ امر صرف انگلستان کے

[الف] انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں پارلیمنٹ میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ججوں نے ہمیں اس امر سے مطلع کیا ہے کہ ہماری شاہی حیثیت کسی وقت بھی اس سے بلند نہیں ہوتی جیسی کہ پارلیمنٹ کے دورانِ اجتماع میں ہوتی ہے، جب کہ ہم اور تم (علی الترتیب) بحیثیت سر اور دیگر اعضا کے ایک جسمِ سیاسی میں متحد ہوجاتے ہیں۔ پس اس ایوان کے ادنیٰ ترین رکن کے خلاف بھی جو کچھ کیا جائے وہ گویا ہماری ذاتِ خاص اور تمام دربارِ پارلیمنٹ کے خلاف کیا گیا ہے۔"

(ب) [بادشاہ کو پارلیمنٹ کا ایک جزو قرار دینے میں بلیکسٹن کو انگلستان کے آئینی مقننوں کی تائید حاصل ہے، چنانچہ بلیک اسٹون اپنی تشریحات Commentarias کی کتاب دوم باب دوم میں لکھتا ہے کہ "پارلیمنٹ کے اجزائے ترکیبی میں ذی عظمت بادشاہ (جو اپنی شاہانہ سیاسی حیثیت سے شریک ہوتا ہے) اور ملک کے تینوں طبقات داخل ہیں۔ مقتدایانِ دین اور امرائے دنیاوی مع بادشاہ کے ایک دیوان میں بیٹھتے ہیں اور عوام اپنے طور پر دوسرے ایوان میں نشست کرتے ہیں"۔ ڈایسی نے اپنی کتاب "قانون نظام سلطنت" میں لکھا ہے کہ "پارلیمنٹ" کا لفظ اگرچہ عام بول چال میں اکثر کچھ اور ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر ایک مقنن کی زبان سے جب یہ لفظ نکلتا ہے تو اس سے مراد بادشاہ، دار الامرا، اور دار العوام سے ہوتی ہے"۔ مگر عام بول چال کی طرح تاریخی حیثیت سے بھی پارلیمنٹ بادشاہ سے ایک ممیز شئے ہے اور اُس سے مراد طبقاتِ رعایا کی وہ مجلس ہے جسکے مشورے اور مرضی کے بغیر بادشاہ کوئی قانون نہیں بنا سکتا۔ یہ ایک پرانی غلطی ہے اور بار بار اسکی تصحیح کی گئی ہے کہ ملک کے تین طبقات سے مقصود بادشاہ، امرا اور عوام نہیں ہیں بلکہ ملک کے تین طبقات پادری، امرا اور عوام ہیں اور جہانتک ان تینوں طبقات کا تعلق پارلیمنٹ سے ہے وہ بقول بلیک اسٹون مقتدایانِ دین امرائے دنیاوی اور ارکان دار العوام ہیں۔ تیرھویں صدی میں قسیسوں سے بحیثیت مجموعی یہ خواہش کیگئی تھی کہ وہ پارلیمنٹ کا ایک طبقہ بن جائیں، مگر انھوں نے اس سے انکار کردیا (اسٹیفن نے اپنی کتاب نظام سلطنت کے قانون و رواج" میں پارلیمنٹ کی یہ تعریف کی ہے کہ "وہ ملک کے تین طبقوں کا اجتماع ہے جن میں سے ایک طبقہ اُس میں شامل ہونے سے برابر انکار کرتا رہا ہے") بغیر بادشاہ کی طلبی کے

نظام سلطنت کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ زمانۂ حال کی نیابتی تنظیمات کا اساسی اصول یہی ہے۔
حکمراں، جسم قوم کا سر سمجھا جاتا ہے مگر اسی وجہ سے وہ قوم کا ایک عضو بھی شمار ہوتا ہے لیکن
سب سے اعلیٰ اقتدار یعنی قانون سازی کا اختیار سرگروہ کو تفویض نہیں ہوتا بلکہ اُسکے ساتھ
ایک نیابتی جماعت بھی ہوتی ہے گویا یوں کہنا چاہئے کہ کل مجموعۂ سلطنت کو یہ کام سپرد ہوتا ہے۔
موروثیت کا خیال جو سلطنت کو حکمراں کی مِلک قرار دیتا ہے اور اس لئے اقتدار اعلیٰ کو صرف
حکمراں تک محدود رکھتا ہے اور مطلق العنانی کا کلیہ جو سلطنت اور حکمران کو ایک ہی شئے
قرار دیتا ہے، یہ دونوں اس امر کو نہیں سمجھتے کہ حکمراں کی تمام طاقت فی نفسہٖ قوم ہی کی مجموعی
طاقت کا نام ہے اور اگرچہ حکمرانوں اور خاندانوں کا زوال ہوتا رہتا ہے مگر قوم اور سلطنت کا
قانونی وجود بدستور باقی رہتا ہے[لے]

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ طبقات کی مجلس پارلیمنٹ نہیں ہوسکتی اور اگر وہ بادشاہ کی طلبی سے نہ منعقد ہوئی تو
اسکی حیثیت صرف ایک "مجلس عارضی" کی ہے۔ (انگریزی مترجم)

لے تسیپ فل سلطنت کے اس اقتدار اعلیٰ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اُسکا دعوے یہ ہے کہ شاہیوں میں
صرف بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا جاتا ہے اور جمہوریتوں میں رعایا کا اور اس خیال کو وہ صرف جرمانیا
ہی کی سلطنتوں تک محدود بھی نہیں رکھتا لیکن اس صورت میں ہم روما کے قانون عامہ کی کیا تعبیر کرینگے
جو شہنشاہی اور جمہوریت دونوں کے تحت میں رومی قوم کو اقتدار اعلیٰ عطا کرتا تھا اور قانون کو ہمیشہ رومی قوم
کی مرضی قرار دیتا تھا۔ معہذا جمہوریت کے زمانہ میں قنصلوں کو شاہانہ اختیارات عطا ہوتے اور اعلیٰ
انتظامی اختیار اور محصول لگانیکا حق سینات کے ہاتھ میں رہتا تھا (جو بالیقین حکومتی اقتدار اعلیٰ کی ایک
صفت ہے) علاوہ اسکے انگلستان کے قانون عامہ کی کیونکر تعبیر کیجائیگی جو پارلیمنٹ اور قوم کے اقتدار اعلیٰ کو
بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ سے ہم آہنگ بنا دیتا ہے۔ قانون قوم کی رو سے جرمانیا کی سلطنتیں بھی اپنے حکمرانوں
سے علٰحدہ صاحب اقتدار اعلیٰ سمجھی جاتی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ جب دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں
اُنکی شخصیت تسلیم کیجاتی ہے تو اُنھیں کے افراد مِلک اور انھیں کے حکمرانوں کے مقابلے میں انکی شخصیت
کیوں نہ تسلیم کیجائے۔ جرمانیا میں قوانین سلطنت کے قوانین ہوتے ہیں اور قومی یا سرکاری قرضے
حکمرانوں کے قرضے سے ایک جداگانہ شئے سمجھے جاتے ہیں۔ منشا یہ ہے کہ حکمرانوں کے مدعی یا مطلق العنانی
اختیار کی روایات باقیات کے باوجود جرمانیا کا قانون عامہ تمام دوسری متمدن سلطنتوں کی طرح

۷۔ حکمرانوں کا اقتدار اعلیٰ

تمام قوم کے اقتدار اعلیٰ کے علاوہ سلطنت کے اندر ایک اور اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے یہ اقتدار سلطنت کے سب سے اعلیٰ رکن، سردار یا حکمرانوں کا اقتدار ہے اور چونکہ یہ اقتدار شاہی میں بہت صاف نظر آتا ہے اس لئے اُسے بادشاہ کا اقتدار شاہانہ کہنا چاہیئے۔ تنظیم سیاسی کے تمام دیگر ارکان اور منفرد اہل ملک کے مقابلے میں قوم کے بادشاہ کو ایک مفہوم میں صاحب اقتدار اعلیٰ کہتے ہیں اور ہر ایک شاہی سلطنت میں اقتدار اعلیٰ بادشاہ ہی کے طرف منسوب ہوتا ہے۔

سلطنت کا اقتدار اعلیٰ اور بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ اس سے اقتدار اعلیٰ کی اس طرح تقسیم نہیں ہو جاتی کہ اسکا نصف حصہ قوم سے متعلق ہو جائے اور نصف حصہ بادشاہ سے۔ اختیارات کے لئے کوشش کرنیوالی دو رقیب طاقتیں نہیں ہوتیں اختیارات کی وحدت وعمومیت دونوں میں شامل ہے مگر یہ عیاں ہے کہ کل جس میں سر بھی داخل ہے تنہا سر سے برتر ہے۔ تمام قوم یا سلطنت قانون بناتی ہے مگر سرگروہ کو جو اعلیٰ اختیارات حاصل ہوتے ہیں، قانونی حدود کے اندر وہ انھیں عمل میں لانیکے لئے بالکل آزاد ہوتا ہے۔ سلطنت کا اقتدار اعلیٰ بالتخصیص قانون سے تعلق رکھتا ہے اور بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ حکومت یا نظم ونسق سے متعلق ہوتا ہے۔ جہاں اول الذکر بیکار ہوتا ہے وہاں موخرالذکر کام دیتا ہے۔ واقعتاً ان دونوں میں تصادم بہت کم ہوتا ہے اور اصولاً بالکل ناممکن ہے کیونکہ اسکے معنی یہ ہونگے کہ تنہا سرگروہ تمام سلطنت سے جس میں خود وہ سرگروہ بھی داخل ہے مقابلہ کرے اور یہ بمنزلہ اسکے ہے کہ کوئی شخص خود اپنے سے مقابلہ کرے۔

قوم کے عمومی اقتدار اعلیٰ اور بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ میں کبھی اصلی اتفاق نہیں ہوسکتا مگر

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ یہ تسلیم کرتا ہے کہ قوم محض رعایا کے مجموعے سے ایک جداگانہ اور بالاتر شئے ہے اور سلطنت کی ایک ہستی اور اُسکی ایک عظمت وقوت ہے جسکا خاتمہ صرف بادشاہوں کی عظمت وقوت پر ہو جاتا ہے۔ میں تسو بُفل کی اس رائے کو مانتا ہوں کہ اقتدار اعلیٰ کو تمام وکمال بادشاہ کے لئے تسلیم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُسکا اقتدار غیر محدود ہو گیا ہے لیکن زمانۂ جدید کی تاریخ نے بلابحث وتکرار یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ اخراجی اصول جرمانیا اور نیز لاطینی ممالک میں مطلق العنانی اور قومی حقوق کی تحقیر کے لئے ایک زبردست موید بن گیا ہے۔

سلطنت کے اقتدارِ اعلیٰ اور بادشاہ کے اقتدارِ اعلیٰ میں ویسی ہی موافقت ہے جیسی موافقت کل جسم انسان اور اُسکے سر کے درمیان ہوتی ہے۔

تعلیق۔ قوم کے اقتدار اعلیٰ کا فقرہ بعض وقت حصۂ کثیر کا غلبہ ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ سلطنت کی اُس شکل یا حکومت کے اُس طرز کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے جو قوم کے حصۂ کثیر کی ہستی و بہبود کے منافی ہونیکے باعث بقا کی قابلیت نہیں رکھتی یا یہ کہ سلطنت یا حکومت کی صورتِ موجودہ قوم کے حسب خواہ ہے۔ یہ خیال فی نفسہ صحیح ہے مگر اس کے اظہار کا انداز بُرا اختیار کیا گیا ہے۔

علاوہ اس کے اگر قوم کے اقتدار اعلیٰ کا یہ مفہوم ہو کہ سلطنت کا اختیار اولاً قوم کے حصۂ کثیر کی مرضی سے اخذ کیا گیا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ بہت سی عمومیات در (رومی شہنشاہی یا فرانسیسی شہنشاہی کے مثل) بعض بعض شاہیوں کے نظام سلطنت کی بنیاد بھی (کم از کم نظری یا اصولی اعتبار سے) قوم کے حصۂ کثیر کے رضامندانہ فعل پر مبنی ہے۔ علیٰ ہذا سوئزرلینڈ کے متعدد صوبوں کے نظام سلطنت میں قوم کو صاحب اقتدار اعلیٰ نہیں قرار دیا ہے بلکہ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ "اقتدار اعلیٰ بہ حیثیت مجموعی قوم کو حاصل ہے اور مجلس عظمیٰ اُسے عمل میں لاتی ہے"، لیکن اس اصول کا اطلاق بھی تمام سلطنتوں پر نہیں ہوسکتا اور اقتدار اعلیٰ کا لفظ جس سے ایک دائمی حق کا اظہار ہوتا ہے جب کسی مخصوص اور عارضی کارروائی پر عائد کیا جاتا ہے تو ناموزوں ہو جاتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ جیسا کہ اکثر عملاً وقوع پذیر ہوتا رہا ہے، قوم کے اقتدار اعلیٰ کے معنی اگر یہ سمجھے جائیں کہ قوم حکومت سے علٰحدہ شئے ہے اور اس قسم کی قوم کو یا کسی طاقتور اور پرجوش مجمع کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے حکومت کو اُلٹ پلٹ کر دے یا نظام سلطنت کو تباہ کر دے تو یہ ایسا خیال ہے جسے قطعاً مردود قرار دینا چاہئے اور جو عمومی اصولوں سے بھی کسی طرح موافق نہیں ہوسکتا۔

(انگلستان میں حال کے زمانے میں اقتدار اعلیٰ کے مسئلے پر زیادہ تر آسٹن کی مشہور تعریف کے موافق بحث ہوئی ہے۔ آسٹن نے اپنی جورسپروڈنس (اصول قانون) کے چھٹے خطبے میں اقتدار اعلیٰ کی تعریف یہ کی ہے کہ اگر کوئی معین و مشخص بالاتر انسانی ہستی عادتاً کسی اپنی ہی سی بالاتر ہستی کی فرماں پذیر نہ ہو اور ایک مخصوص سوسائٹی کا سوادِ اعظم عادتاً

اُسکا فرماں پذیر ہو تو یہی معین و مشخص بالاتر ہستی اُس سوسائٹی میں صاحبِ اقتدارِ اعلیٰ ہے اور یہ سوسائٹی جس میں وہ بالاتر ہستی بھی شامل ہے ایک سیاسی اور خود مختار سوسائٹی ہے" اقتدارِ اعلیٰ کے تصور کا یہ جبر و تجزیہ تاریخ کے بالکل خلاف اور عملی حیثیت سے عسیر المعمول ہے۔ مین نے اپنی تصنیف "ابتدائی تاریخ تاسیسات" کے خطبہ ۱۲ و ۱۳ میں اس پر نکتہ چینی کی ہے۔ انگریزی مترجم۔)

تیسرا باب

(الف) سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کا تجزیہ

۱۔ جلالت

ہر ایک منضبط شدہ قوم کا یہ حق ہے کہ اُسکا رتبہ اور عظمت تسلیم کی جائے اور اُسکی وقعت کیجائے۔ رومی اسے "جلالت سلطنت" کے نام سے موسوم کرتے تھے اور رومی سلطنت کی عزت، اختیار، بلکہ اُسکی ترتیب و تنظیم تک کے خلاف جو کام ہوتا وہ "جلالت سلطنت" کے خلاف ایک جرم سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ خود مختاری

سلطنت کا دوسری سلطنتوں سے آزاد اور خود مختار ہونا۔ اگر کوئی سلطنت کسی دوسری سلطنت کے سیاسی تفوق کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو۔ تو اُسکا اقتدار اعلیٰ زائل ہوجاتا ہے۔ اور وہ اُس دوسری سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کے تابع ہوجاتی ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر طرح کی تبعیت سے سلطنت کا اقتدار اعلیٰ کلیۃً ضائع ہوجائے اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ تبعیت کامل نہ ہو۔ مرکب سلطنتوں، مشترکیتوں، متفقیتوں اور متفقی شہنشاہیوں میں مختلف سلطنتیں اگرچہ بعض اعتبارات سے مجموعے کے تابع ہوتی ہیں تاہم اُن میں اضافی طور پر اقتدار اعلیٰ باقی رہتا ہے۔ یہ اختیار اگرچہ خارجی حیثیت سے محدود ہوتا ہے مگر داخلی حیثیت سے محدود نہیں ہوتا، چنانچہ سوئٹزرلینڈ میں صوبوں کا اقتدار اعلیٰ مجموعی اقتدار اعلےٰ سے بالکل علٰحدہ سمجھا جاتا ہے۔ علیٰ ہٰذا شمالی امریکہ اور جرمانی شہنشاہی میں اتحاد یا شہنشاہی کے اقتدار اعلیٰ اور متحدہ سلطنتوں کے اقتدار اعلیٰ میں فرق ہے۔

کسی منفرد سلطنت کا اضافی اقتدار اعلیٰ اُسی حالت میں ممکن ہوتا ہے جب کہ خود اُسکا ایک سیاسی نظام موجود ہو، یعنی قانون سازی اور نظم و نسق وغیرہ کے سے ضروری اعضا خود اُسی میں موجود ہوں، اور وہ کسی بڑی سلطنت کا محض ایک صوبہ نہ بن گئی ہو۔ اس تغیر حالت کے لئے ایک قطعی حد فاصل قائم کرنا بعض وقت مشکل ہوجاتا ہے۔

خارجی امور میں آج کل سلطنت کا اقتدار اعلیٰ بالعموم مجلس وضع قوانین کے بجائے سلطنت کے صدر یا سرتاج کی ذات سے ظاہر کیا جاتا ہے مگر یہ امر اصول کی بنا پر نہیں ہے۔

محض آسانی کے خیال سے ایسا کیا جاتا ہے۔

حق حکومت کہ پسند کرنے اور بدلنے کا اختیار

اندرونی تعلقات کے اعتبار سے اقتدار اعلےٰ کا اظہار سب سے پہلے رعایا کے اس حق سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی سیاسی ہستی کے لئے جو شکل چاہے پسند کرلے اور اگر ضرورت سمجھے تو اُسے بدل بھی دے۔ اسے قوم کا اختیار ترکیبی کہتے ہیں[1]۔ یہ اختیار قوم کے ایک جُز یعنی محض اُسکے حصۂ کثیر کو تفویض نہیں ہوسکتا بلکہ بلا شک وشبہ اس حق کا تعلق ایک منظم قوم کی مجموعی حیثیت سے ہے۔ رعایا فرداً فرداً قوم کے حکم کی مخالفت نہیں کرسکتی خواہ اس میں اُسکے سیاسی حقوق کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچتا ہو کیونکہ جب تک کہ ہر شخص فرداً فرداً قانون عامہ کے معاملات میں اطاعت نہیں کریگا اُسوقت تک سلطنت اپنی صورت، اپنا ربط، اور اپنا نظم قائم نہیں رکھ سکتی۔

اصلاح

تاہم اخلاقی یا آئینی، کسی اعتبار سے بھی یہ امر نظر انداز کرنیکے قابل نہیں ہے کہ آیا تغیر اصلاح کی صورت میں واقع ہوتا ہے یا انقلاب کی صورت میں۔ اصلاح کے لئے امور ذیل لازمی ہیں:

(۱) تغیر نظام سلطنت کی موافقت کے ساتھ واقع ہو۔ یعنی ایک نیابتی جماعت کے توسط سے عمل میں آئے اور بحالات ظاہر آئینی حد کے اندر ہو۔

---

[1] واشنگٹن نے اپنے ۱۷۹۶ء کے الوداعی خطبے میں کہا تھا کہ "ہمارے سیاسی انتظامات کی بنیاد قوم کے اس حق پر ہے کہ وہ اپنے نظامہائے سلطنت کو خود بنا سکتی اور اُن میں ترمیم کرسکتی ہے لیکن جو نظام سلطنت کسی وقت میں جاری ہو جب تک کہ وہ تمام قوم کی بیّن اور قطعی رائے سے نہ بدلا جائے اُسوقت تک اسکی اطاعت کرنا ہر شخص کا مقدس فرض ہے۔ اس خیال ہی سے کہ قوم کو حکومت کے قائم کرنیکا اختیار واستحقاق ہے یہ لازم آجاتا ہے کہ قوم کے ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ قائم شدہ حکومت کی اطاعت کرے۔ قوانین کے عملدرآمد میں کسی قسم کی مزاحمت، اور کوئی اجتماع، کوئی انجمن کیسی ہی دلفریب نام سے کیوں نہ ہو لیکن اگر اسکی اصلی غرض یہ ہے کہ قائم شدہ قوتوں کے بحث مباحثے یا انکی کارروائی کو اپنی مرضی کے موافق چلائے یا اُن پر حاوی ہوجائے یا اُن کے مخالف کارروائی کرے یا انھیں مرعوب کردے تو یہ تمام امور اس بنیادی اصول کے تباہ کرنے اور قوم کو ہلاکت کی طرف لیجانیوالے ہیں۔"

(۲) یہ تغیر نظام سلطنت کے منشائے اصلی کے موافق ہو یعنی قدیم تنظیمات اگر طرف کیجائیں تو یہ ضروری ہے کہ وہ فی الواقع فرسودہ اور بے جوڑ ہوگئی ہوں اور نئی تنظیمات کے لئے نئے حالات نے راستہ صاف کر دیا ہو۔

انقلاب

اگر نظام سلطنت کے شرائط ظاہری یا اُسکے منشائے باطنی سے انحراف کیا گیا تو پھر یہ تغیر اصلاح نہیں رہتا بلکہ انقلاب ہو جاتا ہے۔

اصلاح کا حق سلطنت کی قوت و طاقت کا ایک لازمی اظہار ہے۔ اس حق میں رکاوٹ پیدا کرنا قوم کے نشو و نما سے انکار کرنا اور انقلاب کی بنا قائم کرنا ہے۔

آیا انقلاب کا حق بھی کوئی شئے ہے

استبدادی نظریۂ سلطنت کا دعوے ہے کہ انقلاب بھی قوم کا ایک حق ہے لیکن یہ بات قانون عامہ کے تصور ہی کے خلاف ہے۔ انقلاب کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو قائم شدہ نظام سلطنت بزور توڑ دیا جائے یا اُسکے اصولوں سے روگردانی کیجائے۔ پس اصولاً انقلابات کا کوئی حق نہیں ہو سکتا مگر اسکے ساتھ ہی اس میں بھی شک نہیں کہ وہ پر زور نوامیس قدرت سے ہیں جو قانونِ عامہ کو بدل دیتے ہیں۔ جو طاقتیں شورانگیز طور پر قوم میں تحرک پیدا کر دیتی ہیں اُن پر جہاں کوئی روک نہیں ہوتی وہاں آئینی قانون کے باقاعدہ عملدرآمد میں خلل پڑ جاتا ہے۔ انقلاب کی موجودگی میں قانون بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ درحقیقت عملی سیاسیات کا یہ بہت بڑا کام ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو انقلابی تحریکات کو آئینی اصلاح کی شاہراہ پر چلا دے۔

مستثنیٰ حالت کے سوا انقلاب کا کوئی حق نہیں ہو سکتا۔ صرف یہی ضرورت اسے روا رکھ سکتی ہے کہ کوئی قوم اپنی ہستی کے بچانے یا اصلاح کے تمام راستوں کے بند ہو جانیکے باعث ترقی حاصل کرنیکے لئے مجبور ہو جائے۔ نظام سلطنت، قوم کا صرف ظاہری انتظام ہے اور اگر اُسکی وجہ سے خود سلطنت تباہی کے گرداب میں پڑ جائے یا بہبود عامہ کے اہم مفاد کو خطرہ پیش آجائے تو پھر "ضرورت کسی قانون کو تسلیم نہیں کرتی"[۲]

[۲] نی بور جو ایسا سخت قدامت پرست تھا کہ جولائی ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی انقلاب سے اُسکا دل ٹوٹ گیا تھا، وہ اپنا یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ "اس اصول سے انکار کرنا کہ ضرورت کسی قانون کو تسلیم نہیں کرتی" بدترین ظلم و ستم کی اجازت دیتا ہے۔ جب کوئی قوم پیروں کے نیچے روندی جا رہی ہو اور اسکے ساتھ ایسا

۴- وضع قوانین

اقتدار اعلیٰ کا ایک دوسرا منصب ہے ضروری قوانین کا وضع کرنا۔ نظام سلطنت بنانے کے اقتدار کی طرح توضیع قوانین کا اختیار بھی سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کا نتیجہ اور ساتھ ہی ساتھ اس کا صحیح مظہر ہے۔

۵- سلطنت کی تمام دوسری طاقتوں کا اس اقتدار اعلیٰ کے تابع ہونا۔

اصولاً تمام اختیارات عامہ اسی اقتدار اعلیٰ کے تابع ہوتے ہیں، چنانچہ نظام سلطنت اور وضع قوانین کے ذریعے سے اقتدار اعلیٰ کی تمام دوسری نوعیتیں محدود و مرتب کیجاتی ہیں۔ نظامِ سلطنت کے ترتیب دینے اور قانون کے وضع کرنے میں سلطنت کا اقتدار اعلیٰ عملی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے ورنہ عام طور پر وہ ساکت وصامت رہتا ہے۔ شاہی میں یہ خاص بات ہے کہ دوسری قوتوں کے روز روز کے تغیر پذیر افعال بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ میں مجتمع ہو جاتے ہیں۔ قوم بحیثیت مجموعی ساکت رہتی ہے اور اُسکا سرگروہ بالواسطہ یا بلاواسطہ حکام وعمال کے ذریعے سے کام کرتا رہتا ہے۔

لیکن اگر وہ رکن جسے باقاعدہ کام کی فکر کرنا پڑتی ہے، کام کرنیکے قابل نہ رہے مثلاً یہ کہ تخت سلطنت خالی ہو جائے اور نظامِ سلطنت کے موافق کوئی جانشین نامزد نہ ہوا ہو تو اس کمی کو پورا کرنیکے لیے سلطنت کا اقتدار اعلیٰ خود عمل کرنے لگتا ہے۔

۶- عدم ذمہ داری

اعلیٰ نقطۂ خیال سے انسان کبھی غیر ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ خود قومیں نہ صرف خدا کے ابدی حکم ہی کی جوابدہ ہیں بلکہ تاریخ کے واقعات کے سامنے بھی وہ جوابدہ ہیں۔ تاہم یہ غیر ممکن ہے کہ سلطنت کے اندر کوئی ایسا محکمہ قائم کیا جائے جسکے روبرو خود قوم بہ حیثیت مجموعی یا اُسکا وہ قائم مقام جسے اعلیٰ اختیار تفویض ہو جوابدہی کے لئے طلب کیا جاسکے، کیونکہ اس صورت میں خود سلطنت اپنے ایک محکمے کے تابع ہو جائیگی اور اس طرح کل جزو کے اور جسم ایک عضو کے تابع ہو جائیگا۔ اگر سلطنت اپنے اقتدار اعلیٰ کے عمل کرنیکے لئے

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ ظالمانہ برتاؤ ہو رہا ہو جسکی اصلاح کی کوئی توقع نہ ہو جسکی ستم شعاری نہ مردوں کے حقوق کا خیال کرے اور نہ عورتوں کی عزت کا پاس، تو یہ ایک انتہائی ضرورت کا موقع ہے اور ایسی صورت میں کوئی فعل اس سے زیادہ حق بجانب نہیں ہو سکتا کہ ایسے ظالموں کے خلاف خروج کیا جائے۔ جو شخص اس سے انکار کرے وہ ایک بدبخت ملعون ہے۔

کسی دوسری سلطنت کو جوابدہ ہو تو اس طرح اُسکا اقتدارِ اعلیٰ محدود ہو جائیگا۔
بین الاقوامی قانون کی ترقی یا ایک عالمگیر سلطنت کے قائم ہو جانے سے یہ ممکن ہے کہ قوموں کی قانونی ذمہ داری کا کوئی انتظام ہو جائے، اس وقت تو یہ محض ایک خیال ہے ممکن ہے کہ آئندہ زمانے میں حقیقت ہو جائے۔
تمام مخصوص طاقتیں سلطنت کے اقتدارِ اعلیٰ کے ارکان کے روبرو جوابدہ ہیں۔ وزرا اور بڑے سے بڑے عمال پر انکے نظم و نسق کی جوابدہی لازم ہے۔

۸۔ سلطنت کی تمام دوسری طاقتیں اسی اقتدارِ اعلیٰ کو جوابدہ ہیں۔

تعلیق ۔ اس زمانے کی مجالس ترکیبی بالعموم ۱۷۸۹ء کی فرانسیسی قومی مجلس کو نظیر قرار دیکر یہ خیال کرتی رہی ہیں کہ اُنکی کارروائی سلطنت کے اقتدارِ اعلیٰ پر نہیں بلکہ (روسو کے خیال کے موافق) قوم کے اقتدارِ اعلیٰ پر مبنی ہے لیکن روسو خود اس سے بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ وہ تمام نیابتی مجلسوں کے کامل اقتدارِ اعلیٰ سے منکر ہے اور اسکا یہ خیال ہے کہ قوم کا سوادِ اعظم جس وقت چاہے بغیر کوئی وجہ ظاہر کئے ہوئے، براہ راست اپنی مرضی کو مجلس پر عائد کر سکتا ہے اور ایسا کرنا بالکل بجا ہے۔ اس اصول کے نتائج اکثر خوفناک دُمدار ستاروں کی طرح سیاسی اُفق پر نمودار ہوتے رہے ہیں اور اُن با اقتدار جماعتوں کو ہیبت زدہ کر دیا ہے جنھوں نے خود ہی عوام کالانعام کو بھڑکایا تھا۔

چوتھا باب

(ب) حکمراں کا اقتدار اعلےٰ

موجودہ زمانے میں سلطنت کے سرگروہ کا اقتدار اعلےٰ صرف شاہی میں تسلیم کیا جاتا ہے اقتدار اعلیٰ کا فی نفسہٖ مستحق بادشاہ ہی ہوسکتا ہے، رئیس جمہوریہ اُسکا دعویٰ نہیں کرسکتا گو کہ شاہانہ اختیارات کو عمل میں لاتا ہے۔

موجودہ زمانہ کی جمہوریتوں میں سلطنت کے سرگروہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم نہیں کیا جاتا

قدیم رومی جمہوریہ میں "جلالت" قنصلوں کی طرف منسوب تھی جنھوں نے شاہی اختیار کو باخود باتقسیم کرلیا تھا۔ بعد کو یہ جلالت، سینات سے بھی منسوب ہوگئی۔ جدید جمہوریتیں اقتدار اعلیٰ پر زیادہ رقیبانہ نظر رکھتی ہیں اور حکومت کے سرگروہ اعلیٰ کو محض قوم کا حکم بردار سمجھتی ہیں اور قوم کے اقتدار اعلیٰ کے حقوق اسکی طرف منتقل نہیں ہوسکتے[۱]۔

اکثر یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ حکمراں کے اقتدار اعلےٰ کا وجود صرف موروثی شاہیوں میں پایا جاتا ہے، لیکن ایسا خیال کرنا، درحقیقت فرمانروا کے نفس اختیار کو مبدا اختیار سے خلط کردینا ہے۔ ایک منتخب شدہ فرمانروا کو اپنی ذاتی حیثیت سے[الف] اقتدار اعلیٰ کا حق کسی موروثی فرمانروا سے کم نہیں ہوتا۔ انگلستان کے بادشاہ جارج اول کا اقتدار شاہانہ کسی طرح اُسکے جانشینوں سے کم نہیں تھا حالانکہ اُسی کے ذات سے یہ نیا خاندان شروع ہوا تھا۔

لیکن شاہیوں میں خواہ وہ انتخابی ہوں یا موروثی۔ یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

تاہم علمی حیثیت سے ہم حکمراں کے ذاتی (original) اور تفویضی (derived)

اس اقتدار کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں (۱) ذاتی

---

[۱] روسو حکمراں کے اقتدار اعلیٰ کو اس بنا پر مسترد کرتا ہے کہ مرضی عامہ کل قوم ہی سے متعلق ہوسکتی ہے۔ قوم کے کسی جزو کی مرضی ایک محدود مرضی ہے اور اس لئے زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ فیصلے صادر کرے، قوانین کا بنانا صرف کل قوم ہی کے وسیلے سے ہوسکتا ہے لیکن اقتدار اعلیٰ کو صرف قانون سازی تک محدود رکھنا اور حکومت کے لئے اُسے وسیع نہ کرنا غلطی ہے۔

(الف) (بلنچلی نے یہاں "ولیم (آرنج)" کا نام لیا ہے۔ منتخب شدہ بادشاہ کی یہ مثال زیادہ موزوں ہے مگر ولیم نے کوئی خاندان نہیں قائم کیا۔ انگریزی مترجم)

اقتدار اعلےٰ میں فرق قائم کرسکتے ہیں لیکن اس فرق کا اطلاق سلطنت کے اقتدار اعلےٰ پر نہیں ہو سکتا کیونکہ سلطنت کا اقتدار اعلیٰ ہمیشہ اسکا جزو ذاتی ہوتا ہے اول الذکر اقتدار وہ ہے جو آبائی یا قابضانہ حقوق کے طور پر اصلاً حکمراں کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس صنف میں موروثی حکمران اور فاتح، اور وہ حکمراں داخل ہیں جو خود تاج شاہی اپنے سر پر رکھ لیں جیسا کہ چارلس اعظم اور فریڈرک اول شاہ پروسیا نے کیا تھا اور یہی حال جرمانیا کے اُن منتخب شدہ شہنشاہوں کا تھا جو اپنے اقتدار اعلیٰ کا ماخذ انتخاب کنندوں کو نہیں بلکہ خدا کو سمجھتے تھے۔

۲۔تفویض ثانی الذکر اقتدار کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ قوم یا انتخاب کنندوں نے اُسے اقتدار تفویض کیا ہے، چنانچہ روما میں شہنشاہی اختیار قوم کا عطا کردہ تھا[۵۲] موجودہ زمانے کی انتخابی شاہیاں بھی اسی قسم کی ہیں۔

سلطنت کے مختلف فرائض پر بحث کرنیکے بعد ہم حکمراں کے اقتدار اعلیٰ کا تجزیہ کرینگے۔

---

[۵۲] دیکھو مقالہ ۶، باب ۱۰۔

پانچواں باب

تقسیم اختیارات

(۱) زمانۂ قدیم کی ابتدائی مجلسیں

بلاواسطہ مجالس قانون سازی

مجالس وضع قوانین کے نشو ونما کے لحاظ سے زمانۂ حال کی سلطنتیں قدیم سلطنتوں کے مقابلے میں بہت ہی اعلےٰ درجۂ تکمیل کو پہنچ گئی ہیں۔ قدیم زمانے میں بھی یہ اصولی خیال پیدا ہوگیا تھا کہ قوم وضع قوانین میں حصہ لیتی ہے اور مجلس واضع قوانین میں قوم کی نیابت ہوتی ہے مگر اُس زمانے میں اہل شہر یکجا جمع ہو جاتے تھے اور اس طرح وہ اس فرض کو براہ راست انجام دیتے تھے۔

یونان کی مجالس عامہ مقابلۃً بہت ابتدائی حالت میں تھیں۔ اتھینز کے نکلسیا (جائے اجتماع) یا مجمع میں اہل شہر کا ایک بے ترتیب مجمع ہو جاتا تھا آدمی گن لیے جاتے تھے اور ہر شخص کو بولنے کا حق حاصل ہوتا تھا۔ اس کے برخلاف روما کی کومیشیا (مجلس عام) طبقات میں منقسم تھی اور صرف اعلیٰ حکام کے حسب ہدایت کارروائی کرتی تھی[1]

نیابتی مجالس سے کمتر درجے پر ہیں

اس طریقے میں بہت سی حقیقی خرابیاں ہیں جنکا تدارک زمانۂ موجودہ کے نیابتی طریق سے کیا گیا ہے۔

(۱) جس سلطنت کا رقبہ ایک معمولی قصبے سے زاید ہو اُس میں تمام شہریوں کا براہ راست اجتماع ناممکن ہے۔ وسیع سلطنتوں میں کل قوم کی مجلس کہنے کی بات رہ جاتی ہے چنانچہ روما میں جمہوریت کی آخری صدیوں میں یہی حال تھا۔ اس حالت میں دارالصدر کے عوام کو ایک غیر متناسب غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

---

[1] اس وجہ سے اہل روما Comitia Centuriata (سنتوریہ) کو Comitia Tributa (مجلس قبایلی) سے بالاتر سمجھتے تھے۔

(۲) ایسی وسیع اور مختلف النوع مجلس بہت ہی بے قابو ہو جاتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ عام رائے کا اظہار کر دے یا کسی ایسی تجویز کی جو پہلے سے مشتہر ہو چکی ہو منظوری یا نامنظوری دیدے لیکن کسی مجوزہ قانون پر سنجیدگی سے بحث کرنا یا سیاسیات کے پیچیدہ مسائل کو سلجھانا اسکے حیطۂ امکان سے بالکل خارج ہے۔

صرف بہت ہی چھوٹی سلطنتوں میں جہاں ہر کام میں بالکل سادگی ہو قانون سازی کا کام عام مجلس کو سپرد کیا جا سکتا ہے۔

چھٹا باب

(ب) سلطنت کے سیاسی فرائض کی قدیم تفریق

اگرچہ اقتدار اعلیٰ میں ایک بڑی حد تک وحدت اور مرکزیت ہوتی ہے لیکن پھر بھی سلطنت کو مختلف فرائض انجام دینا پڑتے ہیں۔ اور اسی سبب سے سلطنت کے مختلف مناصب اپنی اپنی عملی ضرورتوں کے لحاظ سے مختلف شکلیں بھی اختیار کرلیتے ہیں۔

ارسطو کی تقسیم

ارسطو کی رائے میں یہ فرائض تین ہیں۔

(۱) غور و بحث (شوریٰ)

(۲) نظامت۔

(۳) عدالت۔

وہ اول الذکر کے ضمن میں سلطنت کے اہم معاملات عامہ یعنی جنگ و صلح کے فیصلے، معاہدے قائم کرنے یا انکو مسترد کرنے، وضع قوانین، موت، جلا وطنی، اور ضبطی کی سزاؤں اور مالیات کی نگرانی کو داخل سمجھتا ہے پس اس طرح بہت ہی مختلف الحیثیت امور یکجا ہوگئے ہیں۔ بیرونی سیاسیات اور وضع قوانین اور پھر اسی کے ساتھ فوجداری کا اعلےٰ اختیار اور حکومت کے نظم و نسق کی نگرانی سب اس میں آگئی ہیں مگر تمام سلطنت اور اہل ملک کی حفاظت کے لحاظ سے یہ سارے امور اپنی سیاسی اہمیت کی بنا پر ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ارسطو ان سب کو قانون سازی نہیں بلکہ شوریٰ سمجھتا ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ واقعی قانون سازی کا کام زمانۂ مابعد تک مجالس عامہ کے تحت میں نہیں تھا اور صرف بالواسطہ اس پر انکا اثر پڑتا تھا لیکن اور دوسرے نہایت اہم معاملات میں ان کے غور و بحث کا بہت بڑا اثر تھا۔

ثانی الذکر اختیارات کسی حد تک نظامہائے جدیدہ کے عاملانہ اختیارات کے مماثل ہیں لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انکا تعلق حکمرانی کے مقتدر محکموں سے ہے۔

تیسری قسم ہمارے عدالتی اختیار کے مرادف ہے۔

یونان اور روما میں اکثر مختلف فرائض ایک ہی شخص انجام دیا کرتا تھا۔

اگرچہ مختلف فرائض اپنی خصوصیات کی وجہ سے خارجی طور پر ایک دوسرے سے ممیز رکھے گئے ہیں مگر کارکن افراد کے اعتبار سے داخلی طور پر وہ متحد ہوجاتے ہیں، ابھی ابھی یہ ذکر ہوچکا ہے کہ ایتھنز کی مجلس عام قوانین پر غور و بحث کرتی، حکومت کی اہم کارروائیوں کو عمل میں لاتی، اور عدالتی فرائض کو بھی انجام دیتی تھی۔ وہاں کے آرخون انتظامی عہدہ دار ہوتے تھے مگر اسکے ساتھ ہی انھیں عدالتی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے۔ روما کی سلطنت نے اس سے زیادہ ترقی کی تھی اور وہاں فرائض کی تفریق بڑھی ہوئی تھی۔ یونان کی بنسبت کومیٹیا (مجلس عام) کے قانونی فرائض، سینیٹ اور حکام کے فرائض سے پوری طرح واضح اور ممیز تھے تاہم "کومیٹیا" میں غیر ملکی معاملات کے اہم مسائل پر بحث ہوتی تھی اور ابتدائی زمانے میں حکم موت کے مرافعے کا فیصلہ بھی وہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح سینیٹ صرف انتظامی ہی امور کو سرانجام نہیں دیتی تھی بلکہ اسکی منظورشدہ تجویزوں کو قانونی حیثیت حاصل ہوجاتی تھی اور سب سے آخر امر یہ ہے کہ حکام بالعموم انتظامی اور عدالتی دونوں فرائض کے جامع ہوتے تھے جس شخص کو جس حد تک اقتدار (Inperium) حاصل ہوتا تھا اسکو اسی حد تک عدالتی اختیار (Jurisdictis) بھی حاصل ہوتا تھا۔ علاوہ اسکے اُسے مذہبی فرائض بھی انجام دینا پڑتے تھے اور اپنے احکام اعلامی کے وسیلے سے اُسے ایک طرح کا قانونی اختیار بھی حاصل ہوتا تھا۔ با ایں ہمہ جمہوریۂ روما کی تمام تنظیمات میں صاف یہ نظر آتا ہے کہ ارادۃً یہ کوشش کیجاتی تھی کہ حکومت کے مختلف فرائض ایک دوسرے سے علٰحدہ ہوجائیں۔

بزنتین کی شہنشاہی میں ملکی اور فوجی عہدوں کا امتیاز

مشرقی رومی شہنشاہی میں ایک نیا امتیاز اور قائم ہوا۔ تمام شہنشاہی کے جملہ سرکاری اختیارات بدستور شہنشاہ کے ہاتھ میں رہے مگر صوبوں کی ماتحت حکومت میں ملکی اور فوجی عہدے پوری طرح ایک دوسرے سے علٰحدہ کردیے گئے تھے۔ حکام کے بے انتہا اختیارات کے باعث رعایا پر جب ظلم و ستم ہو رہے تھے اُسوقت رعایا کے مفاد کے خیال سے یہ کارروائی عمل میں نہیں آئی مگر اب تخت کو محفوظ رکھنے کی ضرورت سے اسکے نفاذ پر مجبور ہونا پڑا۔ بہرحال اس سے سیاسی ترقی کا ایک قدم آگے بڑھا جسے زمانۂ حال کی سلطنت نے بھی قبول کرلیا ہے۔

ازمنۂ وسطی میں فرق بہت ہی کم تھا۔

ازمنۂ وسطی میں سلطنت کی طاقت میں ہر طرف سے روک پیدا ہوکر وہ محدود ہوگئی تھی

لیکن فی نفسہٖ نہایت ہی مختلف النوع فرائض باہم مجتمع ہو گئے تھے ۔ نہ صرف بادشاہ کو بلکہ ہر ایک کاؤنٹ کو ملکی اور فوجی، انتظامی اور عدالتی جملہ اختیارات حاصل ہوتے تھے اور مجالس ملکی وضع قوانین کے ساتھ ہی ساتھ عدالتی فرائض بھی انجام دیتی تھیں۔

بودین نے عدالتی فرائض کی علیحدگی پر زور دیا

بودین پہلا شخص تھا جس نے اس امر پر توجہ دلائی کہ کم ازکم بادشاہ کو یہ چاہئے کہ وہ بذات خاص عدالتی کارروائی نہ کرے بلکہ اس کام کو آزاد ججوں کے ہاتھ میں چھوڑ دے۔ اُس نے قدیم دستور کی حمایت میں بہت سے دلائل بھی بیان کئے ہیں مثلاً یہ کہ بادشاہ کا بذات خاص تمام قوم کے سامنے عدل و داد کرنا بہت اچھا اثر پیدا کرتا ہے مگر اسکے ساتھ ہی اُس نے یہ دکھایا ہے کہ اس سے قوی تر وجوہ اس امر کے موجود ہیں کہ بادشاہ بذات خاص جج کا کام کرنے سے کنارہ کش رہے ۔ ایک ہی وقت میں قانون ساز اور جج دونوں ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ انصاف اور حق عفو باہم ملادئے جائیں، قانون کی پابندی بھی کیجائے اور حسب مرضی وہ ترک بھی کر دیا جائے ۔ اگر انصاف پوری طرح نہ ہوا تو متخاصم فریقوں کو کافی آزادی نہیں رہتی اور وہ بادشاہ کے اقتدار کے نیچے دب جاتے ہیں۔ سزا کی دہشت، خوفناک طور پر بڑھ جاتی ہے اور اگر بادشاہ کی طبیعت ظلم کی طرف مائل ہوئی تو مقام عدالت پر رعایا کے خون کی نہریں بہنے لگتی ہیں اور قوم کو اپنے سرتاج سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے ۔ جب بادشاہ خود اپنے معاملات میں یا اپنے خلاف جرموں میں فیصلہ کرتا ہے تو صورت معاملات نہایت بدتر ہو جاتی ہے ۔ پس بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے لئے صرف رحم و عفو کے اختیارات خاص کو محفوظ رکھے ۔

درحقیقت بودین کو یہ موقع تھا کہ وہ فرانس کی تاریخ سے نظائر پیش کرتا ۔ مقدمات کے وقت بادشاہ کی موجودگی کے خلاف امرا کی متعدد پارلیمنٹیں اپنا خیال ظاہر کر چکی تھیں۔ بیشتر سلطنتوں نے بتدریج اس نئے اصول کو اختیار کر لیا، بادشاہوں نے یہ کرنا شروع کیا کہ معمولاً عدالتی کارروائیاں حکام کے سپرد کر دیں اور اپنے لئے صرف فیصلوں کی تصدیق اور بالخصوص حکم موت کی منظوری کو محفوظ رکھا ۔

ساتواں باب

(ج) تقسیم اختیارات کا جدید اصول

سیاسیات جدیدہ کی رفتار نے یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ سیاسی فرائض کی خارجی تفریق کے لئے یہ ضروری ہے کہ انھیں فرائض کے موافق شخصی طور پر کارکنوں کی بھی تفریق ہو جائے ۔

مونتسکیو

مونتسکیو پہلا شخص تھا جس نے شد و مد کے ساتھ اس جدید اصول کا اعلان کیا اس نے مدنی آزادی اور تحفظ کے نام سے یہ مطالبہ کیا کہ مختلف فرائض عامہ کو مختلف شخصوں کے ہاتھوں سے انجام پانا چاہئے اگر قانون سازی کے اختیارات عاملانہ اختیارات کے ساتھ ایک ہی شخص بلکہ ایک ہی جماعت حکام کے ہاتھ میں مجتمع ہو جائیں تو پھر آزادی کوئی چیز نہیں رہتی کیونکہ قوم کو یہ خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ بادشاہ یا سینات اپنی جابرانہ کارروائیوں کے لئے من مانے قانون بنائے گا اور انکو جابرانہ طور پر عمل میں بھی لائے گا ۔ علی ہذا اگر عدالتی اختیار تشریعی اور عاملانہ اختیار سے جدا نہیں ہے تو بھی آزادی نہیں باقی رہتی ۔ اگر عدالتی اختیار قانون سازی کے اختیار کے ساتھ ملا دیا جائیگا تو اہل ملک کی زیست و حیات معرض خطر میں پڑ جائے گی کیونکہ خود جج ہی واضع قانون بھی ہو گا ۔ اور اگر عدالتی اختیار عاملانہ اختیار کے ساتھ ملایا جائے گا تو جج کو ایک ستمگار شخص کی قوت حاصل ہو جائے گی [1]

اعلیٰ قسم کی معقولیت کے ونظائف میں تفریق عمل زیادہ ہوتی ہے ۔

کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ضرورت سے زیادہ اختیارات کے جمع ہو جانے سے شخصی آزادی کے لئے بالیقین خطرہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ اگر اختیار کی مختلف شاخیں علٰحدہ کر دی گئیں تو ایک دوسرے کے اثر سے ان میں رنگ پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس تفریق کے قائم کرنے کی دلیل قاطع یہ سیاسی غرض نہیں ہے کہ اس سے عملاً ملکی آزادی کی ضمانت ہو جاتی ہے

---

[1] مونتسکیو کی "روح قانون" Espoit des lois (ب) "انگریزی نظام سلطنت" کا بیان ۔ جلد ۱۱ صفحہ ۶ اور بلنچلی کی "عام نظریۂ سلطنت کی تاریخ" صفحہ ۶۷ ۔

بلکہ اسکی بڑی وجہ نظام عضوی میں پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر کام اُسی وقت خوبی سے انجام پاتا ہے جب کہ اُسکا کارکن عضو خاصکر اسی کے لئے بنایا گیا ہو نہ کہ جب بالکل مختلف فرائض ایک ہی عضو کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اس امر میں ملکی مُدبّر فطرت ہی کی مثال کی پیروی کرتا ہے۔ آنکھ دیکھنے کے لئے موزوں ہے، کان سننے کیلئے، منھ بولنے کے لئے اور ہاتھ گرفت و عمل کے لئے، اسی طرح جسم سیاسی کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہر کام کے لئے ایک جداگانہ کارکن ہو۔

امتیاز ہونا چاہئے نہ کہ تفریق۔

"تفریق اختیارات" کے مقبولِ عام فقرے سے ایک صحیح اصول کا غلط عملدرآمد پیدا ہو جاتا ہے۔ اختیارات میں اگر کلیۃً "تفریق" ہو جائے اور وہ ایک دوسرے سے علیحدہ کر دئے جائیں تو سلطنت کا توحدِ عمل باطل ہو جاتا ہے جس طرح طبعی جسم میں مختلف اعضا ایک دوسرے سے مربوط ہیں اسی طرح سیاسی جسم کے کارکن اعضا کا باہمی ربط اُنکی تفریق سے کم ضروری نہیں ہے، پس سلطنت کے لئے اتحادِ قوت ایک لازمی چیز ہے اس لئے اختیارات میں باعتبار فرائض کے امتیاز ہو سکتا ہے مگر انھیں کلیۃً جدا نہیں ہونا چاہئے۔

اختیارات کی سہ گانہ تقسیم۔

مونٹیسکیو نے تین اختیارات قائم کئے ہیں (۱) اختیار قانون سازی (۲) اختیار عاملانہ (۳) اختیار عدالتی۔

انگریزوں نے بھی اس تقسیم کو اپنا نظریۂ سلطنت بنا لیا ہے۔ شمالی امریکہ کے ممالک متحدہ (الف) میں اس سہ گانہ تقسیم پر بہت سختی بلکہ مبالغے کے ساتھ عملدرآمد ہوا ہے اور جدید یورپ کے بہت سے نظامہائے سلطنت نے بھی اسی کو مان لیا ہے۔

اضافے

بعضوں نے مقدمۃً سلطنت کے وحدتِ عمل کے خیال سے ان تین اختیارات پر اضافے بھی کئے ہیں۔ ازآنجملہ سلطنت میں (۴) ایک قوت معدلہ کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ بنجمن کنسٹنٹ کا خیال ہے اور ڈون پیڈرو کے پرتگالی نظام سلطنت میں بھی اُسے اختیار کیا ہے۔

دوسروں نے عاملانہ قوت کے متعلق حسب ذیل اضافے کئے ہیں:-

(الف) (ممالک متحدہ امریکہ کے واقعی نظام سلطنت نے اُس زمانے کے انگریزی نظام سلطنت کے مروجہ نظریے کی جس درجہ تبعیت کی اُسکے لئے بیجٹ کی تصنیف انگریزی نظام سلطنت (اشاعت ۱۸۶۷ء) صفحہ ۲۰ اور ۲۲ دیکھنا چاہئے۔

(۵) اختیار انتظامی۔

(۶) اختیار نظارت۔

(۷) اختیار نیابت۔

یہ مختلف اختیارات مساوی نہیں ہیں

ایک غلط خیال یہ پھیلا ہوا ہے کہ یہ سب اختیارات ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ یہ خیال سلطنت کی عضوی نوعیت کے خلاف ہے۔ عضوی جسم میں ہر ایک عضو اپنی خاص قوت رکھتا ہے مگر ان عضووں میں سے کسی ایک کی قوت کسی دوسرے عضو کی قوت کے مساوی نہیں ہوتی بلکہ ایک کی قوت دوسرے کی قوت کے یا تو ماتحت ہوتی ہے یا اُس کی بالادست، اور یا پھر اُسکے دوش بدوش کام کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو مجموعے کا ربط و اتحاد قائم نہ رہے گا۔ یہی حال سلطنت کا ہے اگر تمام اعلیٰ اختیارات واقعی مساوی ہوں اور ممالک متحدہ امریکہ کی طرح یہ حالت صرف ظاہری نہ ہو تو سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ "سر کو جسم سے جدا کر کے اُسے جسم کے مساوی کرنا انسان کی جان لئے بغیر ممکن نہیں" (دیکھو بلنچلی کے "اسطالعات" صفحہ ۱۴۲)

دوسری غلطی جو بالکل ہی بچوں کی سی بات معلوم ہوتی ہے یہ ہوا کرتی ہے کہ لوگ سلطنت کے اعضائے عملیہ کو بالکل ایک منطقی قیاس سمجھتے ہیں۔ قانونی قوت، قواعد مرتب کرتی ہے گویا وہ مقدمہ کبریٰ ہے اور عدالتی قوت اُسکے تحت میں کسی خاص واقعے کو جانچتی ہے یعنی وہ مقدمہ صغریٰ ہے اور عاملانہ قوت نتیجہ برآمد کرتی ہے[۵۱]۔ پس اس طرح پر عدالتی فیصلے میں مختلف قوتوں کے تمام فرائض مجتمع ہو جائیں گے اور حکومت اُن فیصلوں کو عمل میں لانیکے لئے صرف پولس کا کام انجام دینے کے لئے رہ جائیگی۔

الف۔ قانون سازی کی قوت

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قانون سازی کی قوت کو دوسری تمام قوتوں سے

[۵۱] مگر مونٹیسکیو نے اسکا تصور اپنے ذہن میں دوسری ہی طرح پر جمایا ہے (۱۱، ص ۶)۔ وہ عدالتی اختیار کو بھی یوں بیان کرتا ہے "اُن امور میں عاملانہ اختیار جو حقوق عامہ سے متعلق ہیں" اور اس طرح اُسے حقیقی "عاملانہ اختیار سے جو حقوق شخصی کے مابین ہوتا ہے" جدا کیا ہے۔ اس عجیب خیال کو اُس کے تتبع میں کانٹ نے "نظریۂ قانون" ف ۴۵) اور اشبٹلر نے "خطبات پر سیاسیات" ف ۱۵ بھی اختیار کیا ہے۔ بخلاف انکے دیکھو اشتال "سلطنت کا نظریہ" جلد ۲ ف ۲۵۷۔

ممیز کرکے دیکھئے دوسرے تمام فرائض، خاص خاص کارکنوں سے متعلق ہیں مگر قانون سازی کا معاملہ تمام سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ قانون سازی کی قوت خود قوانین و تنظیمات سلطنت کا تعین کرتی ہے۔ برخلاف اسکے تمام دوسری طاقتیں نافذالوقت قوانین و تنظیمات کے موافق مختص بدیہی اور تغیر پذیر حالات کے اندر کام کرتی ہیں۔ قوت وضع قوانین کل مجموعے کے مستقل تعلقات کی ترتیب کرتی ہے اور دوسری قوتیں بالعموم ایک خاص مقصد کے لئے کام میں لائی جاتی ہیں اور کل قوم پر اثر نہیں ڈالتیں۔ لیکن جب تک واضع قوانین جماعت کے حقوق کا تعین نہ ہوجائے اُسوقت تک ان دوسری قوتوں کی تقسیم نہیں ہوسکتی۔

قانون سازی کی قوت صرف حقوق کے عام قواعد یعنی مخصوص الاثر قوانین ہی کا تعین نہیں کرتی بلکہ سلطنت کے تنظیمات کا قائم کرنا اور اُنکا بدلنا بھی اُس سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر وہ موازنۂ مابعد کے عام اقتصادی انتظامات پر نظر ڈالتی ہے، اگر وہ اصول نہیں بلکہ مطالبات کی منظوری دیتی ہے، اگر وہ ملک کے واقعی حالات سے بحث کرتی ہے تو یہ سب اس لئے ہے کہ ان کا تعلق تمام سلطنت سے ہے گوکہ وہ صحیح معنی میں قوانین نہیں ہیں۔

روسو اور اشٹائن کی رائے پر تنقید

روسو قانون سازی اور انتظام کے تعلقات کی توضیح اس طرح کرتا ہے کہ اُن میں وہی فرق ہے جو فرق علم النفس کی رو سے آزادی و قوت میں ہے۔ وضع قانون، ارادۂ عام کا اظہار ہے اور انتظام حکومت کے مخصوص افعال پر شامل ہے۔ "قانون قوم کا ہے عمل بادشاہ کا ہے" لورینتس فون اشٹائن بھی اسی امتیاز کو تسلیم کرتا ہے، لیکن قوت قانون سازی کے لئے قوانین و تنظیمات کی ضرورت پر عمیق نظر ڈالنا بھی انکے اجرا کی قوت آزادی سے کم ضروری نہیں ہے اور دوسری طرف حکومت جو اپنی حکمت عملی کی غایت و ذرائع کا انتخاب کرتی ہے، اُسکے افعال بھی قوت آزادی کے لحاظ سے کم درجے پر نہیں ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہ فرق، عام و خاص آزادی یا ایک قائم شدہ نظم اور وقتی کام کے الفاظ سے ظاہر کیا جائے۔

چونکہ کل اپنے ہر ایک جزو یا عضو سے زیادہ ہے، اس لئے قوت قانون سازی تمام دوسری مختص قوتوں سے بالاتر ہے۔

(ب) سلطنت کی دوسری طاقتیں

جدید سلطنتوں میں یہ قوتیں چار مجموعوں میں تقسیم کیجا سکتی ہیں جن کے خصوصیات قطعاً

ایک دوسرے سے الگ ہیں ان میں سے دو سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ بلند تر (۱) حکومت یا انتظام اور (۲) قوت عدالتی ہیں ۔

(۱) حکومت یا انتظام اصطلاح قوت عاملانہ کی تنقید۔

(۱) حکومت یا انتظام ۔ اسکے لئے بالعموم قوت عاملانہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے مگر یہ لفظ نہایت ہی ناموزوں ہے اور اس سے بہت سی لغزشیں پیش آتی، اصول میں غلط فہمیاں اور عمل میں خطائیں واقع ہوتی ہیں۔ اس سے نہ تو حکومت کی اصلی حقیقت ظاہر ہوتی ہے اور نہ وضع قانون اور عدالتی اختیار سے اسکے تعلقات کا اظہار ہوتا ہے ۔

ایک شخص خود اپنے فیصلے کو یا دوسرے کے حکم و فرمان کو عمل میں لا سکتا ہے، مگر ہر حال میں تعمیل دوسرے درجے پر ہے، فیصلہ یا حکم مقدم شئے ہے لیکن حکومت کے فرائض فی نفسہ مقدم (یا اولین) حیثیت رکھتے ہیں۔ حکومت تجویز اور فیصلہ کرتی ہے، رائے قائم کرتی ہے، اپنی مرضی کا اظہار کرتی ہے۔ کسی کام کا حکم دیتی یا کسی کام سے منع کرتی ہے اور بیشتر حالات میں اُسکے احکام کی تعمیل بغیر کسی عاملانہ جبر کے ہوتی ہے۔ عموماً حکومت کی طرف سے محض ایک اعلان کافی ہوتا ہے اور اسکے احکام کی تعمیل ہو جاتی ہے لیکن جب جبر کی ضرورت لاحق ہو تو یہ بھی بے شبہہ حکومت ہی کا کام ہے مگر چونکہ یہ دوسرے درجے پر ہے اس لئے یہ بالعموم ماتحت عمال، مثلاً پولس وغیرہ کے ذریعے سے عمل میں لایا جاتا ہے۔

اگر دوسروں کے ارادے سے بحث ہو تو بھی لفظ عاملانہ درست نہیں ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ قانون جن امور کو عمومی حیثیت سے قرار دیدیتا ہے، حکومت انھیں امور کو انفرادی حیثیت سے عمل میں لاتی ہے۔ عموماً قانون عمل میں نہیں لایا جاتا بلکہ اسکا اطلاق اور اسکی پابندی ہوتی ہے۔ کسی قانون کا اعلام اور اُسکا عمل میں لانا ایک ہی شئے نہیں ہیں۔ واضع قوانین، جن قواعد کو منظور کرتا ہے، جن اُصولوں کو وہ ظاہر کرتا ہے، حکومت اپنی کارروائیوں کے قانونی اور آئینی حدود کے طور پر اُنکا احترام کرتی ہے مگر اُن حدود کے اندر وہ خود آزادانہ فیصلے کرتی، دوسری سلطنتوں سے معاملات طے کرتی، تحقیقات کیلئے کمیشن مقرر کرتی، قیام امن کیلئے جن کارروائیوں کی ضرورت سمجھتی ہے اُنھیں اختیار کرتی، کارکنوں کا تقرر اور فوج کی نگرانی کرتی ہے، یہ اصطلاح انتظام کرنیوالی حکومت اور عدالتوں کے باہمی تعلقات کے لحاظ سے اور بھی کم قابل اطلاق ہے، کسی فیصلے کا عمل میں لانا خود عدالتی قوت کا فعل ہے، کیونکہ انصاف کا انتظام کرنا، زائل شدہ حقوق کا بحال کرنا،

اُسی کا کام ہے، اور جب تک خود اُسکی قوت ناکافی نہ ہوجائے اُسوقت تک اُسے حکومت کی قوی تر قوت سے امداد لینے کی ضرورت نہیں ہے' ان دونوں قوتوں کے تعلقات ایسے نہیں ہیں جیسے ایک آقا اور غلام کے ہوتے ہیں۔

حکومت کا اصل الاصول

پس حکومت کا اصل الاصول یہ ہے کہ اُسے یہ اختیار ہو کہ مخصوص حالات میں جو کچھ قرین انصاف یا مفید ہو اُسکا حکم دے سکے۔ اس میں یہ قوت ہو کہ ملک اور قوم کو خاص حملوں اور خطروں سے محفوظ رکھ سکے، ملک اور قوم کی نیابت کرسکے اور اُنھیں عام خرابیوں سے بچا سکے، حکومت وہی چیز ہے جسے یونانی "ارخے"[عہ] اور رومی "ام پے ریُم" کہتے تھے اور جسے جرمانی زمانۂ وسطیٰ میں "ولایت" اور "فوگٹائی" (Vogtei [عہ]) کا نام دیا گیا تھا۔ سلطنت کی تمام دوسری جزوی طاقتوں کے مقابلے میں حکومت کارفرما اور بلا شبہہ سب سے بلند طاقت ہے کیونکہ دوسروں سے اُسکا تعلق ایسا ہے جیسا کہ سر کا تعلق جسم کے دوسرے اعضاء سے ہے جس شئے کو نیابتی قوت کہتے ہیں وہ بھی اُسی کے اندر داخل ہے۔

سلطنت کی عام کارروائی کی مناسبت سے اُسے "حکومت سیاسی" اور جزئیات کے لحاظ سے "انتظام" کہتے ہیں۔

(۲) قوت عدالتی

عدالتی قوت اکثر فیصلہ کرنیوالی قوت سمجھی جاتی ہے اور یہ غلط بحث فرانسیسی (اور انگریزی) اصطلاح یعنی (قوت انصاف) کے لفظ سے پیدا ہوئی ہے لیکن قوت عدالتی کا اصل الاصول فیصلہ کرنا نہیں بلکہ قانون کے حکم کا معین کرنا ہے (اہل روما اُسے انصاف In jure نہیں بلکہ معدلت گستری In judicio کہتے تھے) فیصلے کا مفہوم اگر یہ ہو کہ خاص حالات میں انصاف کا تعین کرکے اُسکا اعلان کیا جائے تو یہ لازمی طور پر حکومت کا کام نہیں ہے نہ اسے اختیار عامہ کا عملدرآمد کہہ سکتے ہیں۔ روما میں عام طور پر یہ کام ججوں کے بجائے غیر سرکاری اشخاص کو اور ازمنۂ وسطیٰ میں جرمانیا میں اسیسروں کو

عہ یونانی میں اس لفظ کے معنی ہیں (۱) آغاز، اصل، ابتدا، عنصر ہ (۲) پیشروی، حکومت، اقتدار اعلیٰ؛ (۳) ملک، قلمرو جس پر حکومت کی جائے۔ ع۔ ص۔

عہ بیلف کی خدمت یا وہ رقبہ جو اُسکے تحت ہو۔ بیلف کو جرمانی زبان میں "فوگٹ" (Vogt) کہتے ہیں۔ ع۔ ص۔

سپرد ہوتا تھا۔ موجودہ زمانے میں یہ کام اکثر عام جوریوں کے سپرد ہوتا ہے۔ برخلاف اسکے قانون کا قائم رکھنا، افراد اور قوم کے حقوق کی حفاظت کرنا، ہمیشہ حاکمانہ یا ناظمانہ فرض سمجھا گیا ہے۔

قوت عدالتی اور حکومت میں ایک حقیقی فرق یہ ہے کہ ثانی الذکر کی طرح اول الذکر کارفرمائی سے واسطہ نہیں رکھتی بلکہ وہ صرف اُنھیں قوانین کی حفاظت کرتی اور اُنھیں کو نافذ کرتی ہے جو پہلے سے تسلیم کئے جا چکے ہیں۔ حکومت کے فرائض انسان کے ذہنی قویٰ کے مانند قرار دئے جاسکتے ہیں اور قوائے عدالتی کے فرائض کو ضمیر کہہ سکتے ہیں۔

جدید زمانے کی سلطنتوں میں حکومت اور عدالت کے اختیارات کی علیحدگی ایک بہت ہی اہم سیاسی ترقی ہے۔ قدیم زمانے اور ازمنہ وسطیٰ میں ایک ہی حاکم دونوں فرائض کو انجام دیتا تھا۔ اس تغیر سے انصاف کی بے لوثی اور اہل ملک کی آزادی کو فائدہ پہنچا ہے اور حکومت کے وقار میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔[1] تجربے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

---

[1] اس موقع پر واشنگٹن کی ۱۷۹۶ء کی حیرت انگیز الوداعی تقریر کے ان الفاظ کو دیکھنا چاہئے۔ "یہ بھی ایک اہم امر ہے کہ ایک آزاد ملک میں جن لوگوں کو سلطنت کا نظم ونسق سپرد ہو وہ اپنی قوت تخیلہ سے کام لینے میں احتیاط برتیں اور اپنے اپنے آئینی حدود کے اندر رہیں اور اس سے بچتے رہیں کہ ایک محکمہ دوسرے محکمے کے اختیارات میں دخل دے، اس قسم کی دخل ہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام محکموں کی قوت ایک محکمے میں جمع ہو جاتی ہے، اور حکومت کی شکل جو کچھ بھی ہو مگر حقیقتاً مطلق العنانی پیدا ہو جاتی ہے، انسان کے دل میں حصول قوت کا جو شوق اور پھر اُسے خراب کرنیکا جو میلان طبعاً موجود ہے، بس اُسکا صحیح اندازہ ہی کر لینا اس رائے کی صداقت کے تسلیم کرنیکے لئے کافی ہے۔ سیاسی قوت کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اور اُسے مختلف لوگوں کے سپرد کر کے ہر ایک کو دوسروں کی دراندازی کے خلاف بہبود عام کا محافظ بنا دینے سے جس طرح ایک دوسرے پر روک پیدا ہو جاتی ہے اُسکی ضرورت گزشتہ اور موجودہ تجربوں سے ثابت ہو چکی ہے، ان میں سے بعض تجربے ہمارے ہی ملک میں خود ہمارے ہی آنکھوں کے سامنے ہوئے ہیں، پس ان تفاریق کا قائم کرنا جس قدر ضروری ہے اُسی قدر اُنکا محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔"

بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی ممتاز مدبر، یا حکومت کا کوئی فرد (عامل) اچھا جج بھی رہا ہو اور یہی حال اسکے عکس کا ہے۔ عدالتی قوت اگرچہ حکومت سے آزاد ہوتی ہے مگر جس طرح دل، سر کے تابع ہے اسی طرح عدالتی قوت بھی حکومت کے ماتحت ہوتی ہے۔

دوسری طاقتیں

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کے فرائض انھیں تین تقسیموں پر ختم ہوگئے ہیں اور آسانی سے یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ کس طرح ہر حال کے نظامہائے سلطنت نے انھیں تین پر حصر کیا ہے لیکن زیادہ دقت نظر سے کام لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعضائے فرائض کے دو اور مجموعے بھی ہیں اور وہ دونوں اگرچہ حکومت کے تابع ہیں مگر پھر بھی وہ اس سے ممیز ہیں کیونکہ وہ تحکم و فرمان کے (جو حکومت کی شرط لازمی ہے) بہت کم متحمل ہوسکتے ہیں یہ دونوں مجموعے حسب ذیل ہیں:—

(۳-۴) ذہنی اور مادی مقاصد کی نگرانی۔

(۳) تمدن کے ذہنی عناصر اور سلطنتی تہذیب کی نگرانی اور خبر گیری۔

(۴) سلطنت کے مادی اغراض (یعنی اقتصادیات) کا انتظام اور انکی خبر گیری۔

ان دونوں اصناف میں حکمرانی کا کوئی سوال نہیں ہے، انسانی تہذیب کے بڑے اجزا یعنی مذہب اور علوم و فنون کہیں بھی سلطنت کی قوت عمل سے متعلق نہیں ہیں اور نہ سلطنت انکو متعین اور پورا کرسکتی ہے۔ چنانچہ مذہب اور علوم و فنون کے خارجی تنظیمات یعنی گرجے اور مدرسے سے بھی اصولاً سلطنت کو وہ واسطہ نہیں ہے جو خود اسکے حدود خاص میں حاکم و محکوم کے درمیان ہے۔ اس قسم کے معاملات میں بھی سلطنت کا کام اتنا ہی ہے کہ وہ نفع عام کی معاون ہو اور حیات عامہ کو مضرتوں سے محفوظ رکھے مگر وہ جانتی ہے اور متواتر اسکو توجہ دلائی جاتی رہتی ہے کہ ان چیزوں کی اصل اسکی قلمرو سے باہر ہے اس لئے ان امور میں سلطنت کے فرائض صرف نگرانی اور مربیانہ خبر گیری تک محدود ہیں، سلطنت کے امرونہی کو یہاں کچھ دخل نہیں۔

ایسا ہی حال چوتھی صنف یعنی اقتصادیات عامہ کا ہے۔ سلطنت کے مداخل و مخارج کا نظم و نسق، اہل ملک کے کاروبار اور انکی اقتصادی بہبود کو تقویت دینا منافع عامہ کے کاموں کا اہتمام کرنا، مقامی حکومتوں کی نگرانی کرنا، ان سب چیزوں کی مخصوص علت محرکہ سچ پوچھو تو یہ نہیں ہے کہ اقتدار کا نفاذ ہو بلکہ جس طرح تمدنی معاملات کے لئے ذہنی ترقی کی خبر گیری لازم ہے اسی طرح اقتصادی معاملات کے لئے مادی مقاصد کی پیروی۔ اقتصادی

انتظامات میں سلطنت کی تحکمانہ خصوصیت کو گویا دخل ہی نہیں ہے، بلکہ اُس سے کہیں زیادہ ان انتظامات کی بنیاد اہل فن کے علم اور تجربے پر ہوتی ہے۔ پس سلطنت کی کارروائی جس حد تک اس معاملے میں ایک نجی شخص کے مشابہ ہو جاتی ہے اُس قدر کسی اور معاملے میں نہیں ہوتی۔ سلطنت کے املاک کی خرید و فروخت، اسی طرح ہو سکتی ہے جیسے نجی اشخاص کے املاک کی ہوتی ہے۔ قوم کی مادی بہبود، وہ وسیع بنیاد ہے جس پر سلطنت کا مدار کار ہے اور اگرچہ سیاسی ہستی کے لئے یہ ایک لازمی شرط ہے مگر بنیاد ہونے کے اعتبار سے وہ سب سے نیچے اور حکومت سب سے بلند جگہ پر رہتی ہے۔

سلطنت کے فرائض کا یہ امتیاز صرف حال کے زمانے میں بتدریج تسلیم کیا جانے لگا ہے مگر ہنوز تحکم اور مربیانہ سرپرستی میں ایسا خلط ملط ہے کہ اُس سے بہت سی خرابیاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ بعض وقت ایسے کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے جن کے لئے صرف رہبری یا نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض وقت مستعدانہ و تحکمانہ عمل کے موقع پر ڈرتے ڈرتے مدد یا نگرانی کی جاتی ہے لیکن با ایں ہمہ سو بلکہ پچاس برس پیشتر جو حالت تھی اُس سے اب بہت بہتر حالت ہے اور بہت سے تنظیمات حکومت کے براہ راست انتظام سے علحدہ کئے جا چکے ہیں اور اُن کے انتظام میں جبر و زور کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ وہ علمی اور فنی حیثیت سے قوم کی بہبود اور آزادی دونوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عمل میں آتے ہیں۔

آٹھواں باب

خدمات عامہ اور فرائضِ عامہ

خدمات عامہ کا وسیع اور محدود مفہوم

۱۔ سلطنت جو کچھ خدمت لے، یا برضا و رغبت سلطنت کی جو کچھ بھی خدمت کیجائے وسیع معنی میں یہ سب "خدماتِ عامہ" میں داخل ہے، اس میں سپاہی، جوری (پنچ) وکلائے قوم اور ابتدائی اور ثانوی انتخاب کنندے سب داخل ہیں لیکن صحیح مفہوم میں یہ سب کے سب خدماتِ عام میں شامل نہیں ہیں۔ خدمات عامہ کے مفہوم میں یہ مضمر ہے کہ خاص طور پر وہ کام کسی کے تفویض کیا جائے یا بالتخصیص کوئی اس پر مامور کیا جائے۔ مذہبی حلقوں، کنیساؤں اور دوسری جماعتوں کے کارکن سلطنت کے ملازم نہیں ہیں۔ اُنکی خدمت عام ضرور ہے مگر سلطنت نے اُس خدمت کو اُن پر عائد نہیں کیا ہے اور نہ اُن کا تعلق براہ راست سلطنت سے ہے[1]

سلطنت کا سرتاج اس اعتبار سے کہ وہ خود ہی صاحب اقتدار اعلیٰ اور وہی تمام خدمات عامہ کا منبع ہے، ملازمانِ عامہ (سرکاری) میں داخل نہیں ہے، پھر بھی فریڈرک اعظم کا یہ کہنا صحیح تھا کہ بادشاہ سلطنت کا خادمِ اول ہے، کیونکہ اُسکا منصب ہی نظام سلطنت پر مبنی ہے اور اُسکا وجود تمامتر سلطنت ہی کی خدمت کے لئے ہے۔

(۲) تمام سرکاری ملازم سلطنت کے عہدہ دار نہیں ہیں۔

۲۔ محدود معنی میں تمام سرکاری خدمات، فرائض عامہ میں داخل نہیں ہیں اور نہ تمام سرکاری ملازم نظام سلطنت کے عہدہ دار ہیں۔ جسم سیاسی (جماعت عامہ) میں سلطنت کا عہدہ ایک خاص عضو کی حیثیت رکھتا ہے اور اسکے اپنے مخصوص فرائض ہیں۔

ہر ایک فرض عامہ مخصوص اغراض کے لئے محدود ہے اور عہدہ دار کی ذات اس فرض کی انجام دینے والی ہے، وسیع مفہوم میں سلطنت کے عمال یا کارکن وہ سرکاری ملازم ہیں جو اپنے لئے سرتاج سلطنت کی ماتحتی اور وقعت کو تسلیم ضرور کرتے ہیں مگر وہ

[1] خاص خاص فرائض عامہ ان لوگوں کو سپرد کئے جاسکتے ہیں مگر اس سے انکی اصلی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اپنے عہدوں کے کاموں کو خود اپنی رائے سے انجام دیتے ہیں۔ محدود مفہوم میں یوں کہنا چاہئے کہ یہ وہ افراد ہیں جنھیں خود حکم دینے کا اختیار ہوتا ہے اور یہ اُن لوگوں سے علیحدہ ہیں جنھیں اس قسم کا اقتدار و اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کو پرانے رواج کے مطابق منتظم عامہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ پروفیسر، سرکاری مدرسوں کے معلّم، عام شفاخانوں کے نگرانکار اور طبیب، سرکاری انجنیر اور خزانچی، ناظم املاک شاہی وغیرہ کے ایسے اکثر عہدہ دار اس صنف میں داخل ہیں۔

انتظامی اور عدالتی عہدہ داروں کا فرق

صحیح معنی میں کارکنانِ سلطنت وہ لوگ ہیں جو انتظامی یا عدالتی کاموں پر متعین ہوں اول الذکر اقتدار و اختیار سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے حدود اختیار کے اندر جس کام کو رعایا کے لئے مفید سمجھتے ہیں اُسکا حکم دیتے ہیں مگر اُنکا انحصار بالاتر عہدہ داروں پر ہوتا ہے اور وہ اُنکے ہدایات کے تابع ہوتے ہیں۔ برخلاف اسکے، عدالتی عہدہ دار یہ نہیں کرسکتے کہ خود اُنکی رائے میں مفاد عامہ کے لئے جو کام مناسب معلوم ہو اُس پر عمل کریں، وہ مجبور ہیں کہ قانون کو علی حالہ تسلیم کرکے اُس پر کاربند ہوں اور مقررہ قواعد کے بموجب اُسے نافذ کریں۔ مگر اس کام میں وہ خود اپنے فہم و ادراک کے تابع ہیں، حکومت کے خاص احکام کے پابند نہیں ہیں۔ معمولی حالات میں اول الذکر کارکنوں کا میلان، آزادی کی طرف اور ثانی الذکر کا رجحان، استحفاظ کی طرف ہوتا ہے۔

۳۔ سلطنت کے ملازموں اور عہدہ داروں کے مددگاروں کو سلطنت کے ان دونوں قسم کے کارکنوں سے ممیز رکھنا چاہئے۔ ان لوگوں کے ملازم سرکاری ہونے میں کوئی شک نہیں مگر انکا کوئی خاص منصب نہیں ہوتا، نہ انھیں کسی قسم کا اقتدار یا آزادانہ اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وہ محض ان عہدہ داروں کے مددگار ہیں جنکی ماتحتی میں وہ کام کرتے ہیں۔ اس زمرے میں، محرر، مفتش، محصّل وغیرہ داخل ہیں۔ چونکہ یہ لوگ سلطنت کے ایک عضو کے طور پر کام کرتے ہیں اس لئے انکا شمار سرکاری ملازموں میں ہے، خاصکر ایسی صورت میں کہ وہ دماغی کام انجام دیتے ہوں گو کہ یہ دماغی کام نہایت بلند درجہ کا نہ ہو، لیکن اگر یہ وصف بھی نہ ہو اور محض دستی خدمت مدنظر ہو تو ایسے لوگ سلطنت کے کام میں ہونے پر بھی سرکاری ملازم نہیں کہے جاسکتے۔ اُنکے لئے زیادہ موزوں یہ ہے کہ انھیں سلطنت کا شخصی یا خانگی ملازم کہئے۔ ہرکارے، دربان، عصابردار، اہل پولس، نقیب، وغیرہ

اسی زمرے میں داخل ہیں۔ اُنکی حالت، خدمات عامہ کے اعلیٰ شرائط کے بجائے شخصی قانون کے تابع ہوتی ہے۔

ملکی اور فوجی عہدوں میں فرق۔

۴۔ ملکی اور فوجی فرائض میں سب سے اول شہنشاہ قسطنطین اعظم نے صاف طور پر فرق قائم کیا اور نئے زمانے کی سلطنت میں اس فرق کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ فوج میں صرف عہدہ دار ہی خدام عامہ، سمجھے جاسکتے ہیں کیونکہ احکام کا تعلق صرف انھیں سے ہوتا ہے۔ باقی تمام سپاہی ایک عام ملکی فرض انجام دیتے ہیں یا ایک شخص معاہد کے طور پر اپنی خوشی سے فوج میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ملکی اور فوجی عہدہ داروں میں خاص امتیاز یہ ہوتا ہے کہ آخر الذکر میں انضباط زیادہ سخت ہوتا ہے اور فوجی اطاعت اُن پر لازم ہوتی ہے لیکن ایک حد تک اس امتیاز کی وجہ یہ بھی ہے کہ فوجی عہدہ داروں کو اختیارات، بالواسطہ حاصل ہوتے ہیں، کیونکہ اُن کا کام عاملانہ ہے اور یہ کام بالطبع دوسرے درجے پر ہے۔

اجتماعی اور انفرادی عہدوں کا فرق

۵۔ اجتماعی اور انفرادی عہدوں میں بھی ایک طرح کا فرق قائم کیا گیا ہے۔ اول الذکر جس میں بہت سے اشخاص داخل ہوتے ہیں اور جو غور و بحث کے بعد کثرت رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔ صلاح اور مشورے کیلئے زیادہ مناسب ہیں اور ثانی الذکر عمل کیلئے موزوں ہیں۔ بعض وقت اجتماعی غور و بحث اور انفرادی فیصلہ ایک ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر ایک وزیر دوسرے وزیر کی رائے لیکر خود فیصلہ کرتا ہے۔

جائے عمل کے اعتبار سے عہدوں میں امتیاز

علاوہ اسکے 'اعلیٰ اور ادنےٰ' ہونیکے لحاظ سے اور جائے عمل کے اعتبار سے بھی عہدوں میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ عہدے مرکزی بھی ہوتے ہیں، درمیانی بھی ہوتے ہیں، جن کا تعلق صوبوں، محکموں اور ضلعوں سے ہوتا ہے اور سب سے کمتر درجے میں مقامی یا سواضعاتی عہدے ہوتے ہیں۔ بعض وقت یہ عہدے متوازی العمل بھی ہوتے ہیں۔ یعنی متعدد عہدہ دار ایک ہی حد کے اندر ایک ہی اختیار عمل میں لاتے ہیں مگر ہر عہدہ دار بطور خود اُس پر عمل کرتا ہے۔ اُسکی مثال قدیم روما کے حکام اور انگلستان کے ناظمان امن ہیں۔

عہدے میں کیا کیا امور شامل ہیں۔

۶۔ عہدے میں بالعموم حسب ذیل چیزیں شامل ہوتی ہیں:۔

(الف) اختیارات عامہ اور فرائض عامہ کی ایک مخصوص نوعیت اور اُنکا ایک معین دائرۂ عمل جسے "حدود اختیار" کہتے ہیں۔

(ب) ایک مرکز یا معین مقام جسے "عہدے کا مستقر" کہتے ہیں اور جہاں بیٹھکر عہدے کا کاروبار عمل میں آتا ہے۔ جو عہدہ دار گشت کرتے رہتے ہیں اُنکے لئے بھی ایک مستقر ضرور ہوتا ہے۔

(ج) عہدے کی وسعت عمل کیلئے ایک حدِ ارضی (یعنی حلقے یا "گزر") کا ہونا۔

سلطنت اور اُسکے ملازموں کے باہمی تعلقات۔

۷۔ سلطنت اور اُسکے ملازموں کے باہمی تعلقات کا معاملہ شخصی قانون سے متعلق نہیں ہے جیسا کہ پہلے لوگوں نے خیال کیا تھا بلکہ یہ ایک خالص سیاسی نوعیت کا معاملہ ہے۔ سلطنت کی خدمت محض ماموری یا حکم برداری نہیں ہے اور اُسے اجرتی خدمت کہنا تو اور بھی بیجا ہے۔ شخصی قواعد کے معاہدے سے سرکاری ملازموں کے تقرر، اختیارات اور برطرفی کی تشریح نہیں ہوتی۔

سرکاری ملازموں کے تقرر کی بنیاد ایک باضابطہ حکمنامے پر ہوتی ہے جسے سلطنت اپنے ارادے سے عوام کے نفع کیلئے جاری کرتی ہے[۱]۔ لوگوں نے اس کارروائی کو "قانون خاص" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے مگر اس لفظ کا ترک بہتر ہے کیونکہ بالعموم تقرر کی کارروائی جماعت واضع قانون

[۱] دیکھو گوئنر کی تصنیف: "سلطنت کی ملازمت، قانونی نقطۂ نظر سے" لندس ہوٹ ۱۸۹۸ء اور تسخارے کی کتاب جلد ۲ صفحہ ۲۵ اور آگے۔ اشمٹ ہینر اپنی کتاب "قانون سلطنت" (صفحہ ۵۰۹) میں اُس زمانے کے مقننوں کی حیثیت قانون کے خیال کو تو مسترد کرتا ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ وہ خود اس موقع پر روما کے شخصی قانون کے اصول کو عائد کرنا چاہتا ہے حالانکہ خود اہل روما کو خواب میں بھی یہ خیال نہیں آیا ہوگا کہ اس قانون سے یہ کام لیا جائے گا۔ تاہم اُسکی یہ رائے ہے کہ خدمات عامہ کی بنا معاہدے پر ہے اگرچہ اُس معاہدے کی پابندی لازمی نہیں ہے۔ اس معاہدے کو وہ عہدے پر نصب ہونیکے لئے شرط مقدم قرار دیتا ہے جیسے جاگیر پر قبضہ پانے سے پہلے جاگیری معاہدہ ہوا کرتا تھا اگر یہ غلطی ہے اس قسم کے قبل از نصب معاہدات مستثنیات میں سے ہیں۔ کسی شخص سے یہ استفسار کرنا کہ آیا وہ عہدے کو قبول کرے گا یا نہیں اور اسکا جواب، معاہدہ نہیں قرار دیا جا سکتا یہ ایک موہوم معاہدہ ہوسکتا ہے اور اسکی بھی کوئی دلیل نہیں ہے اگر کسی مستثنیٰ صورت میں کوئی معاہدہ ہو بھی تو اس سے صرف فریقین کے شخصی حقوق پر اثر پڑتا ہے، حقوق عامہ پر اثر نہیں پڑتا اور اسلئے یہاں اس پر بحث کرنیکی کوئی ضرورت نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ نامزدگی کے قبول کرنے یا اُس سے انکار کرنیکا حق حاصل ہے مگر اس سے اُس حکم کی قطعی اور موثر حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

کی طرف سے عمل میں نہیں آتی بلکہ بادشاہیوں میں بادشاہ کی جانب سے عمل میں آتی ہے اور جمہوریتوں میں کبھی حکومت کی طرف سے اور کبھی عام انتخاب کے ذریعے سے عمل میں لائی جاتی ہے۔ یہ حکم سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کے ارادے کا یکطرفہ فعل ہے بلکہ جن مستثنیٰ حالتوں میں واقعی معاہدہ بھی ہو، جیسے غیر ملکیوں کے خدمات کے حصول میں ہوتا ہے، وہاں بھی یہ کارروائی یکطرفہ ہی سمجھی جاتی ہے۔ اگر نامزدگی کے بعد سلطنت کی طرف سے تقرر عمل میں نہ آئے تو اس قسم کا معاہدہ کسی کو بجبر مقرر کرانیکے لئے عدالتی کارروائی کی بنا نہیں قرار پاسکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ نقصانات کا مطالبہ کیا جائے جیسا کہ شخصی معاہدہ میں ہوتا ہے۔

خدمات عامہ کے فرائض کا تعین سلطنت کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ فرائض عام اور منتظم نوعیت کے ہوتے ہیں۔ عہدے کا قیام سلطنت کی ضروریات کیلئے ہوتا ہے، اُس شخص کے لئے نہیں ہوتا جو اُس پہ فائز ہو اس لئے عہدہ نہ کسی خاص شخص کی ملک ہوسکتا ہے اور نہ لوگوں کے لئے حصول زر کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ جہاں کہیں یہ حالت ہوتی ہے (جیسی کہ ازمنۂ وسطیٰ میں عام طور پر اور فرانس میں بعد کو بھی ہوتی رہی)۔ وہاں اس حالت میں سلطنت کیلئے شخصی قانون کے حدود سے نکلنا دشوار ہوجاتا ہے اور اور یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ سلطنت کو ابھی اپنی سیاسی ہستی کا پوری طرح احساس نہیں ہوا ہے۔

۸۔ عہدے کیلئے جو مواجبہ معین ہوتا ہے وہ البتہ ایک ایسا عنصر ہے جسکا واسطہ شخصی قانون سے ہے کیونکہ حقیقتاً اس مواجبے کی غرض یہ ہے کہ عہدہ دار اور اسکے خاندان کے معاشی ضروریات پورے ہوں اور چونکہ عہدہ دار سلطنت کی خدمت بجالاتا ہے اس لئے وہ حق رکھتا ہے کہ سلطنت سے اپنی زندگی کے اخراجات طلب کرے۔ اس قسم کے مطالبوں کی حیثیت سیاسی نہیں ہے بلکہ وہ ایک مالکانہ حق کی سی نوعیت رکھتے ہیں۔ پس مواجبے کے دعووں کا فیصلہ ایک ملکی جج (یا حاکم دیوانی) بخوبی کرسکتا ہے۔

مگر اس عنصر سے عہدے کی نوعیت عامہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہر زمانے میں ایسے غیر تنخواہ دار یعنی اعزازی عہدہ دار بھی ہوتے رہے ہیں جنکی اہمیت جماعت سیاسیہ میں باقاعدہ تنخواہ دار عہدہ داروں کے مثل رہی ہے۔ انگلستان کے ناظمان امن بلاشبہ سلطنت کے ویسے ہی عہدہ دار ہیں جیسے پروسیا کے تنخواہ دار (صوبہ دار) جو کوتوالی کے خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔

نواں باب

عہدہ داروں کا تقرر

موروثی عہدے

۱۔ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے ہر ملک میں جس طرح موروثی عہدے قائم ہوگئے تھے اب جدید سیاسیات میں ویسے ہی ہمہ گیر طور پر وہ مردود قرار پارہے ہیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ موروثی عہدے اپنی اپنی جگہ پر با اقتدار ہوگئے تھے اور اس طرح اُن عہدوں نے سلطنت کی وحدت اور اسکے نظم عمل کو برباد کردیا تھا۔ علاوہ اسکے ارثیت شخصی قابلیت کی ضامن نہیں ہوسکتی۔

زمانۂ حال کی سلطنتوں میں بھی مستثنیٰ طور پر موروثی عہدے ہوتے ہیں، مگر یہ عہدے بالعموم اعزاز کے طور پر ہوتے ہیں اُنکے ساتھ کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مثلاً دربار سے متعلق وہ عہدے جو ازمنۂ وسطیٰ سے چلے آرہے ہیں۔

توظیفی اور اعزازی عہدوں کا فرق

۲۔ توظیفی اور اعزازی عہدوں کا فرق اس سے زیادہ اہم ہے۔ توظیفی عہدے میں انسان اپنی تمام قوت صرف کر دیتا ہے اور وہی اُسکا ذریعۂ معاش ہوجاتا ہے۔ اُسکے لئے مختص معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس اُسکے حاصل کرنیکے لئے اس کے حسب ضرورت تعلیم، امیدواری اور امتحاناً کام کرنیکی حاجت ہے۔ پس اس قسم کے عہدوں کے لئے مواجبے کا ہونا ضروری ہے۔

برخلاف اسکے اعزازی عہدے کے فرائض صرف وقتاً فوقتاً انجام دینا ہوتے ہیں اور اس لئے ایسے خدمات کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو اپنا ذاتی کاروبار بجائے خود کرتے ہوں، جیسے زمیندار تاجر وغیرہ اور اُن کا ذریعۂ معاش ان کا پیشہ یا ذاتی دولت ہوتی ہے۔ جوری (پنچ) کی خدمت انجام دینا یا نیابتی مجلسوں میں شریک ہونا اسی قسم کے فرائض ہیں جو اس طریقے پر انجام پاسکتے ہیں۔ بظاہر سوسائٹی کا ذی ثروت طبقہ ہی اس قسم کے عہدوں کا کام انجام دے سکتا ہے۔ عوام الناس یا تو تعلیم یافتہ نہیں ہوتے یا اُنکے پاس وقت نہیں ہوتا یا دونوں کی کمی ہوتی ہے۔

جدید سلطنتوں میں توظیفی عہدے، زیادہ اہم ہیں مگر اکثر حالات میں دونوں قسموں کے فوائد متحد کئے جاسکتے ہیں۔ نیابتی اور خود اختیاری حکومتوں میں یہ مواقع ہیں کہ توظیفی عہدہ داروں کی ہدایات کے ساتھ نیابتی اعزازی عہدہ داروں کی مدد بھی شامل کرلیجائے۔

چنانچہ پروشیا میں صوبہ دار کو صوبے کے ارکان کے ساتھ ملادیا ہے۔ بیڈن (بادن) میں ضلع کا پریفکٹ ضلع کے اعزازی ارکان کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ توظیفی جج، جوری اور اسیسر کے ساتھ شریک کردئے گئے ہیں۔

جرمانیا کے عہدہ دار

۳۔ جرمانیا کی سلطنتیں اگرچہ اکثر اعتبار سے سیاسی ترقی میں انگلستان اور فرانس سے پیچھے ہیں مگر وہ اپنے قابل تعریف توظیفی عہدوں کے انتظام میں سب سے آگے ہیں۔ جرمانی طریق کے موافق عہدہ داروں کے ایک لائق اور قابل اطمینان گروہ کی موجودگی یقینی ہے اس طریقے کے اصول یہ ہیں:۔

(الف) عہدے اُن تمام لوگوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں جن میں اُن عہدوں کے کام کو سرانجام دینے کی قابلیت موجود ہو۔ غریب طلبہ کی امداد کے لئے بہ کثرت وظائف اور اوقاف موجود ہیں مگر فی الاصل زیادہ حصہ ایسے خاندان کے لوگوں کا ہوتا ہے جن میں خود تعلیم کا معیار بلند ہوتا ہے اور وہ خاندانی اخلاق و تربیت کا اثر گھر سے اپنے ساتھ لاتے ہیں اور پھر اُسکا اثر ملازمت کی عام سطح کے بلند کرنے پر پڑتا ہے۔

(ب) بالعموم سرکاری ملازمت کے امیدواروں کے لئے، یہ لازم ہے کہ انھوں نے کسی فوقانی مدرسے اور یونیورسٹی میں قدیم ادبیات (یعنی لاتینی اور یونانی) کی تعلیم پائی ہو؛ مہندسی اور فن تعمیر وغیرہ کے ایسے فنی (ٹکنکل) عہدوں کے لئے مذکورۂ بالا تعلیم کے بجائے عام فنی مدرسوں یا مہندسی مدرسوں کی تعلیم درکار ہوتی ہے۔ نصاب تعلیم کے ختم کرنیکے بعد ایک سرکاری امتحان ہوتا ہے جرمانی یونیورسٹیوں میں علمی روح جاری و ساری ہے وہ اس امر کی مانع ہے کہ تعلیم کی ہمت کسی خاص پیشے کی عملی تیاری تک محدود کردی جائے اور اُسکی کوشش اسی میں صرف ہو کہ قوانین اور اصول کی گہری معرفت حاصل کیجائے۔ اس طرح پرچینی حکام کے طرز تربیت کے نقائص ترقی پذیر علمی کاموں کے ذریعے سے رفع ہوجاتے ہیں اور سلطنت اور سوسائٹی کو اس بات کی ضمانت ملجاتی ہے کہ اُسکے عہدہ داروں کی ابتدائی تربیت نہایت اچھی ہوگی۔ امتحان کی شرط فریقانہ طرفداری

یا منافرت کا اور درباری سازشوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے، امتیازی قابلیت رکھنے والے نوجوانوں کے لئے میدان عمل کی راہ کو کھول دیتی ہے اور سخت پیروی کرنیوالے گرنااہل امیدواروں کو، چاہے وہ کیسی ہی بڑی بڑی سفارشیں یا اثرات رکھتے ہوں پیچھے ہٹا دیتی ہے۔

البتہ اس طریقے پر محض علمی خیال سے آنکھ بند کرکے عمل نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ سلطنت کو لازم ہے کہ چند مناسب مستثنیات کو بھی جگہ دے اور یہ استثنا صرف اُن غیر ملکیوں ہی کے حق میں نہ ہو جنکی قابلیت بغیر کسی سرکاری امتحان میں شریک ہوئے ظاہر ہو چکی ہو بلکہ اُن ملکیوں کے حق میں بھی ہو جو اپنی قابلیت کے باعث ممتاز ہوں۔ خصوصاً وہی لوگ جن کو قسام ازل نے نہایت اعلیٰ قابلیتوں سے مالا مال کیا ہے، شارع عام کو چھوڑکر اپنے لئے ایک نیا راستہ نکال لیتے ہیں اس لئے یہ سخت دیوانگی ہوگی کہ سلطنت اُن کی قابلیتوں سے متمتع ہونے سے ہاتھ دھو بیٹھے، صرف اس بنا پر کہ وہ اُس عام راستے پر نہیں چلے جو پہلے سے بنا دیا گیا تھا گو کہ اُنھوں نے کہیں زیادہ مشکل حالات میں رہ کر اپنی قابلیتوں کو چمکایا ہے۔ اسی کے مصداق وہ عہدے ہیں جنکے لئے اعلیٰ تدبر اور اعلیٰ علمی قابلیت درکار ہے جیسے وزرا اور مشیران سلطنت یا یونیورسٹیوں کے اساتذہ۔ ایسے مستثنیات کا قائم کرنا آسان ہے اور اس میں یہ خوف ہرگز نہیں کہ عام قاعدہ جو مقرر کیا گیا ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔

(ج) نظری (یا علمی) امتحان کے بعد عملی امتحان ہوتا ہے یعنی امیدوار کو کسی عہدہ دار یا قانون پیشہ کے تحت میں کام کرنا ہوتا ہے۔ اس امیدواری کے زمانے کے ختم ہونیکے بعد اور امیدوار کو کوئی عہدہ ملنے سے پہلے بالعموم اُسے ایک اور امتحان دینا ہوتا ہے تاکہ یہ اطمینان ہو جائے کہ اب وہ پختہ کار ہو چکا ہے اور اُسے سلطنت کا کوئی عہدہ دیا جا سکتا ہے۔

(د) جو لوگ ان شرائط کو پورا کرتے ہیں سلطنت اُن میں سے خود اپنی ضرورت کے موافق اُنکا تقرر کرتی ہے۔

اسکے بعد سے ملازموں کو اُنکے زمانۂ ملازمت اور ثبوت قابلیت کے موافق تدریجاً ترقی دیجاتی ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک معین ترتیب کے ساتھ اعزاز، منصب اور معاوضے میں ترقی دیجائے۔ یہ اصول اکثر و بیشتر تو درست ثابت ہوتا ہے مگر اُس پر نہایت

سمجھ بوجھ کر اور چند قیود کے ساتھ عمل کرنا چاہئے۔ بلند تر اور بلند ترین عہدے کچھ اس لئے تو ہیں نہیں کہ تھکے ہوئے مضمحل بڈھوں کا آخری نصب العین بنیں۔ پس سرکاری ملازموں کی ترقی کو بندھے ٹکے حسابی گر کی طرح اُنکی مدت ملازمت ہی پر لحاظ کرکے عمل میں نہ لانا چاہئے اصل چیز ہے اُنکے کام کی خوبی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت اچھے دماغ والے لوگ جب ایک طویل مدت تک ملازمت کے ادنےٰ درجوں میں رہ کے معمولی کام کی چکی میں پڑ جاتے ہیں تو اعلیٰ مدارج پر پہنچنے کے زمانے تک اُنکی کارآمد قوتیں مفلوج اور مردہ ہو جاتی ہیں حالانکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کہ اُن سے بہترین دماغی قابلیتوں کی توقع کیجاتی ہے۔ اس غلط طرزِ عمل کا ذمہ دار وہ نظام نہیں ہے جس نے ملازموں کی ترقی کے ضابطے کو مقرر کیا ہے بلکہ ارباب دفاتر کے کورانہ طرزِ عمل سے یہ نوبت آجاتی ہے۔ جو سیاسی عہدے سب سے بلند ہوتے ہیں انھیں کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اسکی ہے کہ اُن پر ایسے لوگ مامور ہوں جنکی قوتوں میں کسی طرح کی کمی یا خرابی نہ آئی ہو۔ چہ جائے کہ ایسے اہم عہدے فرتوت بڈھوں کے لئے وقف ہو جائیں۔ پس اعلیٰ عہدوں کے لئے قدامت ملازمت بہت کم صورتوں میں دلیل راہ بنادی جاسکتی ہے۔

(ھ) سلطنت جو مواجبے عطا کرتی ہے اُس سے عہدہ دار کو اپنی حالت کے موافق اپنی اور اپنے اہل و عیال کی گزر اوقات کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ اگر تجارت کی آمدنی سے مقابلہ کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ اکثر جرمانی عہدہ داروں کو بہت کم معاوضہ دیا جاتا ہے مگر اسکے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ تجارتی نفع نقصان کی غیر متیقن کیفیتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور اگر اپنے مواجب کو کفایت شعاری کے ساتھ اور کوئی اور ذاتی املاک ہو تو اسکے ساتھ ملا کر کام میں لائیں تو معقول طور سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اگر بے شمار توظیفی عہدوں کے بجائے کچھ عہدے اعزازی کر دئے جائیں تو توظیفی عہدوں کے معاوضے میں ترقی ہو سکتی ہے۔

(و) جرمانی عہدہ دار کو کچھ حقوق عاملہ (Pragmatio rights) بھی حاصل ہوتے ہیں یعنی ایک مقررہ تنخواہ پانیکا اور جب سلطنت کو اُسکی خدمت کی ضرورت باقی نہ رہے یا جب وہ خود عمر یا بیماری کی وجہ سے کام کے قابل نہ رہے تو وظیفہ پانے کا اُسے قانونی حق ہوتا ہے۔

اس طریق میں جرمانی عہدہ داریہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک قابل اطمینان اور قابل عزت حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی قوت اجتماعی کے احساس کے ساتھ ایک حقیقی پیشہ ور جماعت کی ہیت اختیار کر لیتے ہیں اور انھیں سیاسی قوت کی بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ سلطنت کے سرتاج اور رعایا کے نمایندوں کو بھی انھیں میں شامل کرنا پڑتا ہے اور ان لوگوں کو انکے اتحاد عمل کے بغیر مفر نہیں۔

انگلستان کے عہدہ دار

۴۔ انگریزی طریقہ اس سے بالکل مختلف ہے، صوبوں میں پولس کا انتظام اور اختیار غیر تنخواہ دار کارکنوں کو سپرد ہوتا ہے جو طبقۂ امرا سے لئے جاتے ہیں۔ وزرا مستقل عہدہ داروں کے طبقے سے نہیں لئے جاتے بلکہ پارلیمنٹ کے فریقوں میں سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ ملکی عہدوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا تقرر فریقانہ اثر سے ہوتا ہے اور اُن میں سابقہ اہلیت کا کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ صرف پارلیمنٹ کے ذی اثر ارکان کی سرپرستی اور سفارش سے یہ تقررات عمل میں آتے ہیں۔

لیکن اب انگلستان تک میں امیدواروں کے امتحان لینے کی ضرورت بہ نسبت سابق کے زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے۔ اعلیٰ عدالتی عہدوں کے لئے ایک طویل زمانہ کی قانونی تعلیم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ تعلیم یونیورسٹیوں میں نہیں ہوتی بلکہ "انزآف کورٹ" میں اور پیشے کے عملی تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ اکثر خصوصی اور فنی عہدوں کیلئے بھی اب امتحان کی ضرورت ہوتی ہے۔ نااہل لوگ خارج کر دئے جاتے ہیں اور مربیانہ اور فریقانہ اثر کم ہوتا جاتا ہے۔ وزارت کے تغیر سے صرف ساٹھ جگھوں پر اثر پڑتا ہے جن میں کچھ تو اعلیٰ سیاسی عہدے ہیں اور کچھ دربار سے متعلق عہدے ہیں۔

ممالک متحدہ امریکہ کے عہدہ دار

۵۔ ممالک متحدہ کا طریقہ ابتداءً انگریزی طریقے پر مبنی تھا مگر اُسکا عملدرآمد جمہوری اور عمومی انداز پر ہوتا تھا۔ اینڈرو جیکسن کے عہد صدارت میں تغیر کامل کا خطرناک طریقہ جاری ہوا جسے "طریق غنایم" کہنا چاہئے۔ کسی نئے صدر جمہوریہ کے انتخاب پر یعنی ہر چوتھے یا کم سے کم ہر آٹھویں برس، اگر کوئی دوسرا فریق برسراقتدار ہو جائے تو عہدوں کی ایک کثیر تعداد خالی ہو جاتی ہے اور نئے لوگوں سے معمور کیجاتی ہے۔ اس لئے عہدوں کے حصول کا ایک عام خبط پیدا ہو جاتا ہے اور فریقانہ خواہشوں کے مقابلے میں سلطنت اور سوسائٹی کے اغراض کا بہت کم خیال کیا جاتا ہے۔ پس اس طرح عہدہ داروں کا تمام طبقہ غیر متیقن حالت

اور شدید تغیرات کے خدشے میں رہا کرتا ہے اور اس حالت میں رشوت خواری اور خرابیوں کا روکنا مشکل ہوتا ہے۔ صرف ججوں کی حالت بہتر ہے اور چونکہ عادتاً تجربہ کار وکلا میں سے اُن کا انتخاب ہوتا ہے اسلئے اُنکی قانونی مہارت اور قابلیت کی طرف سے اطمینان ہوتا ہے۔

فرانس کے عہدہ دار

۶ - فرانس میں عہدہ داروں کا ایک طبقہ تو ہے مگر اُنکو بہ حیثیت مجموعی جرمانیا کے عہدہ داروں کی سی آزادی ہے اس لئے کہ سلطنت کے سرتاج یعنی موجود الوقت وزارت کو عہدہ داروں کے تقرر اور برطرفی کا اختیار نسبتاً زیادہ حاصل ہوتا ہے اور نہ اُنکی علمی قابلیت ویسی اطمینانی ہوتی ہے۔ البتہ اکثر فنی اور خصوصی عہدوں کیلئے خاص مدرسوں (یعنی مدارس فنون۔ فوجی تعلیمی مدارس) کی خاص تعلیم کی شرط ہے عدالتی فرائض کیلئے یونیورسٹی کی تعلیم درکار ہے مگر اس قاعدے پر اُس وسعت اور کثرت کے ساتھ عمل نہیں ہوتا جیسا کہ جرمانیا میں ہوتا ہے۔ عہدہ دار کا انحصار حکومت پر زیادہ ہوتا ہے عہدے اور سلطنت کی وفاشعاری کے بجائے فریقانہ وفاشعاری کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔

جمہوری سلطنتوں میں تقرر بالعموم ایک معین زمانے کیلئے ہوتا ہے

۷ - قدیم زمانے کی جمہوری سلطنتوں میں اور کسی قدر اس زمانے کی جمہوری سلطنتوں میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ عہدہ داروں کا تقرر ایک معین مدت اور عموماً چند برسوں کے لئے ہوتا ہے کہیں دوبارہ مقرر ہونیکا امکان رہتا ہے اور کہیں یہ امکان بھی نہیں ہوتا۔ سوئزرلینڈ اور امریکہ وغیرہ میں یہی طریقہ جاری ہے۔ مقامی عہدوں کے لئے یہ طریقہ بخوبی کام دے سکتا ہے کیونکہ اُن عہدوں کے لئے بالعموم زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اُس میں کسی شخص کو اپنی پوری قوت صرف کرنیکی ضرورت ہو مگر جب سلطنت کے عہدوں کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جہاں اس زمانہ کے اعلیٰ ترقی یافتہ ضروریات کے لحاظ سے ایک مدت دراز کی فنی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے، تو اس سے سخت نقصانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طریقے میں بکثرت تغیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذاتی حرص وطمع اور فریقانہ سازشوں کے پورا کرنیکا موقع ملتا ہے۔ کارکنوں کو طمانیت نہیں رہتی اور سیاسی کاموں کی پائداری اور استقامت کم ہو جاتی ہے - ان نقصانات کے مقابلے میں یہ نفع کوئی چیز نہیں ہے کہ اس طریقے سے نالائق عہدہ دار اور وہ لوگ جنھوں نے عوام کا اعتماد کھو دیا ہے آسانی کے ساتھ خارج کئے جا سکتے ہیں۔ یہ طریقہ اعیانی حکومت میں اس قدر خطرناک نہیں ہے کیونکہ فطرتاً اسکا میلان استقامت

اور اعتدال کی طرف ہوتا ہے لیکن عمومی حکومت میں یہ زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے کیونکہ اس طریق حکومت میں تغیرات کا شوق زیادہ ہوتا ہے اور محض اسی وجہ سے اس کا رجحان کم مدت کے طریقے کی طرف ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی اندیشہ رہتا ہے کہ نہایت اعلےٰ قابلیت کے لوگوں کے خدمات سے سلطنت محروم ہوجائے اور اسکی وجہ یا تو عوام کی خود رائی اور کج فہمی ہوتی ہے یا یہ کہ خود یہ لوگ اس سے زیادہ قابل اطینان طریق زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔

عہدے کے قبول کرنے یا اس سے انکار کرنیکی آزادی

۸۔ جو شخص کسی عہدے پر مقرر کیا جائے اُس کے قبول کرنے یا اس سے انکار کرنیکے متعلق اُسے آزادی حاصل ہونا چاہئے۔ اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ سلطنت کی خدمت کی بنیاد معاہدے پر ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ دماغی کام کے لئے قطعی مجبوری کا عاید کرنا دشوار ہے اور ضمنی مجبوری حصول مقصد کے لئے ناکافی ہوتی ہے۔ تمام مفید کاموں کی انجام دہی کے لئے شخصی آزادی پہلی شرط ہے۔ کوئی باشندۂ ملک اس امر پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دوسرے کی بہ نسبت زیادہ ایثار کرے۔ اس زمانے کی تمام سلطنتوں میں خواہ جمہوری ہوں یا شاہی یہ اصول مسلم ہے۔ مقامی عہدے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اُن کی تعداد کی کثرت اور کام کی قلت کی وجہ سے ہر باشندے پر اُنکی انجام دہی کا ایک عام فرض عاید ہوجاتا ہے[۱]۔

تقرر کی ابتدا کس وقت سے ہوتی ہے

یہ سوال معرض بحث میں رہا ہے کہ تقرر کی ابتدا کس وقت سے ہوتی ہے اگر ہم اس امر کا خیال رکھیں کہ تقرر صرف سلطنت کی یکطرفہ کارروائی ہے تو ہم بلا تردد اسکا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ جس وقت سے یہ کارروائی عام کردیجائے یعنی درج ہوجائے اور اس پر دستخط ہوجائیں اسی وقت سے تقرر ہوجاتا ہے۔ نامزد شدہ شخص کو اس کی اطلاع دینا اور بعد میں اُسکو عہدے پر منصب کرنا یہ سب کامل نامزدگی کے نتائج مابعد ہیں[۲]۔

[۱] اسکی مثال وہ شہر ہیں جو سلطنت بن گئے ہیں۔ جیسے کہ "شہنشاہی" کے آزاد شہر تھے یا جہاں نظام سلطنت اس قدر سادہ ہوتا ہے کہ اُسکی حالت ایک ضلع یا قصبے کی حکومت کی سی ہوتی ہے جیسے اپنت سل کے کنٹوں کی حالت ہے۔

[۲] اس بحث پر صدر جمہوریہ جفرسن اور ممالک متحدہ کی عدالت عالیہ کے درمیان تنازعہ ہوچکا ہے

بقیۂ حاشیۂ صفحۂ گزشتہ۔ (اسٹوری جلد سوم صفحہ ۳۷) جفرسن کا دعوے یہ تھا کہ نامزدگی سے عہدہ دار کو کوئی حق نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ حکم نامزدگی اُسے نہ ملجائے۔ عدالت عالیہ کی رائے یہ تھی کہ محض نامزدگی ہی اس اعتبار سے اثر پذیر ہے کہ جس حکومت نے نامزدگی کی ہے وہ اُسے ساقط کرنیکا حق نہیں رکھتی۔

تسخارے کا خیال یہ ہے کہ نامزدگی کا اثر قانونی نتائج تک محدود ہے (دیکھو تسخارے کی کتاب فقرہ ۱۴۶) مگر یہ تحدید نہ تو ضروری ہے اور نہ صحیح ہے۔ نامزدگی کا اثر محض شخصی معاہدے کے طور پر نہیں بلکہ سلطنت کے فعل عامہ کے طور پر ہے اور اگرچہ عہدے پر نصب ہونیکے وقت تک اختیارات عمل میں نہیں لائے جاسکتے مگر اُن اختیارات کے عمل میں لانیکا حق پہلے ہی سے قائم ہوجاتا ہے۔

دسواں باب

سرکاری عہدہ داروں کے حقوق اور فرائض

فرائض منصبی کی انجام دہی

۱۔ سب سے مقدم یہ ہے کہ عہدہ دار کو اپنے فرائض منصبی کے انجام دینے کا حق ہوتا ہے۔ اسے عہدہ دار کا حق قانونی یا اسکا قانونی حیطۂ اقتدار کہتے ہیں، اور اسکا تعلق تمامتر مفاد عامہ سے ہے۔ اسکے ساتھ یہ فرض بھی مستقلاً وابستہ ہے کہ عہدہ دار اپنے عہدے کے کارہائے منصبی کو اسی طرح انجام دے جس طرح ہونا چاہئے۔ پس اس حق قانونی کا عمل میں لانا عہدہ دار کی شخصی مرضی پر منحصر نہیں ہے۔ سلطنت یہ حق اُسکو اس لئے نہیں دیتی کہ جو اُسکا جی چاہے کرے بلکہ اس لئے کہ وہ خدمت عامہ کا انصرام کرے۔ اسی سبب سے عہدہ دار کو سلطنت سے یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوا گا اور ذاتی حیثیت سے اپنے عہدے کے دائرۂ عمل کی وسعت یا اپنی سرکاری کارگزاری کی نوعیت کو معین کرے۔ بلکہ ان دونوں باتوں میں وہ قانون کے اُن احکام کا (جنکی رو سے اُسکے عمل کی وسعت اور طرز کارگزاری میں رد و بدل لازم آتی ہے) اور حکام بالادست کی ہدایتوں کا تابع ہے، چاہے یہ چیزیں اُسکی ذاتی مرضی کے خلاف ہی ہوں۔ پس اُسکے ذمے نئے کام بھی عائد کئے جاسکتے ہیں اور اُسے اُن سے انکار کرنیکی قدرت نہیں۔ البتہ یہ نئے کام بھی وہی ہونگے جو اُسکے عہدے سے متعلق ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ عہدوں کی ہستی اور اُن کی نوعیت کلیۃً سلطنت سے متعلق ہے اور اس وجہ سے عہدے کا حق اور عہدے کے فرائض بھی، سلطنت ہی کے تابع ہیں۔

منصب اور درجہ

۲۔ عہدہ دار کو اُسکے عہدے کے لقب اور درجے کا شخصی حق حاصل تو ہوتا ہے مگر اس حق کی بنا بھی سیاسی اغراض پر ہوتی ہے اور بذریعۂ قانون اُس میں ترمیم کیجا سکتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی سابق عہدہ دار کا لقب اور درجہ اُسکے شخصی حق کے طور پر قائم رہے۔

اخراجات کیلئے معاوضہ

۳۔ اغراض سلطنت کے لئے جو اخراجات پیش آئیں یا جو نقصانات برداشت کئے جائیں اُنکے معاوضے کا حق خالصاً شخصی قانون سے تعلق رکھتا ہے اور اس معاملے میں تنخواہ دار

اور غیر تنخواہدار دونوں عہدہ دار یکساں ہیں۔

تنخواہ۔اسواجبہ

۴۔ لیکن خود خدمات کے معاوضے کا حق اسی کے مثل نہیں ہے۔ اسکا انحصار سلطنت کی رائے پر ہے کہ کسی خاص عہدے کیلئے تنخواہ ہونا چاہئے یا نہیں۔ جس عہدہ دار کو تنخواہ ملتی ہو وہ اپنی تنخواہ کے متعلق شخصی قانون کے حقوق کا تابع ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ اکثر جرمانی سلطنتوں کی طرح عہدہ داروں کے معاوضے میں امتیاز قائم کردیا جائے۔ یعنی (۱) ایک معاوضہ درجے کا ہو اور (۲) ایک معاوضہ خدمت کا۔ سلطنت کا یہ فرض ہے اور اسکے اغراض کیلئے یہ ضروری ہے کہ جن عہدہ داروں کے پورے وقت اور قابلیت سے وہ کام لیتی ہو، اُنکے حسب حال اُنکی گزراوقات کا سامان کرے لیکن اسکے علاوہ کچھ اخراجات ایسے بھی ہیں جو عہدے کے فرائض ادا کرنے میں لازمی طور پر پیش آتے ہیں یا اُن فرائض سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ امتیاز ان عہدہ داروں کے معاملے میں خاص اہمیت رکھتا ہے جو عملی خدمات سے کنارہ کشی اختیار کرنیوالے ہوں۔ سابق الذکر قسم کے معاوضے کے متعلق اُنکا حق قائم رہتا ہے لیکن موخر الذکر قسم کے معاوضے کے متعلق اُنکا کوئی حق نہیں رہتا۔ اول الذکر ایک بڑی حد تک شخصی قانون کا معاملہ ہے اور موخر الذکر فرائض عامہ کے عملدرآمد سے تعلق رکھتا ہے۔ جن خاص عہدوں کے ساتھ خاص معاوضے یا رسوم وغیرہ شامل ہوتے ہیں وہ آخر الذکر قسم میں سمجھے جاتے ہیں۔ خواہ اسکا تعلق عہدہ داروں کی مستقل آمدنی ہی سے کیوں نہ ہو۔ سلطنت کو اختیار ہے کہ اس قسم کے رسوم میں تغیر کرے۔ رسوم کی کمی کی تلافی کے لئے اگر معینہ تنخواہ میں اضافہ کردیا جائے تو یہ ایک رعایت ہے ورنہ اس قسم کی تلافی کیلئے کوئی قانونی حق نہیں ہے۔

وظیفۂ تقاعد

وظیفۂ تقاعد کا حق اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ عہدہ دار اگر بغیر اپنے کسی قصور کے عہدے سے ہٹنے پر مجبور ہو تو اُسے اپنی تنخواہ کے متعلق شخصی قانون کے موافق حق حاصل ہوتا ہے۔ وظیفے کا تناسب تنخواہ گزراوقات کے موافق ہونا چاہئے اور اگر اس قسم کا کوئی امتیاز باضابطہ نہ تسلیم کیا گیا ہو تو وظیفے کے معین کرتے وقت عہدے کے اصلی اخراجات کو وضع کرلینا چاہئے۔ مناسب یہ ہے کہ وظائف کی مقدار اور شرطیں از روئے قانون قطعی طور پر معین کردیجائیں تاکہ کسی قسم کی آزادی رائے سے کام لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ وظائف کے عام دستور سے خزانے پر بہت بڑا بار پڑجاتا ہے لیکن سلطنت کو پورا دقت

دینے والے عہدہ داروں کی ضرورت ہو تو پھر اس بار کے نہ برداشت کرنیکے لئے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ تجارت وحرفت کی آمدنی کے مقابلے میں سرکاری عہدہ داروں کی تنخواہیں اکثر حالتوں میں بہت کم ہوتی ہیں اور ذہنی قابلیت وتعلیم کی انھیں زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لئے سلطنت کا یہ فرض ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی اسکے لئے وقف کر دیتے ہیں اُنھیں احتیاج کی طرف سے مستغنی کر دے۔ اس خرچ کا معاوضہ عوام کو اس طرح ملجاتا ہے کہ بہتر لوگ ملازمت میں داخل ہو جاتے ہیں اور رشوت لینے کی طمع باقی نہیں رہتی۔

سلطنت کے ملازموں کی بیواؤں اور اُنکے یتیم بچوں کو وظیفے کا کوئی قانونی حق نہیں ہوتا۔ تنخواہ موروثی نہیں ہوتی۔ بہت سی سلطنتوں میں یہ عمدہ انتظام جاری ہے کہ وظیفہ کا ایک عام سرمایہ ہوتا ہے اور اسکا قیام زیادہ تر عہدہ داروں کی تنخواہوں کی وضعات پر ہوتا ہے۔

عہدہ داروں کے فرائض

۶۔ عہدہ داروں کے فرائض زیادہ تر اُنکے حقوق کے تابع ہوتے ہیں علاوہ اسکے اُن پر اپنے سے اعلیٰ عہدہ داروں کی اطاعت بھی لازم ہوتی ہے۔ سلطنت کے سرتاج اور قوم کے ساتھ انھیں وفاشعاری برتنا پڑتی اور ضرورت ہو تو رازداری کی پابندی بھی کرنا پڑتی ہے۔ عام طور پر عہدے کے لئے جو حلف لیا جاتا ہے اس سے یہ ذمہ داری پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس سے یہ ذمہ داری مضبوط ہو جاتی ہے۔ یہ عہدہ دار کے فرائض کی کوئی شرط نہیں ہے نہ اس سے فرائض پر کسی قسم کا اثر پڑتا ہے۔

اطاعت

مختلف کاموں کی نوعیت کے اعتبار سے اطاعت کی حالت بھی بدلتی رہتی ہے انتظامی اور عدالتی کارکنوں کے لئے اسکی حیثیت مختلف ہوتی ہے۔ بظاہر موخر الذکر کو فی الجملہ آزادانہ حیثیت حاصل ہونا چاہئے مگر اول الذکر بھی اطاعت مطلق یا غلامانہ اطاعت پر مجبور نہیں ہیں۔ قانون و اخلاق دونوں طریقوں سے ایک حد معین ہو جاتی ہے۔ خاص خاص صورتوں میں اطاعت کی حد معین کرنا بڑا مشکل مسئلہ ہو جاتا ہے۔

(الف) عہدہ دار یہ کرسکتا ہے کہ اُسے جو حکم دیا جائے اُسکی نسبت وہ یہ دیکھے کہ وہ حسب ضابطہ ہے یا نہیں، یعنی بالادست عہدہ دار کو اپنے عہدے کے اعتبار سے اس حکم کے دینے کا حق ہے یا اس نے محض اپنی ذاتی رائے سے حکم دیدیا ہے۔

نیز یہ کہ اس حکم کی تعمیل خود اُسکے اختیار کے اندر ہے یا نہیں۔ علاوہ اسکے جس حکم کے لئے دستخط کی ضرورت ہوتی ہے اگر اُس پر دستخط نہ ہوں تو وہ اسکی تعمیل سے انکار کر سکتا ہے۔ وہ سرکاری کارکن ہے کوئی خانگی ملازم نہیں ہے اور اس لئے اُسے یہ حق ہے کہ وہ احکام کے حسب قانون ہونیکے لئے اُنکی نوعیت پر غور کرے۔

اگر اس قسم کی تحقیق کا سوال مشتبہ ہو اور عہدہ دار بالادست یہ تصدیق کرے کہ اُسے حکم دینے کا حق ہے تو عہدہ دار ماتحت کے لئے اطاعت لازم ہے۔ اُسکا حق بلکہ اُسکا فرض جو کچھ ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے شکوک کو اپنے بالادست کے سامنے بیان کر دے اور دوبارہ حکم دئے جانیکا انتظار کرے۔

(ب) کسی حالت میں کوئی عہدہ دار اس قسم کی اطاعت پر مجبور نہیں ہے جس سے مذہب و اخلاق کے اعلیٰ اصول شکست ہوتے ہوں، یا جس سے وہ خود کسی جرم میں شریک ہو جاتا ہو۔ اس قسم کے کام ہرگز اُسکے عہدے کے فرائض میں داخل نہیں ہو سکتے۔ کسی عہدہ دار سے یہ توقع نہیں کیجا سکتی کہ وہ ایسے کام انجام دیگا جسے دوسرا شخص انسانیت کے خیال سے یا صاحب مذہب، مذہب کے خیال سے یا ایک معمولی شہری ملک کے تعزیری قانون کے لحاظ سے اسکی انجام دہی سے انکار کر دیگا (الف)

(ج) ایک ماتحت عہدہ دار کسی ایسے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کر سکتا جسے وہ اپنی

(الف) (اس موقع پر یقیناً ایک فرد واحد کے اخلاق اور اسکے عہدے کے قانونی فرض میں خلط مبحث ہو گیا ہے۔ حامی کمالات، ہونے کی حیثیت سے حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اخلاق کا احترام کرے مگر کسی عہدہ دار کا یہ حق نہیں ہو سکتا کہ وہ قانونی اور آئینی وجوہ کے سوا کسی اور وجہ سے مقاومت کر سکے۔ یہ یقینی ہے کہ اُس سے یہ خواہش نہیں کیجا سکتی کہ وہ ملک کے فوجداری یا دیوانی قانون کی خلاف ورزی کرے لیکن اگر کوئی ایسا حکم دیا جائے جو اسکے مذہب یا اُسکے اخلاق کے مغائر ہو تو وہ یہ نہیں کر سکتا کہ صرف اس بنا پر اس حکم کی تعمیل بھی نہ کرے اور اپنے عہدے پر بھی قائم رہے۔ آگے کے فقرات (ج) و (د) میں اس امر کو صحیح طور پر بیان کیا ہے مگر بلنجلی نے جو کچھ یہاں بیان کیا ہے اس میں اور مذکورۂ بالا فقروں میں تناقض معلوم ہوتا ہے۔ انگریزی مترجم)

رائے میں خلاف قانون یا نامناسب سمجھتا ہو، وہ اس معاملے میں صرف اپنے بالادست کے سامنے عذر پیش کر سکتا ہے، اُسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اُسکے بالادست کی غرض) یہ نہیں ہوسکتی کہ وہ قانون) کی خلاف ورزی کرے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اُس نے کسی خاص معاملے میں کافی غور نہ کیا ہو اور ممکن ہے کہ ماتحت کی ادب اور صاف دلی کے ساتھ ظاہر کی ہوئی رائے کو سنکر وہ اپنے فیصلے میں ترمیم کر دے۔ کسی عہدہ دار کو اپنے بالادست اور اپنی سلطنت کو لغزشوں سے بچانے میں کوتاہی نہ کرنا چاہئے لیکن اگر افسر بالادست اپنے احکام پر مصر ہو تو ماتحت پر اطاعت لازم ہے اور ذمہ داری بالادست پر عائد ہوتی ہے۔ بہ خلاف اسکے اگر ماتحتوں کو مقاومت کا اختیار دیدیا جاوے تو سلطنت کی وحدت عمل برباد ہو جائے گی، اسکی قوت مفلوج ہو جائیگی اور قانون کی ایک منفرد خلاف ورزی کی بہ نسبت جسکا ذمہ دار بالادست افسر ہے کہیں زیادہ مذموم نتائج پیدا ہونگے۔[۵]

---

[۵] اکثر نظامہائے سلطنت میں یہ اصول واضح طور پر ظاہر کر دیا گیا ہے، مثلاً ۱۸۹۲ء کے ہنیوور کے نظام سلطنت کی دفعہ (۱۶۱) میں یہ کہا گیا ہے کہ جو حکم صحیح صورت میں بالادست عہدہ دار کی طرف سے جاری ہوتا ہے اُس سے اس ماتحت عہدہ دار پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جسے وہ حکم دیا جاتا ہے بلکہ اُسکی ذمہ داری اُس بالادست پر عائد ہوتی ہے جو حکم دیتا ہے۔ اسی طرح مائی منگن کے نظام سلطنت کی دفعہ ۴۰۴ میں اور آیسٹبرگ کے نظام سلطنت کی دفعہ (۳۰) میں یہ درج ہے کہ ہر ایک خلاف قانون امر کی ذمہ داری اُس شخص پر ہے جو اسکا حکم دے بالادست عہدہ دار کے احکام کا عذر صرف اس صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے، جب وہ احکام صحیح صورت میں نافذ ہوں اور اُنکا نافذ کرنیوالا اُنکا اختیار رکھتا ہو، اس صورت میں وہی اُن احکام کا ذمہ دار ہو جاتا ہے جس نے اُنکو جاری کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گوشینر (اپنی کتاب محولۂ بالا کے فقرۂ ۹۷ میں) "شرف اطاعت" کے معنی یہی سمجھا ہے گو کہ اس میں شک نہیں کہ اُس نے عہدہ دار کو ایک "کل" فرض کر کے اپنے استدلال کی بنا کو کمزور کر دیا ہے؛ اسلئے کہ وہ غیر واجبی احکام کے خلاف عذر کرنیکے فرض کو تسلیم کرتا اور اطاعت کے فرض کو صورت اور معنی دونوں کے لحاظ سے محدود کرتا ہے (دیکھو اُس کی کتاب صفحہ ۲۰۸) اسکے علاوہ اس سلسلے میں جو "کل" کا لفظ استعمال ہوا ہے اُس سے رہبانیت کی سی بو آتی ہے۔ (اس نہایت معرکۃ الآرا مسئلے پر دیکھو شلتنے کا جرمانی قانون سلطنت، جلد ۱، صفحہ ۳۲۵ اور آگے، لابند کی تصنیف، جلد ۱، صفحہ ۴۰۴ اور آگے لوئننگ کا "قانون نظم ونسق" صفحہ ۱۲۲ اور آگے۔)

یہی حال بالادستوں کے خلافِ آئین احکام کا ہے۔ اُنکی مقاومت کرکے ماتحت کو خود آئینی اطاعت کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہیئے۔

وفاشعاری

۷۔ وفاشعاری کا خیال فرضِ اطاعت سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ عہدہ دار کو جو حکم دیا جائے جب وہ لفظاً و معناً اُسکی تعمیل کر دیتا ہے تو وہ اپنے فرض اطاعت سے سبکدوش ہو جاتا ہے لیکن وفاشعاری کا اثر اُسکے تمام اعمال و افعال پر حاوی ہوتا ہے۔ البتہ اب جاگیر داری طریق کی طرح وفاداری نظم معاشرت کی بنیاد خاص نہیں رہی ہے، کیونکہ عہدہ داروں کے فرائض قانوناً معین ہو گئے ہیں۔ اُنکے کاموں پر بادشاہ کی ذات کی وفاشعاری سے زیادہ سلطنت کی ضروریات کا اثر پڑتا ہے۔ با ایں ہمہ ملازمت سرکاری کی یکجہتی اور اُسکے اخلاقی ارتباط کی بنیاد ابھی تک وفاشعاری پر ہے۔

اگر کوئی عہدہ دار ایسے منفرد امور میں جو اہم ہوں اپنے بالادستوں کی رائے کے خلاف رائے رکھتا ہو اور وقت ضرورت اُسکا اظہار بھی کرتا رہتا ہو تو اس سے وفاشعاری کے فرض میں کوئی نقص نہیں عائد ہوگا۔ لیکن اگر وہ مستقل اور اساسی اصولوں میں حکومت سے مختلف الرائے اور اُسکے مخالف ہو، مثلاً شاہی حکومت میں وہ اپنی جمہوریت پسندی کا اظہار کرے اور جمہوری سلطنت کے قیام کے لئے کوشش کرتا ہو یا اسکے برعکس جمہوریت میں شاہی کے لئے کوشاں ہو تو اس سے وفاداری کا رشتہ ٹوٹ جائیگا اور وہ جسم حکومت کا ہم آہنگ عضو نہ رہیگا۔ یہی حال اس عہدہ دار کا ہے جو اُس مخالفت میں باقاعدہ اور مسلسل حصہ لیتا ہو جسکا مقصود حکومت کو پلٹ دینا یا اسکے راستے میں دقت حائل کرنا ہو۔ یہ وفاشعاری کے اس درجہ خلاف ہے کہ کوئی حکومت طوائف الملوکی کی حالت میں پڑے بغیر اسے گوارا نہیں کر سکتی[۱]۔ کسی خاص کام میں ترک اطاعت نہ بھی کیجائے تو بھی وزارت سے

[۱] گیزو نے واشنگٹن کی سوانح عمری کے دیباچے میں اُسکا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب تک کہ مہام ملکی کی باگ میرے ہاتھ میں ہے، میں دیدہ و دانستہ کسی اہم جگہ پر ہرگز کسی ایسے شخص کو نہیں مقرر کرونگا جسکے سیاسی خیالات حکومت کی عام روش کے خلاف ہوں۔ میری رائے میں ایسا کرنا ایک طرح کی سیاسی خودکشی ہے۔" اشٹائن کے مندرجہ ذیل پرزور ملفوظات سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جرمانی مدبروں نے اُن خرابیوں کو کس قدر قوی طور پر محسوس کر لیا ہے جو غیر وفادار عہدہ داروں کے باعث

باقاعدہ مخالفت کرنا' وفاشعاری کے خلاف ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی عہدہ دار بالکل مختلف بلکہ مخالف رائے رکھتا ہو اور اس سے اُسکے عہدے کے فرائض کی بجا آوری میں خلل نہ پڑے مگر اُس پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے عہدے کی حیثیت سے اس قسم کے خیالات کا اظہار نہ کرے۔ اگر وہ ایمانًا یہ یقین رکھتا ہے کہ اُسے قولًا وفعلًا اپنی مخالفت کا اظہار کرنا لازم ہے تو اُسے چاہئے کہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ججوں کی حالت زیادہ آزادی کی ہے۔ اُن کا عہدہ سیاسی نوعیت کا نہیں ہوتا اور نہ اُسکا انحصار حکومت کی مرضی پر ہوتا ہے۔

عہدے کی وفاشعاری کا ایک لازمہ یہ بھی ہے کہ اپنی حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی عہدہ دار کسی غیر سلطنت کی نہ تو کوئی خدمت اختیار کرے نہ اسکی طرف سے کوئی اعزاز، وظیفہ یا اس قسم کا کوئی اور امتیاز قبول کرے۔

راز داری

۸۔ سرکاری راز داری جو حسب قاعدہ عہدہ داروں پر فرض ہے اُسے کلی اور مطلق راز داری نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اُسکا تعلق انھیں امور سے ہے جنکا علم عہدہ دار کو اپنے عہدے کی بدولت حاصل ہوا ہو اور جنکے افشا سے سلطنت یا افراد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا کسی اعلیٰ تر فریضے کی بنا پر راز داری ضروری ہو دونوں انتہائی حدوں سے بچنا چاہئے۔ نہ تو خلاف آئین اور خلاف قانون افعال کو چھپانے کے لئے بدنیتی یا تقشف سے پراسرار خاموشی اختیار کرنا چاہئے اور نہ بے سمجھے بوجھے فضول گوئی کرنا چاہئے۔

تادیب وانضباط

۹۔ سلطنت کو یہ اختیار ہے کہ جو کارکن اپنے فرائض میں غفلت برتیں یا اسکے خلاف عمل کریں، انکی تادیب کرے یا انھیں سزا دے۔ جن جرائم کی تحقیقات اور سزا معمولی عدالتوں میں ہو سکتی ہے انھیں ادائے فرائض کی اُس غفلت سے ممیز کر دینا چاہئے

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ۔ سلطنت میں پیدا ہو جاتی ہیں وہ کہتا ہے کہ "اکثر سرکاری عہدہ داروں کے انداز سے جس قسم کی گستاخی اور دقت کا سامنا ہوتا ہے اسکا انسداد اسکے سوا اور کسی طور پر نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ اس طرح پر خطرناک رایوں کی اشاعت کریں یا حکومت کے اقتدار کی بیخ کنی کریں اُن کے خلاف سخت کارروائیاں اختیار کیجائیں اور انھیں فوری برطرفی، قید یا جلاوطنی کی سزا دیجائے۔"

جس میں عہدہ دار کی طرف سے تادیب کیجاتی ہے۔ اول الذکر کا فیصلہ ملک کے معمولی قانون سے ہوتا ہے اور موخر الذکر کا تصفیہ خصوصیت کے ساتھ مفاد عامہ کے نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ یہ فرق ویسا ہی ہے جیسے عدل واحتساب میں ہوتا ہے۔ جیساکہ ابھی ذکر ہوچکا ہے اول الذکر کے متعلق قانون فوجداری کے موافق کارروائی کیجاتی ہے مگر سلطنت نے خود اپنے مفاد کے خیال سے اُس میں کچھ ترمیمیں کردی ہیں (۱) فرانسیسی عملدرآمد کے موافق کسی سرکاری جرم کے لئے کسی عہدہ دار پر فوجداری کا مقدمہ اُسوقت چل سکتا ہے جب حکومت یا کوئی اور صاحب اقتدار جسے خاص طور پر اسکا حق دیا گیا ہو اسکی اجازت دے (۲) عہدہ داروں کے مقدمات کی سماعت کیلئے خاص عدالتیں ہوتی ہیں[۱] انگلستان کے عملدرآمد میں یہ دونوں مستثنیات خارج کردئے گئے ہیں مگر وہاں کے اعیانی عہدہ دار بیجا حملوں سے دیگر ذرائع سے محفوظ کردئے گئے ہیں[۲]۔ سرکاری تادیب اس سے ایک قدم آگے بڑھی ہوتی ہے اور اُسکا نفاذ اُن صورتوں میں بھی ہوتا ہے جنمیں عام قانون کے

---

[۱] جرمانی شہنشاہی قانون نظام عدالت (دفعہ ۱۱) کی رو سے جرمانیا کی مختلف سلطنتوں میں وہ قوانین باقی رہ گئے جو اسے لازم قرار دیتے ہیں کہ کسی عہدہ دار پر اسکے بالواسطہ یا بلا واسطہ دوسرے فرائض کے متعلق اگر کوئی دیوانی یا فوجداری کا مقدمہ قائم کیا جائے تو اُس کے لئے سابقہ فیصلے کی ضرورت ہے، لیکن یہ سابقہ فیصلہ صرف اسی قدر تعین کرتا ہے کہ آیا عہدہ دار نے اپنے عہدے کے امتیازات سے تجاوز کیا ہے یا کوئی فرض جو براہ راست اُس پر عائد تھا اُسے ترک کردیا ہے۔ جن جرمانی سلطنتوں میں اعلیٰ انتظامی عدالت موجود ہے وہاں یہی عدالت اُسکا فیصلہ کرتی ہے اور جہاں اس قسم کی عدالت نہیں موجود ہے وہاں شہنشاہی عدالت میں اُسکا تصفیہ ہوتا ہے۔ پروسیا، بویریا، بیڈن، ہیسن وغیرہ میں اس قسم کے قانون جاری ہیں فرانس میں سابقہ فیصلے کی ضرورت ۱۵ ستمبر ۱۸۷۰ء کے حکم کی رو سے منسوخ کردی گئی ہے۔ سزادہی سے علحدہ ہوکر، عہدہ داروں کی تادیب کے متعلق ان دونوں ملکوں میں بہت ہی مختلف ومغائر خیالات پائے جاتے ہیں۔ دیکھو لوئی ننگ کی محولۂ بالا کتاب صفحہ ۱۲۷۔

[۲] جمیکا میں حبشیوں کی بغاوت سے یہ ثابت ہوگیا کہ اختیارات کے اس قدر خوفناک طور پر ناجائز استعمال کرنیکے باوجود انگلستان تک میں عہدہ داروں پر کامیابی سے مقدمہ چلانا سخت دشوار ہے۔

بموجب الزام عائد کرنیکی کافی بنا نہیں ہوتی بلکہ ایسی صورتوں میں بھی اُسکا نفاذ ہوتا ہے جب کہ عام قانون کی رو سے ملزم رہا ہو جاتا۔ یہ تادیب کارکن کی ہر قسم کی غلطی اور غفلت پر حاوی ہوتی ہے بلکہ اُسکی خانگی زندگی پر بھی اُس حد تک اثر ہوتا ہے جس حد تک اُس سے عہدے کی عزت و اعتماد کو نقصان پہنچتا ہو[1]

تادیبی سزائیں یا تو ہلکی ہوتی ہیں جیسے تنبیہ، ملامت، یا خفیف جرمانہ، یا سخت قسم کی ہوتی ہیں جیسے تعطل، تبادلہ، جبری سبکدوشی، یا برطرفی۔ خفیف قسم کی سزاؤں کا دینا عہدہ دار بالادست کے معمولی اختیارات میں داخل ہے اور اسکے لئے کسی خاص قانونی کارروائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ برخلاف اسکے سخت قسم کی سزاؤں کے لئے قانونی کارروائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عہدہ دار کے حقوق بالادست کے اختیار کے مطلق العنانانہ استعمال سے محفوظ رہیں۔ بہت سی سلطنتوں میں برطرفی کی سزا صرف عام قانونی عدالت کے ذریعے سے ہو سکتی ہے، لیکن عام عدالت میں ایسا ہوتا ہے کہ قصور پر شخصی حیثیت سے نظر کیجاتی ہے یعنی عہدہ دار کی شخصی حیثیت کا لحاظ زیادہ کیا جاتا ہے اور اُسکی عہدہ دارانہ حیثیت کا لحاظ کم۔ اس طریق میں عہدہ دار کے مقاصد کو بروقت، سلطنت اور عہدے کے مستقل مقاصد پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے یعنی افراد کے حقوق کو قوم کے حقوق پر ترجیح دیجاتی ہے۔ جو عدالت اس قسم کی عام اہمیت کے معاملے کا فیصلہ کرنیکے لئے مقرر ہو اسکی ترکیب اس طور پر ہونا چاہیئے کہ وہ مشتملہ مقاصد کو کماحقہ سمجھنے کی قابلیت رکھتی ہو۔ اگر ایسی عدالت نہ موجود ہو تو نااہل اور ناکارہ عہدہ داروں کی برطرفی کا اختیار حکومت ہی کے اعلیٰ عہدہ داروں کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے[2]

---

[1] جرمانی شہنشاہی عہدہ داروں کا قانون ۱۸۷۳ء دفعہ ۱۰۔

[2] ایضاً دفعہ ۷۶۔

گیارھواں باب

سرکاری ملازمت کا ختم ہونا

(۱) کسی عہدے کا اٹھا دیا جانا

عہدے کا قیام عہدہ دار کی ضرورت کے لئے نہیں ہوتا بلکہ عہدہ دار عہدے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے۔ پس اگر کوئی عہدہ اُٹھا دیا جائے تو جو شخص اس پر متعین تھا اُسکی عہدہ داری کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ عہدے کی نوعیت اور اسکے قائم رہنے کا فیصلہ صرف مفادِ عامہ کے مصالح پر لحاظ کرکے کیا جاتا ہے لیکن عہدے کے اٹھا دینے سے عہدہ دار کی گزراوقات کا حق زائل نہیں ہو جاتا۔ اس حق کو اُس مدت تک کیلئے برقرار سمجھنا چاہئے جو عہدے کے نہ اُٹھائے جانے کی صورت میں عہدہ دار کو ہوتا۔

جس طرح سے کہ کسی عہدے کے قبول کرنے یا اُس سے انکار کرنیکے معاملے میں آزادی ہوتی ہے اسی طرح اب استعفا دینے کے حق کو بھی زمانۂ حال کے قانونِ سلطنت نے تسلیم کیا ہے گو یہ ضروری ہے کہ آزادی کی ان دونوں صورتوں کی حالت ایک نہیں ہے۔ کیونکہ کسی ذمہ داری کے قبول کرنیکی آزادی کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اُسے ترک کر دینے کی بھی ویسی ہی آزادی حاصل ہو۔ مگر جہاں شخص کارکن کی دماغی قابلیت اور خوشدلی کی اس قدر شدید ضرورت ہے جیسی کہ خدماتِ عامہ میں ہوتی ہے وہاں کسی کارکن کو محض جبر سے اُسکی خدمت پر کارگزار رکھنا سلطنت کے لئے مفید مطلب بھی نہیں ہو سکتا۔[۱] برخلاف اسکے جہاں عہدے کا قبول کرنا ایک لازمی ملکی فرض ہے وہاں کم ازکم ایک معین مدت تک اُس پر قائم رہنا بھی لازمی ہے۔

---

[۱] پروسیا کا قانون یہ ہے کہ "کسی عہدے دار کا استعفا صرف اُس حالت میں نامنظور ہوگا جب کہ اُسکے قبول کرلینے سے مفادِ عامہ کو سخت نقصان ہوتا ہو" بویریا کا قانون یہ ہے کہ ہر شخص اپنی خوشی سے بغیر کسی وجہ کے بیان کئے ہوئے استعفا دے سکتا ہے مگر اس صورت میں وہ اپنی تمام تنخواہ نیز اپنے لقب اور عہدے کے جملہ امتیازوں سے محروم ہو جائیگا۔

(۲) استعفاء

استعفے کا محض دیدینا عہدے کے فرائض کو ختم نہیں کر دیتا۔ عہدہ دار اگر اپنی ہی رائے اور ارادے سے عہدے کو چھوڑ دے تو اُسکا ایسا کرنا خدمت سے فرار ہوجانا کہا جائیگا۔ استعفاء صرف ایک وسیلہ ہے اس تحریک کا کہ سلطنت اُس عہدے کو جو اس نے عہدہ دار کو عطا کیا تھا اس سے واپس لیلے۔ عہدے کے فرائض اُس وقت تک ختم نہیں ہوتے۔ جب تک کہ سلطنت استعفے کو قبول نہ کر لے اور پھر بھی یہ اختیار حکام بالادست کو باقی رہتا ہے کہ وہ ضروریات عامہ پر نظر کر کے سبکدوشی کا ایک وقت معین کریں۔

جب کوئی عہدہ دار معمولی استعفے کی بنا پر سبکدوش کر دیا جائے تو اسکی ملازمت کے ختم ہوتے ہی وہ تمام شخصی اور سیاسی حقوق بھی ختم ہو جاتے ہیں جو اُسے اُسکے عہدے کی بنا پر حاصل تھے۔

(۳) کنارہ کشی

برخلاف اسکے اگر کسی سرکاری ملازم کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ کنارہ کش ملازموں کے زمرے میں شامل کر دئے جانیکا مطالبہ کر سکے تو اُسکا معاملہ دوسری نوعیت رکھتا ہے ایسی صورت میں عہدہ دار کے منصبی اختیارات عامہ ختم ہو جاتے ہیں مگر اُسکے ذاتی اعزاز جیسے خطاب اور مرتبہ زائل نہیں ہوتے اور اُسے بعض اقوام کے پانیکا حق بھی باقی رہتا ہے وظیفۂ تقاعد کی مقدار بالعموم عمر یا مدت ملازمت کے اعتبار سے مقرر ہوتی ہے۔ وظیفۂ تقاعد کا حق کچھ تو سن کی زیادتی پر مبنی ہے جس میں طول ملازمت کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے جسکی مدت تیس سے چالیس برس تک ہوتی ہے اور کچھ صحت کی قبل از وقت خرابی وغیرہ کے باعث کام سے ناقابل ہوجانے پر منحصر ہے (یوریا میں پیرانہ سالی کی حد ستر برس مقرر کی گئی ہے اور پروسیا، ورٹمبرگ، سکسونیا، بلجیم میں پینسٹھ برس) آخرالذکر حالت میں وظیفے کا قانونی حق صرف اُس صورت میں خود بخود پیدا ہوتا ہے جب کہ خود خدمت کی وجہ سے یہ نقص پیش آیا ہو، کیونکہ ایسی ہی صورت میں سلطنت کا یہ فرض ہے کہ مفوضہ خدمات عامہ کے عملدرآمد میں جو نقصانات ملازم کو برداشت کرنا پڑے ہوں اُنکی تلافی کرے۔

(۴) برطرفی

ملازم کی خواہش کے خلاف اُسکی خدمت سے علحدگی یعنی برطرفی کے قواعد و ضوابط موجودہ زمانے میں مختلف سلطنتوں میں مختلف ہیں قدیم جرمانی شہنشاہی (مقدس رومی شہنشاہی) میں مقننوں کے اثر کی وجہ سے عہدہ داروں کے شخصی حقوق کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ عہدے کی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ ایک حق ہے، جو بالعموم مدت العمر کے لئے

عطا کیا جاتا ہے اور اسکا واپس لینا صرف حکام سلطنت کی مرضی سے ممکن نہ تھا۔
ایسی علیحدگی کا امکان اُسی حالت میں ہوتا تھا جب ملازم سے ادائے فرض میں خطا ہوئی ہو
اور عدالتی فیصلہ اُسے خطا تسلیم کرے[1] یہ اعتراض ضرور قائم تھا کہ مفاد عامہ کی بنا پر معزز
برطرفی بھی جائز و درست ہے مگر آخری صدی کے اختتام کے قریب پہلی ہی رائے کو
زیادہ وسعت حاصل ہوتی جاتی تھی، اور بہت سے جدید نظامہائے سلطنت میں اس
اصول کے نسبت بالاعلان یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ یہ آزادی کی ترقی اور خودمختارانہ حکومت
کے خلاف ایک ضمانت ہے[2]۔ یہ حالت نہ صرف جرمانیا میں تھی بلکہ زیادہ قریب زمانہ تک[الف]
سوئیٹزرلینڈ میں بھی یہی حالت تھی جہاں عہدے صرف ایک مدت معینہ کیلئے دئے جایا کرتے ہیں
اسکے برخلاف انگلستان میں فریقانہ مناقشات نے اس سیاسی احساس کو
مدت تک زندہ رکھا کہ عہدے کی خاص غرض سلطنت کا فائدہ ہے افراد کا فائدہ
مدنظر نہیں ہے، یہ اصول یہاں تک مسلم ہوگیا ہے کہ سرکردہ سلطنت کو کامل اختیار ہے کہ
جس طرح وہ عہدے عطا کرسکتا ہے اسی طرح اُسے واپس بھی لے سکتا ہے۔ ججوں کی
آزادی کے تیقن کے خیال سے اُنکی نسبت استثنا قائم کیا گیا تھا۔ ولیم سوم کے عہد میں
یہ طے پایا تھا کہ قانون عامہ کے جج حکام اعلیٰ کی مرضی تک کے لئے نہیں بلکہ اطمینان بخش
رویے کی بنا پر مقرر کئے جائیں اور پھر بھی اگر اُن سے کوئی ایسی بات سرزد ہو جو اُنکی
خوش رویگی کے خلاف سمجھی جائے تو اُنکے برخاست کرنے نہ کرنیکا فیصلہ صرف بادشاہ
اور پارلیمنٹ کے حیطۂ اختیار میں ہو[3]۔ شمالی امریکہ کے ممالک متحدہ کا قانون سلطنت بھی

---

[1] چنانچہ انگلستان میں جو شیرف ایک برس اس عہدے کا کام کرچکتا ہے وہ آئندہ تین برس تک اس عہدے کے قبول کرنے سے آزاد ہے۔

[2] شہنشاہی کی شاہی مجلس کے ارکان کے انتخابی حق بریت کے متعلق باضابطہ یہ ظاہر کردیا گیا ہے کہ کوئی رکن مجلس شاہی بغیر عدالتی تحقیق کے اور ایسے حکم کے جو اس تحقیق پر مبنی ہو، برطرف نہیں کیا جاسکتا۔

(الف) جرمانیا میں بویریا ہی ایک ملک ہے جس میں صرف معمولی عدالت فوجداری ہی انتظامی عہدہ داروں کو موقوف کرسکتی ہے۔ دوسری سلطنتوں میں برطرفی ایک تادیبی سزا سمجھی جاتی ہے۔ یہی قاعدہ شہنشاہی میں بھی ہے۔

[3] جارج سوم کے وقت تک جج کا عہدہ بادشاہ کے انتقال کے ساتھ ختم ہوجاتا تھا۔

اسی قسم کے اصول پر مبنی ہے۔[۵] فرانس میں بھی قدیم زمانے سے انتظامی عہدہ دار حسب مرضی برطرف کئے جا سکتے اور کہیں پندرھویں صدی میں آکر جج ناقابل برطرفی قرار پائے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرانس تک میں انقلابی وقتوں کے سوا عہدہ داروں کو ایک مناسب حد تک اپنی جگہ کی طرف سے اطمینان حاصل ہے۔

جرمانی طریق میں شخصی حقوق کی اہمیت میں مبالغہ ضرور کیا گیا ہے لیکن اگر اس مبالغے سے قطع نظر کر کے اور قانون سلطنت کے نقطۂ خیال کا پورا لحاظ کر کے دیکھئے تو دوسری آئینی سلطنتوں کے خود رایانہ طریق عمل پر جرمانی طریق کی برتری ثابت ہوتی ہے؛ نہ صرف اسلئے کہ اس سے سلطنت کے ملازم کی شخصی ہستی محفوظ ہو جاتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس سے سلطنت کا نظام عضوی فریقانہ ہنگامہ آرائیوں اور اضطراری پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے تہلکوں سے بچا رہتا ہے۔

بہر نوع ہر حالت میں یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ عہدے کا قیام سلطنت کی ضرورت سے ہوتا ہے اور اس لئے سلطنت مفاد عامہ کے لحاظ سے کسی عہدہ دار کو برطرف یا تبدیل کر سکتی ہے۔ یہ دونوں حقوق لازمی طور پر ایک ہی شخص سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی شک کی حالت میں ان کا تعلق سرتاج سلطنت سے ہوتا ہے۔ عہدے سے علٰحدگی کے نتائج جہاں تک شخصی حالت کے بجائے سیاسی حالات سے تعلق رکھتے ہیں وہاں تک اس اصول کو اُن سلطنتوں میں بھی تسلیم کرنا چاہئے جن میں برطرفی کا اختیار صرف عدالت قانونی کو ہوتا ہے۔[۶]

ان قواعد کی حد بندی کی دو شقیں ہو سکتی ہیں: (۱) ایک ججوں کی آزادی کے متعلق

---

[۵] ۱۷۸۹ء کے قانون کے بموجب شمالی امریکہ کے ممالک متحدہ میں عہدہ داروں کے برطرف کرنیکا اختیار صرف رئیس جمہوریہ کو تھا حالانکہ اُسکا تقرر مجلس اعلٰی کی اتفاق رائے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ایک بے جوڑ بات تھی مگر ۱۸۶۷ء تک اس میں ترمیم نہیں ہوئی۔

[۶] لیکن بعض سلطنتیں ایسی بھی ہیں جو اس اصول کو تسلیم نہیں کرتیں بلکہ وہ یہانتک بڑھی ہوئی ہیں کہ ایک خاص مدت تک کیلئے سرکاری وجوہ سے عہدے کو ناقابل تنسیخ قرار دیتی ہیں۔

اور (۲) دوسری خود کارکنوں کے مفاد سے متعلق۔ زمانۂ حال میں یہ اصول عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جج نہ تو موقوف کئے جا سکتے ہیں اور نہ ان کی مرضی کے خلاف انکا تبادلہ ہو سکتا ہے۔ اور بغیر پوری تنخواہ کی برقراری کے وہ کنارہ کشی پر مجبور نہیں کئے جا سکتے۔ انگلستان میں جج صرف پارلیمنٹ کے حکم سے علحدہ کئے جا سکتے ہیں اور جرمانیا میں عدالتی فیصلے کی رو سے[۵]

دوسری قسم کی حد بندی کے متعلق مختلف حالات میں فرق کرنا چاہئے۔ کسی عہدہ دار کے علحدہ کرنیکے اسباب حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(الف) کوئی جرم ایسا سرزد ہو جس سے اخلاقاً وہ عہدے کے ناقابل ثابت ہو۔

(ب) کوئی حقیقی جرم نہ سرزد ہو مگر ایسی غفلت، بزدلی یا کوئی اور اخلاقی خطا ظاہر ہوئی ہو جو عہدہ دار کو عہدے کے ناقابل ثابت کرے۔

(ج) دماغی ناقابلیت مثلاً حافظے کا جاتا رہنا، دیوانگی وغیرہ۔

(د) خارجی اسباب ایسے پیدا ہو جائیں جن کو عہدہ دار کی ذات سے واسطہ نہ ہو مگر جن سے اسکی کارگزاری کی قوت میں فتور پڑ جائے یا جن سے وہ عوام کے اعتماد سے محروم ہو جائے اضطرابی زمانے میں یا غیر ملکی پیچیدگیوں کے باعث ایسے عہدہ داروں کے متعلق بھی یہ صورت پیش آ سکتی ہے جنھوں نے نہ صرف اپنا فرض ادا کیا ہو بلکہ جن کو یہ دشواری صرف اسی وجہ سے پیش آئی ہو کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کیا۔ چنانچہ وزیر اشٹائن، نپولین اول کے خوش کرنیکے لئے برطرف کر دیا گیا تھا۔

ان تمام صورتوں میں سلطنت کے پاس ایسے ذرائع ہونا چاہئیں جن سے وہ عہدہ داروں کو علحدہ کرکے خود کو نقصان سے بچا سکے۔ اس میں سے صرف پہلی صورت (الف) میں قانونی عدالتیں اپنے معمولی طریق کارروائی سے فیصلہ کرنیکے لئے موزوں ہو سکتی ہیں۔

---

[۵] بویریا کے نظام سلطنت میں یہ قرار پایا ہے کہ جج بغیر عدالتی فیصلے کے اپنی تنخواہ سے محروم کرکے اپنے عہدے سے علحدہ نہیں کئے جا سکتے۔ بلجیم کے نظام سلطنت کی دفعہ ۱۰۰ حسب ذیل ہے۔ "ججوں کا تقرر تا دام الحیات ہوتا ہے کوئی جج عدالتی فیصلے کے بغیر نہ اپنی جگہ سے محروم کیا جا سکتا اور نہ معطل کیا جا سکتا ہے۔ کسی جج کا تبادلہ نئی نامزدگی اور اسکی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔"

عدالتی طور پر برطرف کئے جانے سے لقب، عہدہ، تنخواہ، حق وظیفہ سب زائل ہوجاتا ہے۔

دوسری صورت (ب) میں معمولی عدالتوں میں معاملات کے پیش کرنے سے یہ بہتر ہے کہ خود محکمہ کی طرف سے تادیبی کارروائی کیجائے، مگر اس حالت میں عہدہ دار کو ہمیشہ اس امر کا موقع حاصل رہنا چاہئے کہ وہ اپنی محافظت کرسکے۔ اُسکے قصور کے سخت یا خفیف ہونیکے اعتبار سے یہ ہوسکتا ہے کہ اُسکی موقوفی کے ساتھ اسکی تنخواہ کا تمام حق زائل ہوجائے مگر اُسکے بقیہ سیاسی حقوق کو نقصان نہ پہنچے بلکہ وہ مناسب وظیفہ دیکر کنارہ کشی پر مجبور کیا جائے، یہ ظاہر ہے کہ آخر الذکر صورت میں حکومت زیادہ آزادی کے ساتھ کارروائی کرسکتی ہے کیونکہ اس سے عہدہ دار کے شخصی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تیسری صورت (ج) میں بالعموم عہدہ دار کو کنارہ کشی پر مجبور کرنا درست ہے مگر اسکی برطرفی روا نہیں کیونکہ اس میں خود عہدہ دار کا کوئی قصور نہیں ہے۔

چوتھی صورت (د) کی تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ یا تو عہدہ دار جبراً کنارہ کشی پر مجبور کیا جائے، یا اُسی نوعیت، اعزاز اور آمدنی کی دوسری جگہ پر تبدیل کردیا جائے۔

یہ دونوں آخری صورتیں حکومت کے سب سے اعلیٰ صاحب اقتدار کے روبرو پیش ہونا چاہئیں اور جس صورت میں کہ تقرر، سرتاج سلطنت کی طرف سے ہوتا ہو اُس صورت میں برطرفی کے لئے بھی اُسکی منظوری اور حکم کی ضرورت ہو۔

بعض بعض سلطنتوں میں اب بھی بغیر کسی وجہ کے بیان کئے ہوئے اور بغیر اسکے کہ عہدہ دار کو مدافعت کا موقع دیا جائے، خود رایانہ طور پر برطرفی عمل میں آتی ہے مگر یہ دستور ایک منتظم حالت کے موافق نہیں ہے۔

۵۔ تعطّل

عارضی تعطل سزا کے طور پر یا احتیاط کی نظر سے عمل میں آسکتا ہے، اول الذکر صورت میں حکم یا تو قانونی عدالت سے ہونا چاہئے یا تادیبی طور پر کسی بااختیار اعلیٰ عہدہ دار کی جانب سے ہونا چاہئے۔ اس صورت میں بالعموم زمانۂ تعطل میں یا تو کل تنخواہ ضبط ہوجاتی ہے یا اُس میں کمی کردیجاتی ہے۔

بعض صورتوں کے لئے مثلاً مجرمانہ الزام کی حالت میں ازروئے قانون ایک عارضی کارروائی کے طور پر تعطل کے شرائط پہلے سے معین کئے جاسکتے ہیں لیکن کسی

غیرہمدردانہ عہدہ دار کو اسکی پیدا کردہ شورش سے بچانیکے لئے بھی حکام بالا دست اس طریق سے کام لے سکتے ہیں۔ معطلی جب تک سزا کے طور پر نہ ہو اُس سے شخصی حقوق زائل نہیں ہوتے۔ عہدہ دار کو اُسکی آمدنی کا وہ حصہ جو شخصی نوعیت رکھتا ہو ملتا رہیگا۔ بالخصوص اُسکا گزارہ۔ اگر کسی مجرمانہ الزام پر وہ معطل کیا جائے تو بھی اس کے شخصی حقوق قائم رہیں گے مگر عدالت یہ حکم دے سکتی ہے کہ بطور ضمانت کے اُسکی تنخواہ روک دیجائے تاکہ اگر اُس پر جرمانہ ہو یا اُسپر کوئی تاوان عائد کیا جائے تو تنخواہ سے اُسکی ادائی ہوسکے مگر جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے اُسکا آئندہ کی تنخواہ کا حق ختم نہیں ہوتا۔

صحت نامہ نظریۂ سلطنت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۳۰	۱۴	قوتیت	فوقیت	۱۳۰	۱۶	ہیں ہوتے تھے	نہیں ہوتے
″	۲۰	سپہ سالار	سپہ سالار	″	″	کم ہوتی تھی	کم ہوتی ہے
۳۵	۱۷	قوت کو خودکو	قوت خودکو	″	۱۷	دستکاری تھی	دستکاری ہے
۳۷	۱۳	معدلت فرض	معدلت کا فرض	″	۱۸	داخل ہوجاتے تھے	داخل ہوجاتے ہیں
۴۵	۷	جزیات	جزئیات	″	۲۲	تابع	تابع
″	۲۴	رومیوں نے قانون	رومیوں کے قانون	۱۳۶	حاشیہ متن	×	اصلاح
۵۲	۲۱	امعتقدات	(معتقدات)	۱۳۷	۴	میں ۲۰	بیس ۲۰
۶۸	۱۸	انستان	انسان	″	۲۵	ملکتی	مملکتی
۷۱	۲۵ حاشیہ	قانونی	قانون	۱۳۸	۱	کی نسبت	کے بہ نسبت
۷۸	۲۱	سنہ ۵۳۰-۱۸۵۱	سنہ ۵۳-۱۸۵۱	″	۸	کی نہیں	کی تھیں
۸۳	۱۱	یورپینوں	یورپینوں	″	حاشیہ سطر ۲	روھانی	روحانی
۹۰	۱۲	قلسطین	فلسطین	۱۳۹	۴	امرا	امراء
۱۲۸	۲۴ حاشیہ	قانونی ملکی	قانون ملکی	″	۵	طبفہ	طبقہ
۱۲۹	۷	علامتیں	علامات	۱۳۹	۱۵	حاصل کی ہوتی	حاصل کی ہے
″	۱۱	بنیاد تھے	بنیاد ہیں	″	۱۶	جمہوری دور میں	اور جمہوری دور میں
۱۳۰	۳	طبقہ تھا	طبقہ ہے	۱۴۰	۱	Principate	Principate
۱۳۰	۱۳	کرتا تھا	کرتا ہے	۱۴۱	۲۰	روسا	رؤسا
″	″	کہتے تھے	کہتے ہیں	۱۴۲	۸	مقابلے میں ٹیوئنی	مقابلے میں ٹوٹنی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۱۴۲	حاشیہ متن	۹۸۷ — ۲۲	۱۲۲۶ — ۹۸۷
״	۲۱	تسلیم کرنا پڑا	تسلیم کرنا پڑا
״	حاشیہ سطر ۲	Gnizot	Guizot
״	حاشیہ سطر	Frauce	France
۱۴۶	۱۴	نہری چہارم	ہنری چہارم
۱۵۱	۲۰	گرچہ	اگرچہ
۱۵۳	۸	جوانیا	جرانیا
۱۵۴	۱۸	وارثتا	وراثتا
۱۵۷	۱۵	صورتہبائے	صورتہائے
۱۶۱	۵	یادریوں	پادریوں
۱۶۱	۱۲	اشوالتس	اشوائتس
״	۱۳	اشولتسی	اشوئتسی
۱۶۲	۲۰	آزاواد	آزادانہ
۱۶۳	۱۶	آتا	آتا
۱۶۴	۷	مشترکیات	طلفی مشترکیات
۱۶۶	۱۹	ہابس برگ	ہابس برگ کے
۱۶۸	۱۷ / ۲۲	اعالیا	اطالیا
۱۶۹	۲۲	غلاقوں	علاقوں
۱۸۴	۱۴	نئی	ہی
۱۸۵	۲۴	شماکی	شمالی
۱۹۵	۸	زیادوتر	زیادہ تر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۱۹۶	۱۰	دواسار	دواساز
۲۰۲	۱۷	کے لازمی	کے لئے لازمی
۲۲۵	۱۱	وجو	وجوہ
۲۳۲	۱۹	جیس	جسم
۲۴۰	۲۲	ودک	روک
۲۴۸	۱۵	حدادلی	حدادنی
۲۶۲	۱۶	متداعوبہ	متدعویہ
۲۶۳	۱۰	ریتوں	زیتون
۲۶۸	۲۳	مزوج	ممزوج
۲۸۰	۳	اعضا	اعضائے کار
״	۱۵	سویز	سوئیزر
۲۹۸	۷	سنی	مرضی
۳۰۴	۳	چابا	چاہا
۳۱۶	۲	موسیوتو وے	موسیو فوئے
۳۳۳	۱۰	دل ہیلیم	ول ہیلم
۳۳۹		جھولی	چھوٹی
״	״	انے	جانے
۳۴۳	۱۶	واضع	×
۳۵۹	۱۸	مدائنت	مداثت
۳۶۹	۹	گردبیاں	گروہی
۳۷۶	۱۶	نہیں	تھیں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۳۸۸	۲۲	تہنشاہوں	شہنشاہوں
۳۹۵	۱۴	اسانفقہ	اساقفہ
"	"	صوامعہ	صوامع
۴۰۸	۱۹	نہیں	میں
۴۲۵	۸	مطق	مطلق
۴۳۲	۱۶	وائینا	وائنیا
۴۴۳	۱۲	ہے	ہیے
۴۴۶	۲۱	دو	وہ
۴۵۴	۱۷	انھوں سیاسی	انھوں نے سیاسی
۴۶۶	۷	رہتاہے	رہنا ہے
۴۷۶	۱۲	نہ رکھ سکتے	نہ رکھ سکے
۴۸۰	۲۵	بیکسن ہی قوم ہی	سیکسن قوم ہی
۴۸۸	۱۵	قوی مؤتمر	قومی مؤتمر
۴۹۷	۱۴	مولڈیویہ	مولڈیویا
۴۹۹	۴	پروشی	پروسی
۵۰۰	۱	پروشیا	پروسیا
"	"	منتشٰی	مستثنٰی
"	حاشیہ سطر ۱	تیرسس	تبیرس
۵۰۳	۱	und	and
"	*	Statgewalt	Statsgewalt
۵۰۶	حاشیہ سطر ۱	لاٹینس	لاٹنیس

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴
۵۰۶	۶	گیرکی	گیرکے کی
۵۰۸	۱۲	ملت	قوم
"	۱۳	میں قوم	×
۵۱۰	۶	commentarias	commentaries
۵۱۲	۶	داحل	داخل
۵۱۳	حاشیہ سطر ۲	ہوتیکے	ہونے کے
"	" "	خواہ	دل خواہ
۵۲۵	۱۳	Inperium	Imperium
۵۲۷	حاشیہ سطر ۱	Espoit	Esprit
۵۲۸	۵	کہ	کہ اس کے
"	۹	توحد	وحدت
۵۲۹	حاشیہ سطر ۱	مونٹسکو	مونتسکیو
۵۳۱	حاشیہ جدول	اصطلاح	اصلاح
۵۳۱	"	بیشر	بیشتر
۵۳۷	۶	×	عہدہ داروں کے مددگار
"	۱۳ و ۱۴	اور اور	اور
"	حاشیہ جدول	×	مواجبہ
۵۴۲	۴	پیروشیا	پروسیا
۵۴۳	۱۳	کے	کا
۵۴۴	۳	اگر	اگرُ
"	۲۲	Pragmatis	Pragmatic

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۲	۳	۴	۱	۲	۳	۴
۵۵۴	۱۳	مختلف بالرائے	مختلف الرائے	۵۵۸	۱۳	کردیے	کردینے
۵۵۷	۵	خیف	خفیف	.	.	.	.